52 جون 2015ء ۔ شعبان ررمضان ۱۴۳۶ھ

فتنہ غامدی نمبر

جلد اول

ناشر
جامعہ حنفیہ دار الامین لاہور
امداد ٹاؤن شیخوپورہ روڈ فیصل آباد پاکستان
0307-5687800
رعائتی قیمت: 200 روپے

جاوید غامدی کے چند ملحدانہ نظریات

عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ [اشراق مئی ۲۰۰۸ء،ص:۶۶]

قیامت کے قریب کوئی مہدی نہیں آئے گا۔ [میزان،علامات قیامت،ص:۱۷۷، طبع مئی ۲۰۱۴]

حدیث سے دین میں کسی عمل یا عقیدے کا اضافہ بالکل نہیں ہو سکتا۔ [میزان:۱۵، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

مرزا غلام احمد قادیانی بنیادی طور پر صوفی تھا، اس نے دعویٰ نبوت نہیں کیا۔ [اختلافات احمدیہ:۸۴]

نبی ﷺ کے مختلف اعمال، نفلی عبادات، مرغوب طعام، لباس وغیرہ سنت نہیں۔ [میزان:۵۷]

ڈاڑھی سنت اور دین کا حصہ نہیں۔ [مقامات، ص:۱۳۸، طبع نومبر ۲۰۰۸]

دین کے ماخذ میں اجماع کا اضافہ یقیناً بدعت ہے۔ [اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۲]

مرتد کی شرعی سزا نبی کریم ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھی۔ [اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶۴]

قرآن کی ایک ہی قراءت ہے، اس کے علاوہ سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں۔ [میزان:۳۲، طبع ۲۰۰۲ء]

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے بعد اقدامی جہاد ہمیشہ کے لیے ختم ہے۔ [اشراق، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۲]

ہر آدمی کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ [سوال وجواب، ہٹس ۶۱۲، تاریخ اشاعت:۱۰ مارچ ۲۰۰۹ء]

تصوف عالم گیر ضلالت ہے۔ [برہان:۱۹۳، طبع ششم، فروری ۲۰۰۹ء]

ریاست کو زکوٰۃ کے نصاب میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔ [اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۷۰]

یہود ونصاریٰ کے لیے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ [اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۷۰]

موسیقی فی نفسہ جائز ہے۔ [اشراق، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۶۹]

مجلہ صفدر

ٹی وی اور میڈیا کے شہرت یافتہ متجدد، آزاد خیالی کے داعی

دورِ حاضر کے منکرِ حدیث نام نہاد دینی اسکالر

جاوید احمد غامدی

مجلّہ صفدر......اغراض ومقاصد

☆......مجلّہ ''صفدر'' اکابرِ دیو بند، بالخصوص

شیخ العرب و العجم حضرت مولانا سیدِ حسین احمد مدنی رحمہ اللہ

کے افکار ونظریات کا ''بے باک'' ترجمان ہے۔

☆......دورِ حاضر میں یہ

قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ

[تلمیذ وخلیفہ مجاز: شیخ العرب و العجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ]

اور

امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

[تلمیذ شیخ مدنی رحمہ اللہ......خلیفہ مجاز: امام المفسرین مولانا حسین علی رحمہ اللہ]

کے مسلک اور طرزِ عمل کا پابند ہے۔

☆......اس کا اولین مقصد قرآن وسنت اور فقہ حنفی کی تعلیمات کی صحیح تشریح......تحفظ ناموسِ رسالت......دفاع صحابہؓ واہل بیتؓ......مسلک اہل السنۃ والجماعۃ علماء دیو بند کی اشاعت وحفاظت ...... اور فرقِ باطلہ ضالہ کا تعاقب ہے۔

زیر سرپرستی

زیر نگرانی

مناظر اسلام حضرۃ مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی صاحب مدظلہ

0312 4612774 0334-4612774
khadim.khan4@yahoo.com

نام کتاب........................مجلہ ''صفدر'' فتنہ غامدی نمبر (جلد اول)

نظر ثانی........................مولانا احسن خدامی

مرتب........................خادم اہل سنت حمزہ احسانی

صفحات........................۶۰۰

طبع اول........................جون ۲۰۱۵ء......شعبان/رمضان ۱۴۳۶ھ

تعداد........................گیارہ سو (۱۱۰۰)

ناشر........................جامعہ حنفیہ فیصل آباد......دارالامین لاہور

رعائتی قیمت........................دوسو (200) روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

ملنے کے پتے

مولانا احسن خدامی، مکان نمبر 4، گلی نمبر 82، محمود سٹریٹ،

محلہ سردار پورہ، اچھرہ، لاہور 0307-5687800

......مکتبہ صفدریہ، نزد مدینہ مسجد، ماڈل ٹاؤن بی، بہاول پور 0301-7790908

......مکتبہ جمال قاسمی، دوکان نمبر ۲، شان آرکیڈ، بالمقابل جامعہ گلشن عمر، سہراب گوٹھ، کراچی

......مکتبہ عمر فاروق، نزد جامعہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی، بلاک نمبر ۴، کراچی

......ادارہ اشاعت الخیر، بیرون بوہڑ گیٹ، ملتان

......مکتبہ الفرقان، اردو بازار، گوجرانوالہ ...... مکتبہ سراجیہ، سٹیلائٹ ٹاؤن، سرگودہا

......مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور ......مکتبہ قاسمیہ، اردو بازار، لاہور

......مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور ......مکتبہ الحسن، اردو بازار، لاہور

......باب نمبر۱......

آغاز سخن

فہرست، انتساب، پیش لفظ، پیامِ صفدر، عرضِ خادم

فہرست ابواب......

باب اول......آغاز سخن

باب دوم......تحریرات اکابر

باب سوم......قلمی وعلمی فتنے

باب چہارم......تعارف وپس منظر

باب پنجم......افکار کا تحقیقی محاسبہ

باب ششم......عمومی جائزہ

باب ہفتم......فتاویٰ جات

فہرست جلد اول

باب ا......آغاز سخن

باب ۲......تحریراتِ اکابر

باب ۳ ... تجدد پسندوں کے قلمی و علمی فتنے

باب ۴ ... (جاوید احمد غامدی کا) تعارف و پس منظر

باب ۵ ..... (غامدی) افکار کا تحقیقی محاسبہ

باب ۶ ..... غامدی مذہب کا عمومی جائزہ

باب ۷ ..... فتاویٰ جات

☆......☆......☆......☆

"اسلام کی مستحکم علمی روایت کے مقابلے میں فتنے طوفان کی رفتار سے آتے، چیختے چلاتے، آنکھوں میں دھول جھونکتے، گرد مٹی اور ایک آدھ پیڑ گرا کر گذر جاتے ہیں۔ فتنوں میں طغیانیاں اور طوفان سامانیاں تو ہوتی ہیں لیکن دوام واستقرار نہیں۔ اپنے اپنے محدود وقت میں بلند وبانگ دعووں کے جلو میں خطابیات وسفسطیات پر مشتمل دلائل کا ایک خوشنما لشکر بھی ہوتا ہے، جو کچھ چھچھوری اور جلد باز طبیعتوں کو متاثر بھی کرتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے غبار چھٹتا ہے اور قانون فطرت (فاما الزبد فیذھب جفاء) کے تحت ہباء منثورا ہو جاتے ہیں۔ علمی منظر نامے سے غائب ہونے کے بعد ان بے چاروں پر ایسی بے بسی و بے کسی کی اوس پڑتی ہے کہ ان کا نوحہ لکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

آفریں ہے ان نفوس قدسیہ پر جو امت کی مضبوط علمی روایت سے وابستہ رہتے ہوئے داد وستائش کے ڈونگروں اور طعن وملامت کے تیروں سے بہت بلند ہو کر ان فتنوں کے آگے بند باندھنے کا اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہیں۔ اور گھاٹے کی تجارت کرتے ہیں وہ لوگ جو براہ راست یا بالواسطہ ان کا پانی بھرتے ہیں۔"

انتساب

حضرۃ مولانا جانشین شہید اسلام محقق العصر
سعید احمد جلالپوری شہید نور اللہ مرقدہ

استاذ العلماء محقق العصر ترجمان اہل حق
حضرۃ مولانا مفتی عبد الواحد صاحب مدظلہ

حضرۃ نامور محقق استاذِ محترم
مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور صاحب مدظلہ

سمیت تمام اُن صحیح العقیدہ لوگوں کے نام جنھوں نے
''غامدیت'' کا اصلی روپ اُمت کو دکھلانے میں سبقت کی۔
بے شک ''صفدر'' کے ''فتنہ غامدی نمبر'' سمیت اِس فتنہ کے تعاقب کی
تمام کاوشوں کا سہرا اِنھی حضرات کے سر ہے۔

خادم اہل سنت حمزہ احسانی غفرلہ

قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین نوراللہ مرقدہ

کی تالیفات

رد مودودیت

[۱]صحابہ کرام اور مودودی
[۲]علمی محاسبہ بجواب علمی جائزہ
[۳]مودودی مذہب
[۴]مودودی جماعت کے عقائد ونظریات پر ایک تنقیدی نظر
[۵]مولانا سید گل بادشاہ رحمہ اللہ کا فتویٰ اور مودودی جماعت
[۶] کیا عورت صدر مملکت بن سکتی ہے؟
[۷]مودودی صاحب کے نام کھلی چٹھی
[۸]جماعت اسلامی شیعہ انقلاب چاہتی ہے۔
[۹]عقیدہ عصمت انبیاء اور مودودی
[۱۰]جوابی مکتوب (بنام قاضی حسین احمد صاحب)

رد رافضیت

[۱۱]آفتاب ہدایت
[۱۲]بشارت الدارین بالصبر علیٰ شهادت الحسين
[۱۳]ہم ماتم کیوں نہیں کرتے؟
[۱۴]سنی مذہب حق ہے۔
[۱۵]تجلیات صداقت پر ایک اجمالی نظر
[۱۶]سنی تحریک طلبہ کا سنی موقف
[۱۷]دینی مدارس کے سنی، شیعہ طلبہ کا اتحادی فتنہ
[۱۸]صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور پاکستان
[۱۹]سواد اعظم کے ملکی وملی حقوق کے لیے اہم سنی مطالبات
[۲۰]عقیدہ خلافت راشدہ اور امامت
[۲۱]سنی عرضداشت
[۲۲]سنی، شیعہ متفقہ ترجمہ قرآن کا عظیم فتنہ
[۲۳]ایک غیر منصفانہ فیصلہ (سرکاری نصاب میں شیعہ دینیات کے فیصلے پر احتجاج)
[۲۴]یادگار حسین رضی اللہ عنہ
[۲۵]ایک خطرناک سازش
(شیعہ کے خودساختہ کلمہ کی کتب میں منظوری پر احتجاج)
[۲۶]مقدمه المطرقة الكرامة علىٰ مرأة الامامة
[۲۷]مقدمہ بر تحفۂ خلافت
[۲۸]عظمت صحابہ اور حضرت مدنی رحمہ اللہ

معاصرین ومشائخ کے نام مکاتیب

[۲۹]مکتوب مرغوب (بنام سید نور الحسن شاہ بخاری رحمہ اللہ)
[۳۰]احتجاجی مکتوب (بنام مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ)
[۳۱]اصلاحی مکتوب (بنام مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ)

رد مرزائیت

[۳۲]مقدمہ بر تازیانۂ عبرت
[۳۳]قادیانی دجل کا جواب
[۳۴]كشف التلبيس
[۳۵]اعجاز الحق بجواب اظہار الحق

رد خارجیت

[۳۶]خارجی فتنہ (حصہ اول) [مشاجرات صحابہ]
[۳۷]خارجی فتنہ (حصہ دوم) [فسق یزید]
[۳۸]کشف خارجیت
[۳۹]دفاع حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ

متفرق موضوعات

[۴۰]اکابر دار العلوم کا اجمالی تعارف (مقدمہ المہند علی المفند)
[۴۱]خدام اہل سنت کا شرعی منشور
[۴۲]تحفظ اسلام پارٹی کا انتخابی موقف
[۴۳]حضرت لاہوری فتنوں کے تعاقب میں
[۴۴]خدام اہل سنت کی دعوت

احمد مفتی

پیشِ لفظ

شریعت محمدیہ علیٰ صاحبها الف الف تحیۃ کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بلکہ معجزہ یہ ہے کہ یہ کسی بھی تغیر وتبدل سے محفوظ ہے۔ خود اِس کے نازل کرنے والے نے یہ وعدہ فرمایا ہے"انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحفظون "۔اور شارع علیہ السلام نے فرمایا:"قد ترکتکم علیٰ محجة بیضاء لیلها و نهارها سواء. "مفہوم: تمہیں ہدایت وکامیابی کی ایسی شاہراہ پر چھوڑ رہا ہوں جہاں دلائل و براہین کی روشنی جون جولائی کے بارہ بجے کے سورج سے زیادہ ہے۔ایسی روشنی میں ظاہر ہے نہ کوئی چیز چھپی رہتی ہے اور نہ کسی لٹیرے کا خطرہ ہوتا ہے۔

شریعت کی حفاظت امت محمدیہ کے لیے اللہ کا بہت بڑا انعام واحسان ہے۔امم سابقہ کی شرائع اور ادیان سماویہ کا حال دیکھنے سے اِس نعمت کی حقیقی قدردانی پیدا ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس وعدۂ خداوندی سے محروم ہونے کے باعث بے اطمینانی و بے یقینی کے کیسے کیسے اندھیروں میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ کتب محفوظ ہیں اور نہ ہی معانی ومفاہیم تغیر وتبدل کی دست برد سے بچ سکے۔جبکہ آج ایک عام سے عام مسلمان بھی پورے اطمینان کے ساتھ یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ خالقِ کائنات نے جو دین اپنے آخری پیغمبر پر نازل کیا تھا وہ بجمیع تفاصیلہ محفوظ ہے اور ہمارے پاس موجود ہے۔

حفظِ شریعت کے اِس وعدے کی عملی صورت یہ بنی کہ امتِ محمدیہ میں ایسے لوگ پیدا کیے گئے جنہوں نے شریعت کی ظاہری و باطنی، لفظی ومعنوی، صوری و حقیقی ہر طرح کی حفاظت کے لیے اپنی زندگیاں بلکہ نسلیں وقف کردیں۔ان بندگان خدا نے کسی مادی تحریک وترغیب کے بغیر محض رضائے الٰہی کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے اندرونی جذبے کے تحت پوری تندہی، جانفشانی اور اخلاص کے ساتھ شریعت کی حفاظت اور نشرواشاعت کا مبارک کام سرانجام دیا۔ اِس سلسلے میں ہونے والی کاوشوں کو دیکھ کر اگر یہ کہا

جائے کہ شریعت کے ایک ایک گوشے کی حفاظت ونقل پر کئی کئی زندگیاں اور زمانے صرف ہوئے ہیں تو یہ بالکل مبالغہ نہ ہوگا۔ سرسری استقراء سے اِن نفوسِ قدسیہ کو تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱......کتاب الٰہی کے حفاظ وقراء کا جلیل القدر طبقہ۔

۲......محدثین کرام کی باہمت جماعت۔

۳......فقہاء ومتکلمین عظام کا طبقہ۔

اِن میں سے اول الذکر دو طبقات نے شریعت کے ظاہر اور الفاظ کے ابلاغ وحفاظت کا فریضہ سرانجام دیا اور موخر الذکر نے اس کے مفاہیم ومعانی کی حفاظت کے لیے مساعی کیں۔ چنانچہ حفاظ نے کلامِ الٰہی کے ایک ایک لفظ کو ہو بہو اپنے سینوں پہ ثبت کیا۔ قراء نے اس کے ایک ایک لفظ کی صفات وخصوصیات کو محفوظ ومنتقل کیا، علماءِ رسم وضبط نے اس کے ایک ایک لفظ کی ظاہری صورت کو محفوظ ومنتقل کیا۔ یہ کاوشیں علم تجوید ورسم وغیرہ کی شکل میں محفوظ ہیں۔ دوسری طرف محدثین عظام نے اپنی مساعی کا محور ومرکز، خدا کے آخری پیغمبر وشارع علیہ السلام کی زندگی کو قرار دیا، اور آپ ﷺ کے ہر قول، فعل، تقریر وتصویب اور اداء کو بلا کم وکاست محفوظ کیا۔ پھر اس مجموعے میں سے متواتر، مشہور، حسن، صحیح، ضعیف اور موضوع الگ الگ چھانٹ کر امت کے سامنے رکھ دی۔ یہ کاوشیں کتبِ احادیث کی شکل میں امت کے پاس موجود ہیں۔

شریعت کے معانی ومفاہیم کی حفاظت اور نقل کا کٹھن فریضہ اللہ نے امت بلکہ انسانیت کے چنیدہ دماغوں یعنی فقہاء ومتکلمین سے لیا، جنھوں نے قرآن پاک کے معانی ومفاہیم کی حفاظت کی گرانقدر خدمت سرانجام دی۔ اور رسول اللہ ﷺ کے فرامین کے مطالب ومصادیق محفوظ کیے۔ ان کی کاوشیں علم عقائد اور اصول فقہ اور فقہ وغیرہ کی شکل میں موجود ہیں۔

تحریف اور انحراف:

کسی چیز کی حفاظت کے لیے جہاں اس کی اصل کو باقی رکھنا ضروری ہوتا ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بڑھ کر اہم یہ ہوتا ہے اس کی بیرونی خطرات واثرات سے حفاظت کی جائے۔ بحمداللہ اِن طبقاتِ امت نے حفظ شریعت کے اِن دونوں پہلوؤں کی علی وجہ الکمال رعایت کی۔ چنانچہ

اِن طبقات میں یہ جذبہ من جانب اللہ ودیعت کیا گیا کہ جوں ہی کسی بیرونی خطرے کی بومحسوس ہوئی، یہ طبقات اُس سے نمٹنے کے لیے خود بخود بغیر کسی ظاہری تحریک کے متحرک ہو گئے۔ اگر کوئی قرآن پاک کے الفاظ کی حفاظت میں گڑبڑ کا ارتکاب کرے تو اسے عالم اسلام کے کسی کونے میں، کسی گلی کی نکر پر ایک معصوم بچہ بھی گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنے کے لیے کافی ہے۔ اور اگر کسی نے فرامین نبوی ﷺ کے بارے میں ایسی جسارت کی کوشش کی تو محدثین کرام نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا اور نہ صرف یہ کہ اُس کے مذموم اِضافے کو باہر نکال کر رکھ دیا، بلکہ خود اس کو بھی وضاع، کذاب قرار دے کر حدیث کی دنیا سے ہی ایسا بلیک لسٹ کیا کہ قیامت تک اُس کا دامن اِس دھبے سے خلاصی نہیں پا سکتا۔ فقہاء و متکلمین نے یہ ذمہ داری نبھائی کہ انہوں نے شریعت کے معنوی حقائق اور مسلمات کی حفاظت کی اور جس کسی نے شریعت میں معنیٰ ومفاہیم اور تعبیر وتشریح میں اپنی من مانی کرنے کی کوشش کی، فوراً اُس کا ہاتھ روک لیا۔ اِس طرح شریعت کے الفاظ اور معنیٰ دونوں کی دونوں پہلوؤں سے پوری پوری حفاظت کا نظام اللہ جل شانہ نے بنایا اور فعال بھی کرایا۔ ظاہر شریعت میں گڑبڑ کی کوشش کو تحریف اور معنیٰ کی سطح پر ایسی کوشش کو انحراف کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فقہاء کا کام چونکہ زیادہ بیدار مغزی، اور احتیاط کا متقاضی ہونے کے ساتھ ساتھ راہ چلتی مخالفتوں کو مول لینے کے وجہ سے دشوار بھی ہے، اِس لیے ایسے اَرباب عزیمت کو زبان نبوت کی جانب سے پیشگی تسلی اور زبان نبوت سے آفریں بھی کہا گیا ہے۔ فرمایا:

"یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین"

اس علم کے حامل ہر آنے والی نسل میں سے عادل اور اہل لوگ ہوں گے۔ وہ لوگ اِس دین سے غالی لوگوں کی تحریف، اہل باطل کی بدعت سازی اور جاہل لوگوں کی من مانی تاویلوں کی آلائشوں کو دور کرتے رہیں گے۔"

فتویٰ یا مکالمہ؟

حاملین شریعت روزِ اوّل سے اپنی اِن ذمہ داریوں سے باخبر اور اِن کے تقاضوں پر عمل پیرا ہیں۔ تحریف کی مثالیں تو عموماً سامنے ہوتی ہیں، البتہ انحراف کے حوالے سے کچھ تفصیل کرنا ضروری ہے۔ اگر امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ ماضی پر نظر ڈالی جائے تو خیر القرون یعنی صحابہ وتابعین کے زمانے سے

ے کر اِن ساعات تک کسی بھی زمانے کے اہل علم اپنی اِس ذمہ داری سے غافل نہیں ہوئے، اور جب بھی دین کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے کوئی انحراف، اور مسلمات سے تجاوز اور کج روی سامنے آئی فوراً اہل علم نے اُس کا سختی سے نوٹس لیا اور ایسے انحراف کے سے نمٹنے کے لیے متعدد جہتوں میں کام کیا گیا۔ ایک تو اُس کج روی کے شکار کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی، اُس کے جھوٹے سچے دلائل اور مغالطات کا جواب دیا گیا، دوسرے اُس کے نظریے کی حقیقت اور حیثیت کا بے لاگ تعین کیا گیا کہ یہ نظریہ شریعت سے کتنا دُور اور کتنا متصادم ہے، اور تیسرے مرحلے میں اُس نظریے کی سرکوبی کی کوشش کی گئی۔ پہلی کاوش کو آپ دعوت اور مناظرہ کہہ سکتے ہیں اور دوسرے مرحلے کو فتویٰ اور تیسرے کو محاسبہ کا نام دیا جا سکتا۔ امت کی مسلمہ روایت سے اِنحراف کرنے والے لوگوں کے ساتھ یہ سب کام کیے گئے ہیں، اور یہ طرزِ عمل بذات خود امت کی روایت کا حصہ ہے۔ اِس کے برعکس موجودہ زمانے میں بعض لوگ منحرف لوگوں کی بے جا طرفداری میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ مکالمہ ہونا چاہیے، فتویٰ نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مولانا زاہد الراشدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''کیا گمراہی کی طرف جانے والوں کو جانے دینے کی بجائے واپس لانے کی کوشش زیادہ بہتر حکمت عملی نہیں؟ تاریخ کے طالب علم کے طور پر میرے ذہن میں ایک بات مسلسل اٹکی ہوئی ہے کہ واصل بن عطا کو اگر امام التابعین حضرت حسن بصریؒ کی بجائے حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میسر آجاتی اور بحث مباحثہ کا کھلا ماحول مل جاتا تو شاید اعتزل عنا کی نوبت نہ آتی، جبکہ ہم نے اپنے دور میں اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ غلام احمد پرویز کو فتووں کا سامنا تھا، اِس لیے دوسری طرف لڑھک گئے جبکہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم کو براہ راست فتوے کی بجائے کسی حد تک مکالمہ کا ماحول میسر آگیا تو رجوع کی صورت بن گئی۔'' [الشریعہ۔ دسمبر ۲۰۱۴ مکاتیب]

لیکن اِس بارے میں انتہائی اَدب سے گذارش ہے کہ اِن حضرات کی اپنی رائے جو بھی ہو اُس کی بنیاد اِن کے ذاتی ذوق اور وجدان پر تو ہو سکتی ہے' اُمت کی مجموعی علمی روایت کا مطالعہ اس کا ساتھ دیتا نظر نہیں آتا۔ دُور نہ جایئے! خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ جن کی علمی اَبحاث اور مجالس کی کھلی آزادی اور گرم بحث کا' بے نتیجہ مکالمے کو سہارا دیا جاتا ہے، اور مولانا نے اُن کو اپنی مکالمے کی پالیسی میں آئیڈیل قرار دیا ہے، خود اُن کی

مجلس میں جب جہم بن صفوان آیا اور ''مکالمہ'' کیا تو ''مکالمہ'' درج ذیل الفاظ پر منتج ہوا:

أخرج عني يا كافر۔[اصول بزدوی مع کشف الاسرار:۱؍۴۴، قدیمی کتب خانہ، کراچی]

اور ایسا ہی مکالمہ آج بھی اہلِ حق علماء کرتے ہیں۔ اِمام صاحب کا یہ طرز فتویٰ نہیں تو اور کیا ہے؟ بلکہ حضرت حسن بصری نے تو واصل بن عطاء کے لیے پھر بھی نسبتاً بہت نرم اَلفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ اِمام صاحب تو اِس فتوے میں ''جذباتی'' بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اِس لیے یہ کہنا کہ علمائے اُمت لاحاصل مکالمہ کیا کرتے تھے یا اُمت کے علماء میں فتوے اور مکالمے کے دونوں رویے رہے ہیں، حقائق سے چشم پوشی ہے۔

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اُمت کے اجتماعی دھارے سے اَلگ ہونے والے لوگوں کے اختلاف اور انحراف کو کبھی بھی ہلکے اَنداز میں نہیں لیا گیا اور نہ ہی اُس پر اِس طرح کے لاحاصل مکالموں کا بازار گرم کیا گیا ہے، بلکہ اِس کے بجائے اُمت کی علمی روایت میں اختلاف کو اُصولی اور فروعی کے عنوان سے الگ الگ خانوں میں تقسیم (Categorize) کیا گیا ہے۔ اول الذکر میں اختلاف کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اُسی میں مکالمہ اور آزادانہ مباحثہ کیا گیا ہے جس کی ایک مثال امام صاحب کی فقہی مجلس ہے۔ بلکہ ہر استاد کا حلقہ درس اِس کی مثال ہوسکتا ہے، جبکہ ثانی الذکر میں نہ تو اختلاف کا حق دیا گیا ہے اور نہ ہی اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا گیا۔ ہاں اگر کسی نے کر ہی لیا تو اسے اختلاف کی بجائے خلاف کا عنوان دیا گیا اور اس کے ساتھ طرزِ عمل مساویانہ رائے کا نہیں اپنایا گیا بلکہ اسے ایک ناسور سمجھا گیا اور اس کی اصلاح یا سرجری کے ذریعے اسے جسم سے الگ کرنے کی سعی کی گئی۔ مرض کے متعدی یا لازمی ہونے کی بنیاد پر یا نوعیت کے لحاظ سے ایسے اصولی اختلاف کے حامل لوگوں کے ساتھ باہم دگر طرزِ عمل مختلف تو ہوسکتا ہے، لیکن مجموعی طور پر ایسے اختلاف کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کیا گیا اور نہ ہی اسے ہر کس و ناکس کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اور ایسے اختلاف کرنے والوں کی واقعی حیثیت کو فتوے کی اصطلاح میں نہ سہی اِسی حقیقت میں ضرور واضح کیا گیا ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ سے خوارج اور قدریہ کے بارے میں جو روایات منقول ہیں اُن کی حقیقت فتویٰ ہی کی تو ہے۔ پھر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ''مسلم شریف'' میں قدریہ کے نام جو پیغام ہے وہ بھی فتویٰ ہی ہے، بلکہ اِس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اُن کا سوشل بائیکاٹ بھی ہے۔ اِسی طرح سیدہ عائشہؓ کا ایک سائلہ کو یہ کہنا: أحرورية أنت؟ پھر سیدنا حسن بصری رضی اللہ عنہ نے واصل بن عطا کے بارے میں فرمایا: ''اعتزل عنا'' یہ بھی فتویٰ ہے۔ اور خود امام صاحب کا زوردار فتویٰ تو ہے ہی۔

یہ تو چند مثالیں ہیں جو کسی تتبع کے بغیر نوک قلم پر آ گئی ہیں، اگر تلاش کی جائیں تو خود خیر القرون سے اِس کی چند نہیں سیکڑوں نہیں تو بیسیوں مثالیں تو مل ہی جائیں گی، جس سے یہ واضح طور سے معلوم ہوگا کہ اُمت کے اجتماعی دھارے سے الگ ہونے والے اور مسلمات سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ مناظرہ اور پھر اتمام حجت پر ان کا حکم واضح کر دیا گیا، جو آج کل کی اصطلاح میں فتویٰ ہی ہے۔ اِس سے اگر کوئی چیں بجبیں ہو تو اُسے اِس روایت کا بندوبست پہلے سوچنا چاہیے۔

خیر القرون کے بعد جب علوم وفنون مرتب کتابی شکل میں آئے ہیں یہاں سینکڑوں نہیں تو درجنوں مثالیں ایسی مل جائیں گے جن میں کسی گمراہ کی گمراہی پر فتویٰ لگایا گیا ہے۔ خود کتب فقہ میں اَلفاظِ تکفیر کے عنوان سے پورے پورے ابواب ہیں۔ ماضی قریب میں آ جائیں تو علماء دیوبند (جن سے اِس اَخیر زمانے میں علوم کی حفاظت وترویج اور دین کی حقیقی شکل وصورت کی حفاظت کا اللہ نے بلاشبہ عظیم کام لیا ہے، ان) کا طرزِ عمل دیکھ لیں۔ جب بھی کوئی گمراہ اپنی گمراہی لایا، اُس کے ساتھ بات چیت بھی ہوئی، لیکن عوام الناس کے سامنے اُس کی حیثیت واضح کرنے کے لیے دوٹوک انداز میں فتویٰ بھی دیا گیا۔

مرزا قادیانی کے ساتھ مناظرہ کے لیے احتساب قادیانیت کی **60** جلدیں بھی ہیں، اور فتویٰ بھی اور اِس فتویٰ کی تو ہماری پارلیمنٹ نے بھی تائید کی ہے۔ اِسی طرح شیعہ کے بارے میں مقید یا مطلق فتویٰ ہر دار الافتاء سے جاری ہوتا ہے۔ پرویز سے مکالمہ بھی ہوا لیکن فتویٰ بھی لگایا گیا، حمید الدین مشرقی کا حکم واضح کیا گیا۔ حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی نے مکتوبات وغیرہ میں جماعت اسلامی کا جس طرح محاسبہ کیا ہے اُس پر کسی دار الافتاء کی مہر نہ سہی لیکن وہ اپنی حقیقت میں ایک فتوی ہی ہے۔ تھانہ بھون سے حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی حیات میں شبلی نعمانی اور غامدی صاحب کے امام حمید الدین فراہی کے خلاف فتوی دیا گیا۔ اور فی زمانہ ابنائے دار العلوم کی طرف سے انحراف کے سکہ رائج الوقت غامدی صاحب کی نسبت بھی دونوں طرح کا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ پاکستان کے تقریباً ہر اہم دار الافتاء اور ادارے نے غامدی افکار کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ باقی جامعات تو ایک طرف خود جامعہ دار العلوم کراچی سے غامدی صاحب کے مایہ ناز شاگرد عمار خان ناصر صاحب کے خلاف تجدد پسند ہونے کا فتویٰ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کے دستخطوں سے جاری ہو چکا ہے، جس پر عمار خان صاحب کو دُکھ بھی ہے کہ فتوے کی بجائے میرے ساتھ مکالمے کی پانی میں مدہانی کیوں نہیں ڈالی گئی۔

اِن لوگوں کے فتوی سے بدکنے اور مکالمے کی رٹ لگانے کی وجہ شاید یہ ہے کہ فتوٰی دراصل فوری اور حتمی فیصلہ ہوتا ہے، اور متجددین کی ہر مجرم کی طرح یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہمارا کیس لٹکتا رہے اور فیصلے وسزاء کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور اِن کا مکالمہ تو ایسا بے نتیجہ کام ہے جیسے پاکستان میں کسی واقعے پر کمیشن بنا دینا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اِس زمانے کے عام الناس کی نفسیات اِس لفظ سے بدکتی ہیں تو یہ بات بھی حقیقت سے بعید ہے، کیونکہ فتوٰی سے بدکنے والی نفسیات صرف اِس زمانے میں تھوڑی سامنے آئی ہیں، یہ تو ہر گمراہ کی نفسیات رہی ہیں اور اُس نے اپنے بچاؤ کے لیے عوام میں فتوے کی بے وقعتی کا ڈھنڈورا پیٹا ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی (کسی کو گمراہ یا) کافر بناتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مولوی کافر (یا گمراہ) بناتے نہیں، صرف بتاتے ہیں، کافر (یا گمراہ) تو وہ خود اپنے عمل سے ہوا ہے''۔ (گویا مولوی بیچارہ تو ٹیسٹ لیبارٹری کی طرح ہے جو بیماری کا رزلٹ دیتی ہے، اگر کسی مریض کو لیبارٹری ہیپاٹائیٹس یا سرطان کی رپورٹ جاری کرے تو مریض کیا لیبارٹری سے لڑے گا کہ تو نے مجھے کینسر بنایا ہے؟!)

آپ کے ہاتھوں میں موجود یہ کاوش بھی ہماری علمی روایت کا تسلسل اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، کیونکہ یہ روایت سے منحرف اور تحریف معنوی کے مرتکب ایک متجدد اور گمراہ صاحب کے اُفکار ونظریات پر مکالمہ اور محاسبہ کے ساتھ ساتھ، اُس پر فتوٰی بھی ہے۔ اور یہ بات بغیر کسی لگی لپٹی کے سامنے رہنی چاہیے کہ ہم اپنی تسلسل پر مبنی علمی روایت کی روشنی میں گمراہ افراد وفرقوں کے بارے میں مناظرہ، اور فتوٰی کے اصول پر علیٰ وجہ البصیرت قائم ہیں۔ ہمیں اِس کام میں متجددین کے طعنوں سے کوئی عار ہچکچاہٹ اور جھجک نہیں، یہ لوگ فتوے اور دارالافتاءوں لاکھ تمسخر اڑائیں لیکن اہلِ علم اپنی روش پر شرح صدر کے ساتھ قائم ہیں اور اِن شاء اللہ رہیں گے۔ جو کام ہماری علمی روایت کا حصہ ہے، ہمارے اُصول کے مطابق اور پہلے ہمارے متقدمین و معتبر اہلِ علم وفضل کرتے آئے ہیں اُس میں کسی شرم ساری یا بایدو شاید کرنے اور معذرت خواہانہ اَنداز اپنانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ شرم ساری تو اُن کو ہونی چاہیے جو کھلے بندوں امت مسلمہ کے علمی مسلمات کو پامال کرتے ہیں اور پھر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا انتساب بھی امت کی اکثریت کے ساتھ رکھنے

کے دعویدار ہیں۔

آخر میں غامدی صاحب اور اُن کے ہمنواؤں سے بھی گذارش ہے کہ اہل حق علماء کو آپ کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں، نہ آپ کی ترقیوں اور عہدوں سے کسی قسم کی کوئی جلن یا حسد ہے، بحمد اللہ علمائے ربانیین اِس قسم کے جذبات سے کوسوں دُور ہوتے ہیں۔ مسئلہ صرف آپ کے اَفکار ونظریات کا ہے اور وہ بھی وہ جن میں آپ لوگ خود کو معصوم اور امت کو خطا پر سمجھتے ہیں۔ آپ حضرات ٹھنڈے دل سے تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے اُفکار پر غور فرمائیں اور اِن صفحات میں پیش آمدہ معروضات پر بھی غور فرمالیں

ع شاید کہ اتر جائے ترے دل میں کوئی بات

البتہ یہ چیز تو سامنے کی ہے کہ خاص نمبر چونکہ بہت سے اَرباب قلم کی کاوشوں کا گلدستہ ہوتا ہے اور ''ہر گلے را بوئے دیگر است''، اِس لیے یقیناً بعض اہل قلم کا اُن کے جذبات کے پیش نظر انداز سخت بھی ہوگا اور اِس سختی کے معتد بہ نمونے خود آپ کی اور آپ کے مکتب فکر کی تحریروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز قبول حق سے مانع نہیں۔ خصوصاً جبکہ آپ کے مکتب فکر کا دعوی ہی دلیل اور صرف دلیل کے معیار وحید ہونے کا ہے۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت.

☆......☆......☆......☆

پیامِ صفدر

احسن خدامی

نشانِ منزل

نحمده و نصلي علی رسوله الکریم، أما بعد......!

ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد اللہ جل شانہ کے فضل و کرم اور اس کی توفیق سے ''مجلّہ صفدر'' کے ''فتنۂ غامدی نمبر'' کی پہلی جلد برادرانِ اہل السنۃ والجماعۃ کی خدمت میں پیش ہے۔اپنی منزل کے ایک سنگِ میل تک پہنچنے کے بعد جب ہم پیچھے مڑ کر مشکلات کی سنگلاخ وادیوں، صبر و انتظار کی کٹھن راہوں، بے سروسامانی کے صحراؤں اور بے دست و پائی کے تلخ لمحوں کی طرف دیکھتے ہیں تو بے اختیار تشکر و امتنان کے آنسو بہنے لگتے ہیں اور جسم کا رواں رواں اس کریم مالک کے شکر کے بے پایاں جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے جس کے خاص فضل و رحمت، اس کی دست گیری اور اس کی مدد ہی سے ہمارے لیے اس کٹھن سفر کو طے کرنا ممکن ہوا۔

''فتنۂ غامدی نمبر'' آپ کے سامنے ہے، اور آپ کے جذبۂ شوق کا منتظر۔اس کی تیاری و تکمیل کہنے کو تو ہم بے نواؤں کے ہاتھ سے ہوئی، لیکن درحقیقت اس میں بہت سے اہلِ علم کا خونِ جگر، اہلِ قلم کی شبانہ روز محنتیں، اہلِ دل کے نالہ ہائے نیم شب، اہلِ محبت کی محبتیں، اور ان گنت و بے شمار احباب کی بے چینی، بے قراری، جذبہ و شوق اور تمنائیں شامل ہیں۔کتنے ہی لوگ اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر راتوں کو جاگ کر غامدیت کے گمراہ کن فتنہ سے امت کو بچانے کی خاطر دماغ سوزی کرتے رہے، کتنے ہی اللہ والوں کے آنسوؤں نے اس کی کامیابی کی خاطر شب کی تنہائیوں میں سجدہ گاہوں کو تر کیا، کتنے ہی مخلص اور دردمند احباب کے قیمتی مشورے قدم قدم پر راہنمائی کا باعث ہوئے، کتنی ہی ہچکیاں اور سسکیاں آسمانوں پر پہنچ کر اس کی قبولیت کے لیے فریاد کناں ہوئیں، کتنے ہی اکابر کی شفقتیں، تھپکیاں اور دعائیں بار بار ولولوں کو مہمیز دیتی رہیں، کتنے ہی دوست بار بار اس کی اشاعت کے بارے میں استفسار کر کے بے چینی و شوق کا احساس دلاتے رہے، تب جا کر یہ گلدستہ برادرانِ اہل السنۃ والجماعۃ کی خدمت میں پیش کیا جا سکا۔

اِس میں کوئی شک نہیں، کہ جس طرح بہت سے مخلص احباب کا ہمہ قسم تعاون ہمارے لیے زادِ راہ رہا، اِسی طرح راستے کے کچھ کانٹوں، کچھ اَن دیکھی رکاوٹوں سے بھی وقتاً فوقتاً واسطہ پڑتا رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ راہِ وفا میں بکھرے اِن چند کانٹوں سے' محبت و اخلاص کے وہ پھول کہیں زیادہ تھے جو

جا بجا مشامِ جاں کو معطر کرتے رہے

وہ سنگریزے عداوتوں کے، یہ آبگینے سخاوتوں کے
دلِ مسافر قبول کرلے، ملا ہے جو کچھ جہاں جہاں سے

یہ دنیا اَزل سے خیر وشر کی آماجگاہ ہے اور اللہ جل شانہ کی حکمت اِسی میں ہے کہ تا قیامِ قیامت خیر وشر، کفر و اِسلام اور نور وظلمت کا یہ معرکہ برابر جاری وساری رہے۔ اِس لیے جس طرح اِس کارخانہ رنگ وبو میں نور کے مینار ہر زمانے میں روشنی پھیلاتے رہے، اِسی طرح ظلمتوں کے سوداگر بھی اپنی اپنی گمراہیوں کی دوکانیں چمکا کر اِنسانیت کو ضلال کے گڑھے میں گرانے کی اپنی سی کوششیں ہمیشہ ہی کرتے رہے۔ باطل ہمیشہ دلائل وبراہین کے میدان میں حق کے سامنے بے دست و پا ہوتا ہے، اور اُس میں کبھی یہ سکت نہیں ہوتی کہ وہ اہلِ حق کے سامنے مقابلہ کے میدان میں ٹھہر سکے، تاہم چونکہ اللہ جل شانہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ اِس دنیائے ہست و بود میں حق و باطل، دونوں کا وجود باقی رہے، اِس لیے جب بھی کوئی باطل اُٹھتا ہے تو تکوینی حکمتوں کے تحت اولاً اُسے ڈھیل دی جاتی ہے، وہ اپنے پر پرزے پھیلاتا ہے، اپنی دھماچوکڑی مچاتا ہے، اپنا فساد جی بھر کے پھیلاتا ہے، اُس کی رسی دراز کردی جاتی ہے اور اُسے اپنے ارمان پورے کرنے کا خوب موقع دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اللہ جل شانہ اُس کی رسی کھینچنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اپنے بندوں میں سے ہی کچھ کو اُس کے مقابل کھڑا کردیتے ہیں، خیر وشر کا معرکہ گرم ہوجاتا ہے، چنگاریاں اُڑنے لگتی ہیں، پھر باطل کی طنابیں کھینچ دی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ اُس کا ہوائی وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے، حق اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اُسی طرح باقی رہتا ہے جیسے چودہ سو سال پہلے تھا، اور شیطان لعین اپنے کچھ کارندوں کی شکست کے بعد نئے کارندوں کو نیا مشن سونپنے کے مشن پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔

غامدی فتنہ بھی اِس وقت کا ایک خطرناک فتنہ ہے، جس کا مقصد ومنشور یہ ہے کہ تقریباً ایک صدی تک مسلمانوں کے سیاسی نظام، یعنی نظامِ خلافتِ راشدہ کے تعطل کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں میں اس کی بحالی کے لیے جو بے چینی اور بے قراری پھیل رہی ہے، اس کا مناسب سدِّباب کرکے انگریزی وغیر اسلامی نظام ہی کو اسلامی نظام ثابت کرکے مسلمانوں کو اسی کے ساتھ چمٹے رہنے کی پرزور دعوت دی جائے۔ ماضی کے فتنوں کی طرح اِس فتنہ کے ہاتھ میں بھی چالاکی، مکاری، ہاتھ کی صفائی اور مغالطہ آمیزی کے چند داؤ ہیں جن کی بدولت یہ مسلمانوں کی فکری دنیا پر حکمرانی کے سہانے خواب دیکھ رہا ہے۔ اپنے آپ کو کسی فرقے یا جماعت کے روپ میں پیش کرنے، اور اپنی پہچان وشناخت کی تشہیر کے

بجائے اپنے افکار و نظریات کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی تگ و دو کرنا، اِسی طرح اہل حق کے عقائد و نظریات کی پرزور تردید کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیات کو براہِ راست نشانہ بنانے سے گریز کرنا، بلکہ ضرورت پڑے تو اُن کی ذومعنی سے الفاظ میں تعریف بھی کر دینا، اپنے باطل نظریات کو واضح اور صاف انداز میں پیش کرنے کے بجائے مبہم قسم کا انداز اختیار کرنا، یہ غامدی فرقے کے کام کا بنیادی طریقہ کار ہے، اپنے نظریات کو تقیے کی بھول بھلیوں میں چھپا کر پیش کرنے کی بناء پر اِس فرقے کو بھی پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا اپنے نام اور جماعت کی تشہیر نہ کرنے، اکابر اہلِ حق کو براہِ راست نشانہ نہ بنانے اور حسبِ خواہش و حسبِ موقع اُن کے حوالہ جات سے من مانا استدلال کرنے کی بناء پر اِس فتنہ نے اہل حق کی صفوں میں بھی کافی حد تک سرایت کرنے میں کامیابی حاصل کی، تاہم فریب فریب ہی ہوتا ہے، اور اس کے ذریعے ہمیشہ لوگوں کو اندھیرے میں نہیں رکھا جا سکتا، دیگر فتنوں کی طرح اِس فتنہ کو بھی من جانب اللہ کچھ عرصہ کے لیے ڈھیل ملی، اِسی طرح کچھ عرصہ بعد اِس فتنے کا نام ونشان بھی باذن اللہ تعالیٰ ختم ہو جانے والا ہے، اِن شاء اللہ......"و اما الزبد فیذھب جفاء، واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض......"

ناسپاسی ہوگی کہ اِس موقع پر اپنے شیخ ومرشد، اپنے مربی وسرپرست، باغبانِ آستانۂ مظہری، حضرتِ اقدس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سومرو دامت برکاتہم (خلیفۂ مجاز قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ) کا ذکر نہ کیا جائے، حقیری کاوش، درحقیقت حضرت اقدس مدظلہ ہی کی توجہات، شفقت، اور برکت کا نتیجہ ہے، اللہ جل شانہ کی رحمت کے بعد، حضرت اقدس کی دعاؤں، آپ کی راہنمائی، آپ کی لحہ بہ لحہ حوصلہ افزائی ہی اِن اُوراقِ پریشان کو منصۂ شہود پر لانے کا باعث بنی، اللہ جل شانہ حضرت اقدس کی زندگی میں عظیم برکت عطاء فرمائیں، ہمیں ان کے انفاس قدسیہ سے استفادہ کی توفیق عطاء فرمائیں اور ان کی شفقت کی بہترین جزاء انہیں اپنی بارگاہ سے عنایت فرمائیں۔ آمین

ضروری ہے کہ "من لم یشکر الناس، لم یشکر اللہ" کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیگر احباب، جو دن رات ایک کر کے اس کام کی تیاری میں مشغول رہے، اُن کا بھی شکریہ ادا کیا جائے۔ سب سے اول تو ہزار شکریہ کے قابل وہ حضرات اہل علم واہل قلم ہیں جن کی تحریرات اِس خاص نمبر کی زینت بنیں، یہ خاص نمبر اُن میں سے ہر ایک کی محنت دکاوش کا رہینِ منت ہے۔ علاوہ ازیں انتظامی امور میں بھی متعدد محسنین نے تعاون فرمایا، جناب ماسٹر منظور صاحب نے پورے خاص نمبر کی پروف خوانی کا کٹھن کام انتہائی کم وقت میں بخوبی انجام دیا، مجلہ صفدر کے ناظم ترسیل بھائی عبدالغفور صاحب کی مسلسل بھاگ دوڑ اور

جانفشانی سے اِس کی اشاعت وترسیل کے مراحل ممکن ہوئے، محترم جناب درویش صاحب، محترم جناب حضرت مولانا عبدالرحیم چاریاری صاحب، اور دیگر بہت سے بزرگوں اور احباب کا تعاون شامل رہا، اللہ پاک اِن سب کو، اور اِس خاص نمبر کی تیاری میں کسی بھی قسم کا تعاون کرنے والے سب احباب کو بہت ہی جزائے خیر عطاء فرمائیں، اللہ پاک سب کو دنیا وآخرت کی بھلائیاں اور کامیابیاں نصیب فرمائیں۔

مجلّہ ''صفدر'' کا فتنۂ غامدی نمبر محض صفحات کا ایک مجموعہ اور کاغذوں کا ایک پلندہ نہیں ہے، یہ بہت سے اہل علم کی دماغ سوزی، بہت سے اہل دل کے درِدِل اور بہت سے اہل محبت کی محبتوں کی مجسم صورت ہے، یہ اب آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے، یقیناً اِس کا حق اور اِس کی قدر کا طریقہ یہی ہے کہ اِس کی دعوت کو دل کے نہاں خانوں میں اُتار کر اسے گلی گلی، کوچہ کوچہ عام کیا جائے، غامدیت اور ہر باطل کے زہر سے خود کو محفوظ رکھنے کے علاوہ ہر مسلمان کو اِس ایمان سوز فتنے سے بچانے اور اِس کی ضلالت کو سمجھانے کی کوشش کی جائے، یہ ایک دعوت، ایک پیغام ہے، صرف آپ کے لیے نہیں، آپ کے احباب کے لیے بھی اور ہر مسلمان کے لیے بھی......! اگر آپ اِس کی دعوت کو پھیلانے کے لیے خود کو تیار پاتے ہیں، اور اِس باطل کی سرکوبی کے لیے ہمارے ہم قدم چلنے پر آمادہ ہیں تو وہ وقت دور نہیں کہ اللہ جل شانہ کی رحمت سے یہ فتنہ بھی اپنی موت آپ مر کر تاریخ کا حصہ بن جائے۔

اے اللہ......! اے زمین وآسمان کے مالک......! ہم تیرے نادان وگناہگار بندے...... محض تیرے دین کی نصرت کی خاطر یہ حقیری کاوش لے کر تیرے دربار میں حاضر ہوئے ہیں...... یا اللہ......! تیری رضا اور خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب نہیں...... اگر ساری دنیا راضی ہو جائے اور تیری بارگاہ میں یہ ٹوٹی پھوٹی کاوش درجۂ قبولیت نہ پاسکے تو یقیناً ہم خائب وخاسر اور نامراد ٹھہریں گے......اور اگر ساری دنیا اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دے...... مگر تیری جناب میں اسے درجۂ قبولیت نصیب ہو جائے تو اے مالک......! یہ ہم بے نواؤں پر تیرا بے پایاں احسان ہوگا اور اس کے بعد اپنی اس حقیری کاوش کے کسی اور بدلے کی ہمیں تمنا نہ رہے گی...... یارب العالمین......! ہماری بے نوائی، ہماری نادانی اور بے دست وپائی پر رحم فرما......! اس دنیا پر چھائے الحاد وکفر کی ظلمتوں کو دور فرما کر ہمیں طلوع صبح کا نورانی نظارہ دکھادے......! وہی صبح جو فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوئی تھی اور جس کی چکاچوند سے قیصر وکسریٰ کے محلات روشن ہو گئے تھے......! إنک سمیع قریب مجیب الدعوات...... إنک علی کل شیء قدیر...... و صلی اللہ وسلم علی خیر خلقه سیدنا محمد و علی آله و أصحابه أجمعین......!

☆......☆......☆......☆

عرض خادم

مرتب کے قلم سے

مجلّہ صفدر کے ''فتنہ غامدی نمبر'' کی پہلی جلد

۹۔۱۰؍ماہ کے طویل انتظار اور ۳۔۴؍ماہ کی جہدِ مسلسل کے بعد بحمد اللہ تعالیٰ ''فتنہ غامدی نمبر'' کی جلد اول طباعت کے لیے تیار ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اِس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور غامدی صاحب، اُن کے تلامذہ و متعلقین کے لیے ذریعہ ہدایت اور تمام مسلمانوں کے لیے نافع ومفید بنائے۔ آمین

☆......☆......☆......☆

گزشتہ سال اپنے محترم اور محبوب دوست مولانا ندیم الرشید صاحب کے ہمراہ محترم جناب ڈاکٹر خالد جامعی صاحب کے پاس جانے کا اتفاق ہوا، اثنائے گفتگو جامعی صاحب نے کہا:

''آپ ''صفدر'' کی طرف سے ''غامدی نمبر'' شائع کریں۔ مواد ہم آپ کو مہیا کریں گے۔''

اُس وقت تو بندہ خاموش رہا، بعد میں غور وفکر سے جامعی صاحب کی تجویز معقول بلکہ وقت کی اہم ضرورت معلوم ہوئی۔ چنانچہ انتظامیۂ مجلّہ کی مشاورت سے اِشاعت خاص کا عزم کرلیا۔ اگرچہ جامعی صاحب نے مضامین کے سلسلے میں بھرپور بلکہ مکمل تعاون کا وعدہ کیا تھا، (جسے انھوں نے بہت عمدہ طریقے سے پورا بھی کیا۔) لیکن صرف جامعی صاحب پر انحصار کرنے کے بجائے دیگر اہل علم حضرات سے مضامین لکھوانا مناسب معلوم ہوا۔ سو یہ عزم کر کے کمربستہ ہوگیا، کام دشوار اور بہت دشوار تھا۔ انتظامیہ صفدر کے علاوہ بھی مختلف احباب سے مشاورت رہی، مولانا رضوان عزیز صاحب کا مشورہ بہت معقول ثابت ہوا کہ:

''مضامین نگار حضرات سے مطلقاً کہنے کے بجائے موضوع متعین کر کے ہر ایک سے مقالہ لکھوائیں، اِس طرح عمدہ چیز سامنے آئے گی۔ اِن شاء اللہ''

اِس مفید اور کارآمد مشورے کے نتیجے میں نہایت شاندار اور جاندار اَنداز میں یہ خاص نمبر تیار ہوسکا۔ اور مفتی شعیب احمد صاحب کا مشورہ بھی کچھ کم نہیں تھا کہ:

''پہلے خود غامدی صاحب کی کم از کم تین کتب میزان، برہان اور مقامات کو نظر سے گزار لیا جائے۔ اشراق کے کچھ شمارے ہاتھ لگ جائیں تو اُن کو بھی دیکھ لیا جائے۔''

اِس مشورے پر عمل کا فائدہ یہ ہوا کہ جناب غامدی صاحب کی علمیت کے بے جا شہرے کی وجہ سے جو رُعب سا تھا وہ سب ہَوا ہوگیا اور غامدی غبارے کی ہوا مکمل طور پر خارج ہو کر اُس کا ہَوّا نیست

ونابود ہوگیا۔ چنانچہ اپنے ناقص فہم کی روشنی میں پہلے موضوعات پھر اہلِ علم وقلم کی فہرست بنا کر بعد از مشاورت درجِ ذیل عریضے سے ملتا جلتا خط متعدد علماء کی خدمت میں ارسال کیا گیا:'

باسمہ تعالیٰ

از: مجلّہ صفدر

محترم ومکرم حضرت مولانا..............................صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج شریف؟

بعدہٗ! جیسا کہ آنجناب کے علم میں ہے کہ جوں جوں اکابرِ اہلِ سنت کا سایہ ہمارے سروں سے اُٹھتا جارہا ہے، فتنوں کی تعداد میں روز بروز اِضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اور ہماری نئی نسل رفتہ رفتہ اَسلافِ دیوبند سے دُور ہونے کی بنا پر نہایت آسانی سے فتنوں کا شکار ہورہی ہے۔ اللہ پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

اِس صورتِ حال میں اِس بات کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ہر اسٹیج اور ہر پلیٹ فارم سے ہر فتنے کا بھرپور تعاقب کیا جائے اور اجتماعی طور پر منظم انداز میں کیا جائے، تاکہ باطل کو مزید پنپنے کا موقع نہ مل سکے۔ ایک بہت بڑا مسئلہ ''مصلحت'' اور ''رواداری'' کا ہمیں درپیش ہے، جب بھی کسی فتنے کی گمراہی کو واضح کیا جائے یا کسی گمراہ کی ضلالت سے عوام الناس کو آگاہ کیا جائے تو فوراً ''اختلافِ رائے اور اس کے آداب، اختلاف کی حدود، صبر وتحمل، رسول اللہ ﷺ وصحابہؓ کی بردباری، برداشت، ایک دوسرے کا احترام'' اور اس جیسے خوبصورت عنوانات پر مشتمل نہایت زہریلے مضامین کے ذریعے اہلِ حق کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور درحقیقت باطل کو پر پرزے پھیلانے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دورِ حاضر کے منکرِ حدیث، پرویزِ وقت، مودودیٔ زمانہ جاوید احمد غامدی اور اس کے ہم فکر لوگ ہمارے اہلِ سنت دیوبند کے مدارس کی جڑوں میں اپنا زہر پہنچا چکے ہیں۔ اور ہمارے اُن اسلاف کی اولادیں جن کو ربِ کائنات نے اِن فتنوں کے خلاف سدِ سکندری بنایا تھا، آج جاوید غامدی جیسے متجدد کی گود میں جا پڑی ہیں۔

اِس لیے اِس بات کی شدت سے ضرورت سمجھی گئی کہ جاوید غامدی کے باطل اَفکار ونظریات کا علمی وتحقیقی محاسبہ نہایت مضبوط اور منظم انداز میں کیا جائے اور اہلِ سنت عوام کو ان کی فریب کاریوں سے آگاہ کرکے ان کا شکار ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

امام اہلِ سنت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اور قائد اہلِ سنت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ کے اَفکار ونظریات کے ترجمان ''مجلّہ صفدر'' نے اِس کارِ خیر کے لیے...... ''افکارِ غامدی نمبر''...... کی اِشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اکیلے ''صفدر'' کا نہیں، بلکہ ہم سب کا مشترکہ کام ہے۔

اگر توفیق باری اور آپ حضرات کا قلمی وعلمی تعاون شامل حال رہا تو ان شاء اللہ جلد ہی اِس خطرناک فتنہ کے سدباب کی مضبوط اینٹ کے طور پر مجلّہ صفدر کا یہ خاص نمبر شائع ہو کر منظر عام پر آ جائے گا۔

اس سلسلہ میں بعد از مشاورت یہ طے پایا ہے کہ فہرست بنا کر مختلف اہل علم وقلم میں موضاعات تقسیم کر دیئے جائیں، تا کہ ہر ایک اپنے موضوع پر جامع مقالہ تیار کر سکے۔ اِس طرح تکرار کم سے کم اور نافعیت زیادہ سے زیادہ ہوگی۔ ان شاء اللہ

عنوانات کی فہرست پیش خدمت ہے۔ آنجناب سے درخواست ہے جس عنوان پر ممکن ہو سکے مقالہ تحریر فرما کر ممنون فرمائیں۔ ہمارے ناقص خیال میں یہ آرہا ہے کہ آپ سے .... کے عنوان پر کچھ تحریر کرنے کی گزارش کی جائے۔ باقی جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ بہرحال! جو بھی موضوع متعین فرمائیں، اُس سے اِدارہ کو آگاہ ضرور فرمادیں۔ جزاك الله أحسن الجزاء.

اور یہ بھی کوشش فرمائیں کہ موضوع کی جملہ جہات کا احاطہ اُکابر اہلِ سنت کی تحقیقات کی روشنی میں مدلل لیکن سنجیدہ انداز میں ہو جائے۔ ۱۵/۲۰ یا زیادہ سے زیادہ ۲۰/۲۵ صفحات میں مضمون مکمل فرمانے کی پوری کوشش کریں۔ تا کہ خاص اِشاعت کا حجم کم سے کم اور مواد زیادہ سے زیادہ ہو۔ اور عوام الناس کے ہر طبقہ تک بسہولت پہنچایا جا سکے۔

غامدی صاحب کی کتب میزان، برہان اور مقامات وغیرہ آپ کے پاس نہ ہوں اور اُن کی ویب سائٹ ''المورد'' سے ڈاؤن لوڈ کرنے کی صورت بھی ممکن نہ ہو تو اطلاع فرما دیجیے، ان شاء اللہ یہ بوجھ بھی اِدارہ صفدر برداشت کرے گا۔ اور غامدی صاحب کی کتب آپ تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

مؤدبانہ التماس ہے کہ اپنا مضمون نومبر ۲۰۱۴ء کے اَواخر تک ضرور مکمل فرما کر اِرسال فرما دیں۔ اگر کمپوز شدہ مضمون بذریعہ ای میل ارسال کر سکیں تو اِدارہ کے ساتھ تعاون ہوگا۔

نیز غامدی صاحب سے متعلق اپنی مطبوعہ وغیر مطبوعہ سابقہ تمام تحریریں بھی اِرسال فرما دیں تو نوازش ہوگی۔ اُمید ہے اِس کارِ خیر میں ہر ممکن تعاون فرمائیں گے۔

والسلام

(مولانا) حبیب الرحمٰن سومرو......[سرپرست] (مولانا مفتی) محمد انور اوکاڑوی......[نگران]

(مولانا) جمیل الرحمٰن عباسی......[مدیر اعلیٰ] (مولانا) احسن خدامی......[مدیر مسئول]

خادم اہل سنت حمزہ احسانی......[مدیر]

۲۶ رذوالقعدہ ۱۴۳۵ھ (ستمبر ۲۰۱۴ء) بروز پیر

بہت سے حضرات کی خدمت میں غامدی صاحب کی کتب بھی ارسال کی گئیں۔ ہمارے محبوب قائد اور راہنما، ترجمان دیوبند حضرت مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ (نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ) اور

حضرت مولانا کمال الدین مدظلہم سمیت جن حضرات کے مضامین بروقت (اواخر نومبر تک) موصول ہوئے۔ بندہ ناچیز اُن سب کا فرداً فرداً دل وجان سے شکرگزار اور ممنون ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سب کو اپنے شایانِ شان اَجرِ عظیم سے نوازے۔ آمین۔

مفصل مقالہ جات کی درخواست کے علاوہ، اَکابر اہلِ علم کی خدمت میں غامدی نظریات بھیج کر درج ذیل عریضہ کے ذریعہ اُن سے ''مختصر تاثرات'' کی گزارش کی گئی:

باسمہ تعالیٰ

بخدمت اقدس-------------------صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ خداوند قدوس آپ کا سایۂ عاطفت تادیر صحت وعافیت سے ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ آمین

بعدہ! آنجناب کے علم میں ہے کہ دن بدن نت نئے خارجی وداخلی فتنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اور ہماری نئی نسل رفتہ رفتہ اسلاف دیوبند سے دُور ہونے کی بنا پر نہایت آسانی سے فتنوں کا شکار ہورہی ہے۔ اللہ پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

اِس صورتِ حال میں شدت سے اِس بات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ہر اسٹیج اور ہر پلیٹ فارم سے ہر فتنے کا بھرپور تعاقب کیا جائے اور اِجتماعی طور پر منظم اَنداز میں کیا جائے، تاکہ باطل کو مزید پنپنے اور اہلِ حق کی صفوں میں اِنتشار پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

دورِ حاضر کے خطرناک ترین فتنے ''غامدیت'' کے علمی تعاقب اور عوام الناس کو اِس سے بچانے کے لیے ......امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ اور قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ کے افکار ونظریات کے ترجمان ''مجلّہ صفدر'' نے ......''فتنۂ غامدی نمبر'' ......کی اِشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ کام اکیلے ''صفدر'' کا نہیں، بلکہ آپ جیسے اکابر کی سرپرستی، دعاؤں، توجہات اور قلمی وعلمی تعاون کی بدولت ہی اِس کا مؤثر ومفید ہونا ممکن ہے۔

اِس اشاعت خاص کو جامع، مفید اور ہر طبقے کے لیے مؤثر بنانے کی خاطر طویل مشاورت اور غور وفکر کے بعد ''غامدی فکر'' کے مختلف پہلوؤں کو موضاعات میں تقسیم کرکے اہل علم وقلم سے متعین عنوانات پر مضامین لکھنے کی گزارش کی گئی۔ چنانچہ (یہاں اٹھارہ موضوعات کی فہرست دی گئی تھی۔) وغیرہ موضوعات پر درج ذیل علماء ومشائخ مضامین تحریر فرمارہے ہیں: (اور یہاں تقریباً ۲۱ علماء کے اسماء گرامی درج تھے جن سے مقالہ کے لیے درخواست کی گئی تھی۔) وغیرہم

الغرض سنجیدہ اور محقق علماء دیوبند ''صفدر'' کی اِس اِشاعتِ خاص کے لیے مفصل مقالہ جات تحریر فرمارہے ہیں۔ تقریباً نوسو (۹۰۰) کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل مواد اَب تک موصول ہوچکا ہے اور

مزید موصول ہو رہا ہے۔ چھانٹی اور حذف تکرار کے بعد مختصر مگر جامع ''خصوصی نمبر'' تیار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی، تاکہ خریدنے اور پڑھنے میں سہولت ہو۔

جاوید احمد غامدی کے نظریات یکجا لکھ کر مختلف دارالافتاؤں کی طرف استفتاء بھی بھیجا جاچکا ہے۔ اہم فتاویٰ جات کو بھی اِس اشاعت خاص کا حصہ بنایا جائے گا۔ اِن شاءاللہ

آنجناب کی خدمت میں جاوید غامدی کے نظریات اور اُن کے تفصیلی حوالہ جات اِرسال کیے جارہے ہیں۔ آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس فتنے کے بارے میں اپنے چند لفظی تاثرات اور رائے گرامی سے تحریری طور پر آگاہ فرمائیں۔ اگر آپ کی اِس مختصر چند سطری تحریر میں اِس فتنے کی خطرناکی سے آگاہی اور عوام کو اِس سے بچنے کی تلقین ہو تو یقیناً آپ کے متعلقین کے لیے بالخصوص اور جملہ اہلِ سنت کے لیے بالعموم اَز حد نافع ہوگی۔

اُمید ہے اس کارِ خیر میں ہر ممکن تعاون فرمائیں گے۔ آپ کے جواب کا شدت سے اِنتظار رہے گا۔ آنجناب کی گوناگوں مصروفیات کے پیش نظر جواب موصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۰ رجنوری ۲۰۱۵ء ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اِس وقت میں آپ سہولت سے مجلہ صفدر کے ''فتنۂ غامدی نمبر'' کے لیے چند سطری کلمات تحریر فرماسکیں گے۔ اِن شاءاللہ العزیز

- شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہ......[سرپرست: مجلہ صفدر]
- وکیل احناف حضرت مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہ......[نگران: مجلہ صفدر]
- حضرت مولانا جمیل الرحمٰن عباسی......[مدیر اعلیٰ: مجلہ صفدر]
- اور برادرِ مکرم حضرت مولانا احسن خدامی......[مدیر مسئول: مجلہ صفدر]

کی طرف سے ہدیہ سلام قبول فرمائیں۔

والسلام......خادم اہل سنت حمزہ احسانی غفرلہ [مدیر: مجلہ صفدر]......۲۳ رصفر ۱۴۳۶ھ بروز منگل

اس عریضہ کے جواب میں موصول ہونے والی تحریرات دوسرے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

بروقت موصول ہونے والے مضامین کے بعد باقی حضرات کے مضامین بھی آہستہ آہستہ موصول ہوتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے مضامین موصول ہونے کی آخری تاریخ (۱۵ رجنوری) کا اعلان کر دیا۔ اللہ رب العزت کے خصوصی فضل و کرم، اکابر و احباب کی دعاؤں اور بھرپور تعاون کی بدولت بحمد اللہ تعالیٰ ۱۵ ر جنوری تک ہماری امید اور توقع سے تین گنا زیادہ مواد موصول ہو چکا تھا۔

اِرادہ تھا کہ یکم مارچ کو اشاعتِ خاص پریس کے حوالے کر دی جائے اور اپریل میں آنے والا ''صفدر'' کا پچپاسواں شمارہ ''فتنۂ غامدی نمبر'' ہو۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ آخری تاریخ کے بعد موصول

ہونے والا کوئی بھی مضمون شامل اِشاعت نہ کیا جاتا۔ لیکن حضرت مولانا منیر احمد منور مدظلہم، حضرت خواجہ ابوالکلام صدیقی مدظلہم کے مضامین اور دارالعلوم دیوبند کے فتوے کے انتظار میں ''حتمی تاریخ'' کو مؤخر کرنا پڑا۔ یوں دو ماہ مزید تاخیر ہوگئی، مگر باوجود اِس تاخیر کے متعدد اعذار کی بنا پر نہ تو اِن حضرات کے مضامین موصول ہوسکے اور نہ دیوبند کا فتویٰ۔ اَب مزید انتظار ممکن نہ تھا، اور موصولہ مواد بھی ہماری مقررہ حد (۵۰۰ صفحات) کے دوگنے سے بھی بڑھ چکا تھا۔ اِس لیے یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ اِس اشاعت خاص کو دوحصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ جس کے نتیجے میں پہلی جلد تیار ہے۔

اِس پہلی جلد میں حیات عیسیٰ، جہاد، گستاخ رسول کی شرعی سزا، قادیانیت وغامدیت، اُصول تفسیر وتصورِ سنت، قراآت قرآن، تصوف وسلوک، حجیت اجماع، سزائے رجم، غامدی وعمار، نظریہ سیاست، جدت پسندی اور دینی مدارس وغیرہ عنوانات پر مضامین شامل ہیں۔...... جبکہ تصورِ سنت، حجیت حدیث، تصویر، موسیقی، مرتد اور شراب نوشی کی سزا، وارثت، بیمہ، اُصول فطرت، ڈاڑھی، اتمام حجت، مسئلہ تکفیر، اجتہاد، تقلید، زکوۃ، مسجد اقصیٰ کی تولیت اور ظہور امام مہدی وغیرہ موضوعات سے متعلق مضامین اِن شاء اللہ دوسری جلد میں شائع کیے جائیں گے۔ اِسی طرح اَکابر اہل علم کے مسلکی تصلب اور دینی غیرت وحمیت کے مزید منتخب نمونے، ''جدید مفکرین کے طریقے'' نامی مضمون کا دوسرا حصہ، غامدی دستور پر مفصل بحث، عمار خان کے نام مولانا مفتی محمد تقی عثانی مدظلہم کا جوابی ''ناصحانہ مکتوب''، غامدی سے متعلق استفتاء کے تفصیلی حوالہ جات اور دیگر مضامین دوسری جلد میں شائع کیے جائیں گے۔ حدیث سبعۃ احرف پر مفصل بحث، بعض مفتیان کے مفصل فتاویٰ جات، غامدی صاحب کے تضادات، غامدی صاحب اپنے تلامذہ کی نظر میں، غامدی صاحب کے رد میں لکھے گئے معتمد اہل علم کے مضامین وکتب کی فہرست وغیرہ بھی قارئین دوسری جلد میں ملاحظہ فرماسکیں گے۔ اِن شاء اللہ۔

ہم نے متعدد اہل علم وقلم سے غامدی مذہب پر ''مختصر تبصرہ'' کی گذارش کی تھی، جس کے جواب میں موصول ہونے والے تاثرات ''غامدی فتنہ میری نظر میں!'' نامی مضمون میں شامل ہیں۔ جو حضرات تاحال اپنے تاثرات اِرسال نہیں فرماسکے، اُن کے تاثرات یا مضامین ومقالات بھی یکم اگست ۲۰۱۵ء تک موصول ہونے کی صورت میں دوسری جلد میں شامل ہوسکیں گے

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

''فتنہ غامدی نمبر'' میں بوجوہ سیکڑوں صفحات پر مشتمل بہت سے مضامین شامل نہیں کیے جاسکے، جن میں بڑی وجہ تکرار اور طوالت ہے۔ بلکہ پہلی جلد کے لیے منتخب کردہ مضامین میں سے بھی بعض قیمتی اور

اہم مضامین عین آخری وقت میں صرف اِس لیے نکالنے پڑے کہ اُن کے ساتھ اِس جلد کے صفحات کسی طرح بھی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ جن اکابر واحباب کے مضامین قابل اشاعت ہونے کے باوجود شاملِ اشاعت نہیں ہوسکے، اُن سب سے ہم انتہائی معذرت خواہ ہیں۔ اُن کے مضامین دوسری جلد میں شامل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اِن شاء اللہ۔

اِس اشاعت خاص کے بعد مستقل بنیادوں پر اِس فتنے کا تعاقب جاری رکھنے کا عزم ہے، جس کے لیے ایک مجموعہ مرتب کیا جائے گا، اُس میں اِن شاء اللہ تمام مضامین پوری تفصیل کے ساتھ شامل ہوسکیں گے۔ اُس ''مجموعہ'' کے لیے بھی جملہ اہلِ علم وقلم کی خدمت میں قلمی وعلمی تعاون کی درخواست ہے۔ امید ہے بھرپور توجہ فرمائیں گے۔ علاوہ ازیں مختصر کتابچوں، پمفلٹوں اور اکابر کی آراء وفتاویٰ پر مشتمل ٹریکٹوں کا بھی ارادہ ہے۔ اللہ جل شانہ ہمت اور توفیق عطا فرمائیں تو اِن شاء اللہ اکابر واحباب کے تعاون سے ہر فورم پر اِس فتنے کا ہر انداز میں تعاقب کیا جائے گا۔ تمام اہلِ اسلام سے اِس سلسلہ میں خصوصی دعاؤں کی بھی درخواست ہے۔

☆......☆......☆......☆

حسب سابق اِس اشاعت خاص میں بھی برادرِ مکرم مولانا احسن خدامی تقریباً تمام اُمور میں شریک کار رہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اِس دفعہ بندہ اُن کے شریکِ کار رہا تو شائد بے جانہ ہو، علاوہ ازیں...... حضرت مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم، حضرت مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ، حضرت مولانا منیر احمد منور مدظلہم، حضرت مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم، حضرت الشیخ مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہم، حضرت الاستاذ مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہم، حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن مدظلہم، حضرت مولانا عبدالرحیم چاریاری مدظلہم کی دعائیں، سرپرستی، تعاون، مشاورت اور...... مولانا مفتی شعیب احمد، مولانا سید زین العابدین، حافظ عدیل عمران، مولانا جمیل الرحمٰن عباسی، مولانا مفتی رب نواز، مولانا مفتی طلحہ جواد، مولانا شفیق الرحمٰن جلال پوری، مولانا مفتی محمد عبداللہ، محترم جناب ماسٹر منظور حسین صاحب، محترم مولانا عبدالرزاق خان صاحب، بھائی عبدالغفور صاحب اور طلحہ بھائی (حافظ شمس الدین خان طلحہ صفدری) سمیت دیگر احباب کا تعاون بھی شامل حال رہا۔ خداوند قدوس سب کو اپنے شایان شان اجرِ عظیم عطا فرمائے اور ہماری اِس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر نافع ومفید بنائے۔ اور بارگاہِ ایزدی سے مجلہ صفدر کو صحیح خطوط پر دین ومسلک کی اِشاعت وحفاظت کی توفیق مرحمت ہوتی رہے۔ آمین یارب العالمین بجاہ النبی الکریم

☆......☆......☆......☆

مکتبہ صفدریہ بہاول پور کی مطبوعات

گلستانِ عقیدت	اثر جونپوری صاحب
واقعات اسلاف کے قدم بہ قدم..............	اشتیاق احمد (مدیر "بچوں کا اسلام")
(حیات النبی پر) یادگار مناظرہ..................	مولانا محمد امین صفدر اوکاڑویؒ
روئیداد مناظرہ حیات الانبیاء......................	مولانا جمیل الرحمٰن عباسی......
اے میرے لخت جگر..............................	ماسٹر عبدالرؤف صاحب
فکرِ جمیل..	مولانا جمیل الرحمٰن عباسی
احادیثِ بخاری اور غیر مقلدین..................	مولانا مفتی رب نواز
میں ہوں غلام اُن ﷺ کا..............................	شاعر انقلاب سید امین گیلانیؒ
میں ہوں عندلیب بطحا ﷺ (رنگین صفحات)......	شاعر ابن شاعر سید سلمان گیلانی
دروسِ افغانیؒ......مولانا شمس الحق افغانیؒ......	دروس القرآن کا مجموعہ
مقالات افغانیؒ......مولانا شمس الحق افغانیؒ......	مضامین ومقالات کا مجموعہ
نکات افغانی......مولانا شمس الحق افغانیؒ......	ملفوظات اور مجالس
اذانِ ارشد (جلد اول، دوم)....................	مولانا مفتی سعید ارشد الحسینی

علاوہ ازیں

امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ	قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسینؒ
محقق اہل سنت مولانا محمد نافع جھنگوی رحمہ اللہ	مناظر اسلام مولانا محمد امین صفدر اوکاڑویؒ
ترجمان دیوبند حضرت مولانا نور محمد تونسویؒ	وکیل احناف حضرت مولانا منیر احمد منور مدظلہ
شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس قارن مدظلہ	محقق اہل سنت مولانا عبدالحق خان بشیر مدظلہ
مداح صحابہ جناب انجم نیازی صاحب مدظلہ	محترم جناب اشتیاق احمد صاحب مدظلہ

دارالامین، لاہور......اور......مظہریہ دارالمطالعہ کی جملہ کتب دستیاب ہیں۔

مکتبہ صفدریہ، نزد مدینہ مسجد ماڈل ٹاؤن بی بہاول پور

0332-7790908

......باب نمبر۲......

تحریراتِ اکابر

جاوید غامدی، فکر غامدی اور غامدی نمبر کے بارے اکابر کی تحریرات

غامدی فتنہ اس قدر نہ پنپتا اگر اسے بعض خانوادۂ علم وعرفان کی معاونت وحوصلہ افزائی، حکومتی نگرانی وسرپرستی، مغربی طاقتوں کی پشت پناہی اور الیکٹرانک وپرنٹ میڈیا کی بے جا پذیرائی حاصل نہ ہوتی۔

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب لوگوں کو اہل السنۃ والجماعۃ کے متعین کردہ راستے (صراطِ مستقیم) سے ہٹا رہے ہیں۔ (لہٰذا) امت کے لیے اس کے نظریات کو ترک کرنا ضروری ہے۔

غامدی کی تحریرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی اس فانی زندگی میں اس چیز کو مقصود بنایا ہے کہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ اور جمہور امت سے لوگوں کا اعتماد ختم کرکے ایک نیا دین اُن کے سامنے پیش کرے۔ غامدی کی تحریرات میں ایسا خطرناک مواد اور ایسی خوفناک چیزیں ہیں جس سے جدید نسل کے الحاد و بے دینی اور گمراہی وضلالت بلکہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت فرمائیں۔

گذشتہ چند سالوں سے مولانا محمد عمار خان صاحب ناصر اہل حق کی نظروں میں متنازع فیہ شخصیت قرار پاچکے ہیں کہ وہ جاوید غامدی پرویزی کی تقلید میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کی راہ سے ہٹ کر گمراہی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں اور اُن کے والد بزرگوار حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے بیٹے کی ہر صحیح اور غلط بات کے دفاع میں پیش پیش ہیں۔

اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں غامدی صاحب کے بارے میں تبصرہ کریں تو وہ یہ ہے کہ جو شخص بہت سی باتوں میں یہ سمجھتا ہے کہ چودہ صدیوں سے پوری امت گمراہی وضلالت میں مبتلا رہی اور جو دلیل کے نام کا استحصال کرتا ہے تو شریعت کا ہی نہیں بلکہ عقل ودانش کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ شخص عقل و سمجھ سے بالکل عاری ہے۔

احقر کی نظر میں جاوید غامدی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام پر بعض اہل عقل کے اعتراضات دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے اور بے بس ہوکر ان کو مطمئن کرنے کے لیے دین میں تحریفات کو اپنا شیوہ بنایا اور دین کے اصلی حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

جاوید غامدی، فکرِ غامدی اور ”فتنہ غامدی نمبر“ سے متعلق

تحریراتِ اکابر

محقق اہل سنت، وکیل صحابہ واہل بیت حضرت مولانا محمد نافع رحمہ اللہ تعالیٰ

[فاضل: دارالعلوم دیوبند]

باسمہ تعالیٰ و جل شانہ

گرامی قدر جناب مولانا حمزہ احسانی صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   مزاج گرامی!

تسلیمات مسنونہ کے بعد معروض ہے کہ آپ کا مرسلہ خط اور علماء کبار سے متعلق معلومات طبع شدہ موصول ہوئے۔

یاد آوری کا شکریہ!

بندہ مدت مدید سے مریض ہے اور صاحب فراش ہے۔ خود تحریر کرنے اور لکھوانے سے معذور ہے۔

کبار علماء، باطل فرقوں کے متعلق جوابات تحریر فرما رہے ہیں۔ ان کبار علماء کی تحقیق کے بعد مجھ جیسے کم علم کی تحریر کی ضرورت نہیں۔

لہٰذا بندہ کی معذرت قبول فرمائیں اور ہرگز ملال نہ فرمائیں۔

والسلام مع الاحترام محمد نافع عفااللہ عنہ

۲۲ر صفر المظفر ۱۴۳۶ھ......۱۵ر دسمبر ۲۰۱۴م......از: محمدی شریف، ضلع چنیوٹ

حضرت رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ حاضری کے موقع پر (عمار خان کے متعلق) بندہ سے فرمایا:

”ہمارے دینی مدارس کے فضلاء کا غامدی جیسے جاہل کے شکنجے میں آنا نہایت حیرت انگیز ہے۔“

از خادم اہل سنت حمزہ احسانی غفرلہ

☆......☆......☆......☆

بقیۃ السلف، استاذ المحدثین حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہم

[بانی ورئیس: جامعہ فاروقیہ، کراچی......صدر: وفاق المدارس العربیہ]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، وبعد!

دین اسلام کامل و مکمل دین اور ربانی ضابطۂ حیات ہے جس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ بزرگ و برتر نے اپنے ذمہ لی ہے، اِسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں بہت سے فتنوں نے جنم لیا اور مضبوط اسلامی عمارت کو ڈھانے کی بھرپور کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے علمائے امت کے ہاتھوں ان فتنوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور حق و سچ کو روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا۔

اِسی طرح کا ایک فتنہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس سے مغربیت سے مرعوبیت کے زیرِ اثر جدت پسند الحادی فکر کا پیدا ہوا، اس کی ابتداء سر سید احمد خان سے ہوئی، پھر غلام احمد پرویز نے اسے خوب پروان چڑھایا، مولوی چراغ علی، نیاز فتح پوری، اسلم جیراج پوری، علامہ مشرقی، عبداللہ چکڑالوی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے خود سر اور گم راہ قلم کار اسی فتنے کی پیداوار ہیں۔

عصرِ حاضر میں اسی فتنے کی کوکھ سے جنم لینے والے ٹی وی کے ایک نام نہاد اسکالر "جاوید احمد غامدی" بھی آج کل اسی جدت پسند الحادی فکر کے علم بردار ہیں، اس نے اس فتنہ کی ایسی آبیاری کی کہ اسے ضلالت و گم راہی کی انتہا تک پہنچا دیا۔اس کی گم راہ آراء و افکار نے ایک مستقل مکتب فکر اور نئے مذہب کی شکل اختیار کر لی ہے، جس کا بنیادی مقصد امتِ مسلمہ کو اس کے قابل فخر اور مضبوط ماضی سے کاٹنا، قرآن و سنت کے باہمی تعلق و رشتہ میں دراڑ ڈال کر سنت کی حجیت اور اس سے ثابت شدہ عقائد و اعمال کا انکار، مسلماتِ دین کا انکار اور اس میں شکوک و شبہات پیدا کرنا، مسلمہ دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنا، دین اسلام کی چودہ سو سالہ متفقہ اور متوارث تعبیر سے امت کو محروم کرنا اور نصوص شریعت کے عجیب و غریب معانی اور تاویلات بیان کرنا جو عہدِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ گزرے ہوں۔

جاوید احمد غامدی کی کتب اور عقائد کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف کی ہر کتاب بلکہ ہر صفحہ و سطر سے ذہنی آوارگی، کج فہمی، فکری کج روی، آزاد فکری، خود پسندی، تکبر اور ضلالت و گم راہی ٹپکتی ہے۔اور وہ اپنی تحریروں میں اکابر و اسلاف پر عدمِ اعتماد، فقہاء کی تغلیط و توہین، علمائے دین کی تحقیر حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جیسی مبارک و پاکباز ہستیوں کی توہین و تحقیر کرتے نظر آتے ہیں، اور اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ امتِ مسلمہ چودہ صدیوں سے ضلالت و گم راہی میں مبتلا رہی ہے۔

غامدی فتنہ اس قدر نہ پنپتا اگر اسے بعض خانوادۂ علم وعرفان کی معاونت وحوصلہ افزائی، حکومتی نگرانی وسرپرستی، مغربی طاقتوں کی پشت پناہی اور الیکٹرانک ؍ پرنٹ میڈیا کی بے جا پذیرائی حاصل نہ ہوتی۔

یاد رکھیے! اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ مبارک دین قیامت تک باقی رہنے کے لیے آیا ہے، جو بدبخت اس کو مٹانے کے درپے ہوئے وہ ختم ہوگئے، آج ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا اور اسلام زندہ وتابندہ موجود ہے، غامدی فتنہ تو ان فتنوں کے مقابلے میں نومولود بچے کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:"یریدون لیطفئوا نوراللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون"۔

''وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھادیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کے نور کو پورا کرنے والے ہیں اگرچہ کافر اس کو پسند نہ کریں۔''

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اللہ بزرگ وبرتر جل وعلا نے جہاں علمائے دیوبند کو دین اسلام اور شریعت بیضاء کی بے مثال خدمت سے سرفراز فرمایا ہے، جس کے آثار کا مشاہدہ پوری دنیا میں کیا جاتا رہا ہے، وہیں ہر باطل کی سرکوبی واستیصال کرنے اور اس کے تار وپود بکھیرنے میں بھی اس مقدس جماعت کی نظیر نہیں ملتی۔

اللہ جزائے خیر عطا فرمائے''مجلہ صفدر'' کی انتظامیہ کو کہ وہ فتنہ غامدیت کی سرکوبی کے لیے شب وروز کوشاں ہے اور اِسی تسلسل کی ایک بہترین کاوش''غامدی نمبر'' ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہر فتنہ سے محفوظ فرمائے اور مجلہ کی انتظامیہ کی مساعیٔ جمیلہ کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔ آمین

سلیم اللہ خان

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان......بانی ومہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی

۷؍جمادی الثانیہ ۱۴۳۶ھ......۲۸؍مارچ ۲۰۱۵ء

☆......☆......☆......☆

حکیم العصر، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانوی رحمہ اللہ

[شیخ الحدیث وصدر مدرس: جامعہ باب العلوم کہروڑ پکا......امیر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت]

......بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ غامدی فتنہ کے استیصال کے لیے مولانا عبدالرحیم صاحب چار یاری کی دن رات محنت قابل قدر ہے اور مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی بائیکاٹ کی تجویز''واجب التقلید'' ہے، اللہ تعالیٰ امام اہل سنت مولانا سرفراز صاحب صفدر رحمہ اللہ کے خاندان کو حضرت اقدس کے طریق صواب پر

استقامت نصیب فرمائے۔ آمین۔ عبدالمجید، جامعہ باب العلوم، کہروڑ پکا، ضلع لودھراں

☆......☆......☆......☆

نمونۂ اسلاف، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صدیق مدظلہم

[شیخ الحدیث وصدر مدرس: جامعہ خیر المدارس، ملتان]

محترم جناب حمزہ احسانی صاحب زیدمجدکم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ نے فرمایا کہ میں غامدی صاحب کے متعلق کچھ تحریر کروں تو اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ ان کی جزئیات کا استقصاء مشکل ہے، البتہ اصولی بات تحریر کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ج وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ بیشک یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کی اتباع کرو اور دوسرے راستوں کی اتباع نہ کرو کہ تم کو اللہ رب العزت کے راستوں سے جدا کردیں گے۔ یہ تم کو اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں تاکہ غلط راستہ سے بچ جاؤ۔ صراط مستقیم کو ہر نماز میں مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہود ونصاریٰ کے بہتر فرقے ہوں گے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے سب دوزخ کی طرف لے جانے والے ہوں گے صرف ایک راستہ جنت کی طرف لے جانے والا ہوگا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے پوچھا وہ کونسا ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا ما أنا علیہ و أصحابی۔ جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ (کرام رضی اللہ عنہم اجمعین) ہیں۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کی کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جماعت کی اتباع کرنے والے ہیں۔ اور یہ جماعت اہل السنّت والجماعت کے نام سے موسوم ہے اور یہی صراط مستقیم ہے جس کی اتباع ضروری ہے۔

قرآن پاک میں اللہ رب العزت نے ابلیس کا قول نقل کیا ہے قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ۔

میں تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ کر لوگوں کو ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے گمراہ کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکیر کھینچ کر فرمایا کہ یہ سیدھا راستہ ہے اس کے دائیں اور بائیں

گمراہی کے راستے ہیں ہر ایک پر شیطان مسلط ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلنے سے روکتا ہے۔

اب یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ جو شخص اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ عقائد سے انحراف کرتا ہے اور امت کے اجماعی مسائل کا انکار کرتا ہے اور قرآنی آیات کی تحریف کرتا ہے وہ لوگوں کو سیدھے راستے سے ہٹاتا ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شیطان اس پر مسلط ہوا ہے کہ وہ خود شیطان بن کر لوگوں کو صراطِ مستقیم سے گمراہ کررہا ہے۔

لہٰذا جو شخص صراطِ مستقیم پر چلنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلمہ عقائد اور احکام کی اتباع کو اختیار کرکے غامدی صاحب کی شیطانی تزویرات سے بچے۔

مثال:...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطِ مستقیم کھینچا اور فرمایا کہ یہ سبیل راشد صراطِ مستقیم ہے اس کی اتباع کرو اور اس کے بعد ہر جانب چھ چھ خط کھینچے جو سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے تھے اور فرمایا کہ یہ سبل ہیں ان میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے۔ اس سے اجتناب کرو پھر ان بارہ خطوط سے چھ چھ شاخیں بن جائیں گی تو تہتر فرقے بن جائیں گے۔

غامدی صاحب کے جو نظریات بحوالہ درج ذیل ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب اور ان کے متبعین صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے اور لوگوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے میں لگے ہوئے ہیں۔

غامدی صاحب کے نظریات ان کی تحریرات کی روشنی میں:

(۱)...... **سوال**: قرآن وحدیث میں کیا کہیں امام مہدی کے نزول کا ذکر ملتا ہے؟

جواب: قرآن مجید میں نزول مہدی کے بارے میں اشارۃً بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح صحیح حدیثیں بھی اس طرح کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ البتہ بعض دوسرے درجے کی ایسی روایات ملتی ہیں جن میں قیامت کے قریب اس طرح کی ایک شخصیت کے پیدا ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان میں بھی ایسی باتیں کہی گئی ہیں کہ جو نہ علمی لحاظ سے درست ہوسکتی ہیں اور نہ عقلی لحاظ سے۔ میرا رجحان اس معاملے میں یہ ہے کہ یہ روایتیں درحقیقت اگر کچھ تھیں بھی تو سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تھیں۔ ان کے زمانے کے لوگوں نے اس کا مصداق پالیا اور وہ تاریخ میں اپنا کام مکمل کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اس موضوع پر بعض محققین نے بہت اچھی چیزیں اس زمانے میں لکھ دی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ محض ایک افسانہ ہے جو مسلمانوں کے مابین، افسوس ہے کہ بہت رائج کردیا گیا اور اب امت مسلمہ اسی انتظار میں بیٹھی ہے کہ کوئی امام مہدی آئے گا اور ایک مرتبہ پھر ان کی خلافت دنیا میں قائم کردے گا۔ (جون ۲۰۰۴ء)

[سوال وجواب، ہٹس ۸۸۸، تاریخ اشاعت ۲۸ فروری ۲۰۱۰......جاوید احمد غامدی]

(۲)..........پرویز پر کفر کا فتویٰ درست نہیں:

سوال: جاوید احمد غامدی علامہ پرویز صاحب کی قرآن فہمی سے کس حد تک متفق ہیں؟ علمائے کرام نے پرویز صاحب پر کفر کے بہت فتوے لگائے تھے، غامدی صاحب کی پرویز صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کیا وہ صحیح تھے یا غلط؟ (صفدر اقبال)

جواب: معاملہ یہ ہے کہ غامدی صاحب اور پرویز صاحب کی قرآن فہمی میں کوئی اتفاق نہیں ہے۔ ان دونوں حضرات کے قرآن فہمی کے اصولوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔...... غامدی صاحب کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کے الفاظ کے وہی معنی لیے جائیں جو نزول قرآن کے زمانے میں عربوں میں مستعمل تھے، جبکہ پرویز صاحب کے نزدیک کسی لفظ کے معنی اس کے مادے سے طے کیے جائیں گے۔

ہمارے نزدیک کسی پر کفر کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے۔ ہم دوسرے کی آراء سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ اس کے خیالات کو غلط قرار دے سکتے ہیں، لیکن کسی کو کافر کہنے کا حق ہمیں حاصل نہیں۔

[اشراق، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص: ۶۷......محمد رفیع مفتی]

(۳)......حجیت حدیث:

نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقہ پر نقل ہوئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم انھیں ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا، دوسری یہ بات کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی علم یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔

[میزان، حصہ دوم، ص ۶۸ طبع اپریل ۲۰۰۲ء لاہور......بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ ص: ۵۶]

(۴)......اجماع:

دین کا تنہا ماخذ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے۔ آپ سے یہ دین آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی وعملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے: ایک قرآن، دوسرے سنت۔ آپ کے بعد اب یہ انھی دو چیزوں سے اخذ کیا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ تبعاً اگر کوئی چیز خدا کے منشا تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ اجتہاد ہے۔...... آپ کے بعد آپ کے صحابہ وتابعین نے یہ روایت قائم رکھی، لیکن فقہاء کا دور شروع ہوا تو اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اُس کے بعد سے اب تک بالعموم مانا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ایک مصدر یہ اجماع بھی ہے۔ دین

کے ماخذ میں یہ اضافہ یقیناً ایک بدعت ہے۔ قرآن وسنت کے نصوص میں اِس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی۔[اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۲......جاوید احمد غامدی]

(۵)......اسلام میں ارتداد کی سزا:

۱......**سوال** : اسلام میں ارتداد کی سزا قتل کیوں ہے؟ جبکہ دوسرے کسی مذہب میں ایسا نہیں ہے۔(عائشہ خان)

جواب: کسی قوم میں جب کوئی رسول اتمام حجت کر دیتا ہے تو پھر اُس کے لیے ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان نہیں لاتی تو پھر اس پر خدا کا عذاب آجاتا ہے اور صرف وہی لوگ بچتے ہیں جو ایمان لائے ہوتے ہیں، جیسا کہ قوم نوح، قوم لوط، قوم صالح اور قوم ہود پر عذاب آئے تھے اور ان میں سے صرف صالح مسلمان ہی بچے تھے۔ یہ خدا کی سنت ہے۔ ان قوموں میں سے اگر کوئی آدمی ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کو اختیار کر لے تو وہ پھر خدا کے عذاب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں عذاب کی شکل یہ تھی کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے خیال میں مرتد کے لیے قتل کی سزا صرف رسول کے براہ راست مخاطبین تک ہی محدود تھی۔ آج اس کا اطلاق کرنا غلط ہوگا۔

[اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶۴......محمد رفیع مفتی]

(۶)...... یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قرات ہے اس کے علاوہ سب قراتیں فتنہ عجم کی باقیات ہیں۔

[میزان، ص ۳۲، طبع دوم، اپریل 2002ء......بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ از: مولانا عبدالرحیم چار یاری، ص:۵۶ وتحفۂ غامدی، از: مفتی عبدالواحد صاحب]

(۷) **سوال**: کیا آج اجتہاد کا دروازہ بند ہے؟ اگر اجتہاد بند نہیں تو کیا شرائط پر پورا اُترنے والا ہر مجتہد از خود اجتہاد کرنے کا مجاز ہوگا؟ اگر ہر مجتہد از خود اجتہاد کرنے کا مجاز نہیں تو کس دلیل سے۔ اگر مجاز ہے تو کیا ایک ملک میں بیک وقت کئی مجتہد ہو سکتے ہیں؟ اگر ایک سے زیادہ مجتہد نہیں ہوسکتے تو واجدین شرائط میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دینے کا جواز کیا ہوگا؟ اگر کئی مجتہد ہو سکتے ہیں تو ایک ہی مسئلے کے کئی حل ہوسکتے ہیں جو باہم متضاد بھی ہوسکتے ہیں۔ اس صورت میں امت کئی فقہی مسالک میں بٹ کر پارہ پارہ ہو جائے گی۔

جواب: اجتہاد کا مطلب ہے کسی مسئلہ میں اللہ کی منشا معلوم کرنا۔ یہ کام ہر مسلمان کی شب وروز کی ضرورت ہے۔ یہ کسی صورت میں بند نہیں ہوسکتا۔ وہ لوگ بھی اجتہاد کرتے ہیں جو اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے قائل ہیں۔

ہمارے دین میں اجتہاد کی اجازت دینے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا گیا۔ مجتہد کے لیے شرائط کا معاملہ بھی

عقل پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کسی معاملے میں کلام کرنے کا مجاز وہی شخص ہو سکتا ہے جو اس معاملے سے واقف ہو۔ تمام علوم وفنون میں یہ اصول جاری ہے۔ دین کا علم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جو آدمی بھی دین میں تفقہ کی اہلیت پیدا کر لیتا ہے وہ اجتہاد کرنے کا بھی مجاز ہوتا ہے۔

دین میں بصیرت رکھنے والا دینی علوم سے بہرہ مند آدمی ہمارے نزدیک اجتہاد کا مجاز ہے۔ اگر ایک ملک میں کئی افراد نے یہ اہلیت پیدا کر لی ہے تو سب اجتہاد کے مجاز ہوں گے۔ جب ایک سے زیادہ لوگ کسی ایک متن یا کلام پر غور کرتے ہیں تو مختلف اسباب کے تحت ان میں اتفاق یا اختلاف بھی ہوتا ہے۔ علمی اختلاف تفرقے کا باعث نہیں ہے۔...... باقی رہا اجتماعی زندگی کا معاملہ تو اس میں اگر اکثریت کی رائے کے قانون بننے کا طریقہ اختیار کر لیا جائے تو وہاں بھی انتشار کی راہ روکی جا سکتی ہے۔

[سوال وجواب، ہٹس ۶۱۲، تاریخ اشاعت ۱۰ مارچ ۲۰۰۹......طالب محسن]

(۸) حضرت حسینؓ بغاوت کرکے آئے تھے۔ [ایضاً......بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ ص:۶۳]

شہداء کربلا اور شہادت حسین سو فیصد افسانہ تراشی ہے۔

[ایضاً......بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ ص:۶۳]

(۹)...... ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے ان کے لئے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔

[قانون عبادت، ص ۱۱۹، طبع اپریل، 2005ء......بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ ص:۵۷]

[اشراق، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص:۶۳......محمد رفیع مفتی]

(۱۰) **سوال:** دین کے اعتبار سے کون کون سے مسالک صحیح ہیں؟

جواب: دین کے بارے میں جو مسالک، مکاتبِ فکر یا نقطہ ہائے نظر اس وقت موجود ہیں انھیں انسانوں ہی نے اپنے فہم کی روشنی میں قائم کیا ہے۔ ان میں سے کسی مکتبِ فکر کی، ضروری نہیں کہ ہر بات صحیح ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر بات غلط ہو۔ علم وفکر کے اعتبار سے کسی بھی انسانی کاوش کو بالکلیہ صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ میں جو دین آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس کے بارے میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ یہ سارے کا سارا لازماً صحیح ہوگا۔ میری اپنی تاریخ مجھے بتاتی ہے کہ میں نے اپنی قائم کی ہوئی بہت سی آراء سے رجوع کیا ہے۔ اب سے پہلے کسی رائے کو میں اپنے علم وعقل کے مطابق صحیح سمجھتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ اس کو بیان کرتا تھا، آج میں اپنے علم وعقل کی روشنی میں اس رائے کو غلط سمجھتا ہوں۔ میرے ایمان ویقین کا معاملہ اصل میں میرے فہم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس معاملے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ ہمیں ہر وقت اپنے دل ودماغ کو کھلا رکھنا چاہیے اور اپنی رائے کے تعصب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مکاتب فکر کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں مکتبِ فکر حقیقت کے زیادہ قریب ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

فلاں مکتب فکر سرتا سر حق ہے۔ حق کی حتمی حجت کی حیثیت صرف اور صرف اللہ کے پیغمبر کی بات کو حاصل ہے۔اس کو معیار بنا کر آپ کسی بات کے رد یا قبول کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

[سوال وجواب،ہٹس ۱۹۹۶،تاریخ اشاعت ۲۵ ستمبر ۲۰۰۹......جاوید احمد غامدی]

مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب لوگوں کو اہل السنۃ والجماعۃ کے متعین کردہ راستے (صراطِ مستقیم) سے ہٹا رہے ہیں۔امت کے لیے اس کے نظریات کو ترک کرنا ضروری ہے۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک آنجناب کی کوشش کو امت کے لئے غامدی صاحب کے فتنے سے بچنے کا ذریعہ بنائے۔

☆......☆......☆......☆

استاذ العلماء،شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر مدظلہم

[رئیس: جامعۃ العلوم الاسلامیہ،کراچی......نائب صدر: وفاق المدارس العربیہ......امیر: عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت]

الحمدلله رب العالمين

والصلوٰة والسلام على سيدالانبياء والمرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين أما بعد:

دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لیے سامان ہدایت بنا کر بھیجا ہے،مگر لوگوں کی طبائع کی وجہ سے یہ ہدایت کسی کے حق میں تریاق اور کسی کے حق میں زہر ثابت ہو جایا کرتی ہے،اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"يضل به كثيراً ويهدى به كثيراً ومايضل به الاالفاسقين "۔(البقرة:۲۶)

مذکورہ آیت میں اس نسخہ کیمیا کو اپنے حق میں زہر بنانے والے لوگوں کی نشاندہی بھی موجود ہے کہ یہ جادۂ حق اور دائرہ طاعت سے باہر نکلنے والے آزاد منش لوگ ہوں گے،یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو وحی الٰہی اور اس کے واسطوں پر اعتماد کرنے کی بجائے اپنی فہم و عقل پر انحصار کر کے حق کے دعویدار بنے پھرتے ہیں، اس طرز عمل کو عملی تعبیر سے پہلے فکری انحراف کا عنوان دیا جا سکتا ہے،اسلام سے قبل اس فکر نے لوگوں کو شرک، بت پرستی اور خدا بیزاری پر جمنے کا جواز فراہم کیا اور اسلام کے پہلے اسلام کا معارضہ و مقابلہ کیا پھر اسلامی لبادے میں اس انحرافی فکر نے اپنی جگہ بنانے کی کوشش کی،چنانچہ مختلف زائغین،اسلام کے اندر فرقے اور جتھے بنانے میں کامیاب ہو گئے،یہ فکری انحراف دین اسلام میں علمی روپ دھار کر علمی فتنہ بن کر دین اسلام کے نسخ و مسخ کی ناروا کوشش کرتا رہا اور ہر دور میں یہ سلسلہ قائم رہا،ہمارے اس دور میں بھی دین اسلام کو اپنے حق میں ہدایت کی بجائے زہر بنانے والے علمی فتنے سر اٹھا رہے ہیں،مگر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے اپنے نیک بندوں سے کام لیا ہے اور لیتا رہے گا ان شاء اللہ،چنانچہ گزشتہ صدی میں

علمیت نما بعض فتنوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ہمارے شیخ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے اس کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا، جس کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"دنیا کی علمی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جتنے فتنے پیدا ہوئے ہیں، سب اذکیاء اور طباع حضرات کے ذریعے وجود میں آئے اور علمی دور میں اکثر فتنے علم کے راستے سے آئے ہیں، بلکہ علمائے حق میں بہت سے اذکیائے زمانہ اپنی شدت ذکاوت کی وجہ سے جمہور امت سے شذوذ اختیار کر کے غلط افکار و نظریات کا شکار ہو گئے، اور وہاں زیادہ تر یہی حقیقت کارفرما رہی کہ اپنے تبحر و ذکاوت پر اعتماد کر کے علمی کبر اور اعجاب بالرأی کے مرض میں مبتلا ہوئے، زیادہ صحبت نہیں ملی اور کہاں سے کہاں نکل گئے۔

ہمارے اس دور میں اس کے بہت نظائر موجود ہیں اور چونکہ علمی ذہانت تو ہوتی ہی ہے اور بسا اوقات بہت عمدہ بات بھی کہہ جاتے اور لکھ جاتے ہیں، اس لیے ان کی وہ عمدہ باتیں مزید فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں، اور جن حضرات کو زیادہ صحبت اور علمی گہرائیاں نصیب نہیں ہیں وہ بہت شواذ اور جدید افکار و نظریات کے بھی حامی ہو جاتے ہیں اور شیطان تو اپنے کام میں لگا ہوا ہے، جو شخصیت امت کی ہدایت و ارشاد کے کام آسکتی تھی وہ امت کے لیے زیغ و ضلال کا ذریعہ بن جاتی ہے، ہر دور میں اس کی مثالیں موجود ہیں، امام غزالی رحمہ اللہ نے "مقاصد الفلاسفہ" میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے علوم حساب، ہندسہ، عنصریات وغیرہ علوم کو دیکھ کر لوگ ان کے تمام علوم کے معتقد ہو گئے، طبیعیات والٰہیات میں ان کی تحقیقات کے قائل ہو کر گمراہ ہو گئے، امام غزالی رحمہ اللہ کی یہ بات بہت عجیب ہے اور بالکل صحیح ہے۔ شیطان کو اس قسم کے مواقع میں اضلال کا بہت اچھا موقع مل جاتا ہے، بہر حال انتہائی علمی قابلیت والے، انتہائی ذکاوت والے فتنوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو ایسے حضرات کہ جن کی علمی قابلیت بہت کم، لیکن قلمی قابلیت بہت زیادہ ہو، صحبت ارباب کمال سے یکسر محروم ہوں، طباع و ذہین ہوں، وہ تو بہت جلد اعجاب بالرأی کی خطرناک بلا میں مبتلا ہو کر تمام امت کی تحقیر اور تمام تحقیقات امت کا استخفاف اور تمام سلف صالحین کے کارناموں کی تضحیک اور اول سے لے کر آخر تک تمام پر تنقید کر کے خطرناک گڑھے میں گر کر تمام نسل کے لیے گمراہی کا باعث بن جاتے ہیں"۔

[بصائر و عبر: ۱/۲۴۵، ۲۴۶، طبع جدید]

اڑتیس (۳۸) برس قبل لکھے گئے ہمارے شیخ کے یہ الفاظ اس دور کے دیگر علمی فتنوں کے ساتھ ساتھ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی شخصیت، افکار و نظریات اور تحقیقات پر آج حرف بحرف صادق آ رہے ہیں، بد قسمتی سے ہمارے بھولے بھالے عوام جو عموماً دین کی بنیادی و اساسی معلومات سے بھی ناآشنا ہوتے ہیں، غامدی صاحب کی نرالی بوقلمیوں سے متاثر ہو کر جمہور امت سے الگ راہ پر جا رہے ہیں، طبقۂ

علماء کو کسی کی ذات سے کوئی نفرت نہیں، بلکہ یہ حضرات دین کو باطل نظریات کی آمیزش سے بچانا اپنا دینی فرض سمجھتے ہیں، اس لیے نصح و خیر خواہی کی بنا پر اپنے مسلمان بھائیوں کو ایسے اشخاص اور جماعتوں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں، غامدی صاحب کے متعلق اس نوع کی کوششوں میں بھی یہی نیک جذبہ کارفرما ہے، اگر وہ اور ان کے متبعین جمہور علمائے امت کے ساتھ کھڑے ہو جائیں اور دین اسلام کو ہم تک پہنچانے والے واسطوں کی تشریحات و تعبیرات کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کا طریقہ اپنا لیں تو ان کی کاوشیں دین کی صحیح خدمت شمار ہوں گی، ورنہ دین کے نام پر بے دینی کے عام کرنے کے قصوروار ہی رہیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوری امت مسلمہ کو تمام فتنوں خصوصاً علمی فتنوں سے محفوظ رکھے اور راہِ ہدایت پر قائم و دائم رکھے، آمین!

وصلى الله وسلم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين.

عبد الرزاق اسکندر

مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

۱۴۳۶/۳/۲۰ھ......۲۰۱۵/۱/۱۲ء

☆......☆......☆......☆

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا منظور احمد نعمانی مدظلہم

[مدیر و شیخ الحدیث: جامعہ عربیہ احیاء العلوم، ظاہر پیر]

☆......قربِ قیامت کے اِس دور میں اسلام کی بنیادیں ہلانے اور اُن کو کھوکھلا کرنے بلکہ ڈھانے کے لیے فتنے مسلسل بڑھتے جا رہے ہیں۔ اِن میں سے سب سے خطرناک اور ایمان سوز فتنے وہ ہیں جو اسلام، قرآن اور سنت کے نام پر عوام کو نئے اسلام اور نئے دین کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ اِنھی فتنوں میں سے ایک خطرناک قلمی فتنہ جاوید احمد غامدی کا ہے۔ غامدی کی تحریرات سے اَندازہ ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی اِس فانی زندگی میں اِس چیز کو مقصود بنایا ہے کہ صحابہ کرامؓ، سلف صالحینؒ اور جمہور امت سے لوگوں کا اِعتماد ختم کر کے ایک نیا دین اُن کے سامنے پیش کرے۔ غامدی کی تحریرات میں ایسا خطرناک مواد اور ایسی خوفناک چیزیں ہیں جس سے جدید نسل کے الحاد و بے دینی اور گمراہی و ضلالت بلکہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کی حفاظت فرمائیں۔

☆......جو لوگ اپنے اکابر و اسلاف سے سچی عقیدت رکھتے ہوئے اُن کے دامن سے وابستہ رہتے ہیں، اُن پر کسی بھی قسم کا کوئی بھی فتنہ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی کوئی ملحد و بے دین اُن کو گمراہ کر سکتا ہے۔

لیکن جو لوگ ملحدوں کی کتابیں پڑھتے، اُن کی مجالس میں شرکت کرتے اور ان کی تقریریں سنتے ہیں، وہ جلد ہی شیطان کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر اُس ملحد کی گمراہی پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ افسوس کے ہمارے محبوب حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کا ایک پوتا بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اور تعجب اس بات پر ہے اُس کے والد کھلے لفظوں میں اس کی حمایت و سرپرستی بلکہ دفاع تک کرتے ہیں اور اپنے دوروں میں اس کے اسباق رکھتے ہیں۔ جب ایسے ملحد پڑھائیں گے تو پڑھنے والے گمراہ ہی ہوں گے۔ حالانکہ ہم نے اپنے بزرگوں سے یہی سبق سیکھا ہے کہ غلط عقیدے والے کی تائید کبھی کسی درجہ میں بھی نہیں کرنی چاہیے۔

☆......آج کل جتنے بھی جدت پسند ہمیں نئے نئے روپ اور رنگ میں نظر آتے ہیں، در حقیقت یہ سب کے سب سرسید احمد خان، غلام احمد پرویز، ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور اِن جیسے ملحدین کا تسلسل ہیں۔ ہمارے اکابر حضرت بنوری رحمہ اللہ، حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ، ہمارے بھائی شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ اور ہمارے برخوردار مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمہ اللہ سب نے اِن فتنوں کا بھرپور تعاقب کیا اور آخر دم تک کرتے رہے۔ اَب الحمد للہ اِن بزرگوں کی روایت برقرار رکھتے ہوئے برخوردار مولوی احسن اور برخوادر مولوی حمزہ سلمہما اللہ نے یہ میدان سنبھالا ہوا ہے۔ اور اِس وقت کے علماء واکابر کی سرپرستی میں کام کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو قبول فرمائیں۔ یقیناً اِن کی یہ خدمات مذکورہ بالا اکابر کی ارواح کے لیے تسکین و فرحت کا باعث ہوں گی۔

☆......آج کے دور میں اپنے اکابر پر اعتماد کی بہت زیادہ ضرورت ہے، ورنہ قدم قدم پر گمراہی اور ضلالت کے گڑھے ہیں، کسی بھی جگہ انسان پھسل سکتا ہے۔ میں اپنے تمام متعلقین سے کہتا رہتا ہوں کہ ہم حنفی ہیں اور فقہ حنفی کی تشریحات میں بھی اکابر دیوبند کے مقلد ہیں۔ اس لیے میری یہ سب کو نصیحت اور تاکید ہے کہ خود بھی اکابر کے نقش قدم پر مضبوطی سے قائم رہیں اور اپنی اولاد کو بھی قائم رکھیں۔ اولاد کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہم پہلے اولاد کو شتر بے مہار بنادیتے ہیں پھر بعد میں روتے ہیں۔

☆......جو آدمی اکابر کو چھوڑ کر اپنی بات کرے، جمہور کا راستہ ترک کرے، وہ ''ملحد'' تو ہو سکتا ہے، ''محقق'' نہیں۔ اِسی طرح جہاد کا اِنکار یا اس پر اعتراضات بھی ملحدوں اور بے دینوں کا کام ہے۔ ڈاڑھی کا انکار بھی سراسر الحاد اور کفر ہے۔ اور یاد رکھو! حق کا مقابلہ کرنے والوں کو خدا تعالیٰ ڈھیل دیتے ہیں، "سنستدرجهم من حيث لا يعلمون" ۔ اور اس ڈھیل کو یہ لوگ ''ترقی'' خیال کرتے ہیں۔ یہ ترقی نہیں ہوتی بلکہ ڈھیل ہوتی ہے۔ آخر کار انجام عبرتناک ہوتا ہے۔ [منتشر مجالس سے انتخاب]

☆......☆......☆......☆

مفکر اسلام، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

[نائب صدر و شیخ الحدیث: جامعہ دارالعلوم کراچی]

......مضمون کا جو مجموعی طرزِ فکر ہے، وہ بندے کو نہایت خطرناک محسوس ہوتا ہے، اِس طرزِ فکر کے ساتھ انسان کسی وقت کسی بھی بڑی گمراہی میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ جب ایک مرتبہ کوئی صاحب فکر جمہور اُمت کے مسلمات سے آزاد ہوکر اپنی راہ الگ اختیار کر لیتا ہے اور یہ تصور کر لیتا ہے کہ وہ اِن مسلمات کے بارے میں پہلی بار اصابتِ فکر کے ساتھ غور کر رہا ہے، اور چودہ صدیوں میں علماءِ امت اُس اندازِ فکر سے محروم رہے ہیں، تو اُس کے اوپر کوئی روک باقی نہیں رہتی۔ ماضی میں یہی طرزِ فکر نہ جانے کتنی گمراہیاں پیدا کر چکا ہے۔ طٰہٰ حسین سے لے کر سرسید تک اور وحیدالدین خان صاحب سے لے کر جاوید غامدی صاحب تک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں اِس قسم کے طرزِ فکر نے دلائل کا زور بھی باندھا، لیکن امت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر رفتہ رفتہ اُسے رد کر کے اِس طرح آگے بڑھ گیا کہ اُس کا ذکر صرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔ بالخصوص آج کے دور میں جس طرح کے افکار دین میں تحریف کے درپے ہیں، اس کے سوا سلامتی کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ انسان علماءِ امت کے سوادِ اعظم سے اور جمہور امت کے مسلمات سے وابستہ رہے۔ بے شک انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں، لیکن اِس کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ انسان جمہور علماء امت کے مقابلے میں خود کو معصوم سمجھنے لگے اور یہ سمجھے کہ اُن سب سے بیک وقت غلطی ہوئی ہے، مجھ سے نہیں۔

[عمار خان کے نام مکتوب سے ایک اقتباس]

وکیل احناف، مناظر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم

برادر صغیر وکیل احناف مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی رحمہ اللہ......خلیفہ مجاز: حضرت سید نفیس الحسینی رحمہ اللہ

[رئیس: تخصص فی الدعوۃ والارشاد، جامعہ خیرالمدارس ملتان......امیر: اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان]

اِس دور کا سب سے بڑا فتنہ اکابرین سے اعتماد اٹھا کر دین کی نئی تشریح کرنے کا ہے۔ دورِ حاضر میں باقی فتنوں کی طرح ایک جاوید غامدی کا فتنہ ہے۔ اس نے اسلام کی چودہ سوسال سے چلی آنی والی اصطلاحات کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ قرآن پاک نے مؤمنین کے راستہ چھوڑنے والے کو جہنمی کہا ہے۔[النساء] اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ جو جماعت سے کٹے گا وہ جہنم میں جائے گا۔ [مشکوٰۃ] ایک روایت میں فرمایا کہ: جس طرح بھیڑیوں کا دشمن بھیڑیا ہے، اسی طرح انسانوں کا بھیڑیا

شیطان ہے۔ جو بکری ریوڑ سے جدا ہوتی ہے اُس پر بھیڑیا حملہ کرتا ہے، جو ریوڑ کے ساتھ رہے وہ بھیڑئے کے حملہ سے بچ جاتی ہے۔ اِسی طرح جو جماعت کے ساتھ ملا رہے شیطان اس پر حملہ نہیں کرتا، اور جو جماعت سے جدا ہوتا ہے، شیطان اس کو گمراہ کر دیتا ہے۔ [مشکوٰۃ] اور ایک روایت میں ہے کہ: جو اجماع سے کٹ گیا تو گویا اس نے اسلام کا پٹہ اپنے گلے سے اتار کر پھینک دیا۔ جاوید احمد غامدی بھی بہت سے اجماعی مسائل کا انکار کر کے اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو جہنم کا ایندھن بنانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت فرمائیں۔ [چند اجماعی مسائل اور غامدی]

☆......☆......☆......☆

محققِ اہلِ سنت، ترجمانِ مسلکِ دیوبند حضرت مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ

[مدیر: جامعہ عثمانیہ، ترنڈہ رحیم یار خان......سرپرست اعلیٰ: اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان]

گذشتہ چند سالوں سے مولانا محمد عمار خان صاحب ناصر اہل حق کی نظروں میں متنازع فیہ شخصیت قرار پا چکے ہیں کہ وہ جاوید غامدی پرویزی کی تقلید میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کی راہ سے ہٹ کر گمراہی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں اور ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے بیٹے کی ہر صحیح اور غلط بات کے دفاع میں پیش پیش ہیں۔ [''عمار خان پر غامدی کے اثرات'' نامی مضمون سے اقتباس]

☆......☆......☆......☆

وکیلِ احناف، شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد منور مدظلہم

[شیخ الحدیث والتفسیر: جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا......نائب امیر: اتحاد اہل السنۃ والجماعۃ پاکستان]

اہل قرآن، اہل حدیث، مودودی ازم، فتنہ غامدیت اور ان جیسے دیگر اسلاف واکابر کے فکر وتحقیق سے آزاد اداروں، شخصیتوں اور ان کے لٹریچر سے احتراز لازم ہے کہ اس میں دین وایمان کی حفاظت ہے۔

منیر احمد منور، خادم التفسیر والحدیث جامعہ اسلامیہ، باب العلوم، کہروڑ پکا۔

☆......☆......☆......☆

استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی عطاء الرحمٰن مدظلہم

[مدیر وشیخ الحدیث: دار العلوم مدنیہ، بہاولپور]

الجواب باسم ملہم الصواب

صورتِ مسئولہ میں جاوید احمد غامدی کے عقائد ونظریات جو کہ استفتاء کے ساتھ لف ہیں۔ اُن کا بغور مطالعہ کیا اور بعض حوالہ جات کا اُس کی اصل کتابوں سے موازنہ بھی کیا۔ اُس کے اِن عقائد ونظریات مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی

(۱) اس کے بعض نظریات کفریہ ہیں۔ مثلاً قربِ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا انکار، بعض سنتوں کے سنیت کا انکار، احادیث کا انکار۔

(۲) بعض نظریات الحادی ہیں۔

(۳) اس کے نظریات میں جا بجا قرآنی تصریحات کا انکار، احادیثِ متواترہ اور مسائلِ اجماعیہ کا انکار واضح ہوتا ہے۔

لہٰذا اِن عقائد کا حامل شخص دائرہ اسلام سے خارج، ضال اور مضل اور کفریہ عقائد کا مالک ہے۔ ایسے شخص کی پیروی کرنا اور اس کو مقتداء اور پیشوا ماننا اور داعی اسلام سمجھنا اپنے آپ کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا ہے۔ اِس سے خود بھی بچنا اور دوسروں کو بچانا فرض ہے۔ [غامدی سے متعلق استفتاء کا جواب]

☆......☆......☆......☆

شہید ناموس رسالت حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمہ اللہ

خلیفہ اجل: امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ

[جانشین مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ......مدیر: ماہنامہ بینات......امیر: عالمی مجلس ختم نبوت کراچی]

......آج کی نشست میں اس ادارہ کے ایک ''نامور'' رکن جناب جاوید احمد غامدی کے قرآن، و سنت، اجماعِ اُمت اور چودہ سو سالہ تعامل کے خلاف انوکھے اور جدید نظریات پر کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے، بلاشبہ اس وقت جناب جاوید احمد غامدی سرکاری سرپرستی، اسلامی نظریاتی کونسل کی بیساکھیوں اور ٹی وی مذاکروں اور پروگراموں کی ''برکت'' سے شہرت کی بلندیوں پر ہیں۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ میرے جیسے کم علم ''کٹھ ملا'' ''تنگ نظر'' ''شدت پسند'' ''تاریک خیال'' اور ''اِنتہا پسند'' کی بات کا، غامدی صاحب جیسے: ''تجدد پسند'' ''کھلے دماغ'' اور ''مجتہدانہ صلاحیتوں کے مالک'' ''حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے کے منصب پر فائز'' ''جدید دِین وشریعت کے موجد'' دورِ حاضر کے تقاضوں سے میل نہ کھانے والے، دِین سے آزادی دِلانے اور اس کی دورِ حاضر کے تقاضوں سے میل کھاتی جدید تعبیر وتشریح کرنے والے روشن دماغ اِسکالر، کے مقابلہ میں، کوئی وزن نہ ہو، یا اس کو سننے، سمجھنے یا اس پر غور وفکر کے لئے کوئی تیار نہ ہو، تاہم ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے احقاقِ حق کریں اور قرآن وسنت اور دِین وشریعت کی روشنی میں

جو بات صحیح ہو، اس کو صحیح اور جو غلط ہو، اس کو غلط کہیں اور لکھیں۔

ہمیں احساس ہے کہ دورِ حاضر کے ''مجتہدین'' و ''محققین'' اور اُن کا حلقہ ہماری اس سعی و کوشش کو دِیوانے کی بڑ سے زیادہ کچھ اہمیت نہیں دے گا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ وہ سادہ لوح مسلمان، جو دِین کے نام پر ایسے لوگوں کی طلاقت لسانی، چرب زبانی اور اُلٹے سیدھے فلسفے سے متاثر ہو کر، دِین و شریعت کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں، اُن کے سامنے جب تصویر کا دوسرا رخ آئے گا تو کم از کم وہ اس پر غور و فکر کیے بغیر بھی نہیں رہیں گے۔ [''مسئلہ تکفیر اور غامدی سوچ و فکر'' نامی مضمون کے چند اقتباسات]

☆......☆......☆......☆

محقق العصر، ترجمان اہل حق حضرت مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم

[رئیس: دارالافتاء، جامعہ مسجد الہلال، لاہور......خلیفہ مجاز: حضرت سید نفیس الحسینی شاہ رحمہ اللہ]

اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں غامدی صاحب کے بارے میں تبصرہ کریں تو وہ یہ ہے کہ جو شخص بہت سی باتوں میں یہ سمجھتا ہے کہ چودہ صدیوں سے پوری امت گمراہی و ضلالت میں مبتلا رہی اور جو دلیل کے نام کا استحصال کرتا ہے تو شریعت کا ہی نہیں بلکہ عقل و دانش کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ شخص عقل و سمجھ سے بالکل عاری ہے۔ [تحفۂ غامدی]

☆......☆......☆......☆

پیر طریقت، شیخ الحدیث حضرت مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہم

[مہتمم و شیخ الحدیث: جامعہ مظہریہ حسینیہ، جھان، سندھ......خلیفہ مجاز: وکیل صحابہ مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ]

احقر کی نظر میں جاوید غامدی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام پر بعض اہل عقل کے اعتراضات دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے اور بے بس ہو کر ان کو مطمئن کرنے کے لیے دین میں تحریفات کو اپنا شیوہ بنایا اور دین کے اصلی حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

غامدی صاحب کی دین میں عقلی گھوڑے دوڑانے کی روش ان اہل عقول سے مختلف نہیں جو قرون اولیٰ سے یونانی اور الحادی نظریات سے متاثر ہو کر احکام الٰہی سے کھیلنے لگے اور اسے عقل کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی فاسد کر کے نہ صرف سراپا ہدایت والے راستے سے کوسوں دور ہو گئے بلکہ قعر ضلالت میں ایسے گرے کہ پھر واپس نہ آ سکے۔ [''اسلام و تصوف کا صحیح تصور اور غامدی'' نامی مضمون سے انتخاب]

☆......☆......☆......☆

استاذ العلماء، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالقدوس خان قارن مدظلہم

[فرزندار جمند و تلمیذ رشید و خلیفہ مجاز: امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ]

موجودہ دور میں میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے آزاد خیال پروفیسر جاوید احمد غامدی صاحب کو بہت شہرت دی، وہ خود بھی اپنے آپ کو قرآن کریم کی براہ راست تفسیر کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور ان کے پیروکار تو ان کو اجتہاد کے منصب کا اہل سمجھنے لگ گئے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صاحبِ مطالعہ، صاحب معلومات اور صاحبِ لسان ضرور ہیں، اور اپنے اندازِ بیان سے سامعین کو مطمئن کرنے میں مہارت تو رکھتے ہیں مگر ان کے بیانات اور تصانیف میں وہ علمی جھلک ذرا بھی نظر نہیں آتی جو"اہل علم" کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ دورِ حاضر کے کئی فضلاء کرام اور پروفیسر حضرات کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے، ان کے انداز اور بالخصوص عربی اور فارسی عبارات کے مفہوم کو اپنی زبان میں واضح کرنے کی صلاحیت دیکھ کر دیانتداری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کا درجہ اور مرتبہ اس معاملہ میں غامدی صاحب سے بہت بلند ہے، غامدی صاحب اپنے آپ کو قرآن کریم کی براہ راست تفسیر کرنے کا اہل سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت کی دنیا میں ان کو ناقلین کے زمرہ میں شمار کرنا بھی بددیانتی ہے، اس لیے کہ ناقل کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ عبارت کے مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اس کی وضاحت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ غامدی صاحب اس صلاحیت سے یکسر محروم دکھائی دیتے ہیں۔

["تفسیر کے لیے بنیادی شرط اور غامدی صاحب" مضمون کا ابتدائیہ]

☆......☆......☆......☆

محقق العصر حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

فرزندار جمند: فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ

[رئیس دارالافتاء و مدیر: جامعہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودہا]

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔بعد الحمد و الصلاۃ

احقر ناکارہ کو عزیز محترم مولوی حمزہ احسانی سلمہ اللہ تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ وہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات باطلہ کے رد میں حال ہی میں اُپنے ماہنامہ "صفدر" کا ایک خاص نمبر نکالنا چاہتے ہیں جس میں ان کے خلاف جمہور نظریات کا رد کیا جائے گا۔انہوں نے احقر ناکارہ سے بھی فرمائش کی کہ اس سلسلہ میں کوئی مضمون لکھ دیں۔اس مقصد کے لیے عزیز محترم نے غامدی صاحب کی کتاب "میزان" بھی ارسال کی، احقر نے اسے مختلف مقامات سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موصوف جہاں اور بہت سے باطل

نظریات کے حامل ہیں وہاں وہ قرآن کریم کی متواتر قراآت کے بھی منکر ہیں۔قرآن کریم کے خدام میں شامل ہونے کی نیت اور دفاع عن الحق کی غرض سے خیال آیا کہ قراآت عشرہ کی حجیت اور احرف سبعہ کی تشریح کے عنوان پر کچھ معروضات پیش کردی جائیں،اس سے عزیز موصوف سلمہ کی فرمائش بھی پوری ہوجائے گی اور احقاق حق وابطال باطل کا مقصد بھی حاصل ہوجائے گا،واللہ الموفق۔[قراآت قرآن اور غامدی]

☆......☆......☆......☆

نامور محقق،سلطان القلم حضرت مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہم

ہمارے ہاں اس فتنے کی ابتدا سر سید احمد خان نے کی۔پھر اُن کی پیروی میں دو فکری سلسلوں نے اس فتنے کو پروان چڑھایا۔ان میں سے ایک سلسلہ عبداللہ چکڑالوی اور اسلم جیراج پوری سے ہوتا ہوا غلام احمد پرویز تک پہنچتا ہے۔دوسرا سلسلہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی سے گزرتا ہوا جناب جاوید احمد غامدی تک آتا ہے۔گویا یہ دونوں فکری سلسلے"دبستانِ سرسید" کی شاخیں اور برگ وبار ہیں اور"نیچریت" والحاد کے نمائندہ ہیں۔اگرچہ پرویز صاحب اور غامدی صاحب کا طریقِ واردات الگ الگ ہے تاہم نتیجے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔دونوں تجدد،انکارِ حدیث،الحاد اور گمراہی کے علم بردار ہیں۔دونوں اجماع اُمت کے مخالف اور معجزات کے منکر ہیں۔دونوں لغتِ عرب کا سہارا لے کر دین اسلام کا تیاپانچا کرنے کے درپے ہیں۔دونوں فاسد تاویلوں کے ذریعے اسلامی شریعت میں تحریف وتبدل اور ترمیم وتنسیخ کا ارتکاب کرتے ہیں۔دونوں اکابرینِ امت کے مسلمہ ومتفقہ تعبیر کے خلاف ذاتی فہم اور رائے کو دین کی بنیاد بنا کر ٹھوکر کھاتے اور گمراہ کرتے ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ ان کی اکثر تحریرات اسلام دشمن یہودی اور عیسائی عالموں کا سرقہ اور چربہ ہیں۔یہ جو کچھ تحقیق بگھارتے ہیں ان کی یہ باتیں طبع زاد نہیں،رٹو طوطے کی سمع خراش چیخیں ہیں جو وہ چوری کی حرص میں لگاتار رہتا ہے۔ان کی تحریریں بھان متی کا کنبہ ہیں جو کہیں سے اینٹ اور کہیں سے روڑا اُٹھا کر تیار کی گئی ہیں۔......اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھے۔

☆......☆......☆......☆

استاذ العلماء،شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن مدظلہم

[مدیر وشیخ الحدیث:جامعہ عربیہ اظہار الاسلام،چکوال......مجاز بیعت توبہ:وکیل صحابہ مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ]

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے تلمیذ رشید اور خلیفہ مجاز قائد اہل سنت وکیل صحابہ حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ

کے ہی تلمیذ رشید امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حیات مستعار میں دین اسلام کی ہمہ جہت خدمات انجام دیں، درس وتدریس، تحریر وتقریر، تزکیہ وتربیت، دعوت وتبلیغ، وعظ وارشاد اور احقاق حق وابطال باطل سے اسلام کی عظیم الشان خدمت کی اور اس کی پاسبانی وترجمانی کے فرائض سرانجام دیئے۔ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اٹھنے والے تقریباً ہر فتنہ کی سرکوبی کی۔ روافض کا فتنہ ہو یا قادیانیت کا، منکرین حدیث ہوں یا دور حاضر تجدد پسند، خوارج ہوں یا منکرین حیات النبی، منکرین تقلید ہوں یا مودودی......تمام فتنوں کے تعاقب میں اہل سنت کے یہ دونوں راہ نما پیش پیش رہے۔

اِن بزرگوں کی وفات کے بعد جہاں بعض لوگوں نے اِن کے نام پر عقائد حقہ کو مسخ کرنے اور دین ومسلک کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی، الحمد للہ وہیں اِنھی بزرگوں کی اولاد نے اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے داخلی وخارجی فتنوں کی نشاندہی اور اُن کا علمی تعاقب جاری رکھا۔ مجلّہ ''صفدر'' کا ''فتنہ غامدی نمبر'' اِس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

محدث العصر حضرت بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ:

> ''اِس پُرآشوب دَور میں سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ ایمان کے زوال کا خطرہ پیدا ہو۔ اور سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اِس قسم کے فتنوں سے بچنے کی کوشش ہو۔'' [مودودی اکابر کی نظر میں، ص:۳]

حضرتؒ کے اِس فرمان کی روشنی میں ''غامدیت'' اِس وقت کے بڑے فتنوں میں سے ہے، جس کے تعاقب اور قلع قمع کے لیے مجلّہ صفدر الحمد للہ بڑی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اِن حضرات کی محنت کو اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرما کر متلاشیان حق کے لیے نافع بنائے اور ''صفدر'' کی انتظامیہ سمیت تمام اہل حق کو اخلاص واستقامت کے ساتھ اپنے دین کی خدمت کی توفیق بخشیں۔ اور تمام امت مسلمہ کی ہر قسم کے فتنوں سے حفاظت فرمائیں۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

☆......☆......☆......☆

حضرت مولانا قاضی نثار احمد مدظلہم

[مدیر: جامعہ اسلامیہ نصرۃ الاسلام، گلگت......رکن مجلس عاملہ: وفاق المدارس......امیر: تنظیم اہل السنۃ والجماعۃ: گلگت]

بخدمت جناب حمزہ احسانی صاحب مدیر مجلّہ صفدر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ جناب کے موقر جریدے مجلّہ کی طرف سے فتنہ غامدی نمبر سے متعلق تحریر موصول ہوئی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ حضرات نے وقت کے تقاضے کے مطابق اس فتنے کی سرکوبی کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے۔ اس سلسلے

میں ''غامدی فکر'' کے مختلف پہلوؤں پر جن علماء ومشائخ سے مضامین لکھنے کی گزارش کی گئی ہے وہ سب ہمارے قابل قدر اکابر میں سے ہیں اور ان کی تحقیق پر ہم کو پورا اعتماد ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کی ان کاوشوں کو قبول فرمائے۔آپ جناب کی طرف سے غامدی کے نظریات پر مشتمل تفصیلی تحریر بالاستیعاب پڑھ کر غامدی کے متعلق میری رائے درج ذیل سطور میں پیش خدمت ہے۔

سوال میں مذکورہ عقائد ونظریات کا حامل جاوید احمد غامدی صاحب اہل سنت سے خارج اور خلاف شرع عقائد ونظریات کا حامل وداعی ہے۔ان میں سے بعض امور نہ صرف سخت گمراہی کے زمرے میں داخل ہیں بلکہ کفر کی سرحد کو چھو رہے ہیں۔مثال کے طور پر حیات عیسیٰ علیہ السلام،ظہور امام مہدی علیہ الرضوان، حدیث اور اجماع کی حجیت ایسے بنیادی امور ہیں کہ ان کا انکار کرنے والا شخص نہ صرف اہل سنت سے خارج ہو جاتا ہے بلکہ مسلمانوں کے زمرے سے بھی نکل جاتا ہے کیونکہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کا ثبوت نہ صرف احادیث متواترہ سے ہے بلکہ قرآن مجید سے بھی ہے اور اسی پر امت کا اجماع بھی ہے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حیات سے متعلق احادیث کو علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ نے ''التصریح بما تواتر فی نزول المسیح'' میں جمع کر کے ان کو متواتر ثابت کیا ہے اور حدیث متواتر کا انکار کفر ہے۔حیث قال:

''والأخبار المتواترة الواردة في حياة عيسى عليه السلام ونزوله في آخر الزمان كانت ردما بينه وبين مقاصده الباجوجية فأتى على حلها بالإنكار والتحريف ولم يبال الشقي أن إنكارها وتحريفها عين إنكار رسالة محمد صلى الله عليه وسلم وخروج من الإسلام ومروق من الدين نعوذ بالله منه.......أن مسألة نزول المسيح عليه السلام وكونه هو عيسى ابن مريم النبي الإسرائيلي بعينه مما صدعت به النصوص القرآنية وتواترت فيه الأحاديث النبوية وأجمعت عليه الأمة من لدن عهد النبي الكريم صلى الله عليه وسلم إلى يومنا هذا بحيث لا يسمع التأويل ولا يسع فيه القال والقيل وإن جميع ما تفوه به هذا الشقي تقول متقول وما هو بمزحزحه من العذاب أن يحرف أو يؤول.''

[التصريح بماتواتر فی نزول المسيح،ص:۴۷،۴۸،مکتب المطبوعات الاسلاميه]

''أحاديث نزول عيسى عليه السلام متواترة، ولعلك قد عرفت مما ذكرنا أن الأحاديث في هذا الباب متواترة، وقد صرح به جماعة من المحدثين على قول ووجب الإيمان به وأكفر منكره كالفلاسفة من نزول عيسى عليه السلام آخر الزمان؛ لأنه كان نبيا قبل تحلي نبينا صلى الله عليه وسلم بالنبوة في هذه النشأة، وبه صرح الحافظ عماد الدين ابن كثير حيث قال...وقد تواترت الأحاديث عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه أخبر بنزول عيسى عليه السلام...وذكر الحافظ ابن حجر في كتابه فتح الباري تواتر نزول عيسى عليه السلام عن أبي الحسين الآبري، وقال في التلخيص الحبير من كتاب الطلاق وأما رفع عيسى عليه

السلام فاتفق أصحاب الأخبار والتفسير على أنه رفع ببدنه حيا...."[ایضاً،ص:۵۶تا۶۲]

غامدی صاحب کا وفات عیسیٰ علیہ السلام پر قرآنی آیت "فلما توفيتني كنت أنت الرقيب عليهم" سے سوال میں موجود استدلال محض باطل ہے کیونکہ اس آیت میں "توفيتني" کے معنی وفات اور موت نہیں بلکہ "رفعتني" اور "قبضتني" کے معنی ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی مفسر ایسا نہیں ملتا جس نے اس آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کو ثابت کیا ہو۔ قرآن میں اس مقام پر موضوع آیت میں تقابل موت اور حیات کا نہیں کہ غامدی صاحب کے استدلال کے لیے قرینہ بن سکے بلکہ موجودگی اور عدم موجودگی کا ہے کیونکہ الفاظ "ما دمت فيهم" کے ہیں "مادمت حيا" کے الفاظ نہیں جو غامدی کے موقف کے برعکس اس بات پر مشعر ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں کوئی زمانہ ایسا بھی ہوگا جس میں آپ ان کے اندر موجود نہ ہوں اور زندہ ہوں۔ بہرحال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا اور قرب قیامت میں دوبارہ زمین پر نازل ہونا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر تمام صحابہ کرامؓ، تابعین اور پوری امت اسلامیہ کا متفق علیہ اور قطعی متواتر عقیدہ ہے جس کا انکار کفر ہے۔

اسی طرح حضرت مہدی کا قرب قیامت میں ظہور صحیح احادیث اور اجماع امت سے ثابت شدہ مسئلہ ہے اس بارے میں وارد احادیث کو بعض علماء نے ''متواتر'' قرار دیا ہے۔ اس عقیدے کے انکار سے بھی کفر لازم آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کے عقائد پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ''علامات قیامت'' کے ذیل میں ظہور مہدی کا عقیدہ ذکر کیا گیا ہے اور علماء کرام نے اس موضوع پر مستقل رسائل بھی تالیف فرمائے ہیں (مثلاً جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی تصنیف ''العرف الوردی فی ظهور المهدی'')۔ لہٰذا ایسی خبر جو احادیث متواترہ میں ذکر کی گئی ہو اور جسے اہل سنت کے عقائد میں جگہ دی گئی ہو اس کا انکار کرنا پوری امت مسلمہ کو گمراہ اور جاہل قرار دینے کے مترادف ہے۔

''قال العلامة ملا على القارى رحمه الله: و فى المحيط من قال لفقيه يذكر شيئا من العلم او يروى حديثا صحيحا اى ثابتا لا موضوعا هذا ليس بشئى كفر.''
[شرح الفقه الاكبر،ص:۱۷۵، فصل فی العلم والعلماء]

"وبالجملة أن أحاديث ظهور المهدى قد بلغت فى الكثرة حد التواتر، و قد تلقاها الأمة بالقبول فيجب اعتقاده و لا يسوغ رده و إنكاره.....الخ."
[التعليق الصبيح شرح مشكوٰة المصابيح،ج:۴،ص:۱۹۰،طبع عثمانیہ لاہور]

حدیث کے بارے میں یہ کہنا کہ اخبار آحاد سے کسی عقیدہ اور عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا، غامدی صاحب کا اپنا من گھڑت اصول ہے جس کا مقصد دین کی عمارت کو ڈھانے کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ متواتر احادیث تو صرف گنی چنی ہیں، اس کے علاوہ صحیح احادیث کا بیشتر ذخیرہ ''اخبار آحاد'' کے قبیل سے ہے۔

حالانکہ قرآن مجید نے ہر معاملے کے فیصلے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ وَأُولِی الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَیْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِیلًا. (النساء:۵۹) دراصل غامدی صاحب ان منکرین حدیث کی فہرست میں پیش پیش ہیں جو اپنے باطل اور کفریہ نظریات کی ترویج میں احادیث کو رکاوٹ جانتے ہیں جس کی وجہ سے ان لوگوں نے حجیت حدیث کا انکار کیا ہے۔

جاوید احمد غامدی کا اجماع سے متعلق یہ کہنا کہا ''دین کے مآخذ میں اجماع کا اضافہ یقیناً ایک بدعت ہے اور قرآن وسنت کے نصوص میں اس کے لئے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی'' اس قسم کی بات کہنے سے قبل غالباً اس نے قرآن وسنت میں غور کرنا گوارا نہیں کیا ہوگا۔ قرآنی آیت ''وَمَنْ یُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیلِ الْمُؤْمِنِینَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِیرًا''۔ [النساء:۱۱۵] اجماع کی حجیت پر واضح ہے۔ حدیث نبوی: ''عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ لَا یَجْمَعُ أُمَّتِی أَوْقَالَ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَى ضَلَالَةٍ ''۔[ترمذی] سمیت متعدد احادیث اجماع کی حجیت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجماع کو ادلہ اربعہ میں سے با قاعدہ دلیل کے طور پر فقہ کا ماخذ تسلیم کر لیا گیا ہے اور اس کے منکر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی اجماع قطعی کا انکار کرے تو وہ کافر ہو جائیگا، بعض اصولیین نے یہ تفریق کی ہے کہ اگر ضروریاتِ دین پر اجماع ہوا ہو اور وہ عوام وخواص کے درمیان متعارف ہو تو ان کا منکر کافر ہوگا؛ لیکن جو اجماع اس قبیل سے نہ ہو تو اس کے منکر کو کافر قرار نہیں دیا جائیگا، جیسا کہ بعض مسائل وراثت پر اجماع ہوا ہے۔ اور فخر الاسلام بزدویؒ کا کہنا ہے کہ صحابہؓ کا جس مسئلہ پر اجماع ہوا ہو اس کا کوئی انکار کرے جیسے مانعینِ زکوۃ سے قتال وغیرہ تو اس کو کافر شمار کریں گے اور صحابہ کرامؓ کے بعد کے لوگوں کا اجماع کا کوئی منکر ہو تو وہ گمراہ اور ضال ہوگا۔ [الموسوعة الفقهیه :۴۹/۲، وزارة الاوقاف، کویت] اس لیے غامدی صاحب کا اجماع سے بالکلیہ انکار بھی کفر کو مستلزم ہے۔

جاوید غامدی کو ان کے مذکورہ بالا عقائد کے پیش نظر مذہبی پیشوا بنانا، ان سے شرعی سوالات کرنا یا ان کے گروہ میں شمولیت اور اس کے ادارے کی رکنیت حاصل کرنا، عوام الناس کے لئے ان کے بیانات سننا، ان کے تلامذہ و متبعین کی تحریرات پڑھنا سخت گناہ ہے اور ان کے نظریات وخیالات کی تائید یا ترویج واشاعت کرنے والوں کا حکم بھی جاوید غامدی کی طرح ہے۔ واللہ العاصم عن الشرور والفتن۔

☆......☆......☆......☆

......باب نمبر۳......

قلمی وعلمی فتنے

مسلکی تصلب ودینی حمیت: اکابر اہل علم کے چند نمونے،
تفردات کے نقصانات، تجدد پسندوں کے قلمی وعلمی فتنے،
جدید مفکرین کے طریقے

امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ کی اپنے

تلامذۃ اور مریدین کے لیے نصیحت

عزیزان گرامی قدر!

میں کسی بھی مسئلہ میں اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا۔ بلکہ قرآن وسنت اور فقہ وتاریخ کے تمام افکار ومسائل میں اکابرین علماء دیوبند کی اجماعی تحقیق پر اعتماد کرتا ہوں اور اُن کی تمام اجماعی تعلیمات کو حق جانتے ہوئے اُن پر عمل پیرا ہونے کو اپنے لیے ہدایت اور نجات کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں اپنے تمام تلامذہ، مریدین اور متعلقین کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اکابر علماء دیوبند کے مسلک پر سختی کے ساتھ عمل پیرا رہیں۔ اور اُن کے دامن کو کسی صورت چھوڑنے نہ پائیں۔ جو اکابر علماء دیوبند کے اجماعی مسلک کو قرآن وسنت کے مطابق سمجھتے ہوئے اس پر پوری طرح قائم رہے وہ میرے متعلقین میں شامل ہے۔ اور جس کا اکابر کی اجماعی تحقیق پر اعتماد نہ ہو میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

نوٹ: عقیدہ حیات النبی کے بارہ میں اکابر علماء دیوبند کے مسلک جو "**المهند على المفند**" کے اندر مذکور ہے، اس کی روشنی میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں ارواح مبارکہ کے تعلق کے ساتھ زندہ ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ اور عند القبر پڑھا جانے والا صلوٰۃ وسلام سنتے ہیں۔ ہمارے حضرت رئیس المفسرین حضرت مولانا حسین علی صاحب رحمہ اللہ کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ جس کا یہ عقیدہ ہے وہی دیوبندی ہے۔ اور میرے متعلقین میں شامل ہے۔ اور جس کا یہ عقیدہ نہ ہو اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

تحفظ ناموس رسالت اور عقیدہ ختم نبوت کی پاسبانی کے لیے میرے تمام شاگرد، مریدین ومتعلقین "**عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت**" کے ساتھ ہر قسم کا بھرپور تعاون فرمائیں کہ یہ جماعت ہمارے بزرگوں کی قائم کردہ ہے۔ میری سب کو یہ نصیحت اور حکم ہے۔

(امام اہل سنت، حضرت مولانا) ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر (رحمہ اللہ)

مسلکی تصلب ، دینی غیرت و حمیت ...... اور امت کے ایمان و عمل کی سلامتی کی فکر

اہلِ حق اکابر کے طرزِ عمل کے چند نمونے

غامدی صاحب کی طرح مودودی صاحب نے بھی ایک خطرناک ، ایمان سوز ''علمی و قلمی فتنہ'' بپا کیا تھا۔ اکابر علماء نے نہ صرف مودودی صاحب کا علمی تعاقب کیا بلکہ سخت سے سخت الفاظ میں اُن کی گمراہی کو واضح کرتے ہوئے عوام کو مودودی صاحب، اُن کی تحریرات اور اُن کی جماعت سے دُور رہنے کی تلقین بھی کی۔ ذیل میں ''مودودی مذہب'' اور ''مودودی صاحب اور ان کی تحریرات کے متعلق چند اہم مضامین'' نامی کتب سے بعض اکابر کی چند تحریرات بطورِ نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ [ادارہ]

اکابر دیو بند کا متفقہ فیصلہ:

دفتر جمعیت علمائے ہند دہلی میں بتاریخ یکم اگست ۵۱ء علمائے کرام کے اجتماع میں حسب ذیل فیصلہ صادر ہوا:

''مودودی صاحب کی جماعت اور جماعت اسلامی کے لٹریچر سے عام لوگوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ ائمہ ہدایت کے اتباع سے آزادی اور بے تعلقی پیش ہو جاتی ہے جو عوام کے لیے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے۔ اور دین سے صحیح وابستگی رکھنے کے لیے صحابہ کرام اور اسلاف عظام سے جو تعلق رہنا چاہیے، اس میں کمی آجاتی ہے۔ نیز مودودی صاحب کی بہت سی تحقیقات جو غلط ہیں اور پھر ان امور سے ایک جدید فتنہ بلکہ دین ہی کی ایک محدث اور نئے رنگ کی بنیاد پڑ جاتی ہے جو یقیناً مسلمانوں کے دین کے لیے مضر ہے۔ اس لیے ہم ان امور اور ان پر مشتمل تحریک کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔ اور اس سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔''

مؤیدین حضرات:

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا السید حسین احمد صاحب مدنی۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیو بند، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب مہتمم مظاہر العلوم سہارنپور، حضرت مولانا احمد سعید صاحب دہلوی، حضرت مولانا سعید احمد صاحب مفتی مظاہر العلوم سہارنپور۔ شیخ الادب حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب دارالعلوم دیو بند، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب مصنف شاندار ماضی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

[منقول از ماہنامہ دارالعلوم دیو بند ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ صفحہ ۴۹، روز نامہ الجمعیۃ دہلی ۳ راگست ۵۱ء]

مودودی اتحاد العلماء:

مودودیت کے متعلق پاک وہند کے اکابر علمائے دیوبند کے فیصلوں کے باوجود جو لوگ اکابر دیوبند کی عقیدت کا بھی اظہار کرتے ہیں اور مودودی صاحب کو بھی محقق اسلام اور داعیِ حق سمجھتے ہیں اور عامۃ المسلمین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب کی جماعت پاکستان میں صحیح اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ ہے۔ اور اکابر علمائے اسلام اور مودودی صاحب میں محض معمولی فروعی اختلافات ہیں وہ یا تو مسلک حق اور حقیقت اسلام سے بالکل ناواقف ہیں، یا تلبیس ونفاق کے پردہ میں مودودیت کے جراثیم پھیلانا چاہتے ہیں اور مودودی جماعت کے بعض مولوی صاحبان جو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور سے بھی اپنا تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اور ''اتحاد العلماء'' کے نام سے ''مودودی نظریات'' کی تبلیغ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، ان کی خدمت میں ہماری گذارش یہ ہے کہ وہ جس عقیدہ اور نظریہ کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور جس تحریک کی تائید وتقویت کے لیے وہ کوشاں ہیں اس میں وہ آزاد ہیں۔ لیکن ملتِ اسلامیہ پر رحم کرتے ہوئے اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے وہ یہ اعلان کر دیں کہ ''مسلکِ دیوبند'' سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور اکابر علمائے دیوبند کو ہم حق پر نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی ہم امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد ہیں اور نہ ہی مذہب اہل السنۃ والجماعۃ کو ہم من کل الوجوہ حق پر سمجھتے ہیں اور مودودی صاحب کی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ انبیاء کی عصمت کو ہم دوامی نہیں سمجھتے اور بعض صحابہ کو (نعوذ باللہ) ہم مخالف کتاب وسنت سمجھتے ہیں۔ اور متعہ کو بھی اضطراری حالت میں جائز جانتے ہیں۔ اور اگر آپ یہ جواب دیں کہ ہم عصمتِ انبیاء، عظمت وعدالت صحابہؓ اور متعہ وغیرہ عقائد ومسائل کے بارے میں مودودی صاحب سے متفق نہیں ہیں تو پھر حق بیانی سے کام لیتے ہوئے مودودی صاحب کے غلط نظریات کی بھی صاف صاف تردید کریں اور ان کو بھی اخبارات ورسائل کے ذریعہ نصیحت فرمائیں۔ جس طرح علمائے حق کے متعلق زبان وقلم سے یہ خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ گومگو کی پالیسی اہلِ حق کا شیوہ نہیں ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اگر کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی مقدس شخصیتوں کو داغدار ثابت کرنے کی ناپاک کوشش کریں تو آپ کو صدمہ نہ پہنچے بلکہ اس کو دینی خدمت قرار دیں۔ اور جب علمائے حق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع میں مودودی صاحب کی تردید کریں تو آپ کے قلوب میں اشتعال پیدا ہو جائے۔ کیا مودودی صاحب کی عظمت آپ کے عقیدہ میں اصحاب رسول ﷺ سے زیادہ؟ فاعتبروا یا أولی الابصار

مودودی صاحب کے بارے میں یہ اکابر علمائے حق کے ارشادات ہیں۔ یہ وہ علماء ہیں جن کے متعلق یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ سب نے کسی رقابت وغیرہ کی وجہ سے مودودی صاحب کے خلاف ایسا لکھا ہو۔

ایسے جلیل القدر علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ عامۃ المسلمین کے لیے علمائے کرام کی بصیرت وتحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے ایسے جدید فتنوں سے اجتناب ضروری ہے جو مسلکِ سلف صالحین کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو صحابہ کرام اور اسلاف عظام اور اولیائے امت کی اتباع میں اسلام پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ والسلام......الاحقر مظہر حسین غفر لہ، مدنی جامع مسجد چکوال ۔۴ ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ و۴ فروری ۱۹۶۸ء [مودودی مذہب]

مودودی کی تحریرات میں نجاست کی بُو ہے۔ (حضرت تھانویؒ)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو کسی نے مودودی کا رسالہ ''ترجمان'' دیدیا، آپؒ نے چند سطریں پڑھ کر ارشاد فرمایا:

''باتوں کو نجاست میں ملا کر کہتا ہے۔ اہل باطل کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔'' (اور رسالہ بند کر کے رکھ دیا۔) [خاتمۃ السوانح، ص:۱۴۴][مودودی صاحب اوران کی......ص:۱۵]

مودودی لوگوں کو دوزخ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ (حضرت مدنیؒ)

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اب تک ہم نے مودودی صاحب اوران کی نام نہاد جماعت اسلامی کی اصولی غلطیوں کا ذکر کیا ہے جو انتہائی درجہ کی گمراہی میں ہیں۔

اب ہم ان کی قرآن شریف اور احادیث صحیحہ کی کھلی ہوئی مخالفتوں کا ذکر کریں گے۔ جن سے صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مودودی صاحب کا کتاب وسنت کا بار بار ذکر فرمانا محض ڈھونگ ہے، وہ نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ سنت کو مانتے ہیں۔ بلکہ وہ خلاف سلف صالحین ایک نیا مذہب بنا رہے ہیں اور اسی پر لوگوں کو چلا کر دوزخ میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔'' [مودودی دستور اور عقائد کی حقیقت:۴۶۔ بحوالہ مودودی مذہب:۹۲]

مودودی کے عقائد قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔ (حضرت مدنیؒ)

جماعت اسلامی اور مودودی صاحب کے متعلق کسی سائل کے جواب میں حضرت مدنی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''یہ جماعت گمراہ جماعت ہے۔ اس کے عقائد اہل السنّت والجماعت اور قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔......اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنا اور تعاون کرنا درست نہیں ہے۔ اس جماعت کی کوشش اس اسلام کے لیے نہیں ہے جو حقیقی ہے، بلکہ ایک نام نہاد اور مودودی صاحب کے اختراعی نئے اسلام کے لیے ہے۔'' [مودودی صاحب اوران کی......ص:۱۵]

مسلمان مودودی کی جماعت سے الگ رہیں۔ (مفتی کفایت اللہؒ)

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مودودی جماعت کے افسر ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں، وہ کسی معتبر اور معتمد علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں۔......(ان کا) دینی رجحان ضعیف ہے۔......مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیے اور ان سے میل جول ربط واتحاد نہ رکھنا چاہیے۔'' [مودودی صاحب اور......ص:۱۶]

مودودی نیا اسلام پیش کرنا چاہتا ہے۔ (حضرت لاہوریؒ)

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''برادرانِ اسلام! مودودی صاحب کی تحریک کو بہ نظرِ غور دیکھا جائے تو ان کی کتابوں سے جو چیز ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ مودودی صاحب ایک نیا اسلام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں اور نعوذ باللہ من ذالک نیا اسلام لوگ تب ہی قبول کریں گے جب پرانے اسلام کے در و دیوار منہدم کر کے دکھا دیے جائیں اور مسلمانوں کو اس امر کا یقین دلایا جائے کہ ساڑھے تیرہ سو سال کا اسلام جو تم لیے پھرتے ہو وہ نا قابلِ قبول، نا قابلِ روایت اور نا قابلِ عمل ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نئے اسلام کو مانو اور اسی پر عمل کرو جو مودودی صاحب پیش فرما رہے ہیں۔ اے اللہ! میرے دل کی دعائیں قبول فرما! مودودی صاحب کو ہدایت فرما اور ان کے متبعین کو بھی اس جدید اسلام سے توبہ کی توفیق عطا فرما۔ اور انہیں اپنا محمدی اسلام پھر نصیب فرما۔ آمین یا الٰہ العالمین [مودودی مذہب: ص:۴][مودودی صاحب اور ان کی......ص:۶۰]

حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ: مودودی جماعت ''جماعت اسلامی'' کے متعلق شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے: ''جتنی جماعتیں اسلام کے نام پر وجود میں آئی ہیں ان میں سب سے زیادہ خطرناک یہ جماعت ''جماعت اسلامی'' ہے میں ''شرح صدر'' اور براہینِ قاطعہ'' کی روشنی میں کہتا ہوں کہ یہ جماعت اسلامی ان بہتر ناری فرقوں میں سے ایک ہے جس کی خبر حضور اکرم ﷺ نے دی ہے۔

شیخ التفسیر امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ اس جماعت اسلامی کے متعلق فرماتے تھے: ''یہ اسلام کا ایک ایک ستون گرا رہی ہے (اس وقت مودودی صاحب کی بدنام زمانہ کتاب خلافت وملوکیت ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھی) جس جماعت کے بارے میں اکابرین کی ایسی آراء ہوں، حضرت اقدس (مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ) اس سے اتحاد وتعاون کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے،

حضرت اقدس عموماً فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی عالم شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کے پاس آتا تو آپ اس سے استفسار فرماتے کہ تم اپنے علاقہ میں اس فتنہ کے خلاف کام کر رہے ہو کہ نہیں؟ اگر کوئی نفی میں جواب دیتا تو آپ اس کی سخت سرزنش فرماتے اور تاکید فرماتے کہ اس جماعت کے غلط نظریات سے لوگوں کو آگاہ کر کے ان کا ایمان بچانا آپ علماء پر فرض ہے۔[حسین یادیں]

مودودیت عوام کے لیے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے۔(حضرت شیخ الحدیثؒ)

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مودودی صاحب کی جماعت اور جماعت اسلامی کے لٹریچر سے عام لوگوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ ائمہ ہدایت کے اتباع سے آزادی اور بے تعلقی پیش ہو جاتی ہے جو عوام کے لیے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے۔'' [مودودی صاحب اور ان کی......ص:۱۷]

سلف سے بے اعتمادی تمام گمراہیوں کی جڑ ہے۔(مولانا منظور احمد نعمانیؒ)

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ [مدیر: الفرقان، لکھنو] لکھتے ہیں:

''جس کے سامنے اس امت کے گمراہ فرقوں اور گمراہ افراد کی تاریخ ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ فہم دین کے بارے میں سلف سے اعتماد اٹھ جانے کے بعد کوئی حصار باقی نہیں رہتا، پھر آدمی پرویز بھی بن سکتا ہے، برق بھی بن سکتا ہے اور ان سے آگے بھی جا سکتا ہے۔ ہر گمراہی کی پہلی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ آدمی کا اعتماد دین کے فہم کے بارے میں سلف سے اٹھ جائے۔'' [مودودی صاحب اور......ص:۶۳]

جماعت اسلامی کی مخصوص ذہنیت بہت بڑا شر ہے۔(مولانا نعمانیؒ)

''میں محسوس کرتا ہوں کہ رفتہ رفتہ اِن سب کا ذہن یہ بنتا جا رہا ہے کہ دین کو اور دین کے تقاضوں کو اگلوں نے صحیح نہیں سمجھا، اب بس مودودی صاحب نے صحیح سمجھا ہے۔ اور جو جماعت سے جتنا زیادہ متاثر ہوتا ہے وہ اس خیال میں اتنا ہی راسخ اور پکا ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فہم دین کے بارے میں سلف سے بے اعتمادی ساری گمراہیوں اور سارے فتنوں کی جڑ ہے۔...... یہ ذہنیت جماعت سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں اب عام ہو رہی ہے تو پھر اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت بڑا شر ہے۔'' [مودودی صاحب......ص:۶۲]

مودودی کا اجتہاد قابل قبول نہیں۔(حضرت حکیم الاسلامؒ)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک مودودی صاحب کی فقہ و تصوف میں رائے زنی اور دخل دینے کا تعلق ہے، مجھے اس

سے شدید اختلاف ہے۔ میں ان کی تحریرات اور طرزِ استدلال نیز نوعیت معلومات سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انہیں دونوں فنون سے مناسبت ہے اور نہ وہ ان میں مستند معلوم ہوتے ہیں۔ اس بارے میں ان کی رائے غیر صاحب فن اور غیر مبصر کے عقلی استنباط سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتی، جو ظاہر ہے کہ حذاق فن اور عملی ماہرین کے سامنے کسی درجہ میں قابل التفات نہیں ہو سکتی۔ موصوف کے اصول پر جب کہ مستند علماء، ماہرین دین حتیٰ کہ سلف صالحین کا اجتہادی استنباط اور فہم نصوص کسی درجہ میں بھی قابل اعتبار نہیں تو ان کے اصول پر خود ان کا استنباط یا فہم نصوص دوسروں کے لیے کیسے قابل قبول اور لائق اعتنا ہو سکتا ہے؟'' [ایضاص:۲۷]

مودودی حضور ﷺ کے اسلام سے مطمئن نہیں۔ (حضرت افغانیؒ)

شمس العلماء حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مودودی صاحب کی تحریرات پر نگاہ ڈالی۔ موصوف کے متعلق احقر کا تأثر یہ ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے اسلام سے مطمئن نہیں۔ اس لیے اس کو اپنے ڈھب پر لانا چاہتے ہیں جس کے لیے اصلی اسلام میں ترمیم ناگزیر ہے، لیکن اس کا چھپانا بھی ضروری ہے۔ اس لیے وہ اپنی اس ترمیم کے تخریبی عمل کو انشاء پردازی و اقامت دین کے نعروں، یورپی طرز کے پروپیگنڈوں کے پردوں میں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تخریبی عمل کے محرکات دو ہیں۔ نفسانی تعلّی اور فقدانِ خشیت اللہ۔ اور عوام میں بھی ان دونوں بیماریوں میں مبتلا افراد کی کمی نہیں، یہی باطنی ہمرنگی دائرہ تحریک کی توسیع کا اصلی سامان ہے''۔ [ص:۲۱]

مودودی ملحد ہے۔ (مولانا خیر محمدؒ)

مخدوم العلماء حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ (خلیفہ حضرت تھانوی) لکھتے ہیں:

''مودودی اور اس کے متبعین کے بعض مسائل خلاف اہل السنۃ والجماعۃ کے ہیں۔ سلف صالحین کی اتباع کے منکر ہیں۔ لہٰذا بندہ ان کو ملحد سمجھتا ہے۔'' [مودودی صاحب اور......ص:۲۱]

مودودی جماعت میں شرکت زہرِ قاتل ہے۔ (مفتی مہدی حسنؒ)

مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی مہدی حسن رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ لوگ جماعت اسلامی سے اجتناب اور دُوری اختیار کریں۔ اس میں شرکت زہرِ قاتل ہے۔ اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ لوگوں کو اس جماعت میں شرکت سے روکیں تا کہ گمراہ نہ ہوں۔ اور اس جماعت کا ضرر اس کا نفع سے کہیں زیادہ ہے۔ پس تسامح اور غفلت جائز نہیں۔...... اس جماعت کا کوئی آدمی اگر کسی مسجد میں امامت کرے گا تو اس کے پیچھے نماز مکروہ ہوگی۔'' [ایضا،ص:۳۰]

مودودی تحریک کی ضلالت اور گمراہ کن بنیادیں بے نقاب ہوگئیں۔(مفتی محمود الحسنؒ)

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن رحمہ اللہ [صدر مفتی دار العلوم دیوبند] لکھتے ہیں:

''امابعد! رسالہ مبارکہ ''فتنۂ مودودیت'' حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب دامت برکاتہم کی تالیف ایک خصوصی اور مختصر خط ہونے کے باوجود اہل علم واہل دین کے لیے مشعل راہ ہے۔جس کی روشنی میں اس تحریک کی ضلالت اپنے خدوخال کے ساتھ بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔اور پھر اس کا پہلا اور سنہرا رنگ کسی مخلص مومن کے قلب ونظر کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔جن حضرات کے پاس اس تحریک کے زہریلے اثرات سے واقف ہونے کے لیے طویل مطالعہ کا وقت نہیں، یا وہ اس کو اصول اسلام پر جانچنے کی استعداد نہیں رکھتے یا ان کی نظر اس کی گمراہ کن بنیادوں کے ادراک سے قاصر ہے ان کو اس رسالے کے ذریعے ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت کا راستہ بسہولت مل جائے گا۔'' [ایضاً،ص:۶۱]

مودودی منکر الحدیث، گمراہ، مبتدع، جاہل واجہل ہے۔(علامہ ظفر احمد عثمانیؒ)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''بظاہر یہ شخص منکر احادیث ہے۔دائرہ اسلام سے تو خارج نہیں مگر گمراہ ومبتدع ہے۔ایسے شخص سے مسلمانوں کو دُور رہنا چاہیے اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہیے۔اس کو جاہل اجہل سمجھنا چاہیے۔'' [ایضاً،ص:۲۵]

مودودی گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے۔(مولانا غورشتویؒ)

حضرت مولانا نصیر الدین صاحب شیخ الحدیث غورغشتوی [خلیفہ: حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ] لکھتے ہیں:

''مودودی ''ضال اور مضل'' یعنی گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے۔'' [مودودی صاحب......ص:۲۲]

مودودی کے عقائد اہل سنت کے خلاف اور گمراہ کن ہیں۔(مولانا عبد الحقؒ)

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ [اکوڑہ خٹک] لکھتے ہیں:

''مودودی صاحب کے عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف اور گمراہ کن ہیں۔مسلمان اس فتنے سے بچنے کی کوشش کریں۔'' [مودودی صاحب،ص:۲۲]

مودودیت کفر میں مبتلا کردینے والا فتنہ ہے۔(حضرت بنوریؒ)

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مودودی صاحب کے رسائل ومقالات وتالیفات میں ایسے خطرناک مواد اور خطرناک تعبیرات

موجود ہیں جن سے جدید نسل جو باقاعدہ علومِ دین سے ناواقف ہیں وہ گمراہی وضلالت ہی نہیں، صریح کفر میں مبتلا ہو جائیں گے۔[مودودی صاحب اوران کی تحریرات کے متعلق چند اہم مضامین، ص:۱۱]

مودودی متکبر ہے۔ رجوع نہیں کرتا۔ (حضرت بنوریؒ)

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''اس قسم کے نظریات یا قلمی طغیانیاں اس شخص کا شیوہ ہے جو نہ اہل اللہ کا صحبت یافتہ ہو، نہ اسے علم دین میں کمال حاصل ہو، عجب وکبر میں مبتلا ہو، اعجاب بالرأی کی وباء عظیم میں ملوث ہو۔''[ص:۴۳]

''کیا ہی اچھا ہوتا کہ مودودی صاحب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کرتے اور اعلان کرتے کہ میں نے یہ بات غلط کی ہے۔ لیکن مودودی صاحب کی تاریخ زندگی میں اس بات کا امکان نہیں۔''[ص:۴۹]

مودودی کے خودساختہ عقائد کی دین میں گنجائش نہیں۔ (مولانا قاضی مظہر حسینؒ)

قائد اہل سنت حضرت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

۱......آج کل پاکستان میں مذہبی واعتقادی حیثیت سے ''جماعت اسلامی'' عموماً زیر بحث ہے۔ علماء اسلام کی اکثریت ''جماعت اسلامی'' کے خلاف ہے اور اس کی وجہ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خودساختہ غلط عقائد ونظریات ہیں، جن کی دینِ حق میں گنجائش نہیں۔

۲...... اور اگر مودودی صاحب صرف اپنے زمانہ کے علماء ومشائخ پر برستے تو اور بات تھی، لیکن آپ نے اپنی تنقید سے نہ مجددین ومجتہدین امت کو معاف کیا اور نہ صحابہ کرام اور انبیائے عظام کو۔ خصوصاً انبیائے کرام کو تنقید کا نشانہ بنانا تو مودودی صاحب کا وہ ''کارنامہ'' ہے کہ شاید امت محمدیہ میں کوئی ناقد ہی اس میں ان کا ہم پلہ ثابت ہو سکے۔ مودودی صاحب کے اکثر عقائد ونظریات جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہیں اور علمائے حق سے ان کا اختلاف نہ صرف ''فروعی'' بلکہ ''اُصولی'' بھی ہے۔

[مودودی مذہب، ص:۱۲]

مودودی نے مسلمانوں میں بغض صحابہ پیدا کیا۔ (مفتی رشید احمد لدھیانویؒ)

فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مودودی صاحب سے قبل کوئی ایک مسلمان بھی ایسا نظر نہیں آتا جو کسی صحابی سے بغض رکھتا ہو، مگر آج مودودی صاحب نے مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس مہلک زہر سے مکمل طور پر مسموم کر دیا ہے۔''

[مودودی صاحب اوران کی......ص:۸۷]

مودودی کو صحابہ سے عداوت تھی۔ (مولانا یوسف لدھیانوی شہیدؒ)

شہید اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''مودودی صاحب کے قلم کی کاٹ اور شوخی ان کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، مگر اس ناکارہ کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی یہی ہے۔ان کا قلم مومن وکافر دونوں کے خلاف یکساں کاٹ کرتا ہے۔اور وہ کسی فرق وامتیاز کا روادار نہیں۔جس طرح وہ ایک لادین سوشلسٹ کے خلاف چلتا ہے، ٹھیک اسی طرح ایک مومن مخلص اور خادم دین کے خلاف بھی۔...... جب وہ اہل حق کے خلاف خامہ فرسائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے مسٹر پرویز یا غلام احمد قادیانی کا قلم چھین لیا ہے۔'' [ص:۱۷۵]

''ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ایسا شخص جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو، ٹھیک ٹھیک مستشرقین کے نقش پا کا اتباع کرے گا۔۔۔۔لیکن بدقسمتی سے مودودی صاحب کی کتاب۔۔۔۔خلافت وملوکیت۔۔۔۔کا بالکل یہی رنگ ڈھنگ ہے۔پڑھنے والا مسکین یہ سمجھتا ہے کہ مودودی صاحب تاریخی حقائق جمع کر رہے ہیں۔مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ تاریخ سے کیا لے رہے ہیں اور کیا چھوڑ رہے ہیں۔اور کیا اپنی طرف سے اضافہ کر مار رہے ہیں۔الغرض جس طرح ہزار دل فریبیوں کے باوجود مستشرقین عداوت اسلام کے روگ کو چھپانے سے قاصر رہتے ہیں، اسی طرح مودودی صاحب بھی اپنے اس استشراقی شاہکار میں ہزار رکھ رکھاؤ کے باوصف، عداوت صحابہ کو چھپا نہیں سکتے۔اب اگر مودودی صاحب یا ان کے عقیدت مندوں کی تاویلات صحیح ہیں تو مستشرقین کا کارنامہ اُن سے زیادہ صحیح کہلانے کا مستحق ہے۔اور اگر یہودی مستشرقین کا طرزِ عمل غلط ہے تو اسی دلیل سے مودودی صاحب کا رویہ بھی غلط ہے۔'' [مودودی صاحب......:۱۸۴]

''صحابہ کرام کے باہمی معاملات میں آج کسی بڑے سے بڑے شخص کا لب کشائی کرنا، اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بھنگی بازار میں عدالت جما کر بیٹھ جائے اور وہ ارکانِ مملکت کے بارے میں اپنے بے لاگ فیصلے لوگوں کو سنانے لگے۔ایسے موقعوں پر ہی کہا گیا ہے: ایاز! قدر خویش بشناس!'' [۱۸۸]

حضرت مولانا نور محمد تونسوی نور اللہ مرقدہ

تفردات کے نقصانات

قارئین کرام! یہ چند سطور آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں جن میں جمہور امت کی رائے کے برعکس راہِ تفرد اختیار کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے، کیونکہ ہم جیسے لوگوں کے لیے سلف صالحین کی پیروی کرنا اور جمہور امت کا اتباع کرنا ایک سلامتی کی راہ ہے، جس میں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔ کسی بھی مسئلہ میں اکابر سلف صالحین کی راہ سے ہٹ جانا اور بزرگانِ دین سے کٹ کر رہ جانا کسی بڑے خطرے اور فتنے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے' لہٰذا ہم جیسے اصاغر کے لیے تفردات کی پُر خار وادی میں قدم نہ رکھنا ہی مناسب ہے، واضح رہے بندہ عاجز کا روئے سخن عصر حاضر کے اہل علم کی طرف ہے، جہاں تک ادوارِ سابقہ کے اہلِ علم کے تفردات کا تعلق ہے تو وہ قطعاً میری گزارشات سے مستثنیٰ ہیں:

اولاً: اس لیے کہ وہ عالم دنیا سے عالم قبر و برزخ میں پہنچ چکے ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی شان کے مطابق فیصلہ فرمائیں گے۔

ثانیاً: اس لیے کہ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد صرف اُن کی کتابیں ہیں، جن سے اکا دکا تفرد محسوس ہوتا ہے، لیکن اُن کی عبارات میں کئی احتمال ہیں، لہٰذا بندہ عاجز ایسے اہل علم کے حق میں حسن ظن کی تلقین کرتا ہے، کیونکہ دنیا سے رفتگان کے متعلق یہی سلامتی کی راہ ہے۔ معاف رکھنا! میری مراد علماء اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، نہ کہ مرزا غلام احمد قادیانی جیسے داعیانِ ضلالت! یہ وضاحت اس لیے میں نے ضروری سمجھی کہ میرا روئے سخن ادوارِ سابقہ کے علماء کی طرف نہیں ہے، تاکہ عصرِ حاضر کا کوئی تفرد پسند شخص گزشتہ اہلِ علم کی آڑ لے کر اپنے تفرد یا ضلالت و گمراہی کو تحفظ دینے کی کوشش نہ کرے۔ اِس مختصر سی تمہید کے بعد اب تفردات کے نقصانات ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ دنیا میں جتنے فرقے معرضِ وجود میں آئے، تقریباً سب کی بنیاد کسی نہ کسی اہل علم کے تفرد پر ہے، جس کو فرقہ پسند لوگوں نے ہاتھ میں لے کر ایک نئے فرقے کی داغ بیل ڈال لی، لہٰذا کسی بھی مسئلہ میں راہ تفرد اختیار نہ کی جائے، تاکہ یہ تفرد جلد یا بدیر کسی فرقہ کا سبب نہ بنے۔ راہِ تفرد اختیار کرنا گویا باطل پرستوں کو ہتھیار مہیا کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا تفردات سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

۲۔ تفردات کی راہ پر چلنے کی وجہ سے سلف بیزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور سلف بیزاری بعض اوقات خطرناک صورت بھی اختیار کرلیتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سلف صالحین کی راہ کو صراط مستقیم قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''صراط الذین انعمت علیھم '' لہٰذا ایسے راستے پر نہیں چلنا چاہیے جو سلف بیزاری کا باعث بنتا ہو۔

۳۔ آدمی بعض اوقات تفردات اختیار کرتے کرتے عملی یا ذہنی طور پر جلد یا بدیر غیر مقلد بن جاتا ہے اور ترکِ تقلید کے بھیانک انجام آئے دن لوگوں کے سامنے آرہے ہیں، حتیٰ کہ خود علمائے اہلحدیث بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ترک تقلید الحاد و زندقہ کی دہلیز ہے، لہٰذا جس کام سے غیر مقلدیت کی طرف رجحان پیدا ہو وہ ترک کرنا لازم ہے۔

۴۔ جب کوئی شخص کسی غیر اہم مسئلہ میں راہ تفرد اختیار کرتا ہے تو لازماً وہ اپنے تفرد میں غلو کا شکار ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ ہر جگہ اپنے تفرد کا پرچار کرتا نظر آتا ہے اور اس پر مناظرے اور مباحثے کرتا ہے، اس کی اس شدت کی وجہ سے وہ غیر اہم مسئلہ، ایک گونہ اہمیت اختیار کرلیتا ہے، جب کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ ہر مسئلے کو اپنے مقام اور اپنی حیثیت پر رکھا جائے، اس میں افراط و تفریط نہ کی جائے، چونکہ تفرد کی وجہ سے مسئلے کی اصل حیثیت برقرار نہیں رہتی، اس لیے تفرد اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ جب کوئی شخص بزرگانِ دین کی راہ سے ہٹ کر تاراہِ تفرد اختیار کرتا ہے تو ابتدائی چند دن تو اُن اکابر کا احترام کرتا ہے جن کی راہ کو چھوڑ چکا ہوتا ہے، لیکن آگے چل کر اُس کا تفرد ایک ایسی صورت اختیار کرلیتا ہے کہ صاحبِ تفرد اکابر کے حق میں سوءِ ظن کا شکار ہوجاتا ہے اور بعض اوقات اکابر کے حق میں توہین آمیز کلمات استعمال کرتا ہے اور یہ بات اس کے لیے ناگزیر بن جاتی ہے، کیونکہ لوگ اسے یہ طعنہ دیتے ہیں کہ: تیری رائے تو یہ ہے جبکہ بزرگانِ دین تو یوں کہتے ہیں!! اس بے چارے سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو مجبوراً اکابر کا وزن گرانے کی کوشش کرتا ہے اور اُن کی رائے کو غلط قرار دے کر ان کے حق میں نازیبا الفاظ استعمال کرنے لگتا ہے۔

واضح رہے کہ بزرگانِ دین کے حق میں سوءِ ظن خود صاحبِ تفرد میں پیدا ہوجاتا ہے، اگر بالفرض وہ اس سے بچ بھی نکلے تو اس کے تفردات کے پیروکار یقیناً اس کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔

۶۔ بعض اوقات راہِ تفرد اختیار کرنے والے کو تفردات اختیار کرنے کی عادت پڑجاتی ہے، (چسکا لگ جاتا ہے۔) وہ ایک تفرد سے دوسرا، پھر تیسرا تفرد اختیار کرتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ درجنوں مسائل میں تفردات اختیار کرلیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک تفرد بھی کہیں جاکر نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے تو نہ معلوم یہ

درجنوں تفردات کتنا نقصان کرڈالیں گے، لہٰذا ایسی راہ اختیار ہی نہیں کرنی چاہیے۔

۷۔ بسااوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شروع شروع میں راہِ تفرد اختیار کرنے والا معمولی اور غیر اہم مسائل میں جمہور امت سے ایک جداگانہ رائے اختیار کرتا ہے، پھر جب اسے تفردات کی راہ اختیار کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ غیر اہم مسائل سے نکل کر اہم اور اجماعی مسائل میں بھی تفرد اختیار کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ اجماع امت ایک شرعی حجت ہے، جس کی خلاف ورزی کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ اجماع امت کے خلاف رائے قائم کرنا اور اجماع کا انکار کرنا سنگین ترین جرم ہے، حتی کہ بعض علماء کرام اجماع کے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں۔

۸۔ ایک صاحب علم اور قرآن وحدیث کے علوم میں پوری پوری مہارت رکھنے والا جس کی علمی لیاقت، دیانت اور اہلیت اہل حق علماء کے ہاں مسلم بھی ہو، وہ اگر کسی غیر اہم مسئلہ میں تفرد اختیار کرلے تو اس کے دیکھادیکھی بے علم اور نا اہل لوگ بھی مسائلِ شرعیہ میں رائے ظنی کرنے اور تفردات اختیار کرنے لگتے ہیں۔ لہٰذا اہل علم حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ جمہور امت کی رائے کا احترام کریں اور اسی پر قائم رہیں، کسی بھی مسئلہ میں راہِ تفرد اختیار نہ کریں، تاکہ کم علم اور غیر اہل لوگوں کو اُن کے تفرد سے حجت پکڑنے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

۹۔ راہِ تفرد اختیار کرنے والا شخص دِن رات اسی فکر میں رہتا ہے کہ میرے تفرد کو جمہور امت کی رائے پر فوقیت اور برتری حاصل ہو جائے اور ایسی برتری کہ میرا تفرد برحق نظر آنے لگے اور جمہور امت کی رائے ناحق بن کر رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اپنے تفرد کو یہ رنگ دینا کہ وہ حق اور جمہور امت کی رائے ناحق بن جائے' کسی طور بھی منصفانہ اور درست اقدام نہیں ہوسکتا۔

۱۰۔ صاحب تفرد اپنے تفرد کو قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور علماء اسلام کی عبارات سے بھی وہ مطلب کشید کرتا ہے جس سے اُس کے تفرد کو تقویت حاصل ہو، حالانکہ کبھی اس کے تفرد کی کوئی دلیل نہیں ہوتی، بلکہ وہ زبردستی اپنے تفرد کے لیے دلائل گھڑتا ہے اور یہ طریقہ استدلال اہل علم کے ہاں مردود ہے کہ اولاً اپنے ذہن سے مسئلہ بنایا جائے، پھر اس کے متعلق دلائل بنائے جائیں۔ علماء اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں، یعنی وہ قرآن کریم اور حدیث نبی کو اصل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بے راہ لوگ اپنے مسئلہ کو، اپنے عقیدے کو اصل بنا کر قرآن وحدیث کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عموماً ہر راہ تفرد اختیار کرنے والا اس بے راہ روی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

۱۱۔ جب کوئی شخص کسی مسئلہ میں تفرد اختیار کر لیتا ہے تو اس کو قرآن وحدیث میں موجود ایسے دلائل نظر آتے ہیں جو اس کے تفرد کے بالکل موافق نہیں ہوتے، اب ایسا شخص قرآن وحدیث کی تاویلات باطلہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، تاکہ قرآن مجید کی کوئی آیت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث اس کے تفرد کے ناموافق نہ رہے، بلکہ تاویلات باطلہ کی بھینٹ چڑھ کر اس کے تفرد کے موافق نظر آنے لگے۔ جب کہ قرآن وحدیث میں ناروا تاویلات کرنا اہل حق کا شیوہ نہیں ہوا پرستوں کا وطیرہ ہے۔

۱۲۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ تفرد کبھی بھی امت مسلمہ کے حق میں سودمند ثابت نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ نقصان دہ ہی ثابت ہوا ہے۔

۱۳۔ جمہور علماء اسلام کا فیصلہ ہے کہ تفرد چاہے کسی بڑے سے بڑے آدمی کو کیوں نہ ہو، اُسے نہیں اپنانا چاہیے، بلکہ اتباع جمہور ضروری ہے، چنانچہ حضرت اقدس مفتی رشید احمد لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

> ''علاوہ ازیں یہ امر مسلم ہے کہ کوئی کتنا ہی بڑا محقق جمہور کے خلاف قول کرے تو اس کا اتباع جائز نہیں، مسلک جمہور ہی واجب الاتباع ہے، جب دائرہ مذہب کے اندر بھی جمہور کے خلاف قول کا اتباع ممنوع ہے تو خلاف مذہب قول کا اتباع بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا، چنانچہ محقق ابن الہمامؒ مجتہد فی المذہب ہیں، آپ کا مقام تفقہ صرف مشائخ احناف ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں مسلم ہے، مع ہذا یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ آپ کی جو تحقیقات خلاف مذہب ہیں، ان کا اتباع جائز نہیں''۔

(شرح عقود رسم المفتی، ص:۲۵......احسن الفتاویٰ ج:۴، ص:۱۸۷ مطبوعہ ۱۴۰۳ء)

معلوم ہوا تفرد چاہے کتنے بڑے آدمی کا ہو، اس پر عمل کرنا جائز نہیں، بلکہ اتباع جمہور لازم ہے۔ لہٰذا تفرد کرنا ایک بے سود کام ہے۔

۱۴۔ تفردات جب اپنی حدود سے نکل جاتے ہیں تو امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔

۱۵۔ علماء حق کے قلوب میں ایک دوسرے کی محبت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اکرام واحترام کی فضا برقرار رہتی ہے، لیکن جب کسی کا تفرد شہرت پکڑ لیتا ہے اور اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوتی ہیں تو وہ پر خلوص محبت برقرار نہیں رہتی، بلکہ اس میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات محبتوں کی جگہ نفرتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ لہٰذا جو چیز نفرتوں کا باعث بنے، اس سے اجتناب لازم ہے۔

بندہ عاجز گذارش کرتا ہے کہ سلف صالحین میں سے کسی بزرگ کے تفردکو اپنے تفردات (یا ضلالات وگمراہی) کے لیے نہ تو سند جواز بنایا جائے اور نہ ہی اس بزرگ کے متعلق سوءِ ظن رکھا جائے، کیونکہ میرے مخاطب اِس زمانہ کے اہل علم ہیں یا پھر آنے والی نسلیں!

میری گزارش کا خلاصہ یہ ہے کہ: ''گذشتہ را صلوات، آئندہ را احتیاط'' بندہ عاجز اہل علم اور اصحاب تحقیق سے پرامید ہے کہ وہ میری ان گذارشات پر خفا نہ ہوں گے، بلکہ سنجیدگی سے ان پر غور فرمائیں گے۔ اگر میری ان تجاویز میں کسی قسم کی غلطی واقع ہوئی ہو تو اہل حق حضرات ضرور میری اصلاح فرمائیں۔ بندہ عاجز یقین دہانی کراتا ہے کہ اہل علم حضرات کی ہر اصلاح کو خندہ پیشانی سے قبول کیا جائے گا اور ساتھ ساتھ ان کا شکر گذار بھی ہوں گا۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جمہور امت، سلف صالحین اور اکابر بزرگان دین کی سچی پیروی نصیب فرمائے اور انہی کے نقش قدم پر چل کر کتاب وسنت، اجماع اور قیاس شرعی پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہر قسم کی بے راہ روی، ذہنی آوارہ گردی اور اسلاف بیزاری سے محفوظ رکھے۔ آمین

☆......☆......☆......☆

مولانا فضل محمد یوسف زئی مدظلہم

قلمی و علمی فتنوں کا تسلسل......اور جاوید احمد غامدی

......''جاوید احمد غامدی سیاق وسباق کے آئینے میں!'' نامی طویل مضمون کا ایک حصہ......

اسلام کے خلاف غامدی فتنہ آج کا نہیں، بلکہ دین اسلام کے خلاف شروع دن سے ایک لاوا پھٹ پڑا ہے جو مسلسل بہہ رہا ہے اور غامدی صاحب جیسے لوگ اس میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک طویل دورانیہ ہے جس میں دورِ نبوت ہی سے دینِ مقدس کے بدخواہوں نے اسلام کے لبادے میں آ کر اسلام کے مقدس وجود پر ظالمانہ خنجر چلائے ہیں اور اسلام کے معصوم چہرے پر اپنی باطنی غلاظت پھینکنے کی کوشش کی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مقدس دین قیامت تک باقی رہنے کے لیے آیا ہے، کسی بد باطن کی بدخواہی سے یہ ختم نہیں ہوسکتا، البتہ بدخواہ خود ختم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد عالی ہے: ''یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ'' یعنی یہ بدخواہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے نور کو اپنی زبانوں سے بجھا دیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے دین کے اس نور کو مکمل کرنے والے ہیں، اگرچہ بدخواہ کافر اس کو پسند نہ کریں۔ گویا شاعر نے اسی طرح کے موقع پر کہا ہے:

حاسد حسد کی آگ میں خود ہی جلا کرے ۔۔۔ وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

ذرا سوچئے کہ نبوت کے جھوٹے دعویدار اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب کا انجام کیا ہوا جو بڑے شوق سے مقفّیٰ اور مسجع جملے بنا بنا کر اسلام کے خلاف زہر اگلتے رہے؟ کعب بن اشرف یہودی اور عبداللہ بن ابی بن سلول کا کیا حشر ہوا جو اسلام کے معصوم چہرے پر ہر وقت اپنے نجس لعاب پھینکتے رہے، اور اسلام کے روشن چراغ کو بجھانے کے لیے گندی پھونکیں پھونکتے رہے؟ کسی نے سچ کہا ہے:

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ۔۔۔ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ذرا معتزلہ اور خوارج کے فتنوں پر نظر ڈالیے جنہوں نے صدیوں تک اسلام کو پریشان کر رکھا تھا، آخر کیا ہوئے؟ اور کہاں گئے؟ خود ختم ہو گئے اور اسلام زندہ و تابندہ موجود ہے۔ اسلام کے خلاف جہمیہ، مرجئہ، کرامیہ، فلاسفہ، قرامطہ، سوفسطائیہ، لاادریہ اور باطنیہ نے کتنے طویل عرصہ تک فتنے کھڑے کیے اور سازشیں کیں، آخر کہاں گئے؟ ان کا نام ونشان باقی نہیں ہے۔ غامدی صاحب کا فتنہ تو ان کے فتنوں کے سامنے ایک نومولود بچہ ہے۔ ذرا غلام احمد قادیانی کے فتنے کو سوچئے! پوری دنیائے کفر

اس کی پشت پر کھڑی تھی اور تحریرات وتقریرات اور تصنیفات کے حوالہ سے علمی میدان میں میرے خیال میں شاید کسی فتنہ کے لیے اتنا بڑا کام نہیں ہوا ہوگا، لیکن "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا" کا جب ظہور ہو گیا تو حق کے سامنے یہ باطل سسک سسک کر مر گیا اور اس کی باطل عمارت کے پرزے فضاؤں میں اُڑ گئے، اس فتنہ کے مقابلہ میں غامدی صاحب کا فتنہ تو مکڑی کا جالا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کا مقابلہ بھی نہیں کر سکے گا ان شاء اللہ۔

فری میسن کے ایجنٹ سرسید احمد خان کے فتنے کا ذرا مطالعہ کیجئے، انگریز کی چھتری کے سائے تلے وفادار بلبل کی طرح کیسے چہک رہا تھا، علماء حق کو گالیاں دیتا تھا اور احادیث مقدسہ کو اپنی عقل نارسا کے ترازو پر تول کر انکار کیا کرتا تھا، قرآن عظیم میں تحریف کرتا تھا اور معجزات کا انکار کرتا تھا، کچھ بتا دو! کیا اسلام کا کوئی حکم اس کے کہنے سے مٹ گیا یا موقوف ہو گیا؟ صرف ماؤف ذہن اور مشکوک احساسات کے حامل کچھ منافقین اس کے جال میں پھنس گئے، جن کا مقدر یہی تھا۔ بہر حال سرسید احمد خان برصغیر میں انگریزوں کی طرف سے دین کے بگاڑنے کے لیے "بادشاہ" مقرر کیا گیا تھا، جب وہ کچھ نہ کر سکا تو غامدی بیچارا کیا کر سکے گا؟! ہاں! تشویش اور نزاعات کا میدان گرم کر دے گا۔

غلام احمد پرویز، عبد اللہ چکڑالوی، علامہ عنایت اللہ مشرقی کے فتنوں کو دیکھ لیجئے، ہر ایک نے انتہائی فصیح وبلیغ تحریرات کے ذریعہ اور غضب کی تقریرات کے ذریعہ اسلام کے بلند جھنڈے کو سرنگوں کرنے کی کوشش کی، آخر سب کے سب خود سرنگوں ہو گئے۔ بہائی فرقہ کو دیکھ لیجئے، ذکری فتنہ کو دیکھ لیجئے، بلکہ ان تمام فتنوں سے بڑے فتنے کو بھی یاد کیجئے کہ مغل اعظم اکبر بادشاہ نے "دین الٰہی" کے نام سے "دین اکبری" بنایا تھا، کیا اس عظیم فتنہ کے سامنے علماء حق سد سکندری کی طرح کھڑے نہیں ہوئے؟ اور کیا وہ فتنہ اپنے برے انجام پر جا کر ختم نہیں ہوا؟ ہاں! البتہ وقتی طور پر کچھ بدبخت سیاہ کاران فتنوں کا شکار ہو گئے، لیکن میرے خیال میں زیادہ تر ان فتنوں کا شکار وہ لوگ ہوئے جن کا تعلق سرمایہ دار، جاگیردار اور متکبر طبقات سے تھا جو ایک غریب مولوی کے بتائے ہوئے دین کو غریب سمجھتے تھے اور اس پر چلنے کو عار سمجھتے تھے، چنانچہ ایک حد تک میرا تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لینڈ لارڈ چوہدریوں، وڈیروں، نوابوں، سرداروں اور خوانین کو عموماً اصلی دین نصیب نہیں فرماتا تو وہ اس طرح ماڈرن دین میں آ کر پھنس جاتے ہیں۔ غامدی فتنے کے شکار لوگ بھی زیادہ تر یہی فیشن زدہ، روشن خیال اور آزاد منش لوگ ہیں جو دین میں نئی تحقیق نکالنے والے دانشوروں اور چٹکلے چھوڑنے والے فلاسفروں اور عقلی گھوڑے دوڑانے والے اسکالروں کو پسند کرتے ہیں۔

حکایت:

امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں صفحہ: ۷ پر ایک قصہ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عمرو بن

عبید بصری متوفی ۱۴۳ھ مشہور معتزلہ میں سے تھا، بصرہ میں حدیث کا درس بھی دیا کرتا تھا، اس کے نظریات غلط تھے جن کو وہ پھیلایا کرتا تھا۔ بصرہ میں جرح وتعدیل کے امام بڑے محدث ایوب سختیانیؒ بھی درس حدیث دیا کرتے تھے، ان کے درس کے وسیع حلقہ میں علم حدیث سیکھنے والے مختلف لوگ آ کر بیٹھتے تھے، اس درس کے طلباء میں سے ایک طالب علم کچھ عرصہ تک ایوب سختیانیؒ کے پاس پڑھتا رہا، پھر غائب ہو گیا، شیخ ایوب سختیانیؒ اس کو پہچان چکے تھے تو ایک دن طلبہ سے پوچھا کہ وہ طالب علم کہاں چلا گیا؟ طلبہ نے جواب دیا کہ وہ تو عمرو بن عبید معتزلی کے درس میں جا کر بیٹھنے لگا ہے۔ شیخ حماد جو اس قصہ کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ: ایک دن میں اپنے شیخ ایوب سختیانیؒ کے ساتھ سویرے سویرے بازار چلا گیا تو اچانک سامنے سے وہ طالب علم آ گیا، شیخ ایوب سختیانیؒ نے اس کو سلام کیا اور خیر خیریت معلوم کی اور پھر ان سے پوچھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عمرو بن عبید کے درس میں جا کر بیٹھنے لگے ہو؟ اس طالب علم نے جواب میں کہا کہ: جی ہاں! استاذ جی! میں اس لیے ان کے درس میں بیٹھنے لگا ہوں کہ وہ ہم سے عجیب عجیب باتیں بیان کرتا رہتا ہے، یعنی نہایت دلچسپ اور عجیب وغریب باتیں بیان کرتا ہے۔ ایوب سختیانیؒ نے فرمایا کہ ہم تو اس طرح کی عجیب باتوں سے ڈر کر دور بھاگتے ہیں۔

اس قصہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عجیب وغریب باتیں بیان کرنے والوں کو ہر دور میں پسند کیا جاتا ہے، اسی طرح آج کل کے روشن خیال، جدت پسند اور ماڈرن قسم کے لوگ بھی پرانے جدت پسند لوگوں کی طرح چٹکلوں والا ماڈرن دین چاہتے ہیں، اس لیے وہ مسجدوں کے بجائے ہوٹلوں، کلبوں اور ٹی وی لاؤنج کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کو غامدی جیسا روشن خیال مجتہد مل جاتا ہے، جو اپنے غلط اجتہادات سے ان کو چٹکلے بتاتا ہے، نکتہ دانی سکھاتا ہے، لفاظی اور چرب لسانی اور شعبدہ بازی کی جادوگری میں ان کو گھیر لیتا ہے اور تحقیق کے خوشنما اور دبیز پردوں میں گمراہی لپیٹ کر ان کو تھما دیتا ہے، ان کے مال کو بھی لوٹ لیتا ہے اور اسلامی عقیدہ کو بھی بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ بیچارے لوگ اپنے پرانے دین سے بھی بیزار ہو جاتے ہیں اور نئے دین میں بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، حالانکہ ایک ہوشیار شاعر نے ان کو سمجھانے کے لیے کہا تھا:

اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو　　　سنگِ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

مضمون نگاری کا فتنہ:

''وَالشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَالَا یَفْعَلُوْنَ''۔ [سورۂ شعراء: ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶]

ترجمہ:......''اور شاعروں کی اتباع وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہیں، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان

میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں''۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''شاعری کی باتیں محض تخیلات ہوتی ہیں، تحقیق سے ان کو لگاؤ نہیں ہوتا، اس لیے اس کی باتوں سے بجز گرمی محفل یا وقتی جوش اور واہ واہ کے کسی کو مستقل ہدایت نہیں ہوتی، یعنی شاعروں نے جس مضمون کو پکڑ لیا اسی کو بڑھاتے چلے گئے، کسی کی تعریف کی تو آسمان پر چڑھا دیا، مذمت کی تو ساری دنیا کے عیب اس میں جمع کر دیے، موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود ثابت کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ الغرض جھوٹ، مبالغہ اور تخیل کے جس جنگل میں نکل گئے پھر مڑ کر نہیں دیکھا، ان کے شعر پڑھو تو معلوم ہو کہ رستم سے زیادہ بہادر اور شیر سے زیادہ دلیر ہوں گے اور جا کر ملو تو پرلے درجے کے نامرد اور ڈرپوک، کبھی دیکھو تو ہٹے کٹے ہیں اور اشعار پڑھو تو خیال ہو کہ نبضیں ساقط ہو چکی ہیں، قبضِ روح کا انتظار ہے۔'' [تفسیر عثمانی: ۵۰۲]

میں نے ان آیات اور ان کی تفسیر کو صرف شعراء کو پیش نظر رکھ کر پیش نہیں کیا، بلکہ میرے پیش نظر بشمول شعراء زبان کے وہ سارے پہلوان اور قلم کے وہ سارے شہسوار ہیں جو اپنے زورِ قلم اور الفاظ کی بازیگری اور مضمون نگاری کے بل بوتے پر اسلام جیسے مقدس مذہب پر زور آزمائی کرتے ہیں اور دین اسلام کے احکامات کو تختۂ مشق بناتے رہتے ہیں، جن میں سے اس وقت میرے نزدیک سرفہرست اور موضوعِ بحث جاوید غامدی صاحب ہے جو بیک وقت شاعر بھی ہے، دانشور، مضمون نگار اور صاحب قلم بھی ہے۔ شاعر نظم کی صورت میں اور دانشور نثر کی صورت میں الفاظ کی زور آزمائی کرتے ہیں۔ زبان کی لفاظی میں دونوں ایک ہی میدان کے شہسوار ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں دورِ اول کے چند دانشوروں کا نمونہ پیش کروں جنہوں نے زورِ زباں سے شرعی احکامات کا انکار کیا اور بارگاہِ نبوت سے ان کو شعبدہ باز کا لقب ملا اور ڈانٹا گیا۔ مشکوۃ شریف میں باب الدیات کی فصل ثالث کی آخری حدیث کی عربی عبارت اور ترجمہ ملاحظہ ہو:

''وعن سعيد بن المسيبؒ ان رسول اللهﷺ قضى فى الجنين يقتل فى بطن أمه بغرة عبد او وليدة، فقال الذى قضى عليه كيف أغرم من لاشرب ولاأكل ولانطق ولا استهل ومثل ذٰلك يطلّ، فقال رسول اللهﷺ إنما هذا من إخوان الكهان''۔

[رواہ مالک مرسلا ورواہ ابوداؤد عن ابی ہریرۃؓ متصلا]

ترجمہ:...... ''حضرت سعید بن مسیبؒ کہتے ہیں کہ رسول کریمﷺ نے پیٹ کے اس بچہ کی دیت جو مارا جائے ایک غرہ یعنی ایک غلام یا ایک لونڈی مقرر فرمائی۔ جس شخص پر یہ دیت واجب کی گئی تھی اس نے کہا: میں اس شخص کا تاوان کیسے بھروں جس نے نہ کچھ پیا ہو، نہ کھایا ہو، نہ کوئی بات کی ہو اور نہ چلّایا ہو، اس قسم کا قتل تو ساقط کیا جاتا ہے۔ آنحضرتﷺ نے فرمایا کہ: پکی بات ہے کہ یہ شخص کاہنوں کا بھائی ہے۔''

''الـکـھـان'' یہ کاہن کی جمع ہے، کاہن اس شخص کو کہتے ہیں جو غیب دانی کا دعوی کرتا ہے اور مستقبل کی غلط سلط باتوں کو الفاظ کے دبیز پیرایہ میں خوبصورت مسجع صورت میں پیش کرتا ہے، تاکہ لفاظی کی شعبدہ بازی سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کردے اور شریعت کے خلاف اپنے باطل نظریات کو رائج کردے۔

ذرا غور کیجئے! اس شخص نے الفاظ کی سجاوٹ اور قافیہ کی بناوٹ کی غرض سے کتنا تکلف کیا کہ ''اکل'' پر ''شرب'' کو مقدم کیا، حالانکہ طبعی کلام میں اکل مقدم ہوتا ہے، پھر ''نطق'' کو ''استھل'' پر سجع کی غرض سے مقدم کیا، حالانکہ طبعی کلام کا معاملہ اس کے برعکس ہے، پھر آخر میں ''یـطـل'' کو سجع کی غرض سے فٹ کیا اور شریعت کے ایک مقرر حکم کو باطل ٹھہرایا اور جاہلیت کے دستور کے مطابق جنین کی دیت کا انکار کیا اور الفاظ کے زور پر فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کیا، تاکہ شریعت کا حکم مسترد ہو جائے۔

غامدی صاحب کا بھی یہی وطیرہ ہے، الفاظ کے ہیر پھیر اور جوڑ توڑ میں کسی مسئلہ میں اتنی گہرائی میں چلا جاتا ہے کہ سطحی نظر میں آدمی مرعوب ہو جاتا ہے۔ میں خود مانتا ہوں کہ غامدی صاحب کے الفاظ کا جوڑ توڑ اور تحقیق کی گہرائی اپنی نظیر آپ ہے، لیکن کاش! اس کے قلم کا رُخ باطل کی طرف ہوتا، کیا یہ اس کی بدبختی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قوتِ گویائی عطا فرمائی، اس کو صاحب قلم اور دانشور بنایا، جب یہ لکھنے بولنے کے قابل ہوا تو اللہ تعالیٰ کے دین کے خلاف محاذ قائم کیا اور اس کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔

میں اس سے پوچھتا ہوں کہ تم نے اپنے منشور کی پیشانی پر لکھا ہے: ''ہمارا منشور اعلانِ جنگ ہے دورِ حاضر کے خلاف'' اب آپ ذرا بتائیں کہ دورِ حاضر میں کیا اس دھرتی پر یہود ونصاریٰ اور ہندو وپارسی نہیں رہتے؟ کیا اس دنیا میں اہل باطل میں سے قادیانی، آغا خانی، ذکری وبہائی، شیعہ روافض اور اہل بدعت نہیں رہتے؟ کیا تم نے ان کے خلاف کبھی کوئی مقالہ لکھا ہے؟ اس کے برعکس تم نے دین اسلام کے ایک ایک حکم کے خلاف زہر افشانی کی ہے، کیا دورِ حاضر صرف اسلام ہے؟ جس کے خلاف تم جنگ کے لیے میدان میں اتر آئے ہو؟ اس دانشوری اور اس پروفیسری اور اس مقالہ نگاری اور اس مضمون نگاری سے تو یہ بہتر تھا کہ جاوید غامدی اَن پڑھ اور بے علم ہوتا اور صرف دین کے احکام پر عمل کرتا۔ تم نے جو غلط لکھا ہے اس کے بارے میں تم سے پوچھ ہوگی، اگر تم نہ لکھتے تو نہ لکھنے کا تم سے سوال نہ ہوتا۔ اس لکھنے سے تو بہتر تھا کہ تمہارے ہاتھ شل ہو جاتے، تمہارا قلم ٹوٹ جاتا، تمہاری آنکھیں اندھی ہو جاتیں اور تمہاری زبان گنگ ہو جاتی، تاکہ اسلام کے خلاف زہر افشانی کے عذاب سے تو بچ جاتے۔ تمہیں دنیا میں تنقید کرنے کے لیے اگر کوئی ملا تو وہ صرف فقہاء کرام، اولیاء عظام، مفسرین کرام اور مجاہدین عظام ملے؟ تم کہتے ہو کہ دیوبند کا دور ختم ہو گیا، فقہاء کا دور نہیں رہا، جہاد کا دور نہیں رہا، دیت کا دور نہیں رہا، حدود

وتعزیرات کے نفاذ کا دور نہیں رہا، اگر واقعی ایسا ہے تو تم بتاؤ کہ آج کل کس چیز کا دور ہے؟ کیا تم کوئی نئی شریعت لائے ہو؟ اگر کچھ ہے تو اس کو سامنے لاکر دکھا دو یا کوئی نئی نبوت لائے ہو تو اس کو سامنے لاکر بتا دو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر وہی بات دہراتا ہوں کہ کاش! تم اندھے لنگڑے لولے ہوتے، اَن پڑھ ہوتے تو غلط لکھنے کا وبال تمہارے سر پر نہ ہوتا، تم دانشور اور صاحب قلم کیا ہوئے کہ آسمانوں پر مچلنے لگے

اتنا نہ بڑھا پاکئ داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

فصاحت وبلاغت کی دنیا میں فن ادب عربی کے ماہرین میں ابوالعلاء المعری ایک قادر الکلام ادیب گزرا ہے، اس کو اپنی فصاحت پر اتنا ناز تھا کہ سوچنے لگا کہ کیا میں قرآن عظیم کے مقابلہ میں کوئی کلام بنا سکتا ہوں یا نہیں؟ اس سوچ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سے قوتِ گویائی چھین لی اور اس کا سابقہ ولاحقہ سارا کلام ساقط الاعتبار ہو کر رہ گیا، وہ عام سادہ عربی بولنے میں فحش غلطیاں کرنے لگا۔ ابوالعلاء المعری کو جب اللہ تعالیٰ نے قوتِ گویائی اور تحریر وتقریر کا ملکہ دیا تو اس کو چاہیے تھا کہ اس قوت کو دین اسلام کی حمایت میں صرف کرتا اور اعداء دین سے مقابلہ کر کے دفاع اسلام کے لیے کام کرتا، اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اسلام کے خلاف مورچہ سنبھال لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے اس کی استعداد ہی چھین لی۔ غامدی صاحب کو بھی سوچنا چاہیے کہ ان کی زبانی اور قلمی استعداد کہیں اسلام کے خلاف تو استعمال نہیں ہو رہی ہے؟! ان کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ ان کے اردگرد کے حالات اور کیفیات ان کو بھلائی کی طرف لے جا رہی ہیں یا تباہی کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف کتاب الایمان، ص:۱۳ پر ایک حدیث ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

''عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: يؤذينی ابن آدم يسب الدهر وأنا الدهر، بيدی الأمر أقلب الليل والنهار''۔[متفق علیہ]

ترجمہ:......''حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ: آنحضرتﷺ نے فرمایا: انسان مجھے ایذا پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے اور زمانے کی الٹ پلٹ میرے ہاتھ میں ہے، دن رات کالانا میرا کام ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، اس کو قوتِ گویائی عطا فرمائی، جوانی دی، زبان دی، طاقتِ گفتار دی، جب وہ بولنے پر آیا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایذا رسانی کا معاملہ کیا اور زمانہ کو گالی دینے لگا، حالانکہ زمانہ کے پیچھے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں تو گویا بالواسطہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کو گالی دینے کا مرتکب ہوا۔ یہاں غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک آدمی زمانہ کی برائی بیان کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ایذا رسانی کا سبب بنتا ہے تو جو شخص براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم پر بار بار حملے کرتا ہے، وہ اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کو کس قدر ایذا پہنچاتا ہے اور کس قدر بے ادبی اور گستاخی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے

دین کو قیامت تک کے لیے اتارا ہے اور غامدی صاحب اس میں تقسیم شروع کر دیتا ہے کہ یہ حکم اتنی مدت کے لیے ہے، وہ حکم اتنی مدت کے لیے تھا۔ ارے ظالم! تیرے پاس کونسی حدیث ہے یا کونسی وحی ہے کہ ارتداد کی سزا صرف بنی اسماعیل کے ساتھ خاص تھی اور اب یہ سزا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہے۔ اب اگر کوئی شخص مرتد ہو جاتا ہے تو اس کو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ تو قیامت تک امت کے لیے ضابطہ مقرر فرما کر اعلان فرماتے ہیں کہ: ''من بدل دینه فاقتلوه ''......''جو کوئی دین اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے اس کو قتل کر دو۔'' نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ اس کو قتل کر دو، صحابہؓ کا اجماع ہے کہ اس کو قتل کر دو، فقہاء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس کو قتل کر دو، علمائے امت کا فیصلہ ہے کہ اس کو قتل کر دو اور غامدی صاحب قرآن وحدیث، اجماع صحابہؓ واجماع فقہاء وعلماء کے مقابلے میں آ کر کافروں کو خوش کرنے کے لیے کہتا ہے کہ یہ سزا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہے اور مرتد کو کوئی یہ سزا نہیں دے سکتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اگر غامدی ان پڑھ ہوتا، جٹ جاہل ہوتا یا اندھا، لنگڑا، لولا ہوتا، اس کی انگلیاں کٹی ہوئی ہوتیں، اس کا قلم ٹوٹا ہوا ہوتا تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر تھا، کیونکہ نہ لکھتا تو کوئی مؤاخذہ نہ ہوتا، غلط لکھا ہے تو مؤاخذہ ہوگا، پوچھ گچھ ہوگی، اس پر دلیل یہ ہے کہ مشکوۃ شریف، ص:۲۳ باب الایمان بالقدر میں حضرت عائشہؓ سے ایک حدیث منقول ہے، فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

''جس شخص نے تقدیر سے متعلق کوئی بھی بات کی تو قیامت میں اس سے سوال ہوگا اور جس نے تقدیر سے متعلق کوئی بات نہیں کی اس سے کوئی سوال نہیں ہوگا''۔ [مشکوۃ:۲۳]

زبان وقلم کو بے جا استعمال کرنے کی یہ وعید صرف غامدی صاحب کے لیے نہیں، بلکہ ان کے پیشرو اُن تمام دانشوروں اور مقالہ نگاروں کے لیے ہے جن کے قلم اور زبان اسلام کے خلاف زہر اگلتے رہے ہیں اور یہ وعید غامدی صاحب کے ان پیروؤں اور شاگردوں کے لیے بھی ہے جو دانشوری اور مقالہ نگاری کے شوق میں قدم بقدم غامدی صاحب کے نقش قدم پر چل پڑے ہیں، جن میں چند نو وارد اور نو عمر نوجوان ہیں جن کو شاید یہ فکر لاحق ہوگئی کہ نیک نامی کے راستوں میں حصولِ شہرت میں دیر لگتی ہے، چلو دوسرے راستوں سے یہ مقصد جلدی حاصل ہو جائے۔

منہ پھٹ دانشوروں کے لیے وعید:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے میں مشکوۃ شریف کے ''باب البیان والشعر '' کے عنوان کے تحت مندرج چند احادیث کو پیش کروں جن میں زبان وبیان سے متعلق بے جا مبالغہ اور فصاحت وبلاغت کی سینہ زوری اور منہ پھاڑ کر بولنے اور جوڑ توڑ کے ساتھ رطب ویابس اکٹھا کر کے مطلب حاصل کرنے کی وعیدوں کا ذکر ہے۔

بیان کی جادوگری:

۱:"عن ابن عمرؓ قال: قدم رجلان من المشرق فخطبا، فعجب الناس لبيانهما، فقال رسول الله ﷺ: إن من البيان لسحرًا"۔[رواہ البخاری]

ترجمہ:"حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: مشرقی علاقے سے دو آدمی آئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے، لوگوں نے ان کے فصیح و بلیغ بیان پر بڑی حیرت اور تعجب کا اظہار کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ بعض بیان سحر کا اثر رکھتے ہیں۔"

"لسحرا" یعنی بعض بیان دلوں کو مائل کرنے میں جادو کی طرح اثر رکھتے ہیں۔"رجلان" یہ اس وقت کا قصہ ہے کہ جب مشرقی علاقہ سے بنو تمیم کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی بارگاہ میں مدینہ منورہ آیا، اس وفد میں دو فصیح و بلیغ آدمی آئے تھے، ایک کا نام زبرقان تھا اور دوسرے کا نام عمرو بن ہتم تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں صحابہ کرامؓ کے بھرے مجمع میں زبرقان نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے مفاخر و ماثر کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا اور پھر کہا کہ یا رسول اللہ! یہ عمرو بن ہتم بھی میری بیان کردہ خوبیوں کو جانتا ہے کہ میں کیسا ہوں اور میرے کیا کارنامے ہیں۔ اس کے بعد عمرو بن ہتم اٹھا اور اس نے زبرقان کے بیان کردہ تمام کارنامے جھوٹے ثابت کیے اور کہا کہ اس شخص میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ عمرو کا انداز بیان بھی نہایت مؤثر اور موزوں تھا، جس سے لوگ زبرقان کے بارے میں شک میں پڑ گئے۔ اس کے بعد زبرقان پھر اٹھا اور بڑے دلکش انداز میں کہا کہ اس شخص کا دل جانتا ہے کہ میں کیسا ہوں، لیکن حسد نے اس کو اس طرح کہنے پر مجبور کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کا مجمع ان دونوں کے بیان کو جب سنتا تو دونوں کو شاباش دے کر حیران ہو جاتا اور تعجب کرنے لگتا، اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:"إن من البيان لسحرًا" یعنی بعض بیان دلوں کو مائل کرنے میں جادو کی طرح اثر رکھتے ہیں۔ بعض محدثین نے آنحضرت ﷺ کے اس کلام کو بیان کی مذمت پر حمل کیا ہے، گویا آنحضرت ﷺ اس طرح کہنا چاہتے ہیں کہ تکلف کر کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا اور منہ پھاڑ پھاڑ کر عجیب کلام پیش کرنا اور منہ زوری کر کے فصاحت و بلاغت کے شکنجوں میں لوگوں کو جکڑنا، رائی کا پہاڑ بنانا اور بات سے بتنگڑ بنانا، حقیر کو عظیم دکھانا اور عظیم کو حقیر کرنا یہ اچھا کام نہیں ہے، بلکہ یہ خالص جادو کی طرح شعبدہ بازی ہے جو قابل نفرت ہے، لیکن بعض دیگر محدثین نے آنحضرت ﷺ کے اس کلام کو تقریر و بیان کی مدح پر محمول کیا ہے کہ اچھے اندازِ اسلوب سے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا اور لوگوں کو متاثر کرنا، سلیقہ سے بات پیش کرنا غضب کا اثر رکھتا ہے جو عمدہ اور قابل تحسین ہے، مگر جب حق کے لیے ہو۔

منہ پھاڑ پھاڑ کر کلام کرنا تباہی ہے:

۲: ''وعن ابن مسعودؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ھلک المتنطعون، قالھا ثلاثاً''۔

[رواہ مسلم]

ترجمہ: ''اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ: رسول کریم ﷺ نے فرمایا: کلام میں مبالغہ کرنے والے ہلاکت میں پڑ گئے، آپ ﷺ نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔''

''المتنطعون''، ''تنطع'' باب تفعل سے ہے، منہ پھاڑ پھاڑ کر مبالغہ کے ساتھ کلام کرنے والے کو ''متنطع'' کہتے ہیں، یعنی جس کے کلام میں تصنع اور بناوٹ بھی ہو اور بے جا چاپلوسی بھی ہو، خوشامد کی غرض سے بلا فائدہ عبارت آرائی بھی ہو، الفاظ کی نمائش بھی ہو اور چست جملوں کی عیاشی بھی ہو۔ یہ کام اچھا نہیں ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی مذمت فرمائی ہے، ظاہر ہے جھوٹ موٹ ملا کر خلاف حقیقت بات کرنا اور باطل کو حق ثابت کرنا کوئی کمال نہیں ہے۔

منہ پھاڑ کر ٹر ٹر کرنے والوں کی مذمت:

۳: ''وعن ابی ثعلبة الخشنی أن رسول اللہ ﷺ قال: إن احبکم إلیّ واقربکم منی یوم القیامة احاسنکم أخلاقًا وإن أبغضکم إلیّ وأبعدکم منی مساویکم أخلاقًا الثرثارون المتشدقون المتفیھقون، رواہ البیھقی فی شعب الإیمان وروی الترمذی نحوہ عن جابرؓ وفی روایة قالوا: یا رسول اللہ! قد علمنا الثرثارون والمتشدقون المتفیھقون قال: المتکبرون۔'' [رواہ البیھقی]

ترجمہ: ''اور حضرت ابو ثعلبہ خشنیؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مجھ کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب اور میرے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سے زیادہ خوش اخلاق ہیں اور میرے نزدیک تم میں سے سب سے برے اور مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ لوگ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہیں اور بد اخلاق سے مراد وہ لوگ ہیں جو بہت (بنا بنا کر) منہ پھاڑ کر باتیں کرتے ہیں، بغیر احتیاط کے بک بک لگاتے ہیں اور تکبر کرتے ہیں۔ اس روایت کو بیہقیؒ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذیؒ نے بھی حضرت جابرؓ سے اسی طرح روایت نقل کیا ہے۔ نیز سنن ترمذی کی ایک روایت میں یوں ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! ثرثارون اور متشدقون کے معنی تو ہمیں معلوم ہیں، متفیھقون سے کیا مراد ہے؟ یعنی متفیھق کس کو کہتے ہیں؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: تکبر کرنے والے۔''

''الثرثارون'' نہایہ میں لکھا ہے کہ ''الثرثارون ھم الذین یکثرون الکلام تکلفا خروجا

عن الحق من الثرثرة وهي كثرة الكلام وترديده "۔گویا"ثرثارون" ثرثارون کے وزن پر ہے اور"ثرثرة" ثرثرة کے وزن پر ہے،فضول بکواس کرنا مراد ہے۔"المتشدقون" منہ پھاڑ پھاڑ کر بے احتیاطی کے ساتھ جھوٹ بول کر استہزاء کرنا اور فحش اشعار پڑھنا۔"المتفیهقون" منہ پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرنا اور اپنی بڑائی وعظمت جتلانے کی غرض سے فصیح وبلیغ چست جملے چسپاں کرنا، تاکہ لوگ اس سے مرعوب ہو جائیں۔یہ سارا کام متکبر لوگوں کا ہوتا ہے،لہٰذا حدیث میں اس لفظ کی تفسیر خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمائی:"قال المتكبرون "یعنی"متفیهقون" سے متکبرین مراد ہیں۔

ظالموں کی مدح سرائی سے پیسہ کمانے کی مذمت:

"وعن سعد بن أبي وقاص ؓ قال: قال رسول الله ﷺ : لاتقوم الساعة حتى يخرج قوم يأكلون بألسنتهم كما تأكل البقرةُ بألسنتها"۔[رواہ احمد]

ترجمہ:..."حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ایک ایسی جماعت پیدا نہیں ہو جائے گی جو اپنی زبانوں کے ذریعہ اس طرح کھائے گی جس طرح گائے اپنی زبانوں سے کھاتی ہے۔"

"بألسنتهم"یہ"لسان" کی جمع ہے،زبان مراد ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ زبان کو کھانے، پینے کا ذریعہ بنائیں گے،وہ اس طرح کہ فساق وفجار کی بے جا مدح کریں گے،ان کی مدح میں اشعار اور قصیدے پڑھیں گے اور زبان کو موڑ موڑ کر ان کی تعریفیں کریں گے اور اس سے پیسہ کما کر کھائیں گے یا کسی بے گناہ کی مذمت کریں گے اور پیسہ کما کر کھائیں گے۔یہ لوگ حلال وحرام کی تمیز نہ کرنے میں اس حیوان اور گائے کی مانند ہوں گے جو اپنی زبان کے ذریعہ سے ہر قسم کی رطب ویابس اور صالح وخبیث گھاس کو لپیٹ لپیٹ کر جمع کرتی ہے اور پھر کسی تمیز کے بغیر کھا جاتی ہے۔ان لوگوں سے غلط قسم کے شعراء اور خطباء مراد ہیں جو حق وباطل اور حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے ہیں۔ساتھ والی حدیث کی تشریح بھی اسی طرح ہے۔

فصاحت وبلاغت میں بے جا تکلف مذموم ہے:

"وعن عبد الله بن عمرؓ أن رسول الله ﷺ قال: إن الله يبغض البليغ من الرجال الذي يتخلل بلسانه كما يتخلل البقرة بلسانها"۔[رواہ الترمذی وابوداؤد]

ترجمہ:......"اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ شخص سخت ناپسندیدہ ہے جو کلام وبیان میں حد سے زیادہ فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرے، بایں طور کہ وہ اپنی زبان کو اس طرح لپیٹ لپیٹ کر باتیں کرے جس طرح گائے اپنے چارہ کو لپیٹ لپیٹ کر جلدی جلدی اپنی زبان کے ذریعہ کھاتی ہے۔"

''البلیغ'' فصاحت وبلاغت کے ساتھ بے جا مبالغہ کرنے والا مراد ہے، جو منہ پھاڑ پھاڑ کر اور زبان گھما گھما کر حق وباطل میں تمیز کیے بغیر کلام کرتا ہو اور حد شرعی سے تجاوز کرتا ہو، شرعی حدود کے اندر کلام کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''یتخلل'' ای'' یلف الکلام بلسانه کماتلف البقرة بلسانها العلف ''یعنی زبان کو لپیٹ لپیٹ کر کلام کرتا ہے جس طرح گائے گھاس کو لپیٹ کر کھاتی ہے، زورِ قلم سے فنکاری ومقالہ نگاری کر کے حق کے خلاف لکھنا اس میں داخل ہے۔

بے عمل واعظین کا حشر:

''وعن انسؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: مررتُ لیلةَ أسری بی بقوم تقرض شفاههم بمقاریض من النار، فقلت: یا جبرائیل! من هؤلآء؟ قال هؤلآء خطباء أمتک الذین یقولون مالایفعلون۔''[رواہ الترمذی]

ترجمہ:...''اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: معراج کی رات میں میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جارہی تھیں، میں نے (یہ دیکھ کر) پوچھا کہ جبرائیل! یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیلؑ نے کہا کہ: یہ آپ کی امت کے واعظ وخطیب ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے۔''

''تقرض'' یہ صیغہ''قرض'' کے مادہ سے ہے جو کاٹنے کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خطباء زبان سے کچھ کہتے ہیں اور عمل دوسرا کرتے ہیں اور حدودِ شرعیہ کا خیال نہیں رکھتے، فصاحت وبلاغت کی منہ زوری سے باطل کو حق اور حق کو باطل دکھاتے ہیں، معراج کی رات وہ لوگ آنحضرت ﷺ کو دکھائے گئے کہ ان کے ہونٹوں کو بطور سزا قینچیوں سے کاٹا جارہا تھا، کیونکہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے مخالف تھا، جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب ومنبر می کنند | چوں بخلوت می روند کارِ دیگر می کنند

چرب لسانی کے بارے میں وعید:

''وعن ابی هریرةؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من تعلم صرف الکلام لیسبی به قلوب الرجال أو النساء لم یقبل اللہ منه یوم القیامة صرفاً ولاعدلاً۔''

ترجمہ:...''اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس مقصد کے لیے گھما پھرا کر بات کرنے کا سلیقہ سیکھے کہ وہ اس کے ذریعہ مردوں کے دلوں یا لوگوں کے دلوں پر قابو حاصل کر لے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ اس کی نفل عبادت قبول کرے گا اور نہ فرض۔''

''صرف الکلام'' کلام کو گھمانا پھرانا مراد ہے، یعنی باتوں کے گھمانے پھرانے، اُلٹنے پلٹنے اور

چرب لسانی کا خوب سلیقہ سیکھے۔''لیسبی'' سبی (ضرب یضرب) سے ہے، قید کرنے کو کہتے ہیں، مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں کو زورلسانی اور مبالغہ آرائی سے اپنی طرف مائل کرتا ہے، حقیقت کو چھپا کر ضرورت سے زیادہ فصاحت وبلاغت کا مظاہرہ کرتا ہے، تاکہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں اور یہ شخص اپنا مطلب نکال سکے، جس طرح آج کل کے اکثر مضمون نگاروں کا پیشہ ہے۔''صرفا''اس سے نفل عبادت مراد ہے۔ ''عدلا''اس سے فرض عبادت مراد ہے۔بعض علماء نے''صرفا''سے توبہ کرنا مرادلیا ہے اور''عدل'' سے فدیہ مرادلیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کی یہ عبادات قبول نہیں ہوں گی۔اس حدیث میں منہ زوری، مبالغہ آرائی اور چرب لسانی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، لوگ تو اس پر فخر کرتے ہیں۔

زبان کی بے احتیاطی اور الفاظ کی عیاشی کی یہ بیماری عرب وعجم سب کا مشترکہ مشغلہ رہا ہے۔عرب کے شعراء اور مقالہ نگاروں نے زمین وآسمان کے ایسے قلابے ملائے ہیں کہ دوسری دنیا ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔بادشاہوں کی خوشامد اور بے جا تعریفات میں عرب اتنے آگے نکل گئے کہ زبانِ نبوت سے ان کے قابو کرنے کے لیے سخت وعیدات آئیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن عظیم میں ایسے لوگوں کی سخت مذمت فرمائی۔آج کل عربی اخبارات اور جرائد ورسائل میں روزانہ ہزاروں ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جن میں فصاحت وبلاغت اور ادبی میدان میں اتر کر چرب لسانی کے ذریعہ اسلام پر اعتراضات کرنے والے اسلام کے خلاف خوب اپنے دلوں کا بھڑاس نکال رہے ہیں۔عرب کے علاوہ عجم کی دنیا میں مقالہ نگاری، قلمکاری اور دانشوری کے دعویدار قلم کے زور سے اسلام کے خلاف روزانہ ہزاروں مضامین چھاپ رہے ہیں۔ انگریزی اخبارات کا تو مشغلہ یہی ہے۔اردو اخبارات میں بھی ایسے بدباطنوں کی کمی نہیں ہے جو بڑی دیدہ دلیری سے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف کھل کر لکھ رہے ہیں۔ان اخبارات کے مقالہ نگار زبان وقلم اور فصاحت وبلاغت کے چست جملے چسپاں کرنے اور مقالہ نگاری کا جوہر دکھانے کے لیے اسلام اور اسلام کے مبارک احکامات اور اسلام کی مقدس ہستیوں کو تختۂ مشق بنارہے ہیں۔

آپ غور کریں! سلمان رشدی ملعون مقالہ نگاری ہی کے شوق میں اپنے گندے منہ سے اپنے گندے لعاب کا گندہ ملبہ اسلام پر پھینک کر اپنے گندے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔تسلیمہ نسرین اور بے غیرت ملالہ یوسف زئی نے بھی یہی تو کیا۔ایسے سینکڑوں منافقین اور ملحدین نے اپنا ایمان ووطن بیچ کر خالص دنیوی اغراض ومقاصد کے لیے اسلام کے خلاف مقالے لکھے اور پھر بھاگ کر اپنے مغربی آقاؤں کی گود میں جا کر بیٹھ گئے۔وحید الدین خان کو ذرا دیکھ لیجیے، وہ برصغیر ہندوستان میں بیٹھ کر زبان وبیان اور قلم کا سارا زور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف استعمال کررہا ہے۔پٹنہ میں جا کر سرسوتی بت کے سامنے جھک گیا اور ہفتہ وار

رسالہ زندگی کی رپورٹ کے مطابق اس موقع پر اس نے قشقہ بھی لگایا اور ہندوستان کی متعصب اسلام دشمن آر اے ایس، وشوا ہندو پریشد، شیوسینا، اور بجرنگ دل کی تنظیموں کے ساتھ مل کر ان کے جلسوں میں شریک ہوتا ہے اور مسلمانوں کے خلاف بولتا رہتا ہے۔ اسی ملک میں اس سے پہلے سرسید احمد خان نے نصف صدی تک انگریزوں کی خوشامد اور خدمت میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو کچھ لکھا وہ اسی قلم کی دانشوری اور ادبی اسکالری کی نحوست تھی۔ غلام احمد قادیانی بھی اسی مقالہ نگاری کے شوق میں مسلمانوں کو دھوکہ دے کر پہلے مہدی بنا، پھر مسیح موعود کا ڈھنڈورا پیٹنے لگا اور پھر نبوت کا دعویٰ کر بیٹھا۔ غلام احمد پرویز کی تحریرات کو دیکھو، اس نے اسی قلمکاری اور مقالہ نگاری میں انکارِ حدیث کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ شبلی نعمانیؒ کی قلمکاری کو دیکھو وہ اپنے پڑھنے والوں کو آگ لگا دیتے ہیں، لیکن کئی مقامات میں ان کے قلم نے بھاری لغزشوں کا ارتکاب کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف کرے۔ ادھر مودودی صاحب نے اپنے قلم کے زور پر صحابۂ کرامؓ اور انبیاءِ عظامؑ پر کیچڑ اچھالا، خلافت وملوکیت جیسی اعتراضات سے بھری ہوئی کتاب لکھی، رسائل ومسائل میں متنازع مسائل کھڑے کر دیے اور نئی نسل کو ایک مشکوک ذہن دے کر چھوڑ دیا، تاہم ان کی جماعت نے اب ٹھہراؤ کا راستہ اختیار کیا ہے، اللہ کرے مزید سدھر جائیں۔ یہ سب مقالہ نگاری اور قلم کاری کی مصیبت تھی اور غلط لوگوں کی صحبت تھی۔ بدقسمتی سے نیاز فتح پوری جیسے ملحد اور زندیق شخص کی صحبت نے مودودی صاحب کی اچھی قلمکاری کو کج راہی دکھائی، پھر مودودی صاحب کے قریبی رفقاء میں امین احسن اصلاحی صاحب ان کو مل گئے، وہ بھی مقالہ نگاری اور قلم کاری میں غضب کے ماہر تھے، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے بانیان میں سے ہیں، پھر مودودی صاحب کے ان سے اختلافات ہو گئے تو وہ جماعت سے الگ ہوئے اور اپنے اُس غلط مشن کو جاری کیا جو حمید الدین فراہی نے اُنہیں دیا تھا۔

امین احسن اصلاحی کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ان کو جاوید غامدی صاحب ملے۔ یہ پہلے مودودی صاحب کے ساتھ جماعت اسلامی میں تھے، جماعت اسلامی میں غامدی صاحب نے اتنی ترقی کی کہ ان کے حواری ان کو مودودی صاحب کا جانشین بتانے لگے۔ امین اصلاحی کی جماعت اسلامی سے علیحدگی نے جاوید احمد غامدی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور غامدی صاحب امین احسن اصلاحی صاحب کے پکے مرید اور عقیدت مند بن گئے اور کج راہی کے سارے گر اور کرتب امین احسن صاحب نے ان کو سکھلائے۔ یہ سلسلۂ شرمساری جو کچھ بھی تھا، اس میں بنیادی وجہ اشتراک یہی قلم کاری اور یہی مضمون نگاری اور یہی لفاظی اور یہی شعبدہ بازی تھی اور بدقسمتی سے اس میدان میں غامدی صاحب کو نئی نسل اور نئی پود میں ایسے نوعمر نوجوان ملے جو شاگردوں اور خادموں کی صورت میں غامدی صاحب کے بوجھ کو ہلکا کر رہے ہیں اور اپنے قلم سے وہ زہر افشانی کر رہے ہیں کہ جن گوشوں اور کونوں کھانچوں پر ضعیف العمری کی وجہ سے غامدی صاحب کی نظر

نہیں پڑی تھی، ان کے نوعمر شاگردوں نے ان کو اس طرح ڈھونڈ لیا کہ غامدی صاحب اس پر عش عش کرنے لگے، قصہ وہی ہوا جو شاعر نے کہا:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا مزاج

چرب لسانی سے متعلق عجیب احادیث:

زبان کی تیز طراری اور الفاظ کی عیاشی اور شعبدہ بازی اور دانشوری کے دبیز پردوں کے نیچے اسلام کے خلاف عیاری ومکاری اور نفاق کا بڑا طوفان اگر کوئی دردمند مسلمان سمجھنا چاہتا ہے تو وہ مندرجہ ذیل احادیث ترجمہ کے ساتھ پڑھے:

۱:...''عن أبی عثمان النهدی قال: إنی لجالس تحت منبر عمرؓ وهو يخطب الناس، فقال فی خطبته: سمعت رسول الله ﷺ يقول: إن أخوف ما أخاف علىٰ هذه الأمة كل منافق عليم اللسان''۔[مسند احمد:۱/۲۹۷،ط: قاہرہ]

ترجمہ:...''حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر خطبہ کے دوران فرمایا کہ: میں نے نبی اکرم ﷺ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک اس امت کے لیے سب سے زیادہ خوفناک خطرہ جو میں محسوس کررہا ہوں وہ ہر وہ منافق ہے جو زبان کی تیز طراری کا ماہر ہو۔''

۲:...تقریباً یہی روایت بیہقی نے شعب الایمان، ج:۲،صفحہ:۲۸۴ پر ذکر کی ہے، اس میں اتنا اضافہ ہے کہ:''زبان چلانے کے یہ ماہر منافقین میرے بعد آئیں گے۔''

۳:...کنز العمال، ج:۱۰،ص:۱۸۶ پر بھی انہیں الفاظ کے ساتھ یہ حدیث مذکور ہے۔

۴:...ابوبکر ہیثمیؒ نے اس حدیث کو کچھ الفاظ کے اضافہ کے ساتھ یوں نقل کیا ہے:

''عن عمران بن حصینؓ قال: قال رسول الله ﷺ أخوف ما أخاف عليكم جدال منافق عليم اللسان''۔[موارد الظمآن:۱۵]

ترجمہ:...''حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے، فرمایا کہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: مجھے تم پر سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ اس منافق کا جھگڑا اور مباحثہ ہے جو زبان کا تیز طرار اور ماہر ہوگا۔''

اس مضمون کو آگے بڑھانے کے ضمن میں بطور تبرک حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ کی کتاب ''دور حاضر کے فتنے'' سے کچھ اقتباسات قارئین کے سامنے رکھتا ہوں جو اس موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں، حضرت فرماتے ہیں:

''اہل علم واہل قلم حضرات کا فتنہ:

افسوس کہ ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں ارباب علم اپنے علمی تقاضوں کو نہیں پورا

کر رہے ہیں اور ارباب جہل علمی مسائل میں دخل دے رہے ہیں۔ ہر صاحب قلم، صاحب علم بننے کا مدعی ہے۔ کتابوں کے اُردو تراجم نے اس فتنے کو اور وسعت دی ہے۔ اُردو تراجم جہاں ایک اصلاحی مفید خدمت انجام دے سکتے تھے، افسوس کہ عصر حاضر میں ''وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا'' کا مصداق بنتے جا رہے ہیں جن کا ضرر ونقصان فائدہ ونفع سے کہیں بڑھ گیا ہے۔

دورِ حاضر جہاں مختلف فتنوں کی آماجگاہ ہے، وہاں قلم کا فتنہ شاید سب سے گویا سبقت لے جا رہا ہے۔ ایک حدیث میں ہے جسے درمنثور میں بحوالہ ''مسند احمد''، ''الأدب المفرد للبخاریؒ'' اور ''مستدرک حاکم'' بروایت عبداللہ بن مسعودؓ سے ذکر کیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے قیامت سے پہلے چھ فتنوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک ''فشو القلم'' یعنی ''قلم کا طوفان'' ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں آج طوفانِ قلم کی فتنہ سامانی کا اندازہ ہر عاقل کر سکتا ہے۔

علمی میدان میں ان حضرات کا دائرہ نہ صرف بہت محدود وتنگ ہے، بلکہ ہے ہی نہیں۔ اردو کے تراجم سے کچھ سطحی معلومات حاصل کر کے ہر شخص دورِ حاضر کا مجتہد بنتا جا رہا ہے، اور ''إعجاب کل ذي رأي برأيه'' (ہر شخص اپنی رائے کو پسند کرتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے) اس فتنے نے ''کریلا اور پھر نیم چڑھا'' والی مثل صادق کر دی ہے، اور ناشرین نے محض تجارتی مصالح کے خیال سے سستے داموں عالم نما جاہلوں سے تراجم کرا کر فتنہ کو اور بڑھا دیا ہے۔ غرض کہ فتنوں کا دور ہے، ہر طرح کے فتنے اور ہر طرف سے فتنے ہی فتنے نظر آتے ہیں۔ ان فتنوں کے سد باب کے لیے مستقل اداروں کی ضرورت ہے جن کا اساسی مقصد صرف یہی ہو کہ ان تراجم کا جائزہ لیا جائے اور اخبارات میں شائع ہونے والے مقالات کی نگرانی ہو۔ (افسوس کہ) ارباب جرائد ومجلات کا مقصد محض تجارت ہے، اور ارباب قلم کا مقصد محض شہرت ہے یا پھر کچھ مادی منفعت بھی پیش نظر ہے۔

بلاشبہ علمی ۔ ۔ ی نقطۂ نظر سے یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے اور اسلامی احکام کی روشنی میں اگر صحیح متفقہ حل پیش کیا جائے تو کمیونزم کا سد باب ہو سکتا ہے۔ دنیا کی مادی بنیادیں دو ہیں جن پر معاش ومعیشت کا دارومدار ہے: ایک زراعت اور ایک صنعت وتجارت۔ دونوں چیزیں حیات انسانی کے لیے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کے ہیں، اس لیے دین اسلام نے ان کے احکام پورے طور پر بیان کر دیے، قرآن وحدیث وفقہ اسلامی میں ان کی تفصیلات موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مفکرین ارباب دین وارباب علم جن کی علمی زندگیاں انہی بادیہ پیمائیوں میں گزری ہیں اور جن کی بے لوث زندگیاں اخلاص وتقویٰ سے معمور ہیں اور جن کی فکری واجتہادی صلاحیتیں مسلم ہیں، جلد سے جلد کسی مرکز میں بیٹھ کر وفاقی اجتماعی حل پیش کریں۔ شخصی طور پر اس پچاس سال میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اگرچہ ارباب اقتدار آج کل اتنے جری ہو گئے کہ فوجی طاقت کے بل بوتے پر ہر حکم نافذ کرتے ہیں، اور اسلام کے ادعاء کے باوجود ہر قید وبند سے

آزاد ہوکر احکامات صادر فرماتے رہتے ہیں۔ان حالات میں بے چارے اہل علم یا ارباب دین کی باتوں کو وہ کہاں درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں؟ لیکن بارگاہِ ربوبیت میں اپنی مسئولیت پوری کرنے کے لیے ہر وقت اس کی ضرورت ہے۔" [دورِ حاضر کے فتنے:۱۰۰]

اسی کتاب کے دوسرے مقام پر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ فرماتے ہیں:

"علمی فتنے:

علمی فتنے وہ ہوتے ہیں جو علوم وفنون کی راہ سے آتے ہیں۔تاریخ اسلام میں ان علمی فتنوں کی مختلف صورتیں رہی ہیں۔بہرصورت ان علمی فتنوں کا اثر براہ راست اعتقاد پر پڑتا ہے۔ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ "باطنیہ" (اسماعیلیہ فرقہ) کا تھا جو قرامطہ کے دور میں اُبھرا اور خوب پھلا پھولا۔اس فتنہ کا سب سے بڑا اور برا نتیجہ یہ نکلا کہ دین میں الحاد وتحریف کا دروازہ کھل گیا اور اسلامی حقائق "ضروریات دین" متواتراتِ اسلام، بنیادی عقائد واعمال، مجمع علیہ شعائر اسلام میں تاویلوں اور تحریفوں کے دروازے کھل گئے (اور اسی کے نتیجہ میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور دیگر شعائر اسلام ان کے مذہب سے نکالے گئے) اس آخری دور میں یہ فتنہ بہت بڑے پیمانے پر تمام اسلامی ممالک میں یورپ سے درآمد ہونا شروع ہوا۔اور مستشرقینِ یورپ نے تو اس کو ایسا اپنا نصب العین بنالیا کہ درس وتدریس، تصنیف وتالیف، نشر واشاعت، تحقیق وریسرچ غرض ہر دلکش اور پُرفریب عنوان سے اس کے پیچھے پڑ گئے، اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کردیں، اور اسلام سے انتقام لینے کا اس کو ایک "کارگر ترین حربہ" قرار دے لیا، یہاں تک کہ جو طلبہ اسلامی ممالک سے پی.ایچ.ڈی کی ڈگریاں حاصل کرنے کی غرض سے یورپین ممالک کا سفر کرتے ہیں ان درس گاہوں میں ان طلبہ سے "اسلامی موضوعات" پر ایسے "مقالات ومضامین" لکھواتے ہیں کہ وہ مسلمان طلبہ بھی اسلامی معتقدات کے بارے میں کم از کم "تشکیک" کے اندر ضرور مبتلا ہوجاتے ہیں۔یہ وہ دردناک داستانیں ہیں جن کی تفصیل کے لیے بے پایاں دفتر درکار ہیں۔مجمع الزوائد میں حافظ نورالدین ہیثمیؒ نے بحوالہ "معجم طبرانی" ایک حدیث بروایت عصمۃ بن قیس سلمی صحابیؓ نقل کی ہے:

"إنه كان يتعوذ من فتنة المشرق، قيل: فكيف فتنة المغرب؟ قال: "تلك أعظم وأعظم۔"

ترجمہ:..."نبی کریم ﷺ فتنہ مشرق سے پناہ مانگا کرتے تھے۔آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ مغرب میں بھی فتنہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:وہ تو بہت ہی بڑا ہے، بہت ہی بڑا ہے۔"

یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا کہ آپ ﷺ کی مراد فتنۂ مغرب سے کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ سقوطِ اندلس کی طرف اشارہ ہو کہ وہاں اسلام کا پورا بیڑہ ہی غرق ہوگیا، اور نام کا مسلمان بھی کوئی اس ملک میں نہ رہا، تمام ممالک پر کفر کا غلبہ ہوگیا۔لیکن ہوسکتا ہے کہ بلادِ مغرب کے اس فتنہ میں استشراق کی طرف بھی اشارہ

ہو کہ الحاد وتحریف کا یہ فتنہ مغربی دروازوں سے ہی تمام دنیا کے مسلمان ملکوں میں داخل ہوگا جو سب فتنوں سے زیادہ خطرناک اور عالمگیر ہوگا، بہرحال الفاظِ حدیث کے عموم میں تو یہ داخل ہے ہی۔"

"الغرض اس دور میں یہ علمی وعملی فتنے پورے زور وشور اور طاقت وقوت کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں، ہمارا ملک نسبتاً ان سے مأمون ومحفوظ تھا، لیکن کچھ تو جدید تعلیم کے اثرات سے کچھ مستشرقین کی وسیسہ کاریوں سے نیز مواصلات کی آسانیوں سے اور مال ودولت کی فراوانی سے اب تو یہ ملک کچھ بعید نہیں کہ اس معاملہ میں دوسرے ملکوں سے گویا سبقت لے جائے۔"

[دور حاضر کے فتنے:۲۱۔۹۹]

تاریخ فتنہ انکار حدیث اور اس کے اسباب کے بارہ میں محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں:

"۱:......پہلا سبب

یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امت محمدیہ میں سب سے پہلا فتنہ جس نے سر اٹھایا وہ خارجیوں کا فتنہ ہے۔ اسی فتنہ سے ٹکرا کر مسلمانوں کے اتحاد کی چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہوئی۔ چنانچہ ان خارجیوں نے رسول اللہ ﷺ کے بڑے بڑے صحابہؓ سے بے تعلقی کا صاف اعلان کردیا اور حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، شرکاء جنگ جمل اور تحکیم (ثالثی) کو تسلیم کرنے والے تمام صحابہ کرامؓ کو کافر قرار دے دیا۔ اس تکفیر کے نتیجہ میں ان تمام صحابہؓ کی احادیث جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہیں، ان کو صحیح ماننے سے بھی انکار کردیا (کہ راوئ حدیث کے لیے مسلمان ہونا اولین شرط ہے اور یہ سب کافر ہیں) اور اس طرح انکار حدیث وسنت کی تخم ریزی شروع ہوگئی۔

۲:......دوسرا سبب

پھر اس خارجیوں کے فتنہ کے بالمقابل شیعیت کے فتنہ نے سر اٹھایا، حالانکہ شیعیت کا فتنہ ایک سیاسی ہتھکنڈا (اسٹنٹ) تھا (کہ حبِّ آلِ رسول کے نام سے ہی اقتدار کی باگ ڈور کسی طرح شیعوں کے ہاتھ آجائے) پھر انہی شیعوں میں سے سبائی رافضیوں کا گروہ منظر عام پر آیا، انہوں نے حضرت علیؓ کے ماسوا تینوں خلفاء راشدینؓ کو اور چند طرفدارانِ علیؓ جن کی تعداد میں خود شیعوں کا بھی اختلاف ہے کے علاوہ باقی تمام صحابہؓ کو کافر قرار دے دیا۔ اس فتنہ کا فطری نتیجہ تھا کہ انہوں نے ان چند رواۃ کے علاوہ جو ان کے حامی اور طرفدار تھے، باقی تمام صحابہؓ کی حدیثوں کو ماننے سے انکار کردیا (کہ یہ سب کافر ہیں)۔

۳:......تیسرا سبب

اس کے بعد (۲ ہجری کے آخر میں) اعتزال (عقل پرستی) کا دور آیا، چنانچہ اس عقل پرستی کے تسلط نے معتزلہ کو ان تمام حدیثوں میں تاویلیں کرنے پر (اور تاویل نہ ہوسکنے کی صورت میں ان کو صحیح ماننے سے

انکار کرنے پر) مجبور کردیا، جن کو انہوں نے اپنے عقلی معتقدات کے خلاف محسوس کیا۔عباسی خلیفہ مامون کے عہد میں جبکہ یونانی فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوکر منظر عام پر آئیں، مذہب اعتزال نے مامون کی سرپرستی میں بڑا فروغ حاصل کیا۔

۴:......چوتھا سبب

جب خوارج اور معتزلہ دونوں نے اپنے اپنے معتقدات میں غلو کی بنا پر اعمال کو ایمان کا جزء اور رکن قرار دے دیا تو ردعمل کے طور پر ان کے مقابلہ میں مرجئہ کا گروہ اور ارجاء کا عقیدہ منظر عام پر آیا، مرجئہ نے اس عقیدہ میں اتنا غلو کیا کہ صاف کہدیا: ''**لاتضر مع الإیمان معصیة کما لاتنفع مع الکفر طاعة**''.....ترجمہ:......''ایمان کے ہوتے ہوئے معصیت ضرر نہیں پہنچاتی، جیسے کہ کفر کے ہوتے ہوئے کوئی بھی طاعت نفع نہیں پہنچاتی''۔اس عقیدہ کے نتیجہ میں مرجئہ نے رسول اللہ ﷺ کی ان تمام حدیثوں کو ماننے سے انکار کردیا جن میں کبیرہ گناہوں اور معصیتوں کے ارتکاب پر عذاب جہنم کی وعیدیں مذکور ہیں۔

۵:......پانچواں سبب

اسی زمانہ میں مشہور گمراہ اور غالی شخص جہم بن الصفوان الراسبی جو بعد میں قتل کردیا گیا کا متبع فرقہ جہمیہ منظر عام پر آیا اور صفات باری تعالیٰ پر مشتمل احادیث کا اور روزانہ وجود میں آنے والی جزئیات اور حوادث وواقعات سے متعلق باری تعالیٰ کے علم قبل از وقوع کی احادیث کا انکار کردیا۔خلق قرآن (قرآن کریم کے مخلوق ہونے) کا فتنہ اور جبر (بندہ کے مجبور محض ہونے) کا عقیدہ بڑے زور وشور سے منظر عام پر آیا، نیز انہوں نے کفار کے ''**خلود فی النار**'' (دائمی طور پر جہنمی ہونے) کا بھی جوامت کا اجماعی عقیدہ تھا صاف انکار کردیا۔

الغرض یہ خارجی قدری (معتزلی) شیعہ، مرجئہ، اور جہمیہ وہ بڑے بڑے گمراہ فرقے ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں نمودار ہوئے اور انہوں نے اسلامی عقائد کی وحدت کو پارہ پارہ کردیا۔انہی فرقوں نے اپنے اپنے اعتقادات کی حمایت کی غرض سے اپنے معتقدات کے مخالف احادیث صحیحہ کو ماننے سے انکار کردیا اور انہی کی بدولت انکار حدیث کا فتنہ ایک مستقل فتنہ کی صورت میں وبا کی طرح پھیل گیا۔یہ ہے انکار سنت وحدیث کی یا ان میں تحریف وتصرف اور خودساختہ تاویلوں کا دروازہ کھولنے کی تاریخ اور اس کے وجوہ واسباب۔ان خارجیوں، قدریوں، شیعوں، جہمیوں وغیرہ فرقوں نے ساری ہی حدیثوں کا انکار نہیں کیا، نہ ہی ان کے لیے یہ ممکن تھا (کیونکہ یہ فرقے اپنے اپنے مسلک اور معتقدات کو حدیثوں سے ہی ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، بلکہ یہ فرقے صرف اپنے خلاف حدیثوں ہی کا انکار کرتے تھے) لیکن انہوں نے ایک ایسے راستے کی داغ بیل ڈال دی جس پر چل کر ملحدوں اور زندیقوں نے دینی عقائد واحکام

سے گلوخلاصی حاصل کرنے کی غرض سے علی الاعلان تمام ہی حدیثوں کا انکار کرنے اور الحاد و بے دینی کو فروغ دینے کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔[دور حاضر کے فتنے:۱۶۱]

عصر حاضر میں تو دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں فتنوں کا ایک ''سیلاب'' اُمڈ آیا ہے۔علمی، عملی، دینی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی اتنے فتنے ظاہر ہو چکے ہیں کہ عقل حیران ہے اور حضرت نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ہے:

''لتتبعُن سنَنَ من كان قبلكم ذراعًا بذراع وشبرًا بشبرٍ حتى لو دخل أحدهم جحر ضب لدخلتموه۔''[مشکوٰۃ]

یعنی تم بھی پہلی امتوں: یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے نقش قدم پر چل کر رہو گے اور ان کے اتباع میں اتنا غلو ہو جائے گا کہ اگر بالفرض کوئی کسی گوہ کے سوراخ میں گھسا ہے تو تم بھی اس میں ضرور داخل ہو گے، یعنی فضول ولایعنی اور عبث حرکات میں بھی ان کا اتباع کرو گے۔

آج جب ہم دنیائے اسلام کا جائزہ لیتے اور مسلمانوں کے تمدن و معاشرت کو دیکھتے ہیں تو حضرت رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔مسلمانوں کے موجودہ معاشرے کو جب دیکھتے ہیں، خصوصاً بلاد عربیہ اسلامیہ کا جب جائزہ لیتے ہیں تو بے حد افسوس ہوتا ہے کہ بمشکل کوئی خدوخال ایسا نظر آتا ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ یہ مسلمان ہیں۔''مغربیت'' کے اس سیلاب میں اس طرح بہہ جانا انتہائی دردناک ہے۔پھر کاش! یہ مغربیت اور یورپ پرستی ظاہر تک ہی منحصر ہوتی، اب تو یہ زہر ظاہر سے تجاوز کر کے باطن تک سرایت کر چکا ہے۔خیالات، افکار، نظریات، احساسات سب ہی میں یورپ کا چربہ اتارا جانے لگا ہے، مسلمان ملکوں کی یہ تباہی و بربادی دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے، ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں:

لمثل هذا يذوب القلب عن كمد
إن كان في القلب إسلام وإيمان

ترجمہ:......''اگر دل میں ذرا بھی ایمان و اسلام ہو تو ان جیسے حالات کو دیکھ کر غم سے دل پگھل کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔'' [ماخوذ از عصر حاضر کے فتنے:علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ:۱۶]

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

کیا جاوید احمد غامدی کو اجتہاد کا حق حاصل ہے؟

ہر آدمی پر وساوس کی کثرت سے ایک رنگ چڑھ جاتا ہے، پھر یہ وساوس اس شخص کے خیالات اور اس کے تفکرات اور رجحانات کو متاثر کر دیتے ہیں، پھر وہ شخص عُجب، پندار اور خود پسندی کا شکار ہو جاتا ہے،

اس موقع پر مرکزِ وساوس شیطان لعین اس کا پیچھا کرتا ہے اور اس کے دل ودماغ میں دن رات ایسے ایسے جدید نکتے اور جدید علمی حقائق القاء کرتا رہتا ہے، جس کی وجہ سے یہ شخص سمجھ بیٹھتا ہے کہ وہ اجتہاد کے کسی اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا ہے، پھر وہ قلم اٹھاتا ہے اور قرآن وحدیث کے نصوص اور احکام کو تختۂ مشق بناتا ہے اور ابلیس لعین اپنے القاءات کو مزید تیز کرتا رہتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَى أَوْلِيَاءِ هِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ، وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ“. (الانعام:۱۲۱)

ترجمہ:.... ”اور شیاطین اپنے دوستوں کو القاءات کرتے رہتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں اور اگر تم نے شیاطین کی اطاعت کی تو بے شک تم مشرک بن جاؤ گے۔“

پھر یہ شخص دین اسلام کے مسلمات کو نیا رخ دے کر نئے ڈھب پر لاتا ہے اور ایک فتنہ کھڑا کردیتا ہے۔ جاوید احمد غامدی اور ان کے شاگردوں کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے اور ان کے پیشرو اس قسم کے وسواسی لوگوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے بارے میں بہت بڑی خودرائی، پندار اور اعجاب بالرائے کے شکار ہوتے ہیں، یہاں تک کہ درجۂ اجتہاد کے منصب سے بڑھ کر ان میں سے بعض نے تو نبوت کا دعویٰ کیا۔

حکایت:

ہمارے ہاں بٹگرام میں ایک شخص کا نام فیض محمد ہے، مالی پریشانیوں نے جب اس کو بہت تنگ کیا تو وہ وساوس کا شکار ہوگیا اور اس نے علی الاعلان کہہ دیا کہ میں ”گورنمنٹ ہوں“ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کاغذ کے ٹکڑے ہوتے تھے اور وہ اس پر لکھتا رہتا تھا کہ میں وزیر اعلیٰ کو حکم دیتا ہوں کہ اتنے کروڑ روپے فلاں کو دیدو اور اتنے کروڑ فلاں کو دیدو، وہ خط نہیں لکھ سکتا تھا، صرف انگریزی میں ہندسے لکھ کر آرڈر جاری کرتا تھا، گاؤں کے لوگوں کے ہاں اس کا نام ہی گورنمنٹ چچا پڑ گیا، اب وہ شخص لاہور میں کہیں چوکیدار ہوگیا ہے۔ میں غامدی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ بھی گورنمنٹ چچا نہ بنو، وقت کے سارے علماء، عقلاء، عرفاء اور ارباب نظر کہتے ہیں کہ آپ غلط راستے پر چل پڑے ہیں اور آپ بضد ہیں کہ میں صحیح راستہ پر ہوں۔ ادھر دنیا کے سارے اہل باطل نے آپ کو خوش آمدید کہا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ واقعی غلطی کررہے ہیں۔ علماء کی نصیحت کے باوجود باز آجانے کے بجائے آپ مزید غلطیوں میں غوطے کھارہے ہیں اور دوسروں کو غلط کہہ رہے ہیں اور دین اسلام کو لاوارث لاش سمجھ کر اُسے بھنبھوڑ رہے ہیں، لیکن یاد رکھو! یہ دین لاوارث نہیں ہے، اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو اس کا محافظ ہے: ”إِنَّ لِلْإِسْلَامِ رَبًّا يَحْمِيهِ۔“

ایک ضابطہ علماء نے لکھا ہے کہ جب عمل میں آدمی غلطی کرتا ہے تو وہ کسی وقت توبہ کر کے ہدایت پر آسکتا ہے، لیکن جب علم غلط ہو جاتا ہے تو آدمی ایسا گمراہ ہو جاتا ہے کہ ہدایت پر آنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھو روافض کا علم غلط ہو گیا ہے، قادیانیوں اور آغا خانیوں کا علم غلط ہو گیا ہے، ذکریوں کا علم غلط ہو گیا ہے، ہندوؤں اور سکھوں کا علم غلط ہو گیا ہے تو وہ اپنی گمراہی سے پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں۔ غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں کا اجتہاد کے میدان میں علم غلط ہو گیا ہے، دین اسلام کے ابتدائی اساسی نقشہ میں بھی ان کا علم غلط ہو گیا ہے اور انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ دین بے شک دین برحق ہے، لیکن اس کے بہت سارے احکامات دور اول کے صحابہ کرامؓ کے لیے تھے، ہمیشہ کے لیے نہیں اور اصل رسالت حضرت ابراہیمؑ کی ہے، محمد ﷺ بطور مجدد تشریف لائے ہیں، اس قسم کے دیگر خطرناک دعاوی بھی ہیں جو میں آئندہ لکھوں گا، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب اپنے آپ کو مجتہد سمجھتے ہیں اور اپنے اجتہاد پر جمے ہوئے ہیں، للہٰذا سر دست اجتہاد کی تعریف و شرائط اور اس کے مقام کو واضح کرنا ضروری ہے۔

اجتہاد کا مقام:

شریعت میں اجتہاد کا بہت بڑا مقام ہے، لیکن اجتہاد کا ایک تعارف اور پہچان ہے اور اس کے لیے چند شرائط ہیں، ہر آدمی اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا، اگر چہ وہ بزعم خود اپنے آپ کو بڑا مجتہد سمجھتا ہو۔ چنانچہ "الوجیز" میں اجتہاد کی تعریف یہ لکھی ہے:

"هو بذل المجتهد وسعهٗ في طلب العلم بالأحكام الشرعية بطريق الاستنباط۔"

ترجمہ: "بطور استنباط احکام شرعیہ کے حاصل کرنے میں مجتہد کی پوری کوشش کا نام اجتہاد ہے۔"

"قواعد الفقہ، صفحہ: ۱۶۰" میں اجتہاد کی تعریف اس طرح ہے:

"هو في الاصطلاح استفراغ الفقيه الوسع ليحصل به الظن بحكم شرعي۔"

ترجمہ: "فقیہ کا انتہائی کوشش کرنا، تاکہ اس کو شرعی حکم کا ظن غالب حاصل ہو جائے۔"

"قاموس الوحید" میں علامہ وحید الزمان کیرانویؒ نے اجتہاد کی اردو تعریف اس طرح کی ہے:

"اجتہاد ماہر فقیہ کی اس آخری کوشش کا نام ہے جو کسی معاملہ میں حکم شرعی کا ظن غالب حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔" [القاموس الوحید: ۲۹۰]

ان تعریفات میں حکم شرعی حاصل کرنے کی قید لگی ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص حکم شرعی کی غرض سے نہیں بلکہ لغوی حسی یا عقلی احکام سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے اجتہاد کرتا ہے تو وہ اجتہاد نا قابل اعتبار ہوگا۔ آج کل ماڈرن طبقہ اجتہاد کرنے کا زور لگاتا ہے۔ ان کا مقصد حکم شرعی حاصل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ غیر شرعی حکم تلاش کرنے کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتا ہے۔ غامدی صاحب اور ان کے شاگرد اجتہاد کی اسی

وادی میں سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے اس مکروہ اجتہاد کے ذریعہ سے دسیوں غیر شرعی احکامات کا استنباط کیا ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ غامدی صاحب اوران کے شاگردوں کو دین اسلام میں نقب زنی اور اس کے احکام کی تغلیط ہی نظر آرہی ہے، جب بھی قلم اٹھاتے ہیں کسی اسلامی حکم کے خلاف ہی لکھتے ہیں۔ کیا اسلام کی خدمت کا یہی پہلو اُن کو نظر آرہا ہے؟ خدمت کا کوئی اچھا پہلو اُن کو نظر کیوں نہیں آتا؟ چنانچہ غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' کا تعارف اس طرح کیا ہے:

''اسلام کو جس طرح میں نے سمجھا ہے، یہ اس کا بیان ہے۔'' [غامدی علماء کی نظر میں:۴۱]

غامدی نے مزید لکھا ہے کہ:

''کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی کتاب میزان میں بیان کردیا ہے۔ اس کی ہر محکم بات کو پروردگار کی عنایت اور میرے جلیل القدر استاد امام امین احسن اصلاحی کے فیضِ تربیت کا نتیجہ سمجھیے۔'' [دیباچہ اخلاقیات]

اِنہیں نااہل لوگوں کے مجتہد بن بیٹھنے کے بارے میں علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں اجتہاد سے متعلق فیصلہ کن رائے لکھی ہے، فرماتے ہیں:

''اسلامی ممالک میں لوگوں نے انہیں چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کیا ہے اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام ونشان باقی نہ رہا، لوگوں نے اختلاف مسالک کا دروازہ بند کردیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحات کی کثرت ہوگئی اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کے لیے لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی اور اس لیے بھی کہ ہر کس وناکس مجتہد نہ بن بیٹھے۔ اس لیے صراحت سے کہہ دیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کے لیے مجبور ہیں۔'' [مترجم مقدمہ ابن خلدون]

علامہ مزید لکھتے ہیں:

''آج فقہ کا بس اتنا ہی مفہوم ہے، اگر آج کوئی مجتہد بن بیٹھے تو اس کے اجتہاد کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور نہ اس کی تقلید پر کوئی آمادہ ہوگا، آج دنیا کے تمام مسلمان انہیں چار اماموں کی تقلید کی طرف لوٹ گئے ہیں۔''

[مقدمہ ابن خلدون مترجم:۴۴۳]

علامہ ابن خلدونؒ کی ایک عربی عبارت ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

''ومدعی الاجتهاد لهذا العهد مردود علی عقبه ومهجور تقليدهٔ وقد صار أهل الإسلام اليوم علی تقليد هؤلاء الائمة الأربعة۔'' [مقدمہ ابن خلدون:۱/۴۴۸]

ترجمہ:...''اس دور میں اجتہاد کا دعویٰ کرنے والا پیچھے دھکیل دیا گیا ہے اور اس کی تقلید ترک کردی گئی ہے اور آج کے مسلمان ائمہ اربعہ کی تقلید پر جمع ہوچکے ہیں۔''

ابن خلدونؒ کے کلام سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے اور اس پر سینکڑوں سال سے پہلے اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ علماء امت اور فقہاء ملت نے اجتہاد کی اہلیت کے لیے جو شرائط مقرر کی ہیں، اس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے:

۱:......عربی زبان میں مہارت: اس شرط کی ضرورت اس لیے ہے کہ اسلامی شریعت کی زبان عربی ہے اور قرآن وحدیث کی زبانِ فصاحت وبلاغت آسمانِ عروج پر ہے، اس لیے جب تک کوئی مجتہد عربی زبان کے مختلف اسالیب، محاورات اور ضرب الامثال کو اچھی طرح نہیں سمجھتا، وہ قرآن وحدیث کے مفاہیم اور عبارتوں کی تلمیحات واشارات وامثال کو کیسے سمجھ سکتا ہے؟

۲:......قرآن حکیم کا علم: اجتہاد کے لیے یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم ہی اصل الاصول ہے اور ہر دلیل کا مرجع ہے۔ قرآن کے علم کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد کو یہ معلوم ہو کہ قرآن حکیم میں کتنی آیات احکام سے متعلق ہیں، ناسخ اور منسوخ کیا ہے اور احکامات کے اسباب نزول کیا ہیں۔

۳:......سنت کا علم: اس کا مطلب یہ ہے کہ مجتہد کو احادیث میں صحیح اور ضعیف کی پہچان ہو، راویوں کا حال جانتا ہو، جرح وتعدیل کا علم رکھتا ہو، احادیث کو ایک دوسرے پر ترجیح کے قواعد کا علم رکھتا ہو اور ناسخ ومنسوخ کے اصول کو جانتا ہو۔

۴:......اصول فقہ کا علم: مجتہد کے لیے اصول فقہ کا علم اس لیے ضروری ہے کہ اس علم کے ذریعہ سے وہ شرعی دلائل اور اس کے مآخذ ومصادر اور احکام کے استنباط کے طریقے جان لیتا ہے۔

۵:......مواقع اجماع کا علم: یہ شرط اس لیے ضروری ہے تاکہ مجتہد کی نظر اس پر ہو کہ شرعی احکام میں کہاں کہاں علماء کا اجماع منعقد ہوا ہے، تاکہ یہ مجتہد ایسے حکم کا استنباط نہ کرے جو علماء کے اجماع کے خلاف ہو۔

۶:......مقاصد شریعت کا علم: یہ شرط اس لیے ضروری ہے کہ شریعت میں احکام کی علتوں اور لوگوں کی مصلحتوں کا جو خیال رکھا گیا ہے وہ مجتہد کی نظر میں ہو، وہ عوام کے عرف وعادت سے واقف ہو، کیونکہ لوگوں کے مصالح کی رعایت ان چیزوں کے جاننے کے بغیر ممکن نہیں ہے اور لوگوں کے مصالح کی رعایت شریعت کے مقاصد میں سے ہے۔

۷:......فطری استعداد: یہ شرط اس لیے ہے کہ فطری صلاحیت اگر مجتہد میں نہ ہو، صرف علمی ردّ وکد سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے ہیں جو ایک مجتہد کے لیے ضروری ہے، یہاں زورِ قلم اور قلمکاری ومضمون نگاری نہیں، بلکہ ٹھوس اور سلیم فطرت کی ضرورت پڑتی ہے۔

مندرجہ بالا سات شرائط عام فقہائے کرام نے مقرر کی ہیں، لیکن علامہ آمدیؒ نے ''مناھج

الاجتھاد ،ص:۱۶ ۳‘‘ پر ایک بنیادی شرط لکھی ہے،وہ یہ کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ اس کا اللہ تعالیٰ پر اس کے رسول ﷺ پر اور یوم آخرت پر کامل اور مکمل ایمان ہو اور اس کو ضروریاتِ دین کے تمام امور کا علم ہو اور وہ جانتا ہو کہ اس کے بغیر آدمی مسلمان نہیں ہوسکتا ہے۔امام غزالیؒ نے ایک اضافی شرط لکھی ہے،وہ فرماتے ہیں کہ: مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ متقی اور پرہیز گار ہو، عادل ہو اور ہر ایسی بات سے بچنے والا ہو جو افتاء اور قضاء کے منصب پر فائز کسی بھی شخص کو مجروح و متہم کرنے والی ہو۔

بہر حال ان شرائط اور تعریفات کا اکثر حصہ مولانا ڈاکٹر محمد میاں صدیقی کی کتاب ’’ائمہ اربعہ کے اصول اجتہاد، باب:۵،صفحہ:۱۶۰تا صفحہ:۱۶۷‘‘ سے بطور خلاصہ لیا گیا ہے۔اس بحث کے لکھنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ آج کل اجتہاد کے شوقین دعویداروں کی آنکھیں کھل جائیں کہ اجتہاد کا میدان کیا ہے اور یہ بے چارے کس گلی میں بند پڑے ہیں۔واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔ ☆☆☆☆

مرتبہ: سید خالد جامعی
ناظم، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونیورسٹی

اسلامی علمیت کے انہدام کے لیے

جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے چند طریقے

(.....قسط نمبر ا.....)

عموماً تمام جدیدیت پسند مفکرین خواہ وہ راسخ العقیدہ ہی کیوں نہ ہو یا کسی راسخ العقیدہ روایتی مکتب فکر سے بھی مجبوراً وابستہ ہوں لیکن جیسے ہی وہ جدیدیت، مغربیت، اس عہد کے تمدنی مذہب [Civil religion] مذہب حقوق انسانی [Religion of Human Rights] اور اسلام میں ہم آہنگی تلاش کرنے کی شعوری، غیر شعوری، منطقی، عقلی کاوش شروع کرتے ہیں دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلامی علمیت کو غیر معتبر، مشکوک اور ناقابل یقین بنانے کے لیے کئی طریقے استعمال کرتے ہیں اس مضمون میں ہم فی الحال ان کے چند طریقوں کا تعارف اور تنقید پیش کریں گے۔

[ا] عقل پرستی:

دعویٰ کرتے ہیں کہ عقل ونقل میں تضاد نہیں اگر ہوگا تو نقل کو عقل کے مطابق کر دیں کیونکہ دونوں یکساں درجے کے منہاج ہیں، انسان کے پاس دو پیغمبر آتے ہیں، ایک پیغمبر ظاہر جو رخصت ہو جاتے ہیں، ایک پیغمبر باطن جو عقل کی صورت میں ہر فرد کو ہمیشہ میسر رہتا ہے، عقل کو ذریعۂ آلے کے بجائے ماخذ دین کے طور پر استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ دعویٰ خود تضاد کا شکار ہے، کیونکہ جب عقل ونقل یکساں درجے کے ماخذ ہیں تو عقل ونقل میں تضاد کی صورت میں صرف عقل کو نقل کے تابع کرنا غیر عقلی اور غیر منطقی رویہ ہے، کیونکہ انہی کے اصول کے تحت نقل کو عقل کے تابع کرنے میں کوئی حرج نہیں، لہٰذا آخر کار نقل عقل کے تابع ہو جاتی ہے اور پھر تابع مہمل بن جاتی ہے، لہٰذا جدیدیت پسندوں کے یہ دعوے کہ عقل ونقل میں منافات ممکن نہیں، اختلاف محال ہے کہ دین کی بنیاد علم وعقل کے مسلمات پر ہے تو یہ دعویٰ خود بتاتا ہے کہ نقل کی جگہ اگر عقل کو رکھ دیا جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا جو نقل کے ذریعے نکلے گا، لہٰذا عقل نقل کی محتاج نہ رہی اور انسان نقل کا محتاج نہ رہا کہ وہ عقل پیغمبر باطن کے ذریعے ہی نقل کی اصل تک پہنچ سکتا ہے، لہٰذا عقل ونقل میں منافات کا انکار کرنے والے اصلاً نقل کا ہی انکار کر دیتے ہیں اور عقل کو اصل الاصول یعنی نص صریح قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود غازی مرحوم جیسے عالم جو ہرگز جدیدیت پسند نہیں تعقل غالب کے زیر اثر لکھتے ہیں:

''شریعت کی اصل اور روح میں مذہب و عقل لازم و ملزوم ہیں، عقل اور وحی دونوں شریعت کے ماخذ ہیں، وحی الٰہی نے عقل کو شریعت کی تعبیر میں اہم ماخذ کی حیثیت عطا کی ہے''۔

[محمود غازی ۲۰۰۹ء، عصر حاضر اور شریعت اسلامی، ص ۳۴۵، ساتواں خطبہ علم کلام IPS اسلام آباد]

حالانکہ جاوید غامدی جیسے متجدد بھی عقل کی بالادستی برتری کو قدم قدم پر تسلیم کرنے کے باوجود جب عقل کو چند مقامات پر نارسا، بے کس، بے بس، عاجز اور بے نوا پاتے ہیں تو بے اختیار تسلیم کرتے ہیں کہ:

''اللہ نے سورۂ نساء میں ورثاء کے حصے متعین کر کے اسے اپنی وصیت قرار دیا وجہ یہ بتائی گئی کہ انسان نہیں جانتا کہ ان رشتہ داروں میں کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے۔'' [ص: ۵۱۷، میزان ۲۰۱۰ء]

''انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تقسیم وراثت کے معاملے میں وہ انصاف پر مبنی کوئی فیصلہ کر سکتا، کون بہ لحاظ منفعت اس سے قریب تر ہے، وہ نہیں جانتا، علم و عقل میں اس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جا سکتی، اس لیے یہ فیصلہ اس کا پروردگار ہی کر سکتا ہے، انسان نہ رب کے علم کی وسعتوں کو پا سکتا ہے نہ اس کی حکمتوں کو پوری طرح سمجھ سکتا ہے، وہ اگر بندہ مومن ہے تو بس حکم سنے اور سر جھکا دے۔'' [ص ۵۲۲، ایضاً]

''تادیب و تنبیہ کس جرم میں کتنی اور کس طریقے سے ہونی چاہیے، اس کی تعین کے لیے کوئی بنیاد چونکہ عقل انسانی کو میسر نہیں، اس وجہ سے اللہ نے اپنے نبیوں کی وساطت سے انسان کو جو شریعت دی اس میں تمام بڑے جرائم کی سزائیں خود مقرر کر دیں۔'' [میزان، ص ۶۱۰، طبع سوئم مئی ۲۰۰۸ء، لاہور]۔

[۲] فطرت ماخذ دین ہے:

جدیدیت پسند فطرت کو بھی ماٗ خذ علم کے طور پر استعمال کرتے ہیں، مگر یہ نہیں بتاتے کہ کون سا انسان فطرت پر قائم ہے اور کونسا انسان فطرت مسخ کر چکا ہے، فطرت پر قیام کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہوگا، پیمانہ فطرت خود ہے یا پیمانہ باہر ہے، کیا پیمانہ عقل ہے یا نقل ہے؟ حضرت آدم فطرت پر قائم تھے، ان کو پیغام حق اللہ تعالیٰ نے براہ راست دیا تھا کہ شجر کے قریب نہ جاؤ، مگر نقل کے سامنے عقل و فطرت اُن کے کچھ کام نہ آئے، وہ نسیان کے باعث خطا کا ارتکاب کر بیٹھے، لہٰذا عقل و فطرت نقل کے تابع ہوں تو راہِ راست بتا سکتے ہیں۔

[۳] اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے:

کہتے ہیں کہ ''اسلام ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے۔'' لیکن سوال یہ ہے کہ زمانے کو پرکھنے کا پیمانہ کیا ہے؟ کیا زمانہ خود پیمانہ ہے یا زمانے کو نقل پر پرکھا جائے گا؟ ان کا خیال ہے کہ زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا ہے اور یہ زمانے کی فطرت ہے، اسلام کو زمانے کے مطابق چلنا چاہیے، ورنہ مسلمان زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ

جائیں گے۔سوال یہ ہے کہ اگر رسالت مآب ؐ زندہ ہوتے، خلافت اسلامیہ باقی رہتی تو کیا زمانے کے رنگ ڈھنگ یہی ہوتے؟ ظاہر ہے زمانہ تعقل غالب [Dominant Discourse] کے زیر اثر اپنے رنگ بدلتا ہے، اسی لیے انبیاء کرام جب بھی آتے ہیں زمانے کو پیچھے کی طرف موڑتے ہیں اور وہ اپنے اصل سے رجوع کر لیتا ہے، ہر پیغمبر نے اپنے سے پہلے پیغمبروں کی تعلیمات کی تصدیق اسی لیے کی اور زمانے کی رفتار کو روک کر اسے ماضی کی طرف پلٹا دیا۔اگر زمانہ خود ہی پیمانہ ہے تو پھر یہ نصوص دین میں نئے نص کا اضافہ ہے۔

[۴] اجتہاد کے نام پر ماخذات دین میں اجتہاد:

اسلام میں اجتہاد قرآن وسنت اجماع وقیاس کی بنیاد پر غیر منصوص مسائل میں ہوسکتا ہے مگر یہ حضرات اجتہاد کو آزادانہ عقلی سرگرمی تصور کرتے ہیں اور اجتہاد کے نام پر ماخذات دین میں اجتہاد کرنے لگتے ہیں۔

[۵] مجتہد، فقیہ، عالم دین غیر مسلم ہوسکتا ہے۔

متجددین کا خیال ہے کہ ''مجتہد، فقیہ اور عالم دین غیر مسلم بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ اجتہاد، فقہ، فتوے علم کے لیے اصل شرط علم ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ و پرہیزگاری نہیں، لہٰذا ہر غیر مسلم عالم سے جو اسلامی فنون و علوم کا ماہر ہو اسی طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے جس طرح مسلمان علماء فقہاء مجتہدین سے۔''

دوسرے معنوں میں دینی علم کسی سے بھی لیا جاسکتا ہے اور تقویٰ، پرہیزگاری کا علم سے کوئی تعلق نہیں اور قرآن کی ان آیات کا وہ مفہوم بھی درست نہیں کہ راسخون فی العلم اور علماء ہی اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے لوگ ہیں، یعنی خدا کے خوف سے عاری شخص بھی خدا کے فیصلوں کا حقیقی مقصد محض عقل اور علم کے ذریعے مسلمانوں کو بتا سکتا ہے اور مسلمان اس سے استفادہ کرنے پر مجبور ہیں، علم کا عمل سے کوئی ربط نہیں، مجرد علم ہی درست نتیجے تک پہنچنے کے لیے کافی ہے کہ یہ خالص عقلی، معروضی، آفاقی سرگرمی ہے، لہٰذا ایک عابد زاہد تہجد گزار عالم اور غیر مسلم عالم کا نتیجۂ علم، اخذ، واستنباط یکساں سطح کا ہوگا۔

حالانکہ مشکوٰۃ شریف میں آتا ہے'' إن هـذا العلم دين، فانظرو اعمن تاخذون دينكم'' یہ علم ہی تمہارا دین ہے تو یہ دیکھ لو کہ کس [شخصیت] سے تم دین یا [فکر] اخذ کر رہے ہو۔'' جدیدیت پسند اس اُصول کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔

[۶] مغرب کی ترقی معیار ہے اسلام کو یہی ترقی مطلوب ہے۔

متجددین کا یہ بھی خیال ہے کہ:''مغرب کی ترقی معیار ہے اسلام کو یہی ترقی مطلوب ہے۔'' لہٰذا

مغرب قابل تقلید ہے صرف "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول کا اطلاق کیا جائے جو بہتر ہو وہ لے لیا جائے، جو خراب ہے اسے ترک کر دیا جائے۔

مگر مغرب خود کیا ہے؟ اس کی ایجادات کے مقاصد کیا ہیں اس کا فلسفہ، اس کی مابعد الطبیعیات کیا ہے؟ یہ جدیدیے اس سے قطعاً ناواقف ہیں، لیکن اس کے باوجود مغرب کی تقلید کے لیے شرعی حیلے تلاش کرتے ہیں۔

حالانکہ جو شخص مغرب کی جاہلیت سے کوئی خیر اخذ کرنا چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ اس خیر کی مکمل تحقیق کرے، مغربی علمیت اور اسلامی علمیت کا موازنہ کرے، اگر وہ دونوں علوم پر عبور نہیں رکھتا اور تقابل کی صلاحیت کے بغیر اجتہاد کرتا ہے تو وہ جاہلیت کا شکار ہوگا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ لہٰذا "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول سے اسی وقت استفادہ کیا جاسکتا ہے جب حقیقت جاہلیت سے کلی آ گہی ہو۔

[۷] نصوص کی ایک تعبیر نہیں متنوع تعبیریں ممکن ہیں۔

یہ دعویٰ مستشرقین کا تھا، جسے علامہ اقبال نے خطبات کے ذریعے سہواً پیش کیا، بعد میں خطبات کے مباحث سے رجوع کر لیا۔ تفصیلات کے لیے امالی غلام محمد مطبوعہ ساحل جون ۲۰۰۶ء، سہیل عمر کی کتاب خطبات اقبال، نئے تناظر کا اختتامی صفحہ اور ضمیمہ "سزا و نا سزا" ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد پرویز صاحب، ڈاکٹر مشیر الحق نے نصوص میں تنوع کی غیر علمی دلیلیں پیش کیں، جسے عمار خان ناصر صاحب نے اپنی خوبصورت تحریر کے ذریعے "حدود و تعزیرات چند اہم مباحث" میں ایک فلسفے کے طور پر پیش کیا اور جناب زاہد الراشدی صاحب نے اس فلسفے کی تائید سہواً یا قصداً فرمادی۔ یعنی کوئی دائرہ علم یقینی نہیں ہے، سائنس فلسفہ تو ہمیشہ غیر یقینی رہے، اب نصوص بھی اسی سطح پر آ گئے، عقلی اور نقلی علوم میں کوئی فرق باقی نہیں رہا، انسانی علم ہی نہیں خدائی علم وحی الٰہی بھی متغیر ہو گئے، مطلق حتمی ابدی نہیں رہے، خالق و مخلوق اور ان کا علم دونوں یکساں درجے پر آ گئے۔ حالانکہ یہ رویہ اجتہاد نہیں بدعت، ضلالت اور الحاد ہے۔

[۸]

تجدد پسندوں کی رائے ہے کہ: التوحید سب سے اہم ہے، روایت ازلی ہے اور ہر مذہب میں موجود ہے، تمام مذاہب کی تعلیمات ٹھیک ہیں، صرف تشریح میں انحراف اور التباس و تحریف دین ہوتی ہے، عقل کے ذریعے التوحید، واحد، حقیقت الحقائق تک پہنچا جاسکتا ہے۔

حالانکہ اس مفروضے کا تجزیہ کریں تو یہ منصب رسالت کا انکار ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ: رسالت اور حدیث اِسی لیے اہم نہیں ہے، جنت و دوزخ کا فیصلہ توحید پر ہوگا، نجات ایمان بالرسالۃ سے مشروط نہیں کیونکہ توحید آفاقی ہے، رسول ایک خاص قوم میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے، خدا باقی ہے، قیوم ہے، حیّ ہے، لہٰذا خداوند کی معرفت ہی ایمان کی اصل ہے۔

دوسرے معنوں میں صرف خدا پر ایمان کافی ہے، خدا کی صفات، ذات، حقیقت، اس کی رضا، اس کے احکام، اس کی شریعت، اس کے مطالبے تقاضوں پر عمل توحید کا تقاضہ نہیں ہے، بس خدا کو مان لینا ہی عہد الست کا واحد تقاضہ ہے، زندگی جس طرح چاہے بسر کریں، صرف خدا کے نام کی شمع دل میں روشن کرلیں، وحدت ادیان کا فلسفہ یہی ہے، رینے گینوں کا مکتب فکر اور بعض نام نہاد علماء بھی اس خیال کے حامی ہیں۔

[۹] اجماع حجت نہیں ہے۔

متجددین کہتے ہیں کہ: ''اجماع حجت نہیں ہے۔'' حالانکہ اجماع عقل کے استعمال سے پیدا ہونے والے اختلافات کا حل بھی پیش کرتا ہے، تعبیر وتشریح، دین کا عمل عقل کے آلے کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے اور عقل استقراء واستخراج کے تحت غلطی کرتی ہے، کرسکتی ہے اور کرتی رہی ہے، لہٰذا اس امت میں اختلاف کا حل صرف اجماع اور مسلک جمہور ہے، لہٰذا اجماع کا انکار کر کے اختلاف کا دروازہ اس طرح کھولا جاتا ہے کہ دین کے کسی حکم پر عمل ممکن ہی نہیں رہتا، ہر حکم میں اختلافات نظر آتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ انسان دین سے ہی دستبردار ہوجاتا ہے۔ جناب جاوید غامدی صاحب کی تحریروں سے صرف ایک مثال میراث کا مسئلہ پیش خدمت ہے، ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول میں میراث کی آیات کا مفہوم غامدی صاحب نے اہل سنت کی تقلید میں بیان کیا:

> ''سورۂ نساء میں اللہ نے ان نادانوں کو جو اپنے علم وعقل کے غرے یا ذاتی میلان کی بناء پر اس خدائی کے قانون میں ترمیم کرنا چاہیں تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم (میراث) اللہ کے علم وحکمت پر مبنی ہے، انسان اپنی بلند پروازیوں سے اللہ کے حکم کی وسعتوں کو نہ پاسکتا ہے نہ اس کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے، بندہ مومن کا کام یہی ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے کسی بات کی حکمت سمجھ میں آجائے تو اس کے حضور میں سجدہ شکر بجالائے، سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی عقل کے نقص پر محمول کرے، احکام الٰہی کے باب میں صحیح رویہ یہی ہے''۔ [جاوید غامدی، میزان ۱۹۸۵، حصہ اول، ص ۵۸، طبع اول، مئی ۱۹۸۵ء]۔

۲۰۰۲ء میں میزان آئی تب بھی میراث کی آیات کے مفاہیم اہل سنت کے اتباع میں تھے۔

''سورۂ نساء میں اللہ نے ان حصوں کو اپنی وصیت قرار دیا ہے جس کے مقابلے میں ظاہر ہے کہ کسی مسلمان کو

اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے، نساء کی آیت ۷ کے الفاظ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں، لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ بقرہ کی اس آیت (وصیت) کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔

[ص ۱۶۴، میزان جاوید غامدی، طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء دارالاشراق ۱۲۳ بی ماڈل ٹاؤن لاہور]

کتاب کے کل صفحات ۳۲۷ ر ہیں۔ میزان طبع اول ۲۰۰۷ء، ۲۰۰۹ء، ۲۰۱۰ء، ۲۰۱۲ء کے "خاتمہ" میں اس کا کوئی ذکر نہیں بلکہ خاتمے میں غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ میزان کا کام میں نے ۱۹۹۰ء بمطابق ۱۴۱۰ ہجری میں کسی وقت شروع کیا، وہ آج سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچ گیا [ص ۶۵۰، میزان، طبع پنجم، فروری ۲۰۱۰ء] اس تحریر کے نیچے ۲۷ راپریل ۲۰۰۷ء کی تاریخ درج ہے۔ ظاہر ہے یہ غلط بیانی ہے، (کیونکہ) میزان ۱۹۸۰ء میں شروع ہوئی، پہلی مرتبہ ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول کے نام سے شائع ہوئی، دوسری مرتبہ ۲۰۰۲ میں صرف میزان کے نام سے شائع ہوئی لیکن خاتمے میں میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے]

"اب کسی مرنے والے کو اللہ کے ٹھہرائے ہوئے ان وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا، یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے، انسان اس کے علم کی وسعتوں اور اس کی حکمتوں کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، وہ مومن ہے تو اس کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور سر جھکا دے"۔

[میزان، ۲۰۰۲ء، ص ۷۰ بحولہ بالا]

۲۰۰۷ء، ۲۰۰۸ء میں میزان جدید تخنیم آئی تو میراث میں وارث کے حق میں وصیت جائز قرار پائی، لیکن نئے اجتہاد کے لیے ابتداء میں پرانی دلیلیں دی گئیں۔

"سورۂ نساء میں اللہ کی طرف سے قانون نازل ہونے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا، یہ تقسیم اللہ کے علم و حکمت پر مبنی ہے، اس کے ہر حکم میں گہری حکمت ہے، بندہ مومن کے لیے زیبا یہی ہے کہ اس کا حکم سنے اور اس کے سامنے سر جھکا دے"۔ [غامدی، ص ۵۲۰، میزان، طبع پنجم، فروری ۲۰۱۰ء]

"مسلمان اب رشتہ داری کی بنیاد پر اپنی کوئی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا، من بعد وصیۃ کے جو الفاظ ان آیتوں میں بار بار آئیں گے، ان سے مراد بھی ایسی ہی کوئی وصیت ہے جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں خود ان کے حق میں کی جائے۔ [ص: ۵۲۳، بحولہ بالا]

"غیر مضار وصیۃ من اللہ آیت کے آخر میں یہ الفاظ اس تنبیہ کے لیے آئے ہیں کہ وارث بنانے کا یہ عمل کسی حق دار کے لیے ضرر کا موجب نہ ہونا چاہیے، اللہ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں۔" [ص ۵۲۸، ۵۲۹، بحولہ بالا]

"یہ ہماشما کا مشورہ نہیں پروردگار عالم کی وصیت ہے اس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کے ہر عمل سے باخبر ہے۔" [ص۵۲۹،محولہ بالا]

"والدین اور اقرباء کے حصے اللہ نے نساء کی ان آیتوں میں خود متعین کر دیے اور انھیں اپنی وصیت قرار دیا ہے یہ حصے بالکل متعین ہیں ان میں کمی وبیشی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہر مسلمان اب اسی قانون کے مطابق وصیت کا پابند ہے اور دستور کے مطابق وصیت کا حکم باقی نہیں رہا۔"

[غامدی، طبع سوم، مئی ۲۰۰۸ء، میزان، ص۵۱۹، المورد لاہور]

"(سورۂ نساء میں احکام میراث) اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا" [ص۵۲۵،محولہ بالا]

پھر اجتہاد ملاحظہ کیجیے:

"تاہم اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا ان میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو اس صورت میں بھی ان کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی [ص۵۲۵محولہ بالا]

لیکن اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لیے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرمادیے ہیں اس حق (وصیت کے) کو استعمال کرتے ہوئے کسی کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔[ص۵۳۱،محولہ بالا]۔

مئی ۲۰۰۸ء طبع سوم کی میزان میں غامدی صاحب کا میراث میں وصیت کے بارے میں جو نیا موقف تھا، مگر مقامات نومبر ۲۰۰۸ء طبع اول میں یہ موقف مطلق تبدیل ہو گیا۔ ۲۰۰۸ء میں میزان جدید کے بعد غامدی صاحب کی کتاب مقامات میں اجتہاد عربیت کی رو سے سامنے آیا کہ مورث کسی بھی وارث کے حق میں پوری میراث کی وصیت کرسکتا ہے۔ قرآن، عربی مبین، لغت اس معاملے میں کوئی قدغن عائد نہیں کرتے، یہ قدغنیں فقہاء کی عائد کردہ ہیں۔ مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء میں ص۱۴۰ تا ۱۴۲ "وصیت کا حق" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے، یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کرسکتا ہے؟ دوسرا یہ کہ وصیت کیا ان لوگوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے جنھیں اللہ نے میت کا وارث ٹھہرایا ہے۔؟ [مقامات، نومبر ۲۰۰۸ء، ص۱۴۱، محولہ بالا] پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید (وصیت وارث یا غیر وارث کے حق میں) کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، اللہ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی، زبان وبیان کے کسی قاعدے کی رو سے اس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔[ص۱۴۱، محولہ بالا] وارثوں کے

حق میں خود اللہ نے وصیت کر دی ہے، اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا، لہٰذا یہ وصیت بر بنائے رشتہ داری نہیں ہو سکتی، مگر انھی وارثوں کی کوئی ضرورت کسی کی کوئی خدمت یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضہ کرے تو وصیت یقیناً ہو سکتی ہے، یہ وصیت ان وارثوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے''۔[ص۱۴۲، محولہ بالا]۔

صرف ایک فرد ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۸ء تک یعنی صرف ۲۳ سال کے عرصے میں عربیت، عقل، منطق، استقراء کے تحت ایک ہی آیت کے کئی معانی بتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میراث کے حکم پر عمل کب ہوگا؟ اجماع اور مسلک جمہور درحقیقت اسی انتشار، بدنظمی، گمراہی، پریشان خیالی سے بچانے کا دینی روحانی اسلامی اصول ہے۔

[۱۰] اللہ اپنے قوانین کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا طبعی قوانین اٹل ہیں:

واضح رہے کہ سائنس دان بھی یہ بات نہیں کہتے، ان کے یہاں سائنس کا ہر قانون، کلیہ، قاعدہ، غیر مطلق، متغیر غیر حتمی اور ہر آن بدلنے والا ہے۔ جدیدیت پسند کہتے ہیں کہ اللہ خود اپنے قانون کا پابند ہے، یعنی قانون بنا کر مجبور ہو گیا ہے، جس طرح اللہ نے خود اپنے لیے ''کتب علی نفسہ الرحمۃ'' کا قانون بنا کر خود کو پابند کر لیا ہے اب وہ قانون رحمت کے تحت بندوں کو سزا نہ دینے اور معاف کرنے کا پابند ہے، لہٰذا اسی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ اپنی دوزخ کو خود جلا کر ختم کر دے۔

جناب غامدی صاحب نے میزان میں گمراہ فلاسفہ کے قدیم نقطۂ نظر کو علامہ اقبال کے خطبات کے ذریعے پڑھ کر اپنے خطیبانہ اسلوب میں بڑے زعم کے ساتھ بیان کیا ہے۔ واضح رہے کہ اقبال نے اس گمراہی سے رجوع کر لیا تھا، غامدی صاحب قرآن کی ان تمام آیات کو بھول گئے جو دوزخ و جنت کی ابدیت اور ہمیشگی کی زندگی کا بار بار اعلان کرتی ہیں۔ کفار مغرب کو خوش کرنے کے لیے حضرت والا نے آیات قرآنی کے بغیر جہنم کو خود ہی بجھا دیا۔ توقع ہے کہ ایک دن دوزخ کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔[میزان، ص۱۹۱، فروری ۲۰۱۰ء]۔

[۱۱] اسلام کی آمد کا مقصد تسخیر کائنات ہے:

ان کا ایک نظریہ یہ ہے کہ: ''اسلام کی آمد کا مقصد کائنات کی تسخیر ہے۔ تاکہ خزائن فی الارض سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر کے اس کائنات پر خدا کی ہیبت قائم کر دی جائے جس طرح مغرب نے دنیا پر قائم کر دی ہے، اس ہیبت کا حصول تسخیر ارض و سما کے بغیر ممکن نہیں، لہٰذا خلافت ارضی اسی کو ملے گی جو اس کام کو

تکمیل تک پہنچادے گا، مغرب نے ہر کام کرلیا لہٰذا خلافت کا حق دار ٹھہرا۔"

حالانکہ اسلام کی آمد کا اصل مقصد عبادت رب اور معرفت رب کے سوا کچھ نہیں کہ انسان روز حشر خدا کے سامنے کھڑے ہونے، معافی پانے اور جنت میں جانے کے قابل ہو جائے، یہی فوز عظیم ہے، اسی لیے فرمایا گیا کہ انسان اور جنوں کو ہم نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔

جبکہ یہ کہتے ہیں کہ عہد حاضر میں کامیاب اور طاقت ترین ریاست وہ ہے جس کا GTA, GCI, HDI, GNI, GNP, GDP سب سے زیادہ ہو، یہ اہداف تسخیر کائنات اور علوم کفار پر دسترس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہیں، عہد حاضر میں یہ اہداف تمام امتوں کے مشترکہ غیر اقداری اہداف ہیں، ان کا حصول تسخیر کائنات کے بغیر ممکن ہی نہیں، لہٰذا تسخیر کائنات ایمان کا اولین تقاضہ ہے، اس کے بغیر ریاست وخلافت اسلامیہ کا قیام ممکن نہیں، شریعت کے مکمل نفاذ کے لیے اسلامی حکومت وریاست کا قیام لازم ہے، لہٰذا تمکن فی الارض کے لیے تسخیر فی الارض اور تمتع فی الارض بھی امر لازم ہیں۔

لیکن اسلام اِن تصورات کو تسلیم نہیں کرتا، اسلامی ریاست کے مقاصد قرآن میں متعین کر دیے گئے ہیں، نظام صلوۃ وزکوۃ کا قیام اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔

[۱۲] علم صحیح یعنی وحی الٰہی کے پرکھنے کا پیمانہ سائنس ہے:

یہ کہتے ہیں کہ: علم صحیح یعنی وحی الٰہی کے پرکھنے کا پیمانہ سائنس ہے۔ لہٰذا مذاہب عالم سے نزاع ہو یا تقابل یا مناظرہ تو قرآن کی حقانیت ادیان باطلہ پر ثابت کرنے کے لیے سائنسی علم ایجادات نظریات کو حجت، منہاج، فرقان، کسوٹی کے طور پر قبول کیا جائے کیونکہ عصر حاضر میں کفار اور مسلمانوں کے مابین سائنس کے الحق ہونے پر اشتراک ہے اختلاف نہیں اور مناظرہ کا اصول یہی ہے کہ جو اصول فریقین میں متفقہ ہے اس کے مطابق مناظرہ کیا جائے اس اصول کے اطلاق کے نتیجے میں وحی الٰہی سے برتر پیمانہ سائنس قرار پاتی ہے جس پر قرآن کو پرکھا جائے گا۔

حالانکہ وحی الٰہی سب سے افضل وبرتر علم ہے، یہ اپنے جواز کے لیے کسی دوسرے کی محتاج نہیں، اس کو کسی دوسرے پیمانے پر پرکھا نہیں جاسکتا کہ یہ تمام پیمانوں کو پرکھنے کا واحد، آخری، قطعی پیمانہ ہے۔ جب سائنس کو اعلیٰ ترین علم، پیمانہ تسلیم کیا گیا اس اصول کے تحت مخلوق کو خالق اور اس کے کلام پر حاکم اور حَکَم [arbitator] بنا دیا گیا اب قرآن سائنس کی تصدیق کا محتاج ہے وہ خود حجت فرقان برہان نہیں ہے۔

[۱۳] مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی:

ان کا خیال ہے کہ: ''مذہب سائنس کے بغیر اندھا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔'' اس اصول کے تحت الدین، قرآن، اسلام کو نامکمل محتاج اور معذور ثابت کر دیا گیا۔ سائنس سے متاثر بعض جدیدیت پسند مسلم مفکرین خطباء اور مناظرین نے اپنے خطبات میں اس اصول کو بار بار بیان کیا ہے۔ مذہب کو کسی سہارے کا محتاج بنانا قرآن کے اس دعوے کی نفی ہے کہ دین مکمل ہو گیا ہے اللہ کا دین ہی اگر ناقص، معذور اور کمزور ہو تو وہ حجت کیسے ہو سکتا ہے، ایک مسلمان جو اپنے دین میں نقص تسلیم کرے اس کا مقام و مرتبہ کیا ہو سکتا ہے؟

متجددین کا کہنا ہے کہ: قرآن سائنس ہے اور سائنس قرآن۔ قرآن کی اصطلاح عالم کا مطلب سائنس داں ہے جو فطرت، قدرت، آثار کائنات کا قریب ترین مشاہدہ کرتا ہے، جو قرآن کو مطلوب رویہ ہے، تفکر تدبر کی قرآنی اصطلاحات کا اصل عامل سائنس داں ہی ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورۃ العلق میں قلم اور علم کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں علم سے مراد تمام علوم عقلیہ خصوصاً سائنسی علوم ہیں جن سے مسلمانوں کو قوت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا ان علوم کا حصول فرض کفایہ نہیں فرض عین ہے، کیونکہ علوم عقلیہ ہی اصل العلوم ہیں، قرآن کی تمام آیات انہی علوم کے حصول کی دعوت دے رہی ہیں اور مسلمان کئی صدیوں سے اس آواز کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

اس موقف کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہم سے اچھے تو کفار ہیں جو قرآن کی ایک آیت پڑھے بغیر ہی تمام علوم عقلیہ کے ماہر ہو گئے۔ حالانکہ قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے اس کا حقیقی فہم حاصل کرنے والے صحابہ کرام تھے، مگر ان میں ایک بھی سائنس داں نہیں تھا اور کسی ایک صحابی نے کوئی کتاب نہیں لکھی، نہ کوئی شے ایجاد کی، نہ کوئی سائنسی نظریہ، مساوات تخلیق کی تو کیا وہ فہم قرآن سے واقف نہ تھے؟

[۱۴] دنیا میں کوئی آفاقی سچ نہیں اسلام بھی کئی سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے:

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ: ''دنیا میں کوئی آفاقی سچ نہیں، اسلام بھی کئی سچائیوں میں سے ایک سچائی ہے۔'' لہٰذا کوئی اسلام کے الحق ہونے کا دعویٰ نہ کرے کیونکہ اس سے تصادم و تنازع پیدا ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ مغرب میں رواداری کا مطلب وہ نہیں ہے جو رواداری کی اسلامی اصطلاح کا مطلب ہے، کیونکہ ہر اصطلاح خواہ اس میں لفظی مماثلت ہو معنویت کی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ ان کا مابعد الطبیعیاتی تناظر مختلف ہوتا ہے۔ مغربی رواداری کا مطلب یہ ہے کہ مذاہب کے دعوے سائنسی بنیادوں

پرنہیں پرکھے جا سکتے، لہٰذا یہ علمی دعوے نہیں غیر علمی جاہلانہ دعوے ہیں، لہٰذا تمام جہالتیں ایک دوسرے کو برداشت کریں، کسی دعوے کو کسی دوسرے دعوے پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے معنوں میں مذہب، دین، الحق کچھ نہیں ہوتا۔ رواداری [Tolerance] کے تحت تمام خودساختہ سچائیوں کو یکساں درجہ دیا جائے تاکہ متنوع معاشرہ Plularstic society قائم ہو سکے جہاں آزادی اصل قدر ہو، ہر شخص کو اپنا خیر خود تخلیق اور ترک کرنے کا اختیار ہو خیر اعلیٰ آزادی ہو ایسا معاشرہ ہو جہاں امن ہو تنازعات کا اصل سبب کسی دین کا اپنے الحق ہونے پر اصرار ہے۔

ظاہر ہے یہ کاذب بیان ہے۔ پہلی جنگِ عظیم سے لے کر کابل اور عراق تک پھیلی ہوئی عالمی جنگیں برپا کرنے والے مذہبی لوگ نہیں ہیں، وہ مغربی ممالک، ادارے، روس، جرمنی، برطانیہ وغیرہ وغیرہ UNO اور امریکہ ہیں۔

[۱۵] تمام اعتراضات شبہات تنقید تحقیق۔ اسلام فقہ اجتہاد اور قرآن پر ہوتی ہے:

ان متجددین کے تمام اعتراضات شبہات تنقید تحقیق۔ اسلام فقہ اجتہاد اور قرآن پر ہوتی ہے اور اس میں رخنے نظر آتے ہیں مگر کوئی ایک جدیدیت پسند مفکر مغرب پر اس طرح تنقیدی نظر نہیں ڈالتا، نہ مغرب کے علوم عقلیہ کا ناقدانہ جائزہ لیتا ہے، نہ مغرب میں مغرب پر ہونے والی تنقیدات [Internal Critiques] کا مطالعہ کرتا ہے، نہ ہی اس کو علم ہوتا ہے کہ مغرب میں مغرب کے فلسفے جدیدیت، اس کے مظاہر سائنس ٹیکنالوجی سرمایہ داری جمہوریت کے خلاف کیا لکھا جا رہا ہے، ہزرل، ہائیڈیگر، رچرڈ رارٹی جیسے چوٹی کے فلسفی مغرب کے بارے میں کیا بتا رہے ہیں۔

مغرب میں انہیں عریانی فحاشی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، ان کا خیال ہے کہ مغرب عریانی فحاشی ترک کرکے اگر کلمہ پڑھ لے تو وہ ہم سے بہتر مسلمان ثابت ہوں گے۔ لہٰذا جدیدیت پسندوں کو۔ تمام خوبیاں مغرب میں نظر آتی ہیں، تمام خامیاں اسلامی تاریخ، اسلامی علمیت اور اسلامی شخصیات و اداروں میں نظر آتی ہیں۔

[۱۶] قرآن سنت فقہ اجتہاد کی تاریخ میں صرف عورت اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لایا جاتا ہے:

ان کے ہاں قرآن سنت فقہ اجتہاد کی تاریخ میں صرف عورت اور اس کے متعلقات کو زیر بحث لایا جاتا ہے، کیوں کہ ان جدیدیت پسندوں کو۔ اسلامی علمیت کا پندرہ سو سالہ ذخیرہ صرف عورت کے معاملے میں

نا قابلِ قبول، قابلِ تنقید، ترمیم، تنسیخ، تردید نظر آتا ہے، لیکن مرد کے معاملے میں یہ علمی ذخیرہ آج بھی مکمل کفایت کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکامات پندرہ سو سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد صرف مردوں کے معاملے میں آج بھی کامل ہیں، لیکن عورت کے معاملے میں ناقص ہیں اور زمانہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے عورت سے متعلق نصوص کا نقص مسلسل واضح ہو رہا ہے[نعوذ باللہ] دوسرے معنوں میں یہ نقص ذات خداوندی اور ذات رسالت مآبؐ میں تلاش کیا جا رہا ہے نعوذ باللہ۔ غامدی صاحب اور ان کی اتباع میں عمار خان ناصر صاحب نے عورت کی دیت، حدود و تعزیرات میں عورتوں کی گواہی کے بارے میں جو موقف اپنایا ہے اس کے پیچھے یہی نفسیات کارفرما ہیں۔

[۱۷] اسلام کی تباہی کا اصل سبب ملوکیت، تصوف، جامد مذہب اور سرمایہ داری تھے۔

یہ کہتے ہیں کہ: اسلام کی تباہی کا اصل سبب ملوکیت، تصوف، جامد مذہب اور سرمایہ داری تھے۔ حالانکہ سرمایہ داری اٹھارہویں صدی میں آئی ہے۔ یہ لوگ دولت اور سرمایہ کے فرق سے ناواقف ہیں۔ یہ ملوکیت، مشاورت، جمہوریت کے فرق سے بھی واقف نہیں، انہیں تصوف کے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔

[۱۸] اسلامی اصطلاحات کا استعمال:

اسلامی جدیدیت پسند اپنی تحریروں میں اصطلاحات، علامات، شخصیات تو وہی استعمال کرتے ہیں جو اسلام میں مروج ہیں، لیکن ان کی ایسی توضیح تشریح تو جیہہ پیش کرتے ہیں کہ اصطلاح علامت اور شخصیت کا اصل مقصد کالعدم ہو جائے اور اصطلاح کا ہدف بھی حاصل نہ ہو، اس طرح دینی اصطلاحات کے دائرے میں رہتے ہوئے یہ تحریف دین کا کام کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام ظاہری مماثلتوں کے باوجود اسلامی اصطلاحات اسلامی شخصیات اسلامی تاریخ اسلامی علامات سے عمومی تنفر پیدا ہو جاتا ہے۔

[۱۹] صرف قرآن:

پروٹسٹنٹ ازم کی طرح یہ جدیدیت پسند قرآن کی طرف دعوت دیتے ہیں، صرف قرآن سے رجوع کرنے کا صور پھونکتے ہیں، قرآن کے لیے سنت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔

توحید کو رسالت محمدیؐ، سنت، احادیث، اسوۂ حسنہ سے الگ کر کے، علماء سے کاٹ کر، دین کی روایت اور تاریخ سے جدا کر کے دین کی من پسند تشریحات پیش کرنا آسان ہوتا ہے اور جس طرح مارٹن لوتھر نے پوپ کا اور علماء عیسائیت کا انکار کر کے ہر فرد کو عقل، منطق، اور استقراء کے ذریعے خود انجیل کو سمجھنے پرکھنے عمل کرنے کی دعوت دی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انجیل کی طرف دعوت کی تحریک آخرکار انجیل کو ترک کرنے کی

دعوت بن گئی، گو کہ لوتھر کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا، اس نے پوپ کی حاکمیت رد کرنے کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھا۔ لہٰذا جو گروہ اور فرقے قرآن کی طرف بلاتے ہیں، ان کے یہاں عمل بالقرآن معطل ہو جاتا ہے، صرف قرآن پر تفکر تدبر و تحقیق باقی رہ جاتا ہے، یا جماعت نماز کے بجائے نماز کے اوقات میں تدبر فی القرآن بغیر نماز پڑھے جاری رہتا ہے، آخر کار یہ رویہ بھی ختم ہو کر بے دینی پیدا ہوتی ہے اور دینی اقدار و روایات شخصیات علامات سے کامل نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

[۲۰] تعقل قلبی کا انکار

جدیدیت پسند کانٹ کی طرح عقل محض کو تسلیم کرتے ہیں اور تعقل قلبی کے قائل نہیں، جبکہ اسلامی تاریخ میں تعقل قلبی نہایت اہم ذریعہ علم ہے، عقل محض کبھی حقیقت الحقائق اور اس کی معرفت کا ادراک نہیں کر سکتی، عقل کا مقام قلب ہے، تعقل قلبی پر اسلامی علمیت کے ہر مکتب فکر کی تحریریں موجود ہیں، تفسیر ماتریدی، ابن جوزی کی 'صید الخاطر'' قرطبی کی تفسیر قرطبی، ابن تیمیہؒ کے مجموع الفتاویٰ میں تصوف اور کتاب المنطق میں تعقل قلبی پر نفیس بحث ہے، امام قیمؒ کی کتاب الفوائد، شیخ الاسلام خلافت عثمانیہ علامہ مصطفیٰ صابری کی موقف العقل والعالم والعلماء، وغیرہ میں تعقل قلبی پر نفیس استدلال کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار فقہاء علماء کی کتابوں میں تعقل قلبی مرکزی مضمون ہے۔

[۲۱] تفردات اور شذوذ سے کلیات اخذ کرنا:

جدیدیت پسند امت کی تاریخ پڑھ کر مختلف شخصیات کے تفردات علمی کو جمع کر لیتے ہیں اور ان تفردات سے نئی علمیت وضع کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مسلمہ اسلامی روایت اور علمیت کے متبادل علمیت تخلیق کی جائے اور امت کی تاریخ، اجماع، روایت، تعامل اور تسلسل کو نظرانداز کر کے ہر شخص کو اجتہاد کامل کی آزادی دے دی جائے۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جدیدیت پسند اجماع کو حجت نہیں مانتے، لیکن کسی کے تفرد کو مان کر اسے حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ وہ تفرد کو حجت تسلیم کر رہے ہیں، جب اجماع حجت نہیں ہے تو تفرد کیسے حجت ہو سکتا ہے؟ اکثر جدیدیت پسند مسلم مفکرین کے تفردات کی دلیل یہی ہوتی ہے کہ ماضی میں فلاں فلاں ہستی اس رائے کی حامل رہی ہے، لہٰذا تمام تفردات جمع کر کے یہ فلسفے کی زبان میں فلسفہ اصطفطائیت کے مکتب میں شامل ہو جاتے ہیں جو کم زور ترین فلسفہ تصور کیا جاتا ہے۔

[۲۲] (ا) تخصیص و تعمیم:

متجددین کا ایک حربہ یہ ہے کہ: رسالت مآب کے اقوال اور صحابہ کے کسی خاص عمل، فیصلے، تعامل یا

اجتہاد کی عصر حاضر میں تعمیم کرنا یا تخصیص کر دینا۔

مثلاً مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکالنے کا حکم اُس زمانے کے لیے خاص تھا، اُس عہد کے مشرکین واہل کتاب کے لیے تھا، وہ باقی نہیں رہے، لہٰذا حکم اب باقی نہیں، رسول کے ساتھ ختم ہو گیا، اِس میں قیامت تک توسیع ممکن نہیں۔ رسول اللہ نے قانون اتمام حجت کے تحت کفار واہل کتاب پر تلواروں کے ذریعے عذاب نازل کیا، مگر صحابہ نے روم و ایران پر یہ عذاب کیوں نازل کیا؟ تو جواب ملے گا کہ رسول اللہ انھیں خط لکھ چکے تھے، خط اتمام حجت تھا، لہٰذا صحابہ کا جہاد صرف اُس عہد کے لیے خاص تھا، اب نہ رسول ہیں نہ صحابہ، لہٰذا اِقدامی جہاد دین کی دعوت کے لیے قیامت تک ممنوع ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا تو متجددین کی طرف سے اس کی تصریح یوں کی جائے گی کہ کافر سے مراد عہد رسول کے کفار واہل کتاب و مشرکین تھے لیکن وہ باقی نہ رہے، لہٰذا یہ حکم بھی اب باقی نہیں ہے، اب کافر مسلمان ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں۔

(ب) کسی خاص اجتہاد کو اجتہاد کے بجائے تفرد قرار دینا اور اس اجتہاد کی تاریخی تناظر کو دانستہ نظر انداز کر کے اس اجتہاد کی تعمیم کرنا اور اس کا اطلاق عہد حاضر میں اس طرح کرنا کہ اسے مغربی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

مثلاً حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو اسلام قبول کر لینے کے باوجود اپنے غیر مسلم شوہر کے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ اِس اجتہاد کی بنیاد پر مغرب میں آباد تمام ان عورتوں کو جو مسلمان ہو چکی ہیں اور اپنے شوہروں سے ترک تعلق چاہتی ہیں ان کافر شوہروں کے ساتھ رہنے کی مکمل آزادی مہیا کرنا اور اس آزادی کے لیے شرعی دلائل دینا تا کہ متنوع معاشرے Pluralistic Society کی مغربی کافرانہ اصطلاح کے مطابق شریعت سے آزاد معاشرہ اور معاشرت تخلیق و منظم کی جا سکے، یہ اجتہاد کرتے ہوئے جدیدیین اس بات کا ذکر نہیں کرتے کہ اُس وقت خلافت راشدہ موجود تھی، خلافت راشدہ میں پبلک لاء اسلامی تھا، مسلمان دنیا کی امامت کر رہے تھے، کفر کے بڑھنے پھلنے پھولنے کے کوئی امکانات نہ تھے، اہل کتاب جزیہ دے کر اور ذمی بن کر ریاست اسلامی میں رہ رہے تھے، کسی خاص صورت میں حضرت عمرؓ نے اِس کی اجازت دی جس پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا، اُس کے بعد اسلامی خلافت میں اِس اجتہاد کا کبھی اعادہ نہیں کیا گیا، اِس تمام تناظر، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کو دانستہ نظر انداز کرنا دراصل مغرب کو مطلوب اجتہاد کی دانستہ کوشش ہے۔

جدیدیین اجتہاد اور تفرد میں فرق کرنے سے قاصر ہیں، بہت سے معاملات میں ایک بڑا عالم اپنی

رائے مختلف رکھتا ہے لیکن عمل اس رائے پر کرتا ہے جس پر امت کا اجماع ہو، علم وعمل کے اس فرق کو جدیدیت پسند دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ حدیث کے کسی راوی کا عمل اگر اس کی روایت کے خلاف ہے تو راوی کا عمل حجت ہوتا ہے، اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ مگر جدیدیت پسند راوی کے عمل کو نظر انداز کر کے روایت پر اصرار کریں گے۔

[۲۳] تبدیلی زمانہ کے ساتھ فہم قرآن کی تبدیلی:

کہتے ہیں: زمانے کی بڑی تبدیلیوں کو سامنے رکھنا قرآن فہمی کے لیے ضروری ہے، یعنی فہم قرآن منحصر ہے تبدیلی زمانہ پر، جیسے جیسے زمانہ بدلے گا قرآن کا فہم بھی سورج کی طرح اپنا رخ بدلتا جائے گا۔

[۲۴] فقہ کے بعض اجماعی اصول قرآن وسنت کے منافی ہیں:

کہتے ہیں: فقہ کے بہت سے اصول اور مسلمہ فیصلے جن کو اجماع کا درجہ حاصل ہے، قرآن وسنت کے منافی ہیں، جیسے مسلمان عورت کا کتابی مرد سے نکاح کا حرام ہونا قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے، جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی جھگڑے چل رہے تھے تب مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی فقہاء کی جانب سے ممنوع قرار دی گئی تھی، اب وہ جھگڑے ختم ہو گئے ہیں لہٰذا کفار سے نکاح جائز ہے۔

[۲۵] رسول اللہ کو قرآن کی کسی آیت کی تخصیص وتعمیم کا اختیار نہیں:

جدیدیین کا نظریہ ہے کہ: رسول اللہ کو قرآن کی کسی آیت کی تخصیص وتعمیم کا اختیار نہیں، کیوں کہ قرآن حجت اور قطعی الدلالۃ ہے، اسے کسی خارجی تشریح توضیح توجیہہ کی ضرورت نہیں، قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی نہیں ہے، خدا کا پیغمبر بھی اس کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے، جو کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت سے کہتا ہے، کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے عاجز قاصر وخاسر نہیں، اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن، اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتا ہے، ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال اگر پیدا ہو جائے کہ اس کے الفاظ کی دلالت اپنے مفہوم پر قطعی نہیں ہے تو قرآن کی ہر چیز بالکل بے معنی ہو جائے گی، قرآن کے مقامات ایسے ہیں جہاں ایک قول کے سوا کسی دوسرے قول کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی، القرآن لا یحتمل إلا تاویلا واحدا کہ قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی، قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے انسان مجبور ہے کہ بس وہ ایک ہی قول کو اختیار کرے ورنہ قرآن چیستاں بن کر رہ جائے گا۔ [میزان غامدی]

برعظیم پاک و ہند میں قرآن سے متعلق ان اصولوں کا اعلان احمد دین امرتسری، فراہی صاحب، پرویز صاحب، امین احسن اصلاحی صاحب اور جاوید غامدی صاحب نے کیا ہے، لیکن اس دعوے کے باوجود امرتسری صاحب اور پرویز صاحب نے قرآن کی ایک ہی آیت کے ایک سے زیادہ معانی بیان کیے ہیں، فراہی مکتب فکر کے تین اہم افراد فراہی صاحب، اصلاحی اور غامدی صاحب نے آیۃ حجاب سے متعلق آیات کے جو مفاہیم معانی مطالب بیان کیے ہیں وہ بالکل متضاد ہیں، مکتب ایک، اصول ایک اور نتائج بالکل مختلف [تفصیلات کے لیے مجموعہ تفسیر فراہی، تدبر قرآن، مسلمان عورت دوراہے پر اور غامدی صاحب کی کتاب میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء، میزان طبع اول ۲۰۰۸ء، میزان طبع پنجم ۲۰۱۰ء، میزان طبع ششم ۲۰۱۲ء، اسلام کیا ہے طبع اول تا طبع پنجم، اشراق کی فائلیں، قانون اور معاشرت پر ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۵ء تک شائع ہونے والے کتابچے، میزان ۲۰۰۸ء، ملاحظہ کیجیے]

دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب نے ۳۵ رسال کے عرصے میں آیۃ حجاب کے چھ (۶) سے زیادہ مطالب بیان کیے ہیں اور ہر نیا فہم سابقہ فہم کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ قرآن کے قانون میراث کی آیات کے غامدی صاحب نے ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک تین مختلف مفہوم پیش کیے، جبکہ ان کے اصول کے مطابق بھی قرآن کی آیت کا ایک ہی مطالب ہوسکتا ہے ورنہ قرآن چیستان بن جائے گا۔ [تفصیلات کے لیے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، میزان ۲۰۰۲ء، میزان ۲۰۰۸ء، مقامات طبع دوم جولائی ۲۰۰۶ء اور مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء ملاحظہ کیجیے]

قرآن میں عورت کے نشوز پر مرد کو سزا دینے کی ہدایت دی گئی ہے (النساء: ۳۴) اس آیت میں اجازت و ہدایت مرد کو دی گئی ہے اور قرآن اس معاملے میں بالکل واضح ہے امت کا اجماع بھی یہی ہے۔ لیکن اہل قرآن کی طرح غامدی صاحب جو پیغمبر کو بھی قرآن کی کسی آیت کی تخصیص تعمیم یا ترمیم تفسیر و توضیح و تشریح کا اختیار نہیں دیتے خود اس آیت کی تعمیم و تخصیص و ترمیم و تصحیح کا اختیار اپنے لیے حاصل کر لیتے ہیں۔ میزان طبع اول ۲۰۰۸ء اور طبع پنجم ۲۰۱۰ء میں لکھتے ہیں:

"عورت کو جسمانی سزا دی جائے، ظاہر ہے یہ سزا اتنی ہی ہوسکتی ہے جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے، نبیؐ نے اس کی حد "غیر مبرح" کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے، یعنی ایسی سزا نہ دی جائے جو کوئی پائیدار اثر چھوڑے، مرد کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔"

[ص: ۴۲۱، ۴۲۲]

غامدی صاحب نے میزان ۲۰۱۰ء میں لکھا ہے کہ خدا کا پیغمبر بھی اس کے حکم کی تحدید و تخصیص اور

ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا (ص ۲۵، میزان ۲۰۱۰ء) لیکن یہاں پیغمبر کی تحدید وتخصیص خود بیان کر رہے ہیں جوان کے طے کردہ اصول ومبادی کی نفی ہے، پیغمبر کو اپنے اصول کی نفی کی اجازت دینے کے بعد نفی کا یہ اختیار وہ اپنے لیے بھی حاصل کر لیتے ہیں اور قرآن کی اس ہدایت یا اجازت کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں، جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا خطرہ ہو انہیں نصیحت کرو، ان کے بستروں میں انہیں تنہا چھوڑ دو اور اس پر بھی نہ مانیں تو انہیں سزا دو، پھر اگر وہ اطاعت کریں تو ان پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔[النساء:۳۴] جس میں تمام تر خطاب مرد سے ہے، خاندانی مسئلے سے ہے، نجی معاملہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ گھر میں حل کرنے کا طریقہ بتا رہے ہیں اور اسے عدالتوں میں گھسیٹنے اور عوامی گفتگو سے بچانے کے لیے اس کا ایک اندرونی حل پیش فرما رہے ہیں، مگر غامدی صاحب اس حکم کی تخصیص وتوسیع وتعمیم وتشریح کرتے ہوئے اپنے اصول ارتقاء کے تحت عورت کو تادیب کے خدائی حکم کا ارتقاء کے تحت نیا مطلب بتاتے ہوئے مقامات طبع اول نومبر ۲۰۰۸ء میں لکھتے ہیں:

> ''تمدن کی تبدیلی سے عورت کو سزا کا حق عدالت کو دیا جاسکتا ہے، یہ محض طریقہ کار کی تبدیلی ہے، اس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا، سزا شوہر دے یا بزرگ دے یا عدالت دے، اس سے حکم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔'' [ص ۱۴۷، ۱۴۶]

قرآن نے صرف شوہر کو تادیب کرنے اور الزام تراشی سے بچنے کی ہدایت کی تھی، مگر غامدی صاحب نے پہلے میزان ۲۰۱۰ء میں تادیب کے حکم کو شاگرد اور اولاد کو سزا دینے کے عمل پر قیاس کر کے اس حکم کی تحدید وتخصیص کی کہ شوہر بیوی کو شاگرد سمجھے یا اولاد اور انہی پر قیاس کر کے بیوی کو سزا دے۔ جبکہ بیوی نہ شاگرد ہے نہ اولاد، کیونکہ شاگرد اور اولاد سے نہ نکاح ہوسکتا نہ طلاق دی جاسکتی ہے نہ ہم بستری ہوسکتی ہے۔ قرآن نے شوہر کو مخاطب کیا ہے، غامدی صاحب نے اس حکم کی تعمیم اور حکم میں توسیع کرتے ہوئے شوہر۔ خاندان کے بزرگ اور عدالت کے جج کو یکساں مرتبہ دے دیا، سرکش عورت کے لیے شوہر کے جو جذبات ہوں گے کیا وہی جذبات کسی بزرگ، اور عدالت کے کسی جج کے ہوسکتے ہیں؟ بزرگ کی صحت اگر سزا دینے کے قابل نہ ہو تب اگر وہ بہت کم زور بزرگ ہوں تب؟ عدالت مرد کی ہوگی یا عورت کی ہوگی؟ سزا جج دے گا یا اس کے لیے جلاد کا تقرر کرے گا؟ جلاد مرد ہوگا یا عورت ہوگی؟ اگر مرد ہوگا تو محرم ہوگا یا نامحرم ہوگا؟ اگر نامحرم ہوگا تو نامحرم عورت کو ہاتھ کیسے لگا سکتا ہے؟ اگر عورت جسمانی سزا دے گی تو عورت مرد کے مقابلے میں جسمانی طور پر کم زور ہوتی ہے اور عورت ذات ہونے کے باعث وہ سزا دے گی تو اس میں وہ جوش اور شدت بھی نہیں ہوگی جو شوہر میں ہوگی؟ تو کیا اس سے سزا کا مقصد حاصل ہو جائے گا؟ اگر عدالت کا مردجج سزا دے گا تو وہ بھی عورت کو شرعاً اپنے ہاتھ سے سزا نہیں دے سکتا، آخری چارۂ کار یہ ہے کہ عدالت شوہر سے عورت کو

اپنی نگرانی میں سزا دلوا دے، اگر یہی کرنا ہے تو غامدی صاحب کو اتنے اجتہادات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

سورۂ مائدہ میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آیا ہے، مگر کون سا ہاتھ کاٹا جائے، اس کا حکم موجود نہیں ہے، مگر سنت حدیث و اجماع کی روشنی میں دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹا جاتا ہے، غامدی صاحب کے اصول ومبادی کے تحت یہ غلط ہے، مگر خود غامدی صاحب اسی غلط کی تقلید بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''قطع ید کی یہ سزا 'جزاء بما کسبا نکالا من الله' ہے۔ لہٰذا مجرم کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دینے میں عمل اور پاداش عمل کی مناسبت جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اسی طرح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اُس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے، اس لیے کہ انسانوں میں آلۂ کسب کی حیثیت، اگر غور کیجیے تو اصلاً اسی کو حاصل ہے۔'' [میزان: ۶۲۷]

[۲۶] انتخابات، دعوت کا مؤثر ترین ذریعہ:

متجددین کہتے ہیں کہ: انتخابات دعوت دین کو بہت بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچانے کا سب سے موثر ذریعہ ہے، اگر انبیاء اس عہد میں مبعوث ہوتے تو وہ اسی ذریعے سے اپنی قوت کا اندازہ لگاتے اور اسی طریقے سے آئندہ کی حکمت عملی طے کرتے اور اسی طریقے سے انقلاب برپا کرتے۔

[۲۷] روایتی اسلام پر عمل قدامت پرستی ہے:

روایتی اسلام کو جدیدیت پسند مفکرین Traditional Islam، Islamic Political، Orthodox Islam، Fundamental Islam، Evanegelism Islam, Theocratic Islam, Revolutionary Islam قدامت پرستی، آبا پرستی، تقلید، دقیانوسی اسلام، وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں اور جدیدیت پسند اسلام کے لیے Modrate Islam، Real Islam، Folk Islam، Islamic Intellectualism، Libral Islam، Revivalist Islam، New Islam، Islam in new Melinium، Popular Islam، Democratic Islam، Open Islam، Islam Progressive Islam، Markist Islam وغیرہ کی اصطلاحات سے نمایاں کرتے ہیں۔

[۲۸] عورت اور مرد مساوی ہیں:

اسلامی اور روایتی تہذیبوں میں مساوات نہیں ہوتی، عورت مرد انسان نہیں عبد ہوتے ہیں اور عبدیت میں برابر ہوتے ہیں، معرفتِ رب جنس کی تفریق کی بنیاد پر حاصل نہیں ہو سکتی، یہ عمل کا میدان ہے۔ مذکر مونث کا فرق یہاں موجود نہیں، روایتی اور مذہبی تہذیبوں میں مراتب وجود ہوتے ہیں، لوگوں کے

درجات متعین ہوتے ہیں، ان تہذیبوں میں مرد مرد کے برابر نہیں ہوتا تو مرد عورت کی مساوات کا کیا سوال؟ ہر وجود کا مرتبہ اس کے وجود اور عمل سے متعین ہوتا ہے۔

[۲۹] اسلام محض ایک ثقافتی تحریک ہے۔

نئی نئی اصطلاحات کی تخلیق کے ذریعے جدیدیت پسند اسلام کو ایک متنوع الخیال دین بلکہ چیستان بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کو دین کے بجائے ایک ثقافتی تحریک یا تاریخی تحریک باور کراتے ہیں۔اسی اصول کے تحت مغربی یونیورسٹیوں میں اسلام یا مذاہب عالم کو ایک مذہب کے طور پر نہ پڑھا اور نہ ہی پڑھایا جاتا بلکہ اسے ثقافتی مطالعات Cultural Studies کے عنوان کے تحت رکھا جاتا ہے، مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ اسلام کوئی علم، علمیت، حقیقت نہیں، محض ایک ثقافتی رویہ ہے، جو تاریخی تجربے کے نتیجے میں ایک قوم کی میراث قرار پایا ہے، جس کی کوئی علمی، علوی، نبوی اور آسمانی بنیاد نہیں ہے۔

[۳۰] صحیح، کامل اور ابدی مذہب کے اوصاف:

اِن کے نزدیک ایک صحیح، کامل اور ابدی مذہب کے اوصاف درج ذیل ہیں:

۱۔مذہب کی صحت کا مدار عقل قرار دیا جائے نہ کہ تقلید۔

۲۔کوئی عقیدہ مذہبی عقل کے خلاف نہ ہو۔

۳۔عبادات کے یہ معنی نہ قرار دیے جائیں کہ وہ مقصود بالذات ہیں اور خدا ہمارے تکلیفات شاقہ اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، بلکہ عبادات سے خود نوع انسانی کا فائدہ مقصود ہو اور وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہوں۔

۴۔دینی اور دنیوی فرائض کو اس اعتدال کے ساتھ قائم کیا جائے کہ ایک سے دوسرے کو ضرر نہ پہنچے بلکہ ایک دوسرے کا دست و بازو بن جائے۔

۵۔مذہب تمدن کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی کا ساتھ دے سکے بلکہ خود اس ترقی کا رستہ دکھائے ہم اس کتاب میں اول انہی اصول کے معیار پر اسلام کو جانچنا چاہتے ہیں۔

[شبلی علم الکلام اور اسلام ص ۱۷۴، مسعود پبلشنگ ہاوس کراچی طبع دوم ۱۹۶۷ء]

[۳۱] اسلام کو سائنس کے مطابق ثابت کرنا:

اِن کی کوشش ہوتی ہے کہ اسلام کو کسی نہ کسی طرح سائنس کے مطابق ثابت کرنا، تاکہ اسلام کی حقانیت اور فوقیت واضح ہو۔حالانکہ اصلاً اِس طریقے کے نتیجے میں سائنس ہی کی حقانیت ثابت ہوتی ہے اور مذہب کو لوگ سائنس کے بنائے ہوئے اُصولوں پر پرکھنے لگتے ہیں، سائنس پیمانۂ حق و باطل بن جاتا ہے،

الدین، الحق، الوحی پیمانہ حق و باطل نہیں بنتا۔ یہ کام خواہ کتنی نیک نیتی سے کیا جائے لیکن اس کا نتیجہ گزشتہ سو برس کی تاریخ میں یہی نکلا ہے۔

[۳۲] اسلام، لبرازم کی طرح آزادی کا قائل ہے:

اِن کا نظریہ یہ ہے کہ: جتنی شخصی آزادیاں لبرل ازم نے دی ہیں اسلام میں اِس سے زیادہ آزادیاں ہیں اور اگر زیادہ نہیں ہیں تو لبرل ازم سے کم بھی نہیں ہیں، لیکن فقہی قانونی روایتی اسلام نے جو اجماع امت، مسلک جمہور، اہل السنۃ والجماعۃ، منہاج اہل سنت کی اصطلاحات میں اسلامی علمیت کا اجارہ دار ہے، اس نے اسلام میں حاصل آزادیوں کے چہرے پر روایتوں قانونی فقہ، اور چند علماء یا چند مکاتب کے متفق علیہ چند غیر عقلی اصولوں کا پردہ ڈال رکھا ہے، لبرل ازم سے ہم نے اسلام میں آزادی کی روایت کی قدر و قیمت پہچانی ہے اور اپنے گمشدہ سرمایہ آزادی کی بازیافت کی ہے، فی الاصل لبرل ازم نے آزادی کی متاع بے بہا اسلامی تاریخ اور علمیت سے حاصل کر کے دنیا کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ہم وہ آزادی بھی دینے پر تیار نہیں جو اسلام نے دی ہے۔ اِس صورت میں لبرل ازم کا مقابلہ کیسے ممکن ہو؟ دونوں میں قدر مشترک آزادی ہے، مگر اسلامی علمیت کے ورثا یعنی علماء عقیدۂ آزادی کو تسلیم ہی نہیں کرتے، یہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ آزادی اسلام نے دی لیکن شریعت کی تمام پابندیاں ہوں تو آزادی کے کیا معنیٰ؟

[۳۳] مغربی اساسات اور اسلامی اساسات میں کوئی فرق نہیں:

اِن کا کہنا ہے کہ: مغرب کا بنیادی حقوق کے اطلاق اور نفاذ کے حوالے سے عالم اسلام اور عالم کفر کے لیے دوہرا معیار اس کی منافقت ہے، دوسرے معنوں میں اصل معیار تو وہی ہے یعنی انسانی حقوق جو مغرب نے طے کر دیا ہے، مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے معیارات کے مطابق عالم اسلام کو وہ آزادی عطا نہیں کر رہا جو کفار کو عطا کر رہا ہے جس کے باعث مسلمانوں میں محرومی کا احساس عام ہے۔ یعنی اصولی طور پر مغرب کے عقائد یا ایمانیات، اصول ومبادی، اساسات اور اسلام کے اصول مبادی میں کوئی فرق نہیں۔

[۳۴] حقیقت وحی سے الہام سے یا عقل سے ملے وہ حقیقت ہی ہوتی ہے۔

غامدی صاحب نے مقامات ۲۰۰۶ء میں ص ۱۳۲ پر یہ انکشاف کیا ہے۔

[۳۵] جو غیب عقل میں نہ آئے، اسے ماننا ضروری نہیں:

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ:

"ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے انہیں انسان محض عقلی دلائل کی

بنیاد پر مان لے۔ بن دیکھے مانے، مگر بن سوچے سمجھے نہیں، یعنی وہ چیزیں جو دیکھی نہیں جاسکتیں انھیں عقل کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے، مگر ایسی چیزوں کو دیکھنے کا تقاضہ، ان کا تجربہ کرنے کا مطالبہ اصلاً سب سے بڑی بے عقلی ہے، قرآن کے حقائق بے شک حواس سے ماوراء ہیں، لیکن عقل سے ماوراء نہیں ہیں، قرآن کے غیبی حقائق کو ہم نے عقل کی میزان میں تولا اور غیب پر ایمان لائے، ایمان بالغیب کے معنی یہی ہیں کہ ہم انھیں عقل وفطرت کے قطعی دلائل کے طور پر مانتے ہیں، اس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی مانیں گے۔'' [مقامات ۲۰۰۶ء، ص ۶۸، ۶۹]

حالانکہ لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواسِ خمسہ اس کا پتہ لگاسکیں۔ اور قرآن میں لفظِ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔

[۳۶] مغربی بینکاری کے بانی نبی کریم ﷺ ہیں:

یہ کہتے ہیں کہ: مغربی بینکاری نظام کے اصل بانی حضورؐ، حضرت عروہ بن زبیرؓ اور امام ابوحنیفہؒ ہیں، یہ سب لوگوں کی امانتیں اپنے پاس رکھتے تھے، رسول اللہ نے ہجرت سے پہلے یہ امانتیں حضرت علی کے سپرد کی تھیں کہ اب بینک بند کیا جارہا ہے رقم کھاتے داروں کو واپس کردو۔

[۳۷] جدید سیکولر یونیورسٹی تصور 'صفہ' سے لیا گیا:

ان کا کہنا ہے کہ: جدید سیکولر یونیورسٹی آکسفورڈ کیمبرج وغیرہ کا تصور مغرب نے مسجد نبوی میں قائم دنیا کی پہلی یونیورسٹی صفہ سے اخذ کیا ہے؟

[۳۸] لا ادری کہنا سب سے بڑی جہالت ہے:

جدید یت پسندوں کا خیال ہے کہ: لا ادری کہنا سب سے بڑی جہالت ہے، للہذا ہر مسئلے ہر معاملے ہر عقدے پر آزادانہ، بے باکانہ رائے دینا علم کا تقاضہ ہے، خواہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

جدیدیت پسند مسلم مفکرین عموماً اپنے علم میں خود کفیل ہوتے ہیں، انہیں دنیا کا ہر علم حاصل ہوتا ہے، للہذا کسی سے علم حاصل کرنے کی حاجت محسوس نہیں کرتے، للہذا آزادی اظہار رائے کے سب سے بڑے وکیل اور اسی خنجر مغرب کے سب سے بڑے قتیل ہیں۔

[۳۹] زکوٰۃ ٹیکس ہے، روزانہ یا ماہانہ کی بنیاد پر ہونی چاہیے:

زکوٰۃ ٹیکس ہے، اسلامی ریاست میں حکمران صرف زکوٰۃ کا Tax لگاسکتے ہیں، اس کے سوا کوئی اور محصول [Tax] حرام ہے، اگر مفادامت میں محصول لگانا لازم ہوتو یہ کام صرف اور صرف امت کے علماء اور

فقہاء کی اجازت سے اس وقت ہوسکتا ہے جب بیت المال خالی ہو، ورنہ یہ حرام ہے، حدیث ہے: ''ٹیکس وصول کرنے والا جہنمی ہے۔''

زکوٰۃ کا نصاب وہ نہیں ہے جو فقہاء نے بیان کیا ہے، نوکری کرنے والا ہر مہینے اپنی تنخواہ پر بیس فی صد زکوٰۃ دے، کاروبار کرنے والا ہر روز کے منافع پر بیس فی صد زکوٰۃ دے، زکوٰۃ سالانہ بنیاد پر نہیں، عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق روزانہ یا ماہانہ بنیاد پر ہوگی، دیگر امور میں یہ سالانہ بنیاد پر دی جاسکتی ہے۔

[۴۰] تنقید وتحقیق کا رخ مغرب کے بجائے اسلام کی طرف:

کوئی جدیدیت پسند مفکر مغرب پر تنقید نہیں کرتا، زیادہ سے زیادہ تنقید یہ ہوتی ہے کہ مغرب سراسر خیر ہے، بس وہ کلمہ پڑھ لے اور عریانی فحاشی ترک کردے، اس کے سوا مغرب میں انہیں کوئی بڑی، اہم، بنیادی، خلقی، باطنی، خامیاں نظر نہیں آتیں، بلکہ اکثر یہ کہتے ہیں کہ مغرب اسلام ہی کی ایمان سے محروم ترقی یافتہ مگر محرف شکل ہے، اس کا ظاہر ٹھیک ہے، باطن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ تمام جدیدیت پسند مسلم مفکرین مغرب کی تاریخ، فلسفے، سائنس، نظریات، اداروں کے بارے میں تنقیدی تحقیق کرنے کے بجائے تحقیق کا رخ اسلام کی طرف موڑ دیتے ہیں اور تمام خامیاں، غلطیاں، کوتاہیاں، گمراہیاں انھیں پہلی صدی میں ہی اسلام، تاریخ اسلام، صحابہ، علماء، فقہاء، صوفیا، مجتہدین میں نظر آنے لگتی ہیں، اسلامی علوم، اسلامی شخصیات، اسلامی ریاستیں انھیں حقیر دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تنقید وتحقیق کا رخ مغرب کے بجائے اسلامی تاریخ، اسلامی اصطلاحات شخصیات علامات اور ادارے ہوتے ہیں، تمام تحقیقات، تنقیدات، اعتراضات، شبہات، سوالات کا ہدف اسلام، اسلامی تاریخ اسلامی علمیت، فقہ اور اکابرین امت ہوتے ہیں، ایک ایک کو چن چن کر نشانہ بناتے ہیں۔ اسلامی علمیت سے جو مسئلہ ان کے سامنے ثابت ہو وہاں کہتے ہیں سمعنا وعصینا کہ میں نے دین کا مسئلہ سن لیا مگر میں اس کی تکذیب کرتا ہوں، اسے قبول نہیں کرتا۔ اور مغربی علمیت مغربی تاریخ سے جو نتیجہ، نظریہ، اصول، دلیل سامنے آئے اسے سنتے ہی کہتے ہیں سمعنا واطعنا کہ میں نے آپ کا فرمان سن لیا اور میں دل وجان سے اس کی اطاعت، قبولیت کا اقرار کرتا ہوں۔

[۴۱] مذہبی کام کو اپنا حق سمجھ کر کرنا، نہ کہ خدا کا حکم سمجھ کر:

کسی مذہبی کام، مذہبی عمل کی اجازت کے لیے حق [Right] کی اصطلاح کو استعمال کرنا کہ یہ میرا حق ہے، نہ کہ ایک خیر کو انجام دینے کے لیے اسے خیر مطلق Absolute Good کے طور پر پیش کرنا کہ یہ میرے اور تمہارے رب کا حکم ہے۔ منشور بنیادی حقوق کے اس طریقے کو اختیار کرنے کے نتیجے میں حق

کی بحث حق کی سیاست [Politics of Rights] شروع ہو جاتی ہے اور خیر کی بحث خیر کی سیاست [Politics of Good] ختم ہو جاتی ہے۔لہٰذا جہاں بھی منشور بنیادی حقوق کو اہمیت حاصل ہوتی ہے ان معاشروں میں تمام جدوجہد صرف اور صرف مادی معاشی فلاحی حقوق سے وابستہ ہو جاتی ہے، مفاد پرستی اور مادہ پرستی کی جدوجہد خواہش طلب جستجو کے سوا کوئی دوسری خواہش طلب باقی ہی نہیں رہتی۔

[۴۲] مغرب کے ''حقوق انسانی'' اور اسلامی ''حقوق العباد'' ایک ہیں:

کہتے ہیں: مغرب کے منشور حقوق انسانی میں عطا کردہ انسانی حقوق اصلاً حقوق العباد ہیں، یہ حقوق سب سے پہلے قرآن نے دیے اور خطبہ حجۃ الوداع میں ان کو دہرایا گیا۔

جدیدیت پسندوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ منشور حقوق انسانی میں ''انسان'' سے مراد کون ہے؟ ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ دنیا کی ہر تہذیب میں حقوق ہوتے ہیں لیکن وہ مجرد حقوق نہیں ہوتے وہ کسی نہ کسی تصور خیر اعلیٰ [concept of hyper good] سے نکلتے ہیں، حقوق العباد کا تعین کتاب اللہ کرتی ہے، کیونکہ یہ حقوق بندوں کے لیے ہیں، اس لیے یہ حقوق اس انسان کے لیے ہیں جو اللہ کی بندگی کا قائل ہے، وہ ہر کام خدا کو برتر ہستی سمجھ کر کرتا ہے۔اس کے برعکس انسانی حقوق ایک ایسے فرد کے لیے ہیں جو مطلق آزاد ہے، جو کسی خدا کو نہیں مانتا، جس کا ایمان صرف اور صرف آزادی میں مسلسل و مستقل اضافے پر ہے، جو کسی کو جواب دہ نہیں، جو فاعل مختار مطلق ہے، جو حق خود ارادی کا حامل [Right of self determination] فرد ہے، جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور جس کا مقصد آزادی میں، لذتوں میں، معیار زندگی میں مسلسل مستقل اضافہ ہے۔

اسلام ایسے تصورات کو ہی تسلیم نہیں کرتا، لہٰذا یہ کہنا کہ مغرب کے حقوق انسانی اور اسلام کے حقوق العباد ایک ہیں، مغرب اور اسلام کی مابعد الطبیعیات سے ناواقفیت کا شاخسانہ ہے، مثلاً ایک مذکر عبد کسی مرد سے شادی کرنا چاہے تو اسلام میں یہ اس کا حق نہیں ہے، اگر وہ اس خواہش پر عمل کرے تو اس کی سزا نہایت عبرتناک ہے، جبکہ حقوق انسانی کے منشور کے تحت ہر فرد آزاد ہے اور Right of self determination، Right of Freedom، Right of association کے تحت عورت عورت سے، مرد مرد سے جڑ سکتا ہے، شادی کر سکتا ہے، یہ اس کی مرضی ہے، خواہش ہے، آزادی ہے، اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی جا سکتی۔

جرمنی میں جانوروں کے قحبہ خانے میں ایک لاکھ جرمن لوگ جانور کرائے پر لے کر ان سے جنسی تمتع کرتے ہیں، جانور تک پریشان ہیں کہ کس معاشرے میں پیدا ہو گئے ہیں۔حقوق العباد کے نظام میں عبد

کی خواہشات کا تعین قرآن وسنت کریں گے، حقوق انسانی کے نظام میں عبد کی خواہشات کا تعین فرد اس نظام زندگی کے طے کردہ اصول اور منہج کے اندر کر سکے گا، یعنی اس کی خواہش تمنا آزادی [Freedom] کے اصول کے خلاف نہ ہو اور ارادہ عامہ [General Will] سے متصادم نہ ہو۔ ذاتی زندگی میں اپنے کمرے میں، تنہائی میں نجی دائرے میں آزادی اور ارادہ عامہ کے خلاف جو چاہے کرے، کیونکہ اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا، لیکن اگر وہ اس دائرے کو بیوی بچوں خاندان محلے تک اس طرح وسیع کرے کہ لوگوں کی آزادی اور آزادی کے نظام کو خطرہ لاحق ہو تو اسے بلیک پینتھر مومنٹ کے ہزاروں کارکنوں کی طرح قتل کر دیا جائے گا، اگر وہ نظام سرمایہ داری کے لیے مہیب خطرہ نہیں بنتا، صرف گھر والوں محلے والوں کے لیے مسائل پیدا کرے تو قانون حرکت میں آ کر اس کی آزادی کو صرف اس کے نجی دائرے تک محدود کر دے گا اور دائرہ توڑنے پر اسے سزا بھی دے گا۔

[۴۳] نکاح ایک معاشرتی معاہدہ ہے:

کہتے ہیں: نکاح ایک معاشرتی معاہدہ [Social Contract] ہے دو فریقوں کا معاہدہ [Agreement] ہے، جسے جب چاہے ختم کیا جا سکتا ہے۔

نکاح ایک معاشرتی معاہدہ نہیں ایک دینی' روحانی' ایمانی معاہدہ ہے، یہ پیغمبر کی سنت ہے اور نسل آدم کی ضرورت ہے، خطبہ نکاح میں اللہ کو گواہ بنا کر اس معاہدے کا اقرار کیا جاتا ہے، یہ معاہدہ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے ربانی روحانی عہد کے ساتھ عمل میں آتا ہے، اس لیے جو نکاح زمین پر قائم ہو گا وہ قیامت میں آخرت میں بھی باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ کو جائز کاموں میں سب سے ناپسندیدہ کام طلاق ہے۔

[۴۴] خدا کی معرفت کے حصول کے لیے کتاب، سنت، صحبت صالح کی ضرورت نہیں:

کہتے ہیں: کوپرنیکس، کپلر، گیلیلو اور نیوٹن کا یہ اعتقاد کہ خدا نے کائنات کو ریاضی کے اصول کے مطابق منظم کیا ہے، لہٰذا خدا کا عرفان کتاب فطرت جو درحقیقت خدا کا کام [Work of God] اور دوسرا قرآن یعنی کتاب فطرت [Book of Nature] ہے، کتاب فطرت سے خدا کا عرفان کتاب لفظی [Work of God/Revelation] سے زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں انسان اپنے حواس خمسہ، عقل، وجدان، چھٹی حس، تجربے کے ذریعے حصول علم میں خود کفیل ہے اسے خدا کی معرفت کے حصول کے لیے کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، پیغمبر کے اصحاب، علماء صحبت صالح کسی کی ضرورت نہیں ہے، انسان براہ راست کتاب فطرت کے ذریعے انسانی وسیلے کے بغیر صرف خدا کے عطا کردہ

وسیلے فطرت کے ذریعے عرفانِ حق کا ادراک کرسکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے عبد ہونے، اپنی بنیادی حاجت تحدید اور بندگی کا انکار کر کے مذاہب سماوی کی بنیادی بصیرت کا بھی منکر ہو جاتا ہے، مگر اس انکار کا حسن اور جمال یہ ہے کہ وہ خدا تک بہتر رسائی کے نعرے کی گونج میں انکار کا فریضہ انجام دیتا ہے، یہ رویہ انسان پرستی یعنی الوہیت انسانی کے مماثل ہے کہ انسان خدا ہے جو کسی کا محتاج نہیں، خود کفالت کی یہ منزل وہ ہے جہاں معرفت رب کے لیے انسان کی ذات ہی کافی ہے، لہٰذا جب انسان خود خدا بن جاتا ہے تو خدا کی معرفت کا سوال بھی اس کے لیے بے معنی، لغو اور مسترد کرنے کے لیے قابل ہو جاتا ہے۔

مغرب میں عیسائیت، مذہب، خدا، آخرت کا انکار انسان پرستی کے اسی طریقے سے کیا گیا کانٹ کا مضمون What is enlightenment انسان پرستی کی فلسفیانہ بنیادوں سے آگاہ کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ: انسان وہ ہے جو علم میں خود کفیل ہے، وہ علم کے لیے اپنے اندرون سے رجوع کرتا ہے بیرون سے نہیں، وہ وحی، پادری اور ڈاکٹر سے ہدایت نہیں لیتا، وہ ہدایت کے لیے کسی کا محتاج نہیں، خارجی ذرائع علم سے انکار کرنا ہی انسانیت کا تقاضہ ہے، روشن خیالی اسی لمحے، اسی تصور اسی فکر اسی جستجو کا نام ہے، جب انسان نے خارجی ذرائع سے علم حاصل کرنے کو ترک کر دیا اور حصول علم، ہدایت، رہبری، روشنی کے لیے خود اپنے آپ پر انحصار کیا۔ اس رویے کے نتیجے میں مغرب میں معاشرہ اور تہذیب جو پہلے خدا مرکز [Theocentric] تھے اچانک انسان مرکز [Humancentric] ہو گئے۔

مارٹن لوتھر کی پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح نے خدا مرکز کائنات کے، انسان مرکز کائنات میں تبدیلی کا مذہبی جواز پیش کیا، انسان کی علم میں خود کفالت کا دعویٰ وحی کے حصول کے وسیلوں کا انکار تھا، یعنی کتاب اور نبوت اور نبوت سے فیض یاب ہونے، نفوس قدسیہ جبکہ وسیلوں کا اقرار اور ان کی ضرورت کا احساس عبدیت کا تقاضہ اور ان پر ایمان لانا انسان کی تحدید کا اقرار ہے، وسیلۂ کتاب ونبوت کا اقرار عین بندگی ہے اور اس کا انکار اپنے خدا ہونے کا اعلان ہے۔ جدیدیت کا بنیادی عقیدہ انسان کی خدائی کا اقرار ہے، تحریک اصلاح و احتجاج کے ذریعے مارٹن لوتھر نے انسان پرستی اور سرمایہ داری کے جدید مذہب کا مذہبی تعقل بیان کر کے جدیدیت کو قوت مہیا کی۔ ان کے نزدیک جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں کامیاب ہے، شریف آدمی وہ ہے جو امیر آدمی ہے، دنیا میں سب سے زیادہ کامیاب بادشاہ ہے، لہٰذا بادشاہ ہی ٹھیک ہے۔ وغیرہ وغیرہ (جاری ہے۔)

☆......☆......☆......☆

ادارہ مظہر التحقیق، لاہور کی مطبوعات

آفتاب ہدایت (رد رفض وبدعت)	مولانا قاضی کرم الدین دبیرؒ
فیض باری رد تعزیہ داری	مولانا قاضی کرم الدین دبیرؒ
تازیانہ عبرت......و......تازیانہ سنت	مولانا قاضی کرم الدین دبیرؒ
السیف المسلول لاعداء خلفاء الرسول	مولانا قاضی کرم الدین دبیرؒ
بشارت الدارین بالصبر علیٰ شهادت الحسین	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
مفتی محمد یوسف کے ''علمی جائزہ'' کا علمی محاسبہ	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
شیعہ مجتہد محمد حسین ڈھکو کی کتاب پر ایک اجمالی نظر	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
عقیدہ خلافت راشدہ اور عقیدہ امامت	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
دفاع حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
مشاجرات صحابہ اور راہ اعتدال	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
ہم ماتم کیوں نہیں کرتے؟	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
حقانیت اہل السنۃ والجماعۃ	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
سنی مذہب حق ہے	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
خارجی فتنہ (۲ جلد)	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
مودودی مذہب	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
سنی موقف	مولانا قاضی مظہر حسینؒ
مناظرہ حیات النبی (مولانا امین اوکاڑویؒ)	مولانا عبدالجبار سلفی
احوال دبیر (سوانح مولانا قاضی کرم الدین دبیرؒ)	مولانا عبدالجبار سلفی
علامہ عنایت اللہ خان المشرقی احوال وافکار	مولانا عبدالجبار سلفی
عبداللہ چکڑالوی اور فتنہ انکار حدیث	مولانا عبدالجبار سلفی
نجوم ہدایت	مولانا عبدالجبار سلفی
عمار خان کا نیا اسلام اور اس کی سرکوبی ۱۲	مولانا مفتی عبدالواحد

محقق اہل سنت مولانا عبدالحق خان بشیر مدظلہ، شاعر صحابہ انجم نیازی صاحب کی کتب بھی دستیاب ہیں۔

رابطہ: مولانا عبدالرؤف نعمانی، جامع مسجد برکت علی، اچھرہ، لاہور 0321-4145543

......باب نمبر۴......

تعارف و پس منظر

جاوید احمد غامدی، پس منظر، خاندان، مختصر تعلیمی احوال، اساتذہ
دین فہمی اور خود ساختہ اصول، مکر و فریب، قلمی بوالعجبیاں

مرزا غلام احمد قادیانی بنیادی طور پر صوفی تھا، اُس نے دعویٰ نبوت نہیں کیا۔ [غامدی]

(غامدی صاحب کا یہ بیان مرزائیوں نے اپنی کتاب میں شائع کیا، اس عبارت میں "ناقل" سے مراد بھی مرزائی مصنف ہے۔ نیز غامدی صاحب کے اِس بیان کی ریکارڈنگ ہمارے پاس محفوظ ہے۔[ادارہ])

جاوید احمد غامدی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ جو مقام یا مرتبہ بیان کیا ہے، بالکل یہی ہے۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے، وہ بنیادی طور پر صوفی تھے۔ تصوف سے اُن کا اشتغال تھا۔ اس طرح کے اَوراد، وظائف، چلے یہی چیزیں اُن کے ہاں تھیں۔ اِنھی چیزوں کو وہ بیان بھی کرتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں لکھتے بھی ہیں۔

اُنہوں نے کہا کہ میری نبوت سے مراد تشریعی نبوت نہیں، میں اِصطلاحی نبی نہیں ہوں، بروزی نبی ہوں۔ نبوت کا ایک سایہ پڑ رہا ہے۔ نبوت کا ایک پرتَو میرے اندر آ رہا ہے...... پھر کچھ دبی دبی باتیں ہوئیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ نبی بنا دیئے گئے۔ لیکن میں آپ سے عرض کروں کہ خود مرزا غلام احمد صاحب کی تحریریں جتنی بھی ہیں اُن میں بالصراحت نبوت کے دعویٰ کی کوئی تحریر نہیں۔ یعنی اسی طرح کی باتیں ہیں (یعنی صوفیانہ اصطلاحات کا استعمال ہے۔ ناقل)...... یہی وجہ ہے کہ اُن کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُن کی جماعت کے دو گروہ ہو گئے۔ اُن کے قدیم ترین صحابہؓ اُن کی اصطلاح کے مطابق، اُنھوں نے تو کہا کہ ایسا نہیں تھا، بلکہ وہ مجدد تھے۔ یہ جو لاہوری جماعت ہے یہ اِسی تعبیر پر وجود میں آئی۔ اور مرزا بشیر الدین محمود صاحب جو اُن کے فرزند تھے، اُنھوں نے اَصل میں اِس کو زیادہ صریح کیا۔ اور یہ کہا کہ نہیں! یہ باقاعدہ یعنی، ورنہ معاملہ ٹھیک ہو جاتا، اتنا ہی رہ جاتا جتنا صوفیوں کا ہے۔

اُنھوں (مرزا بشیر الدین محمود۔ ناقل) نے اِس کو اُس کی منتہائے کمال تک پہنچا دیا، جہاں پر توضیح کی ضرورت نہ رہی...... حکیم نور الدین صاحب کے زمانے میں بھی صورتحال یہ نہیں تھی، اِسی طرح تھی (یعنی حضرت مرزا صاحب کو نبی نہیں مجدد ہی سمجھا جاتا تھا۔ ناقل)۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کرتے تھے جو ابن عربی نے کہی ہے۔ یعنی دیانتداری کے ساتھ، آپ الزام لگانے کے لیے نہ کہیں۔ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں۔ یعنی ابھی تک حسرت ہے کہ وہ واضح عبارت کون سی ہے؟ (یعنی حضرت مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کی۔ ناقل) آپ دیکھیں! اِس میں الیاس برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" سب سے اعلیٰ کتاب ہے۔ پوری پڑھ جایئے۔ پھر اس کے بعد ہمارے اپنے زمانے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی جیسے جلیل القدر عالم نے "قادیانیت" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اُس میں بھی آپ پوری کی پوری پڑھ جایئے (احمدیت کے خلاف ان دو مستند کتابوں میں بھی کوئی تحریر یا کوئی حوالہ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت مرزا صاحب نے دعویٰ نبوت کیا۔ ناقل) ......یعنی وہ (پہلے صوفیاء کی تحریرات۔ ناقل)...... انہیں اس سے زیادہ تاویل کو قبول کر لیتی ہیں جیسی میں نے بیان کی ہیں۔ اس طرح کا واضح معاملہ نہیں ہے جیسے کہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ زیادہ تر بشیر الدین محمود صاحب کی ہیں۔" [اختلافات سلسلہ احمدیہ: ۸۴]

مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور

جاوید احمد غامدی......پس منظر اور پیش منظر

زیر نظر مضمون حضرت مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور مدظلہم کے مختلف مضامین سے مرتب کردہ ہے، جو کئی سال قبل ''ضرب مومن'' میں شائع ہوئے۔ اس کے بہت سے مندرجات اس سے قبل ماہنامہ ''ساحل'' میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ دنیائے غامدیت کی پراسرار خاموشی ان کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔[ادارہ]

کہتے ہیں کہ انسان اپنے استاذوں سے اور استاذ اپنے شاگردوں سے پہچانا جاتا ہے۔ آیئے! اس حوالے سے ایک شاگرد، استاذ اور استاذ الاساتذہ کی سوانح اور کردار وعمل کا جائزہ لیتے ہیں کہ آج کل ان کا بڑا غلغلہ ہے اور وطن عزیز کا کوئی درخت ایسا نہیں جس کی شاخوں پر ان کا طوطی نہ بولتا ہو۔

حمید الدینؒ فراہی:

یہ ۱۹۰۰ء کا ذکر ہے۔ ہندوستان پر برطانوی سامراج کی دوسری صدی چل رہی تھی۔ ہندوستان کا وائسرائے مشہور ذہین اور شاطر دماغ یہودی ''لارڈ کرزن'' تھا۔ ان صاحب کو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر اور صہیونی مقاصد کی تکمیل کا شیطانی شغف تھا۔ انگریز نے علمائے حق کی قربانیوں کی بدولت برصغیر کی زمین پاؤں تلے سے کھسکتے دیکھ لی تھی۔ سونے کی ہندوستانی چڑیا کے پر وہ نوچ چکا تھا۔ اب مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی دریافت اور ارض اسلام کو اپنے گماشتوں میں تقسیم کرنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ لارڈ کرزن کو انگریز سرکار کی جانب سے حکم ملا تھا کہ وہ خلیج عرب کے ساحلی علاقوں میں مقیم عرب سرداروں سے ملاقات کرے اور مطلب کے لوگوں کی فہرست بنائے۔ خلیج عرب کے ساحلی علاقوں سے مراد کویت، سعودی عرب کا تیل سے لبالب مشرقی حصہ جو اس وقت آل سعود کے زیر نگیں تھا، نیز بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات میں شامل سات مختلف ریاستیں اور عمان ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم ونسٹن چرچل اور امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ ریت پر لکیریں کھینچ کر ''جتنا کم اتنا لذیذ'' کے اُصول پر عمل کرتے ہوئے جس طرح کیک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں اسی طرح ''جتنا مالدار اتنا چھوٹا'' کے اصول پر عرب ریاستیں اپنے دوست عرب سرداروں میں تقسیم کر چکے تھے۔ اب اس تقسیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے فیلڈ ورک کی ضرورت تھی اور لارڈ کرزن اپنے

مخصوص یہودی پس منظر کے سبب یہ کام بخوبی کرسکتا تھا۔

لارڈ کرزن خلیج عرب کے خفیہ دورے پر فوری روانہ ہونا چاہتا تھا اور اسے کسی معتمد اور راز دار عربی ترجمان کی ضرورت تھی۔ برصغیر میں عربی اس وقت دو جگہ تھی۔ یا تو دارالعلوم دیوبند اور اس سے ملحقہ دینی مدارس، یا پھر علی گڑھ کا شعبہ عربی۔ اول الذکر سے تو ظاہر ہے کوئی ایسا ٹاؤٹ ملنا دشوار تھا۔ لارڈ کرزن کی نظر انتخاب اسی طرح کی مشکلات کے حل کے لیے قائم کیے گئے ادارہ علی گڑھ پر پڑی وہاں ایک مانگو تو چار ملتے تھے۔ مسئلہ چونکہ وائسرائے ہند کے ساتھ خفیہ ترین دورے پر جانے کا تھا جس کے مقاصد اور کارروائی کو انتہائی خفیہ قرار دیا گیا تھا اس لیے کسی معتمد ترین شخص کی ضرورت تھی جو عقل کا کورا اور ضمیر کا مارا ہوا ہو۔ سفارشوں پر سفارشیں اور عرضیوں پر عرضیاں چل رہی تھیں کہ خفیہ ہاتھ نے کارروائی دکھائی اور علی گڑھ کے سرپرستان اعلیٰ کی جانب سے ایک نوجوان فاضل کا انتخاب کرلیا گیا۔ لارڈ کرزن صاحب کو ان کی عربی دانی سے زیادہ سرکار سے وفاداری کی غیر مشروط یقین دہانی کرادی گئی اور یوں یہ عجمی عربی دان مسلمان ہو کر بھی اس تاریخی سفر پر انگریز وائسرائے کا خادم اور ترجمان بننے پر راضی ہوگیا جس کے نتیجے میں آج خلیجی ریاستوں میں استعمار کے مفادات کے محافظ حکمران کِلا گاڑے بیٹھے ہیں اور امریکی و برطانوی افواج کو تحفظ اور خدمات فراہم کر رہے ہیں۔

یہ نوجوان فاضل حمید الدین فراہی تھے۔ جو اُتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ''فراہا'' میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور مؤرخ علامہ شبلی نعمانی (1858-1914ء) کے کزن تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور MAO کالج میں عربی پڑھاتے رہے۔ لارڈ کرزن کی ہمراہی کے لیے ان کے انتخاب میں علی گڑھ میں موجود ایک جرمنی پروفیسر ''جوزف ہوروز'' کی سفارش کا بڑا دخل تھا جو یہودی النسل تھا اور آپ پر اس کی خاص نظر تھی۔ آپ نے اس سے عبرانی زبان سیکھی تاکہ تورات کا مطالعہ اس کی اصل زبان میں کرسکیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تورات کی اصل زبان تو جو کچھ ہے لیکن تورات اپنی اصلی زبان میں دنیا میں کہیں دستیاب نہیں۔

لارڈ کرزن صاحب جناب فراہی کی صلاحیت اور کارکردگی سے بہت خوش تھے چنانچہ واپسی پر انہیں انگریزوں کی منظور نظر ریاست حیدر آباد میں سب سے بڑے سرکاری مدرسہ میں اعلیٰ مشاہرے پر رکھ لیا گیا اور آپ نے وہاں سے اس کام کا آغاز کیا جو قسمت کا مارا یہودیوں کا پروردہ ہر وہ شخص کرتا ہے جسے عربی آتی ہو۔ آپ نے اپنے آپ کو قرآن کریم کی ''مخصوص انداز'' میں خدمت کے لیے وقف کرلیا۔ مخصوص انداز سے مراد یہ ہے کہ تمام مفسرین سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی کہ قرآن کریم کو محض لغت کی مدد سے سمجھا

جائے۔ یہ لغت پرست مفسرین دراصل اس راستے سے قرآنی آیات کو وہ معنی پہنانا چاہتے تھے جس کی ان کو ضرورت محسوس ہو اگرچہ دوسری آیات یا احادیث، مفسرین صحابہ و تابعین کے اقوال اس کی قطعی نفی کرتے ہوں۔ درحقیقت قرآن سے ان حضرات کا تعلق، انکار حدیث پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہوتا ہے جیسا کہ تمام منکرین حدیث کا خاصہ ہے کہ وہ اپنے اس عیب کو چھپانے کے لیے قرآن کریم سے بڑھ چڑھ کر تعلق اور شغف کا اظہار کسی نہ کسی بہانے کرتے رہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ وہی حیدر آباد ہے جہاں شاعرِ مشرق علامہ اقبال جیسے فاضل شخص کو محض اس لیے ملازمت نہ مل سکی کہ وہ مغرب دشمن شاعری کے مرتکب تھے لیکن فراہی صاحب پر لارڈ کرزن کا دست کرم تھا کہ حیدر آباد کی آغوش ان کے لیے خود بخود وا ہوگئی اور انہیں ایک بڑے ''علمی منصوبے'' کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ اس منصوبے نے جو برگ و بار لائے انہیں مسلمانان برصغیر بالخصوص آج کے دور کے اہالیان پاکستان خوب خوب بھگت رہے ہیں۔ فراہی صاحب نے ''تفسیر نظام القرآن'' لکھی جس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کتب خانوں میں تلاش کرنے سے بھی مل کے نہیں دیتی۔ علامہ شبلی نعمانی، فراہی صاحب کے بارے میں اس وقت شدید تحفظات کا شکار ہوگئے تھے جب ان کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں ''دار المصنفین'' میں شائع ہونے کے لیے آئیں لیکن ان کی طباعت سے انکار کردیا گیا کہ زبردست فتنہ پھیلنے کا خطرہ تھا۔ فراہی صاحب اپنے پیچھے چند شاگرد، چند کتابیں اور بے شمار شکوک و شبہات چھوڑ کر 1930ء میں دنیا سے رُخصت ہوگئے۔

امین احسن اصلاحی:

فراہی صاحب نے حیدر آباد سے منتقل ہونے کے بعد اعظم گڑھ کے ایک قصبے ''سرائے میر'' میں ''مدرسۃ الاصلاح'' نامی ادارہ قائم کیا۔ نام سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تفسیر کے مسلمہ اُصولوں کی اصلاح کر کے نئی جہتیں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے اس مدرسے میں 1922ء میں ایک نوجوان فارغ ہوا جو اساتذہ کا منظورِ نظر اور چہیتا تھا۔ فراہی صاحب نے اسے دعوت دی کہ وہ ان کے ساتھ مل کر ''قرآن کریم کا مطالعہ'' کرے۔ یہ نوجوان آگے چل کر فراہی صاحب کا ممتاز ترین شاگرد اور ان کے نظریات و افکار کی اشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ یہ جب مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوا تو امین احسن تھا، فارغ ہوا تو ''امین احسن اصلاحی'' (1904-1997ء) بن چکا تھا۔ اس نے فراہی صاحب کی وفات کے بعد آپ کی یاد میں رسالہ ''الاصلاح'' جاری اور ''دائرہ حمیدیہ'' قائم کیا۔

اصلاحی صاحب حدیث اور اجماع امت کا منکر ہونے کے علی الرغم جماعت اسلامی کے بانیوں میں سے تھے۔ قیام کے دوران مجلس شوریٰ کے رُکن رہے۔ 1958ء میں مودودی صاحب سے اختلافات کی

بنا پر جماعت سے علیحدہ ہوئے اور وہی کام شروع کیا جوان کے استاذ نے آخری عمر میں کیا تھا۔آپ نے ''حلقۂ تدبر قرآن'' قائم کیا جس میں کالج کے طلبہ کو قرآن کریم اور عربی پڑھائی جاتی تھی۔ساتھ ساتھ ''تدبر قرآن'' کے نام سے تفسیر لکھنے میں بھی کامیابی حاصل کی لیکن اسے مقبول کروانے میں بری طرح ناکام ہوئے۔فراہی صاحب بہرحال عالم فاضل شخص تھے لیکن اصلاحی صاحب اس پائے کے عالم نہ تھے۔ مغربی علوم تو کیا وہ شرعی علوم سے بھی کماحقہٗ واقف نہ تھے۔ان کی تفسیر میں کئی بچگانہ غلطیاں ہیں جو ایک دوسرے مضمون میں قارئین کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔اصلاحی صاحب ہفتہ وار درس بھی دیتے تھے لیکن انکار حدیث،تجدد پسندی اور لغت پرستی نے انہیں اپنے پیش رو استاذ کی طرح کہیں کا بھی نہ چھوڑا اور وہ خالد مسعود اور جاوید غامدی جیسے شاگرد تیار کر کے ۱۹۹۷ء میں اس دارِفانی سے رخصت ہو گئے۔

محمد شفیق (جاوید احمد غامدی):

قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں پاک پتن کے گاؤں میں ایک پیر پرست اور مزار گرویدہ قسم کا شخص رہتا تھا۔مزاروں والا خصوصی لباس، گلے میں مالائیں ڈالنا، ہاتھ میں کئی انگوٹھیاں پہننا اور لمبی لمبی زلفیں بغیر دھوئے تیل لگائے رکھنا اس کی پہچان تھی۔۱۸/اپریل ۱۹۵۱ء کو اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ نام تو اس کا محمد شفیق تھا لیکن باپ کے مخصوص مزاج کی وجہ سے اس کا عرف کاکوشاہ پڑ گیا۔یہ خاندان ککّے زئی کہلاتا تھا۔اس طرح اس کا پورا عرفی نام ''کاکوشاہ ککّے زئی'' بنا۔محمد شفیق عرف کاکوشاہ ککّے زئی جب گاؤں کی تعلیم کے بعد لاہور آیا تو اسے اپ ٹو ڈیٹ قسم کا نام رکھنے کی فکر لاحق ہوئی۔اس نام کے ساتھ تو وہ ''لہوریوں'' کا سامنا نہ کرسکتا تھا۔سوچ سوچ کر اسے ''جاوید احمد'' نام اچھا معلوم ہوا کہ ماڈرن بھی تھا اور رعب دار بھی۔اس نے محمد شفیق سے تو جان چھڑا لی اب'' کاکوشاہ ککّے زئی'' کے لاحقے کا مسئلہ تھا جو کافی سنگین اور مضحکہ خیز تھا۔لیکن فی الحال اسے اس کی خاص فکر نہ تھی۔اس زمانے میں اس کا ایک قریبی دوست ہوتا تھا...... جناب رفیق احمد چوہدری۔وہ ان دنوں اور اس روئیداد کے عینی گواہ ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ۱۹۷۲ء کا دور تھا۔کاکوشاہ لاہور گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز کرنے کے بعد معاشرے میں مقام بنانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔اس کی انگریزی تو یوں ہی سی تھی لیکن قدرت نے اسے ایک صلاحیت سے خوب خوب نوازا تھا...... وہ تھی طلاقت لسانی۔اس کے بل بوتے پر وہ تعلقات بنانے اور آگے بڑھنے کی سعی میں مصروف تھا۔آخر کار اس کی جدوجہد رنگ لائی اور وہ اپنی چرب زبانی سے پنجاب کے ایڈمنسٹریٹر اوقاف جناب مختار گوندل کو متاثر کر کے اوقاف کے خرچ پر ۲۹ رجے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ''دائرۃ الفکر'' کے نام سے ایک تربیتی اور تحقیقی ادارہ کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب

ہو گیا۔ پھر جلد ہی قدرت نے انہیں مولانا مودودی مرحوم کے سایۂ عاطفت میں ڈال دیا تو جاوید احمد کو فوری طور پر جماعتِ اسلامی میں پذیرائی ملی۔ رکنیت مجلسِ شوریٰ تو چھوٹی شے ہے، ان کے حواری انہیں مودودی صاحب کا ''جانشین'' بتانے لگے کیونکہ مودودی صاحب نے غالباً جاوید احمد کی جولانی طبع کو آزمانے کے لیے ان کو ''دارالعروبہ'' کی خالی ہونے والی کوٹھی ۴ر ذیلدار پارک اچھرہ لاہور نہ صرف مفت دے رکھی تھی بلکہ ایک ہزار روپے مزید ماہوار تعاون کا وعدہ بھی فرمایا۔ اس طرح جاوید احمد کو جماعت اسلامی کے متاثرین میں پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔

اس وقت جاوید احمد ابھی عربی گرامر کے طالب علم تھے اور ہر وقت معتزلہ کے امام ''زمخشری'' کی علم نحو پر کتاب المفصل ان کی بغل میں ہوتی اور تفسیر میں الکشاف سے استفادہ کرنے کا انہیں خصوصی شوق دامن گیر رہتا جو ان کے بس کی چیز نہ تھی اور آج تک نہیں ہے۔ آخر کار جب جاوید احمد کو جماعت اسلامی سے ۱۹۵۷ء میں الگ ہونے والے مولانا امین اصلاحی سے روابط کا شوق مولانا کے قریب تر اور جماعت اسلامی سے مزید دور لے جانے کا باعث بنا۔ آہستہ آہستہ وہ جاوید احمد سے جاوید احمد غامدی ہو گئے۔ اس لقب کی وہ دو چار وجوہات بیان کرتے ہیں اور صحیح ایک کو بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ حال ہی میں ان کے ایک شاگرد خاص نے یہ وجہ بیان کی ہے کہ ''اصل میں وہ اصلاحی صاحب سے عقیدت کی وجہ سے اصلاحی لقب رکھنا چاہتے تھے لیکن ''مدرسۃ الاصلاح'' سے فارغ نہ تھے۔ اس لیے غامدی نام رکھ لیا۔'' سبحان اللہ! چھوٹے میاں کو یہ بھی نہیں پتہ کہ غامدی نہ اصلاحی کے ہم وزن ہے نہ ہم معنی! آخر کس طرح سے اصلاحی سے غامدی تک چھلانگ لگا دی گئی؟؟؟ گویا یہ پانچویں وجہ بھی عارہی عار ہے اور پورا مکتب فکر مل کر اپنے بانی کے نام کی درست توجیہ کرنے سے قاصر ہے۔

۲۰۰۱ء سے قبل غامدی صاحب کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی لیکن اسے کسی لارڈ کرزن کی سرپرستی دستیاب نہ تھی۔ ۲۰۰۱ء میں یہ کمی بھی پوری ہو گئی اور ان کے سر پر عصر حاضر کے لارڈ کرزن کا دست شفقت کچھ ایسا جم کر ٹکا کہ وہ شخص جو عربی کی دو سطریں سیدھی نہیں لکھ سکتا، جو انگریزی کی چار نظموں اور ۲۴ مصرعوں کی پونجی میں آدھے سے زیادہ مصرعے چوری کر کے ٹانکتا ہے، جس کی اکثر اُردو تحریریں سرقہ بازی کا نتیجہ ہیں، وہ آج ملک کا مشہور و معروف اسکالر ہے اور اس کا فرمایا ہوا مستند سمجھا جاتا ہے۔ ''کلکے زئی سے غامدی تک'' کے سفر کی روداد عبرت ناک بھی اور الم ناک بھی۔ سچ ہے استاذ اپنے شاگردوں سے ہی پہچانا جاتا ہے اور شاگرد اپنے استاذ کی پہچان کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ''فراہی سے اصلاحی اور اصلاحی سے غامدی تک'' استاذی شاگردی کا سلسلہ اس مقولے کی صداقت کے لیے کافی سے زیادہ شافی، اور درکار ضرورت سے زیادہ پکی سچی گواہی ہے۔

غامدی صاحب کی پہلی ''زیارت'':

غامدی صاحب کو دیکھنے کا پہلا اتفاق بندہ کو نوے کی دہائی میں ہوا۔ کراچی میں گورا قبرستان کے مدِ مقابل ایف ٹی سی کی بلڈنگ ہے۔ اس کے آڈیٹوریم میں غامدی صاحب کا ''چہرے کا پردہ'' کے موضوع پر بیان تھا۔ اس وقت ماشاء اللہ غامدی صاحب کا چہرہ اتنا کھد یڑا ہوا نہ تھا۔ اسلام کی پیروی کرتے ہوئے عمر گزرنے کے ساتھ انسان کے چہرے پر برکت اور نورانیت، ملائمت اور لطافت کی شکل میں نورانی ہالہ بنا دیتی ہے۔ غامدی صاحب اس کائناتی آفاقی اُصول سے مستثنیٰ ہیں۔ آج کل وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہیں۔ اس وقت چالیس سے کچھ کم ہوں گے۔ ان دنوں ماشاء اللہ ان کی ''اچھی خاصی'' ڈاڑھی بھی تھی اور چہرہ مبارک بھی اتنا ''روشن'' اور کھلا ہوا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ گفتگو ان کی البتہ جتنی اس وقت پٹڑی سے اُتری ہوئی تھی آج کل یہ وصف اس سے کچھ سوا ہی ہے۔ گیا تو تھا بندہ ان کی گفتگو سننے......لیکن ان کی ملغوبہ قسم کی باتیں اور موقف پر شدت آمیز اصرار نے ایسی طبیعت مکدر کی کہ جب سوال و جواب کا سیشن شروع ہوا طبیعت مزید اس ماحول میں بیٹھنے کو تیار نہ تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جیسے ہی آڈیٹوریم سے نکلا ایک اور صاحب بھی اس وقت باہر تشریف لے آئے۔ بندہ کو ان کی شرعی صورت اور ساتھ میں مکمل پردے میں اہلیہ کو دیکھ کر شدید دکھ ہوا کہ کیسے کیسے لوگ سحر میں گرفتار ہوئے جا رہے ہیں۔ مگر اس اللہ والے نے اس وقت جو جملہ کہا اس سے نہ صرف پریشانی دور ہو گئی بلکہ علمائے کرام کی محنتوں پر اطمینان بھی ہوا کہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جب تک درس کا حلقہ قائم اور دین کی دعوت جاری رکھیں گے تب تک ان شاء اللہ خیر ہے۔ حق باقی رہے گا اور باقی ہر چیز نے بہر حال فنا ہی ہونا ہے۔ اس شخص نے کہا: ''مولوی صاحب! یہ پرویزی لوگ ہیں جو اس قدر بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؟'' گویا کہ ایک عام آدمی بھی ان کی گفتگو سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا۔

اس کے بعد غامدی صاحب اُڑانیں بھرتے رہے۔ ان بیس پچیس سالوں میں ''دانش سرا'' کراچی سے لے کر ''المورد'' لاہور تک ان کے کام کو اگر دیکھا جائے تو ان پر حیرت ہوتی ہے کہ آنجناب کی تمام تر قوت اسلامی اقدار اور روایات کو متنازعہ بنانے، مسلمانوں کو اسلام کی مبارک حدود و قیود سے آزادی دلانے اور اکابرین اُمت کی توہین و تردید پر صرف ہو رہی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں اسلام کے مسلمہ اُصولوں اور اجماعی مسائل کے خلاف تو آپ کو بہت کچھ ملے گا لیکن کسی ایک تحریر یا تقریر میں......میں دُہراتا ہوں......کسی ایک تحریر یا تقریر میں مغربی استعماریت، صیہونیت، صلیبیت، جدیدیت، سرمایہ داریت، اشتراکیت اور مستشرقین کے اسلام پر رکیک حملوں اور نازیبا الزامات کے خلاف ایک لفظ نہیں ملے گا۔ ان کا سارا زور اس پر

ہے کہ ٹوپی نہ پہنی جائے۔ شلوار گھسیٹ کر چلا جائے۔ عورت کے سر پر چادر نہ رہے، وہ مردوں سے بے حجابانہ ہاتھ ملائے اور بے باکانہ گفتگو کرے تا کہ اسلام کی وہ حقیقی شکل لوگوں کے سامنے آئے جو مُلاؤں نے ''چھپا'' رکھی ہے۔ حدود اللہ میں ترمیم کی مہم کے ہراول دستے میں شمولیت کے بعد اب ان کا رُخ ہم جنس پرستی کی ترویج جیسے اہم عصری مسائل پر ہے۔ اس سے جو وقت بچ جائے وہ مولویوں کی برائی اور غیبت میں صرف ہوتا ہے کہ انہیں کچھ آتا جاتا نہیں۔ حالانکہ آنجناب کو خود بھی مغربیت کی لادینیت، جدید فلسفہ، جدید فتنہ خیز نظریات، سائنس، ٹیکنالوجی کے بارے میں کچھ خبر ہے نہ ان کے حلقے میں ایسے افراد ہیں جو ان چیزوں کا ذوق رکھتے ہوں۔ البتہ مُلا حضرات نہ صرف راسخ علم اور استعداد رکھتے ہیں بلکہ وہ اسلامی تحقیقات اور عصر حاضر کے بارے میں بدرجہا بہتر اور تازہ معلومات رکھتے ہیں۔

گزشتہ سال بندہ لاہور گیا تو کچھ ساتھیوں نے کہا کہ ''آج'' نامی ٹی وی چینل پر ''حضرت'' غامدی صاحب چہرے کے پردے کے بارے میں لیکچر دے رہے ہیں جو دن میں کئی کئی مرتبہ دکھایا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی عالم اس کا جواب دے؟ بندہ کو یاد آ گیا کہ یہ ربع صدی باسی کڑھی ہے۔ حیرت ہے کہ آنجناب کو پاکستانی معاشرے میں رائج برائیاں، بدعنوانیاں اور بے دینی کے رجحانات ختم کرنے پر ذرا توجہ نہیں، زور ہے تو اس پر کہ مردوں کے چہرے سے ڈاڑھی اور خواتین کے چہرے سے حجاب اُتر جائے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ اسلام کی نہیں، مغربی استعمار کی خدمت ہے۔ خدارا! اس دن سے ڈریے جب چودہ سو سال میں گزرنے والے اُمت کے باریش ولی اور باپردہ ولیات روزِ قیامت آپ کا گریبان پکڑ کر اپنی توہین کا حساب طلب کریں گے اور پوچھیں گی کہ تم پر کیا افتاد آ پڑی تھی کہ اسلام کی آخری نشانیوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے؟ اسلام کی خدمت کے لیے تمہیں مسلمانوں کا حلیہ بدلنے کے علاوہ کوئی موضوع نہ ملتا تھا؟ خدارا سوچیے! اس وقت آپ کا جواب کیا ہوگا؟

عربی دانی کے غرور میں صحابہ وتابعین کی گستاخی:

آج کل غامدی صاحب کی علمیّت کا بڑا چرچا ہے۔ عوام میں اس طرح کی شہرت کا کوئی نوٹس بھی نہ لیتا لیکن جب خود غامدی صاحب اور ان کے شاگردوں نے یہ دعویٰ شروع کیا کہ ''اسلامی دنیا میں ان کے پائے کا عربی دان اور عربی زبان و ادب پر عبور رکھنے والا کوئی شخص نہیں، نیز یہ کہ بڑے بڑے عرب علماء ان سے استفادے کے لیے آتے ہیں اور جب غامدی صاحب عربی کے اسباق دیتے ہیں تو یہ علمائے عرب لغت کھول لیتے اور دانتوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں۔'' جب یہ تعلّی اور تکبر اہلِ علم کے سامنے آیا تو انہوں نے اس کی

حقیقت جاننا اپنا فرض سمجھا۔ حال ہی میں کراچی سے شائع ہونے والے ایک ماہنامے "ساحل" (اپریل مئی ۲۰۰۷ء) میں ایک تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔ سچ پوچھیے تو بڑے خاصے کی چیز ہے، پڑھا تو لطف آ گیا۔ لکھنویوں کی اُردو، ندویوں کا انداز تحریر اور پھر پچاس سال سے عربی لکھنے لکھانے، پڑھنے پڑھانے والے صاحب علم کی طرف سے محاسبہ ومحاکمہ۔ پڑھتے جائیے اور سر دھنتے جائیے۔ غامدی صاحب کا جو حشر صاحب مضمون کے ہاتھوں ہوا ہے لگتا ہے روزِ حشر قائم ہو گیا ہے۔ میزان رکھی جا چکی ہے (غامدی صاحب کی کتاب کا نام میزان ہے جس میں ان کے "غامدی دین" کا بیان ہے۔) اور غامدی صاحب کی بے ہودگیاں تل تل کر باہر آ رہی ہیں اور تول تول کران پر ماری جا رہی ہیں۔

اب اس سے پہلے کہ آپ تحریر سے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں، محوّلہ بالا ماہنامے کے اداریے سے چند سطریں پڑھ لیجیے تا کہ پس منظر و پیش منظر سمجھنے میں آسانی ہو:

"اس دعویٰ کے جائزے کے لیے ہم نے جاوید غامدی صاحب کے مطبوعہ کام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اپنی ساٹھ سالہ علمی زندگی میں انہوں نے صرف ایک سو بائیس (۱۲۲) صفحات عربی میں لکھے تھے۔ ان میں سے صرف بائیس (۲۲) صفحات "الاعلام" میں محفوظ ہیں، جبکہ بقیہ سو (۱۰۰) صفحات جو عربی تفسیر "الاشراق" اور "میراث" پر ایک علمی رسالے کے لیے لکھے گئے تھے، غامدی صاحب نے ضائع کر دیے کیونکہ ان کے قلم سے لکھی گئی عربی ان کے عجمی محض ہونے کی داستان، بڑے کروفر سے سنا رہی تھی۔ اس کے باوجود "المورد" کی ویب سائٹ پر انہیں الاشراق، مثنوی، خیال وخامہ اور باقیات کا مصنف ظاہر کیا گیا ہے جبکہ یہ تصانیف آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ بائیس (۲۲) صفحات کے ایک ایک سطر اور ایک ایک جملے میں عربی قواعد، املا، انشا، زبان، بیان، صرف نحو کی بے شمار غلطیاں اسی طرح در آئی ہیں جس طرح ان کے فکر ونظر اعتقادات اور ایمانیات میں اغلاط اور الحاد کا گرد وغبار داخل ہو گیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۹۸۲ء میں لکھی گئی یہ غلط سلط عربی تحریر ۵ / اپریل ۲۰۰۷ء تک المورد کی ویب سائٹ پر جوں کی توں موجود تھیں، یعنی ستائیس (۲۷) سال میں بھی غامدی صاحب اور ان کے حلقے کی عربی دانی کا ارتقا نہ ہو سکا۔ علامہ ساجد میر کے بھانجے مستنصر میر نے غامدی صاحب کے عربی رسالے میراث میں سو (۱۰۰) غلطیاں نکال دی تھیں۔ الاشراق نامی عربی مسودے کی لسانی اغلاط ڈاکٹر طاہر منصوری نے خط کے ذریعے واضح کر دی تھیں، لہٰذا غامدی صاحب اس دفترِ اغلاط سے دستبردار ہو گئے۔ غامدی صاحب نے الاعلام میں عربی دانی کے جو جوہر دکھائے تھے ان کا لسانی محاکمہ...... پہلی مرتبہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ عربی تحریر نحوی اغلاط سے پُر اور بے معنی، بھونڈی، مہمل، رکیک، بے ربط اور پُر تصنع عربی نثر کا شہ پارہ ہے جس میں انشا، املا، زبان و بیان، فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بے شمار غلطیاں ہیں۔ اسالیب عربی سے لاعلم یہ عجمی جو ایک مختصر نثر پارہ

درست عربی میں لکھنے پر قادر نہیں، صحابہ کبار، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، ائمہ، مفسرین اور ماہرین لغت کی عربی دانی کو حقارت سے رد کرتا ہے۔ یہ غرورِ علم انہیں فراہی اور اصلاحی سے ورثے میں ملا ہے۔ غامدی صاحب کی جہالت کا علم یہ ہے کہ ۱۹۷۸ء سے ۲۰۰۵ء تک سنت پر یہ چودہ (۱۴) موقف بدل چکے ہیں۔ کبھی عورت کا ختنہ، ڈاڑھی، سنت تھی اب بدعت ہوگئی ہے۔ پہلے جمہوریت نظام کفر وشرک تھا آج دنیا کا عظیم ترین بلکہ الہامی نظام ہوگیا۔ جاوید غامدی مغربی فکر وفلسفے اور سائنس وٹیکنالوجی کے علمی مباحث سے قطعاً لاعلم ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی اکیڈمی کا مرتبہ نصاب ہے جو اس جہالت کا آئینہ ہے۔ اشراق کی تیس (۳۰) سالہ فائل میں آپ کو کسی ایک مغربی فلسفی کا ذکر تک نہیں ملے گا۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام اور مغرب کو یہ اپنے زورِ علم سے ملا دیں گے اور جدیدیت کی اسلام کاری فطری اصول پر کریں گے۔"

اب آیئے! مذکورہ بالا تحریر سے چند سطریں ہوجائیں:

"ان مختصر عربی مضامین کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں وہ عیب ہے جو عربی زبان میں "عجمہ" یعنی عجمیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی عربی تحریریں پڑھ کر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ یہ عربی زبان کے عصری اسلوب سے بے خبر ہیں۔ انہوں نے بیسویں صدی کے مشہور ادباء مصطفیٰ صادق الرافعی، لطفی المنفلوطی، محمود احمد شاکر، طٰہٰ حسین، احمد حسن الزیات، احمد امین، احمد تیمور پاشا وغیرہ مصری ادباء وعلماء اور محمد کرد علی، خلیل مردم بک، بھجۃ البیطار، علی طنطاوی شامی اور اس طرح عراق، سعودی عرب اور مراکش کے ادیبوں اور مصنفین کی تحریروں کو نہیں پڑھا ہے۔ ورنہ ان کی عربی کا وہ اسلوب نہ ہوتا جو مذکورہ بالا تحریروں میں ہے اور جس سے بوسیدگی کی بو آتی ہے۔ یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالب علم کے سامنے قدیم عربی کی کتابیں ہیں۔ وہ ان کے جملے، تشبیہات و استعارات اپنی تحریر میں منتقل کر رہا ہے۔

غامدی صاحب کی عربی نثر نحوی اغلاط سے پُر ہے۔ ان کی تحریروں میں نحو یعنی قواعد زبان کی ایسی غلطیاں ہیں کہ کسی عربی کالج واسکول کا لڑکا بھی نہیں کرے گا۔ بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے شائع ہونے والے عربی ماہنامے البعث الاسلامی میں لکھنے والے نوجوان ندوی بھی ایسی اغلاط نہیں کرتے۔ غامدی صاحب نے اپنے غرورِ علم میں ایک ایسا جملہ لکھ دیا ہے جس سے ہمارے اسلاف (صحابہ وتابعین) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت حسن البصری، مجاہد، ضحاک وغیرہ کی تغلیط وتضحیک ہوتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: **وأما الذين قالوا: "إن المراد به نجوم السماء." فإنهم لم يتتبعوا كلام العرب حق التتبع، ولم يتأملوا فيما يقتضي موقعه هنا، فلم يتبين لهم معناه، فأخطأوا وجه الصواب."** (اور جن لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد آسمان کے ستارے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کلام عرب کی اچھی طرح چھان بین نہیں کی اور نہ اس پر غور کیا کہ یہاں کس بات کا موقع محل

ہے۔اس لیے انہیں اس (ذات الحبک) کے معنی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ غلطی کے مرتکب ہوئے۔)
معاذ اللہ! آپ کو معلوم ہے کہ اس انسان نے جو عربی کے چند جملے بھی صحیح نہیں لکھ سکتا، کس پر حملہ کیا ہے۔امام حسن بصری وسعید بن جبیر جیسے تابعین اور طبری وزمخشری جیسے ادیب و ماہرین لغت ومفسرین قرآن پر (ملاحظہ ہو: اس آیت قرآن کی تفسیر طبری اور زمخشری میں)، یہ وہ غرور علم ہے جو موصوف کو امین احسن اصلاحی مرحوم اور ان کو حمید الدین فراہی صاحب سے ورثہ میں ملا تھا۔"

جو لوگ سورۂ مائدہ کے لفظ "المحصنات" سے پاک دامن عورتیں مراد لیتے ہیں، ان کے متعلق غامدی صاحب نے حسب عادت کچھ طنزیہ الفاظ لکھے ہیں۔صاحب مضمون فرماتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے کہ غامدی صاحب کی اس تغلیط اور طنز کی ضرب کس پر پڑتی ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے مشہور شاگرد اور مفسر قرآن مجاہد پر اور ان کے بعد امام طبری پر جن کی تیس جلدوں کی تفسیر سے بارہ سو سال سے مسلمان فیض یاب ہو رہے ہیں۔کیا ان مقدس اور معتبر عرب ہستیوں کو لغت (زبان) قرآن کی فہم نہ تھی؟ اور وہ اس کے اسالیب سے لاعلم تھے؟ کہ آج ایک عجمی کو جو عربی زبان کا ایک پیراگراف بھی صحیح نہیں لکھ سکتا اور اپنی عربی تحریر میں املا اور نحوی اغلاط کا مرتکب ہوتا ہے اس کو یہ جرأت ہو کہ ان عظیم اسلاف پر طنز کرے جن کی عمریں قرآن کی شرح وبسط میں گزریں۔
ہم نے مضمون غامدی صاحب کی چند عربی تحریروں کے زبان کے نقطۂ نظر سے تنقیدی جائزہ لینے کے لیے شروع کیا تھا لیکن اس میں ان کے اور ان کے استاد الاستاد مولانا فراہی کے بعض تفسیری مباحث پر بھی گفتگو ہوگئی۔قارئین کو یہ اندازہ تو پہلے ہی ہو گیا ہوگا کہ جو شخص عربی الفاظ کا صحیح املا نہیں لکھ سکتا، جو غلط نحوی تراکیب اور عربی کے متروک اور غیر مانوس الفاظ استعمال کرتا ہے، جن سب کی نشان دہی گزشتہ صفحات میں کردی گئی ہے، اس کا عربی سے متعلق دعوائے زبان دانی کیا قیمت رکھتا ہے۔اور ساتھ ہی ان کی قلت نظر ان کے محدود مطالعے، ان کے غرور علم اور اسلاف کے خلاف ڈھکے چھپے انداز میں ان کی زبان درازی کی حقیقت بھی واضح ہو گئی ہوگی۔وما توفیقی إلا باللّٰہ، اللّٰھم إنا نعوذ بك من فتنة اللسان ومن فتنة القلم."

درست نام لکھنے سے عاجز.....قرآن کے مقابلے کے لیے تیار:

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔قصہ اس سے بھی کچھ آگے کا ہے۔غامدی صاحب کی علمیت کا عالم یہ ہے کہ اپنا نام تک صحیح نہیں لکھ سکتے۔انہوں نے اپنی ایک عربی تحریر کے شروع میں درج تعارفی نوٹ جو بذات خود مبہم اور یک گونہ مہمل ہے۔(دیکھیے ساحل) کے آخر میں اپنا نام "أَلغامدی" لکھا ہے یعنی الف پر ہمزہ کے ساتھ۔جبکہ دینی مدارس کے پہلے درجے کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ ہمزہ وصلی پر ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔یہ عربی

املا کا مسلمہ قاعدہ ہے۔اس لرزہ خیز مہارت کے باوصف غامدی صاحب کے سر پر ایک زمانے میں قرآن کریم کے مقابلے میں آیات سازی کا جنون سوار تھا اور انھوں نے اپنے پاس سے چالیس مہمل، بے ربط اور رکیک جملے گھڑ کر انھیں آیات کا نام دے رکھا تھا اور اسے محفلوں میں سنایا کرتے تھے۔اس روداد کے نقل کے لیے ہم ایک مرتبہ پھر ماہنامہ ''ساحل'' کے مشکور ہیں۔ملاحظہ ہو:

''۱۹۷۵ء میں جناب غامدی صاحب ممتاز اہل حدیث عالم علامہ ساجد میر کے بھانجے ڈاکٹر مستنصر میر کی دعوت پر سیالکوٹ تشریف لائے۔کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ممتاز راسخ العقیدہ گھرانے کا ہونہار فرزند غامدی صاحب جیسے عربی زبان سے ناواقف، دینی علوم اور مغربی علوم سے لاتعلق لاعلم فرد کا گرویدہ ہوگیا تھا۔اس زمانے میں ڈاکٹر سہیل طفیل نشتر میڈیکل کالج میں سال دوم کے طالب علم تھے۔(ڈاکٹر صاحب مستنصر میر کے خالہ زاد بھائی اور علامہ ساجد میر کے بھانجے جواب ممتاز ماہر قلب بھی ہیں) اور جس گھر میں رہتے تھے اس گھر کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی گلی میں میر خاندان کا ایک آبائی مکان جس کا نمبر 31\694 جو آج بھی موجود ہے اور جناب عبدالوکیل میر صاحب یہاں قیام پذیر ہیں۔اس وقت اس گھر کے مالک عبدالرؤف میر تھے۔جناب غامدی صاحب کی میزبانی کی سعادت اس مکان کو حاصل ہوئی۔ اسی مکان میں جناب غامدی نے قرآن کی وہ چالیس آیات پیش فرمائیں جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ قرآن کے چیلنج کا جواب ہے۔مولانا میر ابراہیم سیالکوٹی جو رشتے میں علامہ ساجد میر صاحب کے رشتے کے نانا ہیں، سیالکوٹ میں ان کی مسجد، مسجد ابراہیمی میں غامدی صاحب نے سورۂ عصر کا درس بھی دیا تھا۔چالیس فرضی آیات کی مجلس میں راقم بھی حاضر تھا۔اس کے علاوہ اسد صدیقی، ڈاکٹر سہیل طفیل، برادر مستنصر میر، ڈاکٹر مستنصر میر، ڈاکٹر منصور الحمید، اسد صدیقی اور دیگر رفقائے خاص اس موقع پر موجود تھے۔ غامدی صاحب نے بعد ازاں یہ آیتیں کتابی شکل میں اشاعت کے لیے منڈی مرید کے ایک کاتب سے کتابت بھی کرائی تھیں لیکن کتابت بہت ناقص تھی لہٰذا مسودہ روک دیا گیا۔دریں اثنا ڈاکٹر مستنصر میر کی زجر و توبیخ کے باعث غامدی صاحب نے توبہ کرلی اور ان کی توبہ ان کے اس حلقہ مریدین نے قبول بھی کرلی لہٰذا مسودہ ضائع کر دیا گیا۔راقم کے پاس اس مسودے کا ایک ٹکڑا محفوظ رہ گیا تھا۔''

غامدی صاحب جس طرح اپنا نام صحیح نہیں لکھ سکتے۔اسی طرح وہ اپنا نام غامدی رکھنے کی کوئی معقول وجہ بھی نہیں بتا سکتے۔یہ بحث بھی بڑی دلچسپ ہے۔غامدی صاحب اور ان کے شاگردانِ رشید سے ہماری گزارش ہے کہ دنیا چند روزہ ہے۔اسلام اور مسلمان اس وقت ابتلا اور آزمائش کے عالم میں ہیں۔توبہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے ورنہ سوچ لیجیے کہ آج انسانوں کی عدالت میں آپ اپنا ''نام'' رکھنے کی وجہ نہیں بتا سکتے تو کل احکم الحاکمین کی عدالت میں اپنے ''کام'' کی کیا جوابدہی کریں گے؟ اب بھی وقت

ہے۔ پردہ اُٹھ تو گیا ہے اس کے چاک ہونے سے پہلے واپس آ جائیے اور اس حرماں نصیب قوم کو مزید مذہبی آزمائشوں میں نہ ڈالیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اصلاح اور رجوع کی توفیق دے۔

ایک نام چار وجوہات:

غامدی صاحب کی ویب سائٹ www.ghamidi.org پر آپ کے تعارف میں درج ہے: ''ان کے دادا نور الٰہی کو لوگ گاؤں کا مُصلح کہتے تھے، اسی لفظ مُصلح کی تعریب سے اپنے لیے غامدی کی نسبت اختیار کی اور اب اسی رعایت سے جاوید احمد غامدی کہلاتے ہیں۔'' مُصلح خود عربی لفظ ہے اس کی تعریب سے غامدی کی نسبت اختیار کرنے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آیا۔ مُصلح غیر عربی لفظ تو نہیں کہ اس کی تعریب کی جاسکے۔ غامد کا مادہ (غ م د) ہے اور اس کے معنی چھپانے اور مستور رکھنے کے ہیں۔

ایک خط میں آپ نے غامدی کا پس منظر یہ بیان فرمایا تھا کہ آپ کے بچپن میں آپ کے والد محترم کے کوئی دوست عرب سے تشریف لائے تھے ان کے نام کا آخری حصہ غامدی تھا۔ آپ کے والد کو یہ نام اچھا لگا اور انہوں نے اسے آپ کے نام کا حصہ بنا دیا جبکہ [حدیث مبارک ابن ماجہ کتاب الحدود باب: ۳۶] میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو اپنے آباؤ اجداد کے سوا کسی دوسرے باپ کے ساتھ اپنی نسبت جوڑ دے۔

گزشتہ دنوں ڈین فیکلٹی آف ماس کمیونی کیشن، جامعہ پنجاب ڈاکٹر مغیث شیخ کراچی تشریف لائے تھے۔ ایک نجی محفل میں جہاں سجاد میر، طاہر مسعود صاحب اور انعام باری صاحب بھی موجود تھے۔ آپ کا لقب غامدی زیرِ بحث آیا تو مغیث شیخ صاحب نے آپ کے حوالے سے اس کی تصریح فرمائی: ''عربوں کا قبیلہ غامد فصاحت و بلاغت میں عالم عرب میں ممتاز تھا اسی مناسبت سے غامدی کنیت اختیار کی جس کے مجازی معنی ہیں ''عربی فصاحت و بلاغت میں ممتاز ترین شخص'' جبکہ تاریخ کے کسی تذکرے میں یمن کے غامدی قبیلے کی فصاحت و بلاغت کا کوئی ذکر نہیں اور عرب میں قبیلہ قریش افصح العرب تھا۔ اس فصاحت کی غامدی قبیلے تک منتقلی عجیب بات ہے۔

چوتھی روایت آپ کے حوالے سے یہ بیان کی گئی ہے کہ بنو غامد کی وہ خاتون جنہیں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراف گناہ کے بعد سنگسار فرما دیا تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعض ناروا الفاظ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا: ''اگر غامدیہ کی توبہ مدینہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہوگی۔'' اس خاتون کے اکرام و احترام میں آپ نے غامدی کی نسبت اختیار فرمائی ہے۔ یہ چار وجوہات ہو گئیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ اصل صورتِ حال کیا ہے اور یہ معمّا کب حل ہوگا؟

ذکر ایک عالمی شاہکار کا:

غامدی صاحب کی عربی دانی کا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ زندگی بھر (آنجناب کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے) کا کل عربی سرمایہ ۱۲۲ر صفحات ہیں۔ ان میں سے سو کو آپ نے اس لیے خود ضائع کر دیا کہ وہ ان کے خیال میں عربی علوم میں عجمی مہارت اور تحقیق واجتہاد کے پردے میں جاہلانہ یاوہ گوئیوں کی حقیقت آشکارا کرتے تھے۔ جو بائیس (۲۲) صفحات غامدی صاحب کی سائٹ پر موجود ہیں، اللہ جھوٹ نہ بلوائے ان میں سے ہر ایک میں ۲۲ر سے زیادہ غلطیاں ہیں۔ غلطیاں محض تعبیر واسلوب کی نہیں کہ کوئی کہہ سکے اس طرح کی اصلاح تو ہر ایک کے کلام پر ہو سکتی ہے..... نہ حضور نہ..... یہ غلطیاں اس قسم کی ہیں کہ درجۂ اولیٰ کے طالب علم دیکھیں تو انگلیاں دانتوں تلے دبالیں اور منتہی طلبہ پڑھیں تو انہیں زمین آسمان کی نبضیں تھمتی محسوس ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"فبھذا السبب كان عمل أعضاء هذا النوع من الأحزاب أن يقضوا طيلة حياتهم لحصول النجاة من سوء نتائج حسابهم هذا."

پڑھیے اور داد دیجیے کہ ایسی بے معنی، مہمل اور عیوب سے آراستہ عربیت اور اس پر متکبرانہ دعویٰ کہ غامدی مکتب فکر ہی عصر حاضر کا وہ طبقہ ہے جو قرآن کی روح سے واقف اور اس کے مزاج سے آشنا ہے۔ خودساختہ فتنہ انگیز مسائل پر دانش وری بگھارنا صرف اس کا حق ہے، آنے والا دور صرف ان کا ہے اور دبستان شبلی کا واحد اور حقیقی جانشین صرف وہی ہے۔

اسلامی علوم اور عربیت میں غامدی صاحب اور ان کے لائق شاگردوں (جو ۲۷ر سال میں اپنے استاذ کی لکھی ہوئی چند سطریں پڑھ کر ان کی اصلاح نہ کر سکے) کی اہلیت ومہارت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اسی سے ان کے فتویٰ نما دعووں کی علمی حیثیت اور شرعی مسائل پر مجتہدانہ تبصروں کی حقیقت آپ پر واضح ہو گئی ہو گی۔ لے دے کے آنجناب کی پونجی میں ایک چیز ایسی رہ جاتی ہے جس کی بنا پر وہ پاکستان کے سب سے بڑے اسکالر ہونے کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور وہ ہے جدید علوم سے واقفیت اور انگریزی دانی۔ آیئے! اس محرم تمنا مکتب فکر کے اس دعوے کی حقیقت کا جائزہ بھی لگے ہاتھوں لیا جائے۔ واضح رہے کہ اس تمام تحقیق اور انکشاف کا کریڈٹ ماہنامہ "ساحل" کو جاتا ہے جس نے عصر حاضر کے فتنے کا پول کھولنے کا کارنامہ انجام دیا اور اس تحقیقی انداز سے انجام دیا کہ غامدی صاحب کو دفاع کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔

غامدی صاحب کی انگریزی دانی:

دبستان غامدی سے وابستہ جدیدیت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ "حضرت الشیخ الغامدی" کئی زبانوں کے

ماہر ہیں۔ انگریزی میں مہارت کے ثبوت میں آنجناب کی انگریزی میں فرمائی گئی شاعری کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ شاعری ۲۴ مصرعوں پر مشتمل چار نظموں کو ''محیط'' ہے اور قطع نظر اس کے کہ عربی نثر سے زیادہ بے تکی، مضحکہ خیز اور غنائیت، سلاست و شعریت سے محروم ہے، اسے سرقے کا عالمی شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ غامدی صاحب کی چار نظموں پر مشتمل ''بھان متی کا کنبہ'' انگریزی کے مشہور شعرا کے کلام سے اینٹ روڑے چرا کر جوڑا گیا ہے۔ یقین نہ آئے تو منسلکہ موازنہ پڑھ لیجیے اور غامدی صاحب کے حوصلے کی داد دیجیے کہ کس بے باکی اور جی داری سے نامی گرامی شعرا کی مشہور زمانہ نظموں سے سرقہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اس پر تعجب تو ہوا لیکن کچھ خاص نہیں اس لیے کہ حضرت غامدی صاحب جب صحابہ کرام و تابعین عظام رضی اللہ عنہم نیز ائمہ مجتہدین اور اُمت کے اکابرین کے علمی مقام و مرتبے کا لحاظ نہیں رکھتے تو انگریزی شعرا کی کیا حیثیت کہ ان کے کلام پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے انہیں کچھ جھجک محسوس ہوئی ہوگی یا تکلف آڑے آیا ہوگا۔

غامدی صاحب کی جدید علوم سے واقفیت:

اس بات کا پرچار بھی بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے: ''غامدی صاحب، مغربی فکر و فلسفے پر عبور رکھتے ہیں جبکہ علمائے کرام اگرچہ دینی علوم میں رسوخ رکھتے ہیں لیکن جدید علوم اور سائنس و فلسفہ سے آشنا نہیں اس لیے سکہ بند قول تو وہ ہے جو حضرت الغامدی صاحب کی زبان عالی سے ارشاد ہو۔ مانا کہ غامدیین کو عربی یا انگریزی نہیں آتی، اسلامی علوم میں عبور نہیں، لیکن یہ پڑھا لکھا روشن خیال طبقہ مغرب اور مغربی علوم سے تو واقف ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ قدیم یونانی منطق و فلسفہ (جس میں اہلِ مدارس محققانہ بصیرت رکھتے ہیں) کی طرح غامدی صاحب اور ان کے شاگردانِ رشید جدید مغربی فلسفہ اور جدید سائنس کی حقیقت سے بھی واقف نہیں۔ اس کی دو دلیلیں ہیں:

(۱) ....غامدی صاحب کے قائم کردہ اکیڈمی ''المورد'' کے نصاب میں (یہ مشکل عربی لفظ بیروت سے چرایا گیا ہے) جدید علوم، فلسفہ، سائنس، سوشل سائنسز شامل تھے نہ ہیں۔ یونانی فلسفہ تو ویسے ہی شامل نہیں۔ مغربی فکر و فلسفے پر پورے غامدی مکتب فکر کا کوئی کام نہیں۔ اور غامدی صاحب تو کیا ان کے استاذ محترم امین احسن اصلاحی صاحب اور استاذ الاستاذ حمید الدین فراہی صاحب دونوں حضرات بھی مغربی فکر و فلسفے سے قطعاً ناواقف تھے۔ جب بانیانِ مکتب کا یہ حال ہے تو وابستگانِ مکتب کی حالت جانچنا کچھ مشکل نہ ہونا چاہیے۔

(۲)......غامدی صاحب نے ساٹھ سال کی عمر میں کتابی شکل میں اُردو نثر کے نو سو صفحات تحریر فرمائے ہیں۔ ان تمام تحریروں میں ایک جگہ کے علاوہ کسی مغربی فلسفی یا مفکر کا کوئی حوالہ نہیں ملتا اور جو پہلا

اور آخری حوالہ مغربی فلسفی ہیگل کا انہوں نے دیا ہے وہ مکمل طور پر غلط ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے مذکورہ بالا ماہنامہ مئی ۲۰۰۷ء، ص: ۹۳،۲۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم و جدید علوم کا جامع ہونے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ حضرات جو جدید فلسفہ پر ایک سطر نہیں لکھ سکے جدید فلسفیانہ مباحث کو سمجھنے یا اس پر نقد کرنے کی کیا اہلیت رکھتے ہوں گے؟

چند عاجزانہ گزارشات:

اس عاجز کو اندیشہ ہے کہ اس تحریر میں کچھ سخت الفاظ آ گئے ہوں گے۔ اللہ شاہد ہے کہ یہ سب کچھ محض اہلیانِ وطن کے ایمان کی حفاظت کے پیش نظر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غامدی صاحب ..... من پسند اصول تفسیر سے لے کر حدود اللہ میں ترمیم تک ..... جس مہم کو لے کر چل رہے ہیں اور جن گمراہانہ خیالات وافکار کی وہ اشاعت کر رہے ہیں، اس سے جو شر و فتنہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں پھیل رہا ہے، یہ ملک وملت کے لیے انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ لہٰذا:

☆ ..... غامدی صاحب سے درخواست ہے کہ آپ نے آج تک اسلام کے دفاع اور مستشرقین کے اسلام پر حملوں کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا، نہ سہی، لیکن خدارا! اُمت کے اجماعی اور متفقہ مسائل میں اختلاف کا رخنہ ڈال کر اپنا اور قوم کا ایمان برباد نہ کیجیے۔ ایک نئے فرقے کا اضافہ نہ کیجیے اور روزِ محشر کی حشر سامانیوں سے ڈریے! جہاں کوئی سایہ، کوئی پناہ گاہ نہ ہو گی۔ آپ آج خلقِ خدا کے سامنے اپنے ایک دعوے کو درست ثابت نہیں کر سکتے، کل عالم الغیب کے سامنے اُمت کی بھنور میں پھنسی کشتی کو مزید ہچکو لے دینے پر کیا جواب دیں گے؟

☆ ..... غامدی صاحب کے شاگردوں سے گزارش ہے کہ وہ ہر طرح کے تاثر اور تعصب سے پاک ہو کر پیش کیے گئے دستاویزی ثبوتوں کی روشنی میں سوچیں اور غور کریں کہ کہاں اجتہاد کا مقدس علمی منصب اور کہاں یہ ہفوات اور علمی سرقے؟ جو شخص عربی کی ابتدائی باتیں نہیں جانتا، اپنا نام صحیح نہیں لکھ سکتا، اسے اپنا امام، شیخ یا مقتدا ماننا اور اس کی تقلید کرتے ہوئے اُمت کے متفقہ موقف سے انحراف کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟

☆ ..... جو چینل مالکان غامدی حضرات کو اہلِ علم و دانش سمجھ کر اپنے چینل پر وقت دیتے ہیں، وہ بلاوجہ دہرے گناہِ بے لذت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قوم کے نظریات میں بھی الحاد پیدا ہو رہا ہے اور علم کے نام پر جہالت اور دین کے نام پر بے دینی بھی پھیل رہی ہے۔ ان حضرات کو اگر ہم ملاؤں کی بات پر یقین نہ آئے تو غامدی صاحب سے انٹرویو کر کے ان سے ان کے نام کا معنیٰ پوچھ لیجیے۔ آپ پر حقیقت

واضح ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قلب سلیم عطا فرمائے۔

☆......میرے جو ہم مذہب و ہم وطن بھائی غامدی صاحب کی علمیت وصلاحیت اجتہاد کے معترف ہیں از راہ کرم وہ اتنا کرلیں کہ کسی پروگرام کے سوال وجواب کے سیشن میں ان سے یا ان کے شاگردوں سے جناب ڈاکٹر ندوی صاحب کی طرف سے نشان زدہ غلطیوں کے متعلق پوچھ لیجیے کہ آپ چند سطریں درست طرح سے نہیں لکھ سکتے تو ضخیم تفاسیر اور ذخیرہ احادیث سے کیسے استفادہ کر لیتے ہیں؟ چلیں جانے دیجیے بائیس (۲۲) صفحات ضرب بائیس (۲۲) اغلاط کو، صرف مذکورہ بالا عربی جملے (جو مضمون کے شروع میں گزرا) کا مطلب بتا دیجیے۔ اگر غامدی مکتب فکر کے دو تین ''مجتہدین'' اور پانچ دس ''مفکرین'' مل کر اپنے ''مجتہد اعظم'' کے ایک جملے کو درست ثابت نہیں کر سکتے تو میرے سادہ لوح ہم وطن بھائیوں کو مان لینا چاہیے کہ علمائے حق جو بات کر رہے ہیں للہ فی اللہ کہہ رہے ہیں۔ وہی درست ہے اور جو کچھ چینلوں پر بگھارا جا رہا ہے، غلط، الحاد، یہودی اور عیسائی مستشرقین کا پڑھایا ہوا سبق اور محض شیخی خوری ہے جس کا علمائے کرام سے جواب پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں۔

☆......میرے جو نوجوان دوست علمائے کرام کے بیانات میں دلچسپی نہیں لیتے کہ اس کے لیے ٹوپی پہن کر مسجد جانا پڑتا ہے اور چینلوں پر آنے والے ڈاکٹرز، اسکالرز کو پسند کرتے اور ان کی آزادخیالی سے لطف اندوز ہو کر ان کو دین کا حقیقی ترجمان سمجھتے ہیں، ان سے التماس ہے کہ منسلکہ شاعری پڑھیے۔ یہ بے جا اور مضحکہ خیز کلام کیا اس قابل ہے کہ Percy Wyndham Lewis کی مرتبہ کتاب (The Stuffed owl) میں شامل کیا جا سکے؟ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے مرتب نے انگریزی کے بھونڈے اشعار سے نادر انتخاب کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے یہ بھی سوچیے! کیا آپ کا دل مانتا ہے جو شخص عالمی سطح کے معروف کلاسیکل لٹریچر پر اس دھڑلے کے ساتھ ہاتھ صاف کر سکتا ہے وہ آپ کو قرآن وحدیث کے حوالے دیتے وقت (جن کا پس منظر آپ قطعاً نہیں جانتے) انصاف و دیانت سے کام لیتا ہوگا؟ نہیں میرے عزیز! ہرگز نہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب توبہ کریں نہ کریں آپ کو ان کی عقیدت سے توبہ کر لینی چاہیے۔ علمائے کرام جیسے بھی ہوں کم از کم دینی معلومات کی فراہمی میں بددیانتی سے کام نہیں لیتے۔ یہ وہ وصف ہے جو آپ کو نام نہاد ڈاکٹرز، اسکالرز کے ہاں نہ ملے گا۔ کسوٹی ہم نے آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ حقیقت کو پرکھنا اور ہدایت کی تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی راہنمائی فرمائے اور ہر قسم کے فتنے سے میری اور آپ کی حفاظت فرمائے۔

☆☆☆☆

محترم جناب اعجاز احمد قیصرانی صاحب

جاوید احمد غامدی......مختصر تعلیمی پس منظر

ربِّ یسّر و تمّم بالخیر. الحمدلله و کفٰی و سلام علیٰ عباده الذین اصطفیٰ، اما بعد!

ازل سے لیکر ابد تک معرکہ حق و باطل سرگرم عمل رہے گا، نہ خود ساختہ مذاہب ختم ہونگے اور نہ ہی ہوئی پرست اپنی ہوئی پرستی سے باز آئیں گے، اب اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ نفس پرستوں کو شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا جائے، وہ جس طرح چاہیں اسلام کا نورانی چہرہ مسخ کرتے رہیں اور ہم مصلحت کی چادر اوڑھ کر درس امن دیتے رہیں، نہیں! بلکہ ان نفس پرستوں کی بیخ کنی ضروری ہے اور جزو ایمان ہے۔ یہ ہوئی پرست کبھی ڈاکٹر فضل الرحمن، کبھی جماعت المسلمین اور کبھی جاوید احمد غامدی کی شکل میں اپنے خود ساختہ عقائد و تشریحات کا پرچار کر کے عوام الناس کو گمراہ کر کے سستی شہرت کما کر اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے جاوید احمد غامدی الیکٹرانک میڈیا کا سہارا لیکر دین اسلام کی خود ساختہ تشریحات پیش کر کے امت مسلمہ کو سنت رسول اللہ ﷺ سے دور کرنے کی مذموم سازش کر کے گمراہی کی طرف دھکیل رہا ہے، اس فتنہ سے نبرد آزما علماء کرام، وارثان علوم انبیاء ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے شب و روز امت کو راہ مستقیم دکھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

دنیائے ہست و بود پر وجود ازل سے لیکر ابد تک انسان کسی نہ کسی ایسے نشہ میں غرقاب رہا ہے جو اس کی طمانیت کا باعث ہو، ان میں سے ایک نہایت ہی خطرناک نشہ عزت و جاہ کا بھی ہے۔ اسلامی تمدن کی بنیاد کلیۃً سادگی، خدا ترسی، زہد و قناعت اور سنن نبوت پر قائم ہے اور جب تک امت مسلمہ اپنی نہج پر قائم رہی امامت و سیادت اسی کے مرہون منت تھی۔ اس کی شان و شوکت کے سامنے قیصر و کسریٰ سمیت آدھی سے زیادہ دنیا سرنگوں تھی، کیونکہ اس وقت امت مسلمہ کا مطمع نظر اس کے دین کی بقا تھی، اپنی ذات، ذات نہ تھی بلکہ سپرد خدا تھی اور خلق خدا کی دائمی بقا تھی۔ ہماری سیاہ کاریوں بد عملیوں اور دین و متین کی خود ساختہ تشریحات نے ہم سے ہماری شان و شوکت چھین لی اور ہم مختلف فرقوں میں تقسیم ہوتے چلے گئے اور غیروں سے زیادہ اپنوں کے لیے نا قابل التفات اور قابل گذاشتنی بن گئے۔ اور اس اسلامی تمدن کے بالمقابل وہ تمدن ہے جس کے سایہ سے بھی ہمارے اسلاف بھاگتے رہے اور علوم وحی کو اپنے سینے سے

اگائے رکھا، یہ وہ تمدن اغیار ہے جس کا منشأ و مقصد کوئی طریق نبوت اور خلق ربانی نہیں بلکہ اس کی بنیاد تلذذ وعیش پرستی اور ابلیسی ملمع سازی پر قائم ہے، ہم اگر خوردبینی نظر سے مشاہدہ کریں کہ کتنے نونہالان مسلم اس خود فریبی تمدن کا شکار ہو کر اس مغربی تمدن کے زیر سایہ پروان چڑھ کر انہیں کے ہو چکے ہیں اور اسلام کی خود ساختہ تشریحات وتنقیحات پیش کر کے دیگر افراد کو اپنا ہم نوا بنانے کی سعی مسلسل کر رہے ہیں۔

امت مسلمہ کے نوجوانوں پر پہلا تیشہ سرسید احمد خان نے چلایا......عنایت اللہ مشرقی نے اپنا زور لگایا......تو پرویز نے ''سب کچھ قرآن'' کا نعرہ لگا کے حدیث نبویہ کا انکار کیا اور منکرین حدیث کے گروہ کی بنیاد ڈالی......اور اسلم جیراجپوری نے اپنی لاف زنیوں کو متعارف کرایا۔علیٰ ہذا القیاس، ان جدت پسندوں کی ایک طویل فہرست ہے جو عزت وجاہ اور مغرب کی چمک ودمک سے متاثر ہو کر دین حق پر رکیک وار کرنے سے گریزاں نہیں ہوتے۔

انہیں میں سے ایک نام جاوید احمد غامدی کا بھی ہے، جو بزعم خود مفسر بھی ہے، مفکر بھی، معلم بھی ہے اور علامہ ومحقق بھی، محدث اور ماہر علوم وفن بھی ہے......مگر......اس کی تمام تر تعلیمی قابلیت کا نتیجہ صرف چند جدت پسندوں کے مخصوص (خلاف اسلام) نظریات کی اشاعت تک محدود رہا......آیئے!......ایک نظر اس کی آپ بیتی پر ڈالتے ہیں تا کہ اس کی شخصیت کا پردہ خود اس کی زبانی چاک ہو، تا کہ اس کی تحریرات اسی کے آئینے میں دیکھی جاسکیں۔

غامدی صاحب کا نام:

موصوف کے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ کسی ایک نام پر اتفاق نہ ہوسکا اور آخر اپنا نام بھی خود رکھا، یعنی موصوف پیدائش سے تفرقہ کا باعث بنے اور آج تک امت میں افتراق کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

اپنی کتاب ''مقامات'' میں خود نوشت یوں لکھتے ہیں:

> ''میرے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے، والد کو جاوید پسند تھا......والد کے مرشد نے کہا اسے ''کاکو شاہ'' کہا کرو!......خالہ کا اصرار تھا اس کا نام شفیق رکھا جائے......بڑی خالہ نے کہا میں نے تو پہلے سے اس کا نام ''کاکا محمد'' رکھا ہوا ہے......چنانچہ جب تک یہ بزرگ زندہ رہے مجھے اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے رہے۔'' [مقامات:۱۳]

جاوید صاحب کی تعلیم کا معاملہ بھی عجیب رہا، ان کے والد صاحب کے ایک دوست نے، جو بچے کے نام سے بھی واقف نہ تھے، جا کر سکول داخل کرادیا، خدا معلوم کس طرح کے دوست تھے کہ ان کو

دوست کے بچے کا نام بھی معلوم نہیں تھا ۔۔۔ خیر! لکھتے ہیں

''مدرسہ میں داخلہ کا وقت آیا تو والد موجود نہ تھے۔اس زمانے میں بعض اوقات دو مہینوں کے لیے اپنے شیخ کی خانقاہ کوٹلی مغلاں چلے جاتے تھے،ان کے ایک عزیز دوست تھے جنہیں ہم چچا کہتے تھے۔۔۔۔ میرے لیے اس سکول کا انتخاب کیا گیا جس میں میرے خالہ زاد بھائی پڑھتے تھے،نام لکھاتے وقت چچا نے نام پوچھا تو میں نے سارے نام بتا دیئے۔۔۔ وہ سخت پریشان ہوئے۔۔۔۔۔ چچا نے چند لمحے توقف کیا اور پھر شفیق نام رجسٹر میں درج کرا دیا۔۔۔ میں جب شعور کی عمر کو پہنچا تو مجھے والد کا رکھا ہوا نام زیادہ پسند آیا۔۔۔۔۔لیکن اب سکول کے رجسٹر کا کیا کیا جائے؟ اپنے ایک استاد محمد صادق کی تجویز پر اپنا قلمی نام جاوید احمد لکھ لیا۔۔۔۔ چنانچہ کالج کے زمانے سے اسی نام سے شہرت ہوگئی۔''

''غامدی'' کا لاحقہ

جاوید احمد ولد طفیل احمد جنیدی اپنے ایک طویل قصہ میں لفظ ''غامدی'' اپنے ساتھ لگانے کی توجیہ کچھ فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو شہرت کمانے کا بچپن سے شوق تھا۔لکھتے ہیں:

''والد کے پاس دو مہمان آئے ان میں سے ایک والد کے پیر بھائی غلام رسول وحشی اور دوسرے کوئی عالم سنیاسی تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔۔۔ عبداللہ صاحب نے انہی مجلس میں کوئی قصہ سناتے ہوئے بیان کیا کہ بنو غامد کے ابوالآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔چنانچہ اسی بنا پر انھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا،اور غمد الامر کے الفاظ اس کے بعد عربی میں اصلح الامر کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔۔۔۔قبیلہ جزیرہ نما عرب میں اسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے۔مجھے فوراً خیال آیا کہ یہی کام تو میرے دادا کرتے تھے۔''[مقامات:۱۶]

اب جناب جاوید صاحب کو یہ لفظ اسقدر پسند آیا کہ اسے اپنے نام کا حصہ بنا لیا،حالانکہ عرب میں یہ لفظ قبیلے کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ فرد واحد کے لیے،اب کسی قبیلے کی صفت کو اپنے نام کا حصہ بنانے کی تنگ بندی سمجھ سے بالاتر ہے،موصوف امت کی اصلاح تو خاک کریں گے الٹا امت کے اندر افتراق کا باعث بنے ہوئے ہیں۔لکھتے ہیں:

''یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بیحد مسرت ہوئی،والد سے ذکر کیا تو انہوں نے پسند کیا۔میں ضلع ساہیوال کے جس دیہاتی ماحول میں رہتا تھا وہاں اس طرح کا نام مذاق بن جاتا،اس لیے میں نے اسے

لکھنا تو بہت بعد میں شروع کیا لیکن فیصلہ اسی دن کر لیا کہ یہ لفظ اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔"

موصوف کے والد محترم غالباً مزدور قسم کے آدمی تھے لہٰذا انہوں نے پاک پتن کے نواح میں میاں محمد حسین بودلہ کی جاگیر پر ملازمت کر لی، دو تین ماہ کے بعد اپنے اہل خانہ کو بھی گاؤں نانکپال بلوا لیا جیسا کہ ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی کہ اس کی اولاد پڑھ لکھ جائے ...... لکھتے ہیں کہ:

"میں سکول پڑھتا تھا، لیکن والد اس پر مطمئن نہ تھے، ان کی خواہش تھی کہ میں عربی، فارسی اور سنسکرت پڑھوں، مگر اس کی کوئی صورت سمجھ نہیں آتی تھی، لہٰذا پکا سدھار کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا گیا۔..... گاؤں (نانکپال) میں ایک چھوٹی مسجد تھی ...... مولوی نور محمد صاحب اس مسجد کے خطیب اور امام تھے ...... والد نے ان سے میری تعلیم کی بات کی تو انہوں نے فرمایا: عربی، فارسی تو میں اسے پڑھا دوں گا ..... شرح جامی تک عربی ..... پند نامہ ..... شیخ عطار تک فارسی پڑھائی۔"

یہ تھی موصوف کی عربی، فارسی تعلیم اور یہی چند کتابیں غامدی صاحب نے کسی استاذ سے پڑھیں اور وہ بھی تیسری سے پانچویں جماعت تک غالباً اسوقت عمر ۸ر سال رہی ہوگی، اس کے بعد موصوف کے والد کی مولوی نور محمد سے ناراضگی ہوگئی اور جاوید میاں کی عربی تعلیم سے چھٹی۔ والد صاحب بودلہ صاحب کی ملازمت ترک کر کے واپس پاک پتن آ گئے۔ اس سے آگے کی تعلیمی کہانی ایک الف لیلیٰ کی داستان لگتی ہے، لکھتے ہیں:

"وہ جو کہتے ہیں کہ: "شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے در کار نیست" میں خود ہی کسی استاذ کے پاس پہنچ جاتا اور ...... درس نظامی کی کتابیں پڑھتا، نویں جماعت تک فنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں ...... دسویں کا امتحان درپیش تھا اور عربی تعلیم کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گیا ......"

(بڑی بات ہے، تقریباً ۱۴ سال کی عمر میں موصوف "علامہ" بن گئے اور وہ بھی چلتے چلتے۔ اور وہ قابل اساتذہ کون تھے جن کا موصوف نام لیتے ہوئے شرمار ہے ہیں؟؟)

ایک بات یہاں پر خصوصاً نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ "علامہ" صاحب نے درس نظامی کی کتب کو فنون کی کتابیں لکھا ہے، حالانکہ یہ کتب اصل علوم کی ہیں اور لارڈ میکالے کے نظام کی کتابیں فنون کی ہیں، اگر موصوف علم وحی سے واقف ہوتے تو یقیناً اس لطیف فرق سے ضرور واقف ہوتے، دراصل قصور اس کا نہیں، وجہ یہ ہے کہ اس لیے کہ ان کا اصل آئیڈل لارڈ میکالے ہی تو ہے۔ اس سے آگے کی تعلیم کی داستان ملاحظہ ہو ...... لکھتے ہیں:

☆ ...... پانچویں جماعت سے مودودی کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔

☆......دسویں جماعت کا سال شروع ہوا تو فلسفہ تصوف ادب تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔

☆......دسویں کے بعد لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا، فلسفہ اور انگریزی ادب اختیاری مضامین تھے۔

☆......بی اے کے ساتھ آنرز کے لیے بھی انگریزی ادب ہی کا انتخاب کیا۔

کالج میں داخل ہوتے ہی علامہ صاحب کی دلچسپی کا محور انگریزی ادب تھا نہ کہ اسلامیات، اگر ان کو اسلام اور اسلامی اقدار سے کسی قسم کی دلچسپی ہوتی تو یقیناً وہ اختیاری مضامین میں سے اسلامیات اختیار کرتے۔ بی اے آنرز کے بعد آپ کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا......اب آگے کی داستان کچھ اس طرح ہے:

☆......ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق صاحب سے میں نے "مقامات ہمدانی"

☆......اور مولانا عطاء اللہ حنیف اہل حدیث سے "دارمی" کا کچھ حصہ پڑھا۔

☆......گورنمنٹ کالج میں کم وبیش پانچ سال رہا اور لائبریری میں بیٹھا رہتا۔

☆......آنرز کے حصہ اول کا امتحان پاس کر لینے کے بعد امام حمید الدین فراہی کی بعض کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا یہ علم ونظر اور فہم وبصیرت کی ایک حیرت انگیز دنیا تھی جو ان کی کتابوں کے اوراق پلٹتے ہی سامنے آگئی۔

☆......ڈاکٹر اسرار احمد کے تعلق سے امین احسن اصلاحی سے واپڈا کالونی لاہور میں ملاقات ہوئی، مولانا دو ہفتے لاہور میں رہے، میں روزانہ ملاقات کے لیے حاضر ہوتا اور ایک نئی دنیا کی سیر دیکھ کے لوٹتا، استاذ امام کے ساتھ یہی ملاقاتیں ہیں جن سے پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے، اسے سمجھا اور سمجھایا بھی جاسکتا ہے......یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن ایک قول فیصل ہے دین وشریعت کے لیے، میزان ہے پورے عالم کے لیے، اور خدا کی حجت ہے۔ مولانا نے مجھے مختلف علوم وفنون کی امہات کتب کی تفصیلی فہرست بھی بتائی۔

☆......میری طالب علمی کا دوسرا دور اسی سے شروع ہوا، یہ ۱۹۷۳ کی ایک شام تھی، اس کے بعد یہ سلسلہ کم وبیش دس سال جاری رہا، اس دوران میں مولانا نے خود بھی پڑھایا، سورۃ زخرف سے آخر قرآن تک مؤطا امام مالک۔ قرآن وحدیث پر تدبر کے اصول ومبادی اور فلسفہ جدید کے بعض مباحث اور ۱۹۸۳ میں تعلیم کا مرحلہ ختم ہوا۔

☆......۱۹۹۰ء زندگی کے چالیس سال پورے ہونے تھے کہ فکر وخیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا میں نے تصنیف وتالیف کا پروگرام ترتیب دیا۔

تصنیفات غامدی پر ایک نظر:

۱......البیان: قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر جو کہ میری معلومات کے مطابق نامکمل ہے اور ان کے استاذ امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر القرآن کا چربہ ہے، کیونکہ تفسیر تدبر القرآن کو کوئی خاص پذیرائی نہ مل سکی، اس لیے شاگردِ رشید نے اب اس کام کو اپنے ذمہ لے کے یہ کام شروع کیا ہوا ہے، مکمل ہونے کے بعد پتہ چلے گا کہ اس میں کیا تیر مارے ہیں۔

۲......میزان: اِس میں پورے ''غامدی دین'' کا بیان ہے۔ چنانچہ غامدی صاحب خود لکھتے ہیں:

''اسلام کو جس طرح میں نے سمجھا ہے، یہ اس کا بیان ہے۔''

۳......الاسلام:

دو ابواب پر مشتمل ہے: الحکمۃ اور الکتاب، میزان کا خلاصہ ہے، ۱۸۷ رصفحات پر مشتمل ہے۔

۴......برہان: نہایت قابل گرفت کتاب ہے، اس کتاب میں ان چیزوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جن میں غامدی نے دیگر علماء سے اختلاف کیا ہے اور خود اس کے معترف بھی ہیں، اپنی کتاب مقامات میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب ان مباحث کی تنقیح کے لیے خاص ہے جہاں میرا نقطۂ نظر دوسرے علماء سے مختلف ہے۔''

۵......مقامات: برہان اور میزان کے علاوہ جو کچھ لکھا اس کے منتخبات اس کتاب میں جمع ہیں۔

میزان کے متعلق غامدی صاحب صفحہ ۱۵۰ پر یوں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا جو کام میں نے ۱۹۹۰ء بمطابق ۱۴۱۰ھ میں کسی وقت شروع کیا تھا، آج سترہ سال بعد پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ یہ اس پورے دین کا بیان ہے جو خدا کے آخری پیغمبر محمد ﷺ کی وساطت سے انسانیت کو دیا گیا، اسے فقہ وکلام اور فلسفہ وتصوف کی ہر آمیزش سے بالکل الگ کر کے بے کم وکاست اور خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔''

اس کتاب میں دعوے تو اس قدر کیے گئے ہیں کہ شاید کسی محدث نے بھی آج تک نہیں کیے، ہاں! اس قسم کے دعوے پرویز اور غلام احمد قادیانی کے قبیل کے لوگوں نے بہت کیے، میں نے بحیثیت ایک ادنیٰ طالب علم کے اس کے صرف ایک باب: ''مبادی تدبر سنت'' پر کلام کیا ہے، میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا؟ یہ فیصلہ قارئین اور میرے قابل قدر اساتذہ ہی کر سکتے ہیں۔ (محترم قیصرانی صاحب کا ''غامدی کا تصورِ سنت'' نامی مضمون اِن شاء اللہ ''غامدی نمبر'' کی دوسری جلد میں یا ''مجموعہ مقالات'' میں

شائع کیا جائے گا۔[ادارہ]

غامدی صاحب کی یہ خودنوشت سوانح ''مقامات'' کے صفحہ نمبر ۱۳ تا ۱۳۱ ر پھیلی ہوئی ہے، ان ایک صد سے زیادہ صفحات میں پیش کیے گئے مواد کے مطابق موصوف نے نہ تو کسی نامور دینی درسگاہ میں تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی علمی شخصیت کے سامنے دوزانو ہوئے، بلکہ غامدی میاں کی حیات برگ آوارہ کی طرح چند جدت پسندوں اور لائبریریوں کی مرہون منت رہی اور فرنگی تعلیم بی اے آنرز انگریزی ادب کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچی۔ اب ایک ایسا شخص جس نے عربی ادب وتعلیم کی گرد تک کو نہیں پایا، لے دے کے پند نامہ اور شرح جامی ایک گمنام مولوی صاحب سے پڑھیں، وہ بھی نامکمل۔ اور نہ ہی کسی علمی خاندان کے خانوادے ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ لوگوں کو دھوکا دینے کی غرض سے اس وقت کے چیدہ چیدہ علماء کے نام لکھے ہیں، جن سے بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لگی کہ شاید یہ غامدی صاحب کے اساتذہ ہیں۔ آیئے! اب اس ڈھول کا پول وا کیے دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

> ''اس زمانے کا لاہور خود ایک جہانِ علم تھا، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا حنیف ندوی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر برہان احمد صدیقی، پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر یوسف سلیم، فیض احمد فیض، شورش کاشمیری، حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی جیسے اساطین علم وادب زندہ تھے اور آدمی جب چاہے ان سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوسکتا تھا۔''

اس پیراگراف میں کہیں سے بھی یہ تاثر نہیں ملتا کہ ان حضرات سے کوئی علم حاصل کیا ہو، صرف استفادہ کی بات کی ہے اور وہ بھی اتنی کہ ''حاضر ہوسکتا تھا۔'' بس! پھر ان میں ایک آدھ کے علاوہ سب ادارہائے فرنگ کے رجال ہیں، اہل علم حضرات ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لہٰذا اب یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ صرف استفادے کے احتمال سے آدمی کس طرح محدث ومحقق بن سکتا ہے؟ یہ نسخہ اکسیر صرف غامدی صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔

غامدی صاحب شہرت وعزت وجاہ کے چکر میں لائبریریوں کے چکر کاٹ کاٹ کر جدت پسندوں کی تصنیفات سے مستفیض ہوتے رہے اور اپنے عقل کل ہونے کا اعلان کرکے مجدد بن کر دین اسلام کی وہ تعبیر پیش کرنے لگے جو آج تک ان کے استاذ امین احسن اصلاحی بھی پیش نہ کرسکے اور نہ کسی اور جدت پسند کو اس کی ہمت ہوئی۔

☆......☆......☆......☆

مولانا کمال الدین المسترشد، کراچی

مکر وفریب کا فتنہ

حامدًا ومصلیًا

دین اسلام وسطِ معمورہ میں نمودار ہونے والے مذاہب میں وہ مذہب ہے جو دین سماوی کی کامل ترین ہیئت ترکیبی ہے، آدم تا ایں دم جتنے مذاہب عالم بالا سے زمین پر نازل کیے گئے ہیں وہ انسانی ارتقا کے ساتھ ساتھ اپنی آخری شکل اور نقطۂ عروج کی طرف مسلسل بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ختم الرسل کے عہد پاک میں اس کی تمام کڑیاں پوری ہوگئیں اور جتنی جڑیں پھیل سکتی تھیں اور شاخیں سایہ فگن ہوسکتی تھیں ہوگئیں اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا گیا:

''الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا''

بلاشبہ یہ ایک زریں دور تھا اور پر مسرت موقعہ تھا کہ انسان ہزاروں سال بعد دینِ حق کی سب سے اونچی چوٹی پر فائز ہوا اور اللہ رب العزت کے منتخب مذہب کے قلعہ کوہ کو سر کرنے میں کامیاب ہوا۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ ہر دور کی طرح اِس عہد پاک میں بھی اَطراف عالم اور اکنافِ معمورہ پر ایسے لوگ نہ صرف آباد تھے بلکہ سرگرم تھے کہ'' یریدون لیطفئوا نور اللہ بأفواھھم، واللہ متم نورہ ولو کرہ الکفرون'' وہ چاہتے (تھے) ہیں کہ اللہ کی روشنی (دینِ اسلام) اپنے منہ (اعتراضات، تلبیسات اور شبہات ڈالنے) سے بجھادیں جبکہ اللہ کو اپنی روشنی پوری کرنی ہے گو کہ منکر برا مانیں۔[الصف:۸]

غرض ہمیشہ کی طرح یہاں سے بھی اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطان کے مابین معرکہ آرائی کے لیے نئی صف بندی ہونے لگی، اور نتیجۂ ایک ایسی جنگ چھڑ گئی جو آج تک ختم ہونے کا نام لینا تو کیا بلکہ مسلسل مشتعل ہورہی ہے، یہ جنگ بیک وقت کئی محاذوں پر لڑی جارہی ہے، عسکری میدانِ جنگ کے علاوہ تہذیبی، ثقافتی، قومی، لسانی وغیرہ میادین ہر وقت گرم رہتے ہیں۔ لیکن اس وقت جو میدان زیرِ بحث ہے وہ کاغذ کے میدان میں قلم کی کمانڈ میں استدلالات کے لشکروں کے درمیان ہونے والی جنگ ہے اور اگر اس کے ساتھ میڈیا کے زمینی وفضائی حملے بھی شامل کیے جائیں تو اس جنگ کا دائرہ مزید وسیع ہوجاتا ہے۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ ایک دشمن دوسرے دشمن کو ڈرانے دھمکانے اور زیادہ سے زیادہ خوف زدہ کرنے کے لیے ہر قسم کا حربہ استعمال کرتا، حتی کہ دشمن فوجیوں میں جن کو گرفتار کیا جاتا، اُن کے سرتنوں

سے قلم کر دیے جاتے اور نیزوں پر نصب کر کے قلعوں کی فصیلوں پر قطار میں منصوب کر دیے جاتے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام مخالف قوتوں نے یہ طریقہ ترک کرنے کو اپنی ترجیحات میں شامل کر دیا اور ایک نئی شکل اختیار کرنے پر اتفاق کیا، ان لوگوں نے اپنے پنجے چھپا کر نرم ملائم کھال سے پنجوں کو آراستہ کیا اور ڈرانے دھمکانے کے الفاظ کے بجائے امن وآشتی کے کلمات کو اپنی اصطلاح کا محور بنا دیا، تاکہ جن مسلمانوں کو عسکری میدان میں شکست نہیں دی جا سکی، اُن کو الفاظ کے تیروں سے نشانہ بنا دیا جائے یا فریب کے جال میں پھنسا دیا جائے۔

دوسری طرف جب مشرقِ وسطی میں تاتاری داخل ہوئے تو انہوں نے تمام اسلامی کتب خانوں کو یا تو جلا دیا یا پھر انہیں دریائے دجلہ کے حوالے کر دیا، مگر مغرب سے آنے والوں نے بہت سارا کتبی ذخیرہ اور علمی سرمایہ بچا کر مغرب منتقل کر دیا اور اس پر حیران کن حد تک کام کیا، اس خزانہ کا راز معلوم کرنے کے لیے انہوں نے ادارے قائم کئے، ماہرین تیار کیے، انہیں عربی سکھائی اور فلسفہ کے ماہرین بنا کر ان کے ذمے یہ کام لگا دیا کہ جو مطلب کی باتیں ہیں وہ اِس خزانے سے نکالی جائیں۔

اُن کے مطلب کی باتیں دو طرح کی تھیں: ایک وہ جو اُن کو دینوی مقاصد میں کامیابی سے ہمکنار کر دیں۔ دوم: وہ جو مسلمانوں کے دین میں کسی طرح شبہات اور تفریق ڈالنے میں مفید ثابت ہو سکتی ہیں، چنانچہ اِن دونوں زاویوں سے کام شروع ہوا اور سینکڑوں سالوں کی جدوجہد کے بعد وہ اپنے دونوں مقاصد میں کامیاب ہوئے، انہوں نے اسلامی طرزِ زندگی، معاشیات، قضایا اور دیگر لاتعداد اصول کو اپنایا اور جہاں جہاں کوئی بات ایسی ہو سکتی تھی جو اگر سیاق وسباق سے کاٹ کر پیش کی جائے، یا اگر وہ صغریٰ ہے تو اس کے ساتھ اپنا کبریٰ ملا لیا جائے، یا اگر وہ کبریٰ ہے تو اس کے ساتھ خود ساختہ صغریٰ ضم کیا جائے تو نتیجہ اُن کے حق میں نکل سکتا ہے تو ایسی باتوں کو الگ کر کے بڑے پیمانے پر اُن کے لیے اسلامی یونیورسٹیوں کے نام پر ایسی فیکٹریاں بنا دی گئیں جہاں ایسے لوگ تیار ہوں جو برائے نام مسلمان ہوں اور برائے کام شیطان ہوں۔

ایسے افراد تیار کرنے کے بعد اُن کی مالی واخلاقی مدد کی جاتی ہے، میڈیا پر اُن کو مشتہر کیا جاتا ہے اور اونچی سوسائٹیوں سے اُن کے کام کا آغاز کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے کام کا طریقہ کچھ اِس طرح ہوتا ہے کہ پہلے شریعت کے متعلق اچھی شروعات کرتے ہیں، دلائل عقلیہ، منطقی طرزِ استدلال اور فلسفیانہ کلام کے ذریعہ لوگوں کے اذہان مسحور بناتے ہیں اور جب ان کا شجرۂ خبیثہ کسی حد تک اپنی جڑیں مضبوط کر لیتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ اپنے تلخ ثمرات مختلف رنگوں میں اور مختلف موسموں میں ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہیں، کسی مجلس میں ایک بات کہی اور کسی میں دوسری، اگر ایک جگہ کچھ مشکلات نظر آئیں، تو وہاں نرمی دکھا دی اور جہاں اپنے

عقیدت مندوں میں بیٹھ گئے تو وہاں چہرے سے نقاب ہٹا کر اصل روپ ظاہر کر دیا۔

یہی حال ان کے لکھنے کا بھی ہے کہ ایک ایڈیشن میں ایک نظریہ اُگل دیا اور دوسرے میں اس کی شکل بدل کر نیا راستہ اپنایا، یوں لگتا ہے کہ ان کے سامنے بیک وقت کئی اہداف ہوتے ہیں: ۱۔ اسلام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں کو شبہات سے بھرنا۔ ۲۔ اسلاف امت پر سے اعتماد اٹھانا۔ ۳۔ احادیث کا استدلالی مقام ختم کرنا۔ ۴۔ مفید مطلب احادیث سے برائے نام استدلال کرنا تا کہ انکارِ حدیث کے الزام سے بچ سکیں، اس مقصد کے لیے تمام اہلِ زیغ کا طریقہ کار مشترک طور پر توارث سے جو چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ متشابہات کو بنیاد بناتے ہیں اور محکمات کو رد کرتے ہیں۔ ۵۔ ان اصول کو غلط ثابت کرنا یا کم از کم بے حیثیت قرار دینا جن کو علمائے اسلام نے بڑی محنت اور مہارت و دیانت سے مرتب کیا ہے، جیسے: اُصولِ تفسیر، اُصولِ حدیث، اُصولِ فقہ اور اصولِ عربیت وغیرہ۔ ۶۔ اجتہاد و تدبر کے نام پر عوام کو آزادی دینا تا کہ وہ اپنی دانش سے اسلامی جو تشریح کرنا چاہیں سو کر لیں، یہ عوام کو باور کراتے ہیں کہ اس میں علما کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں، یہ مولویوں کا ٹھیکہ نہیں ہے اور نہ ہی کسی کی جاگیر ہے، سب لوگ برابر کے مسلمان ہیں، علماء تو انگریزی نہیں جانتے وہ اسلام کی کیا تشریح کریں گے؟ ان کی تشریحات غلط ہیں (والعیاذ باللہ) ۷۔ اور میرے خیال میں ایک اہم ہدف یہ بھی ہے کہ اپنے رنگ گرگٹ کی طرح بدل بدل کر علماء کو اتنا تھکا دیا جائے کہ وہ ان کے شکار میں اپنی زندگیاں گذار کر دوسرے کاموں کے قابل نہ رہیں۔

چنانچہ اب تک جتنے روشن خیال لکھاری آئے ہیں انہوں نے ایسا ہی کیا ہے کہ وہ ایک ایڈیشن میں کچھ واہیات لکھ دیتے ہیں، علماء ان کا تعاقب کرتے ہیں تو وہ نیا ایڈیشن شائع کر کے پہلی باتوں سے توبہ اور رجوع کیے بغیر نئی عبارات ضم کر دیتے ہیں اور یہ سلسلہ تا مرگ جاری رہتا ہے۔

راقم نے غامدی کے اصول و مبادی پر کام کر کے "تجدد پسندوں کے افکار کا جائزہ" نامی کتاب لکھی تھی، مگر اب حال ہی میں جب "میزان" کا ایڈیشن ۲۰۱۴ء دیکھا تو وہ پہلی عبارت جو اصول و مبادی ۲۰۰۶ء کے ایڈیشن میں تھی، بہت مختلف پائی، اِسی پر باقی تلبیسات کو قیاس کیا جائے اور فیصلہ کیا جائے۔ قارئین کی تسلی کے لیے یہاں دونوں ایڈیشنوں کی عبارات پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے اصول و مبادی طبع دوم ستمبر ۲۰۰۶ء ناشر المورد کی عبارت ملاحظہ ہو:

"دین لاریب اِنھی دو صورتوں میں ہے، اِن کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اُسے دین قرار دیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم "حدیث" کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی

درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اِس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا"۔(ص:۱۱)

اوراَب میزان طبع نہم مئی ۲۰۱۴ء کی عبارت پڑھیے:

"دین لاریب اِنھی دوصورتوں میں ہے، اِن کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار آحاد جنھیں بالعموم "حدیث" کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ ان کی تبلیغ وحفاظت کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ چاہیں تو انھیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں۔"(ص:۱۵)

قارئین! آپ نے دیکھا کہ پہلی عبارت اور دوسری عبارت میں کتنا فرق ہے؟ اور یوں لگ رہا ہے کہ ان کے آگے کوئی مقصد نہیں ہے، یہ لوگ کسی دلیل کے تابع نہیں، اگر اِن کا کوئی مقصد ہے تو صرف اور صرف دین کو مشتبہ اور متنازعہ بناتا ہے۔

یہاں یہ موضوع ہمارے پیشِ نظر نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث کی تبلیغ اور ان کی حفاظت کی کتنی ترغیب دی ہے اور کتنا اہتمام فرمایا ہے۔ اگر کسی کو اس بارے میں شبہ اور شک ہو تو وہ ایسی احادیث تمام کتبِ حدیث میں دیکھ سکتا ہے، کہ بلا استثناء تمام محدثین نے اپنی اپنی کتابوں میں کتاب العلم اور کتابتِ حدیث کے نام سے مستقل ابواب قائم کیے ہیں، جن میں ایسی ترغیبی احادیث صحیح اسانید کے ساتھ مروی ہیں۔ بخاری جلد اول کتاب العلم میں آپ کا فتحِ مکہ کے موقع پر دیا جانے والا خطبہ بھی مروی ہے جس میں ہے:"ولیبلغ الشاھد الغائب" اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ بھی مروی ہے، جو تمام محدثین اور اصحاب سیر نے تواتر سے نقل کیا ہے، جس کے آخر میں آپ علیہ السلام بڑے اہتمام اور تاکیدی کلمات کے ساتھ فرماتے ہیں:"ألا! لیبلغ الشاھدمنکم الغائب" صحیح بخاری ،باب لیبلغ العلم الشاھد الغائب الخ (۲۱/۱ قدیمی کتب خانہ)

بات لمبی ہو جائے گی، اِس لیے اِنھی ایک دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں اور اپنی بات کی طرف واپس آتا ہوں، ابن جوزی رحمہ اللہ نے عندی تحقیق کرنے والوں کے متعلق کیا خوب لکھا ہے:

"فجاء أقوام فاظھروا التزھد، وابتکروا طریقۃ زینھا لھم الھویٰ، ثم تطلبوا لھا الدلیل، وانما ینبغی للانسان أن یتبع الدلیل، لا أن یتبع طریقًا ویتطلب دلیلھا".(صید الخاطر، ص ۱۴۰دار الفکر)

یعنی ہونا یہ چاہیے کہ آدمی دلیل کی پیروی کرے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی راستہ پہلے بنائے اور پھر اُس کے حق میں دلیل ڈھونڈتا رہے۔

آج کل کے جتنے فتنہ انگیز لوگ ہیں، ان سب کا حال یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوئی بدعت اور فکر یا دینِ اسلام سے متصادم کوئی راستہ اپنا لیتے ہیں اور پھر اس کی ترویج وتزیین اور تسویل کے لیے تاویلات وحیل کا دروازہ کھولتے ہیں اور تحقیق کے نام پر تلفیق کر کے مسلمانوں کے عقائد متزلزل بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میری غامدی صاحب سے ایک ملاقات ہوئی ہے، میں نے ان سے پوچھا: آپ کیوں دینِ ابراہیمی کی بات کرتے ہیں؟ حالانکہ ہمارے پاس تو اس کی اکمل ترین صورت میں دینِ محمدی واسلام مصطفوی موجود ہے؟

انہوں نے جواب میں کہا کہ:

میں صدر پرویز مشرف کو کیا جواب دوں......؟؟؟

قارئینِ گرامی! آپ اِس جملے پر غور کریں کہ اِس میں کتنی گہرائی ہے؟ اِس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ایک ایسا انٹرنیشنل مذہب بنایا جائے جو یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔

کیا بات ہے اِس احمقانہ فلسفے کی کہ مذاہب ایک معجون اور اَچار بنالیا جائے، جس کے اندر یہودیت ونصرانیت بھی ہو اور برائے نام اِسلامی تعلیمات کی جھلک بھی ہو، اَکبر بادشاہ نے بھی ایسی کوشش کی تھی تاکہ رعایا میں اتحاد ہو اور دنیا میں امن ہو، اِس لیے کہا تھا کہ جو بُت کو سجدہ نہ کرے وہ مسلمان نہیں، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ اَمن کے اتنے بڑے عُشاق ہیں کہ اگر یہود ونصاریٰ اور ہندو وغیرہ اپنے اپنے مذاہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو چلیں ہم یہ خدمات انجام دیتے ہیں کہ اگر اِسلام نہ رہے تو اَمن تو آجائے، اِس بدیہی احمقانہ تصور پر اِنسان تبصرہ کرے بھی تو کیا کرے؟

دنیا کو اَمن کی کتنی ضرورت ہے اور امن اور اِتحاد انسان کی کتنی ضرورت ہیں، یہ سوال اپنی جگہ......لیکن آیا اَمن واتحاد ہر حال میں قائم رکھنا چاہیے؟ اِس کے لیے خواہ مذہب کو برباد کرنا پڑے اور آخرت کو تباہ کرنا پڑے؟ اور اگر دوسرے لوگ اپنے ہی ایجنڈے کے جھنڈے تلے ہم سے اَمن کا مطالبہ کریں تو ہم آنکھیں بند کر کے اس جھنڈے کو خود تھام لیں؟ وغیرہ وغیرہ یہ سوال بھی بہت اہم ہے، حالانکہ یہاں بات ان سے اتحاد قائم کرنے کی نہیں اور نہ ہی یہ ہاتھی کے کھانے کے دانت ہیں، اصل ایجنڈا اِسلام کو بدنام کرنا، مسلمانوں کے عقائد ونظریات کو متنازعہ بنانا اور یقین نام کی چیز کو جسے ''ایمان'' کہا جاتا ہے، شک میں تبدیل کرنا ہے، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ''اَمن کے نام پر بدامنی وانتشار پھیلانا اور مسلمانوں کو بدنام کرنا'' اِن کا سب سے بڑا ہدف ہے تو بے جانہ ہوگا۔ آپ غامدی صاحب کے اس

ایک جملے سے اندازہ لگائیے کہ: ''اِن (احادیث) کے بارے میں یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ ان کی تبلیغ وحفاظت کے لیے آپ علیہ السلام نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔''

غامدی صاحب لوگوں کو کیا پیغام دینا چاہتے ہیں؟ ایک صریح جھوٹ کو ''ناقابلِ تردید حقیقت'' کہہ کر آخر غامدی کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا یہ حدیث کی تردید اور اس کی اہمیت کو ختم کرنے کی ناپاک جسارت نہیں؟؟......اور پھر جب احادیث کو بزعم خود مٹادیں گے تو قرآن کی تفسیر کے نام پر جیسے چاہیں تشریح کریں اور ایک ایسا اِسلام منظرِ عام پر لائیں جو یہود وہنود اور نصاریٰ اور تمام سیکولرز کے لیے یکساں قابلِ قبول ہو یعنی جو دینِ اکبری کی جدید شکل ہو!!

ایسے لوگوں کا خاصہ یہ ہے کہ یہ علماء کی اصلاحی تنقید لاعلمی پر محمول کرتے ہیں، جس سے اِن کے ارادوں کا علم نمایاں طور پر ہوجاتا ہے کہ یہ لوگ نہ اپنی اصلاح کی فکر کرتے ہیں اور نہ دوسروں کی، بلکہ صرف اپنا نام بلند مقام پر لے جانا چاہتے ہیں کہ اس سے حُب مال وحُبّ جاہ کے مقاصد پورے ہوجاتے ہیں۔ اِس لیے اہلِ علم اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ اِن پر تنقید کرنے سے شاید یہ لوگ اپنی حرکات سے باز آجائیں تو یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی، اَلبتہ عوام اور سادہ لوح مسلمانوں کو آگاہ رکھنا ایک اسلامی اور دینی وعلمی فریضہ ہے، جو ہر دور کی طرح آج کے علماء پر بھاری ذمہ داری کی حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔

علماء کو چاہیے کہ اپنے زورِ قلم، زورِ خطابت اور اخلاص وتقویٰ کی طاقت سے ایسی تلبیسات کا راستہ روکے رکھیں اور عوام کو باور کرائیں کہ وہ ہر کس وناکس کی بات نہ سنیں اور بغیر استاذ کے استاذ بننے کی کوشش کرنے والوں کے بارے میں یقین رکھیں کہ ان کی تعلیمات کبھی بھی صحیح منزل کی راہنمائی نہیں کرسکتیں، ان سے سوائے تاوان وخسران کے کچھ ملنے والا نہیں۔ امت کا تعامل اِسی پر رہا ہے کہ جو علم اُس سند سے متصل ہو جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آج تک متداول ہے، بس وہی قابلِ بھروسہ اور قابلِ تقلید ہے، اِس کے علاوہ عندی تحقیقات کسی طرح مستند نہیں، تاریخ ناطق ہے کہ جن لوگوں نے سوادِ اعظم کے علاوہ جتنے راستے اختیار کیے ہیں وہ الگ الگ فرقوں میں منقسم ہوکر خود بھی تباہ ہوئے ہیں اور اپنے پیروؤں کو بھی لے ڈوبے ہیں۔

☆......☆......☆......☆

ڈاکٹر خالد جامعی، ڈائریکٹر شعبہ تصنیف، جامعہ کراچی

جناب جاوید غامدی صاحب کی دین فہمی

اور اُن کے خودساختہ اُصول

(ایک نظر میں)

''جناب غامدی صاحب کی دین فہمی اور اُن کے خودساختہ اُصول'' جامعہ کراچی کے شعبۂ تصنیف کے ڈائریکٹر سید خالد جامعی صاحب نے جمع وترتیب دیئے ہیں، جس میں غامدی صاحب کی مختلف تحریرات وتقریرات کے ذریعہ ان کی فکری بے راہ روی کو خود اُن کے پیش کردہ شواہد وقواعد سے شریعت وحقیقت سے جدا بتایا ہے۔ قارئین کو یہ فکر وتدبر کا موقع دیا گیا ہے کہ جس انسان کی فکر اس قدر غیر متوازن ہو کہ اُسے خود اپنے کیے اور کہے پر گرفت نہ ہو، اُس کی دین فہمی اور شریعت بیانی کس پائے کی ہوگی؟ اور اُس کے مخزنِ فکر کی طبی حالت کیا ہوسکتی ہے؟ غور کا مقام ہے۔ موصوف صاحب قلم کی یہ بنیادی فکر، غامدی صاحب کے ذکری اضطراب کی زد میں آنے والے مسلمان بھائیوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

۱:......کسی فکر کی درستگی کا پیمانہ، اصول، منہاج، فرقان، دینی فکر اُمت کی علمی روایت سے مطابقت رکھتی ہو اور امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہو۔

(پرویز صاحب کا فہم قرآن، غامدی صاحب کی تقریر، ص:۴۸۔ دارالتذکیر ۲۰۰۴ء)

۲:......سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔ (میزان ص:۵۲، طبع دوم ۲۰۰۲ء)۔

۳:......قرآن کی دعوت جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے ۱:......دین فطرت کے حقائق۔ ۲:......سنت ابراہیمی۔ ۳:......اور قدیم صحائف ہیں۔ (میزان ص:۴۸ طبع دوم ۲۰۰۲ء)

(یعنی چوتھے نمبر پر قرآن آئے گا اور فطرتِ انسانی ماخذ شریعت ہے)۔

۴:......خیر وشر کی کسوٹی انسان: دین میں معروف ومنکر کا تعین فطرتِ انسانی کرتی ہے۔ (میزان ص:۴۸، ۴۹، طبع دوم ۲۰۰۲ء) یعنی انسان شارع ہے۔

۵:......نیا اصول: نبی کی رحلت کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(اشراق دسمبر ۲۰۰۰ ء ص:۵۴۔۵۵ بحوالہ غامدی صاحب کا مذہب کیا ہے؟ رفیق اختر)

۶:......شارع فرد خود ہے، زکوۃ کا نصاب منصوص اور مقرر نہیں ہے۔

(قانونِ عبادات، ص:۱۱۹، طبع اپریل ۲۰۰۵ء)

۷:......واحد ماخذ: ''دین کا تنہا ماخذ اس زمین پر اب محمد کی ذات والا صفات ہے''۔

(میزان، ص:۹، طبع دوم ۲۰۰۲ء)

۸:......دین کے ماخذ دو ہیں: ۱:......قرآن مجید۔ ۲:......سنت۔ (میزان، ص:۹، طبع دوم ۲۰۰۲ء)

۹:......فطرت شارع ہے۔ حلال وحرام جانور کا تعین فطرت انسانی کرتی ہے، اسی لئے شیر، چیتے، ہاتھی، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دستر خوان کی لذت کے لئے نہیں، یہ سواری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ (میزان، ص:۳۷ محولہ بالا)۔ (حضور ﷺ اونٹ کیوں کھاتے تھے؟ یہ تو سواری کا اصل جانور ہے؟؟؟) نشہ آور چیزوں کی غلاظت کو سمجھنے میں بھی اس کی عقل عام طور پر صحیح نتیجے پر پہنچتی ہے، چنانچہ خدا کی شریعت نے اس معاملے میں انسان کو اصلاً اس کی فطرت ہی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا ہے، انسان کی فطرت کبھی کبھی مسخ ہو جاتی ہے، لیکن ان کی ایک بڑی تعداد اس معاملے میں بالعموم غلطی نہیں کرتی۔ (میزان، ص:۳۱۰)

۱۰:......عقل وفطرت کامل رہنما نہیں: ''کچھ جانوروں کی حلت وحرمت کا فیصلہ تنہا عقل وفطرت کی رہنمائی میں انسان کے لئے ممکن نہیں، لہٰذا ان کی ممانعت شریعت نے کی ہے''۔

(میزان، ص:۳۷، طبع دوم ۲۰۰۲ء)

۱۱:......تغیر دوامی: ''اصول دین کے ماخذات مستقل نہیں ہوتے، متغیر ہوتے ہیں۔ ان میں اصلاح، کمی بیشی، ترمیم وتنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے، رہ سکتا ہے، ماخذات کے لئے معین اصطلاحات لفظاً ظاہراً مستقل ہوتی ہیں، جیسے قرآن وسنت، لیکن ان کے مطالب ومفاہیم بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں''۔ (اس اصول کے لئے جناب غامدی صاحب کی درج ذیل کتب کا تقابلی مطالعہ کیجئے: میزان، جلد اول ۱۹۸۵ء۔ میزان، طبع دوم، اپریل ۲۰۰۲ء۔ اصول ومبادی ۲۰۰۰ء۔ میزان ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء، مقامات ۲۰۰۶ء۔ مقامات ۲۰۰۸ء۔ قانونِ دعوت ۱۹۹۶ء۔ پرویز صاحب کا فہم قرآن، خطاب جاوید غامدی، ۲۰۰۴ء دار التذکیر، لاہور۔ اس کے سوا بقیہ کتب غامدی صاحب نے خود شائع کی ہیں۔)

۱۲:......اصل الاصول ارتقاء: غامدی صاحب کے یہاں ماخذات دین میں تغیر وتبدل کا اصول فہم کا ارتقاء ہے۔ جب بھی کوئی خیر، حق واضح ہو جائے گا، اس سے رجوع کر لیا جائے گا۔ اس اصول کے تحت سنت

میں پہلے داڑھی شامل تھی، پھر وہ نکل گئی۔ سنتیں ۱۹۹۷ء میں ۲۷ تھیں۔ (اسلام کیا ہے؟) دانش سرا کے صدر ڈاکٹر فاروق کی کتاب اشاعت ۱۹۹۹ء میں سنتوں کی تعداد ۳۹ ہے۔ اصول ومبادی مقدمہ میزان تالیف غامدی صاحب سن ۲۰۰۰ء میں سنتوں کی تعداد چالیس ہے۔ میزان طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء میں سنتوں کی تعداد صرف ۲۷ ہے۔ جون ۱۹۹۱ء کے اشراق ص: ۳۲ کے مطابق داڑھی بھی سنت تھی۔ ۱۹۹۷ء، ۱۹۹۹، ۲۰۰۰ء، ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ء میں داڑھی سنت سے نکل گئی۔ مئی ۱۹۹۸ء اشراق ص: ۳۵ پر سنتوں کی تعداد چالیس تھی۔ فروری ۲۰۰۵ء میں اصول ومبادی طبع ہوئی تو اس میں سنتوں کی تعداد صرف ۱۸ رہ گئی، پھر ۲۶ ہوگئی، سنتوں کی تعداد نہایت تیزی سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے، اس کی کوئی دلیل بھی ہماری نظر سے نہیں گزری۔

''میزان''، ''اصول ومبادی''، ''سنت کیا ہے؟'' جیسے تمام کتابچوں اور اشاعتوں میں ۱۹۹۷ء سے لے کر ۲۰۰۸ء تک نومولود کے کان میں اذان کو سنت شمار کیا گیا تھا، لیکن جب عامر گزدر صاحب نے مؤطا امام مالکؒ سے اس کی کراہت کی دلیل پیش کی اور معز امجد اور خالد ظہیر صاحب نے بھی اس دلیل سے اتفاق کیا تو غامدی صاحب نے میزان ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں اس سنت کو بھی خارج کر دیا، لیکن ارتقاء کے اصول کا ماخذ معلوم نہیں ہوسکا۔

غامدی صاحب کو اس سلسلے میں مدیر ساحل نے ان کے فلسفۂ ارتقاء پر ایک خط لکھا جو ساحل میں شائع ہوا، مگر انہوں نے اس کا جواب نہیں دیا، لیکن ارتقاء کا اصول ان کے یہاں اصل الاصول ہے، مثلاً حدود وتعزیرات طبع اول، اگست ۱۹۹۵ء میں ص: ۱۱ پر غامدی صاحب نے خدا اور اس کے پیغمبروں کے بارے میں سب وشتم کو محاربہ اور فساد فی الارض کے زمرے میں شامل کیا تھا اور مجرموں کو واجب القتل قرار دیا تھا، لیکن میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء میں محاربہ اور فساد فی الارض کے جرائم کی فہرست میں سے غامدی صاحب نے شتم خدا اور رسول کو فہرست سے ہی خارج کر دیا ہے۔ میزان ۲۰۰۸ء میں بھی یہ جرائم جدید فہرست سے خارج ہی رہے، مگر اشراق مئی جون ۲۰۱۱ء میں دوبارہ توہین رسالت کی سزائے قتل کو محاربہ اور فساد فی الارض کے زمرے میں شامل کر دیا، مگر توہین خدا کے بارے میں حضرت والا نے کوئی رائے نہیں دی۔

مسجد میں حاکم کا خطبہ سنت تھا، نبیؐ نے جو سنت ان کے بارے میں (ہماری مسجدیں) قائم کی، وہ یہ تھی کہ نماز جمعہ کا خطاب اور اس کی امامت امیر ریاست اور اس کے عمال کریں گے۔ (ص: ۱۸۷، مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء) اس سنت کا ذکر میزان ۲۰۰۸ء، ۲۰۰۹ء میں سنتوں کی فہرست میں نہیں ہے، ارتقاء ہوگیا یا رجوع۔ وہ لکھتے ہیں کہ قرآن وسنت کی رو سے ان (غیر مسلم شہری) کی دو واضح اقسام ہیں: ایک ذمی، دوسرے معاہد۔ (مقامات، ص: ۱۳۳، ۲۰۰۶ء) بعد میں سنتوں کی فہرست سے ذمی معاہد

کا ذکر غائب ہے۔ اسی طرح بیعت، دعوت، ہجرت، حدود و تعزیرات بھی پہلے قرآن و سنت کے دائرے میں داخل تھے، بعد میں سنت کے دائرے سے خارج ہو گئے۔

۱۳:...... پہلا ماخذ: ''دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے، قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث و سنت ہے۔ دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں''۔ [مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷۸، المورد لاہور]

۱۴:...... قرآن کی ایک آیت کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے، ایک سے زیادہ مطالب ہوں تو قرآن چیستان بن جائے گا۔ (برہان ۱۹۹۲ء، برہان ۲۰۰۶ء، میں طاہر القادری صاحب پر تنقید کا مطالعہ کیجئے، جہاں اس دلیل کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے)۔

غامدی صاحب ۲۰۰۶ء تک اقدامی جہاد کے قائل تھے، اس کی دلیل قرآن سے لاتے تھے۔ (دین حق، ص: ۲۰ ستمبر ۲۰۰۶ء المورد، لاہور) بعد میں اقدامی جہاد قرآن کی جدید تشریح کے باعث ختم ہو گیا۔

المورد کے زیر اہتمام ۱۹۹۷ء میں شائع شدہ کتابچے قانون معیشت میں ص: ۵۶ پر غامدی صاحب کا موقف تھا کہ ''اللہ کی طرف سے وارثوں کے حصے متعین ہونے کے بعد کسی وارث کے لئے وصیت اب جائز نہیں، ورثاء کے بارے میں مبنی بر عدل قانون وہی ہے جو اس نے خود بیان فرمایا (یعنی غیر وارث کے لئے وصیت کی جا سکتی ہے، لیکن اس سے متعین وارث پر اثر نہیں پڑے گا) یہاں علتِ حکم منفعت ہے، اگر وارث و مورث میں سے کوئی دین بدل لے اور وارث اپنے مورث کو قتل کر ڈالے تو منفعت کا قاعدہ لاگو نہ ہوگا۔ (لیکن قرآن و حدیث و سنت سے اس استدلال کے بعد اب مقامات ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ مورث کسی کے حق میں بھی پوری جائیداد کی وصیت کر سکتا ہے) قرآن نے وصیت کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی، جائیداد وصیت پوری کرنے کے بعد تقسیم کی جائے گی، لہٰذا وصیت کی حد پر قرآن کی آیت کی روشنی میں پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ (ص: ۱۴۱ مقامات، ۲۰۰۸ء) حتیٰ کہ وارثوں کے حق میں بھی ان کی ضرورت، خدمت یا اسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو وصیت یقیناً ہو سکتی ہے، مثلاً بچوں میں سے کسی نے والدین کی زیادہ خدمت کی، کوئی بچہ اپنے پیر پر کھڑا نہیں ہے۔ وصیت وارثوں کے حق میں بھی ہو سکتی ہے، اس میں کوئی چیز مانع نہیں۔ (ص: ۱۴۲، مقامات ۲۰۰۸ء)

پہلے قرآن کی ہی آیت سے وارث کے حق میں وصیت کا انکار کیا گیا اور سنت اور اجماع کی روشنی میں وصیت کی تحدید کی گئی، اب اسی آیت سے ورائے حدود وصیت کا حکم ثابت کر دیا گیا کہ کل جائیداد کسی کو بھی دے دو --- ورثاء کو محروم کر دو ---

احکاماتِ حجاب کے سلسلے میں بھی قرآن کی آیتِ حجاب کے معانی بدلتے رہے ہیں۔(تفصیلات کے لئے میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، اشراق کی فائلیں، تقاریر، ڈاکٹر فاروق خان کی کتابیں، اسلام کیا ہے؟ وغیرہ پڑھ لیجئے)

ایک ہی آیت سے مختلف احکامات اخذ کئے جا رہے ہیں اور امام اصلاحی کی تشریحات کو بھی قبول نہیں کیا جا رہا ہے۔۱۹۹۲ء میں وہ حجاب کے قائل تھے، لکھتے ہیں: چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان میں وہ قرآن مجید کی صریح ہدایت کے مطابق سر کی اوڑھنی سے اپنا سینہ ڈھانپ کر اور زیب و زینت کی نمائش کئے بغیر ہی سامنے آتی ہے۔(برہان ص:۹۳)

۱۹۹۲ء میں سر کی اوڑھنی اور اس سے سینہ ڈھانپنا قرآن سے ثابت تھا، ۲۰۰۸ء میں مقامات کی نئی اشاعت میں اوڑھنی قرآن سے ہی غیر ثابت ہوگئی اور صرف اسلامی روایت کی شکل رہ گئی۔ جب غامدی صاحب اپنے ہی اصول کے برعکس قرآن کی ایک ہی آیت سے مختلف مفاہیم نکال رہے ہیں تو قرآن چیستان بن گیا، چیستان ماخذ دین کیسے ہوسکتا ہے؟۔

۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اول میں رضاعت کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے خواتین کے پردے پر قرآن کی آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ سورۂ نور میں پردے کے احکامات عام عورتوں پر گھر میں نافذ العمل ہوں گے، بعد میں ان آیات کا مفہوم ہی بدل گیا۔۱۹۷۵ء سے لے کر ۲۰۰۲ء تک غامدی صاحب کا موقف تھا کہ قرآن کریم سے خواتین کے چہرے کا پردہ گھر اور محفوظ مقامات میں نہیں، بلکہ گلی، بازار اور غیر محفوظ مقامات پر ہے۔ان کی تقاریر سن لی جائیں اور ان کے ادارے دانش سرا، دارالاشراق سے شائع ہونے والی کتاب ''اسلام کیا ہے؟'' کی ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۰ء تک کی اشاعتیں پڑھ لیں، سب میں یہی لکھا ہے۔''میزان'' اسی کتاب کی آخری شکل ہے۔''اسلام کیا ہے؟'' کی عبارت، دلائل، الفاظ تک میزان میں حرف بہ حرف موجود ہیں۔

سورۂ نحل کی آیت: ۴۴ سے غامدی صاحب میزان ۲۰۰۸ء، میزان ۲۰۰۲ء، وغیرہ میں سنت ابراہیمی کا وجوب ثابت کر رہے ہیں، جو کبھی ۱۷ ربھی ۲۷ ربھی ۴۰ ربھی ۱۹ اور کبھی ۲۶ رہیں، لیکن برہان ۲۰۰۶ء میں قرآن کی اسی آیت سے وہ ثابت کرتے ہیں کہ رسول کی سنت قرآن کی تبیین کرسکتی ہے، گویا تبیین پیغمبر کی ذمہ داری ہے۔سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے، بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔(ص: ۳۸ تا ۴۱، برہان ۲۰۰۶ء) بعد میں اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سنت دین ابراہیمی کی روایت ہے، سنت سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا ہرگز اضافہ نہیں ہوتا۔(ص: ۱۱، میزان

۲۰۰۲ء) سنت صرف رسوم وآداب کا نام ہے، سنت قرآن سے مقدم ہے، سنت دین ابراہیمی کی روایت کے طور پر عرب میں رائج تھی، چند چیزوں کے سوا آپ نے ان میں کوئی اضافہ نہیں کیا، یہ تواتر عملی سے امت کو منتقل ہوئی ہے، ان کا ماخذ اجماع امت ہے۔ (رسوم وآداب، ص:۳۲۱، میزان ۲۰۰۲ء)

سورۂ نحل کی ایک آیت سے غامدی صاحب نے دو مختلف مطالب اخذ کر لئے تو کیا قرآن ماخذ رہ گیا؟ مقامات ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۸ء میں حکمرانوں کا عام آدمی کا معیار زندگی رکھنا سنت تھا، قانون معیشت ۱۹۹۷ء میں یہ صرف نمونہ رہ گیا، سنت کے دائرے سے خارج ہو گیا۔

(ص:۴۵، قانون معیشت ۱۹۹۷ء المورد، لاہور)

۲۰۰۶ء کے برہان میں وہ لکھتے ہیں: ''قرآن مجید کوئی چیستان نہیں ہے کہ اس کی ہر آیت دو یا تین متضاد مفاہیم کی حامل قرار دی جائے''۔ (ص:۲۵۵، ارباب منہاج القرآن کی خدمت میں)

غامدی صاحب کے اپنے اصول کی زد میں خود غامدی صاحب بھی آ جاتے ہیں۔ غامدی صاحب نے آیت وصیت ومیراث کی تشریح میں لکھا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے وصیت میں ضرر رسانی کو روکنے کے لئے اصل وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیئے ہیں۔ اُس کا بندہ جانتے بوجھتے کسی حق دار کو محروم کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ اس کے ہر فعل سے باخبر ہے۔ (میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء، ص:۵۷، ۵۸) لیکن مقامات ۲۰۰۸ء میں حضرت والا لکھتے ہیں کہ: مورث کسی کو بھی پوری میراث کی وصیت کر سکتا ہے اور متعین وارثوں کے حق میں بھی یا ان کے متعین حصے کے سوا وصیت لکھ سکتا ہے۔ (ارتقاء ہو گیا شاید)

پردہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''رہی حدیث سالم تو اس کی تاویل میرے نزدیک رفع حرج کے اصول پر کی جانی چاہئے''۔ (سالم کی گھر میں آمد پر خواتین کو پردے میں مشکلات پیش آئیں اور سورۂ نور کے احکامات حجاب پر عمل کا مسئلہ پیدا ہوا تو غامدی صاحب اس کی تشریح کر رہے ہیں) کسی گھرانے کی خواتین اگر حجاب کے ان حدود کی پابندی کرنا چاہیں جو سورۂ نور میں بیان کئے گئے ہیں، رفع حرج کے اصول کی بناء پر اسے عام قانون سے مستثنیٰ کیا جائے گا، تاہم یہ بات ملحوظ رہے کہ اس کی حیثیت ایک رخصت کی ہوگی، اصل قانون وہی رہے گا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ [ص:۷۵، میزان ۱۹۸۵ء]

۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۷ء تک غامدی صاحب آیاتِ حجاب، پردہ سے متعلق موضوعات پر اجماع امت، تعاملِ امت کے قائل تھے، اب ان آیات کی نئی تفسیر پیش کرتے ہیں۔ آیت کے دونوں مفہوم بالکل مختلف ہیں۔ خود وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کی ایک آیت کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے، مگر خود کبھی دو، کبھی چار، کبھی سات مطالب بتاتے ہیں۔

طاہر القادری صاحب نے جب قرآن کی ایک آیت کے کئی مطالب بتائے تو غامدی صاحب نے لکھا ''آدمی کی عربی خام ہو اور اس کا ادبی ذوق پست ہو یا وہ سیاق وسباق کی رعایت ملحوظ رکھے بغیر قرآن کی ہر آیت کو الگ الگ کرکے اس کا مدعا سمجھنے کی کوشش کرے تو یہ البتہ ممکن ہے، لیکن عربیت کے کسی جید عالم اور قرآن کے کسی صاحب ذوق شارح سے یہ چیز کبھی صادر نہیں ہوسکتی۔ یہ کوئی علم نہیں کہ آپ کسی آیت کے دو یا تین یا اس سے زیادہ معنی بیان کردیں، بلکہ علم درحقیقت یہ ہے کہ آپ تمام احتمالات کی نفی کرکے زبان و بیان کے قابل اعتماد دلائل کے ساتھ یہ ثابت کردیں کہ آیت جس سیاق و سباق میں آئی ہے، اس میں اس کا یہی ایک مفہوم ممکن ہے، تاکہ اللہ کی یہ کتاب فی الواقع، ایک میزان کی حیثیت سے اس اُمت کے سامنے آئے اور اس طرح تشت وافتراق کے بجائے یہ اس امت کے لئے فصلِ نزاعات اور وحدتِ فکر وعمل کا ذریعہ بنے''۔ (برہان، ۱۹۹۲، ص: ۴۵، ۴۶)

غامدی صاحب کے ان اصولوں کی روشنی میں جو طاہر القادری صاحب کے لئے بیان ہوئے، اگر ہم محترم غامدی صاحب کو پرکھیں تو کیا ہم نہایت ادب سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ عربیت کے جید عالم ہیں، نہ قرآن کے صاحب ذوق شارح۔ قرآن کی آیت کے کئی مطالب بتانے سے امت تشت وافتراق میں مبتلا ہوگی، قرآن وحدت فکر وعمل کا ذریعہ نہ بن سکے گا؟۔ ہم اس گستاخی پر معذرت خواہ ہیں۔

۱۵:..... کلامِ عرب قرآن کے فہم کا واحد دروازہ ہے: ''قرآن کی ہدایت کے غوامض اور اسرار جو بھی ہوں، ان کا دروازہ بہر حال زبان ہی ہے، یعنی اس کے شہرستانِ معانی میں داخل ہونے کا صرف ایک دروازہ ہے، وہ زبان ہے۔ اس کے اصول وقواعد وہ ایک حاکم کی حیثیت سے موجود رہیں گے۔ اگر کوئی شخص اس دروازے کے سوا کسی اور دروازے سے داخل ہونا چاہے گا تو ظاہر ہے وہ کہیں اور چلا جائے گا، اس پر کتاب کا مدعا کبھی واضح نہ ہوگا، زبان کے سوا کوئی اور دروازہ نہیں ہے۔ (ص: ۲۵ پرویز صاحب کا فہم قرآن، خطاب غامدی، مقدمہ خورشید ندیم ۲۰۰۴ء، دار التذکیر، لاہور) غامدی صاحب کے اس اصول کی مزید تفصیلات کے لئے میزان کا ''باب اصول ومبادی'' کا مطالعہ کیجئے، یعنی نص کا تعین، فہم، ادراک صرف کلام عرب اور شعر جاہلیت پر منحصر ہوگیا۔

۱۶:..... اجماع امت (جو انتقال علم کا ذریعہ ہے) ''سنت صحابہؓ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے''۔

(ص: ۱۰ میزان طبع دوم ۲۰۰۲ء)

امت کا اجماع جن مسائل پر ہے، غامدی صاحب ان کو حجت نہیں مانتے، آخر کیوں؟

۱۷:...... عقل: ''سارا دین عقل پر مبنی ہے، ہماری عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کر سکتی، دین عقل سے ماوراء کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا''۔ (ص: ۱۶۵ تا ۱۶۷، مقامات سن ۲۰۰۸ء) ایمان بالغیب کا مطلب ہے کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے، انہیں محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لینا۔ (مقامات ص: ۱۲۵، سن ۲۰۰۸ء) غامدی صاحب کہتے ہیں کہ عقل و دانش پہلی وحی ہے۔

۱۸:...... صحابہؓ کا اجماع، صحابہؓ کا عملی اور قولی تواتر: ''قرآن صحابہؓ کے قولی تواتر سے ملا ہے، سنت صحابہؓ کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے''۔ (ص: ۱۰ میزان طبع ۲۰۰۲ء)

۱۹:...... ایک اہم اصول رجوع کا منفرد طریقہ: (تاریخ کا صرف انکار نہیں، تاریخ کو ختم کرنے، مٹانے کی کوشش) غامدی صاحب کی کتاب ''درس قرآن'' مقرر جاوید احمد غامدی مجلد، صفحات: ۸۰، مولود احمد شاہد صاحب نے المورد کے ذیلی ادارے میکرو وژن کی جانب سے شائع کی، مگر اچانک کتاب بازار سے اٹھالی گئی، کیوں؟ مقامات ۲۰۰۶ء کی اشاعت کے ساتھ بھی یہی ہوا، اس کتاب کے تین حصے تھے، عربی اور انگریزی۔ ساحل نے عربی حصے کو اغلاط کا دفتر اور انگریزی حصے کی شاعری کو بڑے شعراء کی شاعری کا سرقہ ثابت کیا تو کتاب غائب کرادی گئی۔ یہ بھی غامدی صاحب کا ایک اصول ہے۔ (یہ ارتقاء تھا یا رجوع یا تاریخ کا انکار؟)

اس کتاب کو بازار سے غائب کرانے کے بعد اسی نام سے نئی کتاب مقامات کے نام سے طبع کی گئی، جس سے عربی انگریزی حصے نکال دیئے گئے اور اس پر لکھا گیا طبع اول سن: ۲۰۰۸ء۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ۲۰۰۸ء کے مقامات میں غامدی صاحب کا ۲۰۰۷ء کا ایک مضمون ص: ۲۸ پر درج ہے، جس میں لکھا ہے کہ ''برہان، مقامات اور خیال و خامہ شائع ہو چکی ہیں، جبکہ صفحہ: ۲۹ پر اس مضمون کی تاریخ اشاعت ۲۰۰۷ء درج ہے، یہ اشراق میں ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکا ہے، جبکہ جس کتاب ''مقامات'' میں یہ مضمون درج ہے، اس پر لکھا ہے طبع اول ۲۰۰۸ء۔ اس سے غامدی صاحب کا انوکھا اصول سامنے آتا ہے یعنی التباس پیدا کر دینا۔

۲۰:...... ایک اہم اصول اپنی تاریخ کا خود انکار: غامدی صاحب کی کتاب ''قانونِ معیشت'' ۱۹۹۷ء میں المورد نے شائع کی تو اس کے آخر میں ان کی کتابوں کی فہرست میں الاشراق (عربی) الملک الناس (زیر طبع) کا اشتہار دیا گیا، اس سے پہلے غامدی صاحب کی کتاب ''قانونِ دعوت'' جو ۱۹۹۶ء میں المورد نے شائع کی، اس کے آخر میں درج تصانیف میں الاشراق [عربی] الفاتحہ [زیر طبع] کا اشتہار دیا گیا تھا، لیکن مقامات ۲۰۰۸ء کے ص: ۲۷، ۲۸ پر غامدی صاحب نے اپنی تصانیف زیر طبع، زیر تسوید، مجوزہ کی جو فہرست

اپنے قلم سے تحریر کی ہے، اس میں عربی تفسیر ''الاشراق'' کا ذکر سرے سے غائب ہے۔ یہ رویہ بھی فکر غامدی کا ایک اہم اصول ہے۔ اپنی ہی تاریخ، تصنیف و تحریر کا انکار و اخراج، ان کے فکر کے محاکے میں یہ اصول کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ جب عربی زبان میں کتاب لکھ لی گئی، ۱۹۹۶ء میں طباعت کے لئے تیار تھی تو ۲۰۰۸ء میں کتابوں کی فہرست سے اس کو کیوں نکال دیا گیا؟۔

۲۱:......اپنے ارتقاء کا انکار یا اخفاء: میزان حصہ اول کی پہلی اشاعت ۱۹۸۵ء میں، دوسری اشاعت اپریل ۲۰۰۲ء میں اور تیسری اشاعت ۲۰۰۸ء میں آئی، لیکن کسی پر یہ درج نہیں ہے کہ یہ اضافہ شدہ، ترمیم شدہ، تبدیل شدہ، نظر ثانی شدہ اشاعت ہے۔ درمیان میں میزان کے ابواب، اصول و مبادی، قانون معیشت، حدود و تعزیرات، قانون سیاست، کے نام سے ۱۹۹۳ء، سے لے کر ۲۰۰۵ء تک وقتاً فوقتاً شائع ہو رہے ہیں اور ہر کتابچے میں موقف پارۂ سیماب کی طرح بدلتا رہا، لیکن کسی اشاعت پر نظر ثانی شدہ اشاعت درج نہیں کیا گیا، اس رویے کی توجیہ ہم نہیں کر سکتے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رویہ آخر کیوں؟ حالانکہ ہر اشاعت پہلی سے یکسر مختلف ہے، ان کی آراء بدلتی رہتی ہیں، اصولاً اس کا اظہار کتاب پر کرنا اخلاقی تقاضا ہے۔ اس رویے کو ہم غامدی صاحب کے ایک اصول کے طور پر قبول کرتے ہیں، جس سے ان کے علمی رویے کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۲:......تاریخ کا انکار اور صرف اپنے منبع علم، فہمِ نفس پر کامل اعتبار و اعتماد۔ (یہ غامدی صاحب کا اہم ترین اصول ہے)۔

۲۳:......قدیم صحف: ''قرآن کے اسالیب و اشارات (یہود و نصاریٰ کی تاریخ وغیرہ وغیرہ) سمجھنے کے لئے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے''۔ (میزان، ص:۵۲، طبع دوم ۲۰۰۲ء) یعنی قرآن صرف قرآن یا صاحب قرآن یا صحابہ کرام کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا، اس کا درست فہم محرف صحائف پر ہی منحصر ہے اور ان منسوخ صحائف سے ملنے والا فہم ہی معتبر ہے، اس کے سوا اعتبار کا کوئی ذریعہ نہیں۔ کیا صحابہؓ نے فہم قرآن اس طرح حاصل کیا؟ اس ذریعے سے مستشرقین کو جو فہم حاصل ہوگا، کیا وہ تام ہوگا؟ جبکہ غامدی صاحب کا اصول جو پرویز صاحب پر نقد کرتے ہوئے انہوں نے وضع کیا، یہ تھا کہ پرویز کی تعبیر نہ علمی ہے، نہ امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے۔ (پرویز صاحب کا فہم قرآن ص:۴۸ دار التذکیر ۲۰۰۴ء)

۲۴:......تاریخ: غامدی صاحب کی سنت ابراہیمی کا علم تواتر عملی سے منتقل ہوتا ہے، لیکن بدعات بھی اس ذریعے یعنی تواتر عملی سے ملتی ہیں، پھر سنت و بدعت میں فرق کیسے کیا جائے گا؟ اس کا جواب غامدی صاحب کے پاس ہے۔ تاریخ۔ ''بے شک بہت سی بدعات رائج ہو گئیں، بے عملی بڑھ گئی، لیکن یہ بھی

حقیقت ہے کہ اس کی ساری تاریخ کا واضح ریکارڈ موجود ہے۔کیا اصل ہے؟ کیا اختراع ہے؟ یہ سب امت کے سامنے ہے۔(ماہنامہ اشراق نومبر ۱۹۹۹ء ص:۵۳) یہاں غامدی صاحب کا ماخذ تاریخ ہے، لیکن غامدی صاحب خبر واحد کو ماخذ دین نہیں مانتے، لیکن تاریخ کو کیسے مان لیتے ہیں؟۔ائمہ اربعہؒ میں مسائل پر اختلاف تواتر عملی کی وجہ سے نہیں، بلکہ دلیل اپنے موقف کی تائید کے لئے وہ خبر سے پیش کرتے تھے، یعنی اصل دلیل خبر ہے۔

۲۵:.....سنت آدمؑ: غامدی صاحب کی سنتوں میں قربانی اور تدفین بھی شامل ہے، لیکن یہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کی سنت ہے۔قرآن نے ہابیل قابیل کے حوالے سے دونوں سنتوں کا ذکر کیا ہے۔(المائدۃ:۲۷ تا ۲۹) اسے سنت ابراہیمی کہنا کیا درست ہے؟ لہٰذا سنت آدمؑ بھی ماخذ ہے۔

۲۶:.....تمام انبیاء علیہم السلام کا عمل ماخذ سنت: غامدی صاحب کی سنتوں میں نکاح، طلاق، نماز، زکوۃ، روزہ، حج، حیض ونفاس میں عورت سے اجتناب، حیض ونفاس کے بعد غسل، غسل جنابت، جانور کا تزکیہ شامل ہیں۔لیکن یہ تمام اعمال، سنتیں تمام انبیاء علیہم السلام کے یہاں موجود تھیں۔یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے یہاں یہ اعمال یا سنتیں موجود نہ ہوں، وہ ان احکامات سے فطرت کے مطالبات سے بالکل نابلد ہوں۔اگر یہ تمام کام حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوئے تو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے؟ یہ انبیاء علیہم السلام پر تہمت ہے۔

"قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ". (آل عمران:۸۴)

۲۷:.....خبر: سنت ابراہیمی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ثابت کرنے کا واحد ذریعہ غامدی صاحب کے پاس اب خبر ہے۔خبر سے ان کے نزدیک سنت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ تواتر عملی سے ثابت ہوتی ہے، لیکن وہ خبر کے سوا سنت کو کسی اور طریقے سے تواتر عملی سے عہد ابراہیمی سے لے کر عہد رسالت مآب تک ثابت نہیں کر سکتے۔جب اس کا ثبوت تواتر عملی سے ممکن ہی نہیں تو پھر خبرِ واحد ہی ثبوت ہے، لیکن غامدی صاحب اسے ماخذ نہیں مانتے تو پھر ماخذِ سنتِ ابراہیمی خبر کے سوا کیا رہ جاتا ہے؟ سنتِ ابراہیمی کو اخذ کرنے کا طریقہ براہِ راست مشاہدہ ہے یا بالواسطہ مشاہدہ۔بالواسطہ مشاہدہ ہی خبر ہے، لہٰذا غامدی صاحب کا ماخذ خبر ہے، مگر وہ اُسے تسلیم نہیں کرتے۔

۲۸:.....ملت: غامدی صاحب نے سورۂ نحل کی آیت: "ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

حَنِيفًا وَّ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ''۔(النحل:۱۲۳) سے ثابت کیا ہے کہ سنت، دین ابراہیمی کی روایت اس ذریعے سے ملی ہے، یہاں لفظ ملت ہے، جسے وہ سنت کے مترادف، متبادل کے طور پر استعمال کررہے ہیں اور اس آیت سے کبھی ۲۷ سنتیں، کبھی ۴۰ سنتیں کبھی ۳۰ سنتیں نکال رہے ہیں۔ علم تفسیر کے ذخیرے میں ملت سے کسی نے سنت کا استنباط نہیں کیا مگر غامدی صاحب کا ماخذ ملتِ ابراہیم ہے، جس کا کوئی براہِ راست مشاہدہ ان کے پاس نہیں ہے۔

۲۹:......صحابہؓ اور امت کا اجماع: سنت کے ثبوت کے لئے شرط غامدی صاحب کے پاس صحابہؓ اور امت کا اجماع ہے، مگر سنت کی تعریف متعین کرنے کے لئے وہ ان ہی شرائط کا اطلاق نہیں کرتے، سنت کی تعریف وہ خود متعین فرماتے ہیں، اور اپنی تخلیق کردہ سنت کے لئے بلا دلیل صحابہؓ اور امت کا اجماع ثابت کرتے ہیں، اسی لئے سنتوں کی تعداد مستقل بدلتی رہتی ہے۔

۳۰:......وحی: غامدی صاحب کے نزدیک وحی ماخذ ہے، تمام صحفِ سماوی اور قرآن بھی، قرآن آخری وحی ہے۔ دین وحی سے اخذ ہوتا ہے، یعنی سنت وحی ہے کہ دین یہی ہے۔ اگر دین سنتِ ابراہیمی ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ کی وحی سے یہ ثابت ہے؟ اگر سنت ابراہیمی وحی نہیں ہے تو پھر وہ دین کیسے بن گئی؟ جبکہ اس میں تدفین اور قربانی تو حضرت آدمؑ کی سنت ہے، دیگر سنتیں دیگر انبیاء کی مشترکہ ہیں۔ حدیث ہے کہ ختنہ، زیرناف کے بال مونڈنا، بغل کے بال صاف کرنا، ناخن کاٹنا اور مونچھیں پست رکھنا فطرت ہے۔ ''الفطرة خمس ''۔(صحیح بخاری کتاب اللباس) غامدی صاحب کے اصول سے تو یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کی تمام امتیں فطرت سے نابلد تھیں اور ان کے یہاں نکاح، طلاق، پاکیزگی، طہارت، نفاست کا تصور ہی سے مفقود تھا۔

۳۱:......نقل کرنے کا ذریعہ ماخذ دین ہے: دین کو نقل کرنے کے ذرائع دین نہیں سمجھے جاتے۔ روایت، نقل، تواتر عملی دین کو پہنچانے اور منتقل کرنے کے ذرائع ہیں، نہ کہ دین کا معیار یا خود دین۔ غامدی صاحب ذریعے (Medium) کو ماخذ (Source) بلکہ دین قرار دیتے ہیں۔ تواتر عملی قرن اول کے لئے نہ دین ہے، نہ ذریعہ، کیونکہ صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کے ہر عمل کا براہِ راست مشاہدہ کررہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ایک عمل جو صحابہؓ کے لئے خبر واحد سے ثابت تھا، غامدی صاحب کے نزدیک دین ہی نہیں ہے تو کیا صحابہؓ قرن اول میں دین پر عمل نہیں کررہے تھے؟ دین تو وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول ﷺ دین قرار دیں، چاہے وہ خبر واحد سے ملے یا قولی یا عملی تواتر سے۔ ذریعہ دین نہیں ہے، نہ ہوسکتا ہے، بلکہ اللہ اور رسول ﷺ کے حکم سے کوئی چیز دین بنتی ہے اور پھر بعد میں کسی ذریعے سے پہنچتی ہے۔ دین پہلے

موجود ہوتا ہے، پھر ذریعہ وجود میں آتا ہے۔ ذریعے کو دین بنانا عجیب بات ہے۔

۳۲:......سنت ثابتہ: ''اس مرحلے سے پہلے اس طرح کی بیعت ایک بدعت ہے، جس کا کوئی ثبوت نبی کی سنت ثابتہ اور سیرت طیبہ سے پیش نہیں کیا جاسکتا''۔ (برہان ص: ۱۲۸ اہل بیعت کی خدمت میں ۱۹۹۲ء دارالاشراق، لاہور)۔

۳۳:......سنت: ''سنت ہر اس معاملے میں جس میں قرآن مجید خاموش ہے، بجائے خود ماخذ قانون کی حیثیت رکھتی ہے''۔ (برہان، ص: ۴۱، ۲۰۰۶ء المورد، لاہور)

۳۴:......قول پیغمبر: ''دین میں کوئی چیز اگر ثابت کی جاسکتی ہے تو قرآن مجید کے بعد پیغمبر کے قول سے ہی ثابت کی جاسکتی ہے''۔ (برہان، ص: ۱۹۲، ۲۰۰۶ء، المورد، لاہور)

۳۵:......حدیث وسنت اور اخبار آحاد: ''قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث وسنت ہے۔ اس کا بیشتر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ملا ہے، باقی جو کچھ حصہ اخبار آحاد کی صورت میں تھا، اس میں جتنا کچھ ہمارے اسلاف نے قابل اعتماد پایا، وہ سب انہوں نے منتقل کردیا ہے، اس میں سے کوئی چیز چھپا کر نہیں رکھی۔ دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں''۔ (مقامات، ص: ۱۳۵، ۲۰۰۶ء، المورد، لاہور) (مقامات، طبع اول، ص: ۱۷۸، ۲۰۰۸ء، المورد، لاہور)

۳۶:......سنت ماخذ دین نہیں ہے: غامدی صاحب ۱۹۹۸ء میں کراچی کے محاضرات میں کہہ چکے ہیں کہ ''سنت میں اختلاف کیسے ہو جائے گا؟ جیسے ہی اختلاف ہو جائے گا وہ چیز سنت ثابت نہیں ہوگی۔ اجماع اس کی لازمی شرط ہے۔ جیسے قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا، سنت میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا''۔ (ساحل مئی ۱۹۹۸ء، ص: ۵۸) غامدی صاحب کے اس اصول کے تحت اب سنت ماخذ نہیں ہے، کیونکہ اس میں اختلاف ہوگیا ہے۔ پہلے سنت ثابتہ، پھر حدیث وسنت، پھر سنت، پھر ان کی تعداد کبھی ۲۷، کبھی ۲۶، کبھی ۱۷، کبھی کچھ۔

۳۷:......اس امت کے اہل تحقیق میں کوئی اختلاف نہیں کہ لغتِ عرب کی تحقیق کے لئے سب سے پہلا ماخذ خود قرآن مجید ہے اور اس کے بعد یہ حیثیت پیغمبرؐ اور صحابہؓ کے ان اقوال کو جو روایت باللفظ کے طریقے پر منتقل ہوئے ہیں اور پھر ادب جاہلی کو حاصل ہے۔ (ص: ۱۷۱، برہان ۲۰۰۶ء) لغت عرب کی تحقیق کے لئے پیغمبرؐ اور اقوال صحابہؓ حجت ہیں، لیکن سنت کی تعریف متعین کرنے کے لئے ان ماخذات میں سے کوئی ماخذ حجت نہیں ہے، صرف غامدی صاحب کا فہم حجت ہے۔ وصیت کی آیت میں وصیت کا مفہوم غامدی صاحب نے پہلے پیغمبرؐ، اقوال صحابہؓ، اجماع اور تعامل امت سے اخذ کیا۔ ۲۰۰۸ء میں

مقامات میں وصیت کا فہم لغت عرب سے متعین فرمادیا۔

۳۸:۔۔۔۔۔دانش پہلی وحی ہے: ''دانش خود دین کا حصہ ہے، یوں کہیں کہ دانش اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی جن معاملات میں دانش کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، وہاں وہ کام کرے گی''۔ (ص: ۵۸، افضال ریحان کو غامدی صاحب کا انٹرویو، اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب، ادارہ الفکر، لاہور، ۲۰۰۲ء)

۳۹:۔۔۔۔۔نیا اصول، نبوت لازمی نہیں: ''ہر وہ تہذیب اسلامی ہے جو تین اساسات قبول کرے۔ رسم و روایات، رہن سہن اور آداب وشعائر کے ہزار اختلافات کے باوجود ہم اسے اسلامی تہذیب قرار دے سکتے ہیں: ۱:۔۔۔۔۔وحدت اللہ۔ ۲:۔۔۔۔۔وحدت آدم۔ ۳:۔۔۔۔۔عمل کی بنیاد پر ابدی مکافات۔ اسی وجہ سے کسی خاص قالب کو اسلامی تہذیب نہیں قرار دینا چاہیئے''۔ (ص: ۶۴، انٹرویو افضال ریحان کو، محولہ بالا) (ص: ۶۴، محولہ) جناب غامدی نے اسلامی تہذیب سے رسالت محمدی کو خارج فرمایا۔ رسالت پر ایمان کے بغیر توحید کی تصدیق کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟ توحید اور احکامات الٰہی رسالت کے بغیر انسانوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں؟۔

۴۰:۔۔۔۔۔المورد کے زیراہتمام دانش سرا کے صدر ڈاکٹر فاروق خان کی کتاب ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی تو غامدی صاحب کے مکتب فکر کے ماخذات دین اس کتاب میں شائع کیے گئے، آپ بھی پڑھیے، اس دور کے غامدی صاحب کے ماخذات دین درج ذیل ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ قرآن مجید میزان اور فرقان، یعنی کسوٹی ہے۔

(۲) قرآن کے بعد حضورؐ سے یہ دین ہمیں سنت ثابتہ کی شکل میں بھی ملا ہے۔ سنت ثابتہ حضورؐ کا وہ عمل ہے جو انہوں نے التزام کے ساتھ امت میں جاری فرمایا، پھر یہ عمل صحابہ کرام کے متواتر عمل اور اجماع کے ذریعے سے اس امت کو منتقل ہوا۔ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں۔ قرآن قولی تواتر کے ساتھ ہمیں منتقل ہوا ہے اور سنت ثابتہ عملی تواتر کے ساتھ ہمیں منتقل ہوئی ہے۔

(۳) حدیث، رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل اور تائید کو کہتے ہیں، جو ہمیں مختلف واسطوں سے ملی ہے۔ کسی روایت کو حضور ﷺ کی بات تسلیم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بات قرآن مجید، سنت ثابتہ، اور عقل وفطرت کی پختہ بنیاد پر قائم ہو اور کسی پہلو سے ان کے منافی نہ ہو اور قابل اعتماد ذرائع سے ہم تک پہنچے۔ جو روایت اس معیار پر پوری اترے، وہ بھی ہر مسلمان کے لئے حجت ہے۔

(۴) اجتہاد قرآن وسنت سے ماورا کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہے۔ جس اجتہاد کو

امت مسلمہ کا ضمیر قبول کرے، وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں اس کی پیروی شروع کردیں اور اپنی حقیقی مجالس قانون ساز (پارلیمنٹ) کے ذریعے سے اس کو اپنی اجتماعی زندگیوں پر نافذ کریں، وہی اجتہاد در اصل قانون ہے اور اس سے مختلف اجتہادات کی حیثیت ایک فتوے یا رائے کی سی ہے۔

(۵) اجماع: ''جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، جس میں ایک لفظ کی کمی بیشی خارج از امکان ہے، تو اس دعویٰ کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ صحابہ کرام نے بیک زبان یہ متفقہ شہادت دی کہ یہی قرآن انہوں نے حرف بحرف رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ گویا، قرآن جس پر ہمارے دین کی بنیاد ہے، ہمیں صحابہ کرام کے اجماع سے ملا ہے۔ اسی طرح سنت کو ہم اس لئے حضور ﷺ کا طریقہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے متفقہ طور پر اپنے بعد میں آنے والوں کے سامنے یہ گواہی دی کہ انہوں نے ساری زندگی حضور ﷺ کو یہی طرز عمل اپناتے دیکھا ہے اور آپ ﷺ نے ہمیشہ اسی کا حکم دیا ہے۔ گویا سنت بھی ہمیں صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ملی ہے، چنانچہ جب کہا جاتا ہے کہ اجماع حجت ہے، تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن وسنت ہمیں اجماع صحابہؓ سے ملے ہیں، اس لئے یہ حجت ہیں۔ سلف کے ہاں اجماع کا یہی مفہوم تھا، ظاہر ہے کہ اس معنی کے اعتبار سے اجماع یقیناً حجت ہے اور اسی پر دین کا دارومدار ہے۔ لیکن بعد میں خلف کے ہاں اجماع کو کچھ اور معنوں میں بھی استعمال کیا جانے لگا، جس کے معنی یہ تھے کہ اگر کسی معاملے میں کسی ایک تعبیر پر ایک خاص وقت میں تمام اہل علم متفق ہو جائیں تو وہ اجماع بن جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا لفظ ''جمہور'' کا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی معاملے میں اہل علم کی اکثریت ایک خاص رائے پر متفق ہوتی تھی، تو اسے جمہور کی رائے کہا جاتا تھا۔ اجماع کے اس مفہوم کو ہم نے بہت سادہ انداز میں بیان کردیا ہے، ورنہ اجماع کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف واقع ہوا ہے، اسی لئے اس مسئلے میں ہمیں فقہ کی کتابوں میں بہت سی اصطلاحات ملتی ہیں، مثلاً اجماع واقعی، اجماع ذاتی، اجماع عقلی، اجماع اجتہادی، اجماع قولی، اجماع سکوتی وغیرہ''۔ (ڈاکٹر محمد فاروق خان، صدر دانش سرا پاکستان، نائب صدر المورد، جناب غامدی صاحب کے معتمد خاص جو دانش سرا کے ذریعے فکر غامدی کی تبلیغ وتشہیر کے ذمہ دار تھے، یہ اقتباسات ان کی کتاب اکیسویں صدی اور پاکستان، ص: ۲۵۴ تا ۲۶۱، سن ۱۹۹۶ء، المورد، لاہور سے لئے گئے ہیں واضح رہے کہ یہ کتاب پہلے محمد صلاح الدین مدیر تکبیر نے مطبوعات تکبیر کے تحت شائع کی تھی، کتاب میں اس کا حوالہ درج نہیں ہے، اسے اشاعت اول ظاہر کیا گیا ہے۔ میزان کی اشاعت سے پہلے غامدی صاحب کی فکر ''اسلام کیا ہے؟'' کے نام سے پیش کی گئی تھی، ''میزان'' اسی کا چربہ ہے، اس کے مرتب ڈاکٹر صاحب تھے)۔

۴۱:......۱۱/ اکتوبر ۱۹۹۸ء کے ''زندگی'' میں غامدی صاحب کا انٹرویو شائع ہوا، جو بعد میں افضال ریحان کی کتاب مغربی تہذیب بمقابلہ اسلامی تہذیب ۲۰۰۴ء دار التذکیر میں ص: ۳۱ تا ۶۹ پر شائع ہوا، اس انٹرویو میں مغرب کے حوالے سے غامدی صاحب کے خیالات درج ذیل ہیں:

''مغربی تہذیب اپنی اخلاقی اساسات کے لحاظ سے مسیحی علم الکلام سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ سچا علم کلام ہے۔ ہمیں موحد بن کر مغرب سے بات کرنی چاہئے، یعنی جو چیز ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہے''۔ (ص: ۳۱) ''اہل مغرب خدا، پیغمبروں، آخرت اور مذہب کو ماننے والے لوگ ہیں، اس فکر پر اب ان کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے''۔ (ص: ۳۲) ''آزادی وہاں بحیثیت قدر کے مانی جا چکی ہے''۔ (ص: ۳۳) ''مسلمانوں نے ہزار برس تک جو کچھ کیا ہے، مغرب اس کو ابھی تک چھو بھی نہیں سکا ہے''۔ (ص: ۴۶) ''عدل کرو، یہ تقویٰ کے قریب ہے، یہ ہے ہمارا بین الاقوامی قانون جو ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے بالعموم اس کی پابندی کی''۔ (ص: ۴۸) ''مغرب جو باتیں آج کہہ رہا ہے، وہ ہم نے چودہ سو برس پہلے کہہ دیں۔ عمل کی دنیا میں مغرب بہت بلند ہے اور ہم بہت پست۔ (ص: ۴۹) قرآن انسانی آزادی اور فلاح کے لئے آیا ہے۔ (ص: ۵۲) ''ویزہ، پاسپورٹ ہم نے نہیں، مغرب نے پیدا کیا۔ (ص: ۶۱) ''مغرب نے نیشنل ازم کی مذمت نہیں کی''۔ (ص: ۶۲) ''مغربی تہذیب انسانی تمدن کے ارتقاء ہی کی ایک منزل ہے۔ انسانی تمدن کے مسائل کے حل کے لئے مغربی تہذیب نے بہت کچھ اثاثہ جمع کر لیا ہے''۔ (ص: ۶۲) ''ہر وہ تہذیب اسلامی ہے جو وحدت الٰہ، وحدت آدم اور عمل سے ابدی امکانات کی قائل ہو''۔ (ص: ۶۴) ''مغرب سے ہمارا تعلق داعی اور مدعو کا ہونا چاہئے''۔ (ص: ۶۸)

اس انٹرویو کے بعد حضرت والا کا ارتقاء ہو گیا، لہٰذا اب مغرب کے بارے میں ان کے خیالات مقامات ۲۰۰۶ء میں پڑھیے:

مغرب یاجوج ماجوج ہے: ۲۰۰۶ء تک غامدی صاحب کا مغرب کے بارے میں اصولی نقطۂ نظر یہ تھا کہ مغرب یاجوج ماجوج ہے، دیوار برلن ٹوٹ گئی۔ اب امریکہ روس میں ہے اور روس امریکہ میں۔ یاجوج ماجوج نوحؑ کے تیسرے بیٹے یافث کی اولاد ہیں، ان کا وطن سواد روس ہے۔ قدیم زمانے میں یہی لوگ یورپ میں آباد ہوئے، پھر امریکا، آسٹریلیا پہنچے اور اب دنیا کے سارے پھاٹک ان کے قبضے میں ہیں۔ مغرب فیضان ابلیس ہے، وہ تہذیب جو اس سورج سے نمایاں ہوئی ایک آنکھ سے اندھی ہے، یہ دجال ہے، اس کے پاس دھواں اور دابۃ الارض ہے، اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے کہ وہ کافر ہے، سو وقت قریب آ لگا ہے، اٹھو! اپنے رب کی طرف دوڑو، دجال شہر عزیز میں پہنچ رہا ہے۔ یہ شاید تمہاری

آخری جنگ ہے، جو تمہیں اس جنت کے لئے زمین پر لڑنی ہے۔ اٹھو! اور اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ سوچو کہ تمہیں اس جنگ میں کھونا ہی کیا ہے؟ بس یہ دنیا جس کے کھو دینے سے ہی تمہیں وہ دنیا (جنت) ملے گی۔ (مقامات، ۲۰۰۶ء، ص: ۹۳، ۹۴)

اس عالم کا عقدہ کسی مابعد الطبیعیاتی اساس کے بغیر بھی کھل سکتا ہے اور انسان کا مسئلہ خود اس کے بنانے والے کی رہنمائی کے بغیر بھی حل ہو سکتا ہے۔ یہی اصول ہے جس پر مغرب میں فلسفہ، سائنس اور دوسرے علوم وفنون کا ارتقاء پچھلی دوصدیوں میں ہوا ہے اور جسے ابھی تک مغربی فکر میں اصل اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ مغرب کی فکر کا بنیادی مقدمہ اس انکار پر ہی استوار ہے۔ یہ کارخانۂ عالم بغیر کسی خالق کے وجود میں آتا ہے۔ انسان اس میں اپنی تقدیر خود بناتا، خود بگاڑتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس میں انسان سے شروع ہوتی اور انسان ہی پر ختم ہوتی ہے۔ ذات خداوندی کے لئے اس میں نہ ابتداء میں کوئی جگہ ہے، نہ انتہا میں۔ انسان ہی ابتداء، وہی انتہا اور وہی ظاہر وباطن ہے۔ (۱۴۱، ۱۴۲، بحولہ بالا) اس کے بعد حضرت والا کا پھر ارتقاء ہو گیا اور مقامات، طبع اول ۲۰۰۸ء سے یاجوج ماجوج کا مضمون ہی خارج کر دیا گیا، کیونکہ اب یاجوج ماجوج سے مصالحت، مفاہمت، اشتراک عمل اور محبت وتعلق کا عہد شروع ہو گیا ہے۔

میرے محترم جناب غامدی صاحب کی خدمت میں ان دلائل کے بعد ان کی ہی ایک عبارت ادب کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

> "لیکن حق بہر حال حق ہے اور اس کی حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ اُسے ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا کئے بغیر برملا ظاہر کر دیا جائے۔ ہم میں سے ہر شخص کو ایک دن اس عدالت میں پیش ہونا ہے، جہاں ہمارے وجود کا باطن ہمارے ظاہر سے زیادہ برہنہ ہو گا اور خود ہمارا وجود بھی صاف انکار کر دے گا کہ وہ اسے چھپائے۔ ہماری زبان اس روز بھی معنی ومفہوم کو لفظوں کا جامہ پہنا سکے گی، لیکن اس دن یہ جامہ کسی معنی کو چھپانے کی صلاحیت سے محروم ہو جائے گا۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں اس روز بھی ہمارے وجود کا حصہ ہوں گے، لیکن ہمارے ہر حکم کی تعمیل سے قاصر ہو جائیں گے۔ حقیقت اپنی آخری حد تک بے نقاب ہو جائے گی اور ہم میں سے کوئی شخص اس روز اسے کسی تاویل اور توجیہ کے پردوں میں چھپا نہ سکے گا۔ اس سے پہلے کہ انتہائی عجز اور انتہائی بے بسی کا یہ عالم ہمارے لئے پیدا ہو جائے، بہتر یہی ہے کہ ہم حق اور صرف حق کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیں، وما توفیقنا إلا باللّٰه"۔ [ص: ۳۳، برہان ۱۹۹۲ء] [بشکریہ ماہنامہ بینات]

☆......☆......☆......☆

حضرت مولانا فضل محمد مدظلہم

جاوید احمد غامدی صاحب کا قلم

جاوید احمد غامدی صاحب ایک قادر الکلام صاحب قلم اسکالر ہیں، اُدبی شہہ پاروں کے ضمن میں تلمیحات واشارات اور طنز وتشریحات وتاویلات کے اچھے خاصے ماہر ہیں، اپنے اس فن کے داؤ پیچ میں وہ کبھی مخاطب کو اچھی خاصی گالی دے جاتے ہیں، مگر قلم کی صفائی سے کسی کو احساس ہونے نہیں دیتے ہیں۔ میں غامدی صاحب کے چند چیدہ چیدہ کلمات ان کی کتابوں سے چن کر قارئین کے سامنے رکھتا ہوں اور اپنے مخاطبین کو یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ جاوید غامدی صاحب کے خلاف اگر کہیں کسی کے قلم میں سختی دکھائی دیتی ہے تو وہ غامدی صاحب کے قلم کے عمل کا ردعمل ہوگا۔

صحابی رسول حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ جاوید غامدی کے قلم کی زد میں:

جناب غامدی صاحب کے صحابی رسول کی تحقیر وتوہین کے کلمات سے پہلے ایک ضابطہ اور قاعدہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ تکمیل شریعت کے لیے اور امت کو شریعت کا عملی نمونہ دکھانے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام اعمال وافعال پر خود عمل فرمایا ہے جو اعمال وافعال عصمت نبوت کے منافی نہیں تھے، اگرچہ عام ماحول میں وہ بہت ہی ناآشنا اور ثقیل سمجھے جاتے تھے، جیسے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کرنے کو عرب جاہلیت میں حرام سمجھتے تھے، لیکن اِس رسم کو توڑنے کے لیے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی سے آپ نے نکاح کرکے عرب جاہلیت کے ایک سخت ترین رواج کو توڑ ڈالا، یہ فعل چونکہ عصمت انبیاء کے منافی نہیں تھا، اِس لیے آنحضرت نے اپنی ذات مبارک کو اس کے توڑنے کے لیے پیش فرمایا، لیکن بعض افعال واعمال ایسے تھے کہ تکمیل شریعت کے لیے ان کا نمونہ پیش کرنا ضروری تھا، جیسے چوری کی پاداش میں ہاتھ کٹ جانا، زنا کی پاداش میں شادی شدہ کے لیے سنگسار ہو جانا، شراب پینے پر اسی (۸۰) کوڑوں کی سزا دینا، حد قذف میں اسی (۸۰) کوڑے کھانا، یہ ایسے افعال تھے جن کا ارتکاب شانِ نبوت اور عصمتِ انبیاء کے خلاف تھا، آنحضرت اس کا نمونہ خود پیش نہیں کر سکتے تھے اور تکمیل شریعت کے لیے اس کا عملی نمونہ نہایت ضروری تھا، اِس لیے تکوینی طور پر بعض صحابہ اور بعض صحابیات سے ایسے افعال سرزد ہوگئے جن پر حد نافذ ہوگئی اور امت کو شریعت مقدسہ کا ایک عملی نمونہ مل گیا

کہ شادی شادی شدہ مرد کو اِس طرح سنگسار کیا جاتا ہے، زانیہ عورت کو اِس طرح سنگسار کیا جاتا ہے، غیر شادی شدہ مرد و عورت اور حد خمر و حد قذف میں اِس طرح کوڑے مارے جاتے ہیں، چور اور چورنی کا ہاتھ اِس طرح کاٹا جاتا ہے، چنانچہ اِن سزا یافتہ صحابہ و صحابیات کی یہ بڑی قربانی تھی جنھوں نے گویا تکمیل شریعت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور اسلامی شریعت کی تکمیل ہوگئی، اس پیارے منظر نامے سے اِن سزا یافتہ صحابہ و صحابیات سے امت کے ہر سننے پڑھنے والے کے دل میں محبت اور عقیدت پیدا ہو جاتی ہے میں جب حدیث میں اِن حضرات کے اخلاص پر مبنی احادیث پڑھاتا ہوں تو بے اختیار خود بھی روتا ہوں اور طلبہ بھی روتے ہیں۔ اِس کے برعکس جاوید غامدی صاحب نے اِن صحابہ و صحابیات کو (نعوذ باللہ) غنڈے، اوباش، بدترین اشخاص، بڑے بدمعاش، بدترین انتہائی بدخصلت غنڈے، جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے جیسے ناموں سے اپنی کتاب برھان میں یاد کیا ہے۔[دیکھئے برھان: ۸۳تا۹۱طبع ہفتم دسمبر ۲۰۰۹ء]

غامدی صاحب والا نقشہ پیش کرنے سے سادہ لوح عوام کے دلوں میں اِن صحابہ سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور آنحضرت ﷺ نے جو اِن کی مدح فرمائی ہے اور جنت کی بشارت سنائی ہے مشکوک ہو جاتی ہے۔ شارحین حدیث اور محدثین و فقہاء اور مدارس کے علماء نے ان صحابہ و صحابیات کے خلوص اور خوف آخرت اور گناہ پر ندامت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے لیے جنت کی بشارت اور توبہ کی عظیم قبولیت کو بیان کیا تو جاوید احمد غامدی نے نہایت چالاکی سے ان تمام چیزوں کا رد کیا اور حضرت ماعز پر نہایت گندے اور رکیک حملے کیے، برہان میں غامدی کی عبارت ملاحظہ فرمائیں وہ کس انداز سے حضرت ماعز کو مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔

اصل قصہ یہ ہے کہ جاوید غامدی، اُن کے استاد امین اصلاحی، اُن کے استاد حمید الدین فراہی رجم کی سزا کو نہیں مانتے، وہ کہتے ہیں کہ زانی کے لیے قرآن میں صرف کوڑے ہیں، خواہ زانی شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو اور رجم کی احادیث سب غلط اور نا قابل اعتبار ہیں۔

اُدھر احادیث کی کتابوں بخاری و مسلم اور صحاح ستہ میں موجود صحیح اور صریح احادیث کے مطابق عہد نبوی میں رجم کے کئی واقعات پیش آئے جو تواتر عملی اور اجماع صحابہ سے ثابت شدہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے، رجم کی سزا سے انکار و فرار کی وجہ سے غامدی صاحب ان کے استاد امین اصلاحی ان کے استاد حمید الدین فراہی صاحب نے ان واقعات کو ''فساد فی الارض'' قرار دیا اور پھر ان صحابہ و صحابیات پر فساد فی الارض اور بغاوت و محاربہ کی دفعہ چسپاں کردی اور کہا کہ (نعوذ باللہ) یہ ڈکیت قسم کے لوگ تھے،

بدمعاش تھے، غنڈے تھے، ڈیرے ڈالنے والیاں تھیں، قحبہ گرعورتیں تھیں، بغاوت پر اترنے والے لوگ تھے، اس لیے ان کو زنا کی وجہ سے نہیں بلکہ ان اضافی امور کی وجہ سے سنگسار کیا گیا۔ ان کی سزا کی دفعہ سورت مائدہ کی آیت محاربہ کے تحت آتی ہے اور اسی کی روشنی میں یہ لوگ سنگسار کیے گئے۔ اِن لوگوں نے اگر اعتراف کیا تو جان بچانے کے لیے کیا، آنحضرت ﷺ نے جو اِن کی مدح فرمائی تو مرنے کے بعد ایسا ہوتا ہے، یہ اِن لوگوں کی پاکی کی دلیل نہیں ہے۔ بہرحال غامدی صاحب کی لمبی عبارت ملاحظہ کیجئے اور فیصلہ فرمائیں کہ صحابہ کے بارے میں اُن کا اخلاقی معیار کس پیمانے پر ہے، برہان: ۸۳ طبع ہفتم دسمبر ۲۰۰۹ء پر وہ لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کہ ماعز کے بارے میں یہ سب باتیں حدیث کی کتابوں میں بیان ہوئی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اس کے اس کردار کی نفی کی جا سکے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے نمایاں ہوتا ہے۔

اعتراف جرم اور ندامت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ کوئی مرد صالح تھا جس سے یہ جرم اتفاقاً سرزد ہو گیا۔ دنیا میں جرائم کی جو تاریخ اب تک رقم ہوئی ہے، اس سے دسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ بدترین اوباش اور انتہائی بدخصلت غنڈے جو کسی طرح گرفت میں نہیں آ سکتے تھے، ارتکاب جرم کے فوراً بعد کسی وقت اس طرح قانون کے سامنے خود پیش ہوئے کہ ان کی ندامت پر لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے۔ نفسیات جرم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے محرکات کئی ہو سکتے ہیں: مجرم اس اندیشے میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب یہ جرم چھپا نہ رہے گا، اس لیے وہ خود آگے بڑھ کر اس خیال سے اپنے آپ کو قانون کے سامنے پیش کر دیتا ہے کہ اس طرح شاید اسے سخت سزا نہ دی جائے۔ جرم اس طریقے سے سرزد ہوتا ہے کہ اس کے افشا کو روکنا فی الواقع ممکن نہیں رہتا۔ چنانچہ وہ سبقت کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے ردعمل کی شدت سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جنسی ہیجان کے غلبہ میں مہینوں عورتوں کا پیچھا کرنے والے جب پہلی مرتبہ زنا بالجبر کا ارتکاب بیٹھتے ہیں تو بعض اوقات اس جرم کے نتیجے میں ہیجان کا ختم ہو جانا ہی انہیں اعتراف جرم پر آمادہ کر دیتا ہے۔ مجرم کے ماحول میں کسی غیر معمولی دینی شخصیت کا وجود بھی اس کا باعث بن جاتا ہے۔ جرم کے حالات، مثلاً مجرم کی درندگی کا شکار ہونے والی عورت یا بچے کی بے بسی بھی یہ نتیجہ پیدا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی خلش اور انسان کے اندر سے نفس لوامہ کی سرزنش بھی صرف بھولے بھالے مجرموں ہی میں احساس ندامت پیدا کرنے کا باعث نہیں بنتی، بڑے بڑے بدمعاش بھی بعض اوقات کسی خاص صورت حال میں اس سے متنبہ ہو جاتے ہیں اور پھر پورے خلوص کے ساتھ، نہ صرف یہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں، بلکہ

اصرار کرتے ہیں کہ انہیں جلد سے جلد کیفر کردار کو پہنچا دیا جائے۔"

"......پروردگار اسے جنت میں بھی داخل کر سکتا ہے۔ اللہ کا رسول اگر دنیا میں موجود ہو اور اسے وحی کے ذریعے یہ بتایا جائے کہ مجرم کی مغفرت ہو گئی اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کی نماز جنازہ پڑھے اور لوگوں کو بھی اس کے حق میں دعا کی نصیحت کرے تو اس سے اس کردار کی نفی کس طرح ہو جائے گی جو توبہ واصلاح سے پہلے اس مجرم کا رہا؟ اس سے کیا یہ سمجھا جائے کہ کسی اوباش کو کبھی توبہ کی توفیق نہیں ملتی؟ اور جو شخص توبہ کر لے، اس کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی اوباش بھی رہا تھا؟

اسی طرح یہ بات تو بے شک صحیح ہے کہ کسی بدترین شخص کا ذکر بھی اس کے مرجانے کے بعد کبھی برے لفظوں میں نہیں کرنا چاہیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر ان لوگوں کو تنبیہ کی جو ماعز کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی شامت نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا، یہاں تک کہ کتے کی طرح سنگسار کر دیا گیا، لیکن اس کے معنی کیا یہ ہیں کہ جس شخص کے بارے میں بغیر کسی ضرورت کے اس طرح کا تبصرہ کرنے سے لوگوں کو روکا جائے، وہ لازماً کوئی ہستی معصوم ہی ہوتی ہے؟ اور قانون وشریعت کی تحقیق کے لیے بھی اس کا کردار کبھی زیر بحث نہیں لایا جا سکتا؟

رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے، مثلاً اس طرح کے سوالات کیے کہ کیا تم جانتے ہو کہ زنا کیا ہے؟ تو یہ وہ سوالات ہیں جو اعتراف جرم کی صورت میں ہر عدالت کو لازماً کرنے چاہییں۔ اس صورت میں چونکہ اس بات کا ہر وقت امکان ہوتا ہے کہ بعد میں کوئی شخص مجرم کے کسی مبہم بیان کی بنا پر عدالت کے فیصلے پر معترض ہو اور مدینہ کے ماحول میں جہاں منافقین صبح وشام اسی طرح کے فتنوں کے لیے سرگرم رہتے تھے، اس بات کا اندیشہ چونکہ اور بھی زیادہ تھا، اس وجہ سے آپ نے اپنے سوالات کے ذریعے سے معاملے کا کوئی پہلو غیر واضح نہیں رہنے دیا۔ اس سے کوئی شخص اگر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بے چارہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ زنا کیا ہے تو اس کے بارے میں پھر کیا عرض کیا جا سکتا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ اگر زنا بالجبر کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ شرفا بھی کبھی کبھی اس کے مرتکب ہو جایا کرتے ہیں تو اس پر کچھ تعجب نہ کرنا چاہیے۔ عقل ودانش کی جو مقدار اب ہمارے مدرسوں میں باقی رہ گئی ہے، اس کے بل بوتے پر اس سے زیادہ کیا چیز ہے جس کی توقع ان لوگوں سے کی جا سکتی ہے؟

بہر حال یہ ہے ان سب باتوں کی حقیقت، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی شخص اصرار کرتا ہے کہ ان روایات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہستی معصوم تھی جو بس یونہی راہ چلتے کسی عورت سے بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھا تو اسے پھر مان لینا چاہیے کہ اس صورت میں نہایت شدید قسم کا جو تناقض اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر اور ان روایات کے مضمون میں پیدا ہو جائے گا، اس کی بنا پر کوئی حتمی بات

اس مقدمے کے بارے میں بھی کسی شخص کے لیے کہنا ممکن نہ ہوگا۔'' [برہان: ۸۵]

''......یہ ہیں وہ روایتیں اور مقدمات جن کی بنیاد پر ہمارے فقہا قرآن مجید کے حکم میں تغیر کرتے اور زنا کے مجرموں کے لیے ان کے محض شادی شدہ ہونے کی بنا پر رجم کی سزا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سارے مواد پر جو تبصرہ ہم نے کیا ہے، اس کی روشنی میں پوری دیانت داری کے ساتھ اس کا جائزہ لیجیے۔ اس سے زیادہ اگر کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو بس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے زنا کے بعض مجرموں کو رجم اور جلاوطنی کی سزا بھی دی ہے۔ لیکن کس قسم کے مجرموں کے لیے یہ سزا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے کس طرح کے زانیوں کو یہ سزا دی؟ اس سوال کے جواب میں کوئی حتمی بات ان مقدمات کی رودادوں اور ان روایات کی بنیاد پر نہیں کہی جاسکتی۔'' [برہان: ۸۸]

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ غامدی کے دادا استاد حمید الدین فراہی کے قلم کی زد میں:

جاوید غامدی کہتے ہیں کہ اس سزا (رجم) کا مأخذ در حقیقت کیا ہے؟

''یہی وہ عقدہ ہے جسے امام حمید الدین فراہی نے اپنے رسالہ ''احکام الاصول باحکام الرسول'' میں حل کیا ہے۔ اپنے اصول کے مطابق انہوں نے ان مبہم اور متناقض روایات سے قرآن مجید کے حکم میں کوئی تغیر کرنے کے بجائے انہیں اس کتاب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک رجم اور جلاوطنی کی اس سزا کا مأخذ سورۃ مائدہ کی آیت محاربہ ہے۔''

''......امام حمید الدین فراہی کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، اس کی اصل سزا تو سورہ نور میں قرآن کے صریح حکم کی بنا پر سو کوڑے ہی ہے، لیکن مجرم اگر زنا بالجبر کا ارتکاب کرے یا بدکاری کو پیشہ بنالے یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئے یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بنا پر شریفوں کی عزت و ناموس کے لیے خطرہ بن جائے یا مردہ عورتوں کی نعشیں قبروں سے نکال کر ان سے بدکاری کا مرتکب ہو یا اپنی دولت اور اقتدار کے نشے میں غربا کی بہو بیٹیوں کو سر بازار برہنہ کرے یا کم سن بچیاں بھی اس کی درندگی سے محفوظ نہ رہیں تو مائدہ کی اس آیت محاربہ کی رو سے اسے رجم کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مجرم کے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے جو دوسری سزائیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں، وہ بھی اگر عدالت مناسب سمجھے تو اس طرح کے مجرموں کو دے سکتی ہے۔ انہی سزاؤں میں سے ایک سزا جلاوطنی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مجرموں کو جو محض زنا ہی کے مجرم نہیں تھے، بلکہ اس کے ساتھ اپنی اوباشی کی بنا پر فساد فی الارض کے مجرم بھی تھے، یہ دونوں سزائیں دی ہیں۔ چنانچہ ان میں وہ مجرم جو اپنے حالات اور جرم کی نوعیت کے لحاظ سے رعایت کے مستحق تھے،

انہیں آپ نے زنا کے جرم میں آیہ نور کے تحت سو کوڑے مارنے کے بعد معاشرے کو ان کے شر وفساد سے بچانے کے لیے ان کی اوباشی کی پاداش میں مائدہ کی اسی آیت محاربہ کے تحت جلاوطنی کی سزا دی اور ان میں سے وہ مجرم جنہیں کوئی رعایت دینا ممکن نہ تھا، اسی آیت کے حکم: ان یقتلو: کے تحت رجم کر دیے گئے۔" [برہان:۹۱]

حضرت ماعز رضی اللہ عنہ غامدی کے اُستاد امین احسن اصلاحی کے قلم کی زد میں:

امین اصلاحی نے بھی حمید الدین فراہی کی طرح سنگساری اور رجم کی سزا کو آیت محاربہ کے تحت داخل کیا ہے اور نام لیے بغیر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ اور رجم کے سزا یافتہ دیگر مرد وخواتین کو انہیں القاب سے یاد کیا جن سے حمید الدین فراہی نے یاد کیا اور ان کی اتباع میں آج کل جاوید احمد غامدی ان القاب سے آنحضرت کے ان صحابہ کو یاد کر رہے ہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ امین اصلاحی سورت مائدہ کی آیت محاربہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اللہ اور رسول سے محاربہ یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ یا جتھا جرأت وجسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظام حق وعدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اللہ اور رسول نے قائم فرمایا ہے۔ اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ وجہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوئے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کی رعایا ہوتے ہوئے، عام اس سے کہ وہ مسلم ہیں یا غیر مسلم، اس کے قانون اور نظام کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطہ حدود وتعزیرات کے تحت کاروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کی کوشش کرے۔ اپنے شر وفساد سے علاقے کے امن ونظم کو درہم برہم کر دے۔ لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان، مال، عزت، آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، اغوا، زنا، تخریب، ترہیب اور اس نوع کے سنگین جرائم حکومت کے لیے لاء اور آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں۔ ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطۂ حدود وتعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت مندرجہ ذیل اقدامات کرنے کی مجاز ہے"۔

[تدبر قرآن ۵۰۵/۲]

اس کے بعد انہوں نے رجم کا ماخذ ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"(قرآن میں تقتیل کا حکم مذکور ہے) اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ ان کو عبرت انگیز اور سبق آموز طریقہ پر قتل کیا جائے جس سے دوسروں کو سبق ملے۔ صرف وہ طریقۂ قتل اس سے مستثنیٰ ہوگا جو شریعت میں

ممنوع ہے، مثلاً: آگ میں جلانا، اس کے ماسوا دوسرے طریقے جو غنڈوں اور بدمعاشوں کو عبرت دلانے، ان کو دہشت زدہ کرنے اور لوگوں کے اندر قانون اور نظم کا احترام پیدا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جائیں، حکومت ان سب کو اختیار کر سکتی ہے۔ رجم یعنی سنگسار کرنا بھی ہمارے نزدیک تقتیل کے تحت داخل ہے۔'' [تدبر قرآن ۲/۵۰۵]

''اس وجہ سے وہ غنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت وناموس کے لیے خطرہ بن جائیں جو زنا اور اغوا کو پیشہ بنالیں جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت وآبرو پر ڈاکہ ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لیے رجم کی سزا اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہے۔'' [تدبر قرآن ۲/۵۰۴ ج ۴]

حضرت ماعزؓ کے علاوہ دیگر جن افراد کو عہد نبویؐ میں رجم کیا گیا امین احسن اصلاحی کے نزدیک یہ سب غنڈے تھے وہ لکھتے ہیں:

''اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت سے ڈیرے والیاں ہوتی تھیں، جو پیشہ کراتی تھیں، اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے، اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا، لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے، معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں زیر زمین یہ پیشے کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے، بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو مائدہ کی اسی آیت کے تحت، جس کا حوالہ اوپر گزرا، آپ نے رجم کرایا''۔ [تدبر قرآن: ۲/۵۰۶]

رجم سے متعلق حضرت عمرؓ فاروق کی حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''بہر حال یہ روایت بالکل بے ہودہ ہے اور ستم یہ کہ اسے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔''
[تدبر قرآن: ۵۰۳]

رجم شدہ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم کو مغفرت کی بشارت:

عہد نبوی میں جن صحابہؓ اور صحابیاتؓ پر رجم کا قانون شرعی نافذ کیا گیا ان سے متعلق عقیدت ومغفرت اور نفرت وعداوت کے دونوں پہلو سامنے آسکتے تھے اس لیے لسان نبوت سے ان کی مغفرت اور جنت کی بشارت بالکل واضح طور پر آگئی تا کہ آئندہ ان سے متعلق کسی کی زبان سے غلط اور ہتک آمیز جملہ صادر نہ ہو جائے چنانچہ صحیح مسلم ج ۲ ص: ۶۸ پر حضرت بریدہؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا کہ ماعز بن مالکؓ کے لیے استغفار کی دعا کرو لوگوں نے اس طرح دعا کی ''غَفَرَ اللّٰهُ لِمَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ'' اللہ تعالیٰ ماعز بن مالکؓ کی مغفرت فرمائے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ:

ترجمہ: اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک امت پر تقسیم کردی جاتی تو پوری امت کو کافی ہوتی‘‘۔

نسائی میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَقَدْ رَأَيْتُهُ بَيْنَ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ (فتح الباری: ۱۲/۱۳۰)

ترجمہ: ’میں نے اسے دیکھا کہ جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے‘‘۔

مسند احمد بروایت ابوذر رضی اللہ عنہ یہ ارشاد مروی ہے:

قَدْ غَفَرَ اللّٰهُ لَهُ وَأَدْخَلَ الْجَنَّةَ [فتح الباری: ۱۲/۱۳۰]

ترجمہ: ’’اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا اور اسے جنت میں داخل کر دیا‘‘۔

صحیح ابوعوانہ میں بروایت جابرؓ یہ الفاظ ہیں:

فقد رأيته يتخضخض في انهار الجنة (فتح الباری ص: ۱۳۰ ج ۱۲)

ترجمہ: ’’میں نے اس کو جنت کی نہروں میں غوطے لگاتے ہوئے دیکھا ہے‘‘۔

صحیح مسلم ج ۲ ص: ۶۸ پر غامدیہؓ کا واقعہ مشہور بھی ہے سنگساری کے دوران حضرت خالدؓ کے چہرہ پر غامدیہؓ کے خون کا چھینٹا آکر لگا حضرت خالد نے ان کو برا جملہ کہا تو آنحضرت نے فرمایا:

مَهْلًا يَا خَالِدُ! فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ

ترجمہ: ’’اے خالد! برا بھلا کہنے سے باز رہو، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ ٹیکس وصول کرنے والا کرتا تو اس کی بھی بخشش ہو جاتی‘‘۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا، اور اسے دفن کر دیا گیا۔ صحیح مسلم ج ۲ ص: ۶۹ پر مذکورہ غامدیہ خاتون کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ترجمہ ملاحظہ ہو: اس غامدیہ نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر گناہ گاروں پر تقسیم کر دی جائے تو ان کے لیے بھی کافی ہو جائے گی کیا تمہیں اس سے افضل توبہ مل سکتی ہے کہ اس نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان قربان کر دی۔

قارئین حضرات غور فرمائیں لسان نبوت سے ان صحابہ وصحابیات کے لیے کس قدر عظیم بشارت سنائی جا رہی ہے اور کس قدر ان کی منزلت اور عظمت بتائی جا رہی ہے اور دوسری طرف دیکھئے کہ غامدی صاحب اور ان کے استاد امین احسن اصلاحی صاحب اور ان کے استاد حمید الدین فراہی صاحب کی طرف سے ان کے بارے میں کیا مغلظات سنائے جا رہے ہیں کم از کم یہ خیال تو کرتے کہ آنحضرت کے صحابہ

ہیں یا یہ خیال کرتے کہ مرنے کے بعد کسی کو اس طرح یاد کرنے کی ممانعت ہے یا یہ سوچتے کہ ہم تو بڑے اخلاق کے دعویدار ہیں اور دوسروں سے اس کے طلب گار ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان دانشوروں کا لہجہ صحابہ کرام اور احادیث کے بارے میں بالکل خوارج اور روافض کا ہے افسوس اور صد افسوس ہے۔

فقہاء کرام جاوید احمد غامدی کے قلم کی زد میں:

جاوید احمد غامدی صاحب اپنے آپ کو بہت بڑا خیال کرتے ہیں چنانچہ اس کے قلم کے سامنے بڑے بڑے فقہاء کرام اور مفسرین ومحدثین زیادہ وزن نہیں رکھتے، رجم کے انکار کے مباحث میں انہوں نے سب پر سوقیانہ قلم چلایا ہے میں اپنے قارئین کو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اخلاقیات اور تہذیب کے بلند وبالا دعوے کرنے والے غامدی صاحب اور ان کے رفقاء اخلاقیات وتہذیب کے کس معیار پر کھڑے ہیں اس کی ایک جھلکی ملاحظہ فرمائیں:

''اب یہ ظاہر ہے کہ بات اگر دلیل سے کی جائے تو اس کے رد وقبول کا فیصلہ بھی دلیل کی بنیاد پر ہوگا۔ دلیل قوی ہے تو ہر اس شخص کو جو دیانت داری کے ساتھ حق کا طالب ہے، اسے قبول کرنا چاہیے اور دلیل کمزور ہے تو اسے پیش کرنے والے سلف وخلف کے اکابر ہی کیوں نہ ہوں، طالب حق کو پوری قوت کے ساتھ اسے رد کر دینا چاہیے۔ آپ کسی بات کو دلیل سے منوانا چاہتے ہیں تو دوسروں کا یہ حق بھی تسلیم کیجئے کہ وہ اسے دلیل ہی کی بنیاد پر ماننے سے انکار کر دیں۔ علم واستدلال نہ کسی گروہ کی میراث ہے، نہ کسی دور کا خاصہ۔ اگلوں کو اگر ایک اصول بنانے کا حق تھا تو ہمیں دلائل کے ساتھ اس کے ابطال کا بھی حق ہے۔ تنقید سے بالاتر اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف کتاب وسنت ہیں اور ان کی تعبیر وتشریح کا حق ہر اس شخص کو حاصل ہے جو اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لے۔ جو لوگ ہم سے پہلے آئے، وہ بھی انسان تھے، اور ہم بھی انسان ہیں اور انسانوں میں سے صرف پیغمبر ہی یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی بات بے چون وچرا تسلیم کی جائے۔ دین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے ان حضرات کی جلالت علمی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور اس موضوع سے متعلق وہ ساری چیزیں پڑھی ہیں جو اس فن میں امہات کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن ہمارے نزدیک چونکہ یہ سب حضرات پیغمبر نہیں تھے، اس لیے ان کے دلائل کی صحت وعدم صحت کا جائزہ لینے کی جسارت بھی ہم نے کی ہے۔ برسوں کے مطالعہ اور فکر وتدبر کے بعد ہم اس عقیدت واحترام کے باوجود جو ان حضرات کی علمی خدمات کے لیے ہمارے دل میں ہے، یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اپنے موقف کی تائید میں جتنے دلائل انہوں نے پیش فرمائے ہیں، وہ سب منطقی مغالطوں پر مبنی اور بے حد کمزور ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک یہ اصول کہ سنت قرآن مجید کے احکام میں کسی نوعیت کا تغیر وتبدل کر سکتی ہے، عقل

ونقل، دونوں کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

رجم کی سزا کے بارے میں ہمارے فقہاء نے اپنے استدلال کی عمارت چونکہ اس اصول کی بنیاد پر استوار کی ہے، اس وجہ سے ہماری رائے میں بہتر یہی ہے کہ ان کے بعض دوسرے ارشادات پر تنقید سے پہلے اس اصول کی غلطی واضح کردی جائے، کیونکہ اصل کی تردید کے بعد فروع خود بخود بے معنی ہوجائیں گے۔[برہان:۴۷ طبع ہفتم]

علماء دیوبند کے بارے میں بھی غامدی صاحب نے بہت ہی نامناسب قلم استعمال کیا ہے ایک مختصر اور نرم سی عبارت ملاحظہ ہو:

''اس گروہ (یعنی طبقہ دیوبند) کی عمر پوری ہوچکی ہے اس کی مثال اب اس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے ویران ہوجائے گی آنے والے دور کی امامت دبستان شبلی کے لیے مقدر ہے۔''

[مقامات:۲۱]

بہرحال ان معروضات سے قارئین کو اس حقیقت کا اندازہ ہوجائے گا کہ غامدی گروپ کے نزدیک اکابر امت کی کیا حیثیت ہے میں نے یہ چند گزارشات جلدی میں لکھ دیں ورنہ کہانی بہت لمبی ہے

خاطر مسلسل است پریشاں چوں زلفِ یار
عیبم مکن کہ درشبہ ہجران نوشتہ ام

ترجمہ: محبوب کی زلفوں کی طرح میرا دل پیچ وتاب کھارہا ہے
آپ برا نہ مانیں کیونکہ میں نے شب ہجران میں یہ سطور لکھی ہیں۔

امام اہل سنت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی تالیفات

[۱] خزائن السنن (تقریر ترمذی)
[۲] احسن الکلام (مسئلہ فاتحہ خلف الامام)
[۳] تسکین الصدور (مسئلہ حیات النبی پر مدلل بحث)
[۴] الکلام المفید (مسئلہ تقلید پر مدلل بحث)
[۵] ازالۃ الریب (مسئلہ علم غیب پر مدلل بحث)
[۶] راہ سنت (رد بدعات پر لاجواب کتاب)
[۷] آنکھوں کی ٹھنڈک (مسئلہ حاضر ناظر پر مدلل بحث)
[۸] احسان الباری (بخاری شریف کی ابتدائی ابحاث)
[۹] طائفہ منصورہ (نجات پانے والے گروہ کی علامت)
[۱۰] ارشاد الشیعہ (شیعہ نظریات کا مدلل جواب)
[۱۱] درود شریف پڑھنے کا شرعی طریقہ
[۱۲] عبارات اکابر (اکابر علماء دیوبند کی عبارات پر اعتراضات کے جوابات)
[۱۳] تبلیغ اسلام (ضروریات دین پر مختصر بحث)
[۱۴] گلدستہ توحید (مسئلہ توحید کی وضاحت)
[۱۵] دل کا سرور (مسئلہ مختار کل کی مدلل بحث)
[۱۶] راہ ہدایت
(کرامات ومعجزات کے بارہ میں صحیح عقیدہ کی وضاحت)
[۱۷] بانی دار العلوم دیوبند (مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے حالات زندگی اوران پر اعتراضات کے جوابات)
[۱۸] ینابیع
(غیر مقلد عالم مولانا غلام رسول کے رسالہ تراویح کا اردو ترجمہ)
[۱۹] چراغ کی روشنی (معراج النبی کے بارہ میں قادیانی وغیرہ کے اعتراضات کے جوابات)
[۲۰] مسئلہ قربانی (قربانی کی فضیلت اورایام قربانی پر مدلل بحث)
[۲۱] عیسائیت کا پس منظر (عیسائیوں کے عقائد کا رد)
[۲۲] مقالہ......ختم نبوت قرآن وسنت کی روشنی میں
[۲۳] المسلک المنصور
[۲۴] اتمام البرہان فی رد توضیح البیان
[۲۵] حلیۃ المسلمین (داڑھی کا مسئلہ)
[۲۶] توضیح المرام فی نزول مسیح علیہ السلام
[۲۷] آئینہ محمدی (سیرت پر مختصر رسالہ)
[۲۸] شوق حدیث (حجیت حدیث پر مدلل بحث)
[۲۹] ملاعلی قاری اور مسئلہ علم غیب وحاضر ناظر
[۳۰] تنقید متین بر تفسیر نعیم الدین
[۳۱] باب جنت بجواب راہ جنت
[۳۲] الکلام الحاوی
(سادات کے لیے زکوۃ وغیرہ لینے کی مدلل بحث)
[۳۳] مودودی صاحب کا غلط فتویٰ
[۳۴] تفریح الخواطر بجواب تنویر الخواطر
[۳۵] چہل مسئلہ حضرات بریلویہ
[۳۶] عمدۃ الاثاث تین طلاقوں کا مسئلہ
[۳۷] الشہاب المبین بجواب الشہاب الثاقب
[۳۸] اظہار العیب بجواب اثبات علم الغیب
[۳۹] سماع موتیٰ
[۴۰] چالیس دعائیں
[۴۱] مقام ابی حنیفہ
[۴۲] صرف ایک اسلام
[۴۳] حکم الذکر بالجہر
[۴۴] شوق جہاد
[۴۵] انکار حدیث کے نتائج (منکرین حدیث کا رد)
[۴۶] مرزائی کا جنازہ اور مسلمان
[۴۷] اخفاء الذکر (ذکر آہستہ کرنا چاہیے)

......باب نمبر ۵......

افکار کا تحقیقی محاسبہ

حیات عیسیٰ، عمار پر غامدی اثرات، تصورِ جہاد، غزوۂ ہند، توہین رسالت کی سزا،

عمار خان گستاخِ رسول کے دفاع میں، فتنہ قادیانیت و فتنہ غامدیت،

غامدی کے اصول تفسیر و تصور سنت، قرآن فہمی، قرا آت قرآن،

احسان و تصوف، حجیت اجماع، سزائے رجم، غامدی و عمار،

نظریہ سیاست، جدت پسندی اور دینی مدارس وغیرہ

موضوعات پر علمی و تحقیقی مضامین

مغرب کے سیاسی غلبے اور فکری استیلاء کے بعد گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اسلام کی تعبیر و تشریح کے بارے میں بھانت بھانت کی بولیاں سامنے آئیں۔ مثلاً: جدید اِسلام، عقلی اِسلام، مہذّب اِسلام، عجمی اَثرات سے آزاد اِسلام، جمہوری اِسلام، سائنٹفک اِسلام، دین خالص اور صحیح تعبیر تشریح پر مشتمل اِسلام وغیرہ۔ لیکن وقت کے نباض صاف محسوس کر سکتے ہیں کہ اَب جیسے جیسے مغربی سیادت اور فکری استیلاء کے سائے گھٹ رہے ہیں، یہ تعبیرات بھی مرحلہ وار دَم توڑ رہی ہیں۔ اور امت اَب اُسی مقام پر واپس آیا چاہتی ہے جہاں یہ آوازۂ حق سنائی دیتا ہے:

لن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح أولها

وہی تسلیم و اطاعت، وہی سادگی و قناعت، وہی اعتماد و تصلب، وہی ایمان و ایقان اور وہی حب فی اللہ اور بغض للہ کی پاکیزہ فضاء۔

بنیاد پرست

عقیدہ حیات ونزول عیسی علیہ السلام......قرآن کی روشنی میں

قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ جب یہود نے عیسی علیہ السلام کو صلیب دے کر قتل کرنے کی کوشش کی تو قرآن نے جو فرمایا کہ ''اللہ نے انہیں اپنی طرف بلند کر دیا'' وہ حقیقت میں انہیں بلند نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے درجات بلند کر دیے گئے تھے، اس جگہ پر درجات کے بلندی کا یہ فائدہ ہوا کہ صلیب پر وہ زندہ رہے اور یہود کو شبہ لگ گیا کہ وہ وفات پا چکے ہیں اور وہ انہیں چھوڑ کر چلے گئے، عیسیٰ پھر کسی اور علاقہ میں چلے گئے وہاں تقریباً نصف صدی حیات رہے پھر طبعی وفات پائی اور انکی قبر کشمیر میں ہے، اب ایک نیا مسیح پیدا ہونا تھا جو کہ ایک مخبوط الحواس بھینگے، میٹرک فیل، دجال وکذاب مرزا قادیانی کی شکل میں پیدا ہوا ہے۔ یہی عقیدہ تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ غامدی صاحب کا بھی ہے، یہ بھی ان قادیانیوں کی طرح وفات عیسی کا عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن کہانی تھوڑی سی مختلف بیان کرتے ہیں۔ غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب کے قریب ہی موت دی گئی، پھر انہیں کہیں دفن کرنے کے بجائے ان کا جسم آسمان پر اٹھا لیا گیا اور اب وہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔

غامدی اور قادیانی دونوں آیت "اذ قال اللہ یعیسی انی متوفیك ورافعك الی. [آل عمران ۳۵ پارہ ۳] میں متوفیک'' سے ''موت'' مراد لیتے ہیں اور اس لفظ کو اپنے عقیدہ وفات مسیح کے لیے نص قطعی قرار دیتے ہیں۔ غامدی صاحب اس آیت کی تشریح کرنے والی متواتر صحیح احادیث اور جید صحابہ کے اقوال کو تسلیم نہیں کرتے، جبکہ قادیانی انہی احادیث سے مسیح علیہ السلام کے دوبارہ پیدا ہونے کا عقیدہ گھڑ کر مرزا قادیانی کو مسیح قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مرزا قادیانی نے تو محض عیسی علیہ السلام کی سیٹ خالی دیکھ کر خود کو مسیح کہلوانے کے لیے قرآن سے عیسیٰ کی وفات کا عقیدہ اور اس کی قبر کے قصے گھڑے، اس کے کذب، چال بازیوں، بیہودہ تاویلات پر سینکڑوں دفعہ بات چیت ہو چکی ہے، آج ہم غامدی صاحب کی اس عقیدہ کے متعلق عبارات پر تبصرہ ان کی پسند کے مطابق صرف قرآن سے پیش کریں گے۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ میں قرآن مجید سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اٹھا لیا گیا تھا تا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ یہ میرے نزدیک ان کے منصب رسالت کا ناگزیر تقاضا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اسے اسی طرح بیان کیا

ہے۔انی متوفیك و رافعك الی. اس میں، دیکھ لیجیے توفی وفات کے لئے اور ''رفع'' اس کے بعد رفع جسم کے لیے بالکل تصریح ہے''۔[ماہنامہ اشراق، اپریل ۱۹۹۵ء ص:۳۵]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''حضرت مسیح کو یہود نے صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی ان کا جسم بھی اٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے۔''[اشراق جولائی ۱۹۹۴ء ص:۳۲]

القرآن يفسر بعضه بعضًا:

قرآن کی آیات کی تفسیر کے چند اصول ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی بھی آیت کی تفسیر کے لیے سب سے پہلے قرآن میں دیکھا جائے گا کہ آیا کوئی دوسری آیت اس کے مطلب کی وضاحت کر رہی ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، پھر اقوال صحابہ سے مدد لی جائے گی۔ اس عقیدہ رفع، نزول وحیات عیسیٰ کی تائید میں احادیث تو اتنی موجود ہیں کہ اتنی ارکان اسلام کے متعلق بھی نہیں، بیس سے زائد جید صحابہ روایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح صحابہ، تابعین، تبع تابعین، آئمہ اور تمام بڑے علمائے امت کے ان پر اتفاق واجماع کیوجہ سے ان کو تلقی بالقبول حاصل ہے۔ غامدی صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح اور ان کے شاگردوں کی تفاسیر کو قبول کرنے کے لیے تو تیار نہیں ہم ان کی پسند کے مطابق ان کے اس عقیدہ کی بنیاد سورۃ آل عمران کی اس آیت کی ''القرآن يفسر بعضه بعضًا (قرآن کے کچھ حصوں کی قرآن کی دوسرے حصے تفسیر کرتے ہیں) کے تحت قرآن سے ہی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ کیا قرآن کی دوسری آیات ان کی (غامدی صاحب) اس آیت کی تشریح کی تائید کرتی ہیں؟ کیا واقعی احادیث اور صحابہ وعلمائے امت کا اجماع قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے؟

مسئلہ حیاتِ عیسیٰ اور قرآن:

غامدی صاحب نے جو آیت پیش کی ہے اس سے پہلے آنے والی آیت میں ہے و مکروا و مکر الله۔ و الله خير المكرين۔ اور ان کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام) کے خلاف خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی۔ اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ اس تدبیر کی اور پھر اگلی آیت جس کے ایک لفظ کی بنیاد پر غامدی صاحب ساری امت سے عقیدہ میں اختلاف کیے بیٹھے ہیں، کی وضاحت سورۃ النساء کی آیت ۱۵۷ ار یوں کرتی ہے:

''وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا. بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا.''[۱۵۷۔۱۵۸، پ۶]

ترجمہ: اور یہ کہا کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا تھا، حالانکہ نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا تھا، نہ انہیں سولی دے پائے تھے بلکہ انہیں اشتباہ ہو گیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے، وہ اس سلسلے میں شک کا شکار ہیں، انہیں گمان کے پیچھے چلنے کے سوا اس بات کا کوئی علم نہیں ہے، اور یہ بات بالکل یقینی ہے کہ وہ عیسیٰ کو قتل نہیں کر پائے۔ بلکہ اللہ نے انہیں اپنے پاس اٹھا لیا تھا، اور اللہ بڑا صاحب اقتدار، بڑا حکمت والا ہے۔[آسان ترجمہ القرآن، ۱۵۷، ۱۵۸]

آیت سے دو باتیں بالکل واضح ہیں:۔ پہلی بات آیت میں "وما قتلو"......"وما صلبو"...... "وما قتلو یقینا" کے الفاظ سے ان کے قتل/موت کی مطلق نفی کی گئی ہے۔ دوسری قتل سے بچانے کا انتظام یہ کیا گیا کہ "بل رفعه الله اليه، بلکہ اللہ نے اٹھا لیا اس کو اپنی طرف"۔ یہاں "بل" کے بعد بصیغہ ماضی "رفعه" کو لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے قتل وصلب سے پہلے ہی ان کو ہم نے "اليه" یعنی اپنی طرف اٹھا لیا تھا۔ "وکان الله عزیزا حکیما."

لفظ "توفی" کی قرآن سے وضاحت:

منکر حدیث، قادیانی اور غامدی آیت "إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ" [آل عمران: ۵۵، پارہ: ۳] میں "متوفیك" سے مطلق "موت" مراد لیتے ہیں، جبکہ اگر یہاں اس سے موت مراد لے لی جائے تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ کافروں نے جو عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی تدبیر کی تھی وہ اس میں کامیاب ہو گئے تھے۔۔۔!! جبکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ بہتر تدبیر اللہ کی ہی رہی۔ لفظ "توفی" کی وضاحت کے لیے بھی ہم قرآن سے رجوع کرتے ہیں۔

۱...... "اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَى إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى" [الزمر: ۴۲، پ: ۲۴]

ترجمہ: اللہ تمام روحوں کو انکی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے اور جن کو ابھی موت نہیں آئی ہوتی، انکو بھی انکی نیند کی حالت میں، پھر جن کے بارے میں اس نے موت کا فیصلہ کر لیا، انہیں اپنے پاس روک لیتا ہے اور دوسری روحوں کو ایک معین وقت تک چھوڑ دیتا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہے کہ "توفی" بمعنی موت کے نہیں ہیں، بلکہ "توفی" موت کے علاوہ کوئی شے ہے جو کبھی موت کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے تو کبھی نیند کے ساتھ۔ اور "حین موتها" کی قید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "توفی" موت کے وقت بھی ہوتی ہے عین موت نہیں ہوتی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کو رات کو "توفی" دیتا ہے اور صبح اٹھ کر لوگ ایک بار پھر زندہ ہو کر اپنے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام "توفی" کے بعد بھی حیات ہیں اور قیامت

سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، جس کی وضاحت احادیث میں موجود ہے۔

۲......"وھو الذی یتوفاکم باللیل" الخ[الانعام:۶۰، پارہ:۷]

ترجمہ: وہ ہی ہے جو رات کے وقت تمہاری روح قبض کر لیتا ہے۔"

اس مقام پر بھی ''توفی'' موت کے بجائے نیند کے موقع پر استعمال کیا گیا۔ اگر توفی سے مراد صرف موت ہی ہوتی تو یہاں اسکو استعمال نہ کیا جاتا۔

۳......"حتی یتوفاھن الموت"[النساء:۱۵، پ:۴]

ترجمہ: یہاں تک کہ انہیں موت اٹھا کر لے جائے۔

اگر توفی کا معنی بھی موت تھا تو آگے لفظ "موت" لانے کی کیا ضرورت تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ جس جگہ "توفی" کے ساتھ موت اور اس کے لوازم کا ذکر ہوگا۔ اس جگہ "توفی" سے مراد موت لی جائے گی۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"قُلْ يَتَوَفّٰكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ .[السجدہ:۱۱، پ:۲۱]

ترجمہ: تو کہہ قبض کر لیتا ہے تم کو فرشتہ موت کا جو تم پر مقرر ہے پھر اپنے رب کی طرف پھر جاؤ گے۔"

اس مقام پر ملک الموت کے قرینہ سے ''توفی'' سے مراد موت لی جائے گی۔

اسی طرح قرآن میں دوسرے انبیاء علیہم السلام کی موت کا جہاں کہیں تذکرہ ہے، وہاں موت کا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ نبی علیہ السلام کے لیے:"انك میت وانهم میتون، افان مت فهم الخالدون" اسی طرح سلیمان علیہ السلام "فلما قضینا علیه الموت مادلهم علی موته"۔ جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے رفع اور توفی استعمال کیا ہے۔ اور توفی، جیسا کہ اوپر دی گئی آیات کی مثالوں سے ظاہر ہے جسمانی موت کے لیے وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں اس کے ساتھ موت کے لوازمات کا بھی ذکر کیا جائے، جبکہ غامدی صاحب کی پیش کی گئی آیت میں اس لفظ کے بعد موت کی کسی علامت کا تذکرہ کرنے کے بجائے قرآن کی دوسری آیت کی ہی تائید میں "رافعك"۔ کا ذکر ہے، یہی بات "فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم"۔ میں بھی ہے۔ اس ساری تفصیل سے یہ واضح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق غامدی صاحب کے عقیدہ کو قرآن بھی غلط قرار دے رہا ہے۔

غامدی صاحب محض ایک ذو معنی لفظ کی بنیاد پر عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا عقیدہ گھڑتے ہیں، پھر جسم اوپر اٹھائے جانے کا واضح قرآنی اشارہ نظر آتا ہے تو جسم کو لاش قرار دے کر تاویل کرتے ہیں کہ جی سر پھری قوم کہیں اس کی توہین نہ کرے اور یہ منصب رسالت کا ناگزیر تقاضا بھی ہے۔ شاید ان کے علم میں نہیں کہ اسی سر پھری قوم نے زکریا، یحییٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے دوسرے ہزاروں نبی کس بے دردی سے شہید کیے تھے، حیرت ہے اس سے منصب نبوت یا شان الٰہی میں کوئی فرق نہیں آیا؟ آسان

اور سادہ سی بات تھی کہ یہود نے مل کر عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی تدبیر کی، اللہ نے اس کو ناکام بناتے ہوئے عیسیٰ کو زندہ سلامت اپنی طرف اٹھالیا۔ غامدی صاحب نے اپنی من مانی تشریح کے ذریعے اس واضح اور متفقہ عقیدہ کی بھی عجیب کھچڑی بنا کر رکھ دی۔

مسئلہ نزول عیسیٰ اور قرآن:

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اس واقعہ کی طرف کوئی ادنی اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم و عقل اس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔'' [میزان: ۱۷۸، طبع سوئم]

غامدی صاحب نے لفظ توفی سے حیات عیسیٰ کے انکار کا عقیدہ تیار کیا، پھر اس عقیدہ کے دفاع میں نہ صرف انہیں اس سے متعلق تمام احادیث کا انکار کرنا پڑا اور ساری امت کی مخالفت کرنی پڑی بلکہ نزول عیسیٰ کا منکر بھی ہونا پڑا۔ اپنے نزول عیسیٰ کے انکار کے عقیدہ کی یہ دلیل دے رہے ہیں کہ اس سے متعلق قرآن میں کوئی تذکرہ موجود نہیں۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ جب تمہاری تحقیق کے مطابق قرآن نزول عیسیٰ کے حق یا خلاف میں کچھ نہیں بتا رہا تو پھر تم صحیح احادیث کو کیوں رد کر رہے ہو؟ یہاں تمہارے پاس کونسی نص قطعی ہے جس کی ان احادیث کو صحیح مان لینے سے خلاف ورزی ہو رہی ہے؟ پرویزی تو چلیں حدیث کے صریح منکر ہیں، وہ ایسا عقیدہ رکھ بھی سکتے ہیں، تم تو اپنی کتابوں اور سائیٹس پر ''قرآن وسنت کی روشنی میں'' کے الفاظ سجا سجا کر لکھتے ہو! اس سنت سے کس کی سنت مراد ہے؟ جب تمہیں اتنی متواتر اور صحیح احادیث قبول نہیں اور صرف قرآن ہی تمہاری ساری شریعت کا ماخذ ہے تو پھر اس سنت کے لفظ کو قرآن کے ساتھ سے ہٹا کیوں نہیں دیتے؟ تا کہ لوگوں کو واضح پتا چل جائے کہ یہ بھی منکر حدیث ہیں۔ پھر تمہیں ان لوگوں پر اعتراض کیوں ہے جو یہ کہتے ہیں کہ غامدی مکتبہ فکر صرف اسی صحیح یا ضعیف حدیث کو مانتا ہے جو ان کی بات کی تائید کرتی ہو یا جس سے ان کو اپنے موقف کی دلیل مل سکتی ہو، اس کے علاوہ کسی مسئلہ میں بھی صحیح سے صحیح حدیث کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔!! حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزول عیسیٰ کے متعلق ارشادات کے علاوہ قرآن میں بھی ان کے نزول کے واضح اشارے موجود ہیں۔ مثلاً قرآن میں دو جگہ ان کے بچپن اور ادھیڑ عمر میں بات کرنے کے معجزے کا ذکر ہے۔

"ویکلم الناس فی المھد و کھلا و من الصالحین. اور وہ ماں کی گود میں بھی لوگوں سے باتیں کرے گا اور بڑی عمر میں بھی، اور راست باز لوگوں میں سے ہوگا۔''

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ماں کی گود میں کلام کرنا تو ایک معجزہ تھا، ادھیڑ عمر میں تو مومن،

کافر، جاہل ہر کوئی کلام کیا کرتا ہے، اس کو ساتھ خصوصی طور پر ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روایات عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان بتاتی ہیں، اب ادھیڑ عمر میں جبھی کلام ہوسکتا ہے جب وہ دوبارہ تشریف لائیں، یہی انکا معجزہ ہے۔ جو لوگ یہود کی طرح ان کے بارے میں بدگمانی اور شبہ میں پڑ کر ان کے دوبارہ نزول کے منکر ہو جائیں گے اس اشارہ سے انہیں بھی بتایا جا رہا ہے کہ وہ قیامت کے قریب دوبارہ ضرور تشریف لائیں گے اور بڑھاپے کی عمر پائیں گے۔ اسی کی وضاحت ایک اور آیت سے ہو رہی ہے۔

"وانہ لعلم للساعۃ فلا تمترن بھا واتبعون. [الزخرف:۶۱] اور یقین رکھو کہ وہ (عیسیٰ علیہ السلام) قیامت کی ایک نشانی ہیں۔ اس لیے تم اس میں شک نہ کرو اور میری بات مانو۔"

بہت سے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کی دوبارہ تشریف آوری اس بات کی نشانی ہوگی کہ قیامت قریب آ گئی ہے، اس بات کی تائید صحیح احادیث بھی کر رہی ہیں۔ قرآن اس کا بھی تذکرہ کرتا ہے کہ قیامت کے قریب اہل کتاب کا ان کو دیکھ کر ردعمل کیا ہوگا؟

"وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ. [النساء:۱۵۸] اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے ضرور بالضرور عیسیٰ پر ایمان نہ لائے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ جو اہل کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت موجود ہوں گے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ رہے گا جو ان پر ایمان نہ لائے۔ [البحر المحیط:۳۹۲/۳......تفسیر بیضاوی:۲۵۵/۱]
(یعنی بہت سے اہل کتاب کے دجال کی معیت میں ہلاک ہو جانے کے بعد باقی جو بچیں گے، وہ سب ایمان لائیں گے۔ [احسن])

غامدی مکتبہ فکر عقیدہ حیات نزول مسیح کی قرآن و احادیث کی واضح تائید کو جھٹلا کر محض اپنے گھڑے ہوئے عقیدہ پر بضد ہے۔ اگر ان کے اس عقیدہ کہ "عیسیٰ علیہ السلام کو مردہ آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا" کو صحیح بھی مان لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ اگر ان کے عقیدہ کے مطابق واقعی عیسیٰ علیہ اسلام کی لاش آسمانوں پر اٹھائی گئی ہے تو وہ دنیا میں کب آئے گی؟ حشر کا میدان تو زمین پر لگے گا، اس دن خاتم الانبیاء سمیت سب انسان اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے، کیا عیسیٰ آسمان پر زندہ کیے جائیں گے اور اللہ اور فرشتوں کے ساتھ آسمان سے نازل ہوں گے؟؟؟ قرآن میں اس کی تصریح یا اشارہ کہاں ہے؟ عقیدہ حیات و نزول عیسیٰ کو عیسائیوں سے درآمد شدہ کہنے والے خود نہ صرف حیات عیسیٰ کے متعلق نصاریٰ کے

عقیدہ پر ایمان لائے ہوئے ہیں بلکہ انہیں الوہیت عیسیٰ کے بھرپور دلائل بھی فراہم کر رہے ہیں۔'' سکالر اسلام'' کی دورخی کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف صاحب پرانے صحائف میں موسیقی کے تذکرے کی آیات کی تصدیق قرآن میں موجود داؤد علیہ السلام کے زبور پڑھنے کی آیات سے کرتے ہیں اور انہیں قرآن سے موسیقی کا اشارہ کہتے اور پرانے صحائف میں موجود موسیقی کے متعلق آیات کو ان کی وضاحت کہہ کر موسیقی کو جائز قرار دیتے ہیں، دوسری طرف نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں انجیل اور قرآن میں موجود واضح دلائل کو ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ کتاب مقدس کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''اور جب وہ زیتون کے پہاڑ پر بیٹھا تھا، اس کے شاگردوں نے الگ اس کے پاس آکر کہا ہم کو بتا کہ یہ باتیں کب ہوں گی؟ اور تیرے آنے اور دنیا کے آخر ہونے کا نشان کیا ہوگا؟ یسوع نے جواب میں ان سے کہا خبردار! کوئی تم کو گمراہ نہ کردے۔ کیونکہ بہتیرے میرے نام سے آئیں گے اور کہیں گے میں مسیح ہوں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔'' [متی ۲۴:۳۔۵]

کیا"افرأیت من اتخذ الهه هواه" جیسی آیات کا مصداق غامدی صاحب جیسے لوگ نہیں؟

منکر حیات ونزول مسیح کے بارے میں علمائے امت کی رائے:

ہمارے ہاں قادیانی مسائل پر کی گئی پاکستان و ہندوستان کے جید علماء کی تحقیقات ہر دوسرے مذہب کے مسئلہ پر کی گئی تحقیقات سے زیادہ ہیں، ہزاروں علماء نے جانی و مالی قربانیوں کے ساتھ قادیانی دلائل اور شبہات کے معقولی و منقولی انداز میں جوابات دے کر اپنے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انتظام کیا، ختم نبوت کے متعلق ایک ایک بات کو پرکھا، تولا گیا، اس پر ہر رخ سے دلائل دیے گئے۔ ہزاروں صفحات کی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں۔ مرزا قادیانی چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و نزول کا بھی منکر تھا، اس لیے اس مسئلہ پر بھی پہلے سے کافی تحقیق موجود ہے، جس سے یہ واضح ہے کہ عقیدہ حیات ونزول مسیح کا منکر نہ صرف متواتر احادیث کا انکار کرتا ہے بلکہ قرآنی دلائل کو بھی جھٹلاتا ہے۔ برصغیر کے علماء نے قرآن وسنت کی روشنی میں عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر زندہ ہونے اور دوبارہ تشریف لانے کے منکر کو کافر قرار دیا، اس کے لیے عرب۔ کے بڑے علماء سے بھی رائے لی گئی اور شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ جیسے عرب شیوخ نے بھی اس فتوی کی تائید کی۔ خطرناک صورتحال یہ ہے کہ غامدی صاحب قادیانیوں، پرویزیوں کی طرح اس مسئلہ میں بھی اپنی کم علمی، جدت پسندی اور گمراہی کی وجہ سے نہ صرف خود کفر کی طرف جارہے ہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک بڑی اکثریت کو بھی اپنے ساتھ لیے جارہے ہیں۔۔۔۔!!

☆......☆......☆......☆

مولانا محبوب احمد مدظلہ، سرگودہا

عقیدہ حیات مسیح علیہ السلام......اور......غامدی موقف

اسلامی عقائد انتہائی محکم، واضح اور مدلل ومبرہن ہیں، ان میں تشکیک وتوہم کی گنجائش نہیں ہے۔ ابتدا ہی سے عقائد کا معاملہ انتہائی نازک رہا ہے، عقائد کی حفاظت سے اسلامی قلعہ محفوظ رہتا ہے۔

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم ہی سے کئی افراد اور جماعتوں نے عقائد کے معاملہ میں اعتزال، رفض اور خروج کا راستہ اختیار کیا اور امت کے اجتماعی دھارے سے کٹ کر الگ ہو گئے۔ اس خروج واعتزال کا سلسلہ قرن اول سے تاہنوز جاری ہے، خیر خواہانِ دین وملت نے ہر دور میں حکمت وبصیرت اور دلیل سے انہیں ''قومی دھارے'' میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی، اس سعی پیہم اور جہد مسلسل کا تسلسل آج بھی جاری ہے۔ مجلہ ''صفدر'' کا یہ خصوصی نمبر ایسی ہی کاوش کا ایک مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرما کر نافع ومفید بنائے۔ آمین

حال ہی میں مشہور متجدد جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے اسلامی عقائد واعمال میں جمہور امت کے تسلسل سے جدا ہو کر ''تفرد'' کا راستہ اختیار کیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک مستقل فرقے اور نظریے کا روپ دھار گئے۔

غامدی صاحب نے درجنوں مسائل میں جمہور امت سے اختلاف کیا ہے، ذیل میں حیات مسیح علیہ السلام کے بارے میں غامدی صاحب کے نظریے کا قرآن سنت کی روشنی میں جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔ ہمارا یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''رفع الی السماء'' کے بارے میں غامدی موقف پر بحث کی جائے گی اور دوسرے حصے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''نزول الی الارض'' سے متعلق غامدی نقطہ نظر کا جائزہ لیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء اور......غامدی موقف:

۱......غامدی صاحب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہوئے ماہنامہ اشراق اپریل ۱۹۹۵ کے ص:۴۵ پر لکھتے ہیں:

> ''سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید سے میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اٹھا لیا گیا تاکہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ یہ میرے نزدیک ان کے منصب رسالت کا ناگزیر تقاضا تھا، چنانچہ قرآن مجید نے اسے

اسی طرح بیان کیا ہے۔ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ". اس میں، دیکھیے "توفی" وفات کے لیے اور "رفع" اس کے بعد رفعِ جسم کے لیے بالکل صریح ہے۔"

۲......نیز ماہنامہ "اشراق" جولائی ۱۹۹۶، ص: ۳۲ پر لکھتے ہیں:

"حضرت مسیح کو یہود نے صلیب چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی ان کا جسم بھی اٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سر پھری قوم اس کی توہین کرے۔"

ان دو حوالوں میں غامدی صاحب نے ایسا عقیدہ اور نظریہ بیان کیا ہے جو ابتداء امت سے آج تک کسی مسلمان فرقہ نے اختیار نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی بھی اس عقیدہ پر پینترے بدلتا رہا، آخر میں اس عقیدہ پر کاربند ہو گیا کہ: "حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اور کشمیر میں مدفون ہیں۔"

غامدی صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ:

۱۔ صلیب کے موقع پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اولاً موت دی گئی۔

۲۔ پھر ان کے جسم کو بھی آسمانوں پر اٹھا لیا گیا۔

غامدی صاحب نے قرآن کریم کی آیت کریمہ بطور استدلال پیش کی ہے، آیت یہ ہے:

"اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسَى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْن" [آل عمران: ۵۵]

اس سے اُن کا استدلال دو طرح سے ہے:

۱......آیت کریمہ میں "توفی" کا معنی موت ہے۔

۲......"متوفیك ورافعك الیّ" میں واؤ ترتیب کا فائدہ دے رہی ہے کہ پہلے وفات ہوئی، پھر رفع ہوا۔

غامدی صاحب کا یہ استدلال، دیکھا جائے تو بالکل بے بنیاد اور قواعد عربیت کے خلاف ہے۔ تفصیل سے قبل آیت کریمہ کا مکمل ترجمہ ملاحظہ فرما لیجیے!

"جس وقت اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! میں تجھے پورا پورا (مکمل طور پر اپنی حفاظت میں) لے لوں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ اور تجھے کافروں سے پاک رکھوں گا۔ اور ان لوگوں کو جو تیرے پیروکار ہیں، قیامت تک منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب نے میری طرف آنا ہے اور میں تمہارے اختلاف میں فیصلہ کروں گا۔"

قرآن پاک میں مذکورہ بالا آیت سے پہلے "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْن" ہے، جس میں عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہود کی خفیہ تدبیر کا ذکر ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی تدبیر کے مقابلے میں ناکام ہو گئی۔ اِس آیت میں حق تعالیٰ نے اپنی اسی محکم تدبیر کی خبر دی ہے جو یہود کے "مکر" کے خلاف صادر فرمائی۔

یہود بے بہبود کی تدبیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور پھانسی دینے کی تھی، یہ تدبیر انتہائی خفیہ تھی، اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی۔ ماقبل میں دونوں طرف کی تدبیروں کے ذکر کے بعد حق تعالیٰ نے اگلی آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں کے قبضے سے پورا پورا (مکمل طور پر) بچا کر روح مع الجسد اپنی طرف اٹھانے کی خبر دی، یہی حق تعالیٰ کی جوابی تدبیر تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہودیوں سے بچانے کو ''توفی'' میں بیان کیا گیا، جو تدبیر الٰہی کا مبدا تھا۔ اور آسمان پر اٹھائے جانے کو ''رفع'' سے بیان کیا جو اس تدبیر کا منتہی تھا۔ پھر ''مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا'' میں آپؑ کے رفع کی شان کو بیان فرمایا گیا کہ ان یہودیوں کے ناپاک ہاتھ آپ کو چھو بھی نہ سکیں گے۔

ہم نے آیت کریمہ کے ترجمے میں ''مُتَوَفِّيكَ'' کا معنی ''پورا پورا لینا'' کیا ہے، اِس لیے کہ لفظ ''توفی'' ''باب تفعل سے ہے، اس کا مادہ ''وفی'' ہے، جس کا معنی: ''پورا کرنا'' اور ''وفا کرنا'' ہے۔ اہل لغات نے تصریح کی ہے کہ توفی کا اصل معنی: ''أخذ الشيء وافيًا'' (کسی چیز کو پورا پورا لے لینا) ہے۔

اور موت اس کا مجازی معنی ہے، حقیقی معنی نہیں۔ چنانچہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''التوفي: أخذ الشيء وافيًا، والموت نوع منه.'' (توفی کا معنی کسی چیز کو پورا پورا حاصل کر لینا ہے۔ اور موت اس کی ایک نوع ہے۔) [تفسیر بیضاوی......]

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیش نظر ایک بہت واضح فرق یہ بھی ہے کہ قرآن عزیز نے جگہ جگہ ''موت'' اور ''حیات'' کو تو تقابلاً بیان کیا ہے، لیکن ''توفی'' کو کسی ایک مقام پر بھی ''حیات'' کا مقابل نہیں ٹھہرایا۔ لہٰذا ''توفی'' اور ''موت'' مرادف نہیں۔ البتہ چونکہ ''موت'' پر بھی مجازاً ''توفی'' کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اس لیے جہاں قرینے اور محل کا تقاضا ہو کہ ''توفی'' سے موت کا معنی مراد لینا چاہیے، وہاں موت کا معنی ہی مراد ہوگا۔ لیکن اگر قرینہ اور محل حقیقی معنی کا متقاضی ہو تو پھر وہاں حقیقی معنی متعین ہوگا اور مجازی معنی مراد لینا درست نہ ہوگا۔

اسی بات کی امام اللغت ابوالبقاء رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ عوام میں توفی کا معنی اگرچہ موت ہے۔ لیکن خواص کے نزدیک اس کا معنی ''پورا پورا لینا اور قبض کرنا'' ہے۔ [کلیات ابوالبقاء، ص:......]

اس پوری تفصیل سے جب یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ''توفی'' کا حقیقی معنی ''پورا پورا لینا'' ہے اور موت اس کا مجازی معنی ہے۔ اور مجازی معنی تب ہی مراد ہوسکتا ہے جب حقیقی معنی مراد لینا متعذر ہو اور مجازی معنی پر کوئی قرینہ بھی پایا جائے۔

اب ذیل میں آیت "اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ". کی مختصر تفسیر پیش کی جاتی ہے۔ مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ میں "متوفيك" کا معنی دو طرح کیا ہے:

۱...... جمہور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین اور جمہور سلف وخلف اس طرف گئے ہیں کہ آیت میں "توفی" سے موت کا معنی مراد نہیں، بلکہ "توفی" کا اصلی اور حقیقی معنی مراد ہے، یعنی "پورا پورا لینا" کیونکہ اصل اس مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی اور تسکین مراد ہے کہ: "اے عیسیٰ! تم گھبراؤ نہیں! میں تمہیں دشمنوں کے ہجوم اور نرغے سے پورا پورا روح اور جسم سمیت اٹھالوں گا، یہ ناقدرے اور ناسپاس اس قابل نہیں کہ آپ کے وجود باسعود کو اس میں رہنے دیا جائے۔"

نیز "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ" سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ "توفی" سے "پورا پورا لینا" اور آسمان پر اُٹھایا جانا مراد ہو، کیونکہ "ومکروا" سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور صلیب پر چڑھانے کی تدبیریں مراد ہیں۔ اور "مکر اللہ" سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کی تدبیر مراد ہے۔

اس پر قریب قریب مفسرین کا اجماع ہے، تفصیل کے لیے درج ذیل تفاسیر ملاحظہ فرمائیں:

[تفسیر کبیر: ۲/۴۶۳......تفسیر ابن کثیر: ۲/۲۲۹......روح المعانی: ۲/۱۵۸]

۲...... بعض مفسرین نے "مُتَوَفِّيْكَ" کا معنی "مُمِيْتُكَ" کے ساتھ کیا ہے اور علی بن طلحہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "مُتَوَفِّيْكَ" کی تفسیر "مُمِيْتُكَ" نقل کرتے ہیں۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا مطلب بھی منقول ہے کہ آیت میں تقدیم وتاخیر ہے۔ جیسا کہ آپؓ کے شاگرد ضحاکؒ کہتے ہیں کہ: "ابن عباس رضی اللہ عنہما مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ کی تفسیر میں یہ فرماتے تھے کہ: حضرت مسیح کا رفع مقدم ہے اور اُن کی وفات اخیر زمانہ میں ہوگی۔" [تفسیر درمنثور: ۲/۳۶]

لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جیسے مُتَوَفِّيْكَ کی تفسیر مُمِيْتُكَ مروی ہے، ایسے ہی ان سے تقدیم وتاخیر بھی مروی ہے۔ اور تفسیر ابن جریر، ابن کثیر اور فتح الباری میں "وان مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ" میں قَبْلَ مَوْتِهٖ کی ضمیر حضرت عیسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ: صحیح یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر موت اور بغیر نیند کے آسمانوں پر اٹھالیا۔ اور ابن عباس کا صحیح قول یہی ہے۔ [روح المعانی]

مولانا بدر عالم مہاجر مدنیؒ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مُمِيْتُكَ والی تفسیر پر کیا خوب لکھ گئے:

"پس اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابن عباس سے اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ کی تفسیر اِنِّىْ مُمِيْتُكَ مروی ہے تو زیادہ سے زیادہ اس سے یہی ثابت ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی موت آنی ہے۔ مگر اس کا انکار کس کو

ہے؟ زیر بحث تو یہ ہے کہ وہ موت اُن کو آچکی (یا نہیں) اور کیا وہ فی الحال مردوں میں شامل ہیں؟ اور اب دوبارہ نہیں آئیں گے؟ دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ نہ یہ حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور نہ امت مسلمہ میں کسی اور معتمد عالم سے۔ بلکہ ابن عباس سے باسناد قوی یہ ثابت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام (زندہ) اٹھالیے گئے اور نزول کے بعد پھر وفات پائیں گے۔ اور ٹھیک یہی تمام امت کا عقیدہ ہے۔'' [احتساب قادیانیت: ۳۱۰/۴]

خلاصہ یہ ہوا کہ مُتَوَفِّيكَ کا معنی موت نہیں، اور اگر موت کا معنی مراد لیا جائے تو پھر آیت میں تقدیم وتاخیر کو مانا جائے گا۔ کیونکہ دوسری نصوص قطعیہ میں رفع مسیح کا صریح ذکر ہے۔

اس بحث سے غامدی صاحب کے استدلال کے پہلے جز کا بطلان بالکل واضح اور مفصل طور پر ثابت ہوا۔ نیز اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اگر ''مُتَوَفِّيكَ'' سے موت کا معنی ہی مراد لیا جائے (گو یہ ایک مجازی معنی ہے) تو پھر بھی یہ ہمارے عقیدے کے خلاف نہیں۔ کیونکہ عربی میں واؤ مطلق جمع کے لیے آتا ہے، ترتیب کے لیے نہیں۔ جیسے حق تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو حکم فرمایا:

''وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِينَ. اور تو سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

اب ظاہر ہے کہ سجدہ، رکوع کے بعد ہوتا ہے، اور رکوع اس سے پہلے۔ لیکن آیت میں ترتیب کے بغیر حکم دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اِس کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ لیکن فی الوقت اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اس تمام تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے مکمل طور پر محفوظ رکھا اور انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھالیا، وہ اب بھی زندہ ہیں اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ: ''فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی ان کا جسم بھی اٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے۔'' بالکل بے بنیاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ توہین سے بچانے کے لیے جسد مع الروح لے جانے میں کیا اشکال ہے؟ اسی طرح توہین سے بچانے کے لیے روح کو جسم سے نکال لینا ہی کیوں ضروری ہے؟ جبکہ قرآن میں بالکل صراحت سے بیان کیا گیا ہے: ''وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ'' اور ''وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ''۔

ان آیات میں بالکل واضح بتلایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح مع الجسد زندہ آسمانوں پر اٹھایا گیا ہے۔ کیونکہ وَمَا قَتَلُوهُ، وَمَا صَلَبُوهُ اور وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا اور بَلْ رَفَعَهُ میں تمام ضمیریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ جو کہ آپ کے جسم اور ذات کی طرف راجع ہیں، روح بلا جسد کی طرف نہیں۔ کیونکہ یہود روح کے قتل کے مدعی نہیں تھے، بلکہ وہ جسم مع الروح کے قتل کے مدعی تھے۔ تو بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ میں اس کی تردید کی گئی۔ لہٰذا رَفَعَهُ کی ضمیر بھی عیسیٰ علیہ السلام کی ذات (جسم مع الروح) کی طرف راجع ہے

جسے یہودی قتل نہیں کر سکے، پھانسی نہیں دے سکے۔ اسی کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا۔

اس لیے کہ کلمۂ "بَلْ" کلام عرب میں ماقبل کے ابطال کے لیے آتا ہے۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل اور صلب کے دعویدار تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کے ابطال کے لیے بَلْ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ فرمایا۔ یعنی تم غلط کہتے ہو کہ تم نے ان کے جسم کو قتل کیا یا صلیب پر چڑھادیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ وصحیح سالم آسمان پر اٹھالیا۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. سے وضاحت فرمادی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھائے جانے کو ناممکن مت سمجھنا، کیونکہ اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے لیے بالکل ممکن ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول......اور......غامدی نظریہ:

یہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کے "رفع الی السماء" کے بارے میں غامدی صاحب کے نظریہ کا تجزیہ پیش کیا گیا، ذیل میں اُن کے "نزول الی الارض" کے بارے میں غامدی صاحب کا نظریہ پیش خدمت ہے، اولاً غامدی صاحب کی عبارت ملاحظہ کی جائے، اپنی کتاب "میزان" میں لکھتے ہیں:

> "اِن کے علاوہ ظہور مہدی اور مسیح علیہ السلام کے آسمان سے نزول کو بھی علامات قیامت میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم نے اِن کا ذکر نہیں کیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ظہور مہدی کی روایتیں محدثانہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ان میں کچھ ضعیف اور کچھ موضوع ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ بعض روایتوں میں جو سند کے لحاظ سے قابل قبول ہیں، ایک فیاض خلیفہ کے آنے کی خبر دی گئی ہے، لیکن دقت نظر سے غور کیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اِس کا مصداق سیدنا عمر بن عبدالعزیز تھے جو خیر القرون کے آخر میں خلیفہ بنے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی اُن کے حق میں حرف بہ حرف پوری ہو چکی ہے۔ اس لیے کسی مہدی موعود کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔ نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے، لیکن قرآن کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محل نظر ہیں۔
>
> اولاً، اِس لیے کہ مسیح علیہ السلام کی شخصیت قرآن مجید میں کئی پہلوؤں سے زیر بحث آئی ہے۔ اُن کی دعوت اور شخصیت پر قرآن نے جگہ جگہ تبصرہ کیا ہے۔ روزِ قیامت کی ہلچل بھی قرآن کا خاص موضوع ہے۔ ایک جلیل القدر پیغمبر کا زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اِس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم وعقل اِس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اِسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔
>
> ثانیاً، اِس لیے کہ سورۂ مائدہ میں قرآن کریم نے مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے جو قیامت کے دن ہوگا۔ اُس میں اللہ تعالیٰ اُن سے نصاریٰ کی اصل گمراہی کے بارے میں

پوچھیں گے کہ کیا تم نے یہ تعلیم اِنھیں دی تھی کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا کے سوا معبود بناؤ۔ اِس سوال کے جواب میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہیں گے کہ میں نے تو اِن سے وہی بات کہی تھی جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا اور جب تک میں اِن کے اندر موجود رہا، اُس وقت تک دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن آپ نے مجھے اٹھالیا تو میں نہیں جانتا کہ انھوں نے کیا بنایا اور کیا بگاڑا ہے۔ اِس کے بعد تو آپ ہی اِن کے نگران رہے ہیں۔ اِس میں دیکھ لیجیے، مسیح علیہ السلام اگر ایک مرتبہ پھر دنیا میں آچکے ہیں تو یہ آخری جملہ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اِس کے بعد تو اُنھیں کہنا چاہیے کہ میں اِن کی گمراہی کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ابھی کچھ دیر پہلے اِنھیں اُس پر متنبہ کر کے آیا ہوں۔ فرمایا ہے:

"مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" [المائدہ۵: ۱۱۷]

میں نے تو اِن سے وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی، اور میں اِن پر گواہ رہا، جب تک میں اِن کے اندر موجود رہا، پھر جب تو نے مجھے اٹھالیا تو اِن پر تو ہی نگران رہا ہے اور تو ہر چیز پر گواہ ہے۔

ثالثاً، اِس لیے کہ سورہ آل عمران کی ایک آیت میں قرآن نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحہ عمل بیان فرمایا ہے۔ یہ موقع تھا کہ قیامت تک کے الفاظ کی صراحت کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ وہ چیزیں بیان کر رہے تھے جو اُن کے اور اُن کے پیروؤں کے ساتھ ہونے والی ہیں تو یہ بھی بیان کر دیتے کہ قیامت سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر تجھے دنیا میں بھیجنے والا ہوں۔ مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ سیدنا مسیح کو آنا ہے تو یہ خاموشی کیوں ہے؟ اِس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آیت یہ ہے:

"إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ" [۳:۵۵]

میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے وفات دوں گا اور اپنی طرف اٹھا لوں گا اور (تیرے) اِن منکروں سے تجھے پاک کروں گا اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت کے دن تک اِن منکروں پر غالب رکھوں گا۔ پھر تم سب کو بالآخر میرے پاس آنا ہے۔ سو اُس وقت میں تمھارے درمیان اُن چیزوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔ [میزان، علامات قیامت، ص: ۱۷۸، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

غامدی صاحب کی اِس عبارت میں چار وجوہ سے نزول مسیح کا انکار کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ غامدی صاحب نے چار طرح سے اس عقیدے پر اعتراضات کیے ہیں:

۱......نزول مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے قبول کیا ہے، لیکن قرآن کی روشنی میں وہ محل نظر

ہیں۔

۲......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کا تذکرہ مختلف حوالوں سے قرآن مجید میں موجود ہے، لیکن نزول مسیح کا واقعہ قرآن میں کیوں نہیں بیان کیا گیا؟ قرآن اس حوالہ سے کیوں خاموش ہے؟

۳......سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۱۱۷ میں قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکالمے کا ذکر ہے، جو بارگاہِ خداوندی میں ہوگا۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام قوم کے بگاڑ سے لاعلمی کا اظہار کریں گے، یہ لاعلمی ان کے نزول کی تردید کررہی ہے۔ اگر وہ دنیا میں دوبارہ آئے ہوں گے تو قوم کی گمراہی سے یوں لاعلمی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

۴......"اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ" الخ۔ آیت میں حق تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں قیامت تک کا لائحہ عمل بیان کیا ہے، اس میں قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کا ذکر نہیں۔ قرآن اس کے بارے میں خاموش ہے۔

ذیل میں اختصار کے ساتھ ان تمام امور کا بالترتیب جائزہ پیش خدمت کیا جاتا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ان نظریات کی کیا حیثیت ہے؟ غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ قارئین بآسانی خود فرمالیں گے۔

۱/۲)......ہمیں شدید حیرت ہے کہ غامدی صاحب نے نزول مسیح کی روایات کو محدثین کے ہاں قبولیت پانے کا اقرار کرنے کے باوجود قرآن کی روشنی میں اسے محل نظر کیسے گردان لیا؟

سوال یہ ہے کہ نزول مسیح کی روایات کو محدثین نے بالعموم کیوں قبول کیا ہے؟ غامدی صاحب اس سے پہلوتہی کرکے وجہ بتانے سے کیوں کتراگئے ہیں؟ اور ساتھ ہی محدثین پر افتراءبازی بھی کررہے ہیں کہ: "قرآن مجید کی روشنی میں یہ روایات محل نظر ہیں۔" گویا محدثین نے قرآن کے مخالف ان روایات کو قبول کیا ہے۔

اسے غامدی صاحب کی کوتاہ نظری کہیے یا کوئی اور نام دیجیے! بہرحال محدثین کرام کے مقدس طائفہ پر غامدی صاحب کا یہ صریح بہتان اور محض الزام ہے۔ جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔

نزول مسیح کی روایات درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ اسی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے امام مسلم رحمہ اللہ نے نزول مسیح کو باب الایمان میں درج کیا ہے۔ نزول مسیح کی تقریباً ایک صد سے زائد روایات ہیں جو تیس سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ اور یہ حدتواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس پر امت کا اجماع بھی ہے۔ چنانچہ علامہ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں

"حیات المسیح بجسمه إلی الیوم ونزوله من السماء بجسمه العنصري مما أجمع

علیہ الأمۃ، وتواتر بہ الأحادیث "[البحر المحیط: ۴۷۳/۲]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آج تک اپنے جسد عنصری کے ساتھ زندہ رہنا اور جسم عنصری کے ساتھ نازل ہونا ان (عقائد) میں سے ہے، جن پر امت کا اجماع ہو چکا ہے اور جس کے بارے میں احادیث متواتر ہیں۔

اس تواتر اور صراحت کے باوجود محدثین کو مورد الزام ٹھہرانا اور مسلمانوں کے ذہن میں تشکیک پیدا کرنا انصاف کا خون نہیں تو اور کیا ہے؟

نیز محدثین نے نزول مسیح کی روایات کو قرآن مجید چھوڑ کر نہیں بلکہ قرآنی مؤیدات کے ساتھ قبول کیا ہے۔ حیرت ہے کہ غامدی صاحب اتنی واضح روایات سے صرف نظر کرتے ہوئے متواتر ذخیرہ احادیث کو قرآن کے مقابل قرار دے کر مشکوک کرنے کی سعی ناکام ونامراد انجام دے رہے ہیں!!۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی درج ذیل روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل کی ہے:

"عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: والذی نفسی بیدہ لیوشکن أن ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا......واقرأو إن شئتم "**وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا**"[صحیح بخاری......./.......]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بہت جلد تم میں ابن مریم حاکم عادل ہو کر نازل ہوں گے......آخر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اگر تم اس حدیث کی قرآن سے تائید چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو: "وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا" یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کے بعد یہود ونصاریٰ میں سے کوئی شخص ایسا باقی نہ رہے گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آپ کی وفات سے پہلے ایمان نہ لائے۔

اس روایت میں کس وضاحت سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نزول مسیح کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قسم کے ساتھ مؤکد کرتے ہوئے نقل فرما رہے ہیں۔ پھر تمام صحابہ کرام کے سامنے "وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا " آیت کو نزول مسیح پر بطور دلیل اور گواہی پیش فرما رہے ہیں۔ اور موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا۔ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اِس بات کا انکار کیا؟ آپؓ کو حدیث کے ساتھ قرآنی استشہاد پر ٹوکا؟ کیا ان میں سے کسی نے یہ کہا کہ: یہ عقیدہ حدیث سے تو بیان کرو! لیکن قرآنی گواہی مت دو!؟ یا کسی نے یہ کہا ہو کہ: یہ عقیدہ قرآن کی روشنی میں محل نظر ہے؟ کچھ بھی نہیں! بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے استدلال کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام سلف وخلف نے قبول کیا ہے۔ لہٰذا اِسے کسی بھی اعتبار سے

مشکوک کرنے کی سعی کی نہ تحسین کی جا سکتی ہے اور نہ ہی اِسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

اس گفتگو میں غامدی صاحب کے اِستدلال کی پہلی وجہ کے ساتھ ساتھ دوسری وجہ کا مختصر جائزہ بھی قارئین کے سامنے آ گیا ہے۔ کیونکہ غامدی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ''قرآن مجید نزول مسیح جیسے غیر معمولی واقعہ سے خاموش کیوں ہے؟'' ہم ثابت کر چکے ہیں کہ قرآن مجید اِس سلسلہ میں خاموش نہیں، بلکہ غامدی صاحب کی کم علمی یا تجاہلِ غامدیانہ ہے۔ ورنہ قرآن پاک نے نزول مسیح کی طرف واضح اشارات کیے ہیں۔ اِس سلسلہ میں مزید آیات بھی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن ''سالبہ کلیہ کے رد کے لیے موجبہ جزئیہ ہی کافی ہے۔''

۳)......غامدی صاحب کے تیسرے اعتراض کی بنیاد سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۷ میں موجود عیسیٰ علیہ السلام کا روز قیامت باری تعالیٰ سے ہونے والا مکالمہ ہے۔ آیت یہ ہے:

''فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم، وانت علیٰ کل شیء شھید۔ (قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے:) پس جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا۔''

اس سے غامدی استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ: اس آیت میں فلما توفیتنی الخ کا معنی ہے کہ: ''جب تو نے مجھے وفات دیدی تو میں ذمہ دار نہ رہا۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔ ورنہ قیامت کے دن یہ کیسے کہیں گے مجھے نصاریٰ کا عقیدہ بگڑنے کا علم نہیں؟ کیونکہ بعد نزول، وہ نصاریٰ کے عقیدے سے مطلع ہو چکے ہوں گے۔

علماء اسلام نے اِس استدلالِ فاسد کے کئی جوابات دیئے ہیں:

[۱]......آیت مذکورہ میں فلما توفیتنی کا معنی وفات اور موت نہیں بلکہ رفع اور قبض ہے۔ تمام مفسرین اور مجتہدین نے آیت مذکورہ کا یہی معنی کیا ہے۔

[۲]......آیت مذکورہ میں موت وحیات کا تقابل ہی نہیں ہے، بلکہ موجودگی اور عدم موجودگی کا تقابل ہے، جس پر ''مادمت فیھم'' کے الفاظ واضح طور پر دلالت کر رہے ہیں۔ چنانچہ ''مادمت فیھم'' فرمایا گیا، ''مادمت حیًا'' نہیں فرمایا۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے زمانہ موجودگی میں امت کے نگران تھے، عدم موجودگی کے وہ ذمہ دار نہیں۔ ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی زمانہ ایسا بھی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہونے کے باوجود اپنی امت کے درمیان موجود نہ ہوں۔ چنانچہ یہ زمانہ ان کے آسمان کی طرف اٹھا لیے جانے کے بعد کا ہے۔

[۳]......حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہاں قول کی نفی فرما رہے ہیں، علم کی نہیں۔ آیت یہ ہے:

’’ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَـٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ـ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ‘‘[المائدہ:۱۱۶،۱۱۷]

اور جب کہے گا اللہ، اے میرے عیسیٰ مریم کے بیٹے! کیا تُو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے؟ کہا: (عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے: اے اللہ!) تُو پاک ہے، مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا، تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ تو ہی جاننے والا ہے چھپی باتوں کا۔ میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر (وہی) جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمھارا۔

اس آیت کریمہ سے وہ مقصد ہرگز معلوم نہیں ہوتا جو غامدی صاحب اپنی ’’مہارت‘‘ کی بنا پر معلوم کیے بیٹھے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اعتراض وارد ہوتا ہے جو غامدی صاحب بزور وارد کر رہے ہیں۔ لہٰذا (غامدی صاحب کے اسلوب اور انداز کے مطابق) یہ بالکل قطعی ہے کہ آیت مبارکہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اپنی قوم کی حالت سے لاعلمی کے اظہار اور اس پر ان کی وفات کو مرتب کرنا کسی بھی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی کوئی اہل علم ایسا کر سکتا ہے۔

آیت کے درمیان جو لاعلمی کی بات ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے اپنے عدم علم کا اظہار ہے۔ جیسا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں کے بارے سوال کے جواب میں کہیں گے: ’’لا علم لنا‘‘۔

۴)......غامدی صاحب کی چوتھی دلیل سورۂ آل عمران کی وہی آیت ہے، جس پر بحث ابتدا میں گزر چکی ہے۔ طرزِ استدلال، توفی کا معنی، مفسرین کے حوالے، حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر اور تقدیم وتاخیر کی بحث سمیت تمام امور مفصل بیان ہو چکے ہیں۔

آخر میں جی چاہتا ہے کہ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی رحمہ اللہ کے پرشوکت علمی اقتباس پر اس تحریر کو اختتام پذیر کریں، جو انہوں نے قرآن کریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع جسمانی کی طرح نزول کے صاف طور پر مذکور نہ ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

قرآن کریم میں نزول کا مسئلہ بھی رفع جسمانی کی طرح صاف طور پر کیوں ذکر میں نہیں آیا:

’’قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے اور مقتول نہ ہونے کا تذکرہ صرف یہود کے اسباب لعنت کے بیان کے ضمن میں آ گیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن شریف

نے یہ نقل کیا ہے کہ یہود واقع کے خلاف ان کے قتل کرنے کے مدعی ہیں اور نصاری گو بہت سی بے تحقیق باتیں بناتے ہیں مگر اجمالاً ان کے رفع کے قائل ہیں۔ اس لیے یہاں قابل توجہ صرف یہی مسئلہ تھا کہ وہ مقتول ہوئے یا نہیں اور اگر مقتول نہیں ہوئے تو آسمان پر اٹھائے گئے یا نہیں۔ رہا ان کے نزول کا مسئلہ تو وہ کسی مقام پر بھی زیر بحث نہیں آیا۔ پھر ہم کو کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا کہ نزول یا عدم نزول کا مسئلہ کبھی اہل کتاب نے آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا تھا۔ لہٰذا جب یہ مسئلہ کہیں آپ کے سامنے زیر بحث ہی نہیں آیا اور نہ قرآن کریم ہی کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو اب صراحت کے ساتھ نزول کا لفظ ذکر ہوتا تو کیسے ہوتا۔ ہاں! اگر نزول کا مسئلہ بھی اس وقت کہیں زیر بحث آ جاتا تو جس طرح یہاں رفع کا لفظ صراحت کے ساتھ مذکور ہوا تھا۔ نزول کا لفظ بھی یقیناً اسی طرح صراحت کے ساتھ ذکر ہو جاتا، لیکن جب یہ مسئلہ کہیں بھی زیر بحث آیا ہی نہیں تو اب قرآن کریم میں صراحتاً لفظ نزول کا مطالبہ کرنا کتنی بڑی بے انصافی ہے!! اور اگر بالفرض یہ لفظ مذکور ہو بھی جاتا جب بھی حیلہ جُو طبیعتوں کو فائدہ کیا تھا؟ آخر صحیح سے صحیح حدیثوں میں یہ لفظ بار بار آیا اور آنحضرت ﷺ کی جانب سے قسموں کے ساتھ آیا مگر پھر ان کو کیا فائدہ ہوا؟

پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول یعنی آمد ثانی کا مسئلہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو مگر وہ اس وقت زیر بحث ہی نہ تھا، ہاں قومی تاریخ کے لحاظ سے جو فرقہ ان کے رفع جسمانی کا قائل تھا وہ ان کی آمد ثانی کا بھی منتظر تھا اور اب تک ہے۔ اور جو ان کے قتل کا مدعی تھا ان کے نزدیک ان کی آمد ثانی محل بحث ہی کیا ہو سکتی تھی۔ پس اگر یہاں قرآنی فیصلہ ان کے رفع کا ہو جاتا ہے تو ان کے نزول کا مسئلہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے اور اگر یہ تحقیق ہو کہ وہ مقتول ہو گئے (والعیاذ باللہ) تو پھر ایک شخص کی دوبارہ آمد کی بحث ہی پیدا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اگر قرآن کریم کی کسی آیت میں رفع کے صاف لفظ کی طرح نزول کا لفظ نہیں تو اس سے مسئلہ نزول کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، پھر خاص نزول کا لفظ مذکور ہونا ہی کیوں ضروری ہے؟ جب کہ قرآن کریم یہ تصریح کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابھی وفات نہیں پائی اور قیامت سے پہلے تمام اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا باقی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے اور ابھی تک اس کو موت نہیں آئی ضرور ہے کہ وہ زمین پر نازل ہو۔ تاکہ اہل کتاب ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان پر ایمان لے آئیں اور وہ اپنی مقررہ مدت عمر پوری کر کے دنیا کی آنکھوں کے سامنے وفات پا کر مدفون ہوں۔ اسی لیے حضرت ابوھریرہؓ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی حدیث روایت کر کے فرماتے ہیں اگر اس پیش گوئی کو تم قرآن کریم کے الفاظ میں دیکھنا چاہو تو سورۃ نساء کی یہ آیت پڑھ لو: "وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن به قبل موته ویوم القیامة یکون علیھم شھیدا"

آیت بالا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لیے جو سب سے زیادہ صاف اور واضح لفظ ہو سکتا تھا وہ "قبل موته" کا لفظ ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ جس زندہ شخص کی اب تک وفات ثابت

نہیں ہوئی، اس کی حیات کے لیے کسی اور دلیل کی ضرورت کیا ہے؟ یہاں جو شخص ان کی موت کا مدعی ہو، یہ فرض اس کا ہے کہ وہ ان کی موت ثابت کرے۔ پھر آیت بالا میں خاص اہل کتاب کے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل اسلام کو ان پر اس وقت بھی صحیح ایمان حاصل ہے۔ لہٰذا جن کا ایمان لانا قابل ذکر ہو سکتا تھا وہ صرف اہل کتاب کا ایمان ہے۔ اب اگر فرض کر لو کہ اہل اسلام بھی نصاریٰ کی طرح ان کے سولی پر چڑھنے کو تسلیم کرتے ہوں یا یہود کی طرح ان کے مردہ ہونے کے قائل ہوں تو پھر اہل اسلام کا ایمان بھی ان پر صحیح ایمان نہیں رہتا۔ اہل کتاب اگر اس بارے میں ایک غلطی پر ہیں تو اہل اسلام بھی دوسری اعتبار سے غلطی میں مبتلا ہیں، پھر اس تخصیص کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ قرآن کریم نے جہاں ان کی موت کی صاف نفی فرما کر یہ بتایا ہے کہ ابھی آئندہ زمانے میں اہل کتاب کو ان پر ایمان لانا باقی ہے، اسی طرح دوسری طرف یہ بھی تصریح کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان پر شہادت دینا باقی ہے۔ ان دونوں باتوں کے لیے ان کی تشریف آوری لازمی ہے، کیونکہ شہادت شہود سے مشتق ہے۔ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام جب تک کہ پھر تشریف لا کر ان میں موجود نہ ہوں ان پر گواہی کیسے دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے'' وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ '' [المائدۃ، آیت نمبر ۱۱۷] یعنی میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں موجود رہا اور اب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگران حال تھا۔ آیت بالا سے معلوم ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر دو زمانے گزرے ہیں، ان میں سے آپ کی شہادت کا زمانہ صرف وہ ہے جس میں کہ آپ ان کے اندر موجود تھے۔ اور دوسرا زمانہ جس میں کہ آپ ان میں موجود نہ تھے۔ وہ آپ کی شہادت سے خارج ہے۔ پس آئندہ اہل کتاب پر آپ کی شہادت کے لیے دوبارہ آپ کی تشریف آوری ضروری ٹھہری۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی دلیل فرماتے ہیں۔ حیرت ہے کہ یہ صحابی جلیل القدر تو نزول کی پیش گوئی کو قرآنی پیش گوئی کہتا ہے، ایک بدنصیب جماعت وہ ہے جو اس کو حدیثی پیش گوئی بھی کہنے کو تیار نہیں۔''

[احتساب قادیانیت، ۴/۲۷۷]

دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہر مسلمان کو قرآن وسنت سے ثابت شدہ جمہور امت کے محکم عقیدہ ''حیات مسیح'' پر کاربند رہنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اور اس کا انکار کرنے والوں، بے جا اعتراضات اور اس میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی نامراد کوششیں کرنے والوں کو ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین۔

☆......☆......☆......☆

مولانا نور محمد تونسوی رحمہ اللہ

عمار خان ناصر پر جاوید غامدی کے اثرات

حضرات گرامی!

گذشتہ چند سالوں سے مولانا محمد عمار خان صاحب ناصر اہل حق کی نظروں میں متنازع فیہ شخصیت قرار پا چکے ہیں کہ وہ جاوید غامدی پرویزی کی تقلید میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کی راہ سے ہٹ کر گمراہی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں اور ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب اپنے بیٹے کی ہر صحیح اور غلط بات کے دفاع میں پیش پیش ہیں، اس صورت حال میں ان لوگوں نے اپنی صفائی کے لیے اپنے ماہنامہ الشریعہ کی ایک خصوصی اشاعت شائع کی ہے جس کا عنوان ہے:

''ماہنامہ الشریعہ کا طرز فکر اور پالیسی......اعتراضات واشکالات کا جائزہ''

یہ خصوصی اشاعت جون ۲۰۱۴ء کی ہے، اِس اشاعت خاص میں عمار خان ناصر کا ایک مضمون بعنوان ''میری اختلافی آرا اور ان کی علمی بنیاد'' بھی شائع ہوا ہے، اس میں عمار خان نے اپنے اوپر عائد کردہ الزامات کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے، من جملہ اعتراضات کے عمار خان ناصر پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ وہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جمہور سے الگ موقف رکھتے ہیں اور اسے عقیدے کا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ بندہ عاجز نے بھی بعض علماء کی زبانی یہ سن رکھا تھا کہ موصوف عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ سے جداگانہ رائے رکھتے ہیں۔

جب ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت دیکھی تو حیران رہ گیا کہ موصوف نہ صرف جداگانہ رائے رکھتے ہیں بلکہ انھوں نے اِس عقیدہ میں اقرار اور انکار کی ایسی فضا پیدا کی ہے کہ آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے، موصوف کے اِس طرز بیان سے قائلین حیات عیسیٰ کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا مگر منکرین حیات عیسیٰ کو تسکین قلبی نصیب ہوگی، بلکہ ایک خالص اور علمی خاندان سے تعلق کے باوجود اِس عقیدہ پر ایسی شرم ناک جارحیت کی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی مات کر دیا ہے اور اسلامی عقیدہ کی بنیاد صرف کھوکھلی ہی نہیں کی بلکہ اس کی بیخ کنی کر دی ہے۔ جو شخص بھی عمار خان ناصر کی یہ تحریر پڑھے گا اُس کے لیے انکار حیات عیسیٰ علیہ السلام کی راہ آسان ہو جائے گی، گویا موصوف نے منکرین حیات عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ جب موصوف نے اس عقیدہ کی اہمیت کو ہی ختم کر دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ: ''یہ عقیدے کا مسئلہ ہی نہیں

ہے اور اس کے ماننے نہ ماننے سے آدمی کے اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" تو اب کون ہے کہ اس عقیدہ پر برقرار رہے، الا ماشاء اللہ۔ موصوف کی اِس تحریر سے مرزا غلام احمد قادیانی کی ذرّیت کو نہایت خوشی ہوئی ہوگی کہ ا" ں دیوبند کی طرف منسوب ایک شخص نے اُن کے ہاتھ کس قدر مضبوط کر دیئے اور کتنی اُن کی سپورٹ کر دی، شاید مرزائی یوں بھی کہنے لگیں: "الفضل ما شهدت به الأعداء".

آمدم برسرِ مطلب!

آپ سب سے پہلے وہ تحریر ملاحظہ فرمائیں جو حیات عیسیٰؑ کے بارے میں عمار خان ناصر نے لکھی ہے، پھر اس کے بعد موصوف کی جارحیت کو بیان کیا جائے گا، موصوف نے چار نمبروں میں وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

(۱).....کتب حدیث میں متعدد روایات میں قیامت کے قریبی زمانے میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے اور دجال کو قتل کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ محدثین کے معیار کے مطابق یہ روایات مستند اور قابل اعتماد ہیں، اس لئے نبی ﷺ کی دوسری بہت سی پیشگوئیوں کی طرح اس پیش گوئی کے سچا ہونے پر بھی یقین رکھنا آپ پر ایمان کا تقاضا ہے۔ [الشریعہ، خصوصی اشاعت:۱۸۴]

بندہ عاجز عرض گزار ہے کہ اگر موصوف اس عقیدہ کو یہاں تک محدود رکھتے اور اس پر کسی قسم کی حاشیہ آرائی نہ کرتے تو ہمیں حسن ظن نصیب ہوتا، لیکن عمار خان ناصر نے اس پر حاشیہ آرائی کر کے ہمارے حسن ظن کو متزلزل کر دیا، چنانچہ نمبر دو میں لکھتے ہیں:

(۲) اس پیشگوئی سے متعلق علمی طور پر بعض اشکالات یقیناً پیش آتے ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کا اس اہم واقعے کی صراحت سے صرف نظر کرنا اور متعلقہ احادیث میں بیان ہونے والے بعض امور کو بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہ ہونا تاہم چونکہ باعتبار سند یہ روایات قابل اعتماد ہیں اور ان میں وضع کے آثار نہیں پائے جاتے اس لئے اشکالات کو اشکالات ہی کے درجے میں رکھنا زیادہ قرینِ احتیاط ہے، ان کی بنیاد پر پیش گوئی کا مطلقاً انکار کر دینا درست نہیں خاص طور پر جبکہ روایات سے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ بالمعنیٰ نقل ہوئی ہیں اور کسی بھی واقعے سے متعلق تفصیلات کے نقل کرنے میں راویوں کا سوءِ فہم کا شکار ہو جانا ذخیرۂ حدیث میں ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ [ماہنامہ الشریعہ، اشاعت خاص ۱۸۵]

موصوف کا کہنا ہے کہ "اس پیشگوئی سے متعلق علمی طور پر بعض اشکالات یقیناً پیش آتے ہیں۔" اس بارہ میں گزارش ہے کہ علمی اشکالات صرف حیات عیسیٰ علیہ السلام پر پیش آتے ہیں یا تمام عقائد اسلام پر علمی اشکالات پیش آتے ہیں؟ تو کیا علمی اشکالات پیش آنے کی وجہ سے تمام عقائد اسلام کو متزلزل کر دیا جائے گا؟ اگر نہیں کیا جائے گا اور یقیناً نہیں کیا جائے گا، تو ایسی بات کرنے سے کیا فائدہ جس سے انکار کی

فضا پیدا ہو؟ بے شک موصوف نے کہا ہے: ''کہ اشکالات کو اشکالات ہی کے درجے میں رکھنا زیادہ قرین احتیاط ہے۔'' لیکن یہ حملہ کر کے اس پر پردہ داری مقصود ہے۔

موصوف نمبر۲ میں لکھتے ہیں: ''اور متعلقہ احادیث میں بیان ہونے والے بعض امور کا بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہ ہونا۔'' اس بارے میں گزارش ہے کہ احادیث متواترہ میں بیان ہونے والے بعض امور کون سے ہیں جو بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہیں ہیں؟ اس کی کوئی مثال پیش کر کے اپنی بات کو سچ کر کے دکھایئے۔!!

نیز موصوف نمبر۲ میں لکھتے ہیں: ''مثلاً قرآن مجید کا اس اہم واقعے کی صراحت سے صرف نظر کرنا۔'' قارئین کرام! عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام پر عمار خان ناصر کا یہ ایک خطرناک حملہ ہے کہ قرآن مجید میں عقیدہ مسیح علیہ السلام صراحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔'' فرمایئے جناب! کیا آیاتِ مذکورہ......

وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ [سورۃ الزخرف آیت ۶۱۔ پارہ ۲۵]

ترجمہ از حضرت تھانویؒ: ''اور وہ قیامت کے یقین کا ذریعہ ہیں۔''

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا. بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ، وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا. وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ، وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا. [النساء: ۱۵۷، ۱۵۸، پارہ ۶]

ترجمہ از حضرت تھانویؒ: اور انہوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں اور کوئی شخص اہل کتاب سے نہ رہے گا۔ مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام کی اپنے مرنے سے پہلے ضرور تصدیق کرے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر گواہی دیں گے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ. [آل عمران: ۵۵، پارہ ۳]

ترجمہ از تھانویؒ: جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں سے پاک کرنے والا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو منکر ہیں روز قیامت تک۔

وغیرہ آیات قرآنیہ حیات عیسیٰ علیہم السلام پر نص قطعی کی حیثیت نہیں رکھتیں؟ نیز اگر کوئی مسئلہ اجمالی رنگ میں قرآن مجید میں مذکور ہوا ہے اور احادیث متواترہ میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے تو کیا یہ کہہ کر ''یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ قرآن میں مذکور نہیں ہے۔'' اس کو کھوکھلا کر دیا جائے گا؟

عمار خان ناصر اس تحریر کے نمبر۳ میں لکھتے ہیں:

(۳)......نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ایک پیش گوئی کے طور پر سیدنا مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر اعتقاد رکھتے ہوئے یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے لحاظ سے یہ عقیدے کا مسئلہ نہیں یعنی کوئی ایسی بات نہیں جسے نبی ﷺ نے ایمانیات کے ایک جزو کے طور پر بیان کیا ہو۔ ایمانیات کے معروف اور مسئلہ اجزاء کے ساتھ موازنے سے اس مسئلے کی یہی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ کی صفات، تقدیر، رسالت، ختم نبوت قیامت وغیرہ ان تمام عقائد پر اسلام کے اعتقادی وعملی نظام کی بنیاد ہے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جگہ سے ہٹانے سے پورا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اس کے برخلاف احادیث میں بیان ہونے والے مستقبل واقعات میں سے کسی واقعے کے رونما ہونے یا نہ ہونے پر اسلام کی دینیاتی نظام کا ہرگز مدار نہیں اور بالفرض ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہ ہونا ہوتو بھی اسلام کے اعتقادی نظام میں کسی طرح کا کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔[ایضا:۱۸۵!]

عمار خان ناصر کی یہ سب باتیں اظہر من الشمس ہیں، امید ہے ہر پڑھا لکھا آدمی سمجھ لے گا کہ موصوف کیا فرماتے ہیں۔ البتہ ہماری دانست کے مطابق موصوف نے ایک ہی سطر میں دو متضاد باتیں کہہ دی ہیں۔ سطر کے اول میں لکھتے ہیں: ’’سیدنا مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر اعتقاد رکھتے ہوئے یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے......‘‘ اور اسی سطر کے آخر میں فرماتے ہیں: ’’یہ عقیدے کا مسئلہ نہیں ہے‘‘ اب موصوف ہم جیسے انجان لوگوں کو بتائیں گے کہ اعتقاد اور عقیدے میں کیا فرق ہے؟

قارئین کرام! موصوف کی مذکورہ باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید حیات عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے دوبارہ نزول الی الارض کی صراحت سے صرفِ نظر کرتا ہے۔ اس لئے موصوف نے اس مسئلہ کے بارے میں آیات قرآنیہ کا تذکرہ نہیں کیا اور لکھا ہے کہ:

(۱)......اس پیش گوئی سے متعلق اشکالات پیش آتے ہیں۔

(۲)......اور متعلقہ احادیث میں بیان ہونے والے امور کا بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہ ہونا۔

(۳)......اور کسی بھی واقعہ سے متعلق تفصیلات کے نقل کرنے میں راویوں کا سوءِ فہم کا شکار ہوجانا۔

اور موصوف نے نمبر۳ میں لکھا ہے:

(۴)......اپنی بنیادی نوعیت کے لحاظ سے یہ عقیدے کا مسئلہ نہیں۔

(۵)......یعنی کوئی ایسی بات نہیں جسے نبی ﷺ نے ایمانیات کے ایک جزو کے طور پر بیان کیا ہو۔

(۶)......ایمانیات کے معروف اور مسلمہ اجزاء کے ساتھ موازنے سے اس مسئلے کی یہی نوعیت واضح ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ کی صفات، تقدیر، رسالت، ختم نبوت، قیامت وغیرہ ان تمام عقائد پر اسلام کے اعتقادی

و عملی نظام کی بنیاد ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جگہ سے ہٹانے سے یہ پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف احادیث میں بیان ہونے والے مستقبل کے واقعات میں سے کسی واقعے کے رونما ہونے یا نہ ہونے پر اسلام کے دینیاتی نظام کا ہرگز مدار نہیں اور بالفرض ان میں سے کوئی ایک واقعہ بھی رونما نہ ہونا ہو تو بھی اسلام کے اعتقادی نظام میں کسی طرح کا کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔

اور موصوف نے نمبر ۴ میں لکھا ہے:

(۷)......سیدنا مسیح علیہ السلام کی آمد ثانی کی روایات محققین کے نزدیک اپنی اصل کے لحاظ سے اخبار احاد ہیں۔

(۸)......اور اس دائرے میں آتی ہے جہاں روایات کی تحقیق و تفتیش کے ضمن میں باہم مخالف قرائن کی روشنی میں اشتباہ کا لاحق ہو جانا ممکن ہے۔

(۹)......بعض صحابہؓ کے آثار سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی قطعی الثبوت اور متواتر روایت کے طور پر نہیں جانتے تھے۔

(۱۰)......اس وجہ سے کوئی صاحب علم اگر ان روایات کے استناد سے اختلاف کریں تو یہ ایک علمی نوعیت کا اختلاف ہوگا، جس پر دلائل کی روشنی میں شائستگی سے ہی تنقید کرنی چاہئے اور اس مسئلے کو ایمانیات کے بجائے احادیث کے حوالے سے بحث و تحقیق کے درجہ میں رکھنا چاہئے۔ تلک عشرة كاملة

بندہ عاجز موصوف سے یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ وہ کون سے محققین ہیں جو احادیث حیات عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے دوبارہ نزول الی الارض کی روایات کو اخبار احاد کہتے ہیں؟ اور موصوف نے جو یہ فرمایا کہ "بعض صحابہ کے آثار سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی قطعی الثبوت اور متواتر روایت کے طور پر نہیں جانتے تھے۔" اب ہمیں بتائیں کہ وہ کون سے صحابہ کرام ہیں جو فرماتے ہیں، جو یہ کہتے ہوں کہ حیات عیسیٰ کا عقیدہ قطعی الثبوت نہیں ہے اور متواتر روایات سے بھی ثابت نہیں ہے۔"

قارئین کرام! یہ وہ باتیں ہیں جن کے ذریعہ عمار خان ناصر نے اس عقیدہ کو ایسا متزلزل کر دیا ہے کہ صرف اس کی بنیادوں کو کھوکھلا ہی نہیں کیا بلکہ اس کی بیخ کنی کر دی، موصوف کا یہ نظریہ جمہور اہل سنت بلکہ جملہ علماء اسلام کے عقائد کے برعکس ہے، لہٰذا بندہ عاجز آپ کی خدمت میں امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر رحمہ اللہ کی کتاب "توضیح المرام فی نزول المسیح علیہ السلام" کے چند اقتباسات پیش کرتا ہے، کیونکہ اولاً تو امام اہل سنتؒ عمار خان ناصر کے جد امجد ہیں تاکہ دادے اور پوتے کے عقائد کا موازنہ کیا جا سکے، ثانیاً اس لئے کہ جو کچھ حضرت امام اہل سنتؒ نے لکھا ہے وہی جملہ علماء اسلام کا عقیدہ اور نظریہ ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمایئے؟ حضرت امام اہل سنتؒ لکھتے ہیں:

(ا)......توحید و رسالت اور قیامت کے عقیدے کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیاءِ بنی اسرائیل کے (علی جمیع وعلی نبینا الصلوات والتسلیمات) آخری پیغمبر تھے، ولادت سے لے کر رفع الی السماء تک ان کی زندگی بڑے عجیب رنگ میں گزری اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر عجیب وغریب معجزات صادر فرمائے، جن کا واضح ذکر قرآن کریم اور احادیث متواترہ اور کتب تاریخ میں موجود ہے ان کی زندگی کی مختلف پہلو ہیں ایک یہ کہ ان کو زندہ جسم اور روح کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے اور وہ زندہ ہیں اور قیامت سے پہلے نازل ہو کر دجال لعین کو قتل کریں گے اور یہود ونصاریٰ وغیرہم کفار کا صفایا کریں گے اور مذہب اسلام کو خوب خوب چمکائیں گے اور شادی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی اور چالیس سال تک منصفانہ اور عادلانہ حکومت کریں گے پھر ان کی وفات ہوگی اور مسلمان ان کا جنازہ پڑھیں گے اور مدینہ طیبہ میں روضہ اقدس کے اندر ان کو دفن کیا جائے گا ان کے رفع الی السماء حیات اور نزول الی الارض کے بارے میں تمام اہل اسلام متفق ہیں کسی کا ان امور میں کوئی اختلاف نہیں، ہاں بعض فلاسفہ، ملاحدہ اور قادیانی اور لاہوری مرزائی وغیرہم باطل اور مردود فرقے ان کی حیات اور نزول کے منکر ہیں، اہل اسلام کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء حیات اور نزول ان کے عقائد میں شامل ہے۔ [توضیح المرام:۹۔ بلفظہ]

حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول من السماء کا عقیدہ ضروریات دین میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرات ائمہ مجتہدینؒ حضرات فقہاء اسلام حضرات محدثین حضرات مفسرین کرام اور حضرات صوفیاء عظام وغیرہم سبھی بزرگان دین اس عقیدہ کو عقائد اور ایمانیات میں شامل کرتے ہیں اور صریح اور واضح الفاظ میں اس کو حق اور ایمان کہتے ہیں۔'' [ایضاً:۱۹]

جن علماء کی کتابوں سے امام اہل سنتؒ نے عبارات پیش کی ہیں ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

(ا) حضرت امام ابوحنیفہ (الامام الاعظم نعمان بن ثابت المتوفی ۱۵۰ھ)

(۲) امام ابوجعفر الطحاوی (احمد بن محمد بن سلامہ الازدی المتوفی ۳۲۱ھ)

(۳) قاضی عیاض (ابوالفضل عیاض بن موسیٰ المتوفی ۵۴۴ھ)

(۴) امام اہل السنۃ والجماعۃ الشیخ ابوالحسن الاشعری (علی بن اسماعیل بن اسحاق بن سلام الاشعری المتوفی ۳۳۰ھ)

(۵) علامہ اندلسی (ابوحیان محمد بن یوسف الاندلسی المتوفی ۷۴۵ھ)

(۶) علامہ تفتازانی (سعدالدین مسعود بن عمر تفتازانی المتوفی ۷۹۲)

(۷) علم عقائد کی مستند اور معروف کتاب المسایرۃ (للشیخ الامام کمال الدین محمد بن ہمام الدین عبدالواحد الشہیر بابن الہمام المتوفی ۸۶۱)

(۸)اور اس کی شرح المسامرۃ (للشیخ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی شریف المقدسی التوفی ۹۰۵ھ)

(۹)علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی التوفی ۱۰۶۷ھ۔

(۱۰)مشہور معتمد متکلم امام السفارینی محمد بن احمد بن سلیمان السفارینی التوفی ۱۱۸۸ھ

(۱۱)حافظ ابن حجرؒ

(۱۲)رئیس الصوفیاء الشیخ الاکبر محی الدین محمد بن علی الحاتمی الطائی التوفی ۶۳۸ھ

(۱۳)علامہ ابن حزم ابو محمد علی بن حزم الظاہری الاندلسی التوفی ۴۵۶ھ

(۱۴)امام شعرانی (الشیخ عبدالوہاب بن احمد بن علی الشعرانی) التوفی ۹۷۳ھ

(۱۵)امام سیوطی (ابوالفضل جلال الدین ابوبکر السیوطی) التوفی ۹۱۱ھ

(۱۶)امام البکری (ابوالحسن محمد بن عبدالرحمٰن البکری الصدیقی الشافعی) التوفی ۹۰۵ھ

(۱۷)علامہ سید محمود آلوسی التوفی ۱۲۷۰ھ

(۱۸)نواب صدیق بن حسن بن علی قنوجی التوفی ۱۳۰۷ھ

(۱۹)علامہ ابوعبداللہ الابی (محمد بن خلیفۃ الابی المالکی التوفی ۸۲۷ھ

(۲۰)الاعلامۃ المحدث محمد بن جعفر الکتانی (التوفی ۱۳۴۵ھ

(۲۱)غیر مقلدین کے پیشوا قاضی شوکانی (محمد بن علی الشوکانی التوفی ۱۲۵۰

(۲۲)محقق الاحناف علامہ زاہد الکوثری (التوفی ۱۳۷۲ھ)

حضرت امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ ان علماء اسلام کی عبارات پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء ان کی حیات اور پھر نزول من السماء قرآن کریم سے ثابت ہے، ہم بنظر اختصار قرآن کریم سے صرف دو ہی دلیلیں عرض کرتے ہیں اور پھر ان کی معتبر اور مستند حضرات مفسرین کرام سے باحوالہ تفسیریں نقل کرتے ہیں، غور وفکر کرنا قارئین کا کام ہے۔ دو آیتیں وہی ہیں جن کو ہم نے سابقاً ذکر کر دیا ہے۔“

امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ دو آیتوں کی تفسیر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

”پہلی آیت کریمہ اور اس میں نقل کردہ تفاسیر کی طرح اس دوسری آیت کریمہ اور اس کی تفسیر میں نقل کردہ ٹھوس اور مضبوط حوالوں سے یہ بات بالکل عیاں ہوگئی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما الصلوۃ والسلام کا رفع الی السماء ان کی حیات اور قیامت سے پہلے ان کا زمین پر نازل ہونا نصوص قطعیہ قرآنی آیات سے ثابت ہے جس کا انکار کافر ملحد اور زندیق کے سوا کوئی نہیں کر سکتا باطل پرستوں پر براہین قاطعہ اور ادلہ ساطعہ کا کچھ اثر نہیں ہوتا وہ اپنی انا اور ضد پر قائم رہتے ہیں بھلا شیطان کی ہدایت کس کے بس میں ہے۔

بدلنا ہے تو مے بدلو، طریق مے کشی بدلو
وگرنہ ساغر و مینا بدل جانے سے کیا ہوگا

[ایضاً:۴۸،۴۷]

نیز امام اہل سنت رحمۃ اللہ علیہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر دس حدیثیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ دس حدیثیں بطور نمونہ اور مثال کے باحوالہ عرض کردی گئی ہیں ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بے شمار متواتر اور مرفوع احادیث موجود ہیں اور آثار حضرات صحابہ کرامؓ اور موقوفات تابعین اور تبع تابعین اور اقوال حضرات سلف وخلف اور اجماع امت اس پر مستزاد ہے مگر جن لوگوں کے دلوں پر کفر والحاد کے تالے لگے ہوئے ہیں ان پر حق کی کسی بات کا اثر نہیں ہوتا وہ اپنے الحاد پر نازاں ہیں

رہے نہ اہل خرد تو بے خرد چمکے
فروغ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

[ایضاً:۹۲،۹۳]

حضرت امام اہل سنتؒ اپنی کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

"جملہ اہل اسلام اس کو بخوبی جانتے ہیں کہ ختم نبوت کے عقیدہ کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع الی السماء ان کی حیات اور پھر نزول الی الارض بھی قطعی اور محکم دلائل سے ثابت ہے جو کسی تاویل کا محتاج نہیں لہٰذا جو طبقہ اور گروہ ایسے بنیادی عقیدوں کا انکار یا تاویل کرکے کافروں میں شامل ہونا چاہتا ہے تو بڑے شوق سے ایسا کرے اسے کون روک سکتا ہے؟

کافر ہوئے جو آپ تو میرا قصور کیا
جو کچھ کیا وہ تم نے کیا بے خطا ہوں میں

قارئین کرام! اب ہم تقابل کی صورت میں حضرت امام اہل سنتؒ اور اُن کے پوتے کے نظریات کو پیش کرتے ہیں تاکہ بات خوب ذہن نشین ہوجائے۔

حضرت امام اہل سنتؒ کا موقف	عمار خان ناصر کا نظریہ
(۱) حیات مسیحؑ قرآن کی نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔	(۱) قرآن اس عقیدے کی صراحت سے صرف نظر کرتا ہے۔
(۲) اس عقیدے میں کوئی اشکالات پیش نہیں آتے۔	(۲) بعض اشکالات یقیناً پیش آتے ہیں۔

(۳) اس عقیدہ کے کوئی راوی سوء فہم کا شکار نہیں ہوئے۔	(۳) راوی سوء حفظ کا شکار ہوئے۔
(۴) یہ عقیدہ ایمانیات میں داخل ہے۔	(۴) یہ عقیدہ ایمانیات میں داخل نہیں۔
(۵) اللہ کی صفات تقدیر رسالت ختم نبوت حیات عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ تمام عقائد اسلامیات میں داخل ہے۔	(۵) تقدیر اللہ کی صفات ختم نبوت وغیرہ کی طرح یہ مسئلہ عقائد اسلامیہ میں داخل نہیں ہے۔
(۶) حیات مسیح عقیدے کا مسئلہ ہے۔	(۶) یہ مسئلہ عقیدے کا نہیں ہے۔
(۷) اس عقیدے کا منکر کافر وملحد ہے۔	(۷) اس کا منکر کافر نہیں ہے۔
(۸) اس عقیدے میں کوئی اشتباہ لاحق نہیں ہوتا۔	(۸) اشتباہ لاحق ہو جانا ممکن ہے۔
(۹) صحابہ کرام سے لے کر آج تک تمام مسلمان اس کو قطعی الثبوت اور متواتر جانتے ہیں۔	(۹) بعض صحابہ کے آثار سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اسے قطعی الثبوت اور متواتر نہیں جانتے تھے۔
(۱۰) اس عقیدے سے اختلاف کرنے والا قادیانی (کافر) ہے۔	یہ ایک علمی نوعیت کا اختلاف ہوگا جس پر دلائل کی روشنی میں شائستگی ہی سے تنقید کرنی چاہئے اور اس مسئلے کو ایمانیات کی بجائے احادیث کے حوالے سے بحث اور تحقیق کے درجہ میں ہی رکھنا چاہئے۔

تلك عشرة كاملة

اس تقابلی موازنہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمار خان ناصر نے اپنے جدامجد، امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدرؒ کی تردید میں یہ سطور تحریر کی ہیں۔

جاوید غامدی کی شاگردی کے اثرات:

جناب عمار خان ناصر نے عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام میں کھل کر اپنے جدامجد کی مخالفت کی ہے۔ اور اہل اسلام میں سے کوئی ایک عالم دین ایسا نہیں ہے جس نے عمار خان ناصر والا نظریہ اپنایا ہو۔ کیونکہ بقول امام اہل سنتؒ کے کسی صدی میں کسی عالم دین نے یہ نظریہ نہیں اپنایا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے یہ نظریہ کہاں سے پایا؟ تو ظاہر ہے کہ عمار خان ناصر نے اس عقیدہ کو کھوکھلا کرنے کے ہتھیار بدنام زمانہ مشہور ملحد جاوید غامدی سے حاصل کیے ہیں۔ اور علماء اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جاوید غامدی ملحد اور زندیق ہے اور بقول مولانا زاہد الراشدی کے عمار خان ناصران کا شاگرد اور وظیفہ کار رہا ہے۔ اور یہ بات بھی

واضح ہے کہ جاوید غامدی حیات عیسیٰ علیہ السلام کا یکسر منکر ہے۔[دیکھئے! میزان:۱۷۸،۱۷۹]

جاوید غامدی نے تو کھلم کھلا اس عقیدے کا انکار کر دیا، جبکہ عمار خان صاحب نے اقرار کے ساتھ اِس عقیدے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر کے منکرین حیات عیسیٰ کے ہاتھوں کو مضبوط کیا۔اور انکار حیات عیسیٰ علیہ السلام کی راہ کو ہموار کر دیا۔لہٰذا نسبتاً عمار خان ناصر کا اِس عقیدہ پر حملہ کرنا غامدی کے انکار سے زیادہ خطرناک ہے۔نامعلوم کتنے لوگ موصوف کی تحریر کو پڑھ کر عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔(اعاذنا اللہ منہ)

مولانا زاہد الراشدی صاحب کی خدمت میں ایک گزارش:

مولانا زاہد الراشدی کو جب کہا جاتا ہے کہ آپ کے بیٹے جاوید غامدی کے شاگرد ہیں تو مولانا راشدی صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا قاضی مظہر حسین نور اللہ مرقدہ کے اساتذہ میں مولانا عبدالستار خان نیازی مرحوم اور حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب جہلمی قدس اللہ سرہ العزیز کے اساتذہ میں مولانا محمد چراغ مرحوم جبکہ والد گرامی حضرت مولانا سرفراز صفدرؒ کے اساتذہ میں مولانا غلام محمد رحمانی مرحوم اہل حدیث کا نام آتا ہے۔[الشریعہ خصوصی اشاعت:۱۷۲]

لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ کسی فرقے کے اساتذہ کا صرف شاگرد ہونا اور بات ہے اور گمراہ استاد کی گمراہی کو اپنا لینا بالکل دوسری بات ہے۔جن بزرگوں کے نام لئے گئے ہیں ہمارے علماء نے اُن کی گمراہی کو نہیں اپنایا۔جبکہ عمار خان ناصر اپنے گمراہ استاد کی گمراہی کو اپنا چکے ہیں۔لہٰذا فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

مولانا زاہد الراشدی سے ایک سوال:

بندہ عاجز نے عمار خان ناصر اور جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے جو متضاد نظریات متعلقہ حیات عیسیٰ علیہ السلام بیان کیے ہیں، مولانا راشدی صاحب بتائیں کہ اِن میں کون سے نظریات صحیح اور کون سے غلط ہیں؟ امام اہل سنت اور جمہور اہل سنت کے نظریات صحیح ہیں یا عمار خان کے؟ میں اپیل کروں گا کہ بین بین کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے کھل کر حق بات کی حمایت فرمائیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو جزا خیر عطاء فرمائے۔

مولانا راشدی سے ایک اور سوال:

مولانا راشدی صاحب نے لکھا ہے:

”جمہور اہل سنت کے مسلمات کے دائرے کو حق کا معیار سمجھتا ہوں اور اس سے خروج کو گمراہی قرار دیتا ہوں، مگر اہل سنت میں شوافع، حنابلہ، مالکیہ، اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کو شامل سمجھتا ہوں۔“

[ایضاً:۱۷۳]

ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ کے بیٹے عمار خان ناصر نے عقیدہ حیات عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو خیالات لکھے ہیں کیا اُن سے جمہور اہل سنت سے خروج لازم نہیں آتا؟ اگر نہیں آتا تو پھر وہ کونسا طرز عمل ہوگا جس سے آدمی اہل السنۃ والجماعۃ سے خارج ہوگا؟ اور اگر اِن خیالات کے اپنانے سے آپ کا بیٹا جمہور اہل سنت سے خارج ہو چکا ہے تو پھر بقول شما وہ گمراہ ہے۔ اور ایک گمراہ کی سرپرستی اور دفاع کرنا کم از کم آپ جیسے لوگوں کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔

عمار خان ناصر کا حضرت صوفی صاحبؒ کے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر:

عمار خان ناصر حضرت امام اہل سنتؒ کے برادر صغیر مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمہ اللہ کے کندھے پر بندوق رکھ کر فائر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''استاذ گرامی اور جد مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نے اپنی تدریسی و تصنیفی زندگی کے بالکل آخری دور میں حیات ونزول مسیح علیہ السلام کے موضوع پر ''توضیح المرام'' تصنیف فرمائی، میں اُن دنوں مدرسہ نصرۃ العلوم میں تدریس کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ایک دن مدرسے پہنچا تو صوفی صاحبؒ اپنے معمول کے مطابق دفتر انتظام کے باہر چارپائی پر تشریف فرماتھے اور مدرسے کے سینئر استاذ مولانا عزیز الرحمٰن مرحوم ومغفور (آف ٹیکسلا) کے ساتھ تبادلہ خیال کر رہے تھے، میں نے سلام کیا تو مجھے بھی پاس بٹھالیا اور فرمایا کہ: بھائی! ہم شیخ الحدیث صاحب کی کتاب ''توضیح المرام'' کے بارے میں بات کر رہے ہیں، تم بتاؤ تمہاری اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ میں نے اپنے تأثر کے اظہار میں ذرا جھجک محسوس کی تو وہ سمجھ گئے اور فرمایا کہ: کھل کر اپنی رائے بتاؤ! اِس سے تمہارے دادا کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، میں نے عرض کیا: اُن کی سابقہ تصنیفات سے جو علمی وتحقیقی معیار سامنے آتا ہے، اِس کتاب میں وہ ملحوظ نہیں رکھا جاسکا۔صوفی صاحب نے اِس سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ ہم بھی یہی بات کر رہے تھے۔'' [ماہنامہ نصرۃ العلوم، مفسر قرآن نمبر:۲۷۱]

اولاً: اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب سے امام اہل سنتؒ نے یہ کتاب لکھی ہے، اُسی وقت سے عمار خان اِس کتاب کی اہمیت گرانے کے درپے رہا ہے۔

ثانیاً: اِس قسم کی باتوں سے امام اہل سنتؒ کی کتاب پر جو جارحیت کی گئی ہے، وہ دراصل اِس عقیدہ کو کمزور ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی باتوں کے کہنے سے مرزا غلام احمد قادیانی کی تائید اور منکرین حیات عیسیٰ کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ ہماری دانست کے مطابق یہ سب کچھ موصوف کی بناوٹ ہے۔ کیونکہ مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحبؒ سے ایسی باتوں کا صدور ناممکن ہے

جن سے عقیدہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کو نقصان پہنچے اور مرزا غلام احمد قادیانی کی تائید ہو اور منکرین حیاتِ عیسیٰ کے ہاتھ مضبوط ہوں۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا

(اِس بات کی تائید عمار خان صاحب کی اُس کذب بیانی سے بھی ہوتی ہے جو اُنھوں نے حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ سے متعلق کی۔ اُنھوں نے صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے لکھا تھا کہ: "حضرت امام اہلِ سنت" نزولِ مسیح کو ایک اعتقادی مسئلہ قرار دے کر اُس کا اِنکار کرنے والے کو کافر کہتے تھے، جبکہ حضرت صوفی صاحب" کی رائے اِس سے مختلف تھی۔" [الشریعہ، اشاعت خاص:۱۹۷] یہ عمار خان صاحب کا اتنا بڑا اور بدیہی جھوٹ تھا کہ عمار خان صاحب کی گمراہی پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرنے والے "بزرگ" بھی اِس پر خاموش نہ رہ سکے۔ چنانچہ وہ حضرت صوفی صاحب" کا نظریہ اُنھی کی تفسیر سے نقل فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ نزول کا عقیدہ بنیادی عقیدہ ہے، اہلِ حق سے اِس بارہ میں کسی کا اِختلاف نہیں ہے۔ متواتر اور صحیح احادیث اِس کثرت سے ہیں کہ اُن کا اِنکار کفر ہے۔ ایسا شخص اِسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔" [معالم العرفان: ۵/۶۴۷]

نیز حضرت صوفی صاحب" اپنی کتاب "مولانا سندھی کے علوم و افکار" میں لکھتے ہیں:

"مسئلہ حیات و نزولِ مسیح علیہ السلام امت کے جمیع طبقات کے درمیان ایک مسلمہ مسئلہ ہے اور یہ اعتقادی مسئلہ ہے۔ اِس میں تشکیک پیدا کرنا از حد غلط اور گمراہ کن بات ہے۔" [ص:۴۳]

جب حضرت صوفی صاحب" کی واضح، غیر مبہم اور معروف تحریرات کے ہوتے ہوئے عمار خان صاحب اُن پر بہتان باندھنے سے باز نہیں آئے تو حضرت امام اہلِ سنت" سے متعلق ایک جھوٹی بات دو مرحوم بزرگوں کی طرف منسوب کرنا اُن کے لیے کیا مشکل کام ہے!؟ [ادارہ])

ثالثاً: عمار خان کی یہ تحریر ایک دفعہ ماہنامہ نصرۃ العلوم کے مفسر قرآن نمبر میں بھی شائع ہو چکی ہے اور اب اسے ماہنامہ الشریعہ میں بھی لوٹایا گیا ہے۔ نامعلوم ماہنامہ نصرۃ العلوم کے اَرباب حل و عقد کو اِس کے مضمرات کی طرف التفات کیوں نہ ہوا۔

آخر میں دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اکابر علماء اہلِ سنت کے نقشِ قدم پر استقامت نصیب فرمائے اور ہر قسم کی بے دینی بے راہ روی اور نظر و فکر کی آوارہ گردی سے محفوظ رکھے۔ آمین یا رب العالمین، بجاہ النبی الکریم، صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مااستطعت، وما توفیقی إلا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

☆......☆......☆......☆

مولانا مفتی شعیب احمد

غامدی تصورِ جہاد

کچھ عرصہ قبل راقم نے غامدی صاحب کے شاگرد رشید اور مولانا زاہد الراشدی صاحب کے فرزند من پسند جناب عمار خان ناصر صاحب کے نظریہ جہاد کے نقد و تجزیے کے لیے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا، جو ماہنامہ صفدر میں قسط وار چھپنے کے علاوہ ''عمار خان کا نیا اسلام'' میں باقاعدہ شائع ہوا تھا۔ چونکہ دیگر مسائل و افکار کی طرح اس مسئلے میں بھی عمار خان صاحب نے غامدی صاحب کی شارحانہ تقلید کی ہے، اس لیے وہ مضمون دراصل غامدی صاحب ہی کے نظریہ جہاد کا نقد شمار کیا جانا چاہیے۔ زیر نظر تحریر اسی مضمون کی ترتیب جدید و تلخیص ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے بادل نخواستہ طویل لیکن ضروری و مفید عبارات حذف کرنا پڑی ہیں اور انداز بیان میں بعض ناگزیر تبدیلیاں ضروری سمجھی گئی ہیں۔ اگر کہیں تشنگی محسوس ہو تو اصل مضمون سے مراجعت فرمالی جائے۔ (شعیب احمد)

جہاد اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے، قرآن و سنت میں اس کا صریح حکم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جہاد کیا، صحابہؓ نے کیا اور پھر امت کرتی رہی، لیکن چونکہ کفار کے لیے یہ علماً و عملاً تکلیف دہ چیز تھی، اس لیے انہوں نے اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات میں ہمیشہ اسے سرفہرست رکھا۔ 'اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے' یا 'اسلام ایک سخت مذہب ہے' اس جیسے اعتراضات انہی نفسیات کی ترجمانی تھی۔ یہ اعتراضات اگرچہ طویل عرصے سے چلے آتے تھے، لیکن مغرب کے سیاسی و فکری غلبے اور امت مسلمہ کی مغلوبیت، مرعوبیت کے بعد ان کی شدت میں فطری طور سے بھرپور اضافہ ہوا۔

جب مغرب کے دیے ہوئے فکری و اخلاقی اصولوں کے مطابق مذہب کا سوال انسان کی بنیادی بلکہ ہر طرح کی ترجیحات سے نکل گیا اور مذہب کا صحیح تصور اور اس سے پختہ وابستگی کو تنگ نظری اور دقیانوسیت سمجھا جانے لگا۔ اور پھر مغلوب مسلمانوں میں سے مرعوب اذہان (بالفاظ دیگر متجددین) نے ان اصولوں کو شعوری و لاشعوری طور پر اپنا لیا تو انہیں بھی اسلام کے دامن میں جہاد کا حکم اچنبھا اور اوپرا لگنے لگا۔ دماغوں پر یہ دھن سوار ہوئی کہ کاش اسلام کے دامن سے اس داغ کو کسی طریقے سے ختم کر کے مغرب کی نظر میں اس کا امیج درست کر دیا جائے۔ اس غرض سے رنگا رنگ افکار و نظریات سامنے آئے۔

کسی نے جہاد کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا، کسی نے جہادِ اقدامی کا انکار کر دیا اور یہ کہا کہ اسلام

میں صرف دفاعی جہاد ہے، یعنی از خود کسی کافر قوم پر حملہ نہ کیا جائے بلکہ اگر وہ کریں تو صرف اپنے (پیشگی یا فوری) دفاع میں تلوار اٹھائی جائے، کسی نے دعوت اسلام کی آزادی کی صورت میں اس کی مشروعیت کی نفی کی، اور کسی نے یہ نکتہ نکالا کہ جہاد کا تصور اس وقت درست تھا جب دنیا میں بادشاہت وشہنشاہیت (Imperialism) ہوتی تھی، اَب جبکہ دنیا میں جمہوریت اور افراد واقوام کی آزادی وخودمختاری تسلیم کرلی گئی ہے، اب جہاد کے سابقہ تصور کا کوئی جواز نہیں بنتا، وغیرہ وغیرہ۔ اِس سلسلے میں کی جانے والی تمام مساعی کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ جہاد کا نام تو قرآن وسنت سے نکالنے سے رہے، البتہ اس کے اندر سے وہ بات نکال دی جائے جو اہل مغرب کو کھٹکتی ہے۔ مغرب ان کی توجیہات سے مطمئن ہوا یا نہیں لیکن خود اسلام میں غلط توجیہات وتاویلات بلکہ تحریفات کے دروازے کھل گئے۔

غامدی صاحب کا نظریہ جہاد:

ان میں سے ایک نرالی توجیہ اور انوکھا نظریہ جاوید احمد غامدی صاحب کا ہے۔ غامدی صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ جہاد کی، اقدامی یا دفاعی کے نام سے کوئی تقسیم نہیں ہے، بلکہ ایک اور پہلو سے یعنی جہاد کی غرض وغایت کے اعتبار سے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک محض اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ دین کے لیے جس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر کافروں کے ملک میں جاکر (بالکل اسی طرح جس طرح صحابہؓ نے روم وفارس کی سرحدوں پر کھڑے ہوکر کہا) یہ کہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ دو ورنہ قتال کے لیے تیار ہو جاؤ! اور دوسری قسم یہ ہے کسی جگہ کے مسلمان باشندوں پر کفار کی طرف سے دین پر یا مال وجان یا عزت وآبرو پر ہونے والے ظلم کو ختم کرنے کے لیے ان ظالم کفار کے خلاف کسی مسلمان ریاست کی طرف سے باقاعدہ قتال کیا جائے۔

غامدی صاحب اس بات کے پُرزور مدعی ہیں کہ ان میں سے پہلی قسم صحابہؓ کے ساتھ خاص تھی اور ان کے بعد سے خود بخود ختم ہوگئی ہے، جبکہ دوسری ہمیشہ کے لیے باقی ہے۔ موصوف اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس (جہاد) کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے: (۱) ظلم، عدوان کے خلاف۔ (۲) دوسرے اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔ پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اس کے تحت جہاد اسی مصلحت سے کیا جاتا ہے۔ دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے، جو اس دنیا میں ہمیشہ اس کے براہ راست حکم۔۔۔ اور انہی ہستیوں کے ذریعے روبعمل ہوتا ہے، جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے...... یہ (یعنی رسول اللہ ﷺ کا جزیرۃ العرب میں اور صحابہ ﷺ کا فارس وروم کے خلاف قتال) محض قتال نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلہ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی

اقوام (قیصر و کسریٰ) پر نازل کیا گیا۔ یہ لاریب انہی کا حق تھا جن کے ذریعے اللہ کی حجت ان اقوام پر قائم ہوئی اور جنہیں خود اللہ اور اس کے رسول نے شہداء اللہ فی الارض قرار دیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق ان اقوام کے بعد اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح قوم کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔"

(میزان۔ بحوالہ الشریعہ:۳۰۴)

اور فتنہ و ظلم کے خلاف جہاد کے دائمی ہونے کی تصریح یوں کرتے ہیں:

"فتنہ کے خلاف جنگ کا یہ حکم قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دوسروں کو بالجبر اُن کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی روایت اب بڑی حد تک دنیا سے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن انسان جب تک انسان ہے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب اور کس صورت میں پھر زندہ ہو جائے۔ اس لیے (یعنی گویا صرف اس احتمال کی بنیاد پر۔ ناقل) قرآن کا یہ حکم قیامت تک باقی ہے۔ اللہ کی زمین پر اس طرح کا کوئی فتنہ جب سر اٹھائے مسلمانوں کی حکومت اگر اتنی قوت رکھتی ہو کہ وہ اس کا استیصال کر سکے تو اس پر یہ لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لیے اٹھے اور اللہ کی اس راہ میں جنگ کا اعلان کر دے۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کی یہ ہدایت ابدی ہے اسے دنیا کا کوئی قانون بھی ختم نہیں کر سکتا"۔ (میزان:۲۶۲)

اور غامدی صاحب کا یہ فلسفہ ان کے مایہ ناز شاگرد جناب عمار خان صاحب کے الفاظ میں یہ ہے:

"قرآن و سنت کی نصوص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے پیرو اہل ایمان کو عہد نبوی کے معروضی حالات کے تناظر میں جہاد و قتال کا حکم دو طرح کے مقاصد کے تحت دیا گیا۔ (۱)۔ اہل کفر کے فتنہ و فساد اور اہل ایمان پر ان کے ظلم و عدوان کا مقابلہ کرنے کے لیے۔ (۲)۔ اور دوسرے کفر و شرک کا خاتمہ اور باطل ادیان کے مقابلے میں اسلام کا غلبہ اور سربلندی قائم کرنے کے لیے"۔ (جہاد۔ ایک مطالعہ:۱۱۱)

"رسول اور اس کے پیروکاروں کا یہ غلبہ پوری دنیا کی قوموں پر نہیں بلکہ ان مخاطبین پر ہوتا ہے جن پر اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا نافذ کرنے کا اذن مل جاتا ہے۔ اس اصول کے تحت نبی ﷺ اور آپ کے متبعین نے جو جہاد کیا وہ غلبہ دین کے اسی وعدے کی تکمیل کے لیے اور انہی اقوام تک محدود تھا جن کے خلاف اقدام کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی اور جن کی تعیین نبی ﷺ نے ان کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر کر دی تھی۔ چنانچہ اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی ﷺ اور آپ کے پیروکاروں کے ہاتھوں جزیرہ عرب اور روم و فارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے کے بعد غلبہ دین کے لیے

جہاد وقتال کے حکم کی مدت نفاذ خود بخود ختم ہو چکی ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ اس کا ہدف پوری دنیا پر تلوار کے سائے میں دین کا غلبہ اور حاکمیت قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کے لیے جہاد وقتال کا اقدام دین کے معاملے میں عدم اکراہ اور غیر محارب کفار کے ساتھ جنگ سے گریز کے ان عمومی اور اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کیا جائے گا جو قرآن مجید کی نصوص میں مذکور ہیں"۔ (جہاد۔ ایک مطالعہ:۳۰۲)

جمہور امت کا صحیح نظریہ جہاد:

جبکہ اس کے برعکس امت کا اجتماعی ضمیر جس کی نمائندگی فقہائے کرام کرتے ہیں ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ظلم وعدوان کے خلاف تو جہاد ہے ہی، اس پر تو کسی کافر کو بھی اختلاف واعتراض نہیں، اس کے علاوہ محض کفر کے خلاف بھی جہاد ایک مقدس فریضہ خداوندی ہے جو اشخاص وافراد یا کسی زمان ومکان کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جس طرح زمانہ رسالت اور صحابہ کے لیے تھا بالکل اسی طرح قیامت تک باقی ہے۔ تمام متقدمین ومتاخرین فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ امام المسلمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ دار الحرب پر حملے کے لیے تیاری رکھے اور مناسب حالات وماحول میں کفار کے علاقوں پر دین اسلام کی سربلندی اور غلبے کے لیے از خود ابتداءً حملہ آور ہو۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔

فقہاء کرام کا یہ بھی نظریہ ہے کہ مسلمان اور کافر ممالک کے باہمی تعلقات کی بنیاد اصلاً صلح پر نہیں بلکہ جنگ اور عداوت پر ہے، اس لیے امام المسلمین کفار سے عارضی صلح تو کر سکتا ہے اور وہ بھی اس وقت جب مسلمانوں کے مفاد میں ہو، مستقل جنگ بندی کرنے کا اسے حق حاصل نہیں۔ کفار چاہے اپنے بلاد میں اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوں اور مسلمانوں سے کوئی تعرض نہ بھی کریں تب بھی مسلمان ان سے تعرض کریں گے اور انہیں دین حق اور سنت عادلہ کی دعوت دینے اور اسے نہ ماننے کی صورت میں مطیع و سرنگوں بنانے کے پابند ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف خاتم النبیین ہیں اور دوسری طرف آپ کی نبوت عالمی اور روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور انسانیت کے تمام طبقات آپ کے لائے ہوئے پیغام کے محتاج ہیں۔ اس پیغام کو پہنچانے کے لیے ارباب ثروت وشوکت اور اصحاب حکومت واقتدار کی کھڑی کی ہوئی ہر طرح کی حسی اور معنوی رکاوٹوں کو ختم کرنا ناگزیر ہوتا ہے اور یہ سب دین حق کی سربلندی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ہوتا ہے، اس لیے جہاد کی ہر زمانے اور خطے میں ضرورت رہتی ہے۔ اس بات پر فقہاء کی دوٹوک تصریحات تو بے شمار ہیں اور اصل مضمون میں چیدہ

چیدہ حوالے موجود بھی ہیں، لیکن یہاں اختصار کے پیش نظر صرف ایک حوالہ پیش کرتے ہیں اور وہ بھی ایسے عالم کا جو صرف فقیہ ہی نہیں بلکہ اسلامی لٹریچر پر وسیع نظر رکھنے والے مفکر و مجدد بھی ہیں یعنی مسند الہند شاہ ولی اللہؒ۔ حضرت اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں رقم طراز ہیں:

''نبی علیہ السلام کو (زمان ومکان کی تخصیص کے بغیر قیامت تک کے لئے اور پوری زمین کے لیے) عمومی اور کلی خلافت سے نواز کر مبعوث کیا گیا ہے، اور آپ کے دین کا باقی ادیان پر غلبہ جہاد اور اس کے اسباب کی تیاری ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ چنانچہ اگر مسلمان جہاد کو چھوڑ دیں گے اور بیلوں کی دمیں پکڑ لیں گے (یعنی کھیتی باڑی میں اور دوسرے کاروباری مشاغل میں لگے رہیں گے) تو ذلت انہیں گھیر لے گی اور خسارہ ونقصان ان پر غالب آ جائے گا۔''

دوسری جگہ روئے زمین پر بسنے والی تمام انسانیت کے لیے ایک عالمگیر دین کی ضرورت اور اس کے قائم کرنے والے راہنما کے تحت لکھتے ہیں:

''ایسے عالمگیر راہنما کے لیے ضروری ہے کہ وہ (اپنے مذہب کی بنیاد رکھنے کے لیے) کسی قوم کو سنت راشدہ (صحیح طریقے) کی دعوت دے، ان کا تزکیہ کرے، ان کی حالت سنوارے اور پھر انہیں اپنے اعضاء (یعنی آلہ کار) بنا کر ان کے واسطے سے زمین والوں سے مجاہدہ کرے (یعنی جہاد اور دعوت دین کی محنت کرے) اور اس قوم کو زمین کے اطراف واکناف میں پھیلا دے۔ یہی مطلب ہے خدا تعالی کے اس قول ''کنتم خیر امۃ'' کا۔ (اس قوم کی تربیت اور ان سے دعوت اور جہاد کا کام لینے کی ضرورت) اس وجہ سے ہے کہ خود اکیلے امام راشد (رسول اللہ ﷺ کے لیے (دنیا کی) کی لاتعداد اقوام سے لڑائی اور دعوت دین کی محنت ممکن نہیں۔''

امر واقعہ بھی یوں ہی ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جماعت تیار کی جو دنیا میں پھیل گئی اور (بغیر کسی تحدید وتخصیص کے) جہاں تک اس کا بس چلا سنت راشدہ کی ترویج اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے دعوت وقتال کا فریضہ سرانجام دیتی رہی۔ اور پھر انہوں نے یہ کام اپنے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا بلکہ اگلے طبقے کو منتقل کیا۔ چنانچہ ان کے تیار کردہ لوگ آگے سے آگے اسی طریقے سے چلتے رہے اور اسی نہج پر دعوت حق اور مخالفین ومعاندین سے قتال کرتے رہے اور دیئے سے دیا جلتا رہا، اس بات کو شاہ صاحب نے یوں ذکر کیا ہے:

''یہ (یعنی جہاد کا صدقہ جاریہ ہونا) اس وجہ سے ہے کہ (جہاد کی بدولت) مہاجرین وانصار کے اولین لوگ قریش اور آس پاس کے (عرب کے) لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کا باعث بنے۔ پھر اللہ رب العزت نے ان کے ہاتھوں عراق اور شام کو فتح کرایا پھر ان کے ہاتھوں فارس اور روم کو فتح کروایا۔ پھر ان لوگوں کے ہاتھوں ہندوستان، ترکستان اور حبشہ کو فتح کروایا۔ اس طریقے سے جہاد پر مرتب ہونے والا نفع

لحہ بہ لحہ یوماً فیوماً بڑھتا چلا جاتا ہے۔" (حجۃ اللہ: ج۲: ۴۲۸)

جمہور امت کے اس نظریہ جہاد کو غامدی صاحب کے شاگرد عمار خان صاحب تسلیم کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں یوں لکھتے ہیں:

"کلاسیکی فقہی ذخیرے میں جہاد کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک فرع قرار دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو خدا کی طرف دعوت دینے کفر و شرک سے اجتناب کی تلقین کرنے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے انبیاء کا جو سلسلہ جاری فرمایا، کفار کے ساتھ جہاد بھی اسی کی ایک کڑی اور دعوت الی الحق کی ایک صورت ہے۔ اور امت مسلمہ پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی کافر قوموں کو اسلام کی دعوت دے اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان کے خلاف جہاد کر کے انہیں اپنا غلام بنا لے" [۲] (جہاد: ۱۱۰)

غامدی تصور جہاد کی سنگینی اور انوکھا پن:

پوری اسلامی تاریخ میں اہل سنت کا کوئی قابل ذکر فقیہ، مجتہد، محدث اور مفسر اس اچھوتے اور "قطعی" تصور جہاد کا قائل نہیں گذرا، البتہ ماضی قریب میں نبوت کے جھوٹے دعویدار مرزا غلام احمد قادیانی نے اس قبیل کی کچھ باتیں ضرور کہی ہیں۔

غامدی صاحب کے اس تصور جہاد کا انوکھا پن صرف ہمارا ہی تاثر نہیں بلکہ یہ بات خود ان کے شاگرد جناب عمار صاحب بھی دبے لفظوں میں تسلیم کرتے ہیں۔ الشریعہ کے جہاد نمبر میں شامل اپنے مضمون "جہاد۔ ایک مطالعہ" کے صفحہ ۱۰۳ پر "جاوید احمد غامدی کا نقطہ نظر" کے جلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ ؓ نے اپنے دور میں منکرین حق کے خلاف جو قتال کیا اس کی خاص نوعیت اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کو اہل علم کسی نہ کسی زاویے سے عمومی طور پر محسوس کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاہم اس بحث کو بالعموم چونکہ فقہی تناظر میں دیکھا گیا ہے اور اس کو نسخ و تخصیص کی فنی اصطلاحات کے اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس وجہ سے (مزعومہ) الجھن برقرار رہی اور ہر دور میں اہل علم اس (مزعومہ الجھن) کے حل کے لیے نئی نئی توجیہات کو پیش کرنے پر مجبور ہوتے رہے۔ اس کے برعکس مولانا حمید الدین فراہی نے اس سارے معاملے (یعنی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ ؓ کے قتال) کو پہلی مرتبہ فقہی اصطلاحات کے محدود اور ناکافی دائرے سے نکال کر قرآن مجید میں بیان کردہ سنن الٰہیہ کے دائرے میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کی۔ مولانا نے رسولوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنت کو قرآن مجید سے دریافت کیا اور اس کے روبعمل ہونے کے مختلف مراحل نصوص کی روشنی میں متعین کیے۔ اس بحث کو بعد میں ان کے طریقے پر قرآن مجید پر غور کرنے والے اہل علم مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد

غامدی نے مزید منقح کیا اور اس کی روشنی میں احکام قتال کی ایک نئی تعبیر پیش کی''۔(جہاد ایک مطالعہ:۳۰۱)

ویسے تو مذکورہ بالا عبارت میں کئی باتیں قابل اعتراض ہیں جو غامدی و عمار خان صاحب سمیت تمام متجددین کی نفسیات اور سوچ کی غمازی کرتی ہیں۔ان سب باتوں سے قطع نظر اتنی بات تو خود ان ہی کے بیان سے عیاں ہے کہ یہ انوکھا تصور جہاد''دبستان فراہی'' کی خانہ زاد اختراع اور نئی ایجاد ہے پہلے امت میں اس کا وجود نہیں تھا۔اسی لیے تو خود عمار صاحب کو بھی اس پر''دریافت'' کا اطلاق کرنا پڑا۔پھر اگر چہ موصوف نے اس''نئی دریافت'' پر نئی تعبیر یا تعبیر نو کا لفظ بول کر اس کی سنگینی اور حساسیت کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عبارت بھی اور خود یہ تصور بھی صاف صاف بتا رہا ہے کہ وہ صرف''تعبیر نو''نہیں بلکہ''تعمیر نو'' ہے۔

''تعبیر نو'' کا اطلاق اس وقت تو درست ہوتا جب توجیہ بدلنے کے باوجود جہاد کے احکامات نہ بدلتے اور مسئلہ اپنی جگہ ہی رہتا۔اس کے برعکس جب سارا مسئلہ ہی بدل جائے تب بھی ایسی''نئی دریافت'' کو تعبیر نو کہنا بظاہر معصوم سا لفظ ہے لیکن درحقیقت انتہائی سنگین اور خطرناک غلطی ہے۔ بلکہ اگر ایک قدم اور آگے بڑھیں تو یہاں مسئلہ صرف جہاد کی تعبیر نو کا نہیں بلکہ پورے اسلام کا ہے، کیونکہ خود عمار صاحب کے بقول جہاد کی تعبیر پر پورے اسلام کی تعبیر موقوف ہے۔موصوف اپنے مذکورہ بالا مضمون کے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں:

> ''اسلام میں جہاد کا تصور اس کی غرض وغایت اور بنیادی فلسفہ کیا ہے؟ یہ سوال ان اہم اور نازک ترین سوالات میں سے ہے جن کا جواب بحیثیت مجموعی پورے دین کے حوالے سے ایک متعین زاویہ نگاہ کی تشکیل کرتا اور دین کے اصولی وفروعی اجزاء کی تعبیر وتشریح پر نہایت گہرے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔''

پھر اسی صفحے پر کچھ سطور کے بعد رقمطراز ہیں:

> ''اسلام کے تصور جہاد کی تعبیر وتشریح کے ساتھ اس کے مابعد الطبیعیاتی تصورات اور اخلاقی اصولوں کے ایک بڑے حصے کی تعبیر وتشریح کا سوال بھی وابستہ ہے۔ چنانچہ اس سوال کا کوئی بھی متعین جواب نہ صرف حیات انسانی کے حوالے سے اسلام کے عمومی مزاج اور زاویہ نگاہ کی عکاسی کرے گا بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق اس بات سے بھی ہوگا کہ اسلام مابعد الطبیعیاتی سطح پر انسانی زندگی کے بارے میں خدا کی اسکیم کی کیا وضاحت کرتا اور انسانی اخلاقیات کے دائرے میں دنیا کے دوسرے گروہوں اور مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی کیا نوعیت متعین کرتا ہے۔''(جہاد:۱۰۹)

ان اقتباسات کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ فراہی صاحب کی طرف سے دریافت کردہ اور غامدی و عمار صاحب کے ہاتھوں پروردہ فلسفہ جہاد کی تبدیلی اگر صرف جہاد ہی کے ایک باب تک منحصر رہتی تب بھی مسئلہ سنگین اور نازک تھا کہ جہاد ذروۃ سنام الاسلام (یعنی اسلام کی چوٹی) ہے لیکن یہاں تو بقول

عمار صاحب پورے اسلام کی تعبیر کا سوال بھی وابستہ ہے۔ گویا جب تصور جہاد بدلا تو پورا تصور مذہب و دین ہی بدل گیا۔ چنانچہ جب فراہی صاحب نے پوری امت سے ہٹ کر نیا تصور جہاد دریافت کیا ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کا باقی اسلام بھی نیا ہونا چاہیے۔ اس لیے عمار خان کی کوشش چاہے کچھ بھی ہو فراہی صاحب کی دریافت اور اس کی ساخت و پرداخت کو صرف 'تعبیرنو' کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا۔

اس تصور جہاد کو تسلیم کرنے کا نتیجہ:

اس تصور جہاد کو درست مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کے چودہ صدیوں کے جمہور علماء اور مفتیان اہل علم کی بیک قلم تغلیط کی جائے، اور یہ مانا جائے کہ جہاد جیسے شریعت کے اہم حکم اور بقول عمار صاحب شریعت کے انتہائی اہم بنیادی تصورات میں سے ایک تصور کے بارے میں گذشتہ سارے لوگ یک زبان ہوکر ایک ہی غلطی میں مبتلا رہے کہ وہ اقدامی جہاد برائے اعلائے کلمۃ اللہ کو مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داریوں میں شامل کرتے رہے اور انہیں یہ خبر نہ ہوئی کہ یہ تو صحابہ کے بعد سے خود بخود ختم ہو چکا ہے۔ مگر یہ کیسے باور کرلیا جائے کہ اتنے اہم اور بنیادی تصور میں امت کے اجتماعی ضمیر کو نہ صرف ٹھوکر لگی بلکہ اس ٹھوکر پر صدیوں امت برقرار بھی رہی ہے۔ !!!

پھر اگلا سوال یہ ہے کہ اگر معاملہ یوں ہی کھلے بندوں چلتا رہے، کوئی ختم نبوت کے معنی امت کی اجتماعی خرد و دانش سے ہٹ کر لیتا رہے، کوئی حدیث کے معنی افسانہ کرتا رہے، کوئی سنت کا مفہوم بدلتا رہے، اور کوئی جہاد جیسے اہم تصور کی بنیادوں میں نئی بوقلمونیوں سے کام لیتا رہے تو شریعت کا حلیہ کیا ٹھہرے گا۔ ؟؟؟

غامدی صاحب کے دلائل کا جائزہ:

ویسے تو کسی نظریے کے غلط ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ امت کے اجتماعی ضمیر کے فیصلے سے متصادم ہے، لیکن اگر کچھ نادان امت کے اجتماعی ضمیر کو اتھارٹی ہی تسلیم نہ کرتے ہوں اور اپنے دلائل پر نازاں ہوں تو خود ان پر "اتمام حجت" کے لیے دلائل کی خبر لینا بھی کسی درجے میں فرض ہو جاتا ہے۔ غامدی صاحب کے نزدیک جہاد برائے غلبہ دین کے صحابہ کے ساتھ خاص ہونے کے اس قطعی حکم کی بنیاد یہ دو باتیں ہیں:

(۱)..... صحابہ نے جو بھی جہاد کیا اس کی بنیاد اتمام حجت پر تھی۔

(۲)..... صحابہ شہادت علی الناس کے منصب پر فائز تھے، اور جہاد شہادت علی الناس کی ایک عملی صورت تھی۔

جہاد کی بنیاد ـــ اتمام حجت:

اتمام حجت غامدی فکر کا ایک اہم اور بنیادی اصول ہے۔ بہت سے مواقع پر یہ لوگ اس فلسفے کا

سہارا لیتے ہیں جن میں سے مسئلہ تکفیر، حد ارتداد اور جہاد نمایاں ہیں۔ان کے خیال میں اتمام حجت سے مراد یہ ہے کہ حق اتنا واضح ہو جائے کہ اس کے انکار کے پیچھے جہالت یا غلط فہمی نہ ہو بلکہ صرف اور صرف عناد اور تعصب ہو۔ان کے خیال میں چونکہ حق کے وضوح اور اس کے انکار کے مبنی بر عناد ہونے کا تعلق دل سے ہے، اور دل پر سوائے خدا کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، اس لیے صرف اللہ ہی وحی سے مطلع کر سکتے ہیں، اور اللہ صرف رسول کو مطلع کرتے ہیں، ان سارے صغروں کبروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتمام حجت کا فیصلہ سوائے رسول کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''اتمام حجت. (انبیاء کی دعوت میں) تیسرا مرحلہ ہے،اس تک پہنچنے میں حقائق اس قدر واضح ہو جاتے ہیں کہ مخاطبین کے پاس کوئی عذر پیش کرنے کے لیے باقی نہیں رہ جاتا، یہی چیز ہے جسے اصطلاح میں ''اتمام حجت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے وہ اس طرح مبرہن ہو جائے کہ ضد، ہٹ دھرمی اور عناد کے سوا کوئی چیز بھی آدمی کو اس کے انکار پر آمادہ نہ کر سکے۔اس میں ظاہر ہے اسلوب، استدلال، کلام اور پیغمبر کی ذات وصفات اور علم وعمل میں خدا کی آیات بینات، ہر ہر چیز موثر ہوتی ہے، یہاں تک کہ معاملہ کھلے آسمان پر چمکتے سورج کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔'' (میزان: ۱۹۰)

''اللہ کے پیغمبر جب تبلیغ کا حق بالکل آخری درجے میں ادا کر دیتے ہیں اور حجت تمام ہو جاتی ہے تو یہ (یعنی ہجرت وبراءت کا) مرحلہ آ جاتا ہے۔اس میں قوم کے سرداروں کی فرد قرارداد جرم بھی پوری وضاحت کے ساتھ انہیں سنا دی جاتی ہے اور یہ بات بھی بتا دی جاتی ہے کہ ان کا پیمانہ عمر لبریز ہو چکا۔لہٰذا اب ان کی جڑیں اس زمین سے لازماً کٹ جائیں گی۔'' (میزان: ۱۹۲)

''وہ (یعنی پیغمبر) اپنی رائے سے یہ خیال کر کے کہ اس کی طرف سے فرض دعوت کافی حد تک ادا ہو چکا، اپنی قوم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔اس پر لازم ہے کہ وہ جس ذمہ داری پر مامور ہوا ہے اس میں برابر لگا رہے۔یہاں تک کہ اس کا پروردگار ہی یہ فیصلہ کر دے کہ حجت پوری ہو گئی، قوم کی مہلت ختم ہوئی اور پیغمبر انہیں چھوڑ کر جا سکتا ہے۔'' (میزان: ۱۹۴)

(جہاد کی) دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے، جو اس دنیا میں ہمیشہ اس کے براہ راست حکم سے اور انہی ہستیوں کے ذریعے روبعمل ہوتا ہے جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے...... یہ (یعنی رسول اللہ ﷺ کا جزیرۃ العرب میں اور صحابہ ؓ کا فارس وروم کے خلاف قتال) محض قتال نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا جو اتمام حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلہ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی اقوام (قیصر وکسریٰ) پر نازل کیا گیا۔[میزان۔۔ بحوالہ الشریعہ: ۳۰۴]

صحابہ نے جن لوگوں سے جہاد کیا ان میں سے جزیرۃ العرب کے لوگوں کے بارے میں تو اتمام حجت کی بات درست ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں ایک طویل عرصہ رہے زبان ایک، علاقہ ایک اور مختلف انداز سے بار بار دلائل کے ساتھ دعوت حق سنائی گئی لیکن سوال یہ ہے کہ روم وفارس اور دیگر اقوام کے بارے میں یہ اتمام حجت کیسے ہوا اور ان پر حق کے روز روشن کی طرح واضح ہونے کا مرحلہ کیسے اور کب آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک دفعہ بھی ان علاقوں میں تبلیغ کے لیے نہیں گئے اور نہ ہی صحابہ کا اس غرض سے ان کے ہاں جانے کا ثبوت ملتا ہے، زیادہ سے زیادہ ان کے باہمی رابطے کی صورت یہ ہوئی کہ آپ علیہ السلام نے ایک دفعہ ان سلطنتوں کے سربراہوں کو دعوتی خطوط لکھے۔ ظاہر ہے ان خطوط سے تو حق کا روز روشن کی طرح وضوح نہیں ہوتا اور معاملہ نصف النہار کے سورج کی طرح نہیں ہوتا، جبکہ صحابہ نے ان سلطنتوں کے ساتھ بھرپور طریقے سے جہاد کیا اور کیا بھی محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے۔

غامدی صاحب چونکہ صحابہ کے لیے جہاد برائے غلبہ دین کے قائل ہیں اور قیصر وکسری کے خلاف ان کے جہاد کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن وہ اس جہاد کو عام حکم رکھنے کی بجائے اسے صحابہ کے ساتھ خاص رکھنے کے خواہش مند ہیں اور خصوصیت کے لیے اتمام حجت کا سہارا لیتے ہیں، اس لیے لامحالہ انہیں کسی ایسی دلیل کی تلاش تھی جو ان کے مدعا کا ساتھ دے اور ان اقوام پر بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اتمام حجت ثابت کرے۔ اس کے لیے انہیں کوئی صاف اور سیدھی سادھی دلیل تو ہاتھ آئی نہیں، لہٰذا انہوں نے ان دعوتی خطوط نبوی ﷺ کو جو آپ نے آس پاس کی سلطنتوں کے سربراہوں کو لکھے تھے، اتمام حجت بنانے کی ٹھانی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت جزیرہ نما عرب سے باہر قریب کی تمام قوموں کے سامنے بھی پیش کر دی اور ان کے سربراہوں کو خط لکھ کر ان پر واضح کر دیا کہ اب اسلام ہی ان کے لیے سلامتی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ خدا کی جو حجت آپ کے ذریعے سے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر قائم ہوئی ہے، وہ آپ کے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے جزیرہ نما سے باہر کی ان قوموں پر بھی قائم ہو جائے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد دنیا ہی میں جزا و سزا کے قانون کا اطلاق ان قوموں پر بھی کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد صحابۂ کرام اس اعلان کے ساتھ ان اقوام پر حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کر و یا زیر دست بن کر جزیہ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کے سوا اب زندہ رہنے کی صورت تمہارے لیے باقی نہیں رہی۔ ان میں سے کوئی قوم بھی اصلاً شرک کی علم بردار نہ تھی ()، ورنہ وہ اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ

کرتے جو مشرکین عرب کے ساتھ کیا گیا تھا۔" (میزان:۵۹۹)

اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عمار صاحب لکھتے ہیں:

"حدیث وسیرت کے ذخیرے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحابہ کرام ﷡ کے ان اقدامات کی شرعی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے وہ خطوط تھے جو آپ نے جزیرۃ العرب اور اس کے گردونواح کی سلطنتوں کے سربراہوں کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط کو ہمارے اہل سیرت بالعموم "دعوتی خطوط" کا عنوان دیتے ہیں۔ حالانکہ مضمون اور پیش وعقب کے حالات سے واضح ہے کہ ان میں مخاطبین کو محض سادہ طور پر اسلام کی دعوت نہیں بلکہ یہ وارننگ دی گئی تھی کہ ان کے لیے سلامتی اور بقاء کا راستہ یہی ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلیں بصورت دیگر انہیں اپنی حکومت واقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا"۔ (جہاد:۱۴۰)

آگے خطوط نبوی کا مضمون نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

گویا ان خطوط کی حیثیت اتمام حجت کی تھی جس کے بعد ان اقوام کے خلاف جنگی اقدام کی اجازت (؟) صحابہ ﷡ کو حاصل ہوگئی تھی۔ (جہاد:۱۴۸)

اتمام حجت کی ایک طرف یہ تعریف کہ معاملہ روز روشن کی طرح واضح ہو اور دوسری طرف محض خطوط کو اتمام حجت قرار دینا اس پر سوائے اس کے کیا کہا جائے: ایں چہ بوالعجبی ست! کم از کم غامدی صاحب جیسے آدمی کو کہ قطعیت جن کی تسبیح اور بداہت جن کا تکیہ کلام ہوتا ہے ایسے بودے دلائل زیب نہیں دیتے۔ کیونکہ یہ بات تو زیادہ محتاج وضاحت نہیں کہ خطوط نبوی کی مخاطب ان اقوام پر حق کا وضوح اس درجہ نہیں ہوا جو خود بقول غامدی صاحب نصف النہار کے سورج تک پہنچے۔ پھر بھی ان اقوام پر اتمام حجت کو لاگو کرنے پر اصرار پتہ نہیں کیوں ہے؟۔۔ خیر! روم وفارس کے جہاد والے معاملے سے قطع نظر غامدی صاحب کا اتمام حجت والا فلسفہ اور پہلوؤں سے بھی قوی اشکالات کی زد میں ہے۔ مثلاً:

اس فلسفے میں ایک طرف تو غامدی صاحب کے بقول اتمام حجت روز روشن کا وضوح لیے ہوئے ہے اور دوسری طرف انہی کے بقول خود پیغمبر جس کے ہاتھوں اتمام حجت سرانجام پایا ہے وہ بھی اس کے وجود اتمام کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔

پھر اس فلسفے کے مطابق اتمام حجت والی قوم کی جڑ لازماً کٹتی ہے اور اتمام حجت ہوتے ہی فوراً ایسی قوم کا صفایا کردیا جاتا ہے۔ جبکہ امر واقعہ کچھ اور ہی منظر پیش کرتا ہے۔ بعض اقوام پر اگرچہ اتمام حجت ہوگیا لیکن فوراً جڑ نہیں کٹی، جیسے نوح ؑ کی قوم جس میں وہ ۹۵۰ سال رہے، سیکڑوں سال تک وہ ایک محدود سی قوم کو تبلیغ کرتے اور سمجھاتے رہے، غامدی صاحب والا اتمام حجت چند مہینوں میں نہیں تو چند

سالوں میں ہو گیا ہو گا۔خود قوم نے کہا: یانوح قد جادلتنا فاکثرت جدالنا لیکن اس کے باوجود سیکڑوں سال تک عذاب نہیں آیا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور اس کے مضافات طائف وغیرہ میں ہر طرح سے پیغام حق سنایا۔ تیرہ سالہ مکی زندگی کے گذرے عذاب نہیں آیا، اس کے بعد ہجرت وبراءت کا مرحلہ آیا لیکن عذاب نہیں آیا، مکہ کے لوگ آ، آ کر مسلمان ہوتے رہے۔ جنگوں میں بھی عموماً پہل مشرکوں کی طرف سے ہوئی۔ حنین میں قیدی واپس کر دیے گئے۔ اگر اتمام حجت کے بعد لازماً جڑ کٹ جاتی تو ان لوگوں کو مسلمان ہونے کا موقع کیوں دیا جاتا۔ اسی روم وفارس کی اقوام پر اگر اتمام حجت ہو گیا تھا تو انہیں دوبارہ دعوت اسلام اور پھر اس سے بڑھ کر جزیہ دے کر رہنے کا اختیار کیوں دیا گیا؟

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو غامدی صاحب کا اتمام حجت والا فلسفہ اپنی ذات میں اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کے اعتبار سے ناقص ہے، خاص طور سے جہاد والے مسئلے میں تو اس سے استدلال کسی طرح درست نہیں۔

شہادت علی الناس:

شہادت علی الناس کا سیدھا اور سادہ معروف مطلب چھوڑ کر غامدی صاحب نے ایک اچھوتا مطلب لیا ہے جو یہ ہے کہ جیسے رسول اپنی قوم پر شاہد ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ صحابہ پر شاہد تھے، ایسے ہی صحابہ کو اور صرف صحابہ کو دیگر محدود اقوام عالم پر شہادت علی الناس کا یہ منصب اعزازی اور خصوصی طور سے دیا گیا ہے۔ اور روم وفارس کا جہاد اسی شہادت کا مظہر تھا۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''(صحابہ کی) دعوت ''شہادت علی الناس'' ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ وہی دعوت ہے جس سے دین کی حجت پوری دنیا پر قائم ہو گئی ہے...... جب آپ نے اپنی قوم پر اتمام حجت کر دیا تو جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے آپ کی صحبت اٹھائی، وہ خدا کی زمین پر حق کا ایسا نمونہ بنے کہ سارے اخلاقی تصورات ان کے وجود میں بالکل مجسم ہو گئے یہاں تک کہ خود پروردگار عالم نے انھیں ''خیر امت'' قرار دیا...... اس جماعت کی یہی حیثیت تھی جس کی بنا پر قرآن نے انھیں مخاطب کر کے اعلان کیا ہے کہ تم ایک ''امت وسط'' یعنی درمیان کی جماعت ہو جس کے ایک طرف اللہ کا رسول اور دوسری طرف 'الناس' یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں لہٰذا جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے، اب وہی شہادت باقی دنیا پر تم دو گے...... صحابہ کرام کو اللہ تعالی نے اس شہادت کے لیے اسی طرح منتخب کیا، جس طرح وہ بنی آدم میں سے بعض جلیل القدر ہستیوں کو نبوت ورسالت کے لیے منتخب کرتا ہے...... چنانچہ جس طرح رسولوں کو اپنی قوم پر اتمام حجت کے بعد یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسے عذاب کے حوالے کر دیں، اسی طرح صحابہ کو بھی، جب وہ رسول کی شہادت کے پس منظر میں اور 'خیر امت' بن کر اٹھے تو بحیثیت جماعت یہ حق حاصل ہوا کہ وہ روم وایران کی سرحدوں

پر کھڑے ہو کر انھیں اسلام کی دعوت دیں اور اسے قبول نہ کرنے کی صورت میں جہاد و قتال کے ذریعے سے زیر دست بنا کر ان پر جزیہ عائد کر دیں .... نبوت جس طرح نبی پر ختم ہو گئی، اسی طرح شہادت کا یہ منصب اور اس کے ساتھ منکرین حق کے سے قتال اور ان پر جزیہ عائد کرنے کا حق بھی ان نفوس قدسیہ پر ختم ہوا۔ ہم مسلمانوں کو یہ دعوت پیغمبر کے ان صحابہ ہی سے ملی ہے اور ان کی اس شہادت ہی کے حوالے سے ہم اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ہماری حیثیت ان کے تابعین اور تبع تابعین کی ہے"۔ (میزان:۲۰۳)

اور عمار خان صاحب اس بارے میں یوں گویا ہیں:

"شہادت علی الناس کے منصب کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ عالم کا پروردگار کسی خاص گروہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت کا عہد و پیمان لے کر اسے دین و شریعت کی نعمت سے نوازتا آزمائش اور ابتلاء کے مختلف مراحل سے گزار کر اس کے تزکیہ و تربیت کا اہتمام کرتا اور اس امتحان میں کامیابی پر اسے دنیوی حکومت و اقتدار سے بہریاب کر دیتا ہے۔ یہ گروہ اپنے اجتماعی وجود کے لحاظ سے یوں سراپا حق اور مجسم عدل و انصاف ہوتا اور اپنی دعوت اور کردار کے ذریعے سے حق کی اس طرح عملی شہادت بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں کفر و طغیان کا رویہ اپنانے والی قوموں کو سزا دینے کا اختیار دے دیتا ہے۔ شہادت کے منصب پر فائز گروہ کے لیے اس اختیار اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتوحات کی حیثیت اللہ کے انعام کی ہوتی ہے اور اسے یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی سرزمین میں اس کی میسر کردہ نعمتوں اور وسائل کو اپنے تصرف میں لے آئے جبکہ مفتوح و مغلوب قوم کے لیے یہی عمل اللہ کی طرف سے سزا اور انتقام قرار پاتا ہے۔" (جہاد:۱۶۳)

ان لوگوں کی تحریرات کو از اول تا آخر بغور دیکھیں تو منصب شہادت کے اس اختراعی اور من گھڑت مطلب کے پیچھے ایک بھی صریح دلیل نہیں ملے گی۔ پھر اس بات کی بھی دوٹوک دلیل کوئی نہیں کہ شہادت علی الناس کا منصب صرف صحابہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اگر اس کو مان لیں تو اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کا روم و فارس کے خلاف جہاد اسی شہادت کے حق کا حصہ تھا اس کی سوائے غامدی صاحب کے ذوق وجدانی کے اور کوئی دلیل نہیں۔ اور اگر صحابہ کا قتال اس کے تحت ہو تو پھر بھی باقی امت سے جہاد برائے غلبہ دین کی نفی کا اس سے کوئی لزوم نہیں۔

پھر خود غامدی صاحب کی عبارت میں تعارض ہے ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ صحابہ روم و فارس کی سرحدوں پر اسی منصب شہادت کے تحت کھڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں:

"ہم (یعنی آج کل کے) مسلمانوں کو یہ دعوت پیغمبر کے ان صحابہ ہی سے ملی ہے اور ان کی اس شہادت کے حوالے سے ہم اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ہماری حیثیت ان کے تابعین اور تبع تابعین کی ہے۔"

جب ہم سمیت بعد کی امت کی منصب شہادت میں حیثیت صحابہ کے تابعین کی ہے تو اس کے باوجود صحابہ کے علاوہ باقی امت کو جہاد کے حکم سے مستثنیٰ کرنے کا نہ جانے کیا جواز رہ جاتا ہے۔

اسی طرح ان کی عبارات اور فلسفے میں ایک اور الجھاؤ یہ ہے کہ ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ جو شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ پر قائم کی وہی شہادت صحابہ روم وفارس پر قائم کریں گے۔ حالانکہ صحابہ پر قائم ہونے والی شہادت کی ان کے بقول عملی شکل تزکیے اور مجسم اخلاق بن جانے کی صورت میں تھی، جبکہ روم وفارس کا تو صحابہ نے ایسا کوئی تزکیہ نہیں کیا اور نہ طویل عرصے تک ان میں رہ کر دین سے روشناس کروایا ہے۔ پھر وہی شہادت کیسے ہوگئی؟

الغرض خود انہی کے بتائے ہوئے مطلب کے مطابق آپ ﷺ کی شہادت اور ہے اور روم وفارس پر صحابہ کی شہادت اس سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہے۔ اس کے باوجود پتہ نہیں غامدی صاحب کے پاس کون سا ایسا آلہ و پیمانہ ہے جس سے دونوں متضاد شہادتوں کو بالکل برابر کر کے یوں فرماتے ہیں کہ ''جو شہادت رسول نے تم پر دی ہے، اب وہی شہادت باقی دنیا پر تم دو گے......'' پھر اگلا طرفہ تماشا یہ کہ صحابہ والی شہادت باقی امت دے گی لیکن اس سے جہاد خارج کر دیا۔ یہ کیسی نرالی منطق ہے کہ ایک ہی شہادت تین جگہوں پر دی جا رہی ہے اور تینوں جگہ اس کی حقیقت مکمل طور سے بدل رہی ہے، اس کے باوجود بھی وہ ایک ہی شہادت ہے۔ فیا للعجب

حواشی:

۱۔ نہ جانے غامدی صاحب قطعی کس کو کہتے ہیں۔ ایک طرف تو ان کے ہاں قطعیت اتنی کبریت احمر ہے کہ سوائے ۳۵ سنتوں کے انہیں پورے ذخیرہ حدیث میں اور اجماع میں قطعیت نظر نہیں آتی اور دوسری طرف اپنے نظریات میں قطعیت کی اتنی فراوانی وارزانی ہے کہ ہر دوسری بات قطعی ہے۔ بہر حال کم از کم جہاد والے اس دعوے کی قطعیت کا تو یہ حال ہے کہ اس کی بنیاد میں ایک بھی ایسی دلیل نہیں کہ جو قطعیت چھوڑ ظن غالب کا ہی فائدہ دیدے۔ کسی بات کے پیچھے کوئی بھی دلیل نہ ہونے کے باوجود اسے قطعی کہنا اور کہتے چلے جانا کسی لطیفے سے کم نہیں۔ پھر لطف در لطف یہ ہے کہ غامدی صاحب پر اس حکم کی قطعیت کا انکشاف بھی کافی عرصے بعد ہوا ہے۔ پہلے وہ جمہور کے نظریہ جہاد کے قائل تھے۔ تبدیٔ مضامین پر مشتمل اپنی کتاب ''برہان'' میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے طریقہ دعوت وبیعت کے خلاف ''اہل بیعت کی خدمت میں'' کے عنوان سے ایک مضمون ہے، جس میں ڈاکٹر اسرار صاحب کے طریقہ انقلاب و جہاد کی اصلاح کرتے ہوئے یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ داعی پہلے لوگوں کو دعوت کے ذریعے اپنا ہم خیال بنائے اور پھر اپنی ایک آزاد الگ ریاست بنائے اور وہاں سے اسی طرح جہاد کے لیے نکلے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ان کے صحابہؓ مدینہ منورہ

کے مرکز سے نکلے تھے اور آس پاس کی ریاستوں پر قبضہ کیا تھا۔ پھر ایک عرصے کے بعد نہ جانے کس دن ان کو نئے قطعی نظریہ جہاد کا انکشاف ہوا اور اپنے ہی مضمون کو منسوخ کرتے ہوئے اس پر یہ حاشیہ چڑھایا:

''اس مضمون کی تسوید کے وقت میرا نقطہ نظر یہی تھا، لیکن بعد کی تحقیق سے واضح ہوا کہ اس جہاد کا تعلق قرآن کے قانون اتمام حجت سے ہے اور یہ زمانۂ رسالت کے ساتھ خاص تھا۔ چنانچہ رسول اور صحابہؓ رسول کے بعد اب قیامت تک یہ حق کسی شخص کو بھی حاصل نہیں رہا کہ وہ اسلام لاؤ، جزیہ دو یا لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، کی اس دعوت کے ساتھ دنیا کی قوموں پر حملہ آور ہو جائے۔'' (دیکھیے: برہان۔۲۲۹)

[1] یہ بات تو بداہتہ غلط ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کبار صحابہ بھی اتمام حجت کے بعد ایمان لائے۔ پس چہ باید کرد! غامدی صاحب زورِ انشاء میں بھول جاتے ہیں کہ ان کی بات کے نتائج کہاں کہاں گل کھلا رہے ہیں۔

() مولانا ابو الحسن علی ندویؒ نے اپنی کتاب ''قادیانیت'' صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۵ پر مرزا صاحب کے کئی ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جس میں جہاد کو ایک احمقانہ خیال اور ہمیشہ کے لیے منسوخ حکم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب رقمطراز ہیں:

''میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔۔۔ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور 'مہدی خونی' اور 'مسیح خونی' کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں'' (تریاق القلوب: ۱۵)

(میری مذکورہ کتابوں) کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان نہ دکھلا سکا''۔ (سچ ہے۔ یہ خدمت کسی مسلمان کے بس کی تھی ہی کب!!)۔ (ستارہ قیصرہ: ۳)

''میں ابتدائی عمر سے۔۔۔۔ اس اہم کام میں مشغول ہوں کہ۔۔۔ ان (مسلمانوں) کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کردوں جو دلی صفائی اور (کفار کے ساتھ) مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں'' (تبلیغ رسالت: ۷۔۱۰)

''آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا، اب اس کے بعد جو دین کے لیے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے''

''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے''

☆☆☆☆

مولانا صفی اللہ...جامعہ مظاہر علوم کوہاٹ

غامدی صاحب کا تصورِ جہاد

اسلام کا جنگی نظام ''جہاد'' عرصہ دراز سے مخالفین اسلام کے طعن وتشنیع اور اعتراضات کا ہدف رہا ہے۔ علماء امت ہر زمانے میں اس کے جوابات بھی دیتے رہے ہیں، لیکن ماضی قریب میں 'جب سے برقی ایجادات عام ہوئیں، پرنٹ میڈیا اور انٹرنیٹ پوری دنیا پر چھا گیا، جس نے ساری دنیا کو ایک دوسرے سے ملا دیا' اس کے بعد اس سلسلے میں مزید تیزی آئی ہے اور بڑی شدت سے یہ سوال اٹھایا جا رہا ہے: ''ایک کافر سلطنت جہاں رعایا کو ہر قسم کے حقوق ملتے ہیں۔ عدل وانصاف بھی اس میں عام ہے۔ مسلمانوں کو بھی یکساں حقوق دیئے جاتے ہیں۔ مذہب اسلام کی تبلیغ اور مسلمانوں کو مذہبی رسومات ادا کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایسی صورتحال میں اس ملک پر دھاوا بولنا، اس کو تخت وتاراج کرنا، اس کے کافر باشندوں کے سامنے اسلام، جزیہ یا قتل کا مطالبہ پیش کرنا نیز بصورت جزیہ ان کو جملہ حقوق میں ایک مسلمان کے جیسی حیثیت نہ دینا یہ کون سا اخلاقی درجہ ہے؟ یہ اسلام کا کیسا حکم ہے؟ یہ کیسا جہاد ہے؟''

فرق صرف تعبیر کا ہے سوال وہی دھرایا جا رہا ہے جو کئی سو سال پہلے کیا گیا تھا، لیکن پہلے مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت رکھتے تھے اور کم از کم ذہنی طور پر غلام نہ تھے اس لئے انہوں نے ڈٹ کر جوابات دیئے۔ آج جب مسلمان ایک مفتوح قوم بن گئے ہیں یا کم از کم ذہنی غلامی ہیں تو اس کا لازمی اثر یہ سامنے آیا کہ معترضین کو مطمئن کرنے کی خاطر معذرت خواہانہ بلکہ اس سے بڑھ کر محرفانہ رویہ اپنایا گیا۔ جس کے چند نمونے پیش خدمت ہیں۔

(۱)......کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اسلام میں جہاد صرف دفاعی نوعیت کا ہے۔ اقدام سرے سے ہے ہی نہیں۔ عہد نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام اور دور صحابہ کی تمام جنگیں صرف دفاعی تھیں، بعد میں اگر مسلمانوں نے کہیں اقدام کیا ہے تو وہ ان کا ذاتی فعل تھا اسے اسلام کے سر نہیں تھوپا جا سکتا۔

(۲)......کچھ حضرت کے ہاں اگرچہ اسلام میں اقدام کی اجازت ہے، لیکن اس معنیٰ میں نہیں جو آج تک فقہاء سمجھتے چلے آرہے ہیں اور نہ ہی اس اطلاق کے ساتھ، بلکہ اس کے لئے چند شرائط اور قیود ہیں۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ اقدام اس وقت درست ہوگا جب کفر محاربہ کا مرتکب ہو اور ظلم اور فتنہ انگیزی کے ساتھ ساتھ اسلام کے خلاف پنجہ آزمائی کے لئے آمادہ ہو۔

مذکورہ دونوں مواقف پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں اختلاف لفظی ہے، چنانچہ موقف اول کے قائل بعض بزرگوں نے ان غزوات، جن سے صراحتا اقدام کا ثبوت ملتا ہے، کی یہی تاویل کی ہے، لیکن یہ دونوں موقف اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ قرآن، حدیث اور نا قابل انکار تاریخی شواہد کے سامنے اب ان میں سنجیدہ علمی مقاومت کی تاب نہیں۔ ان کی تردید میں اب اتنا لٹریچر موجود ہے کہ اس میں مزید اضافہ کرعبث معلوم ہوتا ہے۔

(۳)......اب ایک تیسرا نظریہ جنم لے رہا ہے جس کی داغ بیل حمید الدین فراہی صاحب نے ڈالی تھی، امین اصلاحی صاحب نے اس کی آبیاری کی اور جناب جاوید احمد غامدی اور ان کے احباب نے اس کو پروان چڑھایا۔ یہ نظریہ دو زمانوں کے درمیان تفریق پر مبنی ہے۔ ایک زمانہ نبی کریم ﷺ اور ان کے اصحاب کا ہے اور ایک زمانہ ان کے بعد کا۔ ان کے نزدیک پہلے زمانے میں جہاد اپنی دونوں نوعیتوں: اقدامی اور دفاعی کے ساتھ مشروع رہا ہے اور جزیہ وغیرہ احکامات بھی اسی زمانے کے ساتھ خاص ہیں، لیکن دوسرے زمانے میں اس کی وہ حیثیت ختم ہوگئی ہے اور جہاد صرف ایک ہی قسم ''مدافعانہ قتال'' کی صورت میں باقی ہے۔ چنانچہ اسی مکتب فکر کے ایک نامور قلم کار جناب عمار خان صاحب، غامدی صاحب کے اس موضوع پر ان کے مختلف تحریرات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کے ہاتھوں جزیرۂ عرب اور روم وفارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے کے بعد غلبہ دین کے لئے جہاد وقتال کے حکم کی مدت خود بخود ختم ہو چکی ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ اس کا ہدف پوری دنیا پر تلوار کے سائے میں دین کا غلبہ اور حاکمیت قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کے لیے جہاد وقتال کا اقدام، دین کے معاملے میں عدم اکراہ اور غیر محارب کفار کے ساتھ جنگ سے گریز ان عمومی اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کیا جائے گا جو قرآن کے نصوص میں مذکور ہے۔'' [جہاد: ایک مطالعہ:۲۰۳]

خود جناب جاوید احمد غامدی لکھتے ہیں:

> ''لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے۔ اور وہ ظلم اور عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جاسکتی۔'' [میزان، ص:۱۰۶]

اسلام اور اس کے احکامات کو دائمی اور آفاقی تسلیم کرنے والے اور پیغمبر اسلام اور اس کی تعلیمات کو عمومی قرار دینے والے کے سامنے جب یہ انوکھا نظریہ آئے گا تو وہ برجستہ طور پر سب سے پہلے یہی سوال

اٹھائے گا کہ اس تقسیم اور تخصیص کی کیا دلیل ہے؟ اس کا تو مطلب یہ بن جائے گا کہ قرآنی احکامات کے مخاطب نبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ ہیں، بعد میں آنے والے نہیں۔ وہی اس دین کے ذمہ دار تھے۔ انہی کو اس کی خاطر قتل وقتال، قید وبند اور اسارت سب جائز تھا، اوروں کے لیے نہیں؟ نیز اس کا یہ نتیجہ نکالنا بھی درست ہوگا کہ مزید اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے تگ ودو کی گنجائش نہیں اگر وہ پرامن طریقے سے ممکن نہ ہو؟ اور نہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی حاجت باقی رہتی ہے جبکہ جہاد اس کا رکن اعظم ہے؟ غامدی نقطہ نظر میں تو ان باتوں کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ [دیکھیے، جہاد: ایک مطالعہ۔ ص: ۱۹۴۔۲۵۴۔۳۰۲]

غامدی حلقہ فکر کے احباب نے قرآن، حدیث اور تاریخ سے اس 'مفروضے' کی تائید حاصل کرنے کی جو کوشش کی ہے، ذیل میں اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرآن اور غامدی صاحب کا تصور جہاد:

یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ قرآن میں جہاد اقدامی اور اس کے عموم اور تابید کے سلسلے میں واضح احکامات موجود ہیں جن سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ آسانی کے ساتھ انہیں نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن غامدی حضرات مندرجہ ذیل مقدمات کے بل بوتے پر ان کو بائی پاس کرتے ہوئے تحدید اور تخصیص پر محمول کرتے ہیں۔

منصب رسالت کی اصطلاح:

منصب رسالت کی تشریح اور اس کے مخصوص احکام کی توضیح کرتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ سے متعلق معلوم ہے کہ آپ نبوت کے ساتھ ساتھ رسالت کے منصب پر بھی فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو خلق کی ہدایت کے لیے مبعوث فرماتے ہیں اور اپنی طرف سے وحی والہام کے ذریعے ان کی رہنمائی کرتے ہیں انھیں نبی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر نبی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ رسول بھی ہو۔ رسالت ایک خاص منصب ہے جو نبیوں میں سے چند کو حاصل ہوا ہے۔ قرآن میں اس کی تفصیلات کے مطابق رسول اپنے مخاطبین کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے اور ان کا فیصلہ کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔" [میزان: ۴۸]

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"دوسری صورت (یعنی اتمام حجت کے بعد منکرین حق سے قتال کرنا، بہ الفاظ دیگر اقدامی قتال) کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ اس کے براہ راست حکم سے اور انھیں ہستیوں کے ذریعے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ "رسالت" کے منصب پر فائز کرتا ہے۔" [میزان: ۶۰۱]

شہادت علی الناس کی اصطلاح:

'شہادت علی الناس' کی خود ساختہ تشریح اور اس پر احکام کی تفریع کرتے ہوئے جناب عمار خان ناصر صاحب لکھتے ہیں:

''شہادت علی الناس منصب کی مختصر وضاحت یہ ہے کہ عالم کا پروردگار کسی خاص گروہ سے اپنی وفاداری اور اطاعت کا عہد و پیان لے کر اسے دین و شریعت کی نعمت سے نوازتا، آزمائش اور ابتلاء کے مختلف مراحل سے گزار کر اس کے تزکیہ و تربیت کا اہتمام کرتا اور اس امتحان میں کامیابی پر اسے دنیوی حکومت واقتدار سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔ یہ گروہ اپنے اجتماعی وجود کے لحاظ سے یوں سراپا حق اور مجسم عدل وانصاف ہوتا اور اپنی دعوت اور کردار کے ذریعے سے حق کی اس طرح عملی شہادت بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں کفر وطغیان کا رویہ اپنانے والی قوموں کو سزا دینے کا اختیار دے دیتا ہے۔ 'شہادت' کے منصب پر فائز گروہ کے لیے اس اختیار اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتوحات کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے انعام کی ہوتی ہے اور اسے یہ حق دے دیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی سرزمین میں اس کی میسر کردہ نعمتوں اور وسائل کو اپنے تصرف میں لے آئے، جبکہ مفتوح و مغلوب قوموں کے لیے یہی عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا اور انتقام قرار پاتا ہے۔'' [جہاد: ایک مطالعہ، ص:۱۶۳]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ مختلف زمانوں میں کفر وشرک اور بدکاری میں مبتلا قوموں کے محاسبہ اور مواخذہ کے لیے خود انسانوں میں سے بعض منتخب گروہوں کو مامور فرماتے رہے ہیں جو خدا کے اذن کے تحت ایک مخصوص دائرہ اختیار میں بدکار قوموں کے خلاف جنگ اور قتل واسارت اور محکومی کی صورت میں انھیں ان کی بداعمالیوں کی سزا دیتے ہیں۔ اقوام عالم کے سامنے اس منتخب گروہ کی حیثیت کو علی رؤوس الاشہاد مبرہن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے خصوصی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے.....'' [ایضاً:۱۹۴]

اس سلسلے میں جاوید احمد غامدی کی تحریروں کا خلاصہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''۱۔ منصب رسالت پر فائز کوئی ہستی جب کسی قوم میں مبعوث کر دی جاتی ہے تو اس فیصلے کے ساتھ کی جاتی ہے کہ رسول اور اس کے پیروکار اپنے مخالفین پر بہر حال غالب آ کر رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کو جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث کیا گیا، اس سنت الٰہی کے مطابق یہ دوٹوک اعلان کر دیا گیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والے تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے مغلوبیت اور محکومیت مقرر ہو چکی ہے۔

۲۔ اس غلبے کے حصول کی حکمت عملی میں دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ 'جہاد وقتال' بھی ایک لازمی عنصر کے طور پر شامل تھا، چنانچہ یہ ہدف ویکون الدین للہ کے الفاظ میں واضح کر دیا گیا تھا۔ البتہ اس وعدے کا عملی ظہور دو مرحلوں میں ہوا۔ جزیرۃ العرب کی حد تک تو اس دین کو خود نبی ﷺ کی زندگی میں

غالب کر دیا گیا...... جزیرۃ العرب سے باہر روم، فارس اور مصر کی سلطنتوں تک اس غلبے کی توسیع کی ذمہ داری صحابہ کرام پر عائد کی گئی جنھیں اس مقصد کے لیے 'شہادت علی الناس' کے منصب پر فائز کیا گیا۔"

"چنانچہ اسلامی تاریخ کے صدر اول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروکاروں کے ہاتھوں جزیرۂ عرب اور روم وفارس کی سلطنتوں پر دین حق کا غلبہ قائم ہو جانے کے بعد غلبہ دین کے لیے جہاد وقتال کے حکم کی مدت خود بخود ختم ہو چکی ہے۔ یہ شریعت کا کوئی ابدی اور آفاقی حکم نہیں تھا اور نہ اس کا ہدف پوری دنیا پر تلوار کے سائے میں دین کا غلبہ اور حاکمیت قائم کرنا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کے لیے جہاد وقتال کا اقدام، دین کے معاملے میں عدم اکراہ اور غیر محارب کفار کے ساتھ جنگ سے گریز ان عمومی اخلاقی اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی کیا جائے گا جو قرآن کے نصوص میں مذکور ہے۔" [جہاد: ایک مطالعہ:۲۰۳]

ان دونوں مقدمات کا خلاصہ درج ذیل دو نکات کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ شہادت علی الناس اور منصب رسالت کی خاص تشریح۔

۲۔ قرآن میں اقدامی قتال اور اس سے متعلق احکامات کے مخاطب اور مکلف صرف یہی ہستیاں ہیں۔

ہم درج بالا نکات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔

منصب رسالت اور اس پر متفرع احکام کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ:

۱۔ منصب رسالت اور نبوت میں یہ تفریق کوئی قطعی بات نہیں، اس سے اختلاف کی گنجائش ہے اور ہوا بھی ہے اور یہ رائے زیادہ وزنی بھی نہیں۔ اس کی بنیاد پر قرآنی آیات واذکر فی الکتاب اسماعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولا نبیا اور واضرب لھم مثلا اصحاب القریۃ اذجاء ھا المرسلون جیسی آیات کی توجیہ مشکل نظر آتی ہے، اس لیے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

"رسول اور نبی کے مفہوم میں عموم اور خصوص من وجہ ہے، رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعت جدیدہ پہنچائے، خواہ وہ شریعت خود اس کے اعتبار سے جدید ہو، جیسے توراۃ یا صرف اس امت کے اعتبار سے جدید ہو جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت، شریعت ابراہیمیہ بنو جرہم کے اعتبار سے جدید تھی۔ اس معنی کے اعتبار سے رسول کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں، جیسے فرشتے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد۔ اذجاء ھا المرسلون۔ اور نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو، خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ، جیسے اکثر انبیاء بنی اسرائیل۔" [بیان القرآن، ص:۱۱ بتصرف]

۲۔ نیز رسول کا اپنی امت کے حق میں 'فیصلہ کر کے جانا' اور 'بہر حال غالب آنا' دونوں باتیں محل اشکال ہیں۔ اس لیے کہ کئی رسول ایسے گزرے ہیں کہ جنھوں نے مخاطبین تک خدا کا پیغام پورا پورا پہنچایا اور بھر پور انداز سے ان کو تبلیغ کی اس کے باوجود وہ نہیں مانے، بلکہ بعض تو ان کے درپے آزار ہوئے، لیکن ان کی

امتوں پر ان کی موجودگی میں کسی قسم کا عذاب نہیں آیا۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام۔
حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"فصل: ومن آياته نصر الرسل على قومهم: وهذا على وجهين. تارة يكون باهلاك الأمم وانجاء الرسل وأتباعهم، كقوم نوح، وهود، وصالح، وشعيب، ولوط، وموسى، ولهذا يقرن الله بين القصص في سورة الأعراف وهود والشعراء، ولا يذكر معها قصة ابراهيم؛ وانما ذكر قصة ابراهيم في سورة الأنبياء و مريم والعنكبوت والصافات، فان هذه السور لم يقتصر فيها على ذكر من أهلك من الأمم ......الله تعالى لم يذكر قط عن قوم ابراهيم أنهم أهلكو كما ذكر عن غيرهم، بل ذكر أنهم القوه في النار فجعلهاالله بردا وسلاما وأرادو به كيدا فجعلهم الله الأسفلين الأخسرين، (الوجه الثاني: اظهار برهان النبي بالحجة والعلم والقدرة) وفي هذاظهور برهانه وآيته وأنه أظهر عليهم بالحجة والعلم.... [النبوات :۲۰۵ ومابعدها]

"فصل: اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی رسولوں کی ان کی قوم کے مقابلے میں مدد کرنا ہے اور یہ دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ کبھی امتوں کی ہلاکت اور رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو نجات دلانے کی صورت میں، جیسے: نوح، ہود، صالح، شعیب، لوط اور موسیٰ علیہم السلام کی اقوام۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان امتوں کے واقعات سورۂ اعراف، ہود، اور شعراء میں ایک ساتھ ذکر کرتے ہیں اور ابراہیمؑ کا قصہ ان کے ساتھ ذکر نہیں کرتے، بلکہ ابراہیمؑ کا قصہ سورۂ انبیاء، مریم، عنکبوت اور صافات میں ہے، اس لیے کہ ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے صرف ہلاک شدہ امتوں کے تذکرہ پر اکتفاء نہیں کیا ہے......اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے متعلق کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ انہیں ہلاک کردیا گیا جیسے دیگر امتوں کے متعلق بتایا ہے، بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ ان کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنادیا اور قوم نے ان کے خلاف سازشیں کیں اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام ونامراد بنادیا۔ (انبیاء کی مدد کا دوسرا طریقہ: انبیاء کی مدد حجت، علم اور قدرت کے ذریعے) اس طریقہ میں نبی کی دلیل ومعجزے کا اظہار اور اس دلیل اور علم کی بدولت نبی کا قوم پر غلبہ ہوتا ہے۔"

منثور میں بحوالہ ابن ابی حاتم انا لننصر رسلنا والذين امنوا فى الحيوة الدنيا کی تفسیر امام سدیؒ سے یہ منقول ہے:

"لم يبعث الله رسولا الى قومه فيقتلونه أو قوما من المؤمنين فيدعون الى الحق فيقتلون، فيذهب ذلك القرن حتى يبعث الله اليهم من ينصرهم فيطلب بدمائهم ممن فعل ذلك بهم في الدنيا وهم منصورون فيها. [الدر المنثور: ۲۹۳/۷]

"اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی طرف رسول بھیجتے ہیں یا کسی مؤمن قوم کو ان کی طرف مبعوث کرتے ہیں، ان کو حق کی طرف بلاتے ہیں اور اس کے پاداش میں انہیں قتل کردیا جاتا ہے، جب یہ صدی گزر جاتی ہے تو اللہ ان کی طرف ان انبیاء اور مؤمنین کے مددگار بھیجتے ہیں اور ان کے قاتلوں سے قصاص طلب

کرتے ہیں۔ اللہ کی مدد ایسے لوگوں کے شامل حال رہتی ہے۔"

شہادت علی الناس اور اس پر متفرع احکامات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ:

اسی طرح 'شہادت علی الناس' کی مذکورہ تشریح نصوص کے خلاف ہے۔ جس کو ہم صرف اور صرف تفسیر بالرأی موافق للھویٰ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ احادیث کے ذخیرے میں 'شہادت علی الناس' کا بطور منصب جو ذکر آیا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مختلف انبیاء اور ان کی امتوں کو بلائیں گے، پہلے انبیاء سے پوچھیں گے کہ انہوں نے اپنی امتوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا ہے یا نہیں؟ انبیاء جواباً عرض کریں گے کہ ہم نے ان کو پہنچایا ہے۔ اس کے بعد ان کی امتوں سے پوچھا جائے گا تو وہ ان انبیاء کی تکذیب کریں گے۔ اب اللہ تعالیٰ انبیاء سے گواہ طلب کریں گے تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو بطور گواہ پیش کریں گے۔ یہ امت انبیاء کے حق میں گواہی دے گی اور نبی ﷺ اپنی امت کے حق میں گواہی دیں گے۔ یہی وہ منصب ہے جو اس پوری امت کو خصوصی طور پر عطاء کیا جائے گا اور قرآن میں شہادت علی الناس سے یہی مراد ہے۔"

[رواہ البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۹، ۴۴۸۷، ۷۳۴۹، والترمذی: ۲۹۶۱، والنسائی فی السنن الکبری: ۱۱۰۰۷، وابن ماجہ: ٤٢٨٤، واحمد: ۱۱۵۷۵، وابن جریر فی تفسیرہ: ۲۱۷۹، وابن ابی حاتم: ۱۳۲۵]

بلکہ ابی بن کعبؓ کے قراءت میں اسکی تصریح بھی ہے۔ لتکونو شھداء علی الناس یو القیامہ۔ (تفسیر ابن حاتم: رقم ۱۳۳۵)

مزید یہ ہے کہ یہ منصب بھی صحابہ کرام کے ساتھ مختص نہیں، بلکہ پوری امت کے لیے ہے۔ اس لیے کہ لتکونو شھداء علی الناس ثمرہ ہے أمة وسطا کا، اور أمة وسطا کی تفسیر حضرت ابن عمرؓ سے أمة محمد صلی الله علیه و سلم جمیعا منقول ہے۔ [الدر المنثور: ۱/۱۴۴]

درمنثور کی ایک روایت ہے:

"اعطیت ھذہ الأمة ثلاث خصال، لم یعطیھا إلا الانبیاء کان النبی یقال له: بلغ ولا حرج، وأنت شھید علی قومك، وادع أجیبك، وقال لھذہ الأمة: ماجعل علیکم فی الدین من حرج، وقال: لتکونوا شھداء علی الناس، وقال: ادعونی استجب لکم. [الدر المنثور: ۱/۱۴۴]

"اس امت کو تین ایسے شرف عطاء کیے گئے ہیں کہ سوائے انبیاء کے کسی اور کو عطا نہیں کیے گئے۔ پہلے نبی کو یہ کہا جاتا تھا کہ آپ اللہ کے احکامات کی تبلیغ کیجیے اور آپ پر کسی قسم کی تنگی نہیں کی گئی، آپ اپنے قوم پر گواہ ہیں، آپ دعا مانگیں میں قبول کروں گا، اور اس امت کو بھی کہا گیا کہ تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی گئی ہے، تم لوگوں پر گواہ ہو، تم دعا مانگو میں قبول کروں گا۔"

تفسیر طبری کی روایت ہے، جس کی سند میں ایک مجہول راوی بھی ہے لیکن اسے بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے:

"أنا وأمتي لعلى كوم يوم القيامة مشرفين على الخلائق ، ماأحد من الأمم الا ود أنه منا أيتها الأمة، ومامن نبي كذبه قومه الا ونحن شهداؤه يوم القيامة أنه قد بلغ رسالات ربه ونصح لهم.[تفسير الطبرى: ۲۱۸۲]

"میں اور میری امت قیامت کے روز ایک بلند ٹیلے پر لوگوں پر نگاہ کیے ہوئے جلوہ افروز ہوں گے۔ ہر امت یہی چاہے گی کہ وہ اس عظیم امت میں سے ہوتے۔ جس نبی کو بھی اس کی قوم نے جھٹلایا ہو ہم اس کے لیے قیامت کے دن گواہ ہوں گے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہے اور لوگوں سے خیر خواہی کی ہے۔"

حضرت زید بن اسلم سے منقول ہے:

"ان الأمم يقولون يوم القيامة والله لقد كادت هذه الأمة أن تكون انبياء كلهم لما يرون أعطاهم الله .[تفسير الطبرى: ۲۱۹۴]

"دیگر امتیں قیامت کے دن اس امت کی وہ فضیلتیں دیکھیں گی جو اللہ نے اس امت کو عطاء کی ہیں تو کہیں گی: خدا کی قسم! قریب تھا کہ یہ ساری امت انبیاء ہوتے۔"

اس پوری تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ شہادت علی الناس کی نہ وہ تشریح ہے جو غامدی مکتبہ فکر کے ہاں رائج ہے اور نہ یہ منصب صرف صحابہ کے ساتھ مختص ہے۔ لہٰذا اس پر جو احکامات متفرع ہیں وہ بھی بناء الفاسد علی الفاسد کے قبیل سے ہیں۔

احکامات اسلام اور خطابات قرآنیہ کی عمومیت:

غامدی حضرات کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اقدامی قتال یا اسلام، جزیہ اور قتل کا مطالبہ سامنے رکھنا عام اخلاقی دائرے سے باہر ہے اس لیے وہ آیات واحادیث جن میں اس قسم کے احکامات مذکور ہیں ان کے مخاطب اور مکلف صرف نبی ﷺ اور صحابہ ہیں..... یہ انتہائی کمزور بات ہے اور ایک ایسی رائے ہے کہ شاید ہی چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں کسی مسلمان نے اس طور پر کہی ہو۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"وجمهور العلماء على أن جنس العرب خير من غيرهم ....لكن تفضيل الحملة على الحملة لا يستلزم أن يكون كل فرد افضل من كل فرد، فانه في غير العرب خلق كثير خير من أكثر العرب .... كما قال رسول ﷺ:ان خير القرون القرن الذى بعثت فيهم، ثم الذين يلونهم ، ثم الذين يلونهم ، وفي القرون المتأخرة من هو خير كثيرمن القرن الثاني والثالث .ومع هذا، فلم يخص النبي ﷺ القرن الثاني والثالث بحكم شرعي ، كذلك لم يخص العرب بحكم شرعي ،بل ولا خص بعض أصحابه بحكم دون سائر أمته، ولكن الصحابة لما كان لهم من الفضل أخبر بفضلهم ، وكذلك السابقون الأولون لم يخصهم بحكم ولكن أخبر بمالهم من الفضل..... .[مجموع الفتاوى: ۱۱/۱۷ ومابعدها]

"جمہور علماء کا مذہب یہ کہ جنس عرب غیر عرب سے بہتر ہے، لیکن مجموعے کی فضیلت اس مجموعے کے ہر ہر

غیر عرب کے ہر ہر فرد کی فضیلت کو مستلزم نہیں۔ اس لیے کہ غیر عرب میں بہت سارے ایسے لوگ ہیں جن کو بہت سے عربوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ...جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے 'بہترین صدی وہ ہے کہ جس میں میں مبعوث ہوا ہوں، اس کے بعد دوسری صدی والے اور اس کے بعد تیسری صدی والے، لیکن قرون متاخرہ میں ایسے لوگ ہیں جو قرن ثانی اور ثالث والوں سے بدرجہا افضل ہیں۔ اس کے باوجود نبی ﷺ نے قرن ثانی و ثالث کو کسی حکم شرعی کے ساتھ مختص نہیں کیا اور اس طرح آپ ﷺ نے عربوں کو بھی کسی حکم شرعی کے ساتھ خاص نہیں کیا، بلکہ باقی امت کو چھوڑ کر اپنے چند صحابہ کو بھی کسی حکم کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے۔ لیکن چونکہ صحابہ کو فضیلت حاصل تھی تو اس کے متعلق بتادیا۔ اس طرح اسلام لانے میں پہل کرنے والے صحابہ کو بھی کسی حکم کے ساتھ خاص نہیں کیا، بلکہ ان کی جو فضیلت تھی اس سے آگاہ فرمایا۔"

قاضی شوکانی اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الخطاب الوارد شفاها في عصر النبي ﷺ نحو :يأأيها الناس و يأأيها الذين امنو ويسمى: خطاب المواجهة ،قال الزركشي:لا خلاف في شموله من بعد هم من المعدومين حال صدورهم ،لكن هل بالفظ أو بدليل اخر من احماع أو قياس .فذهب جماعة من الحنفية والحنابلة الى أنهم يشملهم باللفظ ، ذهب الأكثرون الى انهم لايشملهم باللفظ......قال ابن دقيق العيد في شرح العنوان:الخلاف في أن خطاب الشافهة هل يشتمل غير المخاطبين قليل الفائدة، ولا ينبغي ان يكون فيه خلاف عند التحقيق ؛لانه اما ان ينظر الى مدلول اللفظ لغة، و لا شك انه لا يتناول غير المخاطبين ،واماان يقال:ان الحكم يقصر على المخاطبين،الا انه يدل دليل على عموم في تلك المسألةبعينها، وهذا باطل؛لما علم قطعاًمن الشريعة أن لأحكام عامةالا حيث يرد التخصيص .انتهى[ارشاد الفحول: ۳۲۲/۱]

"نبی ﷺ کے زمانے میں براہ راست وارد ہونے والا خطاب، جیسے یاایھاالناس اور یاایھاالذین امنو اس کو خطاب مواجہہ کہتے ہیں۔ زرکشیؒ کہتے ہیں اسمیں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ بعد میں آنے والوں کو بھی شامل ہے، لیکن اختلاف اس میں ہے کہ اسی لفظ سے شامل ہوتا ہے یا کسی اور دلیل سے، یعنی اجماع یا قیاس سے۔ حنفیہ میں سے ایک گروہ اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ اسی لفظ سے شامل ہوتا ہے، جبکہ اکثر کا مذہب اس کے خلاف ہے.....ابن دقیق العید شرح العنوان میں لکھتے ہیں: اس مسئلہ میں اختلاف کا کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اہل تحقیق کے ہاں اس میں اختلاف مناسب ہے۔ اس لیے کہ اگر لفظ کے لغوی مدلول کا اعتبار کریں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مخاطبین کے علاوہ کسی اور کو شامل نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اسکا حکم صرف مخاطبین کے لیے ہے کسی اور کے لیے نہیں، سوائے اس صورت کے جس میں خصوصی طور اس حکم کے عموم کی دلیل ہو، یہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ شریعت کے احکامات عام ہیں مگر کہیں تخصیص ہوئی ہو (تو دوسری بات ہے۔)"

التقریر و التحبیر میں خطاب کے صیغوں کے متعلق امام سبکی کا یہ زریں اقتباس درج ہے:

"اعلم أنه لا ينبغي أن يعتقد أن التعميم من جهة وضع الصيغة لغة، ولا أن الشارع لم يحكم بالتعميم حيث لم يظهر التخصيص، بل الحق أن التعميم منتف لغة ثابت شرعا من حيث أن الحكم على الواحد حكم على الجماعة، ولا أعتقد أن أحدا يخالف في هذا.[۱۱۸/۲]

"جان لو کہ یہ سمجھنا کہ (حکم میں) عموم (خطاب کے) صیغے کا معنیٰ موضوعی ہے، صحیح نہیں اور نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ جہاں تخصیص کی کوئی دلیل نہ بھی ہو وہاں بھی شارع نے عموم کا کوئی حکم نہیں کیا ہے۔ حق بات یہ ہے کہ عموم لغۃً تو منتفی ہے، شرعاً ثابت ہے اس لیے کہ ایک فرد پر حکم پوری جماعۃ پر حکم ہے۔ میں نہیں سمجھتا کوئی اس سے بھی مخالفت کرے گا۔"

دکتور صبحی صالح اپنی مایہ ناز کتاب مباحث فی علوم القرآن میں لکھتے ہیں:

"واذا خاطب الله نبيه بمثل يا ايها النبي اتق الله، فخطابه لا يعم الامة بطريق الدلالة الوضعية، ولكنه يعمها بدليل اخر، هو وجوب الاقتداء به صلوات الله عليه، الا اذا قام على ان الحكم خاص به .[مباحث في علوم القرآن:۳۰۷]

"جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو یا ايها النبي اتق الله جیسے تعبیر سے خطاب فرماتا ہے تو یہ دلالت وضعیہ کے طور پر امت کو شامل نہیں بلکہ ایک اور دلیل اور وہ آپ ﷺ کی اتباع واجب ہونا ہے سے شامل ہوتا ہے الا یہ کہ کوئی دلیل اس پر قائم ہو کہ یہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص ہے۔"

ان تمام عبارات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن واحادیث میں وارد ہونے والے تمام خطاب کے صیغے عمومی اور دائمی ہیں، یعنی ہر شخص، ہر جگہ اور ہر زمانے میں رہنے والا اس کا مکلف ہے اور اس پر پوری امت کا اجماع چلا آرہا ہے اور یہ سمجھنا کہ ان کا تعلق صرف ان لوگوں کے ساتھ ہے جو اس وقت موجود تھے سراسر غلط ہے۔ اگر ان احکامات میں کسی کو کوئی اختصاص یا امتیاز حاصل ہے تو اس کے لیے واضح نص کا ہونا ضروری ہے۔ جیسے زکوۃ کے باب میں بنی ہاشم کی تخصیص اور خلافت کے حق میں قریش کا امتیاز۔ لہٰذا اقدام کے متعلق آیات واحادیث بھی جوں کی توں مشروع ہوں گی اس لیے کہ کوئی ایسی نص نہیں جو واضح طور پر اس تفریق کی تائید کرتی ہو بلکہ بکثرت ایسی نصوص موجود ہیں جو اقدام کے عموم اور دوام پر دلالت کرتی ہیں، جیسے کہ آگے آجائے گا۔ رہی یہ بات 'کہ اقدامی قتال اور اس کے متعلقہ احکامات عام اخلاقی دائرے میں نہیں آتے' بے ہودہ سی بات ہے، جو کسی مسلمان کے شایان شان نہیں۔ جب ایک حکم قرآن وحدیث سے ثابت ہے پھر اس میں اخلاقی اور غیر اخلاقی کی تفریق کے کیا معنیٰ؟ سوال یہ ہوتا ہے کہ عام اخلاقی دائرہ کیا ہے؟ اس کا معیار کیا ہے؟ اور کیا اس کی مشترکہ تعیین اور تحدید ممکن ہے؟ افسوس کی بات ہے کہ عصر حاضر کے تحقیق اور اجتہاد کے دعویداروں کو اتنی بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہر کمیونٹی، ملک اور مذہب کی اخلاقیات اور دیگر بہت ساری چیزوں میں معیار مختلف ہوتا ہے۔ آج کا مغربی معاشرہ زنا بالرضا، عورت کو طلاق کا اختیار اور مردوں کے برابر ہر چیز میں ان کو شانہ بشانہ کھڑا کرنا بہت بڑا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہے، جبکہ اسلام اس کی سختی سے تردید

کرتا ہے۔عورت کے پردے کو وہ آج ظلم قرار دے رہے ہیں حالانکہ اسلام اس کے برعکس اس کو ذریعہ حفاظت قرار دے رہا ہے۔اسی طرح کفر کی سربلندی کو اسلام فساد کہتا ہے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیتا ہے۔واضح رہے کہ جب شریعت ایک حکم دے تو اسے بسر و چشم قبول کرنے کے بعد دیکھیں گے کہ اس کی معقولیت عام لوگوں کی ذہن میں آتی ہے یا نہیں،اگر اس کی معقولیت عام لوگوں کی فہم میں بھی آرہی ہے تو حسن لعینہ اور اگر نہیں آرہی تو حسن لغیرہ ہے۔اگر ہم اپنے اکابر کی خدمات اور تحقیقات کو بنظر استخفاف نہ دیکھتے تو آج ان معمولی اعتراضات کی وجہ سے جہالت کی ان گھاٹیوں میں جا کر نہ گرتے۔کاش ہم" کتب علیکم القتال وهو كره لكم وعسى ان تكرهوا شيئا وهو خير لكم .. .اور والفتنة اكبر من القتل "پر غور کرتے تو اس اشکال کا جواب پاتے۔بایں ہمہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ اقدامات بالکل اخلاقی دائرے میں ہے اور اسکی وضاحت ہم مستقل عنوان کے تحت کریں گے۔

نیز احادیث سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے کہ جہاد اقدامی صرف منصب شہادت علی الناس پر فائز ہستیوں کے ذریعے روبہ عمل ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"ما من نبي بعثه الله في امة قبلي الا و كان له من امته حواريون واصحاب يأخذون بسنته ويقتدون بأمره،ثم انها تخلف من بعدهم خلوف يقولون مالا يفعلون ،ويفعلون مالا يؤمرون، فمن جاهدهم بيده فهو مؤمن،ومن جاهدهم بلسانه فهو مؤمن ، ومن جاهدهم بقلبه فهو مؤمن ليس وراء ذلك من الايمان حبة خردل .[رواه مسلم: ۵۰،واحمد:۴۳۷۹،والبيهقي:۱۹۹۶۵]

"جو نبی بھی اللہ نے اس سے پہلی امتوں میں مبعوث فرمایا اس کے لیے ضرور اس قوم میں چند ایسے حواری اور ساتھی ہوتے جو اس کے طریقوں پر چلتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے۔پھر ان کے بعد کچھ نااہل لوگ آتے،وہ جو کہتے اس کو پورا نہیں کرتے اور جس چیز کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہوتا اس کو کرتے۔تو جس نے ان سے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے،جس نے زبان سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے اور جس نے دل سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے۔اس کے بعد رائی کے دانے برابر ایمان بھی نہیں۔"

یہاں انبیاء اور "منصب شہادت پر فائز ہستیوں" کے بعد آنے والے منکرین کے ساتھ بھی جہاد بالید کو اعلیٰ درجہ قرار دیا جارہا ہے۔

احادیث اور غامدی صاحب کا تصور جہاد:

جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو کوئی بھی ایک حدیث ایسی پیش نہیں کرسکے جو اس بات کی تائید کرے کہ جہاد کے اہداف محدود ہیں اور اس مشن کے پیش نظر صرف روم اور فارس کی سلطنتیں ہیں۔تاہم ایک حدیث ایسی ہے جن کو یہ حضرات بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس کو اپنے دلائل میں سرفہرست

رکھتے ہیں، کہ نبی ﷺ نے فرمایا: دعوا الحبشة ما ودعوكم واتركوا الترك ما تركوكم. ''جب تک اہل حبشہ تم سے تعرض نہ کریں تو تم بھی صلح کرنا اور جب تک اہل ترک تم سے گریز کرتے رہیں تو تم بھی کرنا۔'' ترک اور حبشہ پر قیاس کرتے ہوئے روم اور فارس کے علاوہ ممالک کے لیے بھی یہی حکم ثابت کرتے ہیں کہ ان کے خلاف اقدام جائز نہیں۔

لیکن اس حدیث سے کئی وجوہ کی بناء پر استدلال نہیں کیا جا سکتا:

۱- پوری حدیث سے آپ ﷺ کے ارشاد کا صحیح پس منظر سمجھ میں آ جاتا ہے اور پوری حدیث یوں ہے:

''لما امر النبي ﷺ بحفر الخندق عرضت لهم صخرة حالت بينهم وبين الحفر ،فقام رسول الله ﷺ واخذ المعول ووضع رداءه ناحية الخندق ،وقال: تمت كلمة ربك صدقاً وعدلاً لا مبدل لكلماته وهو السميع العليم .فندر ثلث الحجر وسلمان الفارسي قائم ينظر ،فبرق مع ضربة رسول الله ﷺ برقة ، ثم ضرب الثانية وقال:تمت كلمة ربك صدقًا وعدلًا لا مبدل لكلماته وهو السميع العليم .فندر الثلث الآخر ،فبرقت برقة راها سلمان ،ثم ضرب الثالثة وقال:تمت كلمة ربك صدقًا وعدلًا لا مبدل لكلماته وهو السميع العليم.فندر الثلث الباقي وخرج رسول الله ﷺ واخذ رداءه وجلس ،قال سلمان : يا رسول الله رأيتك حين ضربت ما تضرب ضربةً الا كانت معها برقة ،قال رسول الله ﷺ: يا سلمان ! رأيت ذلك ؟ فقال : اى والذى بعثك بالحق يا رسول الله ،قال : فاني حين ضربت الضربة الاولى رفعت لي مدائن كسرىٰ وما حولها ومدائن كثيرة حتى رأيتها بعيني ،-قال له من حضره من اصحابه:يارسول الله ادع الله أن يفتحها علينا ويغنمنا ديارهم ويخرب بأيدينا بلادهم ،فدعا رسول الله ﷺ بذلك۔ ثم ضربت الضربة الثانية فرفعت لي مدائن قيصر وماحولها حتى رأيتها بعيني ۔ قالوا: يا رسول الله!ادع الله أن يفتحها علينا ويغنمنا ديارهم ويخرب بأيدينا بلادهم،فدعا رسول الله ﷺ بذلك۔ ثم ضربت الضربة الثالثة فرفعت لي مدائن الحبشة وما حولها من القرىٰ حتى رأيتها بعيني ،قال رسول الله ﷺ عند ذلك:دعوا الحبشة ما ودعوكم واتركوا الترك ماتركوكم. [سنن النسائي:۳۱۷۶]

''جب نبی کریم ﷺ نے خندق کھودنے کا حکم دیا تو ایک جگہ چٹان آ گئی جو خندق کھودنے میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے اور چادر کو خندق کے ایک کونے پر رکھ کر کدال ہاتھ میں لی اور (وار کرتے ہوئے) یہ فرمایا ''تیرے رب کا کلام سچائی اور عدل میں کامل ہے، کوئی بھی اس کو بدل سکنے والا نہیں اور وہ ہی خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔'' تو چٹان کا ایک تہائی حصہ ٹوٹ گیا، سلمان فارسیؓ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے وار سے ایک بجلی سی چمکی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے کہ ''تیرے رب کا کلام سچائی اور عدل میں کامل ہے، کوئی اس کے کلمات کو بدل سکنے والا نہیں اور وہ ہی خوب سننے والا اور اچھی طرح جاننے والا ہے۔'' دوسرا وار کیا، جس سے چٹان کا دوسرا تہائی حصہ ٹوٹ گیا، اس سے بھی ایک چمک سی اٹھی جس کو سلمانؓ نے دیکھا۔ اس کے بعد پھر آپ نے یہی آیت دہراتے ہوئے تیسرا

وار کیا جس سے چٹان کا باقی حصہ بھی ٹوٹ گیا۔ نبی کریم ﷺ اپنی چادر لے کر تشریف فرما ہوئے۔ سلمان فارسیؓ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! یہ کیا بات ہے کہ آپ جب بھی وار کرتے مجھے اس کے ساتھ ایک چمک سی نظر آتی تھی؟ آپؐ نے فرمایا: سلمان! واقعی تم نے یہ دیکھا؟ سلمان نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میں نے یہ دیکھا ہے، اس پر آپ علیہ السلام نے فرمایا: جب میں نے پہلا وار کیا تو میرے سامنے سلطنت کسریٰ کے شہر، اس کے اردگرد کے علاقے اور دیگر بہت سارے شہر اٹھائے گئے حتیٰ کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔'' حاضر صحابہ کہنے لگے کہ اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کیجیے کہ ہمیں ان پر فتح نصیب فرمائیں اور ہمیں یہ غنیمت میں ملیں اور ان کے گھروں کو ہم اپنے ہاتھوں سے ویران کر دیں، آپ ﷺ نے ان کے لیے یہ دعا فرمائی۔'' جب میں نے دوسرا وار کیا تو میرے سامنے قیصر کے تمام شہر اور اس کے اردگرد کے علاقے اٹھائے گئے یہاں تک کہ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ''صحابہ نے پھر وہی درخواست کی اور آپ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔'' جب میں نے تیسرا وار کیا تو میرے سامنے حبشہ کے تمام شہر اور اس کے اردگرد کی بستیاں اٹھائی گئیں حتیٰ کہ میں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس موقع نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: جب تک اہل حبشہ تم سے تعرض نہ کریں تو تم بھی نہ کرنا اور جب تک اہل ترک تم سے گریز کرتے رہیں تو تم بھی کرتے رہنا۔''

اس حدیث کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں اسلام کے عالمگیر فتوحات سلطنت کسریٰ، اس کے اردگرد علاقے اور ان کے علاوہ دیگر بہت سارے شہر پھر سلطنت روم اور اس کے اردگرد کے علاقے حتیٰ کہ حبشہ کا بھی اس میں صراحتاً ذکر ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا یہ مشن کوئی محدود اہداف نہیں رکھتا بلکہ اس کے پیش نظر تمام عالم ہے۔ حدیث کے دوسرے حصہ میں ابتداء ترک اور حبشہ پر فوج کشی سے منع کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے بظاہر جزء اول سے تعارض نظر آ رہا ہے۔ لیکن درحقیقت کوئی تعارض نہیں اس لیے کہ ما ترکوکم اور ما ودعوا کم کا اسلوب بتاتا ہے کہ یہ حکم جوازی ہے اور آنحضرت ﷺ نے یہ حکم بطور مشورہ دیا ہے اس لیے یہ کہنا کہ یہ دونوں علاقے مسلمانوں کے عالمگیر مشن کے پیش نظر نہیں تھے، قطعاً غلط ہے۔

تاہم بجا طور پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ حبش اور ترک کے خلاف اقدام نہ کرنے کا مشورہ کیوں دیا؟ شاہ حبش پر اقدام نہ کرنے کی وجہ اس کا صحابہ کے ساتھ حسن سلوک، اسلام کی قبولیت اور اپنے سلطنت میں اسلام کے لیے راہ ہموار کرنے کی تگ و دو تھی، اس کی دلیل شاہ حبش کا وہ قول ہے جو انہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ کے خط لانے والے صحابی عمرو بن امیہؓ سے کہا تھا:

''عمرو! بخدا میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے وہی برگزیدہ پیغمبر ہیں جن کی آمد کا ہم اور یہود انتظار کرتے رہے ہیں۔ بے شک جس طرح حضرت موسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تھی ٹھیک اسی طرح

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضرت محمد ﷺ کی بشارت دی ہے، دونوں میں سر موفرق نہیں ہے۔ اس بارے میں میرے لیے خبر اور مشاہدہ دونوں برابر ہیں مگر اہل حبشہ میں میرے حامی اور مددگار بہت کم ہیں، اس لیے مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنی قوم میں کافی مددگار پیدا کرلوں اور اہل حبش کے اسلام قبول کرنے کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔" [مکتوبات نبوی: ۱۰۸، مصنف: مولانا سید محبوب رضوی بحوالہ طبقات ابن سعد: ۳-۱۵]

اس کی تائید سنن سعید بن منصور [رقم الحدیث: ۲۳۰۳] اور ابو عبیدہؒ کے کتاب الاموال [رقم الحدیث: ۵۶] میں سعد بن مسیب کی مرسل روایت سے بھی ہوتی ہے:

"واما امر النجاشی :فأمر من كان عنده من اصحاب رسول الله ﷺ ،فارسل اليه بكتابه، فقال رسول الله ﷺ : اتركوهم ما تركوكم .

"رہا نجاشی کا معاملہ تو اس نے اپنے ہاں موجود تمام صحابہ کو بلایا اور آپ ﷺ کی طرف خط بھیجا، تو آپؐ نے فرمایا جب تک وہ تم سے گریز کرتے رہیں تم بھی ان سے گریز کرو۔"

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ حبش پر اقدام نہ کرنے کا قول ان کے حسن سلوک اور اسلام لانے کی امید کے تناظر میں فرمایا گیا ہے۔

رہی 'ترک' کی تخصیص تو اس کی وجہ یہ حدیث بیان کرتی ہے:

"إن الترك تجلى العرب حتى تلحقها بمنابت الشيخ .[فتح الباری: ۷/۳۱۴]

"ترک اہل عرب کو شکست دے کر 'منابت الشیخ' کے مقام تک پسپا کر دیں گے۔"

نیز مسند احمد میں ہے:

"إن امتي يسوقها قوم عراض الوجوه كأن وجوههم الحجف ثلاث مرار حتى يلحقوهم بجزيرة العرب .... قالوا: يا نبي الله امن هم ؟قال : هم الترك .[مسند احمد: ۲۳۳۳۹]

"میری امت کو ڈھال کی مانند چوڑے چہروں والی قوم تین مرتبہ دھکیل کر جزیرۃ العرب تک پہنچائے گی۔ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ کون لوگ ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: یہ ترک ہوں گے۔"

محض اس فتنے کے پیش نظر آپ ﷺ نے ترک کے خلاف اقدام نہ کرنے مشورہ دیا، چنانچہ حضرت معاویہؓ سے صراحتاً منقول ہے کہ انہوں نے صرف ان جیسی احادیث کی بناء پر ترک کے خلاف کارروائی ناپسند سمجھی۔ [فتح الباری: ۷/۳۱۴] غزوہ احد اگر سامنے رہے تو یہ توجیہ بالکل اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ وہاں نبی ﷺ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر اقدام کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا قتل عام ہو گا اس لیے آپؐ نے مدینے میں رہ کر لڑنے کا مشورہ دیا، لیکن بعض صحابہ کا اصرار باہر لڑنے کا تھا اس لیے آپ نے ان کی رائے قبول فرمائی، اسی طرح یہاں اسی خدشہ کے پیش نظر ان کے خلاف اقدام نہ کرنے کا مشورہ دیا تا آنکہ وہ اقدام نہ کر لیں، لیکن مسلمان ان علاقوں پر ہمیشہ اقدام کرتے چلے آئے ہیں۔ چنانچہ ملا علی قاری

لکھتے ہیں:

"حاصل الکلام ان الامر فی الحدیث للرخصة والاباحة لا للوجوب ابتداءً ایضاً،فان المسلمین قد حاربوا الترك والحبشة بادین ،والی لایخلو زمان عن ذلك ،وقد أعز الله ، اهله فیماهنا لك[المرقاة : ۳۲۱/۹]

م یہ ہے کہ حدیث میں ترک اقدام کا حکم رخصت اور اباحت کے لیے ہے،وجوب کے لیے نہیں۔ س لیے مسلمانوں نے ترک اور حبشہ کیخلاف جنگ کی ابتداء کی تھی۔اور اب تک یہی اقدامی جہاد چلا آ رہا ہے۔اب تو اللہ تعالی نے ان علاقوں میں اسلام اور اہل اسلام کو عزت بخشی ہے۔"

اس پوری بحث سے یہ ثابت ہوا کہ اس حدیث سے ترک اور حبش کے خلاف اقدام کی ممانعت تو ہے،مگر یہ ممانعت امر شفقت کے طور پر اور کسی وقتی حکمت کی بناء پر ہے نہ کہ تشریعی وجوبی حکم کے طور پر۔لہٰذا اس پر قیاس کر کے دوسرے ممالک کی طرف یہ حکم متعدی نہیں کیا جا سکتا۔

۲-اقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سے اقدام کا عموم ثابت ہوتا ہے اور اس حدیث سے خصوص،جبکہ سند کے لحاظ سے ہم اس کو زیادہ سے زیادہ حسن کہہ سکتے ہیں اس کے برخلاف آیت عموم میں قطعی ہے۔ کیسے ایک قطعی امر کو نظر انداز کر کے اس پر ایک ظنی اور محتمل کو ترجیح دی جائے۔؟؟

۳۔اس کے برعکس کئی روایات ایسی ہیں جن میں روم وفارس کے علاوہ ترک وغیرہ کے ساتھ جہاد کا تذکرہ ملتا ہے۔

مثلاً حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے:

لا تقوم الساعة حتی تقاتلو ا الترك صغار الأعین حمر الوجوه ذلف الأنوف ،کأن وجوههم المجان المطرقة ولا تقوم الساعة حتی تقاتلوا قوما نعالهم الشعر [رواه البخاری،۲۹۲۸]

"قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ تم ترکوں سے نہ لڑو، چھوٹی آنکھوں، سرخ چہرے،چپٹی ناک والے ہیں گویا کہ ان کے چہرے تہہ بہ تہہ ڈھال ہیں اور قیامت اس وقت قائم نہ ہوگی جب تک ایسے قوم سے نہ لڑو جن کے جوتے بالوں کے ہوں گے۔"

نسائی باب غزوۃ الہند میں حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت ہے:

وعدنا رسول الله ﷺ غزوة الهند ،فان ادرکتها انفق فیها نفسی ومالی ،فان اقتل کنت من افضل الشهداء ،وان رجعت فانا ابو هریرة المحرر.[اخرجه النسائی،۳۱۷۵]

"رسول اللہ ﷺ نے ہم سے ہندوستان کی لڑائی کا تذکرہ کیا ہے،اگر میں نے اس کا زمانہ پایا تو اپنا جان ومال اس میں خرچ کروں گا۔پھر اگر میں اس میں قتل کیا گیا تو افضل ترین شہداء میں سے ہوں گا اور اگر زندہ لوٹ آیا تو میں گناہوں سے دھلا ہوا ابو ہریرہ ہوں گا۔"

نسائی ہی کی ایک دوسری روایت ہے:

عصابتان من امتي حررهما الله من النار :عصابة تغزو الهند ،وعصابة تكون مع عيسىٰ ابن مريم .[٣١٧٧]

''میری امت میں دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ تعالی نے جہنم کی آگ سے نجات دلایا ہے، ایک گروہ وہ ہے جو ہند کی جنگ لڑے گا اور دوسرا وہ گروہ جو عیسیٰ بن مریمؑ کے ہمراہ ہوگا۔''

ایک اور روایت میں ہے:

انه سيكون بعدي بعوث فكن في بعث خراسان ،ثم كن في بلدة يقال لها مرو، ثم اسكن مدينتها ،فانه بناها ذو القرنين ودعا لها بالبركة ،وقال :لا يصيب اهلها سواد۔ [رواه الدارقطني في الأفراد : ٤١٧٩]

''میرے بعد متعدد لشکر ہوں گے تو آپ خراسان کے لشکر میں شامل ہونا پھر اس کے شہر مرو جانا اور اس میں رہائش اختیار کرنا۔ اس لیے اس شہر کو ذوالقرنین نے بنایا اور برکت کی دعا دی ہے اور کہا ہے کہ اس کے باشندوں کو ذلت اور رسوائی نہیں پہنچے گی۔''

ان احادیث سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ 'اترک الترک' والی حدیث سے نہ ترک کے خلاف اقدام کی ممانعت ثابت ہوتی ہے اور نہ اس پر دیگر ممالک کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اقدامات صحابہؓ اور غامدی صاحب کا تصور جہاد:

قرآن و حدیث کے بعد اگلا مقدمہ یہ قائم کرتے ہیں کہ صحابہ کے جنگی اقدامات کے جغرافیائی اہداف محدود اور متعین تھے اور وہ جہاد اور فتوحات کے دائرے کو وسیع کرنے کی بجائے محدود رکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس پر صحابہ کرامؓ کے دور کے چند واقعات استدلال میں پیش کرنے کے بعد (جس کا جائزہ ہم آگے چل کر لیں گے) یہ حاصل پیش کرتے ہیں:

☆......جہاد سے ان (صحابہ) کا مقصد اسلامی سلطنت کی غیر محدود توسیع نہ تھی بلکہ ان کا ہدف صرف رومی اور فارسی سلطنتیں تھیں۔

☆......رومی اور فارسی سلطنتوں کے خلاف اجازت حاصل ہونے کے باوجود وہ ان کے علاقوں پر قبضہ کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر اصلاً صرف شام اور عراق کے علاقے تھے اور ان سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔

☆......ان علاقوں کو فتح کرنے کے بعد آگے رکنے کا فیصلہ وقتی حالات کے تحت نہیں تھا بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی رکاوٹ درمیان میں حائل ہو جائے کہ نہ دشمن کی فوجیں مسلمانوں کی طرف

آسکیں اور نہ مسلمان ان تک پہنچ سکیں۔ [جہاد ایک مطالعہ، ص:۱۸۴]

صحابہ کرامؓ کے جنگی اقدامات سے اپنی نظریئے کی تائید حاصل کرنے کے لیے جو طویل بحث کی گئی ہے اور اس میں جن اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے وہ تین قسم پر ہیں:

۱۔بعض اقتباسات ایسے ہیں جن کا اس بحث سے سرے سے تعلق ہی نہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول جو انہوں نے خالد بن ولیدؓ کو ہدایات دیتے ہوئے کہا:

''جب تم اونچے پہاڑ والے بڑے شہر انطاکیہ پہنچ جاؤ تو رومیوں کا بادشاہ وہیں ہے۔اگر وہ تم سے (جزیہ دے کر) صلح کرنا چاہے تو اس سے صلح کر، اگر وہ لڑائی پر آمادہ ہے تو اس سے لڑ۔ مجھ سے خط و کتابت کے بغیر پہاڑوں اور دروں میں داخل نہ ہونا۔'' [جہاد۔ایک مطالعہ:۱۷۲]

یا مثال کے طور پر یہ اقتباس:

''یزید بن ابی سفیانؓ کو معاویہؓ نے دمشق کے ساحلی علاقوں کی طرف بھیجا، لیکن طرابلس ان میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ اسے فتح کرنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔'' [ایضاً:۱۷۳]

اسی طرح یہ اقتباس:

''حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ایک شہر آباد کریں۔ مسلمانوں نے بحرین کی جانب سے توج اور بندجان اور طاسان پر حملہ کیا تھا۔ جب انہوں نے ان علاقوں کو فتح کر لیا تو امیر المؤمنین کو لکھا کہ ہمیں طاسان میں شہر بسانے کے لیے ایک مناسب جگہ مل گئی ہے۔ امیر المؤمنین نے جواب میں لکھا کہ میرے اور تمہارے درمیان دجلہ حائل ہے اور میں کسی ایسی جگہ شہر بسانا نہیں چاہتا جس کے اور میرے درمیان دجلہ حائل ہو۔'' [ایضاً:۱۷۶]

۲۔بعض اقتباسات ایسے ہیں جن میں اس بات کی تصریح ہے کہ پیش قدمی روکنے اور آگے بڑھنے سے ممانعت صرف ایک وقتی مصلحت کی بناء پر ہے، دائمی بنیادوں پر نہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے فارس سے آنے والے ایک قاصد سے 'کرمان' کے بارے میں دریافت کیا، تو انہوں نے ان الفاظ میں اس کا تعارف کرایا:

''وہ ایسی سرزمین ہے جس کے میدان پہاڑوں کی طرح دشوار گزار، پانی بہت تھوڑا، کھجوریں بالکل ردی اور دشمن بڑا بہادر ہے۔ وہاں خیر بہت کم اور شر بہت پھیلا ہوا ہے، بہت بڑی تعداد بھی وہاں کم پڑ جائے گی جبکہ تھوڑی تعداد تو بالکل ناکارہ ثابت ہوگی اور اس سے آگے علاقہ اس سے بھی بدتر ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے کہا کہ آپ لفظی تک بندی کر رہے ہو یا ٹھیک ٹھیک حالات بتا رہے ہو؟ قاصد نے کہا: بالکل صحیح بتا رہا ہوں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا: لا ،واللہ لا یغزوھا جیش لی ماالطعت'' بخدا جب تک میرا حکم مانا جاتا ہے میرا کوئی لشکر بھی وہاں لڑنے کے لیے نہیں جائے گا۔''

یہاں اس بات کی صراحت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان علاقوں میں پیش قدمی صرف اس وجہ سے روکی کہ وہاں لڑنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں جبکہ فوج زیادہ تعداد میں مصروف رہے گی۔ لا یغزوھا جیش لی ما اطعت کی تعبیر بھی یہی بتاتا ہے کہ یہ ان کی ذاتی رائے ہے اور مصلحت کی بنا پر تھی، اس سے کوئی مستقل تشریعی نظریہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح سعد بن ابی وقاصؓ کو جب فتوحات حاصل ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے انہیں مزید پیش قدمی سے روک دیا، سعدؓ نے اسے خلاف مصلحت سمجھ کر دوبارہ درخواست کی لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں اجازت نہیں دی۔[جہاد: ایک مطالعہ:۱۷۴] یہ واقعہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ ممانعت صرف وقتی مصلحت کی بناء پر تھی، کوئی تشریعی حکم نہ تھا۔ ورنہ اتنا اہم حکم اور حضرت سعدؓ جیسے صحابی کی اس سے ناواقفیت! پھر صرف سعدؓ ہی نہیں بلکہ وہ تمام سپہ سالار اور ان کے لشکر میں موجود صحابہ جن کو حضرت عمرؓ نے پیش قدمی سے منع کیا یا جنہیں پیش قدمی کرنے پر ڈانٹ پلائی[جہاد: ایک مطالعہ:۱۸۴] ان سب کا اس حکم سے ناواقف ہونا یا واقف ہوتے ہوئے خلاف شریعت امر کے ارتکاب پر رضامندی اور خاموشی بالکل سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔

مسلمانوں کے جہادی مشن کا مقصد صرف ملک گیری نہیں، بلکہ اصل مقصد اللہ کی سرزمین پر اللہ کا نظام قائم کرنا اور اس کے باشندوں کو عدل وانصاف فراہم کرنا ہے، اگر فتوحات کا دائرہ وسیع کیا جائے اور مفتوحہ علاقوں پر تسلط مضبوط نہ ہو تو یہ کوئی ہوشمندی نہیں۔ حضرت عمرؓ کے اپنے گورنروں کے نام وہ خطوط جن میں ان کو پیش قدمی کرنے سے روکا ہے اسی تناظر میں بھیجے گئے تھے۔ احنف بن قیس کی طرف بھیجا گیا خط اس ہوش مندی اور بصیرت کی عکاسی کرتا ہے:

"احفظ مابیدك من بلاد خراسان [البدایۃ والنھایۃ:۷/۱۲۷]

یعنی اس مفتوحہ علاقے کا کنٹرول سنبھالو اور اسی کی حفاظت کرو۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اس اور اس جیسے حضرت عمرؓ کے دیگر اقوال کے متعلق وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان فرمائی ہے:

"والمقصود: أن عمر کان یحجر علی المسلمین أن یتوسعوا فی بلاد العجم خوفاً علیھم من العجم [البدایۃ والنھایۃ: جلد۷، صفحہ نمبر: ۱۰۱ طبع احیاء التراث]

"مطلب یہ کہ عمرؓ نے اہل عجم سے خوف کے باعث مسلمانوں کو اس سے روکے رکھا کہ وہ بلادِ عجم میں اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کریں۔"

عراق کے لیے جب لشکر تیار کیا تو اس پر امیر ابو عبید کو مقرر کیا اور 'سلیط' کو مقرر نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی:

"ولم یمنعني أن أؤمر سلیطا الا سرعته الی الحرب ،وفي التسرع الی الحرب ضیاع الأعراب، فانه لا یصلحها الا الرجل المکیث.[الکامل: ۲/۴۰۱]

"میں نے سلیط کو صرف اس وجہ سے امیر نہیں بنایا کہ وہ جنگ کی طرف جلد بازی کرتا ہے اور جنگ کے لیے تیزی اعراب کا ضیاع ہے۔اس کی اصلاح صرف اور صرف جلد بازی نہ کرنے والا شخص کر سکتا ہے۔"

خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہونے ،فوج کی زیادہ تعداد میں مصروفیت اور دشمن کی طرف سے فوری خطرہ نہ ہونے کے باعث دوسری طرف رخ کرنا ،حضرت عمرؓ کی وہ حکمت عملی جو آنحضرت ﷺ نے غزوہ طائف کے موقع پر اختیار کی تھی ،اور اس سے استدلال کرنا ایسا ہے جیسا کہ ڈوبتا ہوا شخص تنکے کا سہارا لیتا ہے۔

۳-بعض اقتباسات ایسے ہیں (اور وہ بھی بہت کم ہیں) جو محتمل ہیں۔مثلاً حضرت عمرؓ کا یہ قول:

"میری خواہش ہے کہ سواد اور جبل کے علاقے کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ کھڑی ہو جائے جس کو عبور کر کے نہ وہ ہماری طرف آ سکیں اور نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ان شاداب خطوں میں سے ہمارے لیے سواد ہی کافی ہے۔مجھے مال غنیمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"ہم اہل بصرہ کے لیے سواد اور اہواز کا علاقہ کافی ہے۔کاش ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔نہ وہ ہم تک پہنچ پاتے اور نہ ہم ان تک پہنچ پاتے۔اسی طرح آپ نے اہل کوفہ کے بارے میں کہا تھا کہ کاش ان کے اور جبل کے علاقے کے مابین آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا نہ وہ اس طرف آ سکتے نہ ہم ادھر جا سکتے۔"[جہاد، ایک مطالعہ: ۱۷۶،۱۷۵]

یہ اقتباسات اگرچہ بظاہر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ پیش قدمی کی روک تھام مستقل بنیادوں پر ہو،لیکن اس معنی پر ان کو محمول کرنا کئی وجوہ سے درست نہیں بنتا۔

۱-قرآن وحدیث کی سابقہ نصوص کے بعد اب ان تاریخی روایات کی ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

۲-یہ تعبیر محض مبالغہ پر محمول ہے۔حقیقت میں اس جنگ بندی کی علت وہی ہے کہ غنیمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی جان عزیز ہونا۔اس لیے کہ مسلسل لڑتے ہوئے اگرچہ مسلمانوں کو بہت سی فتوحات حاصل ہوئی تھیں لیکن کافی تعداد میں مسلمان شہید بھی ہو چکے تھے اور معذور بھی۔جب کفر کی کمر ٹوٹ جائے اور ان کی شوکت وقوت پارہ پارہ ہو جائے تو ایسے علاقوں پر اقدام جہاں کفر کے منظم ہونے کا خطرہ ہے نہ ہی ان کی کوئی جغرافیائی اہمیت ہے،بہر حال مؤخر سمجھا جائے گا اور اس کے مقابلے میں مفتوحہ علاقوں کا نظم وضبط اور جنگ سے تباہ حال علاقوں کی تعمیر نو کو ترجیح دی جائے گی۔یہ مؤخر اقدامی

جہاد کے 'نظام' کا ایک حصہ ہے۔ چنانچہ احنف بن قیسؓ نے جب خراسان کی فتح کی خبر حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی تو انہوں نے یہی کہا کہ کاش ہمارے اور ان کے درمیان آگ کا دریا ہوتا، کاش میں وہاں فوج نہ بھیجتا۔ پاس حضرت علیؓ بیٹھے تھے انہوں نے اس کی وجہ دریافت کی، آپ نے فرمایا

''لأن أهلها سينقضون منها ثلاث مرات ،فيجتاحون في الثالثة .فكان ذلك بأهلها أحب إلي من أن يكون بالمسلمين.[الکامل: ۲۸/۳]

''اس لیے کہ اس کے باشندوں کو تین مرتبہ گزند پہنچے گا اور تیسرے مرتبہ ان کو بالکل جڑ سے ختم کر دیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مسلمانوں کی بجائے اسی کے باشندوں پر پڑے۔''

اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ عمرؓ نے یہ بات ایک مصلحت کی بناء پر کہی تھی اس سے ہرگز یہ مقصد نہیں لیا جا سکتا کہ جہاد کے اہداف محدود ہیں۔

۳-ان عبارات سے استدلال اشارۃ النص کے طور پر ہے جبکہ اس کے برعکس صحابہ کے ایسے اقوال موجود ہیں جو جہاد کے عموم و دوام پر عبارۃ النص ہیں اور ایسے اقدامات موجود ہے جو اقدامی جہاد کے عموم اور دوام کے لیے بین ثبوت ہیں۔

اقدامی جہاد اور عام اخلاقی دائرہ:

یہاں اس بات کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اقدامی اور اس سے متعلقہ احکامات عام اخلاقی دائرے سے باہر ہیں یا نہیں؟

خالق کائنات نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر پیدا کیا ہے واذ قال ربك للملائكة اني جاعل فـي الارض خـليـفـة جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود بھی اللہ تعالی کے احکامات پر کاربند رہے گا اور روئے زمین پر بھی اس کو نافذ کریگا۔ دنیا میں بھیجنے سے پہلے تمام انسانوں کی ارواح کو اللہ تعالی نے عالم ارواح میں جمع کیا اور ان سے اپنے ربوبیت اور احکامات کی پیروی کا عہد لیا۔ اس کے بعد ان کو زمین کی طرف بھیجا، جہاں انہیں طرح طرح کے انعامات سے نوازا، بے شمار نعمتیں دیں، وسائل اور سہولیات مہیا کیں، اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کی یاددہانی کے لیے مسلسل انبیاء اور رسول بھیجتے رہے، تاکہ مادیت میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو اس کا عہد یاد دلایا جائے۔

اللہ تعالی نے خوب وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے:ولـقـد كتبـنـا في الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثهـا عبـادى الصـالحون کہ اس زمین کے مستحق افراد وہ ہیں جو اللہ کے احکامات کے پیروی کرتے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس جہان میں باعزت طور پر رہنے کے قابل ہیں، جو لوگ شریعت [illegible]

اطاعت کا طوق گلے میں ڈال کر شاہراہ زندگی پر گامزن نہیں ہوتے ان کیلئے بس یہی صورت ہے کہ......

۱)......ان کو یاددہانی کرائی جائے، اگر اسلام قبول کرلیں تو فبہا ورنہ

۲)......جزیہ دے کر محکومانہ اور ذلت کی زندگی اختیار کرلیں اس لیے کہ اتنے محسن پروردگار کے احسان فراموش بندوں کو اس کی زمین پر اس کے احکامات کو روندتے ہوئے باعزت اور بااختیار زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں، اگر اس پر بھی راضی نہیں تو پھر......

۳)......اعلان جنگ ہے دوران جنگ سامنے آئے تو قتل کیا جائے، اگر اس پر قابو پا یا لیا جائے تو اختیار ہے اسے اسیر بنا کر غلام بنالے یا آزاد کرلے یا شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے جو بھی کاروائی اس کے ساتھ کرلے۔

یہ ہے اسلام کا فلسفہ جہاد، اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو اخلاقی دائرے سے باہر ہو۔

ہم اپنے گردوپیش دیکھ سکتے ہیں کہ ایک شخص اپنا ایک گھر دوسرے کو رہائش کے لیے دے دیتا ہے، اس سے کرایہ وصول کرتا ہے نہ کوئی اور عوض۔ بلکہ اپنی طرف سے مزید اس پر نوازشیں کرتا ہے، صرف اس سے اتنا کہہ دیتا ہے کہ اس گھر میں میری مرضی کے خلاف تصرف نہ کرنا، لیکن یہ شخص بڑا احسان فراموش ثابت ہوتا ہے کہ مالک مکان کا کوئی حکم نہیں مانتا، گھر میں اس کے مرضی کے خلاف بے جا تصرف کرتا ہے، اور اپنے اہل وعیال کے ہمراہ خوب آرام کی زندگی گزارتا اور خرمستیاں کرتا ہے۔ وہ مالک مکان اس کو بار بار اس غیر اخلاقی سلوک پر متنبہ کرتا ہے، لیکن یہ ہے کہ اسے اس کا کوئی احساس ہی نہیں، ایسی صورتحال میں مالک مکان اس پر اپنی نوازشیں بند کردیتا ہے، اس کو بمع اہل وعیال اپنے گھر سے نکال کر دوسرے شخص کو یہ گھر دے دیتا ہے جو اس کا فرمانبردار ہو۔ کون ہے جو اس مالک مکان کی کاروائی کو غیر اخلاقی قرار دے یا کون اس کو ظالم کہتا ہے؟ یقیناً کوئی بھی نہیں۔ تو کیا خالق کائنات کے انعامات اس سے کم ہیں؟ کیا اس نے ان غافل بندوں کو متنبہ کرتے کرتے اتمام حجت نہیں کیا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم تو اپنے لحاظ سے اس کاروائی کو غیر اخلاقی قرار نہیں دیتے لیکن اللہ تعالیٰ اگر یہی حکم دے تو اس کو اخلاقی دائرے سے خارج گردانتے ہیں؟

جب کوئی گروہ ملک کے نظام کے خلاف بغاوت کا نعرہ بلند کرتا ہے، اور اس کی رٹ چیلنج کرتا ہے، تو کیا اس زمین کے کسی بھی چپہ پر کوئی ملک یا کوئی تعلیم ایسی ہے جو ان کے بغاوت کو جرم نہیں کہتی؟ اور ان کو زور پکڑنے کے لیے مزید مہلت دے؟ یا ان کے قتل کو غیر انسانی فعل قرار دے؟ نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا مالک ارض وسما کی شریعت واحکامات کی اتنی بھی وقعت نہیں کہ اس سے بغاوت کرنے والوں کے خلاف اقدام کو ناجائز کہا جائے؟

غنڈہ گردی، افراتفری، فساد پھیلانے والے عناصر اور وہ تمام اسباب جو ریاست کو کمزور بنائیں اسکا خاتمہ ہر ملک چاہتا ہے اور اس کے خلاف مستعدی دکھاتا ہے، اور اسمیں کامیاب حکومت اچھی حکومت کہلاتی ہے۔ جب کہ اس عالم کی ویرانی، اور ہستی کی نابودی کفر سے وابستہ ہے، تو کیا اس فساد کے خلاف مجرمانہ غفلت کا ارتکاب جائز ہے؟

اصل غلطی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ غیر مسلموں سے دوران مکالمہ ہمارے بعض سکالر ''جو نئی روشنی سے متاثر نظر آتے ہیں'' کے بحث کا نقطہ آغاز احکامات اسلام ہوتے ہیں۔ غیر مسلم اس کی خامیاں بیان کرتے ہیں اور یہ دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس انداز مباحثہ میں خامی یہ ہے کہ ٹھیٹھ اسلامی موقف پر قائم رہ کر وہ ان کو مطمئن نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ ان احکامات میں نت نئی تاویلات کر کے ایسے دائرے میں لاتے ہیں جو اس کافر کے لیے باعث اطمینان ہو، اگر چہ یہ اس مفہوم کے مخالف ہو جو اب تک علما اسلام سمجھتے چلے آئے ہیں، نیز اس انداز مباحثہ سے نہ رکنے والے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور دیگر احکامات پر بھی اعتراضات کرنے لگ جائیں گے۔ مثلاً نماز کے متعلق یہ اٹھک بیٹھک کیا ہے؟ کبھی چار دفعہ، کبھی دو دفعہ، نہ مریض معاف، نہ تندرست۔ اسی طرح حج کہ عجیب وغریب ہیئت کے ساتھ مخصوص مقامات کی زیارت، اور اس کے عجیب عجیب احکامات، ادھر آنا ادھر جانا پتھر مارنا یہ سب کیا چیزیں ہیں؟

اور سب سے بڑا اسلام کا یہ حکم کہ ایک آدمی ساری عمر شراب کے نشے میں دھت، حسیناؤں کی جھرمٹ میں محصور، دوسروں کا حق دبانے والا اور بے گناہ لوگوں کا قاتل ہے، حرام وحلال کی اسے کوئی تمیز ہی نہیں لیکن صرف کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صدق دل سے پڑھتا ہے، دوسری طرف وہ شخص جو ساری عمر انسانیت کی ہمدردی میں گزارے، مظلوموں کی مدد کرتا ہے، اپنے خون پسینے کی کمائی کھاتا ہے لیکن محمد رسول اللہ کا اقرار نہیں کرتا ہے، اسلام کے نقطہ نظر سے پہلا شخص جنتی ہے اگر چہ دخول اولی نہ ہو اور دوسرا شخص جنت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

اگر یہی روش اپنائی جائے کہ ہر چیز کے لیے عام اخلاقی دائرہ ڈھونڈا جائے تو پھر جہاد کی بہت ان کا دفاع زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

غور کیا جائے تو اقدامی جہاد اور اس کے اخلاقی جواز پر ہونے بحث ومباحثے کچھ نئے نہیں، اور نہ یہ اعتراضات کوئی جدید ہیں، بلکہ عہد صحابہ میں روم وفارس کے ساتھ لڑی جانے والی جنگوں میں صحابہ کے ان کے ساتھ جو مکالمے ہوئے ان میں بھی ان کا یہی اعتراض تھا۔ وہ بھی اس اقدام کو وحشیانہ قرار دے رہے تھے، لیکن صحابہ ان اقدامات کو عقلی اور اخلاقی اعتبار سے جائز قرار دینے کے بجائے عقیدے سے بحث کا آغاز کرتے اور

اسی کی تبلیغ کرتے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، نبی صلی اللہ وسلم کی نبوت اور قران کی حقانیت ثابت کرتے، اس کے بعد بتاتے کہ یہ ان کا حکم ہے۔ اگر ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہی طریقہ اختیار کرتے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، نبی علیہ اسلام کی نبوت اور قران کی حقانیت' جو ایسے ناقابل انکار دلائل سے ثابت ہیں اور جن کا کوئی توڑ ہی نہیں' ثابت کرتے اور پھر ان کو صرف یہ بتاتے کہ یہ حکم اللہ اور اس کے رسول کا دیا ہوا ہے، اور اس کا ثبوت بھی موجود ہے تو ان سنگین تحریفات کا شکار نہ ہوتے۔ باقی اگر کوئی اپنی کج روی سے مطمئن نہ ہو سکے تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں۔ حضرت تھانویؒ اس انداز کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اگر شبہ کرنے والا مسلمان نہیں تب تو اس وجہ سے جواب لا حاصل ہے کہ کفار سے اصول میں گفتگو ہے، فروع میں تطویل کلام کیوں کیا جائے، اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کو اتنا جواب کافی ہے کہ دلیل شرعی سے جو امر ثابت ہے ہم کو اس کی لم کی تفتیش اور طبعیات ظنیہ بلکہ وہمیہ کے معارضات کا جواب و تطبیق ہم پر ضروری نہیں۔'' [امداد الفتاوی: ۶۱۲/۳]

علت جہاد:

جہاد کی علت معلوم کرنے سے پہلے چند مقدمات بطور تمہید ملاحظہ کرنا ضروری ہے:

(۱)......احکام کے علل و اسباب کی ضرورت غیر منصوصی اور اجتہادی احکام کے لیے پیش آتی ہیں۔ فقہاء کرام کسی باب کے منصوص مسائل پر غور و تمحیص کے بعد علت نکالتے ہیں جس سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ

اس باب میں درپیش آنے والے وہ تمام مسائل جن کا صراحتاً ذکر نص میں نہیں ہے ان کا حل تلاش کیا جائے۔

(۲)......حکم منصوص کی علت نکالنے کی ضرورت نہیں، (مثال کے طور پر نماز فرض ہے، اس کی فرضیت کی علت کیا ہے، ہمیں اس کے لئے تگ و دو کی کوئی ضرورت نہیں [احسن])۔ اور کوئی مستنبط علت اس کے مخالف ہو تو اس کو رد کرنا واجب ہے، چنانچہ فقہ کی کتب میں بکثرت ایسا ملتا ہے کہ ایک فقیہ اپنے فہم اور اجتہاد کی بنیاد پر کسی حکم سے علت مستنبط کرتا ہے، لیکن دوسرے فقیہ کو اس علت کے تقاضے کے خلاف منصوص جزئیہ ملتا ہے تو اس کو رد کرتا ہے۔

(۳)......ہر شئی کے لیے ایک علت وجودیہ اور ایک علت غائیہ ہوتی ہے اور ان دونوں علتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً: تپائی کی علت وجودیہ (یعنی جس کی وجہ سے وجود میں آئی) لکڑی ہے اور علت غائیہ یہ ہے کہ اس پر کتاب بسہولت رکھی جا سکے، چنانچہ (اگر لکڑی موجود نہ ہوتی تو تپائی بھی اس حالت میں وجود میں نہ آتی، لیکن اب تپائی وجود

میں آچکی ہے، اس کو وجود میں لانے کا جو مقصد تھا، وہ حاصل ہو چکا ہے، لہٰذا اب جب تک کتابیں رکھنے کے لئے مزید تپائیوں کی ضرورت پیش نہ آئے گی محض لکڑی کی دستیابی کی وجہ سے ہم تپائیاں بناتے نہیں چلے جائیں گے۔[احسن] لکڑیوں کو ترتیب دے کر تپائی تیار ہو جائے تو مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اب اگر چہ لکڑی موجود ہے لیکن غایت پوری ہو چکی ہے اس لیے مزید تپائی بنانے کی ضرورت نہیں۔

(۴)......جہاد کے اکثر احکامات منصوصی ہیں، مثلاً: اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر کفار سے لڑنا جہاد ہے، اور ان کو قتل کرنا جائز ہے چاہے جو بھی ہوں جس جگہ ہوں اور جس وقت ہوں لیکن ان سے چند مستثنیات ہیں:

(۱) دوران جنگ بچوں کو قتل نہیں کیا جائیگا۔(۲) عورتوں کو قتل نہیں کیا جائیگا۔(۳) بوڑھوں اور راہبوں کے قتل سے احتراز کیا جائیگا۔(۴) ذمیوں اور مستامنوں سے بھی تعرض نہیں کیا جائیگا۔(۵) جزیرۃ العرب کے ماسوا کفار اگر جزیہ دے کر لڑائی سے احتراز کرنے پر آمادہ ہیں تو ان کا مطالبہ قابل قبول ہے۔ (۶) دوران جنگ اگر گرفتار ہو جائے تو قتل کیا جا سکتا ہے، غلا[illegible] جا سکتا ہے، فدیہ لے کر رہا بھی کیا جا سکتا ہے اور بلا فدیہ بھی رہا کیا جا سکتا ہے۔(۷) مجاہدین اگر فساق ہوں تو بھی جہاد کا حکم باطل نہیں ہوگا وغیرہ۔ لہٰذا اگر کوئی مستنبط شدہ علت ان احکامات میں سے کسی کے بھی خلاف ہوگی تو وہ علت مردود ہوگی۔

چونکہ جہاد کے اکثر احکامات منصوصی ہیں اس لیے فقہاء کرام کے ہاں اس کے علل واسباب کی بحث بھی تنقیح کے ساتھ نہیں ملتی اور مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض نے اس کی علت......

(۱)......کفر

(۲)......بعض نے محاربہ کفر

(۳)......بعض نے فساد

(۴)......بعض نے شوکت کفر قرار دیا ہے، لیکن قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کے کلام کی بالاستیعاب مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جہاد کی علت وجودیہ 'کفر' اور علت غائیہ 'اعلاء کلمۃ اللہ و کسر شوکۃ الکفر' ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فقہاء کرام کے ہاں پایا جانے کا یہ اختلاف فقط لفظی ہے، حقیقی نہیں۔ بعض نے علت وجودیہ کو دیکھ کر نفس کفر کو علت قرار دیا ہے اور بعض نے علت غائیہ کو مدنظر رکھ کر شوکت کفر کو علت قرار دیا ہے اور بعض نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ''محاربہ کفر'' علت قرار دیا ہے۔ بہر حال علت جو بھی ہو ان کے احکامات میں سب کا اتفاق ہے کہ کفار کے بچوں، بوڑھوں، معذور افراد اور عورتوں کا قتل جائز نہیں اور اگر جزیرۃ العرب کے ماسوا کفار اگر جزیہ دے کر صلح کرنا چاہیں تو بھی درست ہے۔

☆......☆......☆......☆

مولانا مجیب الرحمٰن، ڈیرہ اسماعیل خان

حدیث غزوۂ ہند......اور......غامدی گروپ کی تحقیق

باسمہ تعالیٰ

محترمی ومکرمی جناب مولانا احسن خدامی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ رسالہ (صفدر) کے خریداروں میں سے ایک ہے۔ خصوصی (فتنہ غامدی) نمبر کے لیے چند دن کی محنت کے بعد یہ چند سطریں ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ مسودہ لکھنے کے بعد نظر ثانی تو کی ہے، لیکن صاف نہیں کر سکتا۔ امید ہے کہ میری اس محنت کی قدر فرما کر خصوصی نمبر میں جگہ دیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجیب الرحمٰن عفی اللہ عنہ......(فاضل: جامعہ اشرفیہ، لاہور) مدرس: جامعہ محمدیہ، پروآ شہر، ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

یکے از تلامذہ: حضرت الشیخ مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ تعالیٰ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علی سید المرسلین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین، امابعد!

غامدی صاحب کی ویب سائٹ پر موجود ایک کتاب کا مضمون بعنوان: ''غزوۂ ہند کی کمزور اور غلط روایات کا جائزہ'' ایک ساتھی کے ذریعہ موصول ہوا۔ بعد از مطالعہ یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس مضمون کو سامنے رکھ کر حدیث غزوۂ ہند پر اپنے مطالعہ کی حد تک قارئین کے سامنے درست معلومات لاؤں۔ غامدی گروپ کے نظریات کے مطابق یہ حدیث اور ہندوستان سے جہاد درست نہیں ہے۔ ہمارے ملک بہت سے غیر مسلم ممالک کے ایجنٹوں اور سازشیوں سے بھرا ہوا ہے، ممکن ہے کہ یہ گروپ بھی انڈیا کا آلہ کار ہو، اور مسلمانوں کا لبادہ اوڑھ کر مختلف غلط نظریات اور بے تکی تحقیقات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو الجھا کر جہاد سے دُور اور دیگر فضولیات کی طرف متوجہ رکھنا چاہتا ہو۔ واللہ اعلم

پہلی حدیث، حدیثِ ثوبان رضی اللہ عنہ:

اس سلسلہ میں ایک حدیث حضرت ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"عصابتان من أمتي أحرزهما الله من النار: عصابة تغزو الهند، وعصابة تكون مع عيسى بن مريم عليهما السلام." "میری امت کی دو جماعتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ دوزخ سے محفوظ فرمائیں گے، ایک وہ جماعت ہے جو ہندوستان سے جہاد کرے گی اور دوسری وہ جماعت ہے جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوگی۔

یہ حدیث سنن نسائی کتاب الجہاد باب غزوۃ الہند [۶/۴۲، ۴۳ طبع بیروت] اور الجامع الصغیر [حدیث: ۵۴۳۶] اور مسند احمد [رقم الحدیث: ۲۲۷۵۹] وغیرہ میں ہے، اس حدیث کی سند اس طرح ہے۔ امام نسائیؒ فرماتے ہیں:

أخبرني محمد بن عبدالله بن عبدالرحيم، قال: حدثنا أسد بن موسىٰ، قال: حدثنا بقية، قال: حدثني أبوبكر الزبيدي عن أخيه محمد بن الوليد عن لقمان بن عامر عن عبدالأعلى بن عدي البهراني عن ثوبان مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم....

امام احمدؒ فرماتے ہیں:

حدثنا أبوالنضر، حدثنا بقية، حدثنا عبدالله بن سالم، وأبوبكر بن الوليدالزبيدي عن محمد بن الوليد الزبيدي عن لقمان بن عامر الوصابي عن عبدالأعلىٰ بن عدي البهراني عن ثوبان مولىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم......[الحديث]

رواۃِ حدیث:

(۱)......صحابی راوی حضرت ثوبان مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

ان کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ "الصحابة كلهم عدول" اہل السنّت والجماعت کا متفقہ نظریہ ہے۔

(۲)......عبدالاعلیٰ بن عدی بہرانیؒ:

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے راوی عبدالاعلیٰ بن عدی بہرانی ہیں، یہ حمص کے قاضی تھے، امام ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر فرمایا، یہ حریز بن عثمان کے اساتذہ میں سے ہیں، اور امام ابوداؤد فرماتے ہیں: حریز کے اساتذہ ثقہ لوگ ہیں. [تہذیب التہذیب: ۴/۲۳۱] علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ثقہ راوی ہے، تیسرے طبقہ کا راوی ہے۔ [تقریب: ۱/۵۵۱]

غامدی گروپ کہتا ہے کہ: "یہ مجہول الحال ہے۔ معلوم نہیں کون ہے، اس کے اساتذہ کون ہیں؟ کب پیدا ہوئے؟ اور کب فوت ہوئے؟" لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ اوپر کی عبارات سے واضح ہوا کہ: یہ ثقہ ہے، مجہول الحال نہیں۔ اس کے اساتذہ حضرت ثوبان، عبداللہ بن عمرو، عتبہ بن عبد سلمی، یزید بن میسرہ

ن وابس رضی اللہ عنہم ورحمہم اللہ ہیں، اور شاگرد ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن عدی اور بیٹے محمد بن عبدالاعلیٰ ور احوص بن حکیم، لقمان بن عامر، حریز بن عثمان، صفوان بن عمرو، ابوبکر بن ابی مریم رحمہم اللہ ہیں۔ [تہذیب] ۱۰۴ھ میں فوت ہوئے۔ [تہذیب]

(۳) ... لقمان بن عامر وصابیؒ:

عبدالاعلیٰ سے راوی لقمان بن عامر وصابی ہیں، کنیت ابو عامر ہے، حمص کے رہائشی ہیں، حضرت ابو ہریرہ، ابوامامہ رضی اللہ عنہما سے اور ابوعِنَبہ وعتبہ بن عبد وعبدالاعلی، اوسط بجلی، عامر بن حشیب وغیرہم رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ان سے محمد بن ولید زبیدی، عیسیٰ بن ابی رزین ثمالی، شرقی بن قطامی، فرج بن فضالہ، عقیل بن مدرک وغیرہم رحمہم اللہ روایت کرتے ہیں۔

امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں: اس کی حدیث لکھی جائے، امام ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا۔ [تہذیب: ۴۷/۶] علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: سچا اور تیسرے طبقہ کا راوی ہے [تقریب: ۴۷/۲] امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: سچا راوی ہے۔ [میزان الاعتدال: ۴۱۹/۳]

(۴) ... محمد بن ولید زبیدی:

اور لقمان بن عامر سے روایت کرنے والے محمد بن الولید زبیدی ہیں، یہ ابو ہذیل محمد بن ولید بن عامر زبیدی ہیں، یہ ایسا ثقہ راوی ہے کسی بھی محدث نے اس پر جرح کا ادنیٰ کلمہ نہیں کہا، سب نے ثقہ کہا اور تعریف کی، طوالت کے خوف سے اقوال محدثین نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

[تہذیب التہذیب: ۶/ ۵۳۲، ۴۳۳]

(۵) ... ابوبکر بن ولید/عبداللہ بن سالم:

محمد بن ولید سے روایت کرنے والے دو راوی ہیں: ایک ابوبکر بن ولید زبیدی۔ دوسرے عبداللہ بن سالم۔ یہ عبداللہ بن سالم اشعری وحاظی ابو یوسف حمصی ہیں۔ محمد بن زیاد اور لہانی، ابراہیم بن ابی عبلہ، محمد بن ولید زبیدی، علی بن ابی طلحہ وغیرہم رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان سے ابوتقی عبدالحمید بن ابراہیم حمصی، یحییٰ بن حسان، ابومسہر، ابو المغیرہ، عمرو بن الحارث حمصی وغیرہم رحمہم اللہ روایت کرتے ہیں۔

یحییٰ بن حسان فرماتے ہیں: ملک شام اس کا مثل میں نے نہیں دیکھا۔ امام نسائی فرماتے ہیں: اس پر (ثقہ ہے)۔ دارقطنیؒ نے اس کو ثقہ کہا۔ ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا۔ عبداللہ بن یوسف نے اس کی تعریف کی۔ [تہذیب: ۱۰/۴] علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔ [تقریب: ۴۹۵/۱]

دوسرے راوی ابوبکر بن ولید زبیدی جن کا نام صموم ہے، یہ مجہول الحال ہیں، مگر جب اس

حدیث میں ان کا تائیدی عبداللہ بن سالم ثقہ موجود ہے تو ابوبکر کی جہالت سے روایت ضعیف نہیں ہوسکتی۔

(۶)......بقیہ:

پھر عبداللہ بن سالم اور ابوبکر زبیدی دونوں سے روایت کرنے والا بقیہ ہے، یہ بقیہ بن ولید ابو یحمد حمیری حمصی ہے۔ امام یعقوبؒ فرماتے ہیں: بقیہ ثقہ ہے، جب معروف راویوں سے روایت کرے تو حسن الحدیث ہے۔ ابن سعد فرماتے ہیں: ثقہ راویوں سے روایت کریں تو ثقہ (قابل اعتماد) ہے۔ امام عجلی بھی فرماتے ہیں کہ: جو حدیث معروف لوگوں سے روایت کرے اس میں ثقہ ہے۔ ابوزرعہ بھی فرماتے ہیں: بقیہ جب ثقہ راویوں سے روایت کرے تو ثقہ ہے۔ امام نسائی فرماتے ہیں: جب اہل شام سے روایت کرے تو مضبوط راوی ہے۔ اور فرماتے ہیں: جب مجہول راویوں سے روایت کرے تو (روایت کے ضعف) کی ذمہ داری اُن پر ہے نہ کہ بقیہ پر، بقیہ محدث شام ہے۔ جوزجانی بھی فرماتے ہیں کہ: جب ثقات سے حدیث بیان کرے تو لاباُس بہ ہے۔ امام ابواحمد حاکم بھی یہی فرماتے ہیں۔ ابن مدینی بھی فرماتے ہیں: اہل شام سے روایت میں صالح ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں: ثقہ ہے، قابل اطمینان ہے۔[تہذیب التہذیب: ۱/۲۷۲، ۳۷۳، ۴۷۴، ۴۷۴] علامہ ذہبی ان کو ''الامام الحافظ محدث الشام'' سے ذکر کرتے ہیں۔[تذکرۃ الحفاظ: ۱/۲۱۲] امام منذری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ثقة عند الجمهور لكنه مدلس'' جمہور کے نزدیک بقیہ ثقہ ہے، لیکن مدلس ہے۔[الترغیب: ۴/۹۰۰] امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: ''اذا روى عن الثقات فليس بحديثه بأس'' جب ثقہ راویوں سے روایت کرے تو بقیہ کی حدیث میں جرح نہیں۔[الاستذکار: ۳/۱۷ا۴] علامہ محمد طاہر ہندی رحمہ اللہ وجیز سے نقل کرتے ہیں کہ: اکثر ائمہ اہل شام سے بقیہ کی روایت سے حجت لیتے ہیں۔[قانون الموضوعات: ۲۴۴]

خلاصہ یہ کہ بقیہ ثقہ راوی ہے جب ثقہ راوی سے روایت کرے۔ اہل شام سے روایت کرے تو اس کی روایت 'صحیح' اور کم از کم 'حسن' ہے، اس روایت کو عبداللہ بن سالم جیسے ثقہ سے ''حدثنا'' کہہ کر روایت کررہا ہے، تدلیس بھی نہیں کررہا، اس لیے اس کی وجہ سے یہ روایت ہرگز ضعیف نہیں ٹھہرتی۔

(۷)......اسد بن موسیٰ رابوالنضر:

بقیہ سے روایت کرنے والے دو راوی ہیں: اول اسد بن موسیٰ دوم ابوالنضر۔ اسد بن موسیٰ بن ابراہیم ''اسد السنہ'' کہے جاتے ہیں۔ امام نسائی، ابن یوسف، ابن قانع، عجلی اور بزار ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔[تہذیب: ۱/۲۶۸] امام خلیلی کہتے ہیں: صالح ہے [تہذیب] ابن حزم نے ضعیف کہا تو علامہ ذہبی فرماتے ہیں: ابن حزم کی تضعیف مردود ہے۔[میزان الاعتدال: ۱/۲۰۸] امام بخاری نے اس سے استشہاد کیا اور نسائی اور ابوداؤد نے اس کی روایات سے

حجت لی ہیں۔[میزان] ابوسعید بن یونس فرماتے ہیں کہ: اسد نے کئی منکر روایات بیان کی ہیں، لیکن وہ خود ثقہ ہیں تو میرا خیال ہے کہ ان حدیثوں میں آفت کسی دوسرے راوی سے آئی ہے۔[میزان] علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: سچا راوی ہے، غریب روایتیں لاتا ہے۔[تقریب: ۱/۸۸] دوسرے راوی ابوالنضر ہاشم بن قاسم بن مسلم بن مقسم لیثی بغدادی ہیں، امام ابن معین اور علی بن مدینی اور ابن سعد اور ابو حاتم اور ابن قانع فرماتے ہیں: ابوالنضر ثقہ ہے۔امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں: محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سچا راوی ہے، امام نسائی فرماتے ہیں: ''لاباس بہ'' (یعنی ثقہ) ہے۔امام حاکم فرماتے ہیں: یہ حافظِ حدیث اور حدیث میں مضبوط ہے۔[تہذیب: ۷/۳۷۹] علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ثقہ اور مضبوط راوی ہے، ۷۳رسال کی عمر میں ۲۰۷ھ میں وفات پائی۔[تقریب: ۲/۲۶۱]

(۸)......امام احمد رحمہ اللہ:

راوی ابوالنضر ہاشم بن قاسم رحمہ اللہ سے امام احمد رحمہ اللہ روایت کر رہے ہیں، جس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، ایک عظیم امام ہیں، ثقہ، حافظ، فقیہ، حجت ہیں۔[تقریب: ۱/۴۴]

اس طرح حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث غزوۂ ہند کے امام احمد کی سند کے راوی ثقہ قابلِ اعتماد ہیں اور سند بالکل صحیح ہے۔

(۹)......محمد بن ابراہیم:

اور امام نسائی کی سند میں اسد بن موسیٰ سے روایت کرنے والے امام نسائی و ابوداؤد کے استاذ امام محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم بن سعید مصری ابوعبداللہ البرقی ہیں۔امام نسائی فرماتے ہیں: ''لاباس بہ'' (یعنی ثقہ) ہیں۔امام ابن یونس فرماتے ہیں: ثقہ راوی ہے۔[تہذیب التہذیب ۹/۳۲۸] علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔[تقریب: ۱/۹۷]

(۱۰)...... امام نسائی رحمہ اللہ:

محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم رحمہ اللہ سے روایت کرنے والے امام نسائی احمد بن شعیب بن علی ابوعلی رحمہ اللہ ہیں۔الحافظ (الامام) ہیں۔[تقریب: ۱/۳۶] ان کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

خلاصہ بحث:

امام نسائی کی اس سند میں صرف ایک راوی ابوبکر زبیدی مجہول الحال رہا، باقی سب روی ثقہ ہیں، تو نسائی کی سند زبیدی کی جہالت کی وجہ سے کمزور ہے، مگر مسند احمد کی سند نے اس کمزوری کو دُور کر دیا کہ اس میں ابوبکر کے ساتھ عبداللہ بن سالم قوی راوی روایت کرنے والا ہے تو حدیث پھر بھی صحیح رہی، کیوں کہ کسی حدیث کی ایک سند کمزور ہو اور دوسری قوی و صحیح ہو تو صحیح سند کمزور کو بھی صحیح کر دیتی ہے

،حاصل یہ کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث صحیح ہے۔

دوسری حدیث ،حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

اس بارے میں دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کی سند اور راویوں پر غور فرمائیں، امام نسائی فرماتے ہیں:

أخبرنا أحمد بن عثمان بن حكيم، قال: حدثنا زكريا بن عدى، قال: حدثنا عبدالله بن عمرو عن زيد بن أبي أنيسة عن سيار، ح قال: وأنبأنا هشيم عن سيار عن جبر بن عبيدة وقال عبيدالله عن جبير عن أبي هريرة رضي الله عنه.

(۲) حدثني محمد بن إسماعيل بن إبراهيم، قال: حدثنا يزيد، قال: أنبأنا هشيم، قال: حدثنا سيار أبو الحكم عن جبر بن عبيدة عن أبي هريرة."

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"حدثنا هشيم عن سيار عن جبر بن عبيدة عن أبي هريرة رضي الله عنه."

سند پر بحث سے پہلے حدیث کا متن اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"وعدنا رسول الله صلى الله عليه وسلم غزوة الهند، فإن أدركتها أنفق فيها نفسي ومالي، فإن أقتل كنت من أفضل الشهداء، وإن أرجع فأنا أبو هريرة المحرر."

ترجمہ: ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا (کہ ہوگا) اگر میں نے اُسے پایا تو اُس میں اپنی جان اور مال خرچ کردوں گا۔ اور اگر میں مارا گیا تو افضل شہداء میں سے ہوں گا، اگر میں واپس لوٹا تو میں (جہنم سے) آزاد ابو ہریرہ ہوں گا۔

سند وروات حدیث

(۱)......جبیر یا جبیر بن عبیدہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا راوی جبر بن عبیدہ یا جبر بن عبیدہ ہے۔ اگر چہ امام ذہبی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ راوی غیر معروف ہے، لیکن امام ابن حبانؒ نے اس راوی کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ [تہذیب: ۱/۵۶۵] علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: شاعر ہے، مقبول راوی ہے۔ [تقریب: ۱/۱۵۵] اور یہ تابعی ہے جس کی جہالت زیادہ مضر نہیں۔ کیونکہ جب تک تابعی کے متعلق جرح اور فسق ثابت نہ ہو تب تک وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا مصداق ہوگا: ''خير الناس قرني ثم الذين يلونهم'' بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ جو اُن کے فوراً بعد ہوں گے۔ بہر حال علامہ ابن حجر کا اس کو مقبول کہنا ظاہر کرتا ہے کہ یہ ثقہ راوی ہے، کیوں کہ مقبول ثقہ ہوتا ہے۔

(۲)......ابو الحکم سیار بن ابی سیار بصری:

جبر یا جبیر سے روایت کرنے والا ابوالحکم سیار بن ابی سیار بصری ہے۔ محدثین نے اس کی تعریف کی ہے، کسی نے جرح نہیں کی، امام احمد فرماتے ہیں: سچا ثقہ اور مضبوط راوی ہے۔ امام ابن معین اور نسائی فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔ [تہذیب: ۲/ ۲۷۸] علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: ثقہ ہے، صحاح ستہ کا راوی ہے۔ [تقریب: ۱/ ۳۰۷]

(۳)......زید بن ابی اُنیسہ رہشیم:

سیار سے روایت کرنے والے دو راوی ہیں: زید بن ابی اُنیسہ اور ہشیم۔ زید ابو اسامہ کوفی الاصل غنوی ہے۔ امام ابن معین، عمرو بن عبداللہ اودی، ابن سعد، عجلی، ابوداود، یعقوب بن سفیان، ذہلی، ابن نمیر اور برقی اس کو ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام احمد اس کو حسن الحدیث کہتے ہیں۔ [تہذیب: ۲/ ۶۰۴] علامہ ابن حجر فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔ [تقریب: ۱/ ۳۲۶]

دوسرے راوی ہشیم بن بشیر بن القاسم سُلمی واسطی ہیں۔ یہ امام احمد و مالک وغیرہما بڑے بڑے فقہاء و محدثین کے اساتذہ میں سے ہیں، تہذیب التہذیب میں اس کا ترجمہ چار صفحات پر ہے، سب محدثین نے اس کی تعریف و توثیق کی ہے، کوئی جرح کا کلمہ ذکر نہیں کیا گیا، اور علامہ ذہبی ان کو الحافظ، الکبیر، محدث العصر لکھتے ہیں۔ [تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۸۲] اور فرماتے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ہشیم حفاظ حدیث اور ثقہ راویوں میں سے ہے، ہاں بکثرت تدلیس کرتے ہیں۔ [تذکرۃ الحفاظ] مگر یہاں اس کی تدلیس بھی معتبر نہیں، کیونکہ ہشیم نے سیار سے سماع حدیث کیا ہے، چنانچہ راقم نے سنن سعید بن منصور میں کئی جگہ "ھشیم انا سیار" الفاظ پائے ہیں، مثلاً: سنن سعید: ۱/ ۸۸ باب الرجل یصدق بصدقة فترجع إليه بالميراث، حدیث: ۲۴۴ و ۳۸۲ باب البتة و البرية و الخلية و الحرام، حدیث: ۱۶۶۴ ۔ مطبوعہ دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔

(۴)......امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ:

ہشیم سے روایت کرنے والے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں، جن کی ثقاہت میں شک نہیں ہے۔

لہٰذا امام احمد کی مسند والی حدیث ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی سند بالکل صحیح اور کم از کم حسن ثابت ہوئی۔ اور یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی تائید کر کے ایک دوسرے کو قوی و صحیح بناتی ہیں۔

(۵)......عبیداللہ بن عمرو رمسدد بن مسرہد:

اور نسائی میں ہشیم اور زید بن ابی انیسہ سے روایت کرنے والے عبیداللہ بن عمرو ہیں، ان کو امام ذہبی الامام، الحافظ، مفتی الجزیرہ سے ذکر کرتے ہیں۔ [تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۷۷] ان کو امام یحییٰ بن معین اور نسائی فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔ امام ابوحاتم صالح الحدیث ثقہ اور سچا راوی بیان کرتے ہیں۔ امام ابن سعد فرماتے ہیں: ثقہ اور سچا اور کثیر الحدیث راوی ہے، بعض اوقات غلطی کرتا ہے۔ [تہذیب: [illegible]]

۵۸۵] اور کبھی غلطی کرنے سے راوی مجروح اور ضعیف نہیں ہوتا اور نہ ایسے کی روایت ضعیف یا من گھڑت ہو جاتی ہے۔[دیکھیے :لسان المیزان:۱/۱۷]

اور سنن بیہقی میں اس حدیث کو ہشیم سے روایت کرنے والا راوی مسدد بن مسرہد ہے۔[سنن کبریٰ:۹/۱۷۶] مسدد کی سب محدثین نے توثیق و تعریف کی ہے۔امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: مسدد ثقہ ہے، ثقہ ہے۔امام نسائی اور عجلی اور ابو حاتم اور ابن قانع اس کو ثقہ کہتے ہیں اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا۔[تہذیب:۱۳/۷، ۱۴] امام ذہبی مسدد کو الحافظ، الحجۃ کہتے ہیں۔

[تذکرۃ الحفاظ:۲/۸]

(۶)......زکریا بن عدی:

اور عبیداللہ بن عمرو سے روایت کرنے والے زکریا بن عدی ہیں، جن کو امام ذہبی الحافظ، المجوّد، العبد الصالح سے ذکر کرتے ہیں۔[تذکرۃ الحفاظ:۱/۲۸۹] امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں: لا بأس بہ (ثقہ) ہے۔احمد عجلی فرماتے ہیں: ثقہ ہے۔عبدالرحمٰن بن خرش اس کو ثقہ، جلیل، ورع فرماتے ہیں۔ابن سعد فرماتے ہیں: ثقہ اور صالح الحدیث ہے۔منذر بن شاذان فرماتے ہیں: میں نے زکریا سے زیادہ حافظ حدیث نہیں دیکھا۔[تذکرۃ الحفاظ:۱/۲۹۰] تہذیب میں بھی ان کی صرف تعریف و توثیق ذکر ہے، کسی کی جرح ذکر نہیں۔[۲/۵۵۵]

(۷)......احمد بن عثمان بن حکیم:

اور زکریا بن عدی سے روایت کرنے والا احمد بن عثمان بن حکیم ہے، امام ابو حاتم فرماتے ہیں: سچا راوی ہے۔امام نسائی اور عقیلی و بزار ثقہ کہتے ہیں۔ابن خراش کہتے ہیں: ثقہ اور عادل راوی ہے۔امام ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔[تہذیب:۱/۱۰۰]

(۸)......امام نسائی رحمہ اللہ:

اور احمد بن عثمان بن حکیم سے روایت کرنے والے امام نسائی ہیں۔تو امام نسائی کی حدیث ابو ہریرہ کی سند کے سب راوی قوی اور ثقہ ہیں۔لہٰذا یہ حدیث صحیح ہے۔

تیسری حدیث، حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یکون في هذه الأمة بعث إلى السند والهند، فإن أنا أدركته، فاستشهدت فذلك، وإن أنا رجعت وأنا أبوهريرة المحرر قد أعتقني من النار."

[مسند احمد:۸۸۰۹۔ج:۲/۳۶۹]

اس امت میں سندھ اور ہند کی طرف لشکر بھیجا جائے گا، تو اگر میں نے اس کو پالیا اور شہید ہو گیا تو بہتر اور اگر میں واپس لوٹا تو اس حال میں کہ میں آزاد ابو ہریرہ ہوں گا مجھے اللہ نے جہنم سے آزاد کر دیا ہو گا۔

اس حدیث کی سند یوں ہے:

"حدثنا يحيى بن إسحاق، حدثنا البراء عن الحسن عن أبي هريرة، قال: حدثني خليلي الصادق رسول الله صلى الله عليه وسلم."

رواۃِ حدیث:

(۱) حسن بصری رحمہ اللہ

یہ حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ہیں، حضرت حسن بصری ثقہ اور معتبر راوی ہیں، جن کے متعلق کسی محدث کے قول کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حضرت حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ سے حدیث سنی ہے یا نہیں؟ زیادہ تر محدثین کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ سے ان کا سماع نہیں ہے، لیکن امام ابن حجر رحمہ اللہ سنن نسائی کے حوالے سے عن الحسن عن أبي هريرة حدیث روایت کرتے ہیں اور اس میں ہے: قال الحسن لم أسمع من أبي هريرة غير هذا الحديث حضرت حسن فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اس حدیث کے سوا کوئی حدیث نہیں سنی"۔ پھر فرماتے ہیں: یہ روایت تائید کرتی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے حسن بصری کا فی الجملہ سماع (ثابت) ہے۔[تہذیب ۱۳۴/۲] امام طبرانی رحمہ اللہ حدیث روایت کرتے ہیں جس میں حضرت حسن کے حضرت ابو ہریرہ سے سماع کی صراحت ہے۔ روایت یہ ہے: "عن الحسن قال: خطبنا أبو هريرة على منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم ...." حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت ہے (وہ فرماتے ہیں) کہ ہمیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ دیا اور فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمان سنا......الخ۔ حدیث لکھ کر امام طبرانی فرماتے ہیں: "وهذا الحديث يؤيد قول من قال إن الحسن قد سمع من أبي هريرة بالمدينة"۔ یہ حدیث ان محدثین کے قول کی تائید کرتی ہے جو فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مدینہ طیبہ میں حدیثیں سنی ہیں۔[المعجم للطبرانی: ۳۲،۳۱/۲] اور فرماتے ہیں: "فقيل: إن الحسن لم يسمع من أبي هريرة، وقال بعض أهل العلم: أنه قد سمع منه"۔ کہا گیا کہ حضرت حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نہیں سنی اور بعض علماء نے فرمایا کہ حسن بصری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے۔[طبرانی صغیر: ۱۳۹/۱]

اگر یہ بات لے لی جائے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نہیں سنی تو حضرت حسن بصری کی یہ روایت منقطع ہوگی اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی مرسلات کے متعلق امام علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مرسلات الحسن التي رواها عنه الثقات صحاح" [تہذیب: ۲/۱۳۱] حسن بصری کی وہ مرسل روایات جو ان سے ثقہ راویوں نے روایت کیں، صحیح ہیں۔ اور جو حکم مرسل کا ہے وہی منقطع کا ہے۔ علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فإن التابعي إذا استبان له الإسناد بطرق أرسل وإذا قال بطريق أسند". تابعی کے سامنے جب روایت کئی سندوں سے معلوم ہوتو وہ مرسل بیان کردیا کرتا ہے اور جب ایک سند سے (اس کو) راوی حدیث بیان کرے تو پھر وہ سند بیان کرتا ہے۔ [مسند الأنام شرح مسند الإمام الأعظم: ۵۹۳] تو ہوسکتا ہے کہ حضرت حسن بصری وغیرہ جیسے اکابر تابعین متعدد راویوں سے مروی روایت کو مرسل اور منقطع بیان کرتے ہوں۔

(۲)......براء بن عبداللہ بن یزید بصری:

حضرت حسن بصری سے روایت کرنے والا راوی براء بن عبداللہ بن یزید بصری قاضی ہے۔ امام ابوداؤدؒ فرماتے ہیں: "لاباس بہ (ثقہ) ہے"۔ امام بزار ایک قول میں "لاباس بہ" کہتے ہیں۔ [تہذیب: ۱/۴۲۹]۔ امام یحییٰ بن معین کا ایک قول یہ ہے کہ: لاباس بہ ہے۔ [میزان: ۱/۳۰۱] کچھ محدثین نے اس میں کلام بھی کیا ہے۔

(۳)......یحییٰ بن اسحاق بجلی:

براء سے روایت کرنے والا یحییٰ بن اسحاق بجلی ابوزکریا ہے۔ امام احمدؒ اس کو شیخ، صالح، ثقہ اور سچا کہتے ہیں، امام یحییٰ بن معین بھی سچا بیان کرتے ہیں۔ ابن سعد کہتے ہیں: ثقہ، حافظِ حدیث ہے۔ [تہذیب: ۷/۵۱۶]

(۴)......امام احمد رحمہ اللہ:

اور یحییٰ بن اسحاق سے امام احمد رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں:

یہ سند بھی شدید کمزور نہیں، حسن درجہ کی ہے۔ صرف براء کی وجہ سے اس سند میں معمولی درجہ کا ضعف آیا ہے جو قابل برداشت ہے، کیوں کہ براء بھی اتنے گئے گذرے راوی نہیں ہیں۔ حسن بصری کی وجہ سے روایت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

چوتھی حدیث، حدیثِ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت بھی ہے (فرماتے ہیں) کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ارشاد فرمایا:

"یغزون جیش لکم الھند، فیفتح اللہ علیھم، حتی یأتوا بملوك السند(الھند)مغلغلین فی السلاسل، فیغفر اللہ لھم ذنوبھم، فینصرفون حین ینصرفون، فیجدون المسیح بن مریم بالشام.

تمہارا ایک لشکر ہندوستان سے جہاد کرے گا، اللہ تعالیٰ ان کو فتح عطا فرمائے گا، یہاں تک کہ سندھ (صحیح، ہند) کے بادشاہوں کو زنجیروں میں تیز تیز چلتے ہوئے لائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخش دے گا۔ جب وہ واپس ہوں گے تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو ملک شام میں پائیں گے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"اگر میں نے وہ معرکہ پایا تو اپنا ہر قسم کا نیا پرانا مال بیچ کر وہ معرکہ لڑوں گا اور جب اللہ تعالیٰ ہمیں فتح عطا فرمادیں گے تو ہم واپس ہوں گے اس حال میں کہ میں آزاد ابو ہریرہ ہوں گا جو ملک شام آئے گا اور مسیح بن مریم علیہ السلام سے ملاقات کرے گا۔ میں اس کی خوب کوشش کروں گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قریب جاؤں اور ان کو بتاؤں کہ میں آپ ﷺ کا صحابی ہوں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس کر مسکرائے اور فرمایا: عیسیٰ علیہ السلام کی آخری آمد پہلی آمد کی طرح نہیں ہوگی، ان پر موت کے رعب جتنا رعب ڈال دیا جائے گا، وہ آدمیوں کے چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور ان کو جنت کے درجات بتائیں گے۔"

یہ روایت راقم کو امام اسحاق بن راہویہ کی مسند مطبوعہ ایک جلد میں ملی ہے، امام اسحاق بن راہویہ اس کی سند یوں بیان کرتے ہیں:

"أخبرنا یحی بن یحی أنا إسمعیل بن عیاش عن صفوان بن عمرو السکسکی عن شیخ عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ."

(۱)......شیخ صفوان بن عمرو:

اس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا صفوان بن عمرو کا شیخ (استاذ) ہے جو تابعی اور غیر معلوم ہے، لیکن اس کی جہالت کی وجہ سے حدیث پر اثر نہیں پڑتا کیوں کہ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فأما المبھم الذی لم یسم، أو من سمی ولا تعرف عینہ، فھذا ممن لا یقبل روایتہ أحد علمناہ، ولکنہ إذا کان فی عصر التابعین والقرون المشھود لھم بالخیر، فإنہ یستأنس بروایتہ ویستضاء بھا فی مواطن۔[الباعث الحثیث:۴۸]

لیکن جو راوی مبہم ہو یعنی جس کا نام نہ لیا گیا ہو، یا نام لیا گیا لیکن اس کی ذات متعین نہ ہو تو ایسے کی روایت ہمیں معلوم علماء میں سے کوئی قبول نہیں کرتا، لیکن جب ایسا راوی تابعین کے زمانہ کا ہو اور

جن ادوار کی خیر و بھلائی کی گواہی (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں) دی گئی، ان کے زمانہ کا ہو (یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین میں سے ہو) تو اس کی روایت سے تسلی حاصل کی جائے گی۔ (تائید حاصل ہو سکے گی) اور کئی مواقع میں اس سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

معلوم ہوا کہ ایسے راوی تابعی کی روایت تائید کے درجہ میں حجت ہے۔

(۲)......صفوان بن عمرو السکسکی:

شیخ صفوان سے صفوان بن عمرو السکسکی روایت کر رہے ہیں، جن کو امام عجلی اور دحیم، ابوحاتم، نسائی، ابن سعد، ابن مبارک وغیرہم رحمہم اللہ ثقہ کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ نے ان کو ثقات میں ذکر فرمایا۔ [تہذیب: ۴۰۱/۳]

(۳)......اسماعیل بن عیاش:

اور صفوان بن عمرو سے روای کرنے والے اسماعیل بن عیاش ہیں۔ امام نسائی فرماتے ہیں: اہل شام سے حدیث کی روایت میں صالح (درست) ہے۔ امام علی بن مدینی، ابن عدی، ابوداؤد، یحییٰ بن معین اور امام احمد رحمہم اللہ بھی یہی فرماتے ہیں اور یہ حدیث اہل شام سے ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کی کئی حدیثیں صحیح قرار دیں۔ [تہذیب: ۳۳۲،۳۳۱/۱] امام ابن عدی فرماتے ہیں: جب اس سے روایت کرنے والا ثقہ ہو تو وہ مستقیم ہے۔ امام ابومسہر فرماتے ہیں: جب اس کی روایت ثقہ سے پہنچے تو وہ خود ثقہ ہے۔ [تہذیب: ۳۳۲/۱]

(۴)......یحییٰ بن یحییٰ حنظلی:

اسماعیل بن عیاش سے روایت کرنے والا امام یحییٰ بن یحی حنظلی تمیمی نیشاپوری ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: ثقہ تھا اور ثقہ سے بھی زائد تھا۔ امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں: میں نے اس کی مثل نہیں دیکھا اور ان کی وفات کے دن فرمایا: امام اہل دنیا فوت ہو گیا۔ امام عباس بن مصعب فرماتے ہیں: ثقہ تھا۔ امام احمد بن سیار فرماتے ہیں: حدیث میں ثقہ تھا۔ امام نسائی ثقہ اور مضبوط کہتے ہیں۔ امام ابن حبانؒ نے اس کو ثقات میں ذکر کیا۔ قتیبہ بن سعیدؒ نے فرمایا: مسلمانوں کے اماموں میں سے عظیم امام ہے۔ [تہذیب: ۶۱۷،۱۵/۷] سب محدثین نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔

(۵)......اسحاق بن راہویہ:

اور امام یحییٰ بن یحییٰ سے روایت کرنے والا اسحاق بن راہویہ ہے، جن کے متعلق امام ذہبیؒ فرماتے ہیں: امام، حافظ، کبیر ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں: میں عراق میں اسحاق کی مثل نہیں جانتا۔ امام نسائی فرماتے ہیں: اسحاق ثقہ قابل اطمینان اور امام ہے۔ امام ابوزرعہ فرماتے ہیں: اسحاق سے بڑھ کر حافظ حدیث کوئی نہیں دیکھا گیا۔ [تذکرۃ الحفاظ ۲: ۱۷، ۱۸]

یہ روایت بھی حسن درجہ کی ہے بالخصوص جب کہ مندرجہ بالا دوسری روایات اس کی مؤید ہیں، اس لیے غزوۂ ہند کی مخالفت کر کے ہندوستان کو اپنی تائید سے نوازنا اور خوش کرنا اچھا نہیں ہے۔

غامدی کارندے کی کذب بیانیاں اور خیانتیں:

غامدی کا یہ کارندہ ان روایت کے بارے میں لکھتا ہے:

واضح رہے کہ اگر روایت کے کسی سلسلے میں ایک راوی بھی ناقابل اعتماد ہو تو وہ روایت ضعیف اور ناقابل قبول ہو جاتی ہے۔ مثلاً پہلی روایت میں اسد بن موسیٰ نامی ایک راوی موجود ہے۔ اس شخص کو محدثین نے ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ اس میں ایک اور راوی کا نام بقیہ ہے، اس کو بھی حدیث کے ماہرین نے ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ اس میں ایک اور راوی کا نام یحییٰ بن معین ہے۔ (یہ جھوٹ ہے، کاتب الحروف) محدثین کے نزدیک یہ بھی بالکل ایک ناقابل اعتماد شخص ہے۔ روایت کے اسی سلسلے میں دو مزید افراد بھی ہیں: ایک ابوبکر زبیدی اور دوسرے عبدالاعلیٰ بن عدی البرانی۔ محدثین کے نزدیک یہ دونوں مجہول الحال ہیں، یعنی ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ یہ کون ہیں؟ ان کے اساتذہ کون ہیں؟ یہ کب پیدا ہوئے اور کب فوت ہوئے؟ ظاہر ہے کہ جو شخص حضور کی کوئی بات براہ راست کسی فرد سے سن کر آگے سناتا ہے اسے ایک مشہور و معروف اور عالم آدمی ہونا چاہیے۔ گویا اس روایت کا سارا سلسلہ بہت ناقابل اعتماد ہے اور بس آخر میں ایک صحابی کا نام لگا دیا گیا ہے۔ ایسی روایت پر بھلا کیسے اعتماد کیا جائے اور دین کے معاملے میں اسے بطور ثبوت کیسے پیش کیا جائے؟''

تبصرہ:

غامدی کارندے نے ان الفاظ میں حدیث ثوبان رضی اللہ عنہ سے متعلق کئی جھوٹ بولے اور کئی غلط بیانیاں اور خیانتیں کی ہیں:

(۱)......اسد بن موسیٰ اور بقیہ بن ولید کو ناقابل اعتماد بتایا، حالانکہ محدثین نے ان پر اعتماد کیا ہے، جیسا کہ پہلی روایت کی بحث میں قارئین نے پڑھ لیا۔

(۲)......یہ کہا کہ: 'اس میں ایک راوی یحییٰ بن معین ہے۔' حقیقت یہ ہے کہ سند میں کوئی یحییٰ نامی راوی موجود نہیں ہے۔

(۳)......ان راویوں سے متعلق کوئی ادنیٰ سا جرح کا کلمہ جو مرجوح بھی ہو، لے کر راویوں کو ناقابل اعتماد قرار دے دیا جو یک طرفہ کاروائی اور ظلم و ناانصافی اور خیانت ہے۔

(۴)......عبدالاعلیٰ کو مجہول بتایا۔ حالانکہ محدثین نے اس کو ثقہ بتایا ہے اور اس کا حال تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جس کا مفصل حال بیان کیا گیا وہ کیسا مجہول ہے؟

غامدی باشندہ مزید لکھتا ہے:

"باقی چاروں روایات کا بھی یہی حال ہے، ان راویوں میں ایک شخص کا نام زکریا بن عدی ہے، جس کو حدیث کے علماء ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ ان راویوں میں عبید اللہ بن عمر اور زید بن ابی انیسہ بھی شامل ہیں، ان دونوں کے متعلق محدثین کا یہ بیان ہے کہ ان کے معاملے میں احتیاط کرنی چاہیے، اس لیے کہ ان دونوں کے اندر خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک اور راوی کا نام جبیر بن عبیدہ ہے، اس شخص کے متعلق محدثین کی رائے بہت ہی بری ہے اور اس کو ناقابل اعتماد قرار دیا ہے۔ ایک اور راوی ہشم (ہشیم) ہے، ان کے متعلق بھی محدثین کی رائے بہت بری ہے، یہ صاحب ایسے لوگوں سے حدیث روایت کرتے تھے جن سے ان کی کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی...."

تبصرہ:

اوپر دوسرے نمبر پر جو حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ذکر ہوئی، اس کی سند ہشیم اور جبیر بن عبیدہ اور ایک سند میں زکریا بن عدی ہیں۔

(۱)...... یہ جھوٹ ہے کہ زکریا بن عدی کو علماء ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں۔ اس وقت راقم کے سامنے "المغنی فی الضعفاء" اور "میزان الاعتدال" ہے، علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ضعفاء میں زکریا بن عدی کو ذکر ہی نہیں کیا اور تہذیب التہذیب میں تو جرح کا ایک کلمہ بھی ذکر نہیں۔ معلوم نہیں کہ اس غامدی کارندے کی مراد "علماء" سے خود ان کا گروپ ہے یا اسلاف محدثین؟

(۲)...... جبر یا جبیر بن عبیدہ سے متعلق امام ذہبیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ: معلوم نہیں کہ کون ہے۔ [المغنی، میزان] مگر علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے حال کی تحقیق کی تو ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ جبر یا جبیر شاعر اور مقبول راوی ہے، جس کی تائید ابن حبانؒ کے ثقات میں ذکر کرنے سے ہوگئی۔ اور من علم حجۃ علی من لا یعلم (لاعلم کے مقابلے میں معلومات رکھنے والا حجت ہے۔) کے قاعدہ کے تحت امام ذہبی کی لاعلمی حجت نہیں ہے۔ اور یہ تو بالکل جھوٹ ہے کہ محدثین نے اس کو ناقابل اعتماد قرار دیا اور محدثین کی رائے اس کے بارے میں بری ہے۔ لاؤ کوئی محدث جس نے اس پر جرح کا کلمہ بولا ہو!" ھاتو ابرھانکم إن کنتم صادقین"

(۳)...... غامدی فرد ہشیم کو ہشم لکھتا ہے۔ پھر اس صاحب کا کہنا ہے کہ: "ہشیم تدلیس کرتا ہے" اگرچہ یہ درست ہے کہ تہذیب وغیرہ میں ہشیم سے متعلق امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ: "ہشیم نے یزید بن ابی زیاد اور عاصم بن کلیب اور لیث بن ابی المشرقی اور سیار سے حدیث نہیں سنی۔ لیکن ان سے حدیث بیان کی ہے۔" [تہذیب: ۷/۲۱۵] لیکن امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: امام احمدؒ یہ فرمانے کے باوجود کہ:

ہشیم نے سیار سے حدیث نہیں سنی۔'' ہشیم کی روایت قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ امام عبداللہ بن احمد، امام احمدؒ سے حدیث روایت کرتے ہیں جس میں: "حدثنا هشيم حدثنا سيار و حصين و جماعة'' ہے۔ [میزان: ۳۰۷/۴] اس سے معلوم ہوا کہ امام احمدؒ ان کی تدلیس مضر نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ جو مدلس راوی ثقات سے تدلیس کرتا ہے، اُس کی تدلیس مضر نہیں ہے۔ اور ہشیم ثقات سے تدلیس کرتے ہوں گے۔

نیز امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

وقال خلق كثير من أهل العلم خبر المدلس مقبول؛ لأنهم لم يجعلوه بمثابة الكذاب، ولم يروا التدليس ناقضا لعدالته، وذهب إلى ذلك جمهور من قبل المراسيل من الأحاديث، وزعموا أن نهاية أمره أن يكون التدليس بمعنى الإرسال. [الكفاية: ۳۱۳]

علماء کی ایک بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ: مدلس کی حدیث مقبول ہے، کیونکہ علماء نے مدلس کو جھوٹے کے بمنزلہ نہیں ٹھہرایا۔ اور تدلیس کو اس کی عدالت میں نقص پیدا کرنے والا نہیں سمجھا۔ اور جمہور علماء کا یہی مذہب ہے جو مرسل روایات کو قبول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ تدلیس ارسال کے معنی میں ہوتی ہے۔ (اور ارسال سے حدیث یا راوی ضعیف نہیں ہوتا۔ لہٰذا محض تدلیس سے بھی حدیث یا راوی ضعیف نہیں قرار پاتے۔)

اور فقہاء احناف فرماتے ہیں کہ: تدلیس جرح ہی نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: الأصح ان التدليس ليس بجرح. [قواعد فی علوم الحدیث مع اعلاء السنن: ۸۹۴/۱۸] زیادہ صحیح یہ ہے کہ تدلیس جرح ہی نہیں ہے۔ علامہ محمد حسن سنبلی فرماتے ہیں: "أما التدليس فهو غير جرح عند الحنفية" (تنسيق النظام حاشية مسند الامام: ۶۹) تدلیس تو احناف کے نزدیک جرح ہی نہیں ہے۔ اس لیے امام ہشیم اگر تدلیس کرتے بھی ہیں تو اس کی وجہ سے حدیث کو ضعیف نہیں کہا جا سکتا۔

امام احمد کی مسند کی سند پر غامدی کارندے کی جرح بس اتنی ہے۔ جب کہ امام نسائی کی سند میں مذکور راوی عبیداللہ بن عمرو اور زید بن ابی اُنیسہ پر فرد مذکور نے بایں طور جرح کی کہ: ''محدثین کا بیان ہے کہ: ان راویوں کے معاملہ میں احتیاط کرنی چاہیے، کیوں کہ ان دونوں کے اندر خامیاں پائی جاتی ہیں۔''

اِس وقت تهذيب التهذيب، میزان الاعتدال اور المغني بندہ کے پیش نظر ہے، تینوں کتابوں میں زید بن ابی انیسہ کے متعلق صرف امام احمد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ: ''زید کی حدیث میں کچھ نکارت ہے۔'' اور غالبًا اسی کو غامدی صاحب سامنے رکھے ہوئے ہوں گے، لیکن یہ ان کے قول کا آدھا حصہ ہے، پورا قول اس طرح ہے:

''حديثه حسن مقارب، وإن فيها لبعض النكرة، وهو على ذلك حسن الحديث،

صالح، ولیس ھو بذلک." (تہذیب: ۴۰۴/۲، میزان: ۹۸/۲، المغنی: ۳۷۹/۱) زید کی حدیث حسن ہوتی ہے (اعلیٰ درجہ کی) صحیح کے قریب ہوتی ہے۔ (اگرچہ) اس کی حدیث میں کچھ نکارت ہوتی ہے، اس کے باوجود وہ حسن الحدیث اور صالح راوی ہے، لیکن اعلیٰ درجہ کا قوی نہیں ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ امام احمد زید کو "حسن الحدیث" کہہ رہے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ: گو انتہائی اونچے درجہ کے قوی نہیں ہیں، مگر انتہائی ضعیف بھی نہیں ہیں۔ گویا ایسے ہیں جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما...... یا جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں حضرت حسن بصری وغیرہ رحمہ اللہ۔ باقی جو یہ فرمایا کہ: "اس کی حدیث میں کچھ نکارت ہے۔" تو ہوسکتا ہے کہ وہ نکارت اس سے اوپر کے راویوں کی وجہ سے آئی ہو، یا نکارت کا زیادہ سے زیادہ مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات وہ روایت میں اکیلے ہوتے ہیں۔ اور روایت میں اکیلا ہونا کوئی عیب نہیں ہے۔

اور راوی عبید اللہ بن عمرو سے متعلق بھی تہذیب میں صرف ابن سعد کے قول میں ہے کہ: "ربما أخطأ" کبھی غلطی کرلیتا ہے۔ اور یہ بھی ادھورا قول ہے پورا قول اس طرح ہے: "کان ثقة صدوقا کثیر الحدیث وربما اخطأ. قابل اعتماد اور بہت سچا اور بکثرت حدیثیں روایت کرنے والا تھا۔ اور بعض اوقات غلطی کی ہے۔" اور "کبھی غلطی کرنے" کی بات ذرا بھی وزن نہیں رکھتی، لسان المیزان کا مقدمہ پڑھیے۔ "ربما أخطأ" والا راوی ہرگز قابل رد نہیں ہے۔ ذرا سوچیے! انبیاء علیہم السلام کے سوا کون سا انسان ہے جو کبھی بھی غلطی نہ کرتا ہو؟ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لا یکون ذلک جرحا مستقرا ولا یرد به حدیثه [لسان: ۱/۱۷، ۱۸] یہ (کبھی غلطی کرنے کی بات) جرح نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے راوی کی حدیث رد ہوگی

غامدی کارندہ لکھتا ہے:

> "درج بالا روایات میں سے دوسری روایت میں کہا گیا ہے کہ صفوان بن عمرو نے حضور سے یہ روایت بیان کی ہے۔ صفوان بن عمرو ایک تبع تابعی ہے، یعنی حضور سے کسی صحابی نے یہ بات کی ہوگی، پھر ان سے یہ بات کسی تابعی نے سنی ہوگی اور پھر صفوان نے سنی ہوگی۔ جبکہ صفوان سے نیچے باقی راوی بھی جھوٹے اور ناقابل اعتماد ہیں۔"

تبصرہ:

شاید یہ حضرت [illegible] سے کا پتہ چلا ہے [illegible] حالانکہ [illegible] یہ تھی صفوان سے آگے عن شبیح عن أبي هريرة رضي الله عنه ہے، یعنی صفوان نے براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی بلکہ انہوں نے اپنے استاد سے اور ان کے استاذ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے۔ لیکن حضرت صفوان بن عمرو چونکہ تابعی ہیں (نہ کہ تبع تابعی۔ حضرت عبداللہ بن بسر مازنی صحابی

رضی اللہ عنہ وغیرہ سے حدیث کا سماع ثابت ہے۔) اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ان کے شیخ (استاذ) مجروح ومتکلم فیہ ہوں گے۔ اُن کے استاذ یا تو تابعی ہوں گے۔ اور اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خیر القرون کے دور کے مبہم راوی کی روایت سے تائید حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور یا پھر وہ بھی صحابی ہوں گے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کر رہے ہوں گے۔ صحابی کا مجہول ہونا بھی مضر نہیں۔ لہٰذا یہ روایت بہر صورت تائید کے درجہ میں قابل قبول ہے۔

اور یہ کہنا کہ صفوان سے نیچے کے راوی جھوٹے اور ناقابل اعتماد ہیں بذات خود صاف جھوٹ ہے، اس لیے کہ اسماعیل بن عیاش، یحییٰ بن یحییٰ حنظلی اور امام اسحاق بن راہویہ کو کسی ایک محدث نے بھی ''جھوٹا'' نہیں کہا۔ اور سچے لوگوں کو جھوٹا کہنا بہت بڑا جھوٹ ہے۔

غامدی کارندہ کی باقی باتیں بھی اسی طرح کی بے تحقیق اور بے وزن ہیں۔ یہ لوگ یا تو اندھی تقلید میں غلبے کے فقیر ہیں یا انتہائی درجے کے خائن و بددیانت۔ ان سمیت تمام اہل باطل کا وطیرہ ہے کہ ''پوری دیانت داری'' اور ''اعلیٰ اخلاقیات'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی بھی کتاب کا کوئی حوالہ نقل کرتے وقت اپنے مطلب کی ادھوری بات نقل کر دیتے ہیں۔ [illegible] کو تنکے کا سہارا والا حال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو [illegible]

☆ ☆ ☆ ☆

مولانا مفتی افتخار احمد مدظلہ، بہاولپور

توہین رسالت کی شرعی سزا اور غامدی موقف

توہین رسالت کی سزا کا قانون تمام مذاہب سماوی بالخصوص مذہب اسلام میں بہت اہمیت کا حامل ہے، اس کے عملی نفاذ سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہیں رہا، حداً یا تعزیراً بہر صورت اس جرم کی سزا قتل ہی رہی ہے، ذمی یا مسلم ارتکاب جرم اور نوعیت سزا میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں، اول تا آخر امت کے تمام ادوار ہمہ جہت اس قانون کے محافظ نظر آتے ہیں۔ ہمارے دور میں کچھ افراد اس قانون کے خلاف آواز اٹھائے ہوئے ہیں جو درحقیقت نکتہ مفادات پر نگاہ رکھے اغیار کی بولی بولتے ہیں اور ان کی بے موقع و بے محل ترجمانی میں اپنے من پسند تشریحی ضابطوں کو جن سے نہیں تو ڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں کبھی تو صحیح احادیث سے قرآنی تشریحات کو نا قابل اعتبار [illegible] ہوتے ہیں اور کبھی اپنے موقف کو سچ کرنے میں واہی روایات سے تشریح کے قابل بھی [illegible] تے ہیں۔ غرض وہ سند و رجال کے محتاج ہوئے بغیر آزادی خیال سے دین کی تشریح چاہتے ہیں [illegible] اس زعم باطل کو خوبرو بنانے کیلئے یہ رنگ چڑھاتے ہیں کہ اسلام دنیا میں بدنام ہو رہا ہے یہود و نصاریٰ اسلام اور سیاست پر عقلی سوالات کر رہے ہیں اور وہ ناراض ہیں ہم انکو خوش و راضی کرنا چاہتے ہیں تا [illegible] مطمئن ہو جائیں اس وقت وہ قرآنی آیات لن ترضی عنک الیھود و لا النصاری وغیرہ کو بھی بھول جاتے ہیں۔

جاوید احمد غامدی اسی نظر و فکر کی حامل شخصیت ہیں توہین رسالت کی سزا کے بارے میں انکے انٹرویوز اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں مجلہ اشراق مارچ تا مئی ۲۰۱۱ء میں ان کا مضمون شائع ہوا اس مضمون کی روشنی میں انکے میجر خیالات درج ذیل ہیں۔

۱۔ توہین رسالت کی سزا کا قانون جو ریاست پاکستان میں نافذ ہے یہ قرآن و حدیث کے خلاف ہے، اس کا کوئی ماخذ قرآن و حدیث میں تلاش نہیں کیا جا سکتا [illegible] سورۃ مائدہ آیت نمبر 34-33 کو بنیاد بنایا ہے جو بالکل اس قانون کو سپورٹ نہیں [illegible]

۲۔ رسول ﷺ کے زمانہ میں جن لوگوں کو قتل کیا گیا [illegible] بلکہ وجہ وجوہات فساد فی الارض و ارتداد وغیرہ تھی۔

۳۔ اس قانون کو لازماً تبدیل ہونا چاہیے [illegible] دنیا میں [illegible] کی بدنامی کا

باعث بن رہا ہے۔

ان تمام خیالات کا جواب دینے سے پہلے غامدی صاحب کی خدمت میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جب پاکستان کا قانون توہین رسالت ستائے تو اتنا ضرور سوچ لیا کریں کہ یہ قانون پاکستان کی اسمبلی نے ہی متفقہ طور پر داخل دستور کیا تھا اور اس وقت کی اسمبلی یقیناً آج کی اسمبلی سے بہتر تھی، جس میں علماء بھی تھے، محققین و دانشور بھی، غامدی صاحب جیسے اذکیا و مفکر بھی، بلند پایہ سیاست دان یورپ سے مغلوب شخصیات اور مسلک احناف سے واقف کار بھی، پھر توہین رسالت کی سزا کے قانون کو ختم کرانے کے بجائے آسان تر طریقہ اس قوم کو توہین سے روکنے پر زور لگانا ہے جن کی پناہ انکو بڑی عزیز ہے اور وہ قوم ان کا احترام بھی کرنے لگی ہے اور انکی احسان مند بھی، تا کہ نہ کوئی توہین کرے اور نہ قانون حرکت میں آئے، قانون کی شق کو خارج کرانا یا تبدیل کرانا کونسی عقل مندی یا خدمت اسلام ہے؟ اور غامدی صاحب کو شاید یاد نہیں کہ جس وقت یہ قانون داخل دستور کیا جا رہا تھا اس وقت قومی اسمبلی میں اقلیتوں کے پارلیمانی لیڈر کرنل ہربرٹ نے اپنی پوری جماعت کے ساتھ تعاون کا اعلان کیا تھا، ایک غیر مسلم نے اس قانون کی ضرورت کو محسوس کر لیا اپنوں کو کیوں سمجھ نہیں آتی ؟

قرآن، حدیث اور اجماع امت کی رو سے توہین رسالت کی سزا:

توہین رسالت کی سزا قتل ہے جو قرآن، حدیث، اجماع امت سے ثابت ہے، قاضی عیاضؒ نے شفا میں ابن عتابؒ کا فرمان ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

اَلْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ مُوجِبَانِ اَنَّ مَنْ قَصَدَ النَّبِيَّ ﷺ بِاَذًى اَوْ نَقْصٍ مُعَرِّضاً اَوْ مُصَرِّحاً وَاِنْ قَلَّ فَقَتْلُهُ وَاجِبٌ ـ

ترجمہ: ..... ”قرآن اور سنت سے ثابت ہے کہ جو بھی نبی ﷺ کی تنقیص کرے صراحتاً ہو یا اشارۃً و کنایۃً تھوڑی ہو یا زیادہ اسکو قتل کرنا واجب ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں عملاً اس سزا کا نفاذ کر کے امت کو قانون بتلا دیا تھا، صحابہ و آئمہ مجتہدین اسی پر کاربند رہے، مسلمانوں کے لئے تمام قضایا میں یہی معیار اور بنیاد ہے۔ یہ خیال کہ ہمارے کس عمل کو یورپ پسند کرتا ہے اور کس کو نہیں، قطعاً معیار نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ وہ تم پر راضی نہیں ہوں گے، ان کی خوشنودی کی فکر سے بے نیاز ہو کر شریعت پر عمل پیرا رہو۔

قرآن انہی معیاروں کو کبھی ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون اور کبھی ما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا اور کبھی اطیعوا اللہ و اطیعوا

الرسول واولی الامر منکم سے اور کبھی ومن یشا قق الرسول من بعد ما تبین له الهدٰی و یتبع غیر سبیل المومنین نوله ماتولی ونصله جهنم و ساء ت مصیرا ۔ میں صحابہ و اجماع امت کی راہ سے ہٹنے پر جہنم کی وعید سنا دینے کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پھر بالفرض غامدی صاحب اپنی پوری ہم خیال جماعت کے ساتھ راست بھی ہوں تو بھی زمینی حقائق کا تقاضا کچھ اور ہے اور انکے دل کی آواز بھی یہی ہے کہ یورپ سارے کا سارا ہم مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے، یعنی دوسرے الفاظ میں غامدی صاحب متقدمین احناف کی بات منوانے پر نزاکت احوال کی وجہ سے مُصر ہیں، ورنہ پابندی مسلک اُن کی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی، جبکہ دوسری طرف پوری پاکستانی مسلم قوم اہل یورپ کی منصوبہ ساز اہانت رسول، اہانت قرآن، اہانت شعائر اسلام کیوجہ سے اس قدر جذباتی ہو چکی ہے کہ وہ اس قانون کے تحفظ کے لیے اپنی دنیا تو تباہ کر سکتی ہے لیکن قانون پر زد گوارا نہیں کر سکتی، یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں ہے۔ ان حالات میں ایسی زخمی قوم کو مسالک اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید پر مجبور کرنا دانشمندی نظر نہیں آتی (جبکہ مسلک احناف بھی درحقیقت اسی قانون ہی کو سپورٹ کرتا ہو) کیا سینکڑوں مسائل ایسے نہیں ہیں کی معمولی اعذار کی بناء پر غامدی صاحب جیسے لوگ بھی تبدیلی مسلک کو کوئی بڑی وجہ نہیں سمجھتے؟ میرے خیال میں جو نظر نزاکت اہل یورپ کی طرف ہے، حالات تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اہل اسلام پاکستانیوں کی طرف پھیر دینی چاہیے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ غامدی صاحب اگر تبدیلی قانون میں بالفرض کامیاب ہو بھی جاتے ہیں تو میں انکو یقین دلاتا ہوں یورپ پھر بھی ان پر خوش نہیں ہوگا بلکہ وہ کسی دوسری کڑی کو گرانے کے لئے کسی اور غامدی کو تلاش کرے گا، وہ تو اسی وقت ہی خوش ہو سکتا ہے جب اسلام نہ رہے یا مسلمان نہ رہے۔ اللہ کرے اس درد کو کوئی سمجھے۔

یہ مضمون درج ذیل عنوانات کے تحت لکھا جا رہا ہے:

(۱)......(توہین رسالت کی سزائے قتل کا) قرآن سے ثبوت

(۲)......احادیث سے ثبوت

(۳)......اصحاب رسول ﷺ کا اس بارے میں نظریہ

(۴)......تابعین اور مسالک اربعہ کا نظریہ و مذہب

(۵)......اجماع امت

(۶)......سزا کے اجراء کے لیے شہادۃ شرعی کی ضرورت

(۷)......ایک مشہور شبہ اور اس کا ازالہ

کتاب اللہ سے سزا (قتل) کا ثبوت:

☆ وَاِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ـ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْماً نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَاءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ اَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ـ (۱۱ـ۱۲ـ۱۳ـالتوبة)

ترجمہ:......''اور اگر وہ عہد کر لینے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین میں عیب زنی کریں تو تم کفر کے ان سرداروں سے لڑو تحقیق ان کی قسمیں کچھ (معتبر) نہیں تاکہ وہ باز آ جائیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے نہیں لڑتے ہو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا ہے اور (اس سے پہلے) رسول اللہ ﷺ کو نکالنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اور تم سے ابتداء بھی انہوں نے کی تھی کیا تم ان سے ڈرتے ہو سو اللہ زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے اگر تم مومن ہو۔''

جماعت مفسرینؒ نے اس آیت مبارکہ سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کی سزا قتل ہے۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

☆ وَمِنْ هٰهُنَا اُخِذَ قَتْلُ مَنْ سَبَّ الرَّسُوْلَ ﷺ (تفسیر ابن کثیر تحت آیت التوبة هذه)

ترجمہ:...''اور اسی آیت سے شاتم رسول ﷺ کی سزا قتل ثابت کی گئی ہے۔

اسعد حومد ایسر التفاسیر میں لکھتے ہیں:

وَمِنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ شُرِعَ قَتْلُ مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ وَمَنْ طَعَنَ فِيْ دِيْنِ الْاِسْلَامِ.

(ایسر التفاسیر لاسعد حومد)

ترجمہ:......''اسی آیت مبارکہ سے شاتم رسول ﷺ اور دین اسلام میں طعن کرنے والے کی سزا قتل مشروع ہے۔''

امام جصاصؒ احکام القرآن میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

فَاِذَا ثَبَتَ ذٰلِكَ كَانَ مَنْ اَظْهَرَ سَبَّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَهْلِ الْعَهْدِ نَاقِضًا لِلْعَهْدِ، اِذْ سَبُّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَكْثَرِ الطَّعْنِ فِي الدِّيْنِ. [۳/ ۸۵]

ترجمہ:......''پس جب اس سے یہ ثابت ہو گیا تو جس کسی نے بھی ذمیوں میں سے نبی ﷺ کو سب وشتم کیا تو اسکا یہ عمل عہد کو توڑ دے گا اس واسطے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینا یہ دین میں سب سے بڑا طعن ہے۔''

غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ اہل علم نے سورہ مائدہ کی آیت کو اس قانون کے لیے بنیاد بنایا ہے،

قطعاً درست نہیں۔ غامدی صاحب کو شاید مغالطہ لگ گیا، اہل علم نے آیت مائدہ کو اس قانون کے لیے جو سورہ توبہ کی مذکورہ آیت 12/13 اور صحیح احادیث سے ثابت تھا، تاویلی ہونے کیوجہ سے کسی درجہ تائیدی آیت قرار دیا ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت میں بظاہر دو جرائم پر چار سزاؤں کا حکم ہے جس کی تعبیر درحقیقت یوں ہو سکتی ہے کہ ان جرائم کو ان کے عموم پر رکھا جائے، کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، راہزنی، ڈکیتی، ناحق قتل و نہب، مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈہ وغیرہ تمام کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ اور زمین میں بدامنی پھیلانے کے مترادف قرار دے دیا جائے۔ پھر ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے، مثلاً مرتد پہلی سزا قتل کے ساتھ مختص ہے وغیرہ، ایسے ہی گستاخ رسول کی سزا بھی پہلی قرار دے دی جائے، اس بناء پر کہ یہ ارتداد ہے اور اس بناء پر بھی کہ دوسری نصوص سے یہ مستقلاً سبب قتل ہے، نیز تائیدی مستدل کا دعوی کو من کل الوجوہ محیط ہونا کچھ ضروری نہیں ہے، مفسرین نے آیت مائدہ کے مصداق میں باعتبار عموم وخصوص دیگر تعبیرات بھی کی ہیں۔ بہرحال غامدی صاحب کا اس آیت ہی کو بنیاد ثابت کر کے اپنا مقصد نکالنا ناانصافی ہے، غامدی صاحب آیت توبہ کے مستدل ہونے کا بھی اگر انکار کر دیتے ہیں تب بھی متعین سزا کی صحت پر کچھ اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ اہل سنت مسلمانوں کے عقیدہ کی بنیاد آیت **ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا** (سورہ حشر، آیت نمبر ۷) اور حدیث رسول ﷺ **ان ما حرم رسول اللہ کما حرم اللہ قال ابو عیسٰی ھذا حدیث حسن** (ترمذی) پر ہے۔

بعض مفسرین نے سورہ احزاب کی آیت نمبر 57 کو بھی اس قانون کی تائید میں پیش کیا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

آیت مبارکہ۔

☆ اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَاباً مُّھِیْناً.
(۵۷_الاحزاب)

ترجمہ:......''تحقیق جو لوگ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو اذیت دیتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا میں اور آخرت میں اور اللہ نے انکے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

قاضی عیاضؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب الشفا میں اس آیت مبارکہ سے شاتم رسول ﷺ کے قتل پر ان الفاظ سے استدلال کیا ہے۔

فَمِنَ الْقُرْآنِ لَعْنَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی لِمُؤْذِیْہِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَقِرَانُہٗ تَعَالٰی اَذَاہُ بِاَذَاہُ وَلَا خِلَافَ

فِیْ قَتْلِ مَنْ سَبَّ اللّٰہَ....وَقَالَ فِیْ قَاتِلِ الْمُؤمِنِ مِثْلُ ذَالِکَ فَمِنْ لَعْنَتِہٖ فِیْ الدُّنْیَا اَلْقَتْلُ ...وَقَالَ فِیْ الْمُحَارِبِیْنَ وَذَکَرَ عُقُوْبَتَھُمْ ذَالِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِیْ الدُّنْیَا.

[الشفا باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصہ او سبہ ﷺ]

ترجمہ:......''پس قرآن سے استدلال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والے پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی اذیت کو اپنی اذیت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو اذیت دینے والے کے قتل میں کسی کا اختلاف نہیں ہے (لہٰذا رسول اللہ ﷺ کو اذیت پر بھی قتل ہی کیا جائے گا کیونکہ دونوں کا ذکر ایک ہی پیرائے میں ہے) اور مومن کے قاتل کے بارے میں بھی ایسا ہی جملہ ارشاد فرمایا ہے پس دنیا میں قاتل مومن پر لعنت قتل ہے اور محاربین کے بارے میں بھی (ایسا ہی) فرمایا ہے اور انکی سزا ذَالِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِیْ الدُّنْیَا۔ دنیا میں رسوائی بتائی ہے (جو قتل ہے)''

قاضی عیاضؒ نے دنیا میں لعنت کی تشریح قتل سے کی ہے۔

علامہ سعدیؒ تفسیر قرآن تیسیر الکریم الرحمان میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِیْ الدُّنْیَا اَنَّہٗ یُحْتَمُّ قَتْلُ مَنْ شَتَمَ الرَّسُوْلَ وَآذَاہُ.[تیسیر الکریم الرحمان للسعدی]

ترجمہ......'': دنیا میں ان پر اللہ کی لعنت یہ ہے کہ جس نے بھی اللہ کے رسول ﷺ کو گالی دی اور اذیت پہنچائی اسکو بالیقین قتل کیا جائے گا۔''

تفسیر ابن عباسؓ میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے۔

عَذَّبَھُمُ اللّٰہُ (فِی الدُّنْیَا) بِالْقَتْلِ والاجلاء(وَالْآخِرَۃِ)فِی النَّارِ.[۴۶۲]

احادیث رسول سے سزا کا ثبوت:

واقعاتی احادیث کے بارے میں غامدی صاحب کا کہنا ہے یہ سند کے لحاظ سے نا قابل التفات ہیں، جبکہ اس مسئلہ کے متعلق وارد احادیث کے بارے میں علامہ ابن قیمؒ کی رائے یہ ہے:

وَفِیْ ذَالِکَ بِضْعَۃَ عَشَرَحَدِیْثاً مَابَیْنَ صِحَاحٍ وَحِسَانٍ وَمَشَاھِیْرَ وَھُوَ اِجْمَاعُ الصَّحَابَۃِ.

[زاد المعاد لابن القیم فصل فی قضایا فی من سبہ]

ترجمہ......'': اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دس سے زیادہ احادیث مروی ہیں جو صحیح اور حسن اور مشہور کا درجہ رکھتی ہیں اور یہی صحابہؓ کا اجماع ہے۔''

جن ایک دو احادیث کو موصوف درست مانتے ہیں ان کو ان کے موقع سے ہٹا کر اپنا مصداق بنانے کے لیے ابن اسحاق اور عام مؤرخین سے سہارا ڈھونڈتے ہیں، کم ازکم غامدی صاحب جیسے محقق (مدعی تحقیق) اور (بزعم خود) احادیث کے معاملہ میں انتہائی حساس شخصیت کو قطعاً یہ زیبا نہیں۔

پھر دلچسپ امر یہ ہے کہ اِن نا قابل التفات میں سے صرف ایک بعید المستد ل واقعہ کو تفصیلاً بیان کر دیتے ہیں۔اور جو نا قابل التفات واقعات تاویل کی گنجائش نہیں رکھتے تھے، اُن کو ذکر تک نہیں کرتے، کیونکہ حصول مقصد پر وہی ایک پورا اُترتا تھا۔ان تمام احادیثی واقعات کو تکثیر فائدہ کے لیے بحوالہ لکھا جارہا ہے۔

حدیث نمبر ۱:

سیدنا علیؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ سَبَّ نَبِیّاً مِنَ الْاَنْبِیَاءِ فَاقْتُلُوْہُ وَمَنْ سَبَّ وَاحِداً مِنْ اَصْحَابِیْ فَاجْلِدُوْہُ۔(فوائد تمام باب من سب نبیا من الانبیاء ولفظه ایضاً)(المعجم الصغیر للطبرانی حدیث نمبر ٦٦٠)[کشف الخفاء حدیث نمبر ١٤٤٥ باب حرف السین المهمله ولفظه ومن سبنی فاقتلوه]

ترجمہ:......''جو کسی نبی کو گالی دے اس کو قتل کردو اور جو میرے کسی صحابی کو گالیاں دے اس کو کوڑے لگاؤ۔''

مذکورہ حدیث علیؓ کی تائید قول عمرؓ سے بھی ہوتی ہے جس کو سند صحیح کیساتھ کنز العمال میں ' امالی لابن الحسن کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔

مَنْ سَبَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَوْ اَحَداً مِنَ الْاَنْبِیَاءِ فَاقْتُلُوْہُ.

[کنز العمال حدیث:٣٥٤٦٥ وقال سنده صحیح]

ترجمہ:......''جس نے رسول اللہ ﷺ یا کسی بھی نبی کو گالی دی اس کو قتل کردو۔''

حدیث نمبر۲:

سیدنا علیؓ روایت کرتے ہیں:اِنَّ یَھُوْدِیَّۃً تَشْتُمُ النَّبِیَّ ﷺ کہ ایک یہودیہ نبی ﷺ کو برا بھلا کہتی تھی،ایک صحابیؓ نے اس کا گلا گھونٹ دیا حتی کہ وہ مرگئی۔ فَاَبْطَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ دَمَھَا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا خون معاف کردیا۔[ابوداؤد حدیث نمبر٤٣٦٢باب الحکم فیمن سب النبیؐ]

حدیث نمبر۳:

سیدنا عکرمہؓ روایت کرتے ہیں: اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ سَبَّہٗ رَجُلٌ. کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کو گالی دی تھی، آپ ﷺ نے صحابہ کو مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔مَنْ یَّکْفِیْنِیْ عَدُوِّیْ. میری حرمت و ناموس کیلئے میرے دشمن سے کون نمٹے گا؟ سیدنا زبیرؓ کہنے لگے:یا رسول اللہ ﷺ!میں حاضر ہوں، پس سیدنا زبیرؓ نے اس گستاخ رسول کا کام تمام کردیا۔ (فَقَتَلَہُ الزُّبَیْرُ فَاَعْطَاہُ النَّبِیُّ سُلُبَہٗ) اس گستاخ رسول کے پاس سے چھینا گیا سارا مال رسول اللہ ﷺ نے سیدنا زبیرؓ کو دے دیا۔

[مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ٩٧٠٤ باب من سب النبی ﷺ کیف یصنع به]

حدیث نمبر٤:

عروہ بن محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ: اِنَّ اِمْرَأَةً كَانَتْ تَسُبُّ النَّبِیَّ ﷺ کہ ایک عورت نبی ﷺ کو گالیاں دیتی تھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ يَكْفِينِي عَدُوِّيْ. میری ناموس کیلئے میری دشمن کا کام کون تمام کرے گا۔ فَخَرَجَ اِلَيْهَا خَالِدُ بْنُ وَلِيْدٍ فَقَتَلَهَا . سیدنا خالد بن ولیدؓ کھڑے ہوئے اور اس شاتمہ رسول ﷺ کو قتل کر دیا۔

[مصنف عبدالرزاق حدیث: ٩٧٠٥ باب من سب النبیؐ کیف یصنع به][الاحوال لابن زنجویه]

حدیث نمبر٥:

سیدنا سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں: اِنَّ رَجُلاً كَذَبَ النَّبِیَّ ﷺ کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ کو جھٹلایا، رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علیؓ اور سیدنا زبیرؓ کو فرمایا۔ فَاِنْ اَدْرَكْتُمَا فَاقْتُلَاهُ. اگر تم اسکو پالو تو قتل کر دو۔ [مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ٩٧٠٧]

حدیث نمبر٦:

سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: هَجَتْ اِمْرَأَةٌ مِنْ خِطْمَةِ النَّبِیَّ ﷺ . کہ بنی خطمہ کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مَنْ لِیْ بِهَا؟ میری ناموس کیلئے اس سے کون نمٹے گا؟ تو اس عورت کے قبیلہ کے ایک غیور صحابیؓ کہنے لگے: اَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! یا رسول اللہ ﷺ یہ خدمت میں سرانجام دیتا ہوں۔ لہٰذا اس گستاخہ وشاتمہ رسولؐ پر حملہ کیا اور اس کو قتل کر دیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ لَا يَنْتَطِحُ فِيْهَا عَنْزَانِ۔ کہ یہ معاملہ قاتل سے پوچھ گچھ کے حوالہ سے اتنا صاف ہے کہ اس بارے میں دو بھیڑیں بھی سر نہیں ٹکرائیں گی۔ (مطلب یہ ہے کہ اس عورت کو قتل کرنا عین حق تھا، لہٰذا اس کے قاتل کو بری کیا جاتا ہے۔)

(سبل الهدی والرشاد الباب الرابع فی بیان قتل الساب اذا کان ممن یدعی الاسلام)(الشفا لقاضی عیاض الباب فی بیان ما هو فی حقه صلی الله علیه وسلم سب او نقص من تعریض)

حدیث نمبر٧:

نضر بن حارث رسول اللہ ﷺ کو شدید تکلیف پہنچاتا اور لوگوں کو آپ ﷺ کے خلاف عداوت پر اکساتا تھا سیدنا عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں كَانَ النَّضْرُ بْنُ الْحَارِثِ بْنِ الْكَلْدَةِ مِنْ شَيَاطِيْنِ قُرَيْشٍ وَكَانَ يُؤْذِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَيَنْصِبُ لَهُ الْعَدَاوَةَ (تفسیر طبری تحت آیۃ (٥-٦-الفرقان)

ترجمہ: نضر بن حارث بن کلدہ قریش کے شیطانوں میں سے تھا اور رسول اللہ ﷺ کو اذیت دیتا تھا۔ لوگوں کو آپ کی دشمنی پر ابھارتا تھا۔ اس نے حیرہ جا کر فارس کے بادشاہوں رستم اور اسفندیار کے قصے اور کہانیاں معلوم کیں۔ جب کبھی رسول اللہ ﷺ مجلس وعظ قائم کرتے اللہ اور اس کی نافرمان سابقہ اقوام کا اور ان کی جزاء وسزا کا ذکر کرتے تو آپ ﷺ کی مجلس کے بعد یہ مجلس قائم کرتا اور لوگوں کو کہتا اب میرے پاس آؤ میں تمہیں فارس کے بادشاہوں رستم اور اسفندیار کی باتیں سناتا ہوں اور کہتا۔ وَاللّٰهِ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ أَنَا أَحْسَنُ حَدِيثاً مِنْهُ۔ اللہ کی قسم اے قریش میری بات محمد کی بات سے اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آٹھ آیات اس بدبخت کے بارے میں نازل کیں۔"

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ترجمہ......" اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کے بارے میں بے علم جھگڑا کرتا ہے یہ آیت مبارکہ بھی نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی (تفسیر طبری تحت آیہ (۵۔۶۔الفرقان) معلوم ہوا کہ یہ آدمی اللہ اور اسکے رسول کا اعلانیہ دشمن اور شاتم تھا)

غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ قید ہو گیا جب لشکر اسلام کفار قیدیوں کو لے کر واپس مدینہ کی طرف روانہ ہوا تو مقام صفراء پر پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ نضر بن حارث کو قتل کر دیا جائے۔ سیدنا علی بن ابی طالب ؓ تلوار لے کر آگے بڑھے اور اس کو قتل کر دیا [البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۳۰۱/۳ تا ۳۰۳]

جب آپ ﷺ نے نضر بن حارث کو قتل کرنے کا حکم دیا تو سیدنا مقداد ؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ میرا قیدی ہے (چونکہ اسکو سیدنا مقداد ؓ نے قید کیا تھا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إِنَّهُ كَانَ يَقُولُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ وَفِي رَسُولِهِ مَا كَانَ يَقُولُ. اسکو اس لیے قتل کیا جا رہا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب اور اسکے رسول ﷺ کے بارے میں زبان کھولا کرتا تھا۔ [تفسیر طبری لابن جریر عن سعید بن جبیر ؓ حدیث نمبر ۱۵۹۸۰ تحت آیت الانفال الرقم ۳۱]

بدر کے قیدیوں میں سے صرف دو کو بنا بر اذیت شدید قتل کیا گیا تھا ایک تو یہی تھا اور دوسرے کا ذکر آگے آرہا ہے۔

حدیث نمبر ۸:

عقبہ بن ابی معیط بھی رسول اللہ ﷺ کا شدید ترین دشمن تھا، ساری زندگی آپ ﷺ کی ایذاء رسانی اور عداوت میں گزاری، سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک دن کے علاوہ کبھی بددعا کرتے نہیں سنا' جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کی ایک جماعت بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ہی اونٹنی کی اوجڑی پڑی تھی، وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اس اوجڑی کو کون اٹھا کر محمد ﷺ پر پھینکے گا؟ قریش کی اس جماعت میں سے یہی بدبخت عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اوجڑی اٹھا کر جب آپ سجدہ

ہیں گئے تو آپ ﷺ پر ڈال دی، وہ اتنی زیادہ تھی کہ آپ اس کے بوجھ سے سجدہ ہی میں پڑے رہے، قریش کے یہ بدنصیب زور زور سے ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے پر بسبب ہنسی لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ آپ کی لخت جگر سیدہ فاطمۃ الزہرا جو چھوٹی بچی تھی آئیں اور اس اوجڑی کو آپ پر سے ہٹایا ان کو برا بھلا کہا رسول اللہ ﷺ نے اس دن حالت غم میں بددعا کی۔ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِهٰذَا الْمَلَاءِ مِنْ قُرَيْشٍ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ. اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ . اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِاَبِيْ جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ . اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِاُبَيِّ بْنِ خَلَفٍ اَوْاُمَيَّةَ بْنِ خَلَفٍ. اے اللہ! قریش کی اس جماعت کو اپنی گرفت میں لے لے۔ اے اللہ تو عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عقبہ بن ابی معیط، امیہ بن خلف کو اپنی گرفت میں لے لے۔ (البدایہ والنہایہ لابن کثیر ولفظہ ایضاً (بخاری) حدیث نمبر ۲۹۳۸ باب طرح جيف المشركين فی البئر ولا يوخذ لهم ثمن) اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو غزوہ بدر والے دن ذلت و رسوائی کے مقام پر فائز کر دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نامراد قرار پائے۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے بدبخت نے رسول اللہ ﷺ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اس قدر دبایا کہ رسول اللہ ﷺ شدید تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ سیدنا ابوبکرؓ نے اس کو آپ ﷺ سے دفع کیا۔

[بخاری حدیث نمبر ۳۴۰۲ باب قول النبی ﷺ لو كنت متخذا خليلاً]

عقبہ بن ابی معیط مسلمانوں کے ہاتھ غزوہ بدر میں قید ہوا، جب رسول اللہ ﷺ مع قیدی بدر سے مدینہ کی طرف لوٹے تو مقام عرق الظبیہ پر پہنچ کر حکم دیا کہ عقبہ بن ابی معیط کو بھی قتل کر دیا جائے۔ سیدنا عاصم بن ثابت بن ابی افلح نے اس بدبخت کو قتل کیا [البدایہ والنہایہ لابن کثیر: ۳/۳۰۱ تا ۳۰۳] جب اس کو قتل کیا جانے لگا تو اس نے پوچھا: اے جماعت قریش مجھے کس بناء پر تمہارے درمیان حالت قید میں قتل کیا جا رہا ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: عَلٰى عَدَاوَتِكَ اللّٰهِ وَرَسُوْلَه۔ تجھے اللہ اور اس کے رسولؐ سے عداوت کی بناء پر قتل کیا جا رہا ہے۔ [دلائل النبوة للبيهقی، حدیث: ۹۷۱]

حدیث نمبر۹:

عصماء بنت مروان بھی شاتمہ رسولؐ اور موذیہ تھی، ابن سید الناسؒ اس کی گستاخی کا ذکر یوں کرتے ہیں: كَانَتْ تَعِيْبُ الْاِسْلَامَ وَاَهْلَهٗ وَتُوْذِى النَّبِيَّ وَتُحَرِّضُ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُ الشِّعْرَ. اسلام اور اہل اسلام کی عیب جوئی کرتی تھی۔ نبی ﷺ کو اذیت دیتی تھی اور لوگوں کو آپ کے خلاف ابھارتی تھی اور آپ کی ہجو میں شعر پڑھتی تھی۔ [عیون الاثر]۔ جب رسول اللہ ﷺ تک اس کی گستاخی پہنچی تو آپ ﷺ

نے ارشاد فرمایا۔ اَلَا آخِـذٌلِّیْ مِنْ اِبْنَةِ مَرْوَانَ. کیا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو میری حرمت و ناموس کیلئے مروان کی بیٹی کا کام تمام کردے۔؟ سیدنا عمیر بن عدیؓ جو نابینا صحابیؓ تھے آقا علیہ السلام کی یہ درد بھری آواز سن رہے تھے، رات کے وقت عصماء کے گھر داخل ہو گئے اور عصماء کو قتل کردیا۔ صبح کو دربار رسالتؐ میں حاضری دی اور خوشخبری سنائی. اِنِّیْ قَدْ قَتَلْتُهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ. یارسول اللہ ﷺ میں نے عصماء کو قتل کردیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا۔ نَـصَـرْتَ اللّٰـهَ وَرَسُوْلَهٗ یَا عُمَیْرُ. اے عمیر تو نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی مدد کی ہے، سیدنا عمیر بن عدیؓ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس بارے میں مجھ سے سوال تو نہیں ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا یَـنْـتَـطِـحُ فِیْهَـا عَـنْـزَانِ. اس بارے میں دو بھیڑیں بھی سر نہیں ٹکرائیں گی۔ (مطلب یہ ہے کہ آپ نے عمل حق کیا ہے اس بارے میں سوال نہیں ہوسکتا۔)

[الروض الأنف للسهيلي باب غزوه عمير بن عدى الخطمي لقتل عصماء بنت مروان]

واقدیؒ نے مغازی میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حاضرین کو مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

اِذَا اَحْبَبْتُمْ اَنْ تَنْظُرُوْا اِلٰی رَجُلٍ نَصَرَا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ بِالْغَیْبِ فَانْظُرُوْا اِلٰی عُمَیْرِ بْنِ عَدِیٍّ.

جب تم ایسے بندے کو دیکھنا چاہو جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی غائبانہ مدد کی ہے تو عمیر بن عدی کو دیکھ لو۔

ابو نعیم اصبہانیؒ نے الاصابة فی معرفة الصحابة میں نقل کیا ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ سَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْبَصِیْرَ۔

ان کا نام رسول اللہ ﷺ نے بصیر (دیکھنے والا، رکھ دیا تھا کیونکہ یہ نابینا تھے۔)

حدیث نمبر ۱۰:

ابو عفک رسول اللہ ﷺ کا دشمن اور دریدہ دہن تھا' جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس وقت اس کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ غزوہ بدر میں جب مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے فتح یاب کیا، ابو عفک حسد ور بغض کی آگ میں جل بھن گیا اور اپنی عداوت کو اذیت رسول ﷺ کی شکل میں ظاہر کرنا شروع کردیا۔

علامہ ذہبیؒ نے اپنی تصنیف تاریخ الاسلام میں لکھا ہے: کَـانَ یُؤْذِی النَّبِـیَّ ﷺ یَـقُـوْلُ الشِّـعْـرَ وَیُحَرِّضُ عَلَیْهِ. ابو عفک رسول اللہ ﷺ کو اذیت دیتا تھا آپ کی ہجو میں شعر پڑھتا اور آپ کی عداوت پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔

ابن المطہرؒ البدء والتاریخ میں لکھتے ہیں: یَهْجُوْا لنَّبِیَّ ﷺ وَیُحَرِّضُ عَلَیْهِ. ابو عفک نبی ﷺ کی ہجو کرتا اور لوگوں کو آپ کی عداوت پر تیار کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ تک جب اس کی گستاخی اور دریدہ دہنی کی

خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ۔مَنْ لِی بِھٰذَا الْخَبِیْثِ. میری حرمت اور ناموس کیلئے اس خبیث سے کون نمٹے گا؟ فَخَرَجَ سَالِمُ بْنُ عُمَیْرٍ. سیدنا سالم بن عمیرؓ حکم رسول کی تکمیل میں اس کو قتل کرنے کیلئے روانہ ہوئے ۔سیدنا سالم بن عمیرؓ بڑے زاہد اور خوف خدا سے اکثر رونے والے صحابہ میں سے تھے ۔حکم رسول ﷺ سے پہلے بھی فرمایا کرتے تھے: عَلَیَّ نَذْرٌ اَنْ اَقْتُلَ اَبَا عِفْکٍ اَوْ اَمُوْتَ دُوْنَہٗ. میں نے یہ منت مانی ہے کہ یا تو اس دریدہ دہن ابوعفک کو قتل کردوں یا پھر خود مارا جاؤں ۔بالآخر سیدنا سالم بن عمیرؓ اس کے گھر پہنچے، گرمیوں کا موسم تھا، ابوعفک رات کو اپنے گھر کے صحن میں سویا ہوا تھا، سیدنا سالم بن عمیرؓ نے اپنی شمشیر باضمیر سے اس پر وار کیے اور منحوس شاتم رسول کو اپنے انجام تک پہنچادیا۔

[مغازی الواقدی باب سریة قتل ابی عفك) (الطبقات الکبریٰ لابن سعد:۲/ ۲۸، باب سریة سالم بن عمیر)(عیون الاثر:۲/ ۳۱٤)(المنتظم لابن الحوزی باب سریة سالم بن عمیرؓ) (الروض الانف للسهیلی باب سریة سالم بن عمیر لقتل ابی عفك)(اسد الغابة فی معرفة الصحابه باب فی امامة المذیدیه]

حدیث نمبر ۱۱:

خالد بن سفیان ہذلی رسول اللہ ﷺ کا موذی دشمن تھا، اسکو بھی بناء بر اذیت رسول اللہ ﷺ نے خود حکم دے کر قتل کروایا تھا ۔آپ ﷺ نے اعلان کیا 'مَنْ لِسُفْیَانِ الْھُذَلِیِّ یَھْجُوْنِیْ وَیَشْتُمُنِیْ وَیُوْذِیْنِیْ ۔طبرانی کی دوسری روایت میں آپکے یہ الفاظ منقول ہیں' مَنْ مِنْ خَالِدِ الْھُذَلِیِّ ۔میری حرمت وناموس کیلئے خالد بن سفیان کو کون قتل کرے گا؟ وہ میری ہجو کرتا ہے اور مجھے سب وشتم کرتا ہے اور مجھے اذیت دیتا ہے ۔! سیدنا عبداللہ بن انیسؓ کھڑے ہوئے عرض کی اَنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ! یارسول اللہ ﷺ! اس خدمت کیلئے غلام تیار ہے ۔پس رسول اللہ ﷺ نے انکو اس مہم کیلئے روانہ فرمادیا سیدنا عبد اللہ بن انیسؓ اٹھارہ دن بعد تیئس محرم بروز ہفتہ دربار رسالتؐ میں کامیاب ہوکر واپس لوٹے 'وَجَاءَ ہٗ بِرَاْسِہٖ فَوَضَعَہٗ بَیْنَ یَدَیْہِ اور خالد بن سفیان کا گندی زبان رکھنے والا سر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دیا ۔آپ ﷺ نے جب یہ ماجرا دیکھا تو آپکی خوشی کے الفاظ علامہ ہیثمیؒ نے مجمع الزوائد میں یوں نقل کیے ہیں ۔کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اَفْلَحَ الْوَجْہُ ۔عبداللہ کامیاب ہوگیا ۔رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عصا مبارک تھا آپنے وہ عصا بطور انعام عبداللہ بن انیسؓ کو عطا کردیا' اور ارشاد فرمایا' تَخَصَّرْ بِھٰذِہٖ فَاِنَّ الْمُتَخَصِّرِیْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قَلِیْلٌ. اے عبداللہ اس عصا کے ساتھ تو چلنا یا در کھ قیامت والے دن عصا کے ساتھ چلنے والے بہت کم لوگ ہونگے' وَھٰذِہٖ آیَۃٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ. اے عبداللہ یہ عصا تیرے اور میرے درمیان قیامت والے دن علامت ہوگا ۔سیدنا عبداللہؓ نے موت تک اس عصا کی حفاظت

کی' فَلَمَّا حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ اَوْصٰى اَنْ تُجْعَلَ مَعَهُ فِيْ اَكْفَانِهِ. جب موت کا وقت آیا تو وصیت کی کہ اس عصا کو میرے کفن میں بند کر کے میرے ساتھ ہی دفن کر دینا، لہٰذا ایسا ہی کر دیا گیا۔

[المعجم الكبير للطبراني حديث:١٠١-٩٧ ......زادالمعاد لابن قيم ......الطبقات الكبرى لابن سعد:٣٥/٢ ......البداية والنهاية:١٤٠/٤]

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے سیدنا عبداللہؓ کہتے ہیں کہ بعد از قتل میں رات کو سفر کرتا تھا اور دن کو کسی غار میں چھپ جاتا تھا ایسا بھی ہوا کہ دشمن میری تلاش میں غار کے منہ پر پہنچ گیا لیکن غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا دشمن یہ سمجھ کر کہ اس غار میں کوئی نہیں ہے واپس چلا گیا۔[سیرۃ المصطفیٰ للکاندھلوی:۲/۲۷۷]

حدیث نمبر۱۲:

کعب بن اشرف یہودی رسول اللہ ﷺ کو بہت اذیت دیتا تھا رسول اللہ ﷺ نے اسکے قتل کو ان الفاظ کے ساتھ طلب کیا' مَنْ لِيْ كَعْبَ بْنَ الْاَشْرَفِ فَاِنَّهُ قَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ. کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا؟ اس نے اللہ اور اسکے رسول کو بہت اذیت دی ہے، سیدنا محمد بن مسلمہؓ کھڑے ہوئے، کہنے لگے: یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے میں اسکو قتل کرتا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو روانہ کر دیا۔ سیدنا ابو نائلہؓ جو کعب بن اشرف کے دودھ شریک بھائی تھے اور چند دوسرے صحابہ بھی اس مہم میں سیدنا محمد بن مسلمہؓ کے ساتھ تھے، ان تمام صحابہ کرام نے اسکو قتل کیا' اسکا سر تن سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے لیا اور دربار رسالت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا' اَفْلَحَتِ الْوُجُوْهُ. یہ چہرے کامیاب ہو گئے' وَرَمَوْا رَاْسَهُ بَيْنَ يَدَيْهِ. کعب کا سر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ فَحَمِدَاللّٰهَ عَلٰى قَتْلِهِ. آپ نے اسکے قتل پر اللہ کی تعریف کی۔[بخاری حدیث:۳۷۳۱ باب قتل كعب بن اشرف وشرحه فتح الباري لابن الحجر]

حدیث نمبر ۱۳:

ابورافع یہودی بھی رسول اللہ ﷺ کے بڑے دشمنوں میں سے تھا، آپکو شدید اذیت پہنچاتا تھا، كَانَ اَبُوْرَافِعٍ يُؤْذِيْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ وَيُعِيْنُ عَلَيْهِ۔ آپکو اذیت دیتا تھا اور لوگوں کو آپکے خلاف عداوت پر ابھارتا تھا' بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلٰى اَبِيْ رَافِعِ الْيَهُوْدِيِّ رِجَالاً مِنَ الْاَنْصَارِ فَاَمَّرَ عَلَيْهِمْ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَتِيْكٍؓ. رسول اللہ ﷺ نے ابورافع کے قتل کیلئے انصار کی ایک جماعت کو روانہ کیا' اور انکا امیر سیدنا عبداللہ بن عتیکؓ کو بنایا، سیدنا عبداللہ بن عتیکؓ بڑی ہنرمندی سے رات کو اس کے قلعہ میں داخل ہوئے اور اسکو قتل کر کے واپس سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ ایک سیڑھی سے پاؤں پھسل گیا' اور پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی، انہوں نے رومال سے پنڈلی کو باندھ لیا اور اپنے ساتھیوں کو آکر خوشخبری سنائی۔ تمام

ساتھی دربار رسالت مآب ﷺ میں پہنچے' بیہقی کی روایت میں ہے کہ جب یہ مجاہد رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے' جب آپ ﷺ کی نظر ان پر پڑی تو آپ نے ارشاد فرمایا' اَفْلَحَتِ الْوُجُوْهُ. یہ چہرے کامیاب ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبد اللہؓ سے تلوار لے کر صحابہؓ کو بتایا کہ یہ دیکھو اس تلوار کو اسکے پیٹ کا کھانا لگا ہوا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبد اللہ بن عتیکؓ کو حکم دیا' اُبْسُطْ رِجْلَکَ. اے عبد اللہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ لمبی کرو۔ سیدنا عبد اللہؓ فرماتے ہیں۔ فَبَسَطْتُ رِجْلِیْ فَمَسَحَهَا فَکَاَنَّهَا لَمْ اِشْتَکِهَا قَطُّ۔ میں نے اپنی ٹانگ لمبی کی رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیر دیا' میری ٹانگ ایسی ہو گئی جیسے مجھے کبھی تکلیف ہوئی ہی نہیں تھی۔

[بخاری حدیث :۳۷۳۳ باب قتل ابن رافع عبداللہ بن ابی الحقیق ......سنن الکبری للبیھقی......معرفۃ الآثار والسنن للبیھقی حدیث :۱۷۸۵ ......الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم اصبھانی حدیث : ۳۹۰۴]

حدیث نمبر۱۴:

عبد اللہ بن خطل اسکی دو لونڈیاں اور اسکے ساتھ چند لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی شدید ہجو کرتے تھے۔ شعر و شاعری میں آپکی گستاخی گاتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ ارشاد فرمایا جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسکو بھی امن ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسکو بھی امن ہے، لیکن ان دریدہ دہن لوگوں کو معافی نہ دی بلکہ اعلان کر دیا اُقْتُلُوْهُمْ وَاِنْ وَجَدْتُمُوْهُمْ مُتَعَلِّقِيْنَ بِاَسْتَارِ الْكَعْبَةِ۔ انکو اگر تم کعبہ کے پردوں کیساتھ چمٹا ہوا بھی پاؤ تو بھی قتل کر دو کسی نے آ کر خبر دی یا رسول اللہ ﷺ ابن خطل کعبہ کے پردوں کیساتھ چمٹا ہوا ہے آپ نے ارشاد فرمایا اُقْتُلُوْهُ اسکو (وہیں) قتل کر دو پس اسکو وہیں سیدنا سعید بن حریثؓ اور عمار بن یاسرؓ نے قتل کر دیا۔ [نسائی حدیث :۳۹۹۹ باب الحکم فی المرتد' حدیث :۲۸۱۸ باب دخول مکۃ بغیر احرام......بخاری حدیث :۲۸۱۷ باب قتل الاسیر وقتل الصبر]

اہانت رسول اتنا سخت گناہ ہے کہ اسکے مرتکب کو جائے امن بیت اللہ بھی پناہ نہیں دے سکتا۔

ان مذکورہ افراد کو معافی نہ ملنے کا سبب اذیت رسول تھا اسکی ایک دلیل سیدنا بجیر بن زہیرؓ کا وہ خط بھی ہے جو انہوں نے فتح مکہ کے ایام میں رسول اللہ ﷺ کی مدینہ واپسی پر اپنے بھائی کعب بن زہیر کو لکھا تھا اس خط میں بجیرؓ نے ان الفاظ کیساتھ اپنے بھائی کو ڈرایا تھا۔ قَتَلَ رِجَالاً بِمَكَّةَ مِمَّنْ كَانَ يَهْجُوْهُ وَيُؤْذِيْهِ وَاِنَّهُ مَنْ بَقِيَ مِنْ شُعَرَاءِ قُرَيْشٍ اِبْنُ الزِّبَعْرٰى، وَهُبَيْرَةُ بْنُ اَبِيْ وَهْبٍ قَدْ هَرَبُوْا فِيْ

كُلِّ وَجْهٍ. ترجمہ:......''رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو قتل کر دیا ہے جو آپ کی ہجو کرتے تھے اور آپکو اذیت دیتے تھے' اور اب ان میں سے قریش کے شعراء ابن الزبعری اور ہبیرہ بن ابی وہب باقی ہیں جو اِدھر اُدھر بھاگ چکے ہیں۔'' [المستدرك للحاكم حديث :٦٥٥٧ باب ذكر كعب وبجير ابني زهير......معرفة الصحابة لابي نعيم حديث :١١٦٨ ......المعجم الكبير للطبراني حديث :١٥٧٣٥]

علامہ ابن قیمؒ اور امام طبرانیؒ لکھتے ہیں وَاَمَّنَ النَّاسَ يَوْمَ الْفَتْحِ اِلَّا نَفَرًا مِمَّنْ كَانَ يُؤْذِيْهِ وَيَهْجُوْهُ وَهُمْ اَرْبَعَةُ رِجَالٍ وَاِمْرَاَتَانِ ۔ترجمہ:......''فتح مکہ والے دن رسول اللہ ﷺ نے تمام لوگوں کو امن دے دیا تھا مگر چند وہ لوگ جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتے تھے اور آپکو اذیت دیتے تھے انکو امن نہ دیا اور وہ چار مرد اور دو عورتیں تھیں۔[زادالمعاد لابن القيم فصل في قضائه في من سب رسول الله ﷺ......المعجم الاوسط للطبراني حديث :٨٣٠١]

حدیث نمبر۱۵:

سیدنا عمیر بن امیہ رضی اللہ عنہ کا اکثر خاندان مشرک تھا، اُن کی بہن نے رسول اللہ ﷺ کو نازیبا الفاظ کہہ کر اذیت پہنچائی۔ آذَتْهُ وَشَتَمَتِ النَّبِيَّ وَكَانَتْ مُشْرِكَةً. سیدنا عمیر بن امیہؓ سے ناموس رسالت کی پامالی پر صبر نہ ہو سکا اپنی حقیقی بہن کو گستاخی رسالت مآب ﷺ کے جرم میں قتل کر دیا لیکن خاندان کو فی الوقت قاتل کا علم نہ ہو سکا۔ چند دن بعد حضرت عمیر بن امیہؓ نے سوچا کہ اگر میں نے قتل کو ظاہر نہ کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر قاتل کو بدلہ میں قتل کر دیا جائے کیونکہ اہل قبیلہ قتل کی تفتیش میں لگے ہوئے تھے۔ سیدنا عمیر بن امیہؓ دربار رسالتؐ میں پہنچے اور عرض گزار ہوئے یا رسول اللہ ﷺ میں نے اپنی بہن کو قتل کر دیا ہے' لِاَنَّهَا كَانَتْ تُؤْذِيْنِيْ فِيْكَ. کیونکہ وہ آپ کی ذات اقدس کو اذیت پہنچا کر مجھے اذیت دیتی تھی۔ فَاَخْبَرَهُمْ بِيْ وَاَهْدَرَ دَمَهَا ۔رسول اللہ ﷺ نے خاندان والوں کو میرے قتل کی اطلاع بھی کر دی اور مجھ سے اس گستاخ بہن کا خون بھی معاف کر دیا۔[الديات لابن ابي عاصم حديث:٢٥٥ باب إذا قتل ساب النبيّ فلادية ولاقود...... المعجم الكبير للطبراني حديث:١٣٥٩٢ ...... قال الهيثمي في مجمع الزوائدعن هذا الحديث رواه الطبراني عن تابعين أحدهما ثقة وبقية رجاله ثقات]

حدیث نمبر۱۶:

ایک نابینا صحابیؓ کی ام ولد (لونڈی ۔ بیوی) جو مسلسل رسول اللہ ﷺ کو سب و شتم کرتی تھی۔ فَيَنْهَاهَا فَلَا تَنْتَهِيْ وَيَزْجُرُهَا فَلَا تَنْزَجِرُ. اس نابینا صحابی کے سمجھانے پر جب وہ نہ رکی تو انہوں نے

اس کو رات کے وقت قتل کر دیا اور بوقت صبح رسول اللہ ﷺ کو سارا واقعہ ذکر کیا اور کہا ۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَانَتْ بِیْ رَفِیْقَۃً ۔ وہ میری زندگی کی ساتھی تھی وَلِیْ مِنْھَا اِبْنَانِ مِثْلُ اللُّؤْلُؤَتَیْنِ. اور اسکے بطن سے میرے دو موتیوں جیسے بیٹے ہیں ۔ (لیکن آپ کی توہین پر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور میں نے اس کو قتل کر دیا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے موجودین صحابہؓ کو مخاطب ہو کر فرمایا' اَلَا اِشْھَدُوْا اَنَّ دَمَھَا ھَدْرٌ. گواہ ہو جاؤ میں نے اپنے اس نابینا صحابی سے اس گستاخہ کا خون معاف کر دیا ہے (آپ نے دیکھ لیا کہ ناموس رسالت میں اپنے بچوں کی ماں رفیقہ حیات بھی رکاوٹ نہ بن سکی اور پھر رسول اللہ کی اس پر تائید نے مسئلہ کو مزید واضح کر دیا) ۔

[ابو دائود حدیث : ۳۷۹۵ باب الحکم فیمن سب النبیؐ]

حدیث نمبر ۱۷ :

ابن قانعؒ کہتے ہیں کہ : ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا ۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ ! سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ فِیْکَ قَوْلاً قَبِیْحاً فَقَتَلْتُہٗ ۔ یا رسول اللہ ﷺ ! میں نے اپنے والد سے آپ کی شان میں بری بات سنی ، مجھ سے رہا نہ گیا ، میں نے اسکو قتل کر دیا ہے 'فَلَمْ یَشُقَّ ذَالِکَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ ، نبی ﷺ کو اس پر کچھ گرانی نہ ہوئی ۔

[الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصہ او سبہ علیہ السلام]

حدیث نمبر ۱۸ :

عَنْ حِزَامِ بْنِ ھِشَامِ بْنِ خَالِدِ الْکَعْبِیِّ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ : لَمَّا قَدِمَ رُکْبُ خُزَاعَۃَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ یَسْتَنْصِرُوْنَہٗ ، فَلَمَّا فَرَغُوْا مِنْ کَلَامِھِمْ قَالُوْا : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَنَّ اَنَسَ بْنَ زُنَیْمِ الدِّیْلِیَّ قَدْ ھَجَاکَ ؛ فَاَھْدَرَ دَمَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ . [اسد الغابہ باب انس بن زنیم]

ترجمہ :...... '' حزام بن ہشام اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ جب بنو خزاعہ کے سوار رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے ، آپ ﷺ سے مدد طلب کرتے تھے ، پس جب وہ اپنی گفتگو سے فارغ ہوئے تو کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ انس بن زنیم دیلی نے آپ کی ہجو کی ہے ، جس پر آپ ﷺ نے ابو زنیم کے خون کو رائیگاں قرار دیا ۔

حدیث نمبر : ۱۹

عَنْ عُرْوَۃَ قَالَ قَالَتْ عَائِشَۃُ رضی اللہ عنہا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ امْرَاَۃً مِنْ بَنِیْ فَزَارَۃَ یُقَالُ لَھَا : اُمُّ قِرْفَۃَ ، جَھَّزَتْ ثَلَاثِیْنَ رَاکِبًا مِنْ وَلَدِھَا ، وَوَلَدِ وَلَدِھَا ، وَقَالَتْ : اذْھَبُوا اِلَی الْمَدِیْنَۃِ فَاقْتُلُوا مُحَمَّدًا ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ : اَللّٰھُمَّ اَثْکِلْھَا بِوَلَدِھَا ، وَبَعَثَ اِلَیْھِمْ زَیْدَ بْنَ حَارِثَۃَ فِیْ بَعْثٍ ، فَالْتَقَوْا ، فَقَتَلَ زَیْدٌ بَنِیْ فَزَارَۃَ ، وَقَتَلَ اُمَّ قِرْفَۃَ وَوَلَدَھَا ، وَبَعَثَ بِدِرْعِھَا اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَنَصَبَہٗ بَیْنَ رُمْحَیْنِ ، وَاَقْبَلَ زَیْدٌ حَتّٰی قَدِمَ الْمَدِیْنَۃَ

۔ قَالَتْ عَائِشَةُ رضی الله عنها وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم تِلْكَ اللَّيْلَةَ فِيْ بَيْتِيْ فَقَرِعَ الْبَابُ فَخَرَجَ إِلَيْهِ يَجُرُّ ثَوْبَهُ حَتّٰى اِعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم.

[الدلائل النبوة لأبی نعیم حدیث:٤٤٣، الباب الثامن والعشرین قال الرافعی فی نصب الرایة فی تخریج أحادیث الهدایة عن هذا الحدیث حدیث حسن غریب]

ترجمہ:......''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ قبیلہ بنی فزارہ کی ام قرفہ نامی عورت نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کا تیس افراد پر مشتمل لشکر تیار کیا ہے اور انکو حکم دیا ہے کہ تم مدینہ جاؤ اور محمد ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کردو۔ رسول اللہ ﷺ نے بددعا کی، اے اللہ! اسے اسکی اولاد سمیت تباہ کردے اور سیدنا زید بن حارثہؓ کو ایک لشکر دے کر اس سے نمٹنے کیلئے روانہ کیا، حضرت زید بن حارثہؓ نے بنی فزارہ سے لڑائی شروع کی، ام قرفہ اور اسکی تمام اولاد کو قتل کیا اور اسکی زرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ بھیجی، آپ ﷺ نے اس زرہ کو نیزوں پر لٹکا دیا، پھر سیدنا زیدؓ بھی مدینہ کی طرف چلے اور مدینہ پہنچے، سیدہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ جس رات سیدنا زیدؓ مدینہ پہنچے اس رات رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تھے، دروازہ کھٹکا، رسول اللہ ﷺ اپنی چادر کو کھینچتے ہوئے باہر نکلے اور سیدنا زیدؓ سے معانقہ کیا اور انکو بوسہ دیا۔

امام سرخسیؒ نے سیر کبیر کی شرح میں جہاں اہل حرب کی عورتوں اور بچوں وغیرہ کے قتل کے عدم جواز کو دلائل سے واضح کیا ہے اسی بحث میں لکھتے ہیں **وکذالک إن کانت تعلن شتم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فلا بأس بقتلھا،** کہ اگر کوئی عورت رسول اللہ ﷺ کو اعلانیہ سب وشتم کرے تو اسکو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جواز قتل پر جو دلائل قائم کیے ہیں انمیں سیدہ عائشہؓ کی مذکورہ حدیث کو بھی مستدل کے طور پر ذکر کیا ہے۔ [شرح کتاب السیر الکبیر باب من یکرہ قتلہ من اھل الحرب من النساء وغیرھم]

سنت صحابہ سے گستاخ رسول ﷺ کی سزا (قتل) کا ثبوت:

ا۔ سیدنا ابوبکرؓ کا مذہب:

☆......عَنْ أَبِيْ بُرْزَةَ الْأَسْلَمِيِّؓ قَالَ أَغْلَظَ رَجُلٌ لِأَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِؓ فَقُلْتُ أَقْتُلُهُ فَانْتَهَرَنِيْ وَقَالَ لَيْسَ هٰذَا لِأَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ.

[سنن نسائی ولفظه ایضا حدیث:٤٠٣٤، باب الحکم فیمن سب النبی صلی الله علیه وسلم......ابو داؤد حدیث:٣٧٩٧ باب فیمن سب النبی صلی الله علیه وسلم]

ترجمہ:......''سیدنا ابو برزہ اسلمیؓ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے سیدنا ابوبکرؓ کو سخت برا بھلا کہا میں نے کہا کہ امیر المومنین میں اسکو قتل کردوں سیدنا ابوبکرؓ نے مجھے منع کردیا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی کیلئے

یہ عمل جائز نہیں۔"

یعنی صرف ذات اقدس ﷺ کو سب وشتم کرنے والے کو قتل کیا جائے گا آپ کے علاوہ کو نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ سب وشتم کرنے پر قتل کا حکم صرف رسول اللہ ﷺ ہی دے سکتے ہیں آپ کے علاوہ کسی کیلئے جائز نہیں ہے۔ معلوم ہوا سیدنا ابوبکرؓ رسالت مآب کی توہین اور گستاخی کی سزا (قتل) کا نظریہ رکھتے تھے۔

☆......امیر یمن حضرت مہاجر بن ابی امیہؓ نے سیدنا ابوبکرؓ کو پیغام بھیجا کہ "اِنَّ اِمْـرَاءَ ةً فِـيْ الرِّدَّةِ غَنَّتْ بِسَبِّ النَّبِيِّ ﷺ فَقَطَعَ يَدَهَا وَنَزَعَ ثَنِيَّتَهَا۔ کہ یہاں ایک مرتدہ عورت ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی ہے، میں نے اسکا ہاتھ کاٹ دیا ہے' اور سامنے والے دانت توڑ دیئے ہیں' سیدنا ابوبکرؓ نے پیغام بھیجا' لَوْلَا مَا فَعَلْتَ لَاَمَرْتُكَ بِقَتْلِهَا لِاَنَّ حَدَّ الْاَنْبِيَاءِ لَيْسَ بِشِبْهِ الْحُدُوْدِ. اگر تو نے یہ سزا نہ دے دی ہوتی تو میں تجھ کو اسکے قتل کا حکم دیتا کیونکہ توہین انبیاء کی سزا بقیہ حدود کی طرح نہیں ہے۔ (مطلب یہ تھا کہ انبیاءؑ کی توہین کی سزا قتل ہے)۔ [سبل الهدى والرشاد الباب الرابع فی بیان قتل الساب......الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصه او سبه علیه السلام]

۲۔ سیدنا عمرؓ کا مذہب:

عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ أُتِيَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ بِرَجُلٍ سَبَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَتَلَهُ ثُمَّ قَالَ مَنْ سَبَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَوْاَحَداً مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ فَاقْتُلُوْهُ.

[کنز العمال حدیث:۳۵۴۶۵ وقال سنده صحیح ......زادالمعاد لابن قیم عن مجاهد]

ترجمہ:......"سیدنا عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ امیر المومنین سیدنا عمرؓ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جس نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی تھی حضرت عمرؓ نے اسکو قتل کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ جو رسول اللہ ﷺ کو یا انبیاءؑ میں سے کسی نبیؑ کو گالی دے پس تم اسکو قتل کر دو۔"

۳۔ امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالبؓ کا مذہب:

☆ عَنْ عَبْدِالرَّزَّاقِ عَنِ التَّيْمِيِّ اَنَّ عَلِيًّاؓ قَالَ فِيْمَنْ كَذَبَ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ يُضْرَبُ عُنُقُهُ.

[مصنف عبدالرزاق، حدیث:۹۷۰۸ باب من سب النبی ﷺ کیف یصنع]

ترجمہ:......"سیدنا علیؓ نے فرمایا کہ جو رسول اللہ ﷺ کو جھٹلائے اسکی گردن اڑا دی جائے۔"

☆ اَنَّ رَجُلاً قَالَ فِيْ مَجْلِسِ عَلِيٍّؓ مَاقُتِلَ كَعْبُ بْنُ الْاَشْرَفِ اِلَّا غَدْراً فَاَمَرَ عَلِيٌّؓ بِضَرْبِ عُنُقِهِ۔

ترجمہ:......"ایک آدمی نے سیدنا علیؓ کی مجلس میں کہہ دیا کہ کعب بن اشرف کو دھوکا سے مارا گیا' (چونکہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے حکم سے قتل کروایا تھا تو ایسا جملہ شان رسالت کی توہین تھی کہ اسمیں

رسول اللہ ﷺ پر الزام غدر تھا) سیدنا علیؓ نے حکم دیا اس گستاخ کو قتل کر دیا جائے۔[تفسیر قرطبی تحت قول الله تعالیٰ وان نكثوا ايمانهم من بعد عهدهم الخ آیت نمبر۱۲۔۱۳۔التوبة]

۴۔سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا مذہب:

☆ عَنْ حُصَيْنِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ اَنَّ ابْنَ عُمَرَؓ مَرَّ بِرَاهِبٍ فَقِيْلَ اِنَّ هٰذَا سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ وَقَالَ لَوْ سَمِعْتُهُ لَضَرَبْتُ عُنُقَهُ اِنَّ لَمْ نُعْطِهِمُ الْعَهْدَ عَلٰى اَنْ يُّسَبَّ نَبِيُّنَا ﷺ ۔

[المطالب العالية لابن حجر العسقلانی حديث:۲۰۸۵ باب هدر دم من سب النبی ﷺ من اهل العهد......الديات لابن ابی عاصم حديث: ۲٥٤ باب اذاقتل ساب النبی ﷺ فلادية ولاقود......بغية الحارث حديث:۵۷۱ باب فيمن سب النبی ﷺ......مسند الحارث حديث:۲ ۰ ۵ باب فی من سب النبی ﷺ]

ترجمہ:......’’حضرت حصین بن عبدالرحمانؒ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ایک راہب کے یہاں سے ہوا سیدنا ابن عمرؓ کو بتایا گیا کہ اس نے شان رسالتؐ میں گستاخی کی ہے، سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میں سن لیتا تو اسکو قتل کر دیتا، ہم انکو عہد اس لئے نہیں دیتے ہیں کہ یہ ہمارے نبی ﷺ کو گالیاں دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا ابن عمرؓ گستاخی رسالت ﷺ کے مرتکب کی سزا قتل کے قائل تھے اگرچہ گستاخ ذمی ومعاہد ہی کیوں نہ ہو۔

۵۔سیدنا ابو ہریرہؓ کا مذہب:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ لَا يُقْتَلُ اَحَدٌ بِسَبِّ اَحَدٍ اِلَّا مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ.[الديات لابن ابی عاصم حديث:۲۵۲ باب ۱: قتل ساب النبی ﷺ فلا دية ولاقود]

ترجمہ:......’’سیدنا ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ کسی کو گالی دینے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا ہاں اگر کوئی نبی ﷺ کو گالی دے تو اسکو قتل کر دیا جائے گا۔‘‘

۶۔سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کا مذہب:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ اَيُّمَا مُعَاهِدٍ عَانَدَ فَسَبَّ اللّٰهَ اَوْ سَبَّ اَحَدًا مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ اَوْ جَهَرَ بِهٖ فَقَدْ نَقَضَ الْعَهْدَ فَاقْتُلُوْهُ؛ [زاد المعاد لابن القيم:٥/٤ ٥،باب له صلى الله عليه وسلم العفو عمن سبه فی حياته.]

ترجمہ:......’’حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جو معاہد (ذمی) سرکش ہوا اور اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو یا کسی بھی نبی کو اعلانیہ گالی دی پس اس نے عہد توڑ دیا لہٰذا اسکو قتل کر دو۔‘‘

سیدنا ابن عباسؓ نے بھی گستاخ رسول ﷺ کی سزا واضح کر دی کہ اسکو قتل کر دیا جائے اگرچہ وہ ذمی کافر ہی کیوں نہ ہو۔

۷۔۸سیدنا عمرو بن العاصؓ اور سیدنا عرفہؓ کا مذہب:

رَوَى اَبُو يَعْلَى بِسَنَدٍ صَحِيْحٍ عَنْ كَعْبِ بْنِ الْعَلْقَمَةِ اَنَّ عَرَفَةَ ابْنَ الْحَارِثِؓ وَكَانَتْ لَهُ صُحْبَةٌ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ كَانَ يَلْبَسُ كُلَّ يَوْمٍ ثَوْبًا لَاتَشْبَهُ الْاُخْرَى فَلَبِسَ فِى السَّنَةِ ثَلَاثَ مِئَةٍ وَسِتِّيْنَ ثَوْبًا وَكَانَ لَهُ عَهْدٌ فَدَعَاهُ عَرَفَةُ اِلَى الْاِسْلَامِ فَغَضِبَ فَسَبَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَتَلَهُ عَرَفَةُ فَقَالَ لَهُ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِؓ اِنَّهُمْ اِنَّمَا يُعَظِّمُوْنَ لِلْعَهْدِ مَاعَهِدْنَاهُمْ اَنْ يُّؤْذُوْنَا فِى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

[سبل الهدى والرشاد: ١٠/٤٥٧ ...... المطالب العالية لابن الحجر العسقلانى، حديث: ٢٠٨٦، باب هدر الدم من سب النبى ﷺ من اهل العهد.]

ترجمہ:...... ''ابو یعلیٰ نے سند صحیح کے ساتھ سیدنا کعب بن علقمہؓ سے روایت کیا ہے کہ صحابی رسول حضرت عرفۃ بن حارثؓ ایسے آدمی سے ملے جو ہر روز جدید لباس پہنتا تھا اور سال میں تین سو تیرہ جوڑے استعمال کرتا تھا اور وہ معاہد (ذمی) تھا، سیدنا عرفۃؓ نے اسکو اسلام کی دعوت دی، وہ غصہ ہو گیا اور رسالت مآب ﷺ کو گالی دینے لگا، سیدنا عرفۃؓ نے اسکو قتل کر دیا، (جب سیدنا عمرو بن العاصؓ تک خبر پہنچی) تو فرمایا کہ انکو تحفظ عہد کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور ہم انکو اس بات کا عہد نہیں دیا کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے بارے میں تکلیف دیں۔''

تو گویا کہ سیدنا عمرو بن العاصؓ نے حضرت عرفۃؓ کی حوصلہ افزائی کی اور اپنا نظریہ واضح کر دیا کہ گستاخی رسالت مآب ﷺ ذمی کافر بھی کرے گا تو اسکو قتل کیا جائے گا۔

۹۔ سیدنا ابو عبیدہ بن جراحؓ کا مذہب:

عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ كَانَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ قَتَلَ اَبَاهُ وَهُوَ مِنْ جُمْلَةِ اَسَارِىْ بَدْرٍ بِيَدِهٖ لَمَّا سَمِعَ مِنْهُ فِىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَا يَكْرَهُ وَنَهَاهُ فَلَمْ يَنْتَهِ وَنَزَلَتْ۔(آية اخيره من مجادلة) حَيْثُ قَتَلَ اَبَاهُ.

[تفسير روح المعانى للآلوسى، زاد المسير لابن الجوزى، درمنثور وغيره و لفظه آلوسى بحواله بخارى ومسلم......معجم الكبير للطبرانى حديث: ٣٦٦]

ترجمہ:...... ''سیدنا انسؓ فرماتے ہیں بدری قیدیوں میں سیدنا ابو عبیدہؓ کا والد بھی تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو نازیبا الفاظ استعمال کیے، سیدنا ابو عبیدہؓ کے منع کرنے پر بھی باز نہ آیا تو سیدنا ابو عبیدہؓ کی تلوار گستاخ والد کی گردن پر چل گئی اور انجام تک پہنچا دیا۔

۱۰۔ سیدنا محمد بن مسلمہؓ کا مذہب:

کسی حاکم وقت کے دربار میں ایک آدمی نے یہ الفاظ کہہ دیے مَاقُتِلَ كَعْبُ ابْنُ الْاَشْرَفِ اِلَّا غَدْرًا کہ کعب بن اشرف کو دھوکا سے قتل کیا گیا چونکہ کعب بن اشرف کو رسول اللہ ﷺ نے قتل کروایا تھا اس لیے سیدنا محمد بن مسلمہؓ نے ان الفاظ کو توہین رسالت سمجھا۔ ان الفاظ پر جب بڑوں کا سکوت دیکھا تو شدید غصہ ہوئے اور کہنے لگے اَيُقَالُ هٰذَا فِىْ مَجْلِسِكَ وَتَسْكُتُ۔ تمہاری مجلس میں یہ کہا جا رہا ہے اور تم

خاموش ہو وَاللّٰہِ لَاِنْ خَلَوْتُ بِہٖ لَاَقْتُلَنَّہٗ ۔خدا کی قسم اگر میں اسکے ساتھ علیحدہ ہوں تو اسکو ضرور قتل کردوں۔[تفسیر قرطبی تحت قولہ تعالی وان نکثوا ایمانھم الخ آیت ۱۲۔۱۳۔التوبہ]

اجماعِ صحابہؓ:

علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں صحابہ کرامؓ کا اس مسئلہ پر اجماع ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے:

وَفِیْ ذٰلِکَ بِضْعَۃَ عَشَرَ حَدِیْثاً مَّا بَیْنَ صِحَاحٍ وَحِسَانٍ وَمَشَاھِیْرَ وَھُوَ اِجْمَاعُ الصَّحَابَۃِ ۔اس بارے میں دس سے اوپر احادیث ہیں اور وہ سب صحیح یا حسن یا مشہور کا درجہ رکھتی ہیں اور یہی تمام صحابہؓ کا اجماع ہے۔[زاد المعاد لابن القیم فصل فی قضایا فی من سبه]

خیرالقرون کے تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے مذاہب:

سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کا مذہب:

عَنْ خُلَیْدٍ اَنَّ رَجُلاً سَبَّ عُمَرَ فَکَتَبَ عُمَرُبْنُ عَبْدِالْعَزِیْزِ اَنْ لَایُقْتَلَ اِلَّامَنْ سَبَّ النَّبِیَّ ﷺ.

[الدیات لابن عاصم باب اذ قتل ساب النبی ﷺ فلادیة ولاقود ......الاموال لابن زنجویه]

ترجمہ:......"حضرت خلیدؒ سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کو کسی نے گالی دی تو لکھ بھیجا کہ کسی کو گالی دینے پر قتل نہیں کیا جائے گا، ہاں اگر کوئی نبیؐ کو گالی دے گا تو اسکو قتل کیا جائے گا۔"

عبدالملک بن مروان کا مذہب:

عَبْدُالرَّزَّاقِ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبِیْ عَنْ اَیُّوْبَ بْنِ یَحْیٰی خَرَجَ اِلٰی عَدْنٍ فَرُفِعَ اِلَیْہِ رَجُلٌ مِّنَ النَّصَارٰی سَبَّ النَّبِیَّ ﷺ فَاسْتَشَارَ فِیْہِ فَاَشَارَ عَلَیْہِ عَبْدُالرَّحْمَانِ بْنُ یَزِیْدَ الصَّنْعَانِیِّ اَنْ یَّقْتُلَہٗ فَقَتَلَہٗ .....قَالَ فَکَتَبَ فِیْ ذَالِکَ اَیُّوْبُ اِلٰی عَبْدِ الْمَلِکِ فَکَتَبَ یُحْسِنُ ذَالِکَ۔

[مصنف عبدالرزاق حدیث نمبر ۹۷۰۶ باب من سب النبی ﷺ کیف یصنع به]

ترجمہ:......"عبدالرزاقؒ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایوب بن یحییٰؒ عدن گئے تو انکے پاس اس نصرانی کو لایا گیا جس نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی تھی، ایوب بن یحییٰؒ نے اس کے بارے میں مشورہ کیا، عبدالرحمان بن یزید الصعانیؒ نے اس کے قتل کا مشورہ دیا، لہٰذا اسکو قتل کر دیا گیا، ایوب بن یحییٰ نے امیر المومنین عبدالملک بن مروان کو جب یہ واقعہ لکھا تو انہوں نے جواب میں اس عمل کی تحسین فرمائی۔"

حنفی مسلک:

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

فَصَارَ الْحَاصِلُ اَنَّ عَقْدَ الذِّمَّۃِ لَایُنْتَقَضُ بِمَا ذَکَرُوْہُ مَا لَمْ یُشْتَرَطْ انْتِقَاضُہٗ بِہٖ فَاِذَا اُشْتُرِطَ انْتَقَضَ، وَاِلَّا فَلَا اِلَّا اِذَا اَعْلَنَ بِالشَّتْمِ اَوْ اعْتَادَہٗ لِمَا قَدَّمْنَاہُ ــــ عَنْ حَافِظِ الدِّیْنِ النَّسَفِیِّ

إِذَا طَعَنَ الذِّمِّيُّ فِي دِينِ الْإِسْلَامِ طَعْنًا ظَاهِرًا جَازَ قَتْلُهُ لِأَنَّ الْعَهْدَ مَعْقُودٌ مَعَهُ عَلَى أَنْ لَا يَطْعَنَ فَإِذَا طَعَنَ، فَقَدْ نَكَثَ عَهْدَهُ وَخَرَجَ مِنَ الذِّمَّةِ.

[ردالمحتار باب مطلب فيما ينتقض به عهد الذمي وما لا ينتقض]

ترجمہ:......''پس حاصل کلام یہ ہوا کہ عقد ذمہ انکے مذکورہ افعال کے ساتھ نہیں ٹوٹے گا' جب تک کہ انکے ساتھ ٹوٹنے کی شرط نہ کی گئی ہو اور اگر (بوقت عقد) ان افعال سے پرہیز کی شرط کردی گئی تھی تو پھر (انکی خلاف ورزی کرنے سے عہد) ٹوٹ جائیگا اور انکے شرط پر پورا اترنے کی صورت میں نہیں ٹوٹے گا' ہاں اگر وہ رسول اللہ ﷺ کو اعلانیہ سب وشتم کرتے ہیں اور اسکی عادت کر لیتے ہیں تو (ہر صورت میں شرط کی ہو یا نہ کی ہو) عقد ذمہ ٹوٹ جائیگا جیسا کہ ہم پہلے اسکو ذکر کر چکے ہیں۔ اور ایسا ہی ذکر کیا ہے حافظ الدین نسفیؒ نے کہ جب ذمی دین اسلام میں اعلانیہ طعن کرے تو اسکا قتل کرنا درست ہے' کیونکہ انکا عہد مشروط تھا اس بات کیساتھ کہ وہ طعن نہیں کریں گے پس جب انہوں نے طعن کر دیا تو تحقیق انکا عہد ٹوٹ گیا اور وہ ذمہ سے خارج ہوئے۔''

علامہ شامیؒ دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

فَلَوْ أَعْلَنَ بِشَتْمِهِ أَوْ اِعْتَادَهُ قُتِلَ وَلَوْ اِمْرَأَةٌ وَبِهِ يُفْتَى الْيَوْمَ.

[ردالمحتار:۶/۳۳۱، باب مطلب في حكم سب الذمي النبي ﷺ]

ترجمہ:......''پس اگر (ذمی) رسول اللہ ﷺ کو اعلانیہ سب وشتم کرے یا اسکی عادت کرلے تو اسکو قتل کر دیا جائے اگرچہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو اور اس زمانہ میں اسی بات پر فتوی ہے۔''

علامہ شامیؒ تیسری جگہ لکھتے ہیں:

وَالْحَاصِلُ أَنَّ الذِّمِّيَّ يَجُوزُ قَتْلُهُ عِنْدَنَا لٰكِنْ لَا حَدًّا بَلْ تَعْزِيرًا فَقَتْلُهُ لَيْسَ مُخَالِفًا لِلْمَذْهَبِ.

[رسائل ابن عابدين:۳۵۴]

ترجمہ:......''اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک گستاخ رسولؐ ذمی کو قتل کرنا جائز ہے لیکن حد کے طور پر نہیں بلکہ تعزیر کے طور پر' تو اسکا قتل ہمارے مذہب کے خلاف نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں۔

وَاخْتِيَارِيْ فِي السَّبِّ أَنْ يُقْتَلَ ...وَتَبِعَهُ ابْنُ الْهَمَّامِ قُلْتُ وَبِهِ أَفْتَى شَيْخُنَا الْخَيْرُ الرَّمْلِيُّ.

[درمختار:۲۷۹]

ترجمہ:......''میرا مذہب گالی دینے والے کے بارے میں یہ ہے کہ اسکو قتل کیا جائے' علامہ ابن ہمامؒ بھی یہی فرماتے ہیں' علامہ خیر الرملیؒ نے اسی پر فتوی دیا ہے۔''

علامہ ابن کمال پاشاؒ لکھتے ہیں:

وَالْحَقُّ اَنَّهُ يُقْتَلُ عِنْدَنَا اِذَااَعْلَنَ بِشَتْمِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ صَرَّحَ بِهِ فِي سِيَرِ الذَّخِيْرَةِ.
[رسائل ابن عابدین:۳۵۵]

ترجمہ......''اور حق بات یہ ہے کہ (ذمی) اگر اعلانیہ رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کرے ہمارے نزدیک اسکو قتل کیا جائے گا۔'' ابن ہمام فرماتے ہیں:

وَالَّذِي عِنْدِي اَنَّ سَبَّهُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ ---إِذَا أَظْهَرَهُ يُقْتَلُ بِهِ وَيُنْتَقَضُ عَهْدُهُ ، وَإِنْ لَمْ يُظْهِرْهُ وَلٰكِنْ عُثِرَ عَلَيْهِ ، وَهُوَ يَكْتُمُهُ فَلَا وَهٰذَا لِأَنَّهُ الْغَايَةُ فِي التَّمَرُّدِ وَالِاسْتِخْفَافِ بِالْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ ، فَلَا يَكُونُ جَارِيًا عَلَى الْعَقْدِ الَّذِي يَدْفَعُ عَنْهُ الْقَتْلَ.
[ردالمحتار، باب مطلب فیما ینتقض به عهد الذمی وما لا ینتقض]

ترجمہ:......''اور میرا مذہب یہ ہے کہ اگر ذمی رسول اللہ ﷺ کو اعلانیہ سب وشتم کرے تو اسکی وجہ سے اسکو قتل کیا جائے گا اور اس سے کیے گئے عہد اور ذمہ کو بھی توڑ دیا جائے گا، اور اگر وہ اعلانیہ سب وشتم تو نہ کرے لیکن اس پر کسی طریقہ سے مطلع ہوا جائے اور وہ سب وشتم کو خفیہ رکھتا ہو تو اسکو قتل نہیں کیا جائے گا اور عہد معاہدہ بھی نہیں توڑا جائے گا اور (اعلانیہ سب وشتم پر اسکو قتل کرنا) سرکشی کی انتہاء اور اسلام اور مسلمانوں کے استخفاف کی وجہ سے ہے پس وہ اس عہد پر باقی نہیں رکھا جاسکتا جو عہد اسکو قتل سے بچالے۔''

خلاصہ: جب ذمی اپنی زبان سے اس طور پر سب وشتم کرے کہ اس پر شہادت شرعی (دو عادل آدمی) قائم ہو جائے تو درحقیقت یہی اعلان کی تعریف ہے اور اگر شہادت شرعی تو قائم نہ ہو البتہ اس جرم پر اطلاع پالی گئی ہو تو یہ کیفیت اعلان سے بعید ہے اس پر قتل کرنا تو جائز نہ ہوگا البتہ بقدر شہرت جرم سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ وَيُجْتَهَدُ فِي اَدَبِهِ بِقَدْرِ شُهْرَةِ حَالِهِ۔ اسکو اس کے حال کی شہرت کے بقدر سزا کی کوشش کی جائے [تبصرة الحكام فى اصول الاقضية ومناهج الاحكام]

ابن ہمامؒ کے مذکور کلام سے اعلان کی یہی تعریف مترشح ہوتی ہے۔

فقہ مالکیؒ: خلیفہ ہارون الرشیدؒ نے جب امام مالک سے نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا حکم دریافت کیا تو یہ ارشاد فرمایا۔ مَا بَقَاءُ الْاُمَّةِ بَعْدَ شَتْمِ نَبِيِّهَا ﷺ اس امت کی کیا زندگی ہے جسکے پیغمبر کو گالیاں دی جائیں۔

[الشفا لقاضی عیاض:۳۶۳/٤،باب فی بیان ما هو فی حقه سب اور نقص]

حضرت ابومصعبؒ اور ابواولیسؒ فرماتے ہیں:

سَمِعْنَا مَالِكًا يَقُولُ مَنْ سَبَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اَوْ شَتَمَهُ اَوْ عَابَهُ اَوْتَنَقَّصَهُ قُتِلَ مُسْلِماً كَانَ اَوْ كَافِراً وَلَا يُسْتَتَابُ.[الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوه الاحکام فیمن تنقصه او سبه علیه لسلام]

ترجمہ:......''ہم نے امام مالکؒ سے سنا وہ فرما رہے تھے کہ جو رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کرے یا عیب جوئی کرے یا تنقیص کرے اس کو قتل کیا جائے گا وہ مسلمان ہو یا کافر اور اسکی توبہ بھی قبول نہیں ہے۔''

فقہ شافعیؒ : مَنْ سَبَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُقْتَلُ حَدّاً.[التھذیب:۷۰۶]

ترجمہ:......''جو شخص رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کرے اسے حداً قتل کیا جائے۔

فَاَمَّا سَبُّ الرَّسُوْلِ فَهُوَ مَا يَنْقُضُ بِهِ عَقْدُ الْهُدْنَةِ وَعَقْدُ الذِّمَّةِ .[الحاوی الکبیر:۲۳۲/۱۸]

ترجمہ:......''پس بہرحال رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کرنے سے معاہدہ اور عقد ذمہ ٹوٹ جائے گا (یعنی گستاخی رسول پر ذمی کو بھی قتل کیا جائے گا)۔''

فقہ حنبلیؒ: إِنَّ سَابَّ النَّبِيِّ ﷺ يُقْتَلُ وَلَوْ اَسْلَمَ ...فَلَا يَسْقُطُ بِتَوْبَةٍ.[الفروع:۴۸۱/۳]

ترجمہ:......''تحقیق نبی ﷺ کو سب وشتم کرنے والے کو قتل کیا جائے گا اگر چہ وہ مسلمان ہو جائے۔''

نوٹ: فقہ حنفی سے متعلق بحث محاکمہ کے عنوان میں آ رہی ہے۔

فقہاء اندلسؒ کا مذہب:

أَفْتٰى فُقَهَاءُ الْاَنْدَلُسِ بِقَتْلِ اِبْنِ حَاتِمِ الْمُتَفَقِّهِ الطُّلَيْطِلِيْ وَصُلْبِهِ بِمَا شَهِدَ عَلَيْهِ بِهِ مِنْ اِسْتِخْفَافِهِ بِحَقِّ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَتَسْمِيَتِهِ إِيَّاهُ أَثْنَاءَ مُنَاظَرَتِهِ بِالْيَتِيْمِ وَخَتَنِ حَيْدَرَةٍ وَزَعْمِهِ أَنَّ زُهْدَهُ لَمْ يَكُنْ قَصْداً وَلَوْ قَدَرَ عَلَى الطَّيِّبَاتِ أَكَلَهَا.[الشفاء لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فی من تنقصہ او سبہ علیہ السلام]

ترجمہ:......''فقہاء اندلسؒ نے ابن حاتم طلیطلی کو قتل کرنے اور اسکو سولی چڑھانے کا فتویٰ دیا کیونکہ یہ ثابت ہوگیا تھا کہ اس نے نبی ﷺ کی شان میں تحقیر کی ہے اور اپنے مناظرے کے دوران (تحقیراً) آپکو یتیم کہہ کر پکارا ہے اور اسنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ آپکا زہد اختیاری نہیں تھا بلکہ اگر آپکو دنیاوی نعمتیں میسر ہوتیں تو آپ انکا استعمال ضرور کرتے۔''

فقہاء قیروان کا مذہب:

أَفْتٰى فُقَهَاءُ الْقَيْرَوَانِ بِقَتْلِ اِبْرَاهِيْمَ الْفَزَارِيْ وَكَانَ شَاعِراً مُتَفَنِّناً فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْعُلُوْمِ وَكَانَ مِمَّنْ يَحْضُرُ مَجْلِسَ الْقَاضِيْ أَبِي الْعَبَّاسِ بْنِ طَالِبٍ لِلْمُنَاظَرَةِ فَرُفِعَتْ عَلَيْهِ أُمُوْرٌ مُنْكَرَةٌ مِنْ هٰذَا الْبَابِ فِي الْاِسْتِهْزَاءِ بِاللّٰهِ وَأَنْبِيَائِهِ وَنَبِيِّنَا صلی اللہ علیہ وسلم فَأَحْضَرَ لَهُ الْقَاضِيْ يَحْيَى بْنَ عُمَرَ وَغَيْرَهُ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَأَمَرَ بِقَتْلِهِ وَصُلْبِهِ فَطُعِنَ بِالسِّكِّيْنِ وَصُلِبَ مُنَكَّساً ثُمَّ أُنْزِلَ وَأُحْرِقَ بِالنَّارِ.[الشفاء لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فی من تنقصہ او سبہ علیہ السلام]

ترجمہ:......''قیروان کے فقہاءؒ نے ابراہیم فرازی کے قتل کا فتویٰ دیا۔ ابراہیم فرازی بہت سے علوم میں

مہارت رکھنے والا شاعر تھا اور قاضی ابو العباس کی مجلس مناظرہ میں اکثر حاضر ہونے والوں میں سے تھا اس پر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ ایسی کلام کا استعمال کرتا ہے جسکا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ انبیاء کرامؑ اور ہمارے نبی ﷺ کے استہزاء سے ہے۔ اسے قاضی یحییٰ بن عمرؒ کی عدالت میں پیش کیا گیا جبکہ وہاں کثیر فقہاء کی جماعت موجود تھی قاضی نے اسکو قتل کرنے اور سولی چڑھانے کا حکم دے دیا پس اسکو چھری کیساتھ مطعون کیا گیا اور سولی پر چڑھا دیا گیا پھر سولی سے اتار کر آگ میں جلا دیا گیا۔

اجماع امت:

امت مسلمہ کے اہل علم اور آئمہ اربعہؒ کے معتقدین کا اس بات پر اجماع ہے کہ شاتم رسول کی سزا قتل ہے اور اسکی توبہ قتل سے نجات دلانے میں بے فائدہ ہے البتہ اگر مسلمان تھا تو آخرت میں فائدہ مند ہو سکتی ہے۔

ابن عتابؒ فرماتے ہیں:

فَهٰذَا الْبَابُ كُلُّهُ مِمَّا عَدَّهُ الْعُلَمَاءُ سَبٌّ أَوْ تَنَقُّصٌ يَجِبُ قَتْلُ قَائِلِهٖ لَمْ يَخْتَلِفْ فِيْ ذَالِكَ مُتَقَدِّمِهِمْ وَلَا مُتَأَخِّرِهِمْ۔ [الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصہ اور سبہ علیہ السلام]

ترجمہ:...... ''پس اس باب میں تمام کی تمام وہ کلام جسکو علماء نے سب وشتم اور تنقیص رسول بتایا ہے اس کے قائل کو قتل کرنا واجب ہے اس معاملہ میں اگلوں پچھلوں میں سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔''

ابن سحنونؒ فرماتے ہیں:

أَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ أَنَّ شَاتِمَ النَّبِيِّ ﷺ مُتَنَقِّصٌ لَهُ كَافِرٌ وَالْوَعِيْدُ جَاءَ عَلَيْهِ بِعَذَابِ اللّٰهِ لَهُ وَحُكْمُهُ عِنْدَ الْأُمَّةِ قَتْلٌ مَنْ شَكَّ فِيْ كُفْرِهٖ وَعَذَابِهٖ كَفَرَ۔ [الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصہ اور سبہ علیہ السلام]

ترجمہ:...... ''علماء کا اس پر اجماع ہے کہ شاتم رسول اور آپ کی تنقیص کرنے والا کافر ہے اور اسکے لیے اللہ کے عذاب کی وعید آئی ہے اور امت کے نزدیک اسکا حکم قتل ہے جس نے بھی اسکے کفر اور اسکی سزا قتل میں شک کیا وہ بھی کافر ہوا۔''

ابن منذرؒ فرماتے ہیں:

أَجْمَعَ عَامَّةُ أَهْلِ الْعِلْمِ عَلٰى أَنَّ مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَيْهِ الْقَتْلُ۔

[تفسیر قرطبی تحت قولہ تعالی وان نکثوا ایمانهم الخ ۱۲۔۱۳۔توبہ]

ترجمہ:...... ''عامہ اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ نبی علیہ السلام کو سب وشتم کرنے والے کو قتل کیا جائے گا۔''

علامہ شامی حنفیؒ لکھتے ہیں:

کہ اگر کسی نے نبی اکرم ﷺ کو گالی دی تو اسکو توبہ کا موقع دیے بغیر قتل کرنے پر اجماع ہے فعلم ان المراد من نقل الاجماع علی قتلہ قبل التوبۃ ثم قال وبمثلہ قال ابو حنیفہ واصحابہ (فتاوی شامی: ۲/۳۵۷) یہی نظریہ امام ابوحنیفہؒ اور انکے اصحاب کا ہے۔

[ماخوذ من مجلہ نصرت العلوم، مقالہ الشیخ عبدالقدوس قارن فروری ۲۰۱۱]

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

کہ جو مسلمان مرتد ہو جائے پھر توبہ کرلے تو اسکی توبہ قبول کی جائے گی مگر ایسی جماعت کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی جو بار بار مرتد ہو جاتی ہو اسی طرح انبیاء کرام میں سے کسی کو گالی دینے کی وجہ سے کافر ہوا۔ فانہ یقتل حداً ولا تقبل توبتہ مطلقا [فتاوی شامی: ۳۵۶/۶] تو اسکو حد کے طور پر قتل کیا جائے گا اور اسکی توبہ بالکل قبول نہیں کی جائے گی۔ [ایضا]

حنفی امام ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں:

كُلُّ مَنْ اَبْغَضَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بِقَلْبِهٖ كَانَ مُرْتَدًّا فَالسَّابُّ بِطَرِيْقِ الْاَوْلٰى ثُمَّ يُقْتَلُ حَدًّا عِنْدَنَا فَلَا تُقْبَلُ تَوْبَتُهٗ فِيْ اِسْقَاطِ الْقَتْلِ قَالُوْا هٰذَا مَذْهَبُ اَهْلِ الْكُوْفَةِ وَمَالِكٍ وَنُقِلَ عَنْ اَبِيْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِؓ .... قَالَ الْخَطَّابِيُّ لَا اَعْلَمُ اَحَدًا خَالَفَ فِيْ وُجُوْبِ قَتْلِهٖ ... وَعَلَّلَهُ الْبَزَّازِيُّ بِاَنَّهٗ حَقٌّ تَعَلَّقَ بِهٖ حَقُّ الْعَبْدِ فَلَا يَسْقُطُ بِالتَّوْبَةِ كَسَائِرِ حُقُوْقِ الْاٰدَمِيِّيْنَ وَكَحَدِّ الْقَذْفِ لَا يَزُوْلُ بِالتَّوْبَةِ وَصَرَّحَ بِاَنَّ سَبَّ وَاحِدٍ مِّنَ الْاَنْبِيَاءِ كَذٰلِكَ، وَقَوْلُهٗ فِيْ فَتْحِ الْقَدِيْرِ فِيْ اِسْقَاطِ الْقَتْلِ يُفِيْدُ اَنَّ تَوْبَتَهٗ مَقْبُوْلَةٌ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَهُوَ مُصَرَّحٌ بِهٖ۔ [فتح القدیر باب احکام المرتدین]

ترجمہ......'' جو آدمی بھی اپنے دل میں رسول اللہ ﷺ کا بغض رکھتا ہے وہ مرتد ہے تو سب وشتم کرنے والا بطریق اولی مرتد ہوا پھر ہمارے نزدیک اس کی حداً قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ سے قتل کی سزا ساقط نہیں ہوگی، فقہاء کا کہنا ہے کہ اہل کوفہ کا یہی مذہب ہے، اور امام مالکؒ کا بھی، اور سیدنا ابوبکرؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ خطابیؒ کہتے ہیں کہ (گستاخ رسول کی) سزا قتل ہے میں نے اسمیں کسی کو مخالف نہیں پایا۔ بزازی نے اسکی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ (سب وشتم رسول) حق العبد ہے اور حقوق العباد توبہ سے ساقط نہیں ہوتے جیسا کہ حد قذف توبہ سے معاف نہیں ہو سکتی، ایسے ہی جس نے انبیاءؑ میں سے کسی کو سب وشتم کیا وہ اسی حکم میں ہے، اور صاحب فتح القدیر کا یہ کہنا کہ اس توبہ سے قتل ساقط نہیں ہوگا، اس سے ثابت ہوا کہ یہ توبہ عند اللہ مقبول ہے۔ (یعنی بعد از قتل آخرت میں مفید ہوگی)

اسی مسئلہ کی وضاحت شیخ اسماعیل حقیؒ نے تفسیر روح البیان میں یوں کی ہے:

وَاِذَا كُنَّا لَا نَقْبَلُ تَوْبَةَ الْمُسْلِمِ فَلِاَنْ لَا نَقْبَلُ تَوْبَةَ الْكَافِرِ اَوْلٰى كَمَا فِي الْاَسْرَارِ وَالْحَاوِيْ

فَالْمُخْتَارُ اَنَّ مَنْ صَدَرَ مِنْهُ مَا يَدُلُّ عَلٰى تَخْفِيْفِهٖ ﷺ بِعَمْدٍ وَقَصْدٍ مِنْ عَامَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ يَجِبُ قَتْلُهٗ وَلَا تُقْبَلُ تَوْبَتُهٗ بِمَعْنَى الْخَلَاصِ مِنَ الْقَتْلِ وَاِنْ اَتٰى بِكَلِمَةِ الشَّهَادَةِ وَالرُّجُوْعِ وَالتَّوْبَةِ لٰكِنْ اِنْ مَاتَ وَاَبَى التَّوْبَةَ مِنْهُ فَقُتِلَ عَلٰى ذٰلِكَ كَانَ كَافِرًا وَمِيْرَاثُهٗ لِلْمُسْلِمِيْنَ وَلَا يُغْسَلُ وَلَا يُصَلّٰى عَلَيْهِ وَلَا يُكَفَّنُ بَلْ تُسْتَرُ عَوْرَتُهٗ وَيُوَارٰى كَمَا يُفْعَلُ بِالْكُفَّارِ.

[تفسیر روح البیان تحت آیۃ وان نکثوا ایمانھم ۱۲-۱۳-توبہ]

ترجمہ:......''اور جب ہم گستاخ مسلمان کی توبہ قبول نہیں کرتے تو کافر کی توبہ بطریق اولیٰ قبول نہیں کریں گے' جیسا کہ اسرار اور حاوی میں ہے اور مختار یہ ہے کہ جب کسی مسلمان سے ایسی کلام قصداً وعمداً صادر ہوئی جس سے نبی ﷺ کی تحقیر ٹپکتی تھی تو اس کو قتل کرنا واجب ہے اور اس کی توبہ قتل سے نجات نہیں دلائے گی البتہ اگر وہ کلمہ شہادت پڑھتا ہے اور اپنی گستاخی سے رجوع کرتا ہے پھر اس کو موت واقع ہو جاتی ہے یا حداً قتل کر دیا جاتا ہے تو اسکو موتِ اسلام پر سمجھا جائے گا' غسل بھی دیا جائیگا' نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی اور مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا لیکن اگر اس نے رجوع اور توبہ نہ کی تھی بلکہ مصر رہا تھا تو وہ کافر سمجھا جائے گا اس کی میراث مسلمانوں کی ہوگی' نہ اسکو غسل دیا جائے گا اور نہ اسکی نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ ہی اسکو کفن دیا جائے گا بلکہ عام کافروں کیطرح اسکا ستر چھپا کر مٹی میں دبا دیا جائے گا۔''

عبداللہ بن عبدالحکم فرماتے ہیں:

مَنْ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ مِنْ مُسْلِمٍ اَوْ كَافِرٍ قُتِلَ وَلَمْ يُسْتَتَبْ.[الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصہ اور سبہ علیہ السلام]

ترجمہ:......''جو بھی نبی ﷺ کو سب وشتم کرے مسلمان ہو یا کافر اسکو قتل کر دیا جائے اور اسکی توبہ بھی قبول نہ کی جائے۔''

ہمارے کلام کا خلاصہ یہ نکلا کہ رسول اللہ ﷺ کو سب شتم کرنے والے کا قتل واجب ہے۔ سب وشتم کرنے والا مسلمان ہو یا حربی وذمی کافر اور اسکی توبہ کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اجراء حد کیلئے گواہی کی ضرورت:

گستاخی رسالت ﷺ کی سزا کیلئے جرم کا ثبوت دو عادل آدمیوں سے ضروری ہے، ایک آدمی کی شہادت سے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ حکومت وقت پر ضروری ہے کہ بغیر شہادت شرعی اگر جرم مشہور ہو تو بقدر شہرت ملزم کو سزا دے اور تادیب کرے۔

وَكَذٰلِكَ الشَّاهِدُ الْوَاحِدُ عَلٰى رَجُلٍ اَنَّهٗ سَبَّ النَّبِيَّ ﷺ فَيُدْرَأُ عَنْهُ الْحَدُّ وَيُجْتَهَدُ فِيْ اَدَبِهٖ بِقَدْرِ شُهْرَةِ حَالِهٖ.[تبصرۃ الحکام فی اصول الاقضیۃ ومناھج الاحکام]

ترجمہ:...... ''اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کرنے والے پر ایک آدمی کی حد (قتل) کو ساقط کر دیتی ہے اور اسکے حال کی شہرت کیمطابق اسکو ادب سکھانے کی کوشش کی جائے گی۔''

غزوہ حنین کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت سے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو اوروں سے زیادہ سو اونٹ دیے جس پر ایک آدمی نے کہا' وَاللّٰہِ اِنَّ ھٰذِہٖ لَقِسْمَۃٌ مَا عُدِلَ فِیْھَا وَمَا اُرِیْدُ فِیْھَا وَجْہُ اللّٰہِ ۔ کہ اس تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا اور اللہ کی رضا کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔یہ گستاخی کا جملہ سیدنا عبداللہؓ نے رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیا لیکن اس جملہ کے کہنے والے کو سزا نہ ملی۔اس سزا نہ ملنے کیوجہ محدثین کی ایک جماعت نے یوں لکھی ہے۔

لِاَنَّہٗ لَمْ یَثْبُتْ عَلَیْہِ ذَالِکَ وَاِنَّمَا نَقَلَہٗ عَنْہُ وَاحِدٌ وَشَھَادَۃُ الْوَاحِدِ لَا یُرَاقُ بِھَا الدَّمُ.

[نووی شرح مسلم تحت حدیث:۱۷۵۹ باب اعطا لمؤلفة قلوبهم]

ترجمہ:...... ''اس آدمی پر جرم ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ اس واقعہ کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جانے والا ایک آدمی تھا اور ایک آدمی کی شہادت سے قتل نہیں کیا جا سکتا۔''

شبہات کا ازالہ:

سوال : گستاخ رسول ﷺ کی سزا قتل ہے،جبکہ دوسری طرف ایسے واقعات بھی موجود ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں نے بہت ستایا لیکن آپ نے اپنی ذات کیوجہ سے ان تکلیف دینے والوں کو معاف کر دیا۔نہ تو ان سے خود انتقام لیا اور نہ ہی اپنے صحابہؓ کو انتقام لینے کی اجازت دی،جس سے آپکا عفوو درگزر معلوم ہوتا ہے۔بطور مثال چند واقعات لکھے جاتے ہیں تا کہ سوال کی صورت واضح ہو جائے۔

۱...... ''رسول اللہ ﷺ طائف دعوت وتبلیغ کی غرض سے تشریف لے گئے بنوثقیف نے ذات اقدس ﷺ کو اس قدر اذیت دی کہ لہولہان ہو گئے نہ تو خود انتقام لیا اور جب فرشتوں نے انتقام کی اجازت چاہی تو آپ نے انتقام کی اجازت بھی نہ دی۔''

۲...... ''ایک عورت جو آپ ﷺ پر کوڑا کرکٹ پھینکا کرتی تھی وہ بیمار ہوگئی تو آپ ﷺ اسکی تیمارداری اور خدمت کیلئے تشریف لے گئے اس سے انتقام نہ لیا۔''

نیز مکی زندگی میں اسطرح کی عفوو درگزر کی سینکڑوں مثالیں موجود ہیں۔

۳...... ''منافقین بالخصوص عبداللہ بن ابی نے رسول اللہ ﷺ کو جا بجا ستایا لیکن آپ ﷺ نے ان سے ہمیشہ درگزر فرمایا۔اس کتاب میں بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں۔جن واقعات میں سے درج ذیل واقعہ بھی ہے۔''

غزوہ حنین کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں سے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو اوروں سے زیادہ سو اونٹ دیے جس پر ایک آدمی نے کہا' وَاللّٰهِ إِنَّ هٰذِهِ لَقِسْمَةٌ مَا عُدِلَ فِيهَا وَمَا أُرِيدُ فِيهَا وَجْهُ اللّٰهِ . کہ اس تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا اور اللہ کی رضا کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ یہ گستاخی کا جملہ سیدنا عبداللہؓ نے رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر یہ جملہ ارشاد فرمایا' يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوسٰى قَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ ۔ اللہ موسیٰ پر رحم فرمائیں کہ انکو اس سے بھی زیادہ ستایا گیا لیکن انہوں نے صبر کیا۔

۴......''ایک یہودی نے رسول اللہ ﷺ کو السام علیکم (کہ تم پر موت واقع ہو) بددعائیہ جملہ کہا جو کہ گستاخی ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسکو قتل نہیں کیا۔''

جوابات:

۱......اس حوالہ سے تمام سوالات کا ایک جواب تو وہ ہے جو قاضی عیاضؒ نے اپنی تصنیف الشفا میں دیا ہے کہ جن جن مواقع میں رسول اللہ ﷺ کا معاف کرنا ملتا ہے یہ آپکی خصوصیت ہے (کیونکہ آپکو ہر کلی کی جزئیات بھی بذریعہ وحی بتا دی جاتی تھیں) جسکا امت کو اختیار نہیں ہے امت کیلئے حکم قتل ہی کا ہے۔'' لکھتے ہیں:

وَيَحْتَمِلُ مِنْ أَذَاهُمْ وَيَصْبِرُ عَلٰى جَفَائِهِمْ مَالَا يَجُوزُ لَنَا الْيَوْمَ الصَّبْرُ لَهُمْ عَلَيْهِ.[الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقصه او سبه علیه السلام]

ترجمہ:......''آپ ﷺ کافروں کی اذیتوں کو برداشت کرتے تھے اور انکی طرف سے مصائب پر صبر کرتے تھے (لیکن) اب اگر کوئی آپکو اذیت دے تو ہمیں اس پر صبر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

۲......مکی زندگی کے مصائب پر صبر کیوجہ ہم مقدمہ میں ذکر کر چکے ہیں کہ اسلام کو استقرار بھی نہ ملا تھا اور لوگوں کے پاس اسلام کی حقانیت پر غزوہ بدر جیسی بڑی فارق علامت بھی وجود میں نہ آئی تھی۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دے رکھا تھا' فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ(۱۳ ۔المائدہ) کہ آپ انکو معاف کریں اور ان سے درگزر کریں۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ تکالیف پر صبر کرتے تھے۔ مدنی زندگی شروع ہونے پر یہ آیت بھی منسوخ ہوگئی اور حکم بھی بدل گیا لہذا گستاخی رسول ﷺ کی سزا کو مکی زندگی کے واقعات پر قیاس کرنا شدید خطاء ہے۔

اسی بات کو قاضی عیاضؒ ان الفاظ کیساتھ لکھتے ہیں:

وَذَالِكَ لِحَاجَةِ النَّاسِ لِلتَّالِيفِ أَوَّلِ الْإِسْلَامِ وَجَمْعِ الْكَلِمَةِ عَلَيْهِ فَلَمَّا اسْتَقَرَّ وَأَظْهَرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ قُتِلَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ وَاشْتَهَرَ أَمْرُهُ.[الشفا لقاضی عیاض باب القسم الرابع فی

تصرف وجوه الاحكام فيمن تنقصه او سبه عليه السلام]

ترجمہ:...... ''آپ ﷺ کا اذیتوں پر صبر کرنا شروع اسلام میں لوگوں کی تالیف قلب کی ضرورت کی بناء پر تھا۔ پس جب پختگی نصیب ہوگئی اور اسلام کا تمام ادیان پر غلبہ ہوگیا تو ہر اس آدمی کو قتل کر دیا گیا جس نے گستاخی کا ارتکاب کیا اور اس پر قابو پالیا گیا۔

۳......منافقین کو سزا نہ دینے کی ایک وجہ تو یہ رہی کہ یہ منافق تمام تر گستاخی غائبانہ کرتے تھے شرعی شہادت قائم نہ ہو پاتی تھی جس پر انکو قتل کیا جا سکتا۔ اور دوسری وجہ وہ رسول اللہ ﷺ کا یہ خصوصی فرمان تھا۔ مَعَاذَاللّٰهِ اَنْ يَّتَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ مُحَمَّداً يَقْتُلُ اَصْحَابَهُ . کہ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔

[نووی شرح مسلم تحت حديث ۱۷۵۹ باب اعطاء لمؤلفة قلوبهم]

۴......اور یہود کو جہاں جہاں معاف کرنا ملتا ہے جیسا کہ السام علیکم وغیرہ اس کا سبب یہ رہا ہے کہ قتل؛ صریح سب وشتم کی بناء پر مشروع ہے یہود نے جب کبھی غیر صریح سب وشتم کیا اس پر انکو قتل نہ کیا گیا۔ [فتح البارى لابن حجر، تحت باب إذاعرض الذمى وغيره بسب النبیؐ ولم يصرح نحو قوله السام عليك]

☆☆☆☆

حافظ محمد عدیل عمران، لاہور

عمار خان ناصر...... گستاخ رسول کے دفاع میں!

اللہ رب العزت کا آخری اور کامل دین اسلام اپنی حقانیت، اعلیٰ اقدار اور فطرت انسانی سے غیر معمولی مطابقت رکھنے کی بنا پر جس قدر تیزی سے دنیا میں پھیل رہا ہے، اسی قدر مخالف قوتیں اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ "الکفر ملة واحدة" (کفر ایک ہی جماعت ہے) کے فرمان نبوی کی مصداق تمام باطل قوتیں اِس "کارِ خیر" میں ہر طرح سے شریک اور حصہ دار ہیں۔ لیکن اِس خدمت کا جو "شرف" یہود و نصاریٰ اور اُن کے پروردہ لوگوں کو حاصل ہوا وہ انھی کا خاصہ ہے۔

ان قوتوں کے ایجنڈے میں اسلام و مسلم دشمنی کے دیگر منصوبوں کے ساتھ انتہائی اہم پروگرام یہ بھی ہے کہ "مسلم اسکالرز" کے نام پر ایسے حضرات کو مسلمانوں میں دینی راہ نما کے طور پر متعارف کرایا جائے جو اسلام کی تمام ادیان کے لیے قابل قبول صورت دنیا کے سامنے پیش کریں۔

انھی خفیہ طاقتوں کی جانی یا انجانی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دینے والے ایک "عظیم مجاہد" کا نام عمار خان ناصر ہے، جو عرصہ دراز سے اِس فکر میں گھلے جا رہے ہیں کہ چودہ صدیوں میں فراہی، اصلاحی اور غامدی کے بعد میں چوتھا آدمی ہوں جسے دین کی "صحیح" سمجھ ہے۔ اگر میں "کچھ" کیے بغیر چلا گیا تو اِسلام کی "حقیقی صورت" کا کیا ہوگا؟ اسلام تو دنیا بھر میں بدنام ہے، اور ہوتا رہے گا......!! صحابہ کرام سے لے کر آج تک کے مسلمان اِسلام کی "سچی تصویر" دکھانے سے عاجز رہے، اگر میں نے بھی یہ کام نہ کیا تو قیامت تک "حقیقی اسلام" کی صورت واضح نہ ہو سکے گی بلکہ "مسخ شدہ" چہرہ ہی دنیا کے سامنے رہے گا۔ اِسی پریشانی میں وہ آئے روز نت نئے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ اور سرتوڑ کوشش میں ہیں کہ ان کا "حقیقی اسلام" کسی طرح دنیا کو سمجھ آجائے۔ چاہے اس کے لیے ان کو کچھ بھی کرنا پڑے۔

اُن کے عزائم سے لگتا ہے کہ اِس "نیک کام" کے لیے وہ ہر گھاٹی عبور اور ہر مشکل کا سامنا کرنے کے لیے لنگوٹ کس چکے ہیں۔ دین فہمی کے خود ساختہ اُصول وضع کرنے سے لے کر اَحکام شرع کی من مانی تعریف و تشریح تک...... تمام فقہاء اُمت کی اتفاقی و اجماعی تحقیقات کو ٹھکرانے سے لے کر اِجماع کے اِنکار تک، مسلمہ عقائد پر "قوی" اشکالات سے لے کر عقیدے کے مسئلے کو تحقیق کا مسئلہ باور کرانے تک...... صحابہ کرامؓ کی گستاخی لے کر حضرت اِمام اہل سنتؒ پر بے طعن و تشنیع تک...... تمام گھاٹیاں وہ بڑی تیزی سے

عبور کرتے جارہے ہیں۔ اور ایک ''نیا اسلام'' تشکیل دینے کی فکر میں سرگرداں ہیں۔ چاہے اس کے لیے ''پرانے اسلام'' کو آگ لگانی پڑے یا اس میں تخریب کاری کرنی پڑے، اس کی بنیادوں کو منہدم کرنا پڑے یا اس کی دیواریں زمین بوس کرنی پڑیں، اُن کو تو ہر حال میں ایک عدد ''نیا اسلام'' چاہیے۔

موصوف نے اپنے ماہواری رسالے ''الشریعہ'' کے خاص نمبر [جون ۲۰۱۴] میں ''میری انفرادی آراء اور ان کی علمی بنیاد'' نامی بھاری بھرکم عنوان کے تحت مختلف مسائل پر اپنے ''حقیقی اسلام'' کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ سر دست ہمیں اس میں سے صرف ایک مسئلہ ''توہین رسالت کی سزا'' کے صرف ایک پہلو پر کچھ معروضات پیش کرنی ہیں۔ جناب خان صاحب مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''توہین رسالت سے متعلق حالیہ قانون چند بنیادی اور اہم پہلوؤں سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اس لیے جید اور ذمہ دار علما کی راہ نمائی میں مذہبی جماعتیں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ترمیم شدہ اور جامع مسودہ قانون پارلیمنٹ میں پیش کریں۔'' [الشریعہ، جون ۲۰۱۴، ص: ۱۸۸]

خان صاحب کو اس قانون پر یہ ''بنیادی'' اعتراض ہے کہ یہ احناف کے کلاسیکی موقف کے خلاف ہے۔

۱۔ اس سلسلے میں پہلی وضاحت تو یہ ہے کہ خان صاحب کی یہ بات ہی غلط ہے۔ جس کی تفصیل حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب کی کتاب ''عمار خان کا نیا اسلام'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سر دست یہ ہمارا موضوع نہیں۔

۲۔ دوسری گذارش یہ کہ خان صاحب خود مذہب حنفی کے کس قدر پیروکار اور اس کی تعلیمات سے کتنے متفق ہیں جو اُن کو ملکی قوانین کو 'احناف کے کلاسیکی موقف' کے مطابق ڈھالنے کی فکر کھائے چلی جارہی ہے!؟

۳۔ تیسری عرض یہ ہے کہ یہ قانون احناف کے کبار علماء حضرات کے مطالبے اور مشورے کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اور وہ خان صاحب کی نسبت اسے بہتر جانتے ہیں۔ خان صاحب کی تحقیق اور ''پوری دیانت داری'' اُن اکابر کے علم تقویٰ کے مقابلہ میں پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔

۴۔ چوتھی بات یہ ہے کہ اِس ملک کی اکثریتی آبادی اہل سنت عوام کی ہے، جس کے شدید اصرار اور پرزور مطالبے کے بعد یہ قانون منظور ہوا۔ اَب اِس قانون پر وہ مطمئن ہے۔ ایسے میں خان صاحب کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اکثریتی آبادی پر اپنے ''حقیقی اسلام'' کے ''انفرادی'' قوانین ٹھونسنے کے مشورے دے کر انتشار پھیلائیں اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائیں......؟!

۵۔ پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض اس ملک کی اکثریتی آبادی کے اکابر علماء نے

کسی ضرورت کے تحت اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق قانون منظور کروایا ہے تو اِس سے خان صاحب کے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں!؟ اِس ملک کے باشندوں کے اکابر کو حق حاصل ہے کہ وہ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے جو فیصلہ مناسب سمجھیں فرمائیں، اِس 'معمولی' بات پر خان صاحب کا بلبلانا کم از کم ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

باقی رہی بات اس قانون کے غلط استعمال کی، تو آنکھیں کھلی رکھنے والا ہر باشعور آدمی اِس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ ہمارے ملک پاکستان کا تقریباً ہر قانون ہی غلط استعمال ہو رہا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ صحیح استعمال کم اور غلط استعمال زیادہ ہے تو شاید بے جا نہ ہو۔ خان صاحب کو یقین نہ آئے تو ذرا ایک سروے کر لیں کہ ہمارے تھانوں میں قتل، ڈکیتی، چوری، اغوا اور لڑائی جھگڑے کے کتنے مقدمات جھوٹے درج کرائے جاتے ہیں اور کتنے سچے۔ ہر قانون کا غلط استعمال اگر صحیح سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوگا۔

ایسی لاقانونیت کی اندھیر نگری میں صرف ایک قانون کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جانا، معاف کیجیے! کسی اور بات کی غمازی کرتا ہے ؏ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

ایسے میں بجائے اس کے کہ خان صاحب یہ مطالبہ کرتے کہ بلا امتیاز تمام قوانین کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے موثر اقدامات کیے جائیں اور اس سلسلہ کو بند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، وہ اِس ایک قانون کو تبدیل کرانے کے لیے اپنی ایڑیاں اونچی کرنے میں مصروف ہیں۔

ہاں! اگر اِس قانون میں کوئی ایسی کمی یا نرمی پائی جاتی ہے جس کا فائدہ اٹھا کر گستاخ رسول اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کمی کو دُور کرنے کا مطالبہ ہر سنی مسلمان حکومت پاکستان سے کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ کہ اس قانون میں کسی قسم کی کوئی لچک باقی نہ رکھی جائے تاکہ ہمارے آقا و مولیٰ کا کوئی بھی گستاخ، پھانسی کے پھندے سے بچ نہ پائے۔ چاہے خان صاحب اسے ''شدید ناپسند'' کریں۔

لیکن اگر کوئی اس کے مخالف سمت میں آواز اٹھاتا ہے کہ اس میں 'تخفیف کی جائے، کم تر سزاؤں کی گنجائش رکھی جائے، معافی کی سہولت دی جائے' تو وہ یقیناً جانے یا انجانے میں قادیانیوں اور دیگر غداران دین وملک کی بولی بول کر اُن کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے۔ کیونکہ اس قانون سے اصل تکلیف انھی کو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے ہر تھوڑے عرصے بعد کسی واقعہ کو ایشو بنا کر اس قانون کو ختم یا تبدیل کرنے کا شور مچایا جاتا ہے۔

ہم حکومت وقت کو اس سلسلہ میں خبردار کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ سرکاری وردی میں ملبوس کالی بھیڑوں سمیت تمام غداران دین وملک سے ہوشیار رہے اور ان کے شور شرابے پر قطعاً کان نہ دھرے۔

یہاں ہم یہ بات بھی خان صاحب کے گوش گزار کرنا چاہیں گے کہ: اس قانون کی تیاری کے دوران اور اِس کے نفاذ سے پہلے تو بحث مباحثہ کی گنجائش تھی، مگر قانون بن جانے کے بعد اب اِس میں تبدیلی اور خصوصاً اِس قسم کی تبدیلی جس کا مطالبہ قادیانی و غامدی لابی کر رہی ہے، یقیناً ناموس رسالت کا استخفاف ہے، اس لیے کہ معمولی عقل والا بھی جانتا ہے کہ اگر کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز کو یہ کہہ کر نچلے عہدہ پر بھیج دیا جائے کہ ''تُو اس عہدہ کے لائق نہیں ہے'' تو اِس میں اس کی تذلیل اور اس کا استخفاف ہے۔ اسی طرح جب ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے قانون بنا دیا گیا ہے۔ تو اب اس میں نرمی کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ناموس رسالت کا مسئلہ اتنی اہمیت کا حامل نہ تھا کہ اس کی سزا قتل ہوتی۔ لہٰذا یہ سراسر اِس کی اہمیت گھٹانے کی مکروہ سازش ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی عقیدت و محبت رکھنے والا ایک عام غیرت مند مسلمان بھی شاتم رسول کی سزا میں کسی استخفاف یا کمی کا روادار نہیں ہوتا، چہ جائے کہ اصحابِ قلم کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا جائے۔

لیکن اِسے عمار خان صاحب کی غامدی ذہنیت کا کمال سمجھیے یا فراہی و اصلاحی فکر کا تسلسل کہ وہ انتہائی بے حمیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اس قانون میں نرمی کا مشورہ دیتے ہیں بلکہ توہین رسالت کے مجرم کو سزا سے بچانے کی ہر ممکن کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ نجانے کیوں ہر گستاخ رسول کے گلے کا پھندا خان صاحب کو اپنے گلے میں اٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی خاطر گنجائش در گنجائش نکالتے چلے جاتے ہیں، دیکھ لیجیے! پہلے عام سر پھرے لوگوں (غیور مسلمانوں) کو بے دخل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، جو کسی بھی گستاخ رسول کے خلاف مقدمہ درج کرانے فوراً تھانے میں پہنچ جاتے ہیں اور مقدمہ یا اس میں صحیح صورت حال درج نہ کرنے کی صورت میں سراپا احتجاج بن کر عمار خان صاحب کے جذبات کو ٹھیس پہنچاتے اور اُن کے حقیقی اسلام کے احکامات کی 'سراسر خلاف ورزی' کے مرتکب ہوتے ہیں۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''توہین رسالت کا جرم کسی ایک فرد کے خلاف نہیں، بلکہ پورے معاشرے اور ریاست کے خلاف جرم ہے۔ اس لیے اس میں قانونی طور پر مدعی بھی کسی فرد کو نہیں، بلکہ ریاست کو ہونا چاہیے۔ جب کہ عام لوگوں کا کردار ایسے کسی بھی معاملے کو محض قانون کے نوٹس میں لانے تک محدود ہونا چاہیے۔''

[الشریعہ جون ۲۰۱۲ء، ص:۱۸۸]

لہٰذا کسی بھی 'جذباتی' آدمی کو اِس معاملے میں احتجاج کی راہ اپنا کر خان صاحب کے حقیقی اسلام کے 'صریح احکامات' کی خلاف کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کوئی بھی واقعہ پیش آ جائے ریاست کو اس کی خبر کر دی جائے اور بس!

چونکہ خان صاحب جانتے ہیں کہ ہماری ریاست کے سرکردہ افراد عموماً 'پینٹا گون' کے اشاروں پر ہی چلتے ہیں، لہٰذا اُن سے ایسی 'حماقت' کی توقع ہرگز نہیں۔ لیکن اگر ریاست کا کوئی فرد 'جذباتیت' کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی شاتم رسول کے خلاف مقدمہ درج کر بھی لے تو خان صاحب کا حقیقی اسلام اسے حکم جاری کرتا ہے کہ خبردار! اسے کسی بھی قسم کی اذیت پہنچائے بغیر عزت واکرام کے ساتھ امریکہ، برطانیہ یا کینیڈا روانہ کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ کی 'جذباتی' ریاست میں اس کی جان خطرے میں ہے۔ خان صاحب کی تعبیر پڑھیے:

''اسلامی جمہوریہ پاکستان کی شہریت کے لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کے احترام کو بنیادی شرط قرار دیا جائے اور کوئی بھی شخص جو اپنے قول وفعل سے اس شرط کی دانستہ خلاف ورزی کرے، اس کے حقوق شہریت منسوخ کر دیے جائیں۔'' [الشریعہ، جون ۲۰۱۴، ص: ۱۸۸]

یعنی اس کا پاسپورٹ منسوخ کر دیا جائے، جس کے نتیجے میں اسے کسی یورپی ملک کی شہریت مل جائے، اس طرح اسے اپنے اصلی آقاؤں کی آغوش میں بھیج دیا جائے جہاں وہ 'محفوظ' زندگی گزار سکے۔ اگر اس کا موقع بھی میسر نہ ہو تو حقیقی اسلام اسے معذرت ومعافی کا موقع دیتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

''مجرم سے پہلی مرتبہ جرم سرزد ہوا ہو تو اسے توبہ ومعذرت اور معافی کا موقع دیا جائے۔'' [ایضاً]

لیجیے! یہ تیسری گنجائش ہے۔ کہ شاتم رسول اور گستاخ رسول اگر پہلی دفعہ خباثت کرے تو اسے توبہ کا موقع دیا جائے، معذرت کا موقع دیا جائے، معافی کا موقع دیا جائے، اگر وہ (سزا کے ڈر یا کسی بھی وجہ سے) معذرت کے دو (جھوٹے یا سچے) لفظ زبان سے نکال دے تو بس! اس کی جان بخشی خان صاحب کا حقیقی اسلام لکھ کر دے رہا ہے۔

قارئین حیران ہوں گے کہ خان صاحب کے حقیقی اسلام کو شاتم رسول سے کس قدر ہمدردی ہے کہ مذکورہ بالا تین رعائتوں پر بھی تسکین نہیں ہوئی، مزید ڈھیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''البتہ جرم کے مکرر ارتکاب کی صورت میں قرائن وشواہد سے یہ واضح ہو جائے کہ......'' ایضاً]

غور کیجیے! خان صاحب کی عبارت بار بار پڑھیے!

۱۔ جرم کا مکرر ارتکاب ہو۔

۲۔ قرائن بھی دلالت کریں کہ مجرم اصلاح پر آمادہ نہیں۔

۳۔ شواہدات سے بھی اس کے رویے کی خرابی بیان کریں۔

۴۔ اور ان قرائن وشواہد سے ''واضح'' بھی ہو۔

لہٰذا اگر قرائن تو دلالت کریں، لیکن شواہد بیان نہ کریں تو توبہ قبول کرنا لازم ہے۔ اور اگر بدبخت قرائن وشواہد دونوں ہی ایسے مجرم کے خلاف اتحاد کرلیں تو پھر صورتِ حال کو دیکھا جائے "پوری طرح واضح" ہے یا نہیں؟ اگر پوری طرح واضح نہ ہو تو بھی توبہ قبول کرنا ضروری ہے۔ اور اگر مزید ستم ڈھاتے ہوئے خان صاحب کی منشا کے خلاف صورت حال بھی "پوری طرح واضح" ہو جائے تو اب حقیقی اسلام کا حکم یہ ہے کہ:

> "تکرارِ ارتکاب کی صورت میں قرائن وشواہد سے یہ واضح ہو جائے کہ مجرم صرف دفع الوقتی کے لیے معذرت کا سہارا لے رہا ہے۔ جب کہ حقیقی طور پر اپنے رویے کی اصلاح پر آمادہ نہیں تو اس کی توبہ قبول کرنے سے انکار کردیا جائے۔" [ایضاً]

درج بالا چار شرائط پائے جانے کے باوجود صرف اتنی اجازت ہے کہ "اس کی توبہ قبول کرنے سے انکار کردیا جائے۔" اس کے بعد خان صاحب کا حقیقی اسلام گستاخ رسول کی ہمدردی میں آخری حد سے تجاوز کرتے ہوئے مشورہ دیتا ہے کہ:

> "جرم کی نوعیت اور اثرات کے لحاظ سے سزائے موت کے ساتھ متبادل اور کم تر سزاوں کی گنجائش بھی قانون میں شامل کی جائے، جب کہ موت کی سزا کو اس جرم کی انتہائی سزا قرار دیتے ہوئے اسی صورت میں نافذ کیا جائے جب جرم کے سدباب اور اس کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لیے یہی سزا ناگزیر ہو۔" [الشریعہ، ص:۱۸۹]

حقیقی اسلام کی طرف سے دی گئی تمام تر گنجائشوں کے بعد بھی اگر کوئی شاتم رسول "بدقسمتی سے" سزا کے مرحلے تک پہنچ جائے تو اب "جرم کی نوعیت اور کیفیت" کو دیکھا جائے۔ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں کی گئی گستاخی کو عمار خان کے حقیقی اسلام کے ترازو میں تولا جائے......!!

حالانکہ ایک عام مسلمان (نہ کہ "حقیقی مسلمان") بھی اس بات کو بخوبی سمجھتا ہے کہ شانِ رسالت میں کی گئی کوئی بھی توہین وگستاخی دنیا کی بڑی سے بڑی گستاخی سے بھی بھاری ہے۔ جسے کوئی بھی مسلمان (نہ کہ "اعلیٰ وارفع مسلمان") کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا۔ خان صاحب کا حقیقی اسلام، مضبوط ایمان اور اعلیٰ اخلاقیات ہی اُن کو اس بے حمیتی کی اجازت دے سکتی ہیں، ہم تو ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔

گزشتہ تمام بحث سے پوری طرح واضح ہے کہ شاتم رسول سے متعلق خان صاحب کے حقیقی اسلام کے 'صریح احکامات' کا ماحصل درج ذیل نکات ہیں:

۱۔ کسی فرد کو اس کے خلاف مقدمہ درج کرانے یا احتجاج کرنے کا کوئی حق نہیں۔ عام لوگ

صرف ریاست کے نوٹس میں لا سکتے ہیں۔ (وہ اس کے خلاف کارروائی کرے یا نہ کرے)

۲۔ ریاست کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شہریت ختم کر کے اس کو عزت و اکرام کے ساتھ یورپ کی طرف روانہ کر دے۔

۳۔ اگر نہیں تو پھر اس کو معذرت و توبہ کا موقع دے کر اس کی (جھوٹی سچی) توبہ قبول کی جائے۔

۴۔ جرم کے تکرار ارتکاب کی صورت میں دوبارہ معذرت کا موقع دیا جائے۔

۵۔ قرائن کو دیکھا جائے۔

۶۔ شواہد کو ملاحظہ کیا جائے۔

۷۔ اگر ''پوری طرح واضح'' ہو کہ دفع الوقتی کے لیے معذرت کا سہارا لے رہا ہے تو اب توبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

توجہ فرمایئے! خان صاحب کے حقیقی اسلام میں اب بھی ایسے گستاخ کے لیے ''عبرتناک سزا دی جائے'' جیسے الفاظ نہیں ہیں۔ جبکہ دوسری طرف کوئی شخص کسی پر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگائے تو اس کے بارے میں خان صاحب کے حقیقی اسلام کا حکم ہے کہ:

''اگر توہین رسالت کا الزام جھوٹا ثابت ہو تو الزام لگانے والے کو سخت سزا دی جائے۔'' [ص:۱۸۹]

یاد رہے کہ اس کی زد میں وہ سچا عاشق رسول بھی آتا ہے جس نے کسی بدبخت وخبیث کو گستاخی کرتے ہوئے دیکھا لیکن کسی اور گواہ کے نہ ہونے کی وجہ سے عدالت میں ثابت نہیں کر سکا۔ لیکن خان صاحب کا حقیقی اسلام یہاں کسی استثنا کے بغیر حکم جاری کرتا ہے کہ ''سخت سزا دی جائے۔'' کیا خان صاحب کے حقیقی اسلام میں گستاخی رسول، گستاخی کا الزام لگانے جتنا جرم بھی نہیں؟

اے کاش! کہ خان صاحب کے حقیقی اسلام میں ایسی ''سخت سزا'' کے جذبات کسی شاتم رسول کے لیے بھی ہوتے۔ لیکن افسوس صد افسوس! گستاخ رسول کے لیے تو پے در پے رعائتیں اور گنجائشیں اور توہین رسالت کا الزام لگانے والے کے بارے میں یہ جذبات۔۔۔!! اس سے زیادہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو!

☆......☆......☆......☆

مولانا عبداللہ معتصم [انچارج ایڈیٹر: ماہنامہ لولاک، ملتان]

فتنہ غامدیت......اور......فتنہ قادیانیت

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو عباسی دور حکومت میں جب فلسفۂ یونان عربی زبان میں منتقل ہوا تو اس کے ردعمل میں مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک بڑی اکثریت نے تو اسے قرآن وسنت سے متصادم پا کر اس کے تارو پود بکھیر دیئے اور یکسر مسترد کر دیا۔ دوسرے گروہ نے اس کی معقولیت سے مرعوب ہو کر گھٹنے ٹیک دیئے۔ پہلا گروہ اہل سنت والجماعت کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرے نے فرقہ معتزلہ کے نام سے شہرت پائی۔ معتزلہ نے عقل کو اصل قرار دے کر شریعت کو اس کے تابع کیا۔ کیونکہ یونانی فلسفہ کے اعتقادات وافکار، اسلامی عقائد وافکار سے یکسر مختلف تھے اور ان کو فروغ دینے کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ خود آپ ﷺ کی سنت تھی جو قرآن کی حتمی تعبیر کی شکل میں مسلمانوں کے پاس محفوظ اور ان میں رائج تھی۔ چنانچہ انہوں نے انکار سنت کی راہ اپنائی۔ نتیجے کے طور پر یونانی فلسفے کی روشنی میں جدید اصولوں کی بنیاد پر معتزلہ کا ایک نیا اسلام وجود میں آیا۔ جس کا کوئی تصور صحابہ کرامؓ اور ائمہ کرام کے دور میں موجود نہ تھا۔ خلافت عباسیہ کے دور میں حکومتی سرپرستی کی وجہ سے اس فرقہ کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ لیکن ائمہ کرام کی انتھک محنتوں اور بے مثال قربانیوں کی وجہ سے یہ فرقہ زیادہ عرصے تک چل نہ سکا۔ ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے کتابوں کے صفحات تک محدود رہ گیا۔

انیسویں صدی میں جب سائنس نے پاپائیت کے نرغے سے نکل کر عملی تفوق پایا تو اس کے اثرات عالمگیر سطح پر مرتب ہوئے۔ سائنس کامیابی کا معراج سمجھا جانے لگا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی مسلمانوں کی طرف سے دو طرح کا طرز عمل سامنے آیا۔ ایک طرف راسخ اور پختہ فکر علماء تھے جنہوں نے واضح کیا کہ مذہب کی بنیاد وحی ہے۔ دنیا کی کوئی مسلمہ حقیقت وحی کے خلاف نہیں ہو سکتی۔ ان حضرات میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے اسماء گرامی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں دوسرے گروہ نے اپنی مرعوبانہ ذہنیت کے مطابق سائنسی نظریات کو مسلمہ حقائق کا درجہ دے کر وحی کو ان کے مطابق ڈھالنے کی تدابیر شروع کر دی۔ اس گروہ کے سرخیل سرسید احمد خان اور خوشہ چینوں میں حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی سرفہرست ہیں۔ ان حضرات نے عربی لغت کے بل بوتے پر قرآن کو سمجھنا شروع کر دیا۔ ائمہ مجتہدین کی وہ تفاسیر اور تاویلات جو حدیث اور صاحب قرآن کے

مزاج کو سامنے رکھ کر کی گئی تھیں ان کو ائمہ کے ذاتی خیالات واجتہادات کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ اپنی ضرورت اور چاہت کے مطابق قرآن کی تفسیر اور شریعت کی وضاحت شروع کی۔ امین حسن اصلاحی اور حمید الدین فراہی کا ایک خوشہ چیں ''محمد شفیق عرف کا کوشاہ ککے زئی'' تھا۔ جس کی گھٹی میں ''استاذ محترم'' نے انکار حدیث، تجدد پسندی، لغت پرستی اور شریعت کی من چاہی تعبیر کا سارا زہر انڈیلا تھا۔ اتنی لمبی تمہید ہم نے اسی مبارک شخصیت ''محمد شفیق عرف کا کوشاہ ککے زئی'' کے تعارف کے لئے باندھی۔ یہ حضرت آج کل'' جاوید احمد غامدی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کا ٹی.وی چینلز اور سوشل میڈیا پر بڑا غلغلہ ہے۔ جن کی چرب زبانی، طلاقت لسانی اور الٹے سیدھے فلسفے سے متاثر ہو کر بہت سارے سادہ لوح مسلمان شریعت کے متعلق غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔ جو وضع قطع میں اسلامی شعائر سے عاری، نام نہاد روشن خیالی کے پرزور داعی، دینی اصولوں میں جدت وارتقاء کے نام پہ من چاہی تحریف کے قائل وفاعل اور دینی احکام کی عملی تعبیر کو انتہاء پسندی اور دقیانوسیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ محمد شفیق ''کوشاہ ککے زئی'' سے جاوید احمد غامدی کیسے بنے، یہ ایک بیچ پر قضیہ ہے۔ ہم اس سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ دست ہم غامدی صاحب کے عقائد ونظریات کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔ غامدیت اور قادیانیت کے درمیان غیر معمولی مشابہت ومماثلت پر روشنی ڈالتے ہیں اور غامدی صاحب کی ہر مسئلہ میں الگ اور انوکھی رائے کن عزائم کا پیش خیمہ ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غامدی صاحب نے اکثر مسائل میں وہ راہ اپنائی ہے جو اس کے پیش رو عقل پرستوں یا قادیانیوں نے اپنائی تھی۔ چند ایک مسائل کا ذکر کرتے ہیں جن میں غامدی صاحب نے مرزائیوں کے ساتھ موافقت کی ہے۔ ہر مسئلہ میں جمہور امت کی رائے پیش کریں گے اور پھر غامدی صاحب اور قادیانیوں کا اس مسئلہ میں نقطۂ نظر بیان کر کے قرآن وسنت کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں گے۔

رفع ونزول عیسیٰ علیہ السلام:

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود بے بہبود کے ہاتھوں محفوظ، صحیح وسالم بچا کر اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا ہے۔ اب تک زندہ ہیں۔ قیامت کے قریب آسمان سے ان کا نزول ہوگا اور دجال کو قتل کریں گے۔ دور نبوت سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک سوائے چند معتزلہ اور فلاسفہ کے کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع ونزول کا انکار نہیں کیا۔ تیرھویں صدی میں کچھ ملحدانہ ذہن رکھنے والوں کی اکا دکا آوازیں سننے کو ملیں۔ جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور نزول سے انکار کیا اور جن احادیث مبارکہ میں رفع ونزول کا تذکرہ تھا۔ ان کو یک جنبش قلم اسرائیلیات اور نا قابل قبول قرار دے کر رد کر دیا۔ ان میں مصر کے شیخ محمد عبدہ، ان کے شاگرد علامہ رشید رضا، شیخ محمد شلتوت اور مسیلمۂ

اپنی کتاب ''میزان'' جو بقول ان کے ''ربع صدی کے مطالعہ و تحقیق کے بعد لکھی ہے۔'' میں نزول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ایک جلیل القدر پیغمبر کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اس واقع کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم و عقل اسی خاموشی پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اسے باور کرنا آسان نہیں۔'' [میزان:۱۷۸]

غامدی صاحب کی اس عبارت سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ رفع و نزول عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ دوسری: جو چیز قرآن میں نہ ہو وہ بھلے حدیث اور اجماع سے ثابت ہو لیکن قابل اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ غامدی صاحب کے نزدیک حدیث دین کا حصہ نہیں۔ رفع و نزول مسیح علیہ السلام کے حوالے سے غامدی صاحب کا یہ کہنا قرآن میں مذکور نہیں، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ قرآن میں واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسمانی کا تذکرہ موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقيناً بل رفعه الله اليه وكان الله عزيزاً حكيماً'' [سورۃ النساء:۱۵۸]

چونکہ قرآن کریم یہود و نصاریٰ میں اختلافی مسائل میں فیصل بن کر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلاف میں فیصلہ فرما رہے ہیں۔ یہود کا قول ہے: ''انا قتلنا المسیح'' کہ ہم نے مسیح علیہ السلام کو قتل کیا اور نصاریٰ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھالیے گئے ہیں۔ لیکن رفع میں دو فریق تھے۔ ایک فریق کہتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام سولی پر قتل کئے گئے اور تمام امت کی جانب سے کفارہ ہو گئے۔ پھر تین دن بعد زندہ کر کے آسمانوں پر اٹھالیے گئے۔ قیامت میں نازل ہوں گے۔ دوسرا فریق کہتا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے ہاتھوں سے محفوظ، صحیح و سالم بچا کر آسمانوں پر زندہ اٹھالیا گیا اور دوسرا شخص ان کی جگہ مصلوب ہوا۔ پھر قیامت میں نازل ہوں گے۔ ''الجواب الصحیح لمن بدّل دین المسیح (ابن تیمیہ)'' ''اللہ تعالیٰ یہود اور نصاریٰ میں فیصلہ فرماتا ہے:'' وما قتلوہ یقیناً بل رفعه الله ''یعنی قائلین قتل غلطی پر ہیں۔ ان کو کچھ علم نہیں۔ محض تخمینہ اور اٹکل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جسم سمیت زندہ آسمان پر اٹھالیا ہے۔ یہود اور نصاریٰ کے جس فریق کا قول قتل کا تھا، دونوں کو بالکل غلط فرما کر اس کی نفی کر دی۔ آیت کریمہ میں لفظ ''بل'' آیا ہے جو ابطال ماقبل کے لئے آتا ہے۔ یعنی یہ بتانے کے لئے کہ میرا مابعد، ماقبل سے مغائر ہے۔ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کے رفع کے تو قائل تھے۔ رفع

جسمانی کے منکر تھے۔رفع روحانی کے عقیدہ کو اللہ تعالیٰ نے ''ما قتلوہ ما صلبوہ'' کہہ کر رد فرمایا۔یعنی ان کی روح جسم سے نکلی نہیں تو آسمان کی طرف جائے گی کیسے۔''بل رفعہ اللہ'' سے واقعہ کی تحقیق اور منشاء غلطی کا بیان ہے۔یعنی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے غائب ہو جانے سے غلطی میں پڑ گئے۔اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کے قتل کی نفی کی۔''بل'' ابطالیہ کا قبل و مابعد آپس میں متغائر ہوتے ہیں۔قتل جسمانی اور رفع روحانی باہم جمع ہو سکتے ہیں۔یہ متغائر نہیں۔تغائر اسی صورت میں ہوگا کہ قتل جسمانی کی نفی اور رفع جسمانی کا اثبات ہو۔اس لئے بل کے بعد ان کا رفع جسمانی بیان کیا۔اس آیت سے رفع ونزول مسیح تقریباً سات طرق سے ثابت ہوتا ہے۔اختصار کے پیش نظر اس پر اکتفاء کرتے ہیں۔(احتساب قادیانیت ج ۱۷ میں تفصیل اور وضاحت موجود ہے۔من شاء فلیراجع)اس کے علاوہ (نساء ۵۹،زخرف :۶۱،مائدہ:۱۱، ال عمران: ۴۵، ال عمران: ۵۵، مائدہ: ۱۱۶، ۱۱۷) سے بھی یہی مضمون ثابت ہوتا ہے۔صحیح احادیث جو کہ ایک درجن صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں اور جن کو تلقی بالقبول کی وجہ سے تواتر کا درجہ حاصل ہے، بھی رفع ونزول کے مسئلے کو مبرہن کرتی ہیں۔صرف ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

''عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ. واللذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکماً عدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیہ ویفیض المال حتیٰ لا یقبلہ احد حتیٰ تکون السجدۃ الواحدہ خیراً من الدنیا وما فیھا ......حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔عنقریب عیسیٰ ابن مریم تمہارے درمیان ایک عادل حاکم کے طور پر نازل ہوں گے۔وہ صلیب توڑ دیں گے۔خنزیر کو مار ڈالیں گے۔جزیہ کو ختم کر دیں گے۔مال کی اتنی ریل پیل ہوگی کہ اسے لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ایک سجدہ دنیا اور اس کی ہر چیز سے بہتر ہوگا۔[صحیح بخاری رقم: ۳۴۴۸، صحیح مسلم رقم: ۳۸۹، ترمذی رقم: ۲۲۳۳]

اس مسئلہ پر خلفاء اربعہ اور صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اٹھا لئے گئے ہیں۔پھر دوبارہ تشریف لا کر دجال کو قتل کریں گے۔اس میں کسی صحابی نے اختلاف نہیں کیا۔

[مشکوٰۃ: ۴۷۹، باب قصہ ابن صیاد، شرح السنہ: ۷/۴۵۴]

غامدی صاحب موجودہ تورات، زبور اور چاروں انجیلوں کو بالکل برحق قابل اعتبار اور قابل حجت واستدلال سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ سب خدا کی کتابیں (World of Allah) ہیں۔

[میزان: ۱۵۱]

حالانکہ اہل اسلام کا عقیدہ ان کے بارے میں یہ ہے کہ سابقہ تمام الہامی کتابیں اپنے اپنے

زمانے میں خاص قوموں کے لئے ہدایت تھیں۔ پھر یہ محفوظ نہیں رہیں۔ نزول قرآن سے قبل ہی دنیا سے ناپید ہو چکی تھیں۔ اب روئے زمین پر صرف اور صرف قرآن مجید ہی اللہ کا کلام ہے جو محفوظ بھی ہے اور پوری انسانیت کے لئے ہدایت وراہنما بھی۔ اب جب کہ غامدی صاحب انجیل کو اللہ کا کلام، قابل حجت مانتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ پھر رفع ونزول مسیح کا عقیدہ بھی مانیں اس لئے کہ انجیل سے بھی یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''اور یہ کہہ کر ان کے دیکھتے ہوئے اوپر اٹھایا گیا اور بدلی نے اسے ان کی نظروں سے چھپالیا اور وہ اس کو آسمان پر جاتے ہوئے تاکتے ہی تھے کہ دیکھو دو مرد سفید پوشاک ان کے پاس آ کھڑے ہوئے اور بولے اے جلیلی مردو! تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو۔ یہی یسوع تمہارے پاس سے آسمان پر اٹھایا گیا ہے۔ جس طرح تم نے اسے آسمان پر جاتے دیکھا ہے اسی طرح واپس آئے گا۔''

[انجیل اعمال باب:۱، آیات:۹ تا ۱۲]

انجیل یوحنا میں ہے:

''تم سن چکے ہو کہ میں نے تم کو کہا کہ میں (آسمان کی طرف) جاتا ہوں اور تمہارے پاس پھر آتا ہوں۔''

[انجیل یوحنا، باب:۱۴، آیت:۲۸]

ظہور مہدی علیہ الرضوان:

جمہور مسلمانان عالم کا از روئے احادیث متواترہ یہ عقیدہ ہے کہ قرب قیامت کے زمانے میں حضرت مہدی علیہ الرضوان تشریف لائیں گے۔ وہ خانوادہ سادات کے چشم وچراغ ہوں گے۔ نام محمد، والد کا نام عبداللہ اور ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زیر امارت دجال کے خلاف جہاد کریں گے۔ مرزائیوں اور جاوید غامدی صاحب کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی علیہ السلام نہیں آئیں گے۔ مرزائی تو کہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی خود مسیح بھی تھا اور مہدی بھی۔ یعنی ان کے نزدیک مہدی مرزا قادیانی کی شکل میں آچکا ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب کہتے ہیں:

''مہدی محض ایک افسانہ ہے جو مسلمانوں کے مابین رائج کر دیا گیا اور اب امت مسلمہ اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ کوئی مہدی آئے اور ایک مرتبہ پھر ان کی خلافت دنیا میں قائم کر دے گا۔ قرآن مجید میں نزول مہدی کے بارے میں اشارۃً بھی کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح صحیح حدیثیں بھی اس تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ البتہ بعض دوسرے درجے کی ایسی روایات ملتی ہیں جن میں قیامت کے قریب اس طرح کی ایک شخصیت کے پیدا ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان میں ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو نہ علمی لحاظ سے درست ہو سکتی ہیں نہ عقلی لحاظ سے۔ میرا رجحان اس معاملے میں یہ ہے کہ یہ روایتیں درحقیقت اگر کچھ تھیں بھی تو

سیدنا عمر بن العزیزؒ کے بارے میں تھیں۔ ان کے زمانے کے لوگوں نے اس کا مصداق پالیا اور وہ تاریخ میں اپنا کام مکمل کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے۔'' [ماہنامہ اشراق اکتوبر ۲۰۰۹ء]

غامدی صاحب، خدا جانے کیسے اتنی بڑی بات کہہ گئے کہ صحیح احادیث امام مہدی کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ اس لئے کہ امام مہدی علیہ الرضوان کا آنا تو متواتر احادیث سے ثابت ہیں۔ صرف دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

''عن ام سلمةؓ قالت: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول المهدی، من عترتی من ولد فاطمه [ابو داؤد: ۱۳۱/۲، ابن ماجه: ۳۰۰، باب خروج المهدی] ...حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ مہدی میرے خاندان سے ہوگا یعنی اولاد فاطمہ سے۔''

''عن علیؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: سیخرج من صلبه رجل یسمّی باسم نبیکم یشبه فی الخلق ولا یشبه فی الخلق ثم ذکر یملأ الارض عدلاً (ابو داؤد: ۱۳۱/۲، کتاب المهدی، مشکوٰۃ باب اشراط الساعة] .... حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی صلب سے ایک شخص نکلے گا جو آپ ﷺ ہی کے نام سے موسوم ہوگا اور اخلاق میں آپ ﷺ کے مشابہ ہوگا مگر خلقت میں نہیں ہوگا۔ وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا۔''

امام مہدی علیہ الرضوان کے متعلق وارد احادیث کے بارے میں قاضی شوکانی فرماتے ہیں:

''فتقرر أن الأحادیث الواردة فی المهدی المنتظر متواترة''[کتاب الاذاعۃ: ۷۷]

غامدی صاحب نے یہ جو گل افشانی کی ہے کہ میرا رجحان یہ ہے امام مہدی علیہ الرضوان کی روایات حضرت عمر بن العزیزؒ کے بارے میں ہیں۔ بالکل غیر معقول بات ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں صراحت ہے کہ حضرت مہدی علیہ الرضوان حضور ﷺ کے خاندان میں سے ہوں گے اور حضرت عمر بن العزیزؒ تو خاندان بنی امیہ میں سے تھے۔ وہ ان احادیث کا مصداق کیسے ہو سکتے ہیں؟

مسیح دجال:

اہل اسلام کا نظریہ ہے کہ دجال معہود ایک کانا شخص یہودی النسل ہوگا اور یہودی اس کی اتباع کریں گے۔ آخر زمانے میں بڑا فتنہ برپا کرے گا۔ خدائی کا دعویٰ کرے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتر کر اسے قتل کریں گے اور یاجوج ماجوج دو مخصوص قومیں ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے سب یک لخت مر جائیں گے۔ تمام جہاں میں تعفن اور ان کی لاشوں کی بدبو پھیل جائے گی۔ [الی آخر الحدیث مسلم: ۴۰۲/۲]

جاوید غامدی اور مرزا قادیانی کا عقیدہ دجال اور یاجوج ماجوج کے بارے میں قریب قریب ایک جیسا ہے۔ مرزا قادیانی کہتا تھا:

"دجال عیسائی پادریوں کا گروہ ہے۔" [ازالہ اوہام: ۲۹۶، خزائن: ۳/ ۳۶۶]

"یاجوج ماجوج انگریز اور روس ہیں۔" [ازالہ اوہام: ۵۰۲، خزائن: ۳/ ۳۶۹]

"یاجوج ماجوج مغربی اقوام (نصاریٰ) ہیں۔" [حقیقت الوحی: ۴۴، خزائن: ۲۲/ ۴۹۸]

غامدی دجال اور یاجوج ماجوج کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ نے قیامت کے قریب یاجوج ماجوج ہی کے خروج کو دجال کے خروج سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج و ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کے علمبردار ہیں اور اسی سبب سے نبی ﷺ نے انہیں دجال (عظیم فریب کار قرار دیا) قرار دیا۔" [بحوالہ غامدیت کیا ہے؟]

غامدی صاحب اور قادیانی نے دجال کے شخص معین ہونے کا انکار کیا۔ حالانکہ صحاح ستہ کی احادیث میں دجال کو شخص معین بتایا گیا ہے اور باقاعدہ اس کا حلیہ، جسامت اور قد کاٹھ کی صراحت کی گئی ہے۔

☆....."عن عبادة بن الصامت انه حدثهم ان رسول الله ﷺ قال: انی قد حدثتکم عن الدجال حتٰی خشیت ان لا تعقلوا ان مسیح الدجال رجل قسیراً فحج جعد اعور ممسوح العین لیس بناتئة ولا حجراء فان لبس علیکم فاعلموا ان ربکم لیس باعور [ابو داؤد: ۲/ ۱۳۴، باب خروج الدجال]..... حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تحقیق میں نے تم کو دجال کے متعلق بہت کچھ بیان کیا۔ یہاں تک کہ میں ڈرا کہ تم سمجھ نہ سکو گے۔ تحقیق مسیح دجال ایک پستہ قد آدمی ہوگا جو ٹانگیں پھیلا کر چلے گا۔ گھنگھریالے بال، کانا، ہموار آنکھ والا کہ زیادہ باہر نکلی ہوگی اور نہ پچکی ہوئی ہوگی۔ اگر تم کو اشتباہ ہو تو جان لو (کہ دجال کانا ہے اور) تمہارا رب کانا نہیں ہے۔"

☆.....حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرامؓ کو خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ آپ ﷺ نے حمد و ثناء بیان کی جیسا کہ بیان کرنے کا حق ہے۔ پھر آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ کیا اور فرمایا "انی انذرکموہ وما من نبی الا وقد انذر قومه لقد انذر نوح قومه ولکن سأقول لکم فیه قولاً لم یقل نبی لقومه اتعلمون انه اعور وان الله لیس باعور [بخاری کتاب الجهاد]..... کہ میں تمہیں اس (دجال) سے ڈراتا ہوں۔ کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا نہ ہو۔ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو دجال سے ڈرایا

تھا۔ لیکن میں تمہیں دجال کے بارے میں ایک ایسی بات بتارہا ہوں جو کہ کسی نبی نے اس سے پہلے اپنی قوم کو نہیں بتائی۔ تم جان لو کہ دجال کانا ہے اور (معاذ اللہ) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کانا نہیں ہے۔"

صرف صحاح ستہ میں بہت ساری احادیث ہیں جو دجال کے شخص معین ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اختصار کے پیش نظر صرف یہ دو ذکر کیں۔ مسلمانوں کے علاوہ عیسائی دنیا بھی جس دجال کو اپنی کتابوں کے حوالے سے جانتی ہیں وہ ایک معین شخص ہے نہ کہ صفت یا جوج ماجوج اور امریکہ۔ غامدی صاحب کو صاحب قرآن کی دجال کے حوالے سے یہ احادیث ماننی چاہئے۔ قادیانیوں کی طرح معقولیت کے ڈھکوسلوں اور ظاہر پرستی کے بھول بھلیوں میں پڑنے کی بجائے امت مسلمہ کے اجتماعی موقف کو تسلیم کرلیں۔

جہاد فی سبیل اللہ:

امت مسلمہ کا عقیدہ ہے کہ جہاد کا مسئلہ جو قرآن، احادیث اور آثار میں بیان ہوا ہے بالکل برحق ہے۔ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت تک فرض رہے گا۔ علی وجود الشرائط جہاد کے متعلق غامدی کا نظریہ اور مرزا غلام احمد قادیانی کا نظریہ سرتا سر مماثل ہے۔ دونوں جہاد کا انکار کرتے ہیں۔ جاوید غامدی لکھتے ہیں:

"انہیں (نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ کو) قتال کا جو حکم دیا گیا اس کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے۔" [میزان:۲۶۴]

مزید لکھتے ہیں:

"یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق (کفار) کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔" [میزان:۲۷۰]

"لوگوں کی تکفیر اور ان کے خلاف محض ان کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا ان پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔" [ماہنامہ اشراق اگست ۲۰۰۹ء]

غامدی صاحب کی تحریر یہ ظاہر کرتی ہے کہ جہاد دور نبوت میں ہوا ہے۔ اس کے بعد اگر مسلمانوں نے کچھ لوگوں کو غلطی سے کافر سمجھ کر ان کے خلاف جہاد وقتال کیا۔ یا ان سے مال غنیمت حاصل کیا۔ یا ان سے جزیہ وصول کیا۔ تو ان کے یہ سارے کام غیر شرعی، غیر اخلاقی اور خلاف قرآن ہیں۔

لئے کہ دور نبوت کے بعد جہاد کی حقیقت نہ رہی۔ یہ محض جھگڑا اور تخریب کاری ہے۔ جہاد کے متعلق یہی نظریہ جاوید غامدی کے پیش رو مرزا قادیانی کا بھی تھا۔ اس نے کہا تھا

اب چھوڑ دو اے دوستو جہاد کا خیال
دین کے لئے حرام ہے اب جنگ اور قتال

[ضمیمہ تحفہ گولڑویہ:۲۶،خزائن:۱۷/۷۶]

نیز لکھتا ہے:

''یہ بات تو اچھی ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کی مدد کی جائے اور جہاد کے خراب مسئلہ کے خیال کو دلوں سے مٹایا جائے۔'' [اعجاز احمدی:۳۴،خزائن:۱۹/۱۴۴]

مرزا قادیانی نے انگریز سرکار کی خوشنودی کی خاطر جہاد کو حرام قرار دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج غامدی صاحب امریکہ، یورپی یونین، اسرائیل اور بھارت کی رضا اور تعاون حاصل کرنے کے لئے جہاد وقتال کے فریضے کا انکار کر رہے ہیں اور اسے حرام اور خلاف شرع قرار دے رہے ہیں۔

دیکھئے! کس قدر مشابہت اور مماثلت ہیں۔ مرزا قادیانی اور جاوید غامدی کے درمیان کہ دونوں ہی بیک زبان جہاد کو حرام کہہ رہے ہیں۔ جہاد کی فرضیت اور یوم قیامت تک جاری رہنے کے قرآن کریم کی دو آیتیں اور ایک حدیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

۱......''کتب علیکم القتال (بقرۃ:۲۱۶]......اے مسلمانو! تم پر قتال (جہاد) فرض کیا گیا ہے۔''

۲......''قاتلوا اللذین لایؤمنون باللہ ولا بالیوم الأخر. [توبہ :۲۹]......(اے مسلمانو!) تم لڑو ان اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر، اور ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے۔ جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ سچے دین کو مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے (ذلیل) بن کر رہیں۔''

''عن ابی ہریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ: من مات ولم یغز ولم یحدث بہ نفسہ مات علیٰ شعبۃ من نفاق. [صحیح مسلم]......جو بندہ اس حال میں مر جائے کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور جہاد کا خیال بھی اس کے خاطر میں نہیں آیا تو وہ منافق کی موت مرا۔''

قادیانی فتنہ انگریزوں کے اشارے پر برپا کیا گیا تھا تاکہ مسلمانوں کے دل سے جذبہ جہاد کو ختم کیا جا سکے۔ قادیانی نے انگریزوں کی نمک خواری کا پورا پورا حق ادا کیا اور جہاد کو حرام قرار دے دیا۔ آج کل جاوید غامدی صاحب وہی کام کر رہے ہیں۔ اپنے آقاؤں کی غم خواری اور نمک حلالی کر رہے ہیں۔

حجیت حدیث:

احادیث مبارکہ محدثین کی اصطلاح میں حضور ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو کہتے ہیں۔ احادیث مبارکہ کی گرانقدر امانت حضور ﷺ سے صحابہؓ، صحابہ کرامؓ سے تابعینؒ، تبع تابعینؒ کے اور پھر ہر دور میں ایک جماعت سے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہے۔ غامدی صاحب نے دوسرے عقائد و اعمال کی طرح احادیث پر بھی اپنا زہریلا پنجہ مار دیا۔ لکھتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے ان کے بارے میں دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم انہیں ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لئے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی علم یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔ حدیث سے متعلق یہی دو حقائق ہیں جن کی بناء پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ نہیں ہوتا" [میزان ۶۸]

انکار حدیث کے لئے بطور مقدمہ کے غامدی صاحب نے جو دو دعوے پیش کئے وہ بالکل بے بنیاد اور مبنی بر جہل ہے۔ پہلی بات کہ آپ ﷺ نے احادیث کی حفاظت و اشاعت کا اہتمام نہیں کیا، غلط اور بے اصل ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو احادیث سننے، ان کو حفظ کرنے اور ان کی کتابت تحریر کرنے کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ نے حفظ اور کتابت دونوں ذرائع سے کام لیتے ہوئے احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام فرمایا۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

"نضر الله امرأ سمع منا حديثاً فحفظه حتىٰ يبلغه غيره۔ [ترمذی رقم: ۲۶۵۶]..... کہ اللہ اس آدمی کو تر و تازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سن کر یاد کر لی اور اسے دوسروں تک پہنچا دیا۔"

اسی طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ کے روز جو خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں فرمایا:

"ویبلغ الشاهد الغائب [بخاری: ۱۵۴]..... کہ ضروری ہے جو یہاں حاضر ہے وہ میری باتیں غائبوں تک پہنچائے۔"

صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ یاد کر لیا۔ اسے لکھ کر محفوظ کیا۔ اس پر عمل کیا اور اسے دوسروں تک پہنچا دیا۔ مرزا قادیانی بھی احادیث مبارکہ کا انکار کرتا ہے۔ لیکن وہ ایک قدم بڑھ کر سخت بے ادبی کے الفاظ استعمال کر کے احادیث مبارکہ کی توہین بھی

کرتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:

"میرے اس دعویٰ کی بنیاد حدیث نہیں بلکہ قرآن مجید اور وحی ہے جو میرے پر نازل ہوئی۔ ہاں تائیدی طور پر ہم وہ حدیثیں پیش کرتے ہیں جو قرآن شریف کے مطابق اور میری وحی کے معارض نہیں اور دوسری حدیثوں کو ہم ردی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔" [اعجاز احمدی: ۳۰، خزائن: ۱۹/۱۴۰]

جاوید غامدی نے بھی احادیث کو ناقابل استدلال قرار دیا اور دین سے خارج قرار دیا اور مرزا قادیانی نے بھی ناقابل اعتبار گردانا۔ فرق صرف یہ کہ غامدی صاحب نے تمہید باندھ کر اور الفاظ کو گھما پھرا کر احادیث کی حجیت سے انکار کیا ہے اور مرزا قادیانی نے اپنے اخلاق کا مظاہرہ کر کے خوب دھڑلے سے انکار کیا۔

توہین صحابہ کرامؓ:

اہل اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد اس دھرتی پر ہر انسانی آبادی میں جو طبقہ سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بنا، وہ حضرات صحابہ کرامؓ ہیں۔ قرآن پاک اس گروہ کو اللہ کی جماعت قرار دیتا ہے اور اللہ کی رضا کا سرٹیفکیٹ عطاء کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے بھی اس جماعت کو ہدایت کے ستارے قرار دیا اور فرمایا: خبردار! ان کو اذیت پہنچانا مجھے اذیت پہنچانا ہے۔

عمار خان ناصر علم و فضل کے افق پر سرتاسر سفر کرنے والے خاندان کے چشم و چراغ ہیں، غامدی طرز فکر اور آزاد خیالی کے ترجمان ہیں اور اس کی اشاعت و ترویج کے لئے اپنی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار لائے ہوئے ہیں۔ اپنی کتاب "حدود و تعزیرات" میں لکھتے ہیں:

"صحابہؓ کا عورت کی نصف دیت پر اجماع کرنا زمانہ جاہلیت کے معاشرتی تصورات اور رسم و رواج سے متاثر ہونے کی بناء پر تھا۔" [حدود و تعزیرات: ۱۰۵]

مزید لکھتے ہیں:

"اس معاشرے میں آپ ﷺ کے تربیت یافتہ اور بلند کردار صحابہؓ کے علاوہ منافقین اور تربیت سے محروم کمزور مسلمان کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو مختلف اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں میں مبتلا تھی۔ اس طرح کے گروہوں میں نہ صرف پیشہ ورانہ بدکاری اور یارآشنائی کے تعلقات کی مثالیں پائی جاتی تھیں بلکہ اپنی مملوکہ لونڈیوں کو زنا پر مجبور کر کے ان کے ذریعے کسب معاش کا سلسلہ بھی جاری وساری تھا۔"

[مفتی عبدالواحد کی تنقیدات کا جائزہ: ۴۳]

عمار صاحب کی اس تحریر میں ہمیں اس پر ہرگز اعتراض نہیں کہ اس نے منافقوں کے لئے پیشہ

دارانہ بدکاری' وریار آشنائی جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اشکال اس بات پہ یہ ہے کہ اس نے منافقین کے ساتھ'' تربیت سے محروم کمزور مسلمان'' کو بھی ملایا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ کے دور میں بالفرض اگر کوئی مسلمان کمزور بھی ہے اس کی شان میں بھی ہم جیسوں کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا سوءادب اور گستاخی ہے۔اس لئے کہ اس دور میں جتنے مسلمان تھے ان کو رب تعالیٰ نے اپنی رضا کی سند تھی۔حضور نبی اکرم ﷺ نے اس گروہ باصفا پر طعن و تشنیع کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ،فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔اسی لعنت کا مستحق مرزا قادیانی بھی ٹھہرا ہے۔اس نے بھی صحابہ کرامؓ کے خلاف سوقیانہ اور توہین آمیز زبان کا استعمال کیا ہے۔ایک دو نمونے ملاحظہ فرمائیں:

- ''ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) جو غبی تھا اور درایت اچھی نہیں رکھتا تھا۔''

[اعجاز احمدی:۱۸،خزائن:۱۹ر۱۲۷]

- ''ابوبکر و عمرؓ کیا تھے وہ تو حضرت غلام احمد کے جوتیوں کے تسمے کھولنے کے لائق نہ تھے۔''

[ماہنامہ المہدی جنوری ۱۹۱۵ء]

قرآن کی من مانی تفسیر:

اپنے پیش رو مرزا قادیانی کی طرح غامدی صاحب بھی قرآن کی من مانی تفسیر،الفاظ کو کھینچ تان کر اپنے مطلب کی بات نکالنے کی طاق میں ہیں۔قرآن کی معنوی تحریف اور جمہور امت سے ایک الگ اعتزال کا راہ اپنانا اور ایک امتیازی رائے رکھنا اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہے۔''اسلام کے حدود وتعزیرات'' پر حضرت کی خامہ فرسائی ملاحظہ فرمائیں۔

''موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جاسکتی۔اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان دو جرائم کو چھوڑ کر،فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے۔''

(سورۃ) مائدہ میں ہے:''من قتل نفساً بغير نفسٍ او فسادٍ في الارض فكانّما قتل الناس جميعاً ......جس نے کسی کو قتل کیا اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو،یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا۔[میزان:۲۸۳]

محولہ بالا عبارات میں غامدی صاحب نے یہ مغالطہ اور فریب دیا کہ سورۃ المائدہ کی پوری آیت نہیں لکھی۔کیونکہ اگر وہ پوری آیت لکھ دیتے تو اس سے وہ اپنا من پسند مفہوم کشید نہیں کر سکتے تھے۔اس لئے انہوں نے مذکورہ آیت کا صرف اتنا حصہ لکھا جس سے ان کو اپنا خود ساختہ مفہوم نکالنے میں آسانی ہو۔

دراصل مذکورہ آیت کے مضمون کا تعلق بنی اسرائیل کے ساتھ ہے۔ اسلامی حدود و تعزیرات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے قانون کا ایک اصول ذکر فرمایا ہے۔ سورۃ مائدہ کی اس آیت کی جو تفسیر غامدی نے کی ہے اس کے استاذ امین حسن اصلاحی سمیت امت میں کسی عالم نے یہ تفسیر نہیں کی۔ کسی نے اس کو حدود و تعزیرات کا ماخذ نہیں سمجھا۔ جاوید غامدی جمہور امت کی کی گئی تفسیر میں غلطیاں نکال رہے ہیں۔ جس طرح مرزا قادیانی اپنے بارے میں کہتا ہے:

''میں قرآن کی غلطیاں نکالنے آیا ہوں جو تفسیروں کی وجہ سے واقع ہو گئی ہیں۔''

[ازالہ اوہام: ۷۰۸، خزائن: ۳/۴۸۲]

اسی طرح سورۃ الفیل کی بھی غامدی صاحب نے وہ تفسیر کی ہے جو سلف سے خلف تک کسی مفسر نے نہیں کی۔ [ملاحظہ ہو البیان: ۲۳۹]

سورۃ نصر مکی ہے:

اہل علم و دانش بخوبی جانتے ہیں کہ سلف و خلف کے تمام مفسرین کے نزدیک سورۃ نصر مدنی ہے اور اس کے مدنی ہونے پر سب کا اتفاق و اجماع ہے۔ جناب جاوید غامدی صاحب نے امت سے امتیازی رائے رکھنے کی قسم کھائی ہے۔ یہاں بھی اس کا راستہ وہ ہے جو امت میں سوائے مرزائیوں کے بعض مفسرین کے کسی نے نہیں رکھا۔ غامدی صاحب کا اصرار ہے کہ سورۃ نصر مکی ہے۔ اپنی تفسیر ''البیان'' میں لکھتے ہیں:

''سورۃ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے یہاں اس سورۃ (النصر) کے مقام سے واضح ہے کہ سورۃ کوثر کی طرح یہ بھی، ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلہ ہجرت و برأت میں آپ ﷺ کے لئے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی۔'' [البیان: ۲۵۲]

اسی بات کو دوسرے مقام پر مختصر اور واضح طور پر یوں فرماتے ہیں:

''ساتواں باب سورۃ ملک سے شروع ہو کر سورۃ الناس پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں آخری دو معوذتین مدنی اور باقی سب مکی ہیں۔'' [البیان: ۶]

سورۃ نصر کے بارے میں یہی رائے مرزائیوں کے لاہوری گروپ کے بانی مولوی محمد علی کی بھی ہے۔ اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''سورۃ کا نام نصر ہے۔ اس میں تین آیتیں ہیں۔ اس کو مکی سورتوں کے مجموعہ میں شامل کیا جاتا ہے۔''

[بیان القرآن: جلد سوم، سورۃ النصر]

مرتد کی سزائے قتل سے انکار:

یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف لوٹ جائے۔ ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتل مرتد کے معاملے میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائے نہیں پائی گئیں۔ نبی ﷺ خلفاء راشدین، کبار صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ اور ان کے بعد ہر صدی کے علماء شریعت کی تصریحات کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے دیکھ لیجئے۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دور نبوت سے لے کر آج تک اس مسئلے میں ایک ہی حکم مسلسل و متواتر چلا آ رہا ہے اور کہیں اس شبہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی کہ شاید مرتد کی سزا قتل نہ ہو۔ غامدی صاحب نے ایسے ثابت شدہ مسائل میں بھی روشن خیالی سے متاثر ہو کر اختلافی بحث کا دروازہ کھولا اور امت کے اس اجتماعی موقف سے انکار کر کے مرتد کی سزا کے بارے میں یہ امتیازی رائے اختیار کی۔ ملاحظہ ہو:

''ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے۔ ''من بدل دینا فاقتلوه...... کہ جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اسے قتل کر دو'' ہمارے فقہاء بالعموم اسے ایک عام حکم قرار دیتے ہیں۔ جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا اسے اس حدیث کی رو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ اس معاملے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں اور اگر دی جائے گی تو اس کی مدت کیا ہونی چاہئے''

مزید لکھتے ہیں:

''لیکن فقہاء کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم تو بے شک ثابت ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا۔ بلکہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا۔ جس میں آپ کی بعثت ہوئی... ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کو مدعا سمجھنے کی بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود وتعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کیا جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں۔'' [برہان: ۱۳۹ تا ۱۴۳]

جاوید غامدی صاحب کی اس متفردانہ رائے کے جواب میں مولانا مودودی صاحب کی عبارت پیش کرتے ہیں جن سے بقول پروفیسر مولانا محمد رفیق صاحب ''غامدی بہت متاثر تھے اور کئی سال ان کی جماعت کے کارکن رہے۔'' ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے مرتد کی سزا پر اعتراضات کرنے والوں کے

جواب میں لکھا ہے:

''ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے ''مولویوں'' نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو۔ان کو اطمینان دلانے کے لئے میں یہاں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوالزکوٰۃ فأخوانکم فی الدین ونفصل الآیات لقوم یعلمون وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا أئمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون (توبہ)'' یہ آیت سورہ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ ہجری میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلان برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔اس اعلان کا مقاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور اس کے رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کرلیں،معاف کردیئے جائیں گے۔ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں۔مدت مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو،ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔اس سلسلے میں فرمایا کہ اگر وہ توبہ کرکے ادائے نماز وزکوٰۃ کے پابند ہوجائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی۔بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کا معنی ''اقرار اسلام سے پھر جانا'' متعین کردیتا ہے اور اس کے بعد ''فقاتلوا ائمۃ الکفر'' کا معنی سوا اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔'' [مرتد کی سزا اسلامی قانون میں،مودودی صاحب:۲،۳]

یہ تو تھا قرآن کا حکم،احادیث کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔جس میں مرتد کی سزا قتل ہی تجویز کی گئی ہے۔صرف ایک حدیث پر اکتفاء کرتے ہیں۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے:

''من بدل دیناً فاقتلوہ......جو مسلمان اپنا دین بدل دے اسے قتل کردو۔'' [بخاری،رقم:۶۹۲۲]

یہ حدیث حضرت ابوبکرؓ،حضرت عثمانؓ،حضرت علیؓ،حضرت معاذ بن جبلؓ،حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ،حضرت عبداللہ بن عباسؓ،حضرت خالد بن ولیدؓ اور متعدد دوسرے صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور تمام معتبر کتب حدیث میں موجود ہے۔

غامدی صاحب نے اس مسئلہ میں قادیانیوں اور دیگر فتنہ پرور مرتدوں کو محفوظ راستہ دینے کے

لئے بالکل ایک، الگ، انوکھا اور امتیازی مذہب رائے اختیار کیا۔ اسی سے ملتا جلتا مسئلہ تکفیر کا ہے۔ اس میں بھی غامدی صاحب نے پوری امت سے بالکلیہ ایک الگ اور شاذ راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ صرف پیغمبر ہی کسی شخص یا گروہ کی تکفیر کر سکتا ہے۔ کسی غیر نبی، عالم، فقیہ یا مفتی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی شخص یا گروہ کو کافر قرار دے۔ ایک سوال کے جواب میں غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے۔ یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں۔'' [اشراق دسمبر ۲۰۰۰ء]

غامدی صاحب کی یہ رائے بالکل غلط، بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ خلفاء راشدین سے لے کر آج تک ایسے لوگوں کی ہمیشہ تکفیر کی گئی ہے جو ضروریات دین میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتے رہے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے اپنے دور خلافت میں مدعیان نبوت اور مانعین زکوٰۃ کو کافر قرار دے کر ان کے خلاف جہاد کیا تھا۔ ماضی قریب میں امت مسلمہ نے اجماعی طور پر مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو کافر قرار دیا تھا۔ ریاض احمد گوہر شاہی کے دعویٰ مہدویت پر پاکستان کے قریباً ایک ہزار علماء نے اسے کافر قرار دیا تھا۔ یوسف کذاب کے دعویٰ نبوت و مہدویت کرنے کے بعد پاکستان کی عدلیہ اور تمام مسلمانوں نے اسے کافر اور کذاب کہا۔ غامدی صاحب دراصل تکفیر کا حق مسلمان سے چھین کر کے اپنے لئے اور اپنے سنگی بھائیوں مرزائیوں، بہائیوں وغیرہ کو محفوظ راستہ دینا چاہتا ہے۔

غامدی صاحب کے ایک دو مسائل میں امت مسلمہ سے امتیازی رائے نہیں بلکہ وہ اسلام کے متوازی ایک الگ مذہب کے علم بردار ہیں۔ ایمانیات، قرآنیات، حدیث و سنت، عبادات، معاشرت، سیاست و ریاست فقہی مسائل اور متفقہ اسلامی عقائد و اعمال کے چیدہ چیدہ مسائل کی ایک بڑی لسٹ ہے۔ جن میں غامدی صاحب نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے۔ سب کا احاطہ کرنا وقت اور مناسب موقع کا متقاضی ہے۔ اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ خداوند قدوس سے دست بدعا ہیں کہ ہمیں تا دم مرگ ایمان کامل کے ساتھ رکھے اور ایسے نئے روشن خیال روشنی سے امت مسلمہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین! ☆☆

مولانا مفتی محمد خالد، لاہور

غامدی اُصول تفسیر و تصور سنت

پیش نظر سطور میں اصل مقصود تو موسیو (جناب) جاوید احمد غامدی کے اصول تفسیر پر ہی کچھ عرض کرنا ہے، جنہیں وہ ''تدبرِ قرآن کے اصول'' سے موسوم کرتے ہیں۔لیکن ان کے اصول تفسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقت تک پہنچنے میں ہمیں جن مراحل کا سامنا کرنا پڑا اور جن راہوں پر چل کر ان مراحل سے نجات حاصل ہوئی، ان کو اجمالاً ذکر کرنا بھی ایک حد تک ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ اگر کوئی بندۂ خدا براہِ راست موسیو جاوید غامدی کی تحریروں کا مطالعہ کرنا چاہے تو اسے پہلے سے کچھ اندازہ ہو کہ کس مرحلے میں کس راہ پر ہو کر چلنا ہے کہ ایمان بچ جائے۔ کہاں کھائی ہے کہاں پتھر، کہاں مار و کژدم ہیں اور کہاں خار و اخگر۔۔۔''شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد''

دراصل موسیو جاوید احمد غامدی کے فرمودات کی حقیقت تک پہنچنا اور ان کی بات کے اصل منشا کو سمجھنا ذرا غور طلب کام ہے۔ یہ گتھی ہمارا غالب گمان ہے کہ ''اہلِ غامد نے بڑی سوچ کے اُلجھائی ہے'' کیونکہ اس کے اُلجھانے سے ہی اُن کے کئی کام سلجھتے اور مطلوبہ مقاصد پورے ہوتے ہیں۔تو اولاً ہم موسیو جاوید غامدی کے اختراع کردہ مذہب اور اس کی تبلیغ کے لیے اختیار کردہ اندازِ نگارش پر اپنے محسوسات اور تبصرہ بیان کریں گے، اس کے بعد ان کے اصولِ تفسیر پر گفتگو کی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس مذہب کے اُصول و عقائد اور کلامیات سے لے کر جزوی فروعی مسائل اور عملیات تک اتنی گمراہیاں اور مغالطے ہیں کہ ہمیں اِس بات کا خدشہ ہے کہ جب ہم ان کو سادہ الفاظ میں تفصیل سے بیان کریں گے تو سننے والے یہی نہ کہنے لگیں کہ ''نہیں صاحب! یہ نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کا ایک رہنما اور دینی پیشوا، جس کے متبعین بھی کثیر تعداد میں ہوں، یوں برسرِ عام اور برسرِ ٹی وی ایسی واضح سراسر خلاف اسلام باتیں کیسے کرسکتا ہے؟'' یا اِسی بات کو دوسرے زاویے سے یوں کہہ لیا جائے کہ ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر اِس شخص کو اَب تک مسلمان کیسے اور کیوں باور کیا جاتا ہے؟'' حقیقت تو یہ ہے کہ ہم بھی یہی سوچتے ہیں کہ آخر اِن سب باتوں کے سامنے آجانے کے باوجود، موسیو غامدی کو مسلمان کیوں باور کیا جاتا ہے؟ شاید اِس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے افکار کو مکمل مضمرات سمیت سمجھا نہیں گیا اور نہ ہی اس بات کی

بھرپور وضاحت ہو سکتی ہے کہ اس مذہب کے مسلمات کی کتنی گہری چوٹ اسلام کے کیسے بنیادی عقیدوں پر جا کر پڑتی ہے۔

بس ایک بار پیچیدہ و پرشکوہ الفاظ و تراکیب اور موسیو جاوید غامدی کی وضع کردہ، نوزائیدہ اور عجیب الخلقت اصطلاحات کا زرنگار جال سلامتی سے عبور ہو جائے تو غامدی دھرم کی اسلام سے عین متصادم خطرناک حقیقتوں کا ادراک کوئی مشکل کام نہیں۔ مثال دی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ غامدی دھرم کی حقیقت بس اتنی ہے کہ انتہائی مہلک اور ایمان کش زہریلے سانپ کو ایک خوشنما اور خوش رنگ بلوریں مرتبان میں بند کر دیا گیا ہے۔ جس شخص نے اس خوبصورت مرتبان میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کی بے مثال کشیدہ کاریوں کے پس پردہ ایک مرتبہ جھانک کر اندر موجود چیز کو دیکھ لیا، وہ تو اس کے قریب پھٹکنے سے بھی دور بھاگے گا، اور جو بدنصیب اس کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر اس میں موجود چیز کو پانے کی خاطر اس میں ہاتھ ڈال بیٹھا، شاید اس میں بیٹھے ایمان کش سانپ کے ڈس جانے کے بعد اسے یہ سمجھنے کا موقع بھی نہ مل سکے کہ اس کی حیات ایمانی کا چراغ کیسے یکا یک گل ہو گیا۔ امید ہے کہ مجلہ صفدر کا یہ شمارہ ان شاء اللہ غامدی دھرم کی اصلیت اور حقیقت کو واضح کرنے کے لئے سرمۂ بصیرت، اور مارگزیدوں کے لئے تریاق ثابت ہو گا۔

ایمان داری کی بات ہے کہ ہمیں خود ان کی واضح کافرانہ تصریحات پڑھتے ہوئے بہت اچنبھا محسوس ہوا اور حیرت کی کیفیت میں شاید کئی بار حقیقتاً آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لفظوں کو گھورا کہ کیا.....؟ واقعی .....؟ یہی لکھا ہے.....؟ اور پھر لکھے ہوئے لفظوں اور اپنی بصارت کو جھٹلانے پر قدرت نہ پاتے ہوئے تسلیم کرتے ہی بنی کہ ہاں.....! واقعی! یہی لکھا ہے! شاید ابھی یہ باتیں مبالغہ آرائی محسوس ہوں، لیکن چند ہی صفحوں میں ان شاء اللہ سیاق و سباق سمیت، مکمل حوالوں کے ساتھ اس دھرم کی یہ ساری حقیقت بے نقاب ہو جائے گی۔

یہی اُلجھا ہوا چیستانی اُسلوب اِس دھرم کا پاسبان اور مبلغ اعظم ہے اور اسی کی بنا پر موسیو جاوید غامدی کی گمراہی ایسی واضح ہونے کے باوجود یہ مذہب اتنا بڑا فتنہ بن چکا ہے کہ اپنے تصلب، دینی حمیت، علمی پختگی اور رسوخ نظر کے لیے خاص طور پر معروف علمائے دیوبند میں سے بھی چند افراد اس دام میں آگئے ہیں۔ حتی کہ کئی بڑے بڑے علماء آج کلی نہیں تو جزئی طور پر ہی سہی، برملا اس مذہب کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں اور شعوری نہیں تو لاشعوری طور پر اسی کا پرچار کر رہے ہیں۔ اس سارے فساد کی بنیاد صرف اور صرف موسیو جاوید غامدی کی مذکورہ قلمی شعبدہ بازی ہے۔ وہ اپنے مطلب کی بات کو ایسے

طریقے سے مخاطب کے ذہن میں اتارتے ہیں کہ اس بیچارے کو مطلق احساس نہیں ہو پاتا کہ اس کے ساتھ کتنی بھیانک واردات ہوگئی ہے۔

اس مقصد کے لیے ان کی بنیادی تکنیک یہ ہے کہ پہلے تو اپنی دین فہمی پر دال چند ایسے دعوے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بیچارہ رعبِ علم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس رعب کو اپنی نوزائیدہ اور عجیب الخلقت اصطلاحات کی سان پر رکھ خوب دھار بناتے ہیں، اور "قطعی، یقینی، پختہ، بالکل واضح" جیسے الفاظ کے جلو میں بلند بانگ دعوے کرتے ہوئے مخاطب کو پوری طرح فتح کر لیتے ہیں۔ پھر اپنے اس ہوائی رعب اور منصب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور خود کو بنی نوع انسان کا ایک عظیم دماغ رکھنے والا عالم باور کرواتے ہوئے رطب و یابس پر مبنی چند ملی جلی باتوں کا ایسا ملغوبہ سا بنا کر سامنے رکھ دیتے ہیں جن میں بعض باتیں درست اور اہل سنت کے مسلک کے مطابق بھی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک تو ان کے علمی مقام کا تراشا ہوا بت، دوسرے یہ باتیں، اب کسی کو ان کے یہ افکار کلی طور پر رد کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور جب ذہن ان درست باتوں کو قبول کرتا ہے تو ان کی آڑ میں غامدی دھرم کے اصول بھی ساتھ ہی راہ پا جاتے ہیں اور موسیو اسلام کے بارے میں شک کا زہر انڈیلنے میں تو کامیاب رہتے ہی ہیں، اپنے مذہب کا بیج بھی ساتھ ہی کاشت کر دیتے ہیں۔

"مکالمہ" کے عنوان سے غامدی شعبدہ بازیاں:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان معروضات کے پیش کرنے سے اس وقت ہمارا مقصد نہ ملتِ غامدیہ سے مکالمہ کرنا ہے نہ ہی سردست انہیں سمجھانا یا نصیحت کرنا پیش نظر ہے۔ ہمارا مقصدِ وحید یہ ہے کہ غامدی دھرم کو جو اسلام سے تباین اور تناقض کی نسبت ہے اسے واضح کر کے بیان کر دیں۔ دیگر الفاظ میں ہمارا روئے سخن غامدیہ کے پیروکاروں کی جانب نہیں بلکہ برادرانِ اہلِ سنت کی طرف ہے اور ہم انہیں صرف یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ غامدی دھرم اسلام کے کتنا الٹ اور کیسا برخلاف مذہب ہے۔

ہم ان سے مکالمہ کیوں نہیں کرنا چاہتے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عقلی تقاضوں کے مطابق مباحثے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین کے درمیان کوئی ایسی قدرِ مشترک پائی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو اور اس کی روشنی میں مختلف فیہ مسائل حل کیے جائیں۔ مباحثے کے لیے قدرِ مشترک اور متفق علیہ مسلمات کی ضرورت خود موسیو جاوید غامدی کو بھی تسلیم ہے اور ان کے اپنے بیان کے مطابق، اسی ضرورت سے انہوں نے قرآن کا غامدی ایڈیشن تیار کیا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اسلامی روایات اور اصولِ تفسیر کی پابندی کی جائے تو قرآن مجید یہود و نصاریٰ پر حجت نہیں بن سکتا کہ یہ ان کے معتقدات کے مطابق نہیں ہے۔ اب موسیو غامدی نے تو یہود و نصاریٰ پر حجت تام کرنے کے لیے قرآن اور حدیث کا حلیہ بگاڑ کر اسے ان کے معتقدات کے مطابق بنا دیا

ہے بلکہ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر بائبل کو اور یہود ونصاریٰ سمیت مشرکین مکہ کی ''روایات'' کو قرآن پر حاکم بنا دیا ہے۔ لیکن ہمارے اندر اپنے دین وایمان تک کو قربان کر دینے کی یہ بے مثال ہمت نہیں اس لیے ہم غامدی دھرم پر اسلام کو حجت بنانے کے لیے اسلام کے اصول کا حلیہ بگاڑنے سے معذور ہیں اور اس لیے غامدی صاحب کی ان بے اصولیوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہمارا ان سے مکالمہ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔

یہ ایک الگ بات ہے کہ حجت قائم کرنے کا شوشہ بھی موسیو غامدی کا محض ایک شعبدہ ہے جس کے ذریعے وہ اسلام کا حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ ورنہ کیا ان کے اصول کے مطابق ہی غامدی دھرم یہود ونصاریٰ کے خلاف حجت تسلیم کر لیا گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ درحقیقت یہود ونصاریٰ پر حجت قائم کرنے کی اس چھتری تلے صرف اور صرف اسلامی عقائد واحکام پر قصابانہ جراحت کا شاہکار انتہائی خوفناک شب خون مارا گیا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، مباحثے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین کسی اصول پر متفق ہوں اور پھر اس کی بنیاد پر بات بڑھائی جائے۔ اِدھر غامدی دھرم کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ان کا اور ہمارا کوئی بھی منہجِ استدلال ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ مثلاً ہم قرآن کو دین وشریعت کے احکام کا ماخذ اصلی مانتے ہیں، وہ نہیں مانتے۔ ہم سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ لیتے ہیں، وہ اس سے یہود ونصاریٰ کے طریقے مراد لیتے ہیں۔ ہم حدیث شریف کو ماخذ شریعت تسلیم کرتے ہیں، وہ نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک اجماع امت حجتِ شرعیہ ہے، ان کے نزدیک اجماع محض ایک افسانہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قرآن، حدیث، سنت، اجماع کا جگہ جگہ حوالہ بھی دیتے نظر آتے ہیں اور ان سب کو تسلیم کرنے کا جھانسہ بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ دیتے ہیں! اس دورنگی، شعبدہ بازی اور بازیگری کے ساتھ ان سے ''مکالمہ'' کون کرے اور کیسے کرے؟

ویسے بھی، ہمارا سمجھانا اور ہمارا مکالمہ کرنا تو ایک طرف رہا، فرض کیجیے اگر کتب احادیث میں مشہور زمانہ پہلی حدیث شریف انما الاعمال بالنیات کی بجائے یہ ہوتی کہ ''سن دو ہزار سات میں ''میزان'' نامی کتاب لکھنے والا شخص اور المورد کا بانی ''جاوید احمد غامدی'' ایک گمراہ شخص ہوگا اور اس کا اختراع کردہ دھرم، اسلام کے بالکل مخالف اور متوازی ایک نیا گمراہی پر مبنی دھرم ہوگا جس کی پیروی کرنے والے اسلام سے دور ہو جائیں گے'' تو کیا موسیو اس حدیث کو تسلیم کر لیتے؟ اور کیا اپنی روش سے باز آجاتے؟ ہمارا خیال ہے کہ موسیو فرماتے کہ یہ بات دین میں ایک نئے حکم کا اضافہ ہے جو خبرِ واحد سے ممکن نہیں، لہٰذا ہم اِسے تسلیم نہیں کرتے۔ ایک قدم آگے بڑھ کر فرض کیجیے کہ یہ بات حدیث متواتر میں آئی ہوتی اور ہر زمانے کے علماء کا بلکہ عوام تک کا اس بات پر اجماع ہو چکا ہوتا، تب بھی کیا موسیو جاوید احمد غامدی اس کو تسلیم کر لیتے؟ غامدی دھرم

کے علمِ کلام اور اصولِ جدل کے مطابق جہاں تک ہمارا خیال ہے، ان کا جواب یہ ہوتا کہ اجماع تو محض ایک علمی افسانہ ہے، اس کی وجہ سے ہم پر کیسے کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے؟ بلکہ مزید ایک قدم آگے بڑھ کر فرض کیجیے کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید ہی کی کسی آیت میں یہ بات ارشاد فرمادی ہوتی تب بھی کیا موسیو جاوید احمد غامدی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے؟ ہرگز نہیں...... بلکہ ہمیں پورا یقین ہے کہ وہ اپنے اصولِ تدبر و تفسیرِ قرآن کی بنا پر جواب میں فرماتے کہ قرآن مجید تو ... گذشت انذار ہے، اور شرعی احکام کا اصل ماخذ انسانی فطرت اور دین ابراہیمی کی روایت ہیں، لہٰذا یہ آیت ہمارے خلاف کسی بھی درجے میں حجت نہیں ہے۔

جی ہاں، یہ ہمارے لیے حیرت کی بات تو ہے لیکن یہ عین حقیقت ہے، قرآن مجید کے بارے میں ان کا عقیدہ یہی ہے اور قرآن مجید کا درجہ ان کی نظر میں محض اتنا ہی ہے۔ غامدی دھرم کے اصولِ تفسیر کے مطابق حقیقت میں ان کے نزدیک شریعت کے احکام کا ماخذ قرآن مجید ہرگز نہیں ہے، بلکہ ایک ایسا چیستان ان کے نزدیک احکامِ شریعت کا ماخذ ہے جسے وہ سنت کہتے ہیں اور اس سے مراد دینِ ابراہیمی کی روایت وغیرہ لیتے۔ یہی ان کے نزدیک شرعی اور عملی احکام کی اصل بنیاد ہے اور نہ صرف شرعی اور عملی احکام کی بنیاد بلکہ قرونِ ماضیہ کی اخبار و تاریخ کے لیے بھی صحفِ اولیٰ ہی ماخذ ہیں۔

تو اس مفروضے کے تحت، جب حدیث صحیح، حدیثِ متواتر، اجماعِ امت اور خود قرآنِ پاک بھی ان سے کوئی بات نہیں منوا سکتا تو ہمارا اس باب میں منہ کھولنا تو بالکل ہی بے جا ہوگا۔ ہاں، ممکن ہے کہ وہ ''دینِ ابراہیمی کی روایت'' اور ''صحفِ اولیٰ'' کی کسی دلیل سے مطمئن ہو سکتے، مگر اس قلمرو میں جانے سے ہمیں تو اسلام نے منع کر رکھا ہے، اس لیے وہاں سے ان کا مطلوبہ سامان فراہم کرنا ہمارے بس سے باہر ہے۔

تو گویا غامدی صاحب کے بنائے ہوئے نرالے اصولوں کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے مکالمہ کرنا اور انہیں کوئی بات دلیل سے سمجھانا یا منوانا اپنے لیے ناممکن سمجھتے ہوئے ہم اسی میں عافیت سمجھتے ہیں کہ بس جو کچھ خامہ فرسائی ہمارے لیے ممکن ہے، اسے ان کے مذہب کے تعارف اور اسلام سے اس کے تقابل کی وضاحت پر ہی صرف کریں تاکہ برادرانِ اسلام کو حسبِ مقدور غامدیت سے روشناس کروا دیا جائے، ہاں اگر موسیو غامدی اپنے ہی ایجاد کردہ نرالے اصولوں کی بھول بھلیوں اور تاریک غاروں سے باہر نکلنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بے بسی اور پسپائی کا نظارہ دنیا کو دیکھنے میں انشاء اللہ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اور اگر وہ بڑے طنطنے کے ساتھ کسی کرکٹ کے میدان میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کریں کہ: ''میرا اصول یہ ہے کہ میں نہ تو کیچ سے آؤٹ ہوتا ہوں اور نہ ہی وکٹ کے گرنے سے'' تو اس صورت میں ہم بیچارے تو کیا، دنیا کا کوئی بھی جغادری ظاہر ہے کہ ان کا مقابلہ کرنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتا۔

مکالمے کا عنوان ملتِ غامدیہ کا خوش رنگ دامِ فریب ہے جس کے ذریعے مخاطب کے دل میں موجود

یقین کو شکوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی اس مخصوص روش پر بڑی سختی سے کاربند ہیں کہ مخاطب چاہے کیسی ہی دلیل پیش کرتا رہے اور کیسے ہی مسلمات کو بنیاد بنا کر بات کرتا رہے، اس کی بات کا جواب دینے یا اسے سننے کی بجائے محض اپنے گھڑے ہوئے بالکل بے اصل مفروضات ہی بار بار دہراتے جائیے اور ساتھ میں رواداری، برداشت، تحقیق، معروضی حالات، وقت کے تقاضوں جیسے الفاظ کی تکرار بھی جاری رہے۔ نتیجے میں یا تو مخاطب ان کی جانب سے قبول حق سے مایوس ہو کر خاموش ہو جائے گا یا خود ہی ان کے پیہم پراپیگنڈے کا شکار ہو کر دولتِ ایمان گنوا بیٹھے گا۔ دونوں صورتوں میں رہے نام ملتِ غامدیہ کا۔

نہ ہی یہ نصیحت ہے:

ہماری تو اوقات ہی کیا اور ہمیں سلیقہ ہی کیا، اس منصب کے لیے استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی شخصیت سے بڑھ کر کون سی دوسری شخصیت موزوں ہو سکتی تھی؟ کہ ان کے علم و فضل کا اعتراف ملتِ غامدیہ کے نامور ترجمان عمار خان بھی کرتے رہتے تھے۔ مزید برآں، بات کہنے کا جو ملکہ حضرت کو حاصل ہے اور اصلاح و ہدایت کے لیے ان کے دل میں جیسی تڑپ ہے، ان سب چیزوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سے حضرت استاذ مکرم سے بڑھ کر کون موثر اور دل سوز نصیحت کر سکتا تھا؟ اور ان کے سوا کس کی بات پر غور کی توقع کی جا سکتی تھی؟ حضرت مدظلہم نے جس خیر خواہی سے نصیحت کی، وہ بھی کے سامنے ہے، پھر اس کے جواب میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا وہ بھی کوئی راز نہیں۔ جب اُن بارگاہ میں بایں ہمہ فضائل و مناقب، حضرت استاذ مکرم کی بھی نہیں سنی گئی تو ہماری آواز پر کون کان دھرے گا؟ لہٰذا اب ہمارے پاس یہی ایک راستہ باقی ہے کہ استاذ مکرم حضرت مفتی عبدالواحد صاحب مدظلہم کی پیروی میں، جو کچھ بن پڑے، غامدی دھرم کی حقیقت کو ہی وضاحت سے بیان کر دیں۔ اللہ ہم کو اپنی رضا کے مطابق سچی اور حق بات کہنے کی دولتِ عظمیٰ نصیب فرمائیں اور جھوٹ، بہتان نیز بدگمانی اور بدزبانی سے بھی محفوظ رکھیں۔ آمین۔

مذہب غامدیت کے لیے نئے اصول وضع کرنے کا سیدھا اور سادہ مطلب:

غامدی اصولِ تفسیر کی حقیقت اور حکم جاننے کے لیے منطقی طور پر سب سے پہلے یہ بات زیرِ غور آتی ہے کہ آخر موسیو غامدی کو یہ اصول وضع کرنے کی ضرورت پیش کیوں آئی؟ مثلاً علماء متقدمین نے علوم کو مدون و مرتب کرنے کے لیے قلم اٹھایا، بعد والوں نے مزید تحقیقات پیش کیں یا کسی اشکال کا جواب دیا وغیرہ۔۔۔ تو آخر موسیو غامدی نے کس وجہ سے اتنی فکری مشقت برداشت کی اور یہ نئے اصول وضع کیے؟ یہ سوال اور اس کا جواب تلاش کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اسی بات کا جائزہ لینے سے غامدی اُصولِ تفسیر کی بنیاد سامنے آئے گی اور اس کی بنا پر آئندہ ان کی تمام تحقیقات کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے ایک رخ واضح ہوگا۔ لطف کی بات یہ

ہے کہ موسیو غامدی نے اس سوال کا جواب کافی حد تک وضاحت اور صراحت سے خود ہی ذکر کر رکھا ہے۔ اصولِ تفسیر یعنی ''مبادی تدبرِ قرآن'' بیان کرنے کی تمہید میں موسیو فرماتے ہیں:

''ان کے بارے میں (یعنی قرآن، سنت اور حدیث کے بارے میں) **صحیح نقطۂ نظر** پر قائم رہنے کے لیے جو چیزیں ہمارے نزدیک ہر صاحبِ علم کے پیشِ نظر رہنی چاہییں، وہ ایک ترتیب کے ساتھ ہم یہاں بیان کریں گے۔'' [میزان: ۱۵]

اس کا آسان ترجمہ یہ ہوا کہ پوری مسلمان امت ابتداء سے اب تک قرآن وسنت کے بارے میں غلط نقطہ نظر پر ہی قائم تھی۔ یہ موسیو غامدی کی اس عبارت کا مطلب بھی ہے اور غامدی اصولِ تفسیر کی پرکھ کے نتیجے میں سامنے آنے والا بنیادی اور جوہری عنصر بھی، کہ موسیو سے پہلے کوئی بھی قرآن پاک پر صحیح اصول وضوابط کی روشنی میں غور اور تدبر کی سعادت حاصل نہیں کر سکا۔ یہی فکر غامدی اصولِ تفسیر کی بنیاد ہے اور مذکورہ عبارت کے علاوہ بھی جابجا اس کا پرچار ہمیں غامدی مذہب کے پیچھے چھپے پڑا ملتا ہے۔ لہٰذا اس کی بنا پر غامدیت پر غور کرتے وقت سب سے پہلے یہ بات ذہن میں بالکل واضح ہونی چاہیے کہ اس دھرم کو امت میں معروف اور رائج اسلام سے اگر کوئی نسبت ہے تو صرف یہ کہ اس کی نظر میں ساری اسلامی تعلیمات قرآن وسنت کے بارے میں غلط نقطہ نظر کا پرچار ہیں۔

غامدی اصطلاحات، نہایت اہم تنبیہ:

اگر غامدیت کی حقیقت جاننے کی خواہش ہو تو ''غامدی اصطلاحات'' کے کاری وار سے ہمیشہ خبردار اور آگاہ رہنا چاہیے۔ موسیو نے اپنی باتوں کو پر پیچ و پرخم بنانے کے لیے ایک اُلجھاؤ تو یہ پیدا کیا ہے کہ ناگاہ ایک ایسی اصطلاح وضع کرتے ہیں جو نہ کبھی سنی گئی ہوتی ہے نہ دیکھی گئی ہوتی ہے۔ پھر ان نوزائیدہ اور عجیب الخلقت اصطلاحات کو یوں دہراتے ہیں گویا وہ قاری کے لیے ہمیشہ سے مانوس ہی تھیں۔ اس حربے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری بات کی حقیقت کو سمجھنے سے محروم رہتا ہے، لہٰذا اس پر غامدی دھرم کی گمراہی واضح نہیں ہو پاتی بلکہ الٹا وہ موسیو غامدی کی علمیت وغیرہ کے دھوکے میں آجاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر دوسرا نہایت خطرناک اور مکروہ داؤ انہوں نے یہ کھیلا ہے کہ اسلامی اصطلاحات کو بالکل خلافِ اسلام معانی کے لیے وضع کر کے انہیں اپنی مخصوص اصطلاح قرار دیا ہے۔ اس بنا پر اثنائے کلام میں ان کی جانب سے اسلامی روایت میں مستعمل کوئی ایسا لفظ سامنے آتا ہے جس سے مسلمان مانوس ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ لفظ غامدیت کی کوئی اصطلاح ہوتا ہے، جس کی کبھی تو وہ کہیں اور وضاحت کر دیتے ہیں اور کبھی وہ بھی نہیں کرتے۔ اب ایک خالی الذہن قاری عبارت پڑھتے ہوئے غامدی دھرم کی مخصوص

اصطلاح کے وہ معنی مراد لیتا ہے جو پہلے سے اسلام میں معلوم ومعروف رہے ہیں۔ اِس طرح بھی قاری کے سامنے غامدی دھرم کی گمراہی واضح نہیں ہوتی بلکہ الٹا وہ فتنہ کا شکار ہو جاتا ہے۔

غامدی سنت:

ایسی اصطلاحات میں سب سے زیادہ خطرناک اصطلاح غامدی مذہب میں ''سنت'' کی اصطلاح ہے جو درحقیقت تو ایک باوقار اسلامی اصطلاح ہے، اور اس لفظ کو سنتے ہی کسی بھی مسلمان کی آنکھیں ادب واحترام سے جھک جاتی ہیں، مگر غامدی حضرات نے اسے اپنے من پسند معانی ومفاہیم میں ڈھالنے کے بعد اس کا وہ حال کیا ہے کہ اس میں اور یہودیت وعیسائیت میں کوئی خاص فرق نہیں چھوڑا۔ غامدیت کا مطالعہ کرتے ہوئے سب سے زیادہ ہوشیار اسی سے رہنے کی ضرورت ہے۔ موسیو غامدی سنت کا لفظ بڑے دھڑلے سے استعمال کرتے ہیں، لیکن اِس سے اُن کی مراد اسلام میں معروف سنت ہرگز نہیں جس کا مصداق وہ اعمال ہیں جنہیں خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ سے نسبت ہے، بلکہ اس مبارک اسلامی اصطلاح کی غامدی دھرم میں جاکر جو قلبِ ماہیت اور کایا پلٹ ہوئی ہے، اس کے نتیجے میں نہ صرف اس کا معنی بدلا ہے بلکہ اس کی حیثیت میں بھی زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ اسلامی اصطلاح کے خلاف، بجا طور پر موسیو ہی کی تشریحات کی روشنی میں باآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غامدی دھرم میں سنت سے مراد یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے طریقے ہیں۔

لہٰذا، غامدی سنت کیا ہے؟ اس سوال کا صحیح اور مختصر ترین جواب یہ ہے کہ غامدی سنت، بائبل اور مشرکین مکہ کی روایات ہیں۔ یقیناً یہ دعویٰ محتاجِ دلیل ہے اور یہی اس کے بیان کا مناسب موقع ہے، لہٰذا موسیو غامدی کی تصریحات اور عبارات کی روشنی میں غامدی سنت کا مذکورہ حقیقت پر مبنی ہونا ملاحظہ فرمائیے، موسیو غامدی نے سنت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے''۔ [میزان: ۱۴]

اس تعریف کو سمجھنے کے لیے اس کی تجزی کی جائے تو اس میں دو باتیں ہیں: ۱۔ ایک یہ کہ غامدی دھرم میں سنت کی اصل اور اس کا جوہر ''دینِ ابراہیمی کی روایت'' ہے۔ ۲۔ دوسری یہ کہ نبی ﷺ نے اس کی کچھ تجدید کی اور اس میں کچھ اضافے کر کے اسے اپنے ماننے والوں میں جاری کیا ہے۔

ان دونوں باتوں کا غامدی دھرم کی حقیقی فکر اور اس کے معمولہ عقائد سے تقابل کیا جائے تو دوسری بات سراسر جھوٹ کہی گئی ہے۔ غامدی مذہب کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کی کسی تجدید اور آپ ﷺ کے کسی

اضافے کو تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے عمل میں لائی گئی اس مزعومہ تجدید وغیرہ کا ماخذ ممکنہ طور پر دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں: قرآن مجید، یا حدیث شریف۔ ان دونوں کے ساتھ غامدی مذہب نے یہ سلوک کیا ہے کہ قرآن شریف اگر غامدی مذہب کی مزعومہ سنت کے کسی حکم کے بارے میں کچھ بیان کرے تو غامدی اصول کے مطابق:

''قرآن میں اس (سنت) کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، ان کی تفصیلات بھی اسی اجماع وتواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی، انہیں قرآن سے براہِ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی''۔ [میزان: ۴۷]

جبکہ حدیث کے بارے میں غامدی مذہب کا مسلمہ اصول ہے کہ خبرِ واحد سے دین میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے کسی بھی اضافے یا تجدید سمیت اس دین ابراہیمی کی روایت کو قبول کرنا غامدی مذہب کے زریں اصولوں کے ہی خلاف ہے۔ تو یہ بات پوری وضاحت سے سمجھ لینی چاہیے کہ موسیو غامدی نے اپنی سنت کی تعریف میں جو رسول اللہ ﷺ کی جانب سے عمل میں لائے گئے اضافے یا تجدید کو قبول کرنا ذکر کیا ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ غامدی مذہب، قرآن اور حدیث دونوں میں سے کسی میں بھی، ہرگز رسول اللہ ﷺ کو یہ حق دینے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں کہ آپ ﷺ غامدی دھرم کی مزعومہ سنت میں کوئی تجدید یا اضافہ کریں۔

البتہ پہلی بات بیشک صحیح اور سچ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ہاں مزعومہ سنت ''دین ابراہیمی کی روایت'' کا ہی دوسرا نام ہے۔ نہ صرف سنت بلکہ پورے غامدی دھرم کی اصل اور بنیاد ہی ''دین ابراہیمی کی روایت'' ہے۔ اس لیے غامدی دھرم کی سنت کی تفہیم میں اُصولی طور پر صرف اور صرف دین ابراہیمی کی روایت کی ہی تنقیح کی جائے گی۔

درحقیقت یہی وہ بنیاد ہے جہاں غامدی سنت اسلامی سنت سے جدا ہوئی ہے۔ اسلامی سنت کا سلسلہ محدثین اور صحابہؓ کے معطر انفاس سمیٹتا ہوا رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے اور اس کے بعد کسی کو مزید آگے دیکھنے کی نہ حاجت ہے، نہ تاب اور نہ ہی شوق۔ جب کہ غامدی سنت کا سلسلہ یہود ونصاریٰ اور مشرکین مکہ کے واسطے سے موسیو غامدی کے زعم کے مطابق حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے۔ نہ صرف یہ، بلکہ یہی سلسلہ دین کا اصل مدار ہے اور اسی کی روشنی میں قرآن مجید تک کو پرکھا جانا ضروری ہے۔ جب غامدی سنت کو یہ حیثیت اور مقام عطا کیا گیا ہے کہ وہ قرآن پر بھی مقدم ہے تو لازماً اس سنت کی اپنی حیثیت کا سوال اس سے پہلے اٹھتا ہے اور اسی سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ غامدی مذہب میں سنت سے جو دین ابراہیمی کی روایت مراد لی گئی ہے تو اس کا اصل مطلب یہود ونصاریٰ اور مشرکین مکہ کی روایات ہیں۔ موسیو

نے سنت کا ماخذ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سنت ...... لہٰذا اس کے حاملین کے اجماع و تواتر سے ہی اخذ کی جائے گی'' [میزان: ۲۷]

یہ غور رہنا چاہیے کہ سنت سے مراد غامدی مذہب میں دین ابراہیمی کی روایت ہے۔ لہٰذا اسے دین ابراہیمی کی روایت کہہ دیا جائے یا سنت، حقیقت میں کچھ تغیر نہیں اور دونوں الفاظ ایک ہی حقیقت پر دال ہیں۔ اب ''غامدی سنت'' یا ''دین ابراہیمی کی روایت'' کے حاملین کی پہچان کے لیے یہ غور کیا جائے کہ وہ خوش نصیب کون ہیں جن کے اجماع و تواتر پر موسیو غامدی تک کو اعتبار ہے تو فطری طور پر حضرت ابراہیمؑ کی روایت کے حاملین، یا تو ان کی اولاد کو قرار دیا جا سکتا ہے یا ان کے مذہب کے پیروکاروں کو۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہی ان کے مذہب کی پیروکار بھی تھی، لہٰذا ان کی نسبی اولاد کے سلسلوں کی پہچان سے ہی یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ دین ابراہیمی کی روایت کے حاملین کون ہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے تھے، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام۔ حضرت اسماعیلؑ مکہ میں رہائش پذیر ہوئے اور وہیں ان کی اولاد پلی بڑھی۔ یہ لوگ خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار یعنی ''دین ابراہیمی کی روایت کا حامل'' بتاتے تھے اور اسلامی روایت میں انہیں ''مشرکین مکہ'' کہا جاتا ہے۔ لہٰذا غامدی دھرم کے اصول کے مطابق ''دین ابراہیمی کے حاملین'' کا ایک رکن یعنی ''غامدی سنت'' کا ایک ماخذ مشرکین مکہ ہیں۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کے ایک صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کی نسبت سے دین ابراہیمی کے پیروکاروں کا سلسلہ ہوا۔

ان کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے اور ان کے صاحبزادے حضرت یعقوبؑ۔ ان ہی کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی جنہیں اسلامی روایت میں یہودی یا عیسائی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ غامدی تصریحات و تشریحات اور اشارات کے مطابق، حضرت اسحٰقؑ کی نسبت سے ''دین ابراہیمی کی روایت کے حاملین'' کا دوسرا رکن یہود و نصاریٰ ہیں۔ یاد رہے کہ اسی بنی اسرائیل میں قرآن کے سوا باقی تین کتابیں یعنی تورات، زبور اور انجیل نازل ہوئیں اور دیگر متعدد صحیفے بھی نازل ہوئے۔ ان تینوں کتب اور بہت سے صحیفوں کا مجموعہ آج کل بائبل کے نام سے معروف ہے۔

اس تفصیل سے جب یہ بات واضح ہوگئی کہ غامدی دھرم کے مطابق ''دین ابراہیمی کی روایت کے حاملین'' مشرکین مکہ اور یہود و نصاریٰ ہیں تو منطقی طور پر ''دین ابراہیمی کی روایت'' یا ''غامدی سنت'' ''مشرکین مکہ کا دین اور بائبل ہی قرار پاتے ہیں۔ یہ ہرگز موسیو غامدی پر کوئی الزام یا بہتان نہیں ہے۔ وہ پوری صراحت کے ساتھ یہ باتیں اپنی مخصوص اصطلاحات کی آڑ میں لکھ چکے ہیں۔ ان اصطلاحات کے غامدی معانی سے واقفیت ہو جائے تو ہر ہوشمند ''غامدی سنت'' کا یہی معنی سمجھے گا جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔ لہٰذا موسیو غامدی کی

تصریح سے ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ "غامدی سنت" کا اخذ یا تو بائبل ہے یا مشرکین مکہ کی رسوم ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور چیز اس قابل نہیں کہ اس سے غامدی سنت کو اخذ کیا جا سکے۔

مذکورہ تفصیل کا آسان خلاصہ یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ غامدی دھرم میں سنت سے مراد دین ابراہیمی کی روایت ہے اور دین ابراہیمی کی روایت تاریخ کا سفر طے کرنے کے بعد یا تو بائبل کی شکل اختیار کرتی ہے یا مشرکین مکہ کے رسوم ورواج کی۔ لہٰذا غامدی دھرم میں سنت سے مراد بائبل اور مشرکین کے رسوم و رواج ہیں۔

اتنی وضاحت البتہ یہاں ضروری ہے کہ یہ تو غامدی دھرم کی تشریحات کے مطابق سامنے آنے والی سنت کی حقیقت کا کلیاتی، اصولی اور نظری بیان تھا اور یہ ذکر اس لیے ضروری تھا کہ اس مبارک اصطلاح کو غامدی دھرم کی اپنی تصریحات کے مطابق جس ہولناک معنی اور مفہوم کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ واضح ہو جائے۔ ورنہ غامدی سنت کے بارے میں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام کے کسی اصولی اور کلیاتی حکم یا اصطلاح کی طرح غامدیت میں سنت کوئی ایسی چیز نہیں جس کی تعریف کے پیش نظر کسی امر کو سنت کہا جائے اور کسی امر کو سنت ہونے سے خارج کیا جا سکے۔ غامدی سنت کی تنگنائے میں فی الحال گنی چنی چھبیس چیزیں ہیں جو مختلف ادوار میں کم زیادہ ہوتی رہی ہیں۔ لہٰذا آئندہ کے لیے بھی کوئی حتمی اندازہ اور پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی کہ یہ اتنی ہی رہیں گی، کم ہو جائیں گی یا زیادہ ہو جائیں گی۔ انہیں وہ اپنی کتاب میزان کے صفحہ نمبر چودہ پر ایک ایک کر کے گنوا چکے ہیں۔

بہر حال، "غامدی سنت" کی حقیقت کے طور پر اس کی نظری اور کلیاتی یہ خالص غیر اسلامی تفصیل بھی ذہن میں رہنی چاہیے اور اس کا مصداق بننے والی چھبیس اشیاء بھی ملحوظ رہنی چاہییں۔ ایک تو اس لیے کہ غامدی سنت کا اسلامی سنت سے اشتباہ نہ ہو سکے، دوسرا اس لیے کہ جہاں بھی موسیو غامدی سنت کا لفظ استعمال کریں، اس کے معنی کی صحیح حقیقت واضح ہو جائے۔

پرانے زمانے میں حبشی غلاموں کا نام کافور رکھ دیا جاتا تھا۔ اس پر کسی ستم ظریف نے کہا: "برعکس نہند نام زنگی کافور"۔ یعنی حبشی کا نام اس کے رنگ کے بالکل الٹ اور برعکس کافور رکھ دیتے ہیں کہ جیسا کافور سفید ہوتا ہے اتنا ہی حبشی سیاہ ہوتا ہے۔ لہٰذا غامدیہ کی مصطلحہ سنت کو بجا طور پر "کافوری سنت" کہا جا سکتا ہے اور آئندہ سطور میں اسلامی سنت سے غامدی سنت کے امتیاز کے لیے ہم اسے کافوری سنت ہی کہیں گے۔

غامدی اصولِ تفسیر:

قرآن، تفسیر اور اصولِ تفسیر کے بارے میں غامدی دھرم اسلامی آراء وافکار کے عین برخلاف اور

متضاد ہے۔ جس طرح موسیو جاوید احمد غامدی نے سنت، حدیث اور اجماع وغیرہ جیسی اسلامی اصطلاحات کے وہ مصداق اور معانی گھڑ کر بیان کیے ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں، اسی طرح تفسیر اور اصولِ تفسیر کے بیان میں بھی انہوں نے وہ خارا تراشیاں کی ہیں کہ غامدی دھرم میں قرآن کا معنی اور اس کی حیثیت، مذہب اسلام میں معروف ومتعارف قرآن مجید کے معنی اور حیثیت سے بالکل الگ بلکہ الٹ بن کر رہ گئی ہے۔ غامدی اصولِ تفسیر میں موجود ایک ایک گمراہی اور خرابی کو لے کر اس کا رد کیا جائے تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور غیر مقصودی باتوں کے درآنے سے کسی حد تک اُلجھ بھی جائے گی۔ لہٰذا کوشش کی جائے گی کہ غامدی اصولِ تفسیر کا ماحصل اور خلاصہ نکال کر پیش کر دیا جائے۔ پھر وہ اسلامی تعلیمات کے جتنی وضاحت کے ساتھ مخالف اور متضاد ہیں، محض ان کا بیان ہی ان کے رد کے لیے کافی ہوگا اور ہر مسلمان با آسانی یہ سمجھ لے گا کہ غامدی افکار اور عقائد بالکل خلاف اسلام ہیں۔ اللہ تعالی صحیح بات کہنے کی توفیق نصیب فرمائیں اور کسی بھی افراط وتفریط سے محفوظ رکھیں۔

موسیو جاوید احمد غامدی کے اصولِ تفسیر پر تبصرہ اور تنقید کرنے کے لیے ہم نے ان کی کتاب میزان میں بیان شدہ اصولِ تفسیر کو بنیاد بنایا ہے اور ان کے تجزیے سے جو کچھ سمجھ آیا ہے اسے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تبصرے کے لیے ہم نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ غامدی اصول کا ان کی تفسیر سے تقابل بھی کر کے دیکھیں کہ آیا انہوں نے اپنے اصول کی پیروی کی ہے یا مخالفت۔ کیونکہ ہمارا مقصد ان اصول پر تبصرہ اور ان کی تنقیح وتنقید ہے، اصول اور اس کے اجراء میں توافق وتخالف کا تقابلی جائزہ لینا نہیں۔ اگر کہیں موسیو اپنے اصولوں کے برخلاف تفسیر کر گئے ہوں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے، اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں انہی پر ہے۔

موسیو جاوید احمد غامدی نے اپنے اصولِ تفسیر میں، جنہیں وہ مبادی تدبرِ قرآن کہتے ہیں، کل دس اصول ذکر کیے ہیں۔

پہلے تین اصولوں یعنی: (۱) عربی معلّٰی (۲) زبان کی ابانت اور (۳) اسلوب کی ندرت کے تحت انہوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن کو محض قرآن کے اسلوب، اس کے الفاظ اور عربیت کی بنا پر ہی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان تینوں کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے کہ علمائے امت کی جانب سے کی گئی قرآن کی تشریحات و تفاسیر سے استفادہ کرنا کوئی مستحسن امر نہیں۔ اس موضوع پر ان کا رد اس وقت چونکہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لیے بے جا طوالت سے بچتے ہوئے ہم ان کی تفصیلات کو نظر انداز کیے دیتے ہیں۔ اسی طرح (۴) کتاباً متشابہا، (۸) نظمِ کلام، (۹) سبع مثانی اور (۱۰) تاریخ کا پس منظر کے عنوان سے جو چار اصول تحریر کیے گئے ہیں، یہ بھی فتنہ انگیزی کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان میں رطب ویابس کو یوں ملا جلا کر بیان کیا گیا ہے کہ جمہور امت کے افکار کے اتباع کی اداکاری کے ساتھ ساتھ مسلمان مفسرین پر بے بنیاد قسم کی

الزام تراشی کا سلسلہ بھی روا رکھا گیا ہے۔ مغالطوں اور گمراہیوں پر مشتمل ہونے کے باوجود، چونکہ ہمارا موضوع ان سے کچھ ہٹ کر چل رہا ہے، اس لیے ہم ان کی تفصیلات کو بھی قلم انداز کیے دیتے ہیں۔

البتہ عربی معلّٰی نامی اصل کی وضاحت کرتے ہوئے موسیو نے اپنی جس بنیادی کجی کا شاید نادانستہ اظہار کیا ہے اس کی نشاندہی کرنا فائدے سے خالی نہیں۔ غامدی دھرم کا مشہور اصول ہے کہ خبرِ واحد سے دین میں کسی نئے حکم کا اضافہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس اصول کی دھار کے نیچے آکر پورا ذخیرۂ حدیث غیر معتبر قرار پاتا ہے۔ لیکن عربی معلّٰی کے اس خارزار میں پرورش پانے والا نیا شگوفہ یہ ہے کہ یہی حدیث لغوی وضاحت کے طور پر غامدی بارگاہ میں لائقِ اعتبار بھی بن جاتی ہے۔ یوں کہ اگر قرآن مجید کے زبان و بیان کی کوئی تشریح اور وضاحت حدیث میں نظر آتی ہو تو لغوی تشریح کے طور پر اُسے قبول کرلیا جائے گا۔ موسیو فرماتے ہیں:

"اس کتاب کا فہم اب اس زبان کے صحیح علم اور اس کے صحیح ذوق ہی پر منحصر ہے...... قرآن کی زبان کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی طرف رجوع کرنا چاہیے، وہ خود قرآن مجید ہی ہے...... قرآن مجید کے بعد یہ زبان حدیث نبوی اور آثار صحابہ کے ذخائر میں ملتی ہے" [میزان:۱۶،۱۷]

یعنی ایک حدیث اگر کوئی شرعی حکم بیان کرے تو اس حکم پر تو ہرگز کوئی توجہ نہ دی جائے گی حالانکہ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ کا مقصد شرعی حکم بیان کرنا ہی ہوگا۔ لیکن اسی حدیث سے کوئی لغوی تشریح معلوم ہوتی ہو تو وہ لائقِ اعتنا قرار پائے گی۔ یہ بنیادی طور پر منکرینِ حدیث کی وہی مشہور ذہنیت ہے جس میں لغت، حدیث شریف سے زیادہ معتبر شمار ہوتی ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ علمائے اصولِ حدیث کسی روایت پر دادِ تحقیق دیتے ہوئے چاہے کتنی ہی جانکاہی اور محنت سے کیسے ہی پختہ استناد کی بنیاد پر اس روایت کا مرتبہ اور درجہ بیان کریں، بہرحال وہ روایت، مذکورہ غامدی اصول کی بھینٹ چڑھ کر نا قابلِ قبول ہی قرار پاتی ہے۔ لیکن دوسری طرف لغت کے بارے میں یہ رویہ اختیار کیا گیا ہے کہ:

"عربی زبان کے بیش تر لغات اہلِ زبان کے اجماع اور تواتر سے نقل ہوئے ہیں اور ان کا ایک بڑا ذخیرہ لغت کی امہات "التهذیب، المحكم، الصحاح، الجمهرہ، النهایه" وغیرہ میں محفوظ ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ لغتِ عرب کا جو ذخیرہ اس طرح متواتر نہیں ہے، اس کی تحقیق کے لیے سب سے زیادہ مستند ماخذ یہی کلامِ عرب ہے۔ اس میں اگرچہ کچھ منحول کلام بھی شامل ہے لیکن جس طرح نقدِ حدیث کے علما اس کی صحیح اور سقیم روایتوں میں امتیاز کر سکتے ہیں، اسی طرح اس کلام کے نقاد بھی روایت و درایت کے نہایت واضح معیارات کی بنا پر اس کے خالص اور منحول کلام کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دے سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ لغت وادب کے ائمہ اس بات پر ہمیشہ متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے اور جو صحتِ نقل اور روایت باللفظ کی بنا پر زبان کی تحقیق میں سند و

حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔" [میزان:۱۹]

دیکھ لیجیے کہ علمائے حدیث کی تو ساری کاوشیں اپنے پورے اعتبار و اعتماد اور ثقاہت کے باوجود موسیو کی نظر میں نہیں سمائیں اور وہ انہیں احکامِ شریعت کی شرح اور ان کے بیان کے لیے ماخذ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوئے، لیکن "کلام کے نقاد کی روایت و درایت کے نہایت واضح معیارات کی بنا پر" ان ماہرینِ لغت کا بیان "زبان کی تحقیق میں سند و حجت کی حیثیت" سے مقبول قرار پایا۔ اس فرق کی ایک ہی توجیہ ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ موسیو بہر طور "حدیث" سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ورنہ کیا لغت کی روایت و درایت کے معیار حدیث کی روایت و درایت کے معیار سے بھی واضح تر ہیں کہ لغت میں تو انہیں قبول کر لیا گیا اور حدیث میں رد کر دیا گیا؟

علاوہ ازیں، موسیو کو علمائے اسلام اور ائمۂ حدیث و فقہ کے کردار یا علمی تحقیقات میں کچھ ایسی خرابیاں نظر آگئیں کہ ان کے تو ہر اتفاق کو جوتے کی نوک پر رکھا، بلکہ اجماع تک کو ان کے فیض یافتگان کے افسانے کہا، لیکن دوسری جانب لغت و ادب کے ائمہ کے اتفاق پر دل و جان سے فدا ہو کر ان کی تحقیقات کو ان الفاظ قبول فرما کر اپنے اصول کا حصہ بنایا ہے:

> "لغت و ادب کے ائمہ اس بات پر ہمیشہ متفق رہے ہیں کہ قرآن کے بعد یہی کلام ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور جو صحت نقل اور روایت باللفظ کی بنا پر زبان کی تحقیق میں سند و حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔" [میزان:۱۹]

پانچواں، چھٹا اور ساتواں اصول غامدی اصول تفسیر کی بنیاد ہیں اور انہی میں قرآن مجید کے بارے میں غامدی طرزِ عمل کی پوری وضاحت موجود ہے۔ ان کے نام (۵) میزان اور فرقان (۶) دین کی آخری کتاب (۷) پیغمبر کی سرگزشت انذار ہیں۔

چھٹے اور ساتویں اصول میں یہ بنیادی بات بیان کی گئی ہے کہ غامدی دھرم میں قرآن مجید کی حیثیت، دائرۂ اختیار اور اتھارٹی کیا ہے؟ نیز یہ کہ غامدی دھرم کے نزدیک مضمون کے لحاظ سے قرآن کی ماہیت کیا ہے؟ لہٰذا منطقی طور پر سب سے پہلے انہی دو اصولوں پر بات ہو گی۔ اس کے بعد پانچویں اصول کا تذکرہ کیا جائے گا جس میں موسیو نے اپنی فکری روش کی کافی حد تک وضاحت کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر غامدی اصولِ تفسیر پر تبصرہ و تنقید انہی تین، اور ان میں سے بھی زیادہ تر دو اصولوں پر مبنی ہے۔ اور چونکہ انہی اصولوں میں وہ جوہری بات موجود ہے جو نہ صرف غامدی اصولِ تفسیر کا بلکہ پورے غامدی دھرم کا رخ بھی طے کر دیتی ہے، اس لیے ان کو یہ مقام حاصل ہے کہ انہی کی تفہیم اور انہی پر تبصرہ و تنقید کو غامدی اصولِ تفسیر یا کسی حد تک غامدی مذہب کی بھی تفہیم اور تبصرہ و تنقید قرار دیا جا سکے۔ چونکہ یہی دو اصول

پورے غامدی اصول تفسیر کی اصل بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کے صحیح یا غلط ہونے پر ہی پورے غامدی اصول تفسیر کے صحیح یا غلط ہونے کا مدار ہے۔ چھٹے اور ساتویں اصول کی جو تشریحات غامدی تحریرات کی روشنی میں واضح ہوئی ہیں، جب وہ غامدی دھرم اور اس کے اصول تفسیر کی بنیادی حیثیت سے اپنی جگہ موجود ہیں، تو بعض دوسرے مغالطہ انگیز اصولوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسا پیشاب کی بوتل میں چند قطرے گدلا پانی بھی شامل کر دیا جائے۔ ان کی وجہ سے ہرگز مجموعی فکر اور اصول کے رخ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

غامدی دھرم میں قرآن مجید کی حیثیت متعین کرنے والے دو بنیادی اصول:

ان دونوں اصولوں کو انہوں نے بالترتیب "دین کی آخری کتاب" اور "پیغمبر کی سرگزشت انذار" سے موسوم کیا ہے۔ ان کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ دین اسلام کی ابتداء حضرت آدمؑ سے ہوگئی تھی، مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد حضرت موسیٰ کے زمانے تک دین مکمل ہو گیا تھا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی تک کے احکام بھی مکمل طور پر عطا کر دیے گئے تھے۔ زبور اور انجیل محض تحریفات کی اصلاح اور ان سے آگاہ کرنے کے لیے عطا کی گئی تھیں اور قرآن صرف اس لیے نازل ہوا کہ پچھلی کتابوں کے متن اپنی اصل زبانوں میں باقی نہیں رہے تھے۔ لہٰذا دین تو وہی ہے جو زبور اور انجیل سے بھی پہلے مکمل ہو گیا تھا۔ اسی دین پر عمل کرنا ضروری ہے اور یہ لازماً قرآن سے مقدم اور پہلے ہے۔ بعد میں آنے والی کتاب یعنی قرآن مجید کی تشریح و تفصیل اسی پہلے سے مکمل شدہ دین کے دائرے کے اندر رہ کر کرنا ضروری ہے۔ اگر قرآن اس سابقہ دین کی کسی بات کے بارے میں لب کشائی کرے تو اس پر مطلق توجہ نہیں دی جائے گی بلکہ اس سابقہ دین کے مطابق قرآن کو ڈھال دیا جائے گا۔ سابقہ دین کے علاوہ قرآن مجید اگر کسی نئے حکم کا اضافہ کرے تو وہ حکم صرف اسی زمانے اور انہی حالات کے ساتھ خاص ہوگا۔ مزید برآں، اگر قرآن میں کسی تاریخی واقعے کا تذکرہ ہے تو اس کی تفصیل بھی سابقہ صحیفوں سے ہی اخذ کی جائے گی، اس ضمن میں تفاسیر وغیرہ کو دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت بلکہ اجازت بھی نہیں ہے۔

یہاں ایک مسلمان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ایک طرف تو قرآن کے انفرادی احکام (وہ احکام جو سابقہ دین کے علاوہ اور اس پر اضافہ ہیں) اپنے ہی زمانے اور حالات و اشخاص کے ساتھ خاص ہیں، اور دوسری طرف نہ صرف دین کے احکام بلکہ قرآن میں مذکور گذشتہ واقعات تک سابقہ دین اور کتب وصحف سے ہی درست معلوم ہو سکتے ہیں تو پھر قرآن کی کیا حیثیت رہے گی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی حیثیت محض اتنی ہوگی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ دین کی ایک تاریخ ہوگا۔ اور بس!

یہ غامدی دھرم کے ان دونوں اصولوں کا خلاصہ ہے اور اس میں مسلمانوں کے لیے خاص طور پر

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان اصولوں کے نتیجے میں قرآن عقائد واحکام کا بیان تو دور کی بات، اقوام ماضیہ کی کوئی تاریخی روایت بھی بیان کرنے کے لائق نہیں رہا۔ کیونکہ ان سب چیزوں کے لیے غامدی دھرم کے پاس دوسرے زیادہ معتبر ذرائع موجود ہیں۔ نتیجے کے طور پر قرآن مجید تاریخ کی ایک کتاب بن کر رہ جاتا ہے۔ گویا دین قرآن سے پہلے نازل ہو گیا تھا، قرآن عقائد واحکام میں اس کے تابع ہے اور یہ خود اگر کچھ بیان کر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف صاحب قرآن ﷺ کی تاریخِ دعوت ہے، یا اپنے زمانے کے مخصوص حالات کے تحت صرف وقتی ضرورتوں کے لیے احکام ہیں۔

قارئین کرام......! یہ سب کچھ پڑھ کر جتنی حیرت آپ کو ہو رہی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہمیں اس وقت ہوئی تھی جب غامدی ''اصولِ تدبرِ قرآن'' کے اصل الاصول کے طور پر یہ بات ہمیں دریافت ہوئی تھی۔ لیکن جو کچھ موسیو نے لکھا ہے، اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جھٹلانے پر قدرت نہ ہوئی اور یقین کرنا ہی پڑا۔ اور اس بارے میں یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہ بات جتنی حساسیت کی حامل ہے اس کی بنا پر ہم اس حوالے سے جو کچھ بھی معروض پیش کر رہے ہیں، لازماً اس کے پختہ اور یقینی بنیادوں پر مبنی ہونے کا اطمینان کر کے ہی پیش کر رہے ہیں۔ ان شاء اللہ قارئین کے سامنے جب اس حقیقت کے شواہد پیش کیے جائیں گے تو انہیں بھی لازماً یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا۔

اوپر جو کچھ غامدی اصولِ تفسیر کے خلاصے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، وہ موسیو جاوید غامدی کی ہی عبارات سے اخذ کیا گیا ہے، لہٰذا قارئین کے سامنے بھی موسیو کی یہ عبارتیں ضروری تفصیلات اور اس بیان کے ساتھ پیش کیے دیتے ہیں کہ ان عبارتوں سے مذکورہ معانی کیسے اخذ کیے گئے۔

اسلام کو محمد رسول اللہ ﷺ سے نہیں بلکہ حضرت آدمؑ سے اخذ کیا جائے گا:

موسیو غامدی ''دین کی آخری کتاب'' کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:

''چھٹی چیز یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے، اس کی وہ پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے۔ اس دین کی تاریخ یہ ہے کہ انسان کو جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تو اس کے بنیادی حقائق ابتدا ہی سے اس کی فطرت میں ودیعت کر دیے۔ پھر اس کے ابوالآباء آدم علیہ السلام کی وساطت سے اسے بتا دیا گیا کہ اولاً، اس کا ایک خالق ہے جس نے اسے وجود بخشا ہے، وہی اس کا مالک ہے اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر تنہا وہی ہے جسے اس کا معبود ہونا چاہیے۔ ثانیاً، وہ اس دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے اور اس کے لیے خیر وشر کے راستے نہایت واضح شعور کے ساتھ اسے سمجھا دیے گئے ہیں۔ پھر اسے ارادہ و اختیار ہی نہیں، زمین کا اقتدار بھی دیا گیا ہے۔ اس کا یہ امتحان دنیا میں اس کی زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے گا۔ وہ اگر اس میں کامیاب رہا تو اس کے صلے میں خدا کی ابدی بادشاہی اسے حاصل ہو جائے

گی جہاں نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا ہوگا اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ثالثاً، اس کی ضرورتوں کے پیش نظر اس کا خالق وقتاً فوقتاً اپنی ہدایت اسے بھیجتا رہے گا۔ پھر اس نے اگر اس ہدایت کی پیروی کی تو ہر قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رہے گا اور اس سے گریز کا رویہ اختیار کیا تو قیامت میں ابدی شقاوت اس کا مقدر ٹھیرے گی۔

چنانچہ پروردگار نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور انسانوں ہی میں سے کچھ ہستیوں کو منتخب کر کے ان کے ذریعے سے اپنی یہ ہدایت بنی آدم کو پہنچائی۔ اس میں حکمت بھی تھی اور شریعت بھی۔ حکمت، ظاہر ہے کہ ہر طرح کے تغیرات سے بالاتر تھی، لیکن شریعت کا یہ معاملہ نہ تھا۔ وہ ہر قوم کی ضرورتوں کے لحاظ سے اترتی رہی، یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت میں پوری انسانیت کے لیے اس کے احکام بہت حد تک ایک واضح سنت کی صورت اختیار کر گئے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جب بنی اسرائیل کی ایک باقاعدہ حکومت قائم ہو جانے کا مرحلہ آیا تو تورات نازل ہوئی اور اجتماعی زندگی سے متعلق شریعت کے احکام بھی اترے۔ اس عرصے میں حکمت کے بعض پہلو نگاہوں سے اوجھل ہوئے تو زبور اور انجیل کے ذریعے سے انہیں نمایاں کیا گیا۔ پھر ان کتابوں کے متن جب اپنی اصل زبان میں باقی نہیں رہے تو اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث کیا اور انہیں یہ قرآن دیا''۔[میزان:۴۴]

ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ:

دینِ اسلام کی بنیاد میں دو باتیں ہیں: ایک: انسان کی اپنی فطرت میں ودیعت کردہ اچھائی برائی کی تمیز۔ دوسری: اللہ تعالیٰ کی ہدایات۔ اِن میں سے پہلی، انسانی فطرت تو ابتداء سے ہی انسان کو حاصل ہے اور دوسری، یعنی اللہ تعالیٰ کی ہدایات مذکورہ بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پوری ہو گئی تھیں۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس کا ضروری تتمہ بھی نازل ہو گیا۔ لہٰذا دین یہاں تک مکمل ہو گیا۔ بعد میں زبور اور انجیل تو محض یاد دہانی کے لیے نازل کی گئی ہیں اور قرآن مجید صرف اس ضرورت سے عطا کیا گیا کہ کتابوں کے متن اپنی اصل زبانوں میں باقی نہیں رہے تھے۔

اور ان فرمودات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ:

انسانی فطرت اور پہلے سے مکمل طور پر حاصل شدہ ہدایات پر مبنی پورے دین کے موجود ہوتے ہوئے کسی بھی نئے ابدی شرعی حکم کے لیے قرآن مجید کی ہرگز کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ لہٰذا غامدی دھرم میں لامحالہ قرآن مجید کسی نئے حکم کو ہرگز بیان نہیں کرے گا۔ جی ہاں، شاید مذکورہ منطق کا کوئی اور نتیجہ اخذ کرنا بھی ممکن ہوتا، اگر خود موسیو غامدی نے ہی کسی بھی تاویل اور تشکیک کا کوئی شائبہ باقی نہ چھوڑتے ہوئے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ دعویٰ ذکر نہ کیا ہوتا۔ چنانچہ موسیو غامدی سے ہی اس حکم کا بیان سنیے:

۴۔قرآن سے کسی نئے حکم کو اخذ کرنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں:

چنانچہ موسیو غامدی فرماتے ہیں:

''نماز، روزہ، حج، زکوۃ، یہ سب اسی ملت کے احکام ہیں جن سے قرآن کے مخاطب پوری طرح واقف بلکہ بڑی حد تک ان پر عامل تھے۔ سیدنا ابوذر کے ایمان لانے کی جو روایت مسلم میں بیان ہوئی ہے، اس میں وہ صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی وہ نماز کے پابند ہو چکے تھے۔ جمعہ کی اقامت کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ قرآن کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ نماز جنازہ وہ پڑھتے تھے۔ روزہ اسی طرح رکھتے تھے، جس طرح اب ہم رکھتے ہیں۔ زکوۃ ان کے ہاں بالکل اسی طرح ایک متعین حق تھی، جس طرح اب متعین ہے۔ حج وعمرہ سے متعلق ہر صاحب علم اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قریش نے چند بدعتیں ان میں بے شک داخل کر دی تھیں، لیکن ان کے فی الجملہ مناسک وہی تھے جن کے مطابق یہ عبادات اس وقت ادا کی جاتی ہیں۔ بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان بدعتوں پر متنبہ بھی تھے۔ چنانچہ بخاری ومسلم، دونوں میں بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے پہلے جو حج کیا، وہ قریش کی ان بدعتوں سے الگ رہ کر بالکل اسی طریقے پر کیا جس طریقے پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج ہمیشہ جاری رہا ہے۔

یہی معاملہ قربانی، اعتکاف، ختنہ اور بعض دوسرے رسوم وآداب کا ہے۔ یہ سب چیزیں پہلے سے رائج، معلوم ومتعین اور نسلاً بعد نسل جاری ایک روایت کی حیثیت سے پوری طرح متعارف تھیں۔ چنانچہ اس بات کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ قرآن ان کی تفصیل کرتا۔ لغت عرب میں جو الفاظ ان کے لیے مستعمل تھے، ان کا مصداق لوگوں کے سامنے موجود تھا۔ قرآن نے انہیں نماز قائم کرنے یا زکوۃ ادا کرنے یا روزہ رکھنے یا حج وعمرہ کے لیے آنے کا حکم دیا تو وہ جانتے تھے کہ نماز زکوۃ، روزہ اور حج وعمرہ کن چیزوں کے نام ہیں۔ قرآن نے ان میں سے کسی چیز کی ابتدا نہیں کی''۔ [میزان:۴۶]

ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ:

اسلام کے آنے سے پہلے بھی، یا پہلے ہی، مشرکین مکہ اسلامی عبادات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان پر عمل پیرا بھی تھے اور ان میں رواج پا جانے والی بدعتوں تک سے مکمل آگاہی رکھتے تھے۔ پورا دین ان میں اپنی کامل اور خالص صورت میں انہیں معلوم تو تھا ہی، اس حد تک رائج بھی تھا کہ کوئی شخص اگر ٹھیک ٹھیک طریقے سے کوئی عبادت ادا کرنا چاہتا تو بآسانی کر سکتا تھا۔ قرآن نے آکر جب ان سے کسی عبادت کو اور کسی عمل کو بجالانے کا تقاضا کیا تو ان مشرکین مکہ کو ہرگز ان عبادات اور اعمال کی تعیین وتفصیل جاننے کی حاجت پیش نہیں آئی۔ قرآن کا انہیں کسی بھی شے کا حکم کرنا صرف اور صرف یاددہانی کی حیثیت رکھتا تھا۔

اگر ان فرمودات پر آمنا وصدقنا کہہ دیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ:

صحابہ کرامؓ اور حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام احکامِ شریعت کے لیے وحی کا نہ جانے کیوں انتظار کرتے رہے؟ سیدھا اور صاف طریقہ یہ تھا کہ مشرکین مکہ سے پوچھتے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں؟ بلکہ پوچھنے کی بھی کیا ضرورت تھی، جب ساری ہی عبادتیں اپنی اصل روح کے ساتھ ان میں جاری اور معمول ومعروف تھیں تو بس انہیں دیکھتے جاتے اور عمل کرتے جاتے۔ حتیٰ کہ وہ اصل اعمال میں رواج پا جانے والی بدعتوں تک سے واقف تھے، بے کار میں شرعی تعلیمات اخذ کرنے کے لیے وحی کا انتظار کرتے رہے اور اسلام کی بنیاد تعلیمات الٰہی پر رکھنے کا تکلف کیا۔ عبادات تو در کنار، ختنے جیسی رسوم وآداب بھی جو ان کے معاشرے میں رائج تھے، ناحق شریعتِ اسلامی کے بیان کا تکلف کیا گیا۔

غامدی دھرم کی اس بنیاد سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ورسومات اور عبادات کی حد تک اصلی دین اسلام، مشرکین مکہ میں پہلے سے موجود تھا، اور [illegible] لیا، نہ اسلام کو اس میں کسی اضافے کا حق تھا، اور نہ اس کی ضرورت۔

موسیو کی تضاد بیانی:

کچھ پیچھے تو موسیو یہ فرما کر آئے تھے کہ دین ابراہیمی اپنی اصل شکل میں مشرکین مکہ میں موجود تھا، اس دین کی عبادات ورسومات بعینہ اس طرح باقی تھیں کہ قرآن کو بھی ان کی کوئی تفصیل بتانے کی کچھ ضرورت نہ تھی، مگر چند صفحے آگے جا کر دفعتاً فرماتے ہیں کہ ان عبادات ورسومات میں بری طرح تحریف ہو چکی تھی اور ان کی شکل بدل دی گئی تھی، ملاحظہ فرمائیے... ! لکھتے ہیں...

> ”قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس میں عرب کی پچھلی قوموں، مثلاً عاد وثمود اور قوم مدین کی تباہی کا ذکر ہے۔ ان کے معتقدات زیر بحث ہیں... ان نبیوں کی دعوت اور اس دعوت پر ان کے رد عمل کا بیان ہے۔ سیدنا ابراہیم کے عرب میں آنے، اپنے فرزند اسمٰعیل کو قربانی کے لیے پیش کرنے اور بیت اللہ کی تعمیر کی حکایت ہے۔ عرب کے تمدنی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی حالات پر ان کا جو اثر ہوا، اس کی طرف اشارات ہیں۔ بعد میں قریش نے ان کے دین میں جو تحریفات کیں، توحید کے مرکز بیت الحرام کو ان کے بعد جس طرح ایک بت خانے میں بدلا اور اس کے نتیجے میں جو بدعتیں اور رسوم وجود میں آئیں، ان کا حوالہ ہے“۔ [میزان: ۵۵]

عجب ماجرا ہے کہ ایک طرف تو موسیو غامدی کے فرمان کے مطابق دین اپنی اصل اور خالص صورت میں اسلام سے پہلے معلوم بھی تھا اور معمول بھی تھا، وہ بھی اس شان سے کہ قرآن کو بھی کسی عبادات ورسم کے بارے میں کسی وضاحت وتوضیح کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اب قرآن کا حوالہ دے کر یہ فرماتے ہیں کہ قریش نے

دین میں تحریفات بھی کیں، توحید کے مرکز کو بت خانے میں بھی بدلا اور اس سب کے نتیجے میں بدعتیں اور رسوم بھی وجود میں آئیں، گویا کہ موسیو غامدی یہاں خود اپنے خلاف قرآن پیش کر کے اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اب قرآن پر ایمان رکھنے والے ایک مسلمان کے لیے یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ وہ قرآن کے بیان کو تسلیم کر کے اپنا ایمان سلامت رکھے یا اس کے بالکل خلاف موسیو غامدی کی تحقیقات کو اپنائے۔ اس تضاد سے لطف اندوز ہونے کے بعد آگے بڑھیے۔

۳: کافوری سنت کے علاوہ قرآن کے احکام مخصوص زمانے اور اشخاص کے لیے ہیں:

یوں تو غامدی منطق کے مطابق قرآن مجید کو کسی نئے حکم کے بیان کی بھی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ جب دین پہلے ہی سے مکمل ہو چکا ہے اور صاف اور واضح صورت میں موجود بھی ہے تو قرآن مجید کو کسی نئے حکم کے بیان کی کیا ضرورت؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسے موسیو غامدی مکمل دین کہتے ہیں، قرآن مجید نے اس کے علاوہ بھی احکام بیان کیے ہیں۔ اپنی پوری فنکاری کے باوجود یہ دعوی کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ قرآن میں ان کے مزعومہ اصل اور خالص دین کے علاوہ کوئی حکم بیان نہیں ہوا۔ بلاشبہ قرآن میں ایسے احکام مذکور ہیں جو غامدی دھرم کے نزدیک کامل دین اور کافوری سنت کے علاوہ ہیں، مثلاً جہاد کا حکم اور تفصیلات۔ لیکن بجائے اس کے کہ اپنے مزعومہ ''مکمل دین'' کے علاوہ اور مزید احکام کو قرآن میں دیکھ کر موسیو اپنے اس موقف سے رجوع کرتے کہ ''دین'' قرآن سے پہلے مکمل ہو چکا ہے، اور یہ تسلیم کرتے کہ قرآن مجید ہی دین کا اصل ماخذ ہے، انہوں نے قرآن مجید میں مذکور ایسے احکام کو ہی ابدی ہدایات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ان کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ احکام ہمیشہ کے لیے اور ساری آنے والی امت اور زمانوں کے لیے نہیں ہیں بلکہ یہ تو صرف قرآن کے مخاطبین کے ساتھ خاص تھے اور اسی زمانے تک محدود تھے۔ ان احکام کو تمیز کے لیے ہم قرآن کے انفرادی احکام کا نام دیتے ہیں۔

موسیو غامدی کے نزدیک یہ انفرادی احکام دراصل اس زمانے کی تاریخ کے ضمن میں صرف اسکے لیے بیان ہوئے ہیں کہ قرآن کے نزول اور دعوت کے زمانے میں یہ احکام بھی دیئے گئے تھے۔ ان کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ تاریخی ہے۔ اسی لیے اس بات کا بیان انہوں نے اپنے اگلے اصول ''پیغمبر کی سرگزشت انذار'' کے تحت کیا ہے۔ لیکن ان کے اصول پر تبصرے کی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تفصیلات یہیں ذکر کی جائیں اس لیے ان کی وضاحت اسی جگہ ذکر کی جارہی ہے۔

قرآن کے انفرادی احکام خاص زمانے اور خاص لوگوں کے لیے تھے:

چنانچہ فرماتے ہیں:

"قرآن کی شرح وتفسیر میں جو چیزیں اس رعایت سے اس کے ہر طالب علم کے پیش نظر رہنی چاہییں، وہ یہ ہیں:

اولاً، اس کی ہر سورۃ میں تدبر کر کے اس کا زمانۂ نزول نبی ﷺ کی دعوت کے انہی مراحل کے لحاظ سے اس طرح متعین کرنا چاہیے کہ اس کے بارے میں یہ بات پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکے کہ مثال کے طور پر وہ زمانۂ انذار میں نازل ہوئی ہے یا زمانۂ ہجرت و براءت اور جزاء وسزا میں، اس کی ہر آیت کا مدعا اسی پس منظر میں سمجھنا چاہیے۔

ثانیاً، اس کی ہر سورۃ کے بارے میں یہ طے کرنا چاہیے کہ اس کے مخاطب اصلاً زمانۂ رسالت کے مشرکین ہیں، اہلِ کتاب ہیں، منافقین ہیں، پیغمبر اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان یا ان مخاطبین کی کوئی خاص جماعت۔ اسی طرح طے کرنا چاہیے کہ جا بجا ان میں سے کس کی طرف اور کہاں التفات ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی ہر ضمیر کا مرجع، ہر لام تعریف کا معہود اور ہر تعبیر کا مصداق پھر اسی روشنی میں واضح کرنا چاہیے۔

ثالثاً، اس میں غلبۂ حق، استخلاف فی الارض اور جہاد وقتال کی آیات سے متعلق یہ بات بالخصوص پوری تحقیق کے ساتھ متعین کرنی چاہیے کہ ان میں کیا چیز شریعت کا حکم اور خدا کا ابدی فیصلہ ہے اور کیا چیز اسی انذار رسالت کے مخاطبین کے ساتھ کوئی خاص قانون رہا ہے جو اب لوگوں کے لیے باقی نہیں رہا۔" [میزان: ۴۹]

یعنی پہلے تو ان انفرادی احکام کا مصداق متعین کیا جائے گا، پھر ان کا زمانہ متعین کیا جائے گا اور ان دو مرحلوں کے بعد نتیجہ خود بخود یہ نکلے گا کہ یہ حکم تو اسی زمانے کے انہی افراد کے ساتھ خاص تھا۔ خصوصاً "غلبۂ حق، استخلاف فی الارض اور جہاد وقتال کی آیات سے متعلق" تو یہ فریضہ نہایت تندہی سے انجام دیا جائے گا اور تمام احکام کو محض زمانۂ رسالت کے افراد کے ساتھ ہی خاص قرار دیا جائے گا۔

یہاں موسیو غامدی کی ان "حکیمانہ" ہدایات میں جو اس بات کی لچک محسوس ہوتی ہے کہ شاید یہ احکام کسی درجے میں بعد والے زمانوں کے لیے بھی کارآمد قرار پا سکیں تو یہ گنجائش محض لفظی اور زبانی، صرف اور صرف قاعدے اور کلیے کی حد تک ہے۔ یہ اُسلوب صرف اس لیے اپنایا گیا ہے کہ اہلِ اسلام قرآن کے انفرادی احکام کو غامدی دھرم میں یکسر مردود ہوتا دیکھ کر بدک ہی نہ جائیں۔ اسی لیے موسیو غامدی نے ایسے کسی حکم کی مثال ذکر کرنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ ورنہ غامدی دھرم کی جزئیات سے واقف ہر شخص یہ جانتا ہے کہ درحقیقت قرآن کے انفرادی احکام کو اس دھرم میں ہمیشہ زمانۂ رسالت کے ساتھ خاص ہی قرار دیا جاتا ہے اور کبھی بھی قرآن سے احکامِ شریعت کا اخذ کرنا روا نہیں رکھا گیا۔ چونکہ یہاں اصول پر ہی تبصرہ ہے اور خود موسیو نے بھی

کوئی مثال پیش نہیں کی اس لیے ہم بھی کسی مثال کو پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

۴۔ کافوری سنت، یعنی مشرکین کی رسوم اور بائبل قرآن سے مقدم ہیں:

ظاہر ہے کہ غامدی بیان کے مطابق جب زمانہ جاہلیت کے مشرک نہ صرف پورے دین پر عمل پیرا ہی تھے، بلکہ پورے دین کا صحیح اور نکھرا، ستھرا علم بھی رکھتے تھے جس میں بدعات تک کی نشاندہی کی گئی تھی تو قرآن مجید کس طرح معیار حق بن سکتا ہے؟ حق تو پہلے ہی موجود تھا، معلوم تھا، ممیز تھا، معروف تھا تو اب قرآن مجید کس حاجت سے اتارا جائے؟ بلکہ اس منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن یہود و نصاریٰ اور مشرکین پر حاکم بن کر نہیں بلکہ ان کا محکوم بن کر اور ان کی شرح و توضیح کا محتاج بن کر نازل ہو۔ آخر کو جب وہ عقیدہ بھی درست رکھتے تھے، اور عبادات چھوڑیے، رسوم تک سے واقف تھے، اور ایسے واقف تھے کہ بدعات سے بھی مکمل آگاہی رکھتے تھے، تو قرآن انہیں کچھ بتانے کی حیثیت میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس تفصیل کے مطابق تو قرآن کو مذکورہ کفار سے اپنی تصدیق کروانے کی ضرورت تھی۔ جی ہاں، یہ بھی مفروضات نہیں بلکہ غامدی اصول کا لازمی تقاضا ہیں اور شاید ان تقاضوں تک ہم از خود نہ بھی پہنچ پاتے اگر موسیو غامدی کسی بھی تاویل اور تشکیک کا کوئی شائبہ باقی نہ چھوڑتے ہوئے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ حسب سابق خود ہی اس کی صراحت نہ کر دیتے۔ چنانچہ دیکھیے! فرماتے ہیں:

> ''سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے، اس لیے وہ لازماً اس کے حاملین کے اجماع و تواتر ہی سے اخذ کی جائے گی۔ قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، اُن کی تفصیلات بھی اسی اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔ انہیں قرآن سے براہ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی'' [میزان: ۴۷]

اہلِ اسلام کا اجماع و تواتر بمقابلہ مشرکین کا اجماع و تواتر:

اس بے مثال اور اچھوتے اصول کا مطلب بیان کرنے سے پہلے، اس عبارت میں مذکور غامدی دھرم کی ایک بہت بڑی ستم ظریفی کی داد دیے بغیر گزرنا ہرگز ممکن نہیں۔ غور کیجیے! یہاں موسیو نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں، کافوری سنت کے جن احکام کے بارے میں لب کشائی کی گئی ہے، وہاں ہرگز قرآن کی بات نہیں سنی جائے گی بلکہ قرآن کو چھوڑ کر ان مذکورہ احکام کی تفصیلات بھی '' اسی اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی''۔ یہ اجماع و تواتر کن کا ہے؟ دین ابراہیمی کی روایت کے حاملین یعنی مشرکین اور یہود و نصاریٰ کا۔ سبحان اللہ!! کیا شانِ بے نیازی ہے کہ ایک جانب تو وہ تاریخ عالم کے سب سے زیادہ صحیح اور مضبوط اسناد، تیقن اور وقعت کے حامل اسلامی اجماع اور روایتِ حدیث کو بیک جنبشِ ابرو

نا قابلِ اعتبار قرار دیتے ہوئے پورے دھڑلے سے یہ حکم صادر کرتے ہیں کہ ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور یہ تو محض افسانہ ہیں، دوسری طرف کا فوری سنت کے حاملین یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ''اجماع وتواتر'' پر انہیں اتنا اعتماد ہے کہ قرآن تک کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا: ''قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، اُن کی تفصیلات بھی اسی اجماع وتواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔ انہیں قرآن سے براہ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی''۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں بھی انہوں نے اپنے پسندیدہ اجماع وتواتر کی کوئی سند وغیرہ پیش کرنے کا تکلف نہیں کیا۔ خیر!

ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ:

سیدھے اور سادے الفاظ میں غامدی دھرم کے اصول کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے احکام کی تفصیل یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ جیسے بدترین کفار سے پوچھی جائے گی اور انہی کفار کے اجماع وتواتر سے اسلامی اور قرآنی احکام کی شکل وصورت متعین ہوگی۔ ہرگز، زنہار، احکامِ شریعت کو قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش بھی نہ کی جائے۔ کیونکہ غامدی دھرم کے مطابق یہ ''سنت'' کے نام سے موسوم کیا گیا مجموعہ جو اسلام کے افسانوی اجماع وتواتر کے مقابلے میں سنت کے معتبر و مستند حاملین یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے حقیقی اجماع وتواتر سے اخذ کیا گیا ہے، قرآن سے مقدم ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں بھی قرآن اس مذکورہ کافوری سنت کے خلاف کچھ بتاتا ہوا پایا جائے گا، تو ہرگز قرآن کی بات پر کان نہیں دھرا جائے گا، بلکہ مذکورہ کفار کے اجماع وتواتر پر مبنی کافوری سنت کی وجہ سے قرآن کو چھوڑ دیا جائے گا۔

اور ان فرمودات کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ:

جب غامدی دھرم کی یہ کافوری سنت قرآن پر مقدم ہے اور حسب صراحت ''قرآن میں اس کے جن احکام کا ذکر ہوا ہے، اُن کی تفصیلات بھی اسی اجماع وتواتر پر مبنی روایت سے متعین ہوں گی۔ انہیں قرآن سے براہ راست اخذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی'' تو پھر لامحالہ قرآن کی حیثیت و وقعت اور اتھارٹی ہی ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور جب قرآن کی اتھارٹی ختم ہو کر کافوری سنت کی کالی حکمرانی رائج ہوگی تو اسلام سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ عین پہلے پیش آمدہ صورتوں کی طرح، یہ نتیجہ بھی ہم ہرگز از خود اخذ نہ کر سکتے اگر خود موسیو غامدی ہی واشگاف انداز میں یہ نہ بتلا دیتے۔

۵: نجات کے لیے اسلام کی کوئی ضرورت نہیں:

چنانچہ موسیو نے اپنی فکر کے اس منطقی نتیجے کا صراحت سے بھی اعلان کر دیا ہے اور اگرچہ اس صراحت کے بغیر بھی ان کے اصولِ موضوعہ کا واحد نتیجہ یہی نکلتا ہے، لیکن ان کے اس اعتراف سے ہمیں

یہ آسانی ہوگئی ہے کہ مقدمے جوڑنے اور نتیجے نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی، ان کا صریح اعلان ہی کافی ہوگیا ہے۔ چنانچہ دیکھیے! فرماتے ہیں:

''جنت میں جانے کا معیار قرآن میں بیان ہے، خدا اور آخرت پر یقین، اچھے اعمال کرنا اور جرائم سے دور رہنا، خواہ اب وہ مسلمان ہو، یہودی ہو یا کسی بھی مذہب کو ماننے والا، جنت کا حقدار ہے''۔

[سالانہ مجلہ مصعبی، سال ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، صفحہ ۱۵، لاہور]

موسیو غامدی کی کافوری سنت کو قرآن پر مقدم کرنے کے نتائج ولوازم کے طور پر جو کچھ سامنے آچکا ہے، ایک مسلمان اس کے بعد مزید کی کیا توقع رکھ سکتا ہے؟ یعنی اسلام کی ضرورت ہی باقی نہ رہی تو اور کیا بچا؟ لیکن موسیو کی زنبیل میں ابھی سامان باقی ہے۔ غامدی دھرم کی بنیادوں میں جب یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی روایت اور اجماع اور تواتر ان کے دھرم کا ماخذ ہیں، اور اس دھرم کی دوربین کے فوکس میں اسلامی اجماع و تواتر دھندلا کر افسانہ و اجماع قرار پاتا ہے اور ہزاروں برس کے انقطاع کے باوجود، کافوری تواتر و سنت اور اجماع و روایت اسے بالکل صاف دکھائی دیتی ہے تو اس کا اثر قرآن مجید کے ایک اور حصے پر بھی لازماً پڑے گا۔ یعنی قرآن مجید نے گزشتہ ادوار کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، وہ تو غامدی دوربین سے پہلے ہی صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اب قرآن کا یہ ثانوی ذریعہ اختیار کر کے اپنے علم و یقین کو گدلا اور آلودہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا تاریخ کے باب میں بھی قرآن کا بیان ناقابلِ اعتبار قرار پائے گا۔

۶: قرآن مجید میں بیان شدہ تاریخ وغیرہ کا اصل ماخذ قدیم صحیفے ہیں:

یہ بھی ہمارے شہبازِ خیال کی پرواز ہرگز نہیں، اگر موسیو غامدی ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں اس منزل تک نہ پہنچا دیتے تو ہم یہاں تک کبھی نہ پہنچ پاتے۔ سنیے! فرماتے ہیں:

''الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگزشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔ بحث و تنقید کی ساری بنیاد انہی پر رکھی جائے گی۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انہیں ہرگز قابلِ التفات نہ سمجھا جائے گا۔ اِن موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ جس طرح ان کی تفصیلات کو قبول کرتے یا ان میں بیان کردہ کسی چیز سے متعلق اصل حقائق کو واضح کرتے ہیں، اس کا بدل ہرگز یہ روایتیں نہیں ہوسکتیں جن سے نہ قرآن کے کسی طالب علم کے دل میں کوئی اطمینان پیدا ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب ہی پر وہ کسی پہلو سے حجت قرار پاسکتی ہیں''۔ [میزان: ۴۷]

تفسیر کی سنی سنائی باتیں بمقابلہ قطعی اور یقینی قدیم صحیفے:

یہاں بھی اس تقابل کا تذکرہ کیے بغیر نہیں بنتی کہ ایک طرف تو غامدی دھرم مسلمانوں کی مرتب کردہ قرآن کی تفسیر کو اس بنا پر مطلقاً ناقابلِ اعتبار قرار دیتا ہے کہ اس میں مذکور روایتیں سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ حالانکہ ان تفسیری روایات میں متواتر و مشہور روایات بھی ہیں اور صحیح ترین احادیث بھی، اور اگر ضعیف یا موضوع روایات در آئی ہیں تو ان کی پوری طرح سے نشاندہی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہی دھرم قدیم صحیفوں کو مخصوص موضوعات پر اصل ماخذ قرار دیتا ہے، جبکہ ان مزعومہ و مجہولہ اور مہملہ صحیفوں کا پایۂ استناد تو دور کی بات، مروجہ بائبل سے باہر ان کا وجود تک کسی کو معلوم نہیں۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

آخر قرآن کی کیا حیثیت ہے؟

یہاں تک ''دین کی آخری کتاب'' نامی اِس بنیادی اُصول کا اختتام ہو گیا ہے اور اس کے فہم و تجزیہ کے سفر میں ہمیں یہ پتا چلا ہے کہ غامدی دھرم میں قرآن مجید تو کافوری سنت کے سامنے بالکل گنگ ہے اور ایک لفظ نہیں بول سکتا۔ اولاً تو وہ کافوری سنت سے درجے میں بھی نیچے ہے، چنانچہ وہ کافوری سنت سے ہٹ کر کوئی نیا حکم بھی نہیں بتا سکتا اور اسے کافوری سنت کے کسی حکم کی تفصیل کے بارے میں بھی کچھ کہنے کی ہرگز کوئی اجازت نہیں۔ اگر کہیں وہ کافوری سنت کے کسی حکم کے بارے میں کچھ کہے بھی تو ہرگز اس کے کہے پر دھیان نہیں دیا جائے گا بلکہ کافوری سنت کے اجماع و تواتر پر مبنی روایت سے ہی تمام احکام کی تفصیلات متعین ہوں گی۔ احکام کے علاوہ اگر قرآن مجید کبھی غلطی سے الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیائے بنی اسرائیل کی سرگذشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق کچھ کہنے کی جسارت کرے تب بھی قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے اور بحث و تنقید کی ساری بنیاد انہی پر رکھی جائے گی۔ اس ساری صورت حال میں قرآن کی حیثیت کے بارے میں یہ سوال لازماً سامنے آتا ہے کہ پھر غامدی دھرم کے نزدیک قرآن آخر ہے کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے اور کس کام آتا ہے وغیرہ، تو اس کا جواب موسیو جاوید احمد غامدی نے ''پیغمبر کی سرگزشت انذار'' نامی اگلے اصول میں بیان کیا ہے۔

۷: قرآن تاریخ کی کتاب ہے:

لکھا ہے: ''ساتویں چیز یہ ہے کہ اپنے مضمون کے لحاظ سے قرآن ایک رسول کی سرگزشتِ انذار ہے۔ اسے شروع سے آخر تک پڑھیے، یہ حقیقت اس کے ہر صفحے پر نظر آئے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے اسے محض ایک مجموعۂ قانون و حکمت نہیں، بلکہ پیغمبر کے لیے اپنی قوم کو انذار کا ذریعہ بنا کر نازل کیا ہے''۔

ان فرمودات کا مطلب اور نتیجہ یہ ہوا کہ:

قرآن تاریخ کی ایک کتاب ہے۔سرگذشت: کہانی۔انذار: ڈرانا، یا دعوت دینا۔مطلب ہوا: ڈرانے یا دعوت دینے کی کہانی۔یعنی قرآن اپنے مضمون کے لحاظ سے ایک رسول کے ڈرانے یا دعوت دینے کی کہانی ہے اور بس!۔نہ تو یہ کا فوری سنت سے ہٹ کر کوئی حکم بیان کرتا ہے، نہ کسی قضیے میں فیصلہ کرتا ہے، نہ کوئی رہنمائی فراہم کرتا ہے اور حتیٰ کہ گذشتہ اقوام اور انبیاء کی تاریخ کے بیان کے لیے بھی اصل ماخذ نہیں بن سکتا۔لے دے کر اگر اس کا کوئی مصرف ہے تو وہ صرف اتنا کہ یہ ایک خاص رسول، یعنی نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے انذار کی تاریخ ہے۔اسی تاریخ کے ضمن میں اس زمانے کے احکام بھی اس حیثیت سے بیان ہو گئے ہیں کہ ان مخصوص حالات میں مخصوص لوگوں کو مخصوص لوگوں کے لیے یہ احکام دیے گئے تھے۔غامدی دھرم میں قرآن چونکہ اصلاً حکم نامہ ہے ہی نہیں، بلکہ وہ تو تاریخ کی کتاب ہے اس لیے اس میں ان احکام کے ذکر کا یہ مطلب نہیں کہ اب بھی ان کی پیروی ضروری سمجھی جائے۔غامدی دھرم میں قرآن مجید کے سرگزشتِ انذار ہونے کے نتیجے کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً جیسے تاریخ کی کتاب میں کوئی مورخ سکندر مقدونی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس کا ایرانی سپاہیوں سے لڑائی کا حکم نقل کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس تاریخ کو پڑھنے والا اس حکم کو اپنے لیے بھی سکندر کا حکم سمجھے اور اٹھ کر ایرانیوں پر چڑھ دوڑے۔بلکہ مورخ کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو گذشتہ زمانے میں پیش آنے والے واقعات اور تاریخ کا علم ہو جائے۔ٹھیک یہی حیثیت قرآن میں مذکور "انفرادی احکام" کی ہے۔اس بات کی ضروری وضاحت پہلے بھی گذر چکی ہے۔

یہ ہے غامدی دھرم میں قرآن کی حیثیت اور اس کا مقام:

یہی ان دو اصولوں کی وضاحت اور مطلب تھا جن میں غامدی اصولِ تفسیر اور غامدی دھرم میں قرآن کی حیثیت اور مقام کو بیان کیا گیا ہے۔ان اصولوں کے مذکورہ خطرناک معانی، ان کے مضمرات اور لوازم کو واضح کر دینا ہی ان کو مسترد کر دینے کے لیے کافی ہے اور ان پر مزید کسی رد کی کوئی حاجت نہیں۔اگرچہ غامدی کوچے میں آ کر قطعیت کا لفظ اپنی حرمت کھو چکا ہے، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا بھی قطعی یقین ہے کہ قرآن کو ماننے والے اور اسلام کو مدارِ نجات سمجھنے والے کسی بھی مسلمان کے سامنے محض ان اصول وضوابط کو کھول کر بیان کر دینا ہی ان کو رد کر دینے کی دلیل بننے کے لیے کافی ہے۔قارئین خود ہی آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا ان میں ایسا کچھ رکھا ہے جس کی

تحقیق کی جائے اور رد کے لیے کچھ تلاش و جستجو کی جائے۔ گمراہی کی اس باون گزی بنیاد کے بعد دیگر تمام مغالطے اور گمراہیاں، جو اپنی جگہ پر مستقل فتنے ہیں، بلاشبہ محض بونے معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ میزان اور فرقان کے عنوان سے جو کچھ موصوف نے فرمایا ہے اس سے چونکہ ان کے دھرم کی مخصوص ذہنیت اور ساخت کا علم ہوتا ہے اس لیے اس کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

چوتھا اصول: میزان اور فرقان:

کل دس اصولوں میں سے دو کا تذکرہ تو اوپر ہو چکا ہے۔ باقی اصولوں میں سے چوتھے نمبر پر ''میزان اور فرقان'' کے عنوان سے جو اصول ذکر کیا ہے اس میں انہوں نے اپنا مقصود وضاحت سے بتلا دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر اور تشریح کے لیے علماء امت سے ہی نہیں، خود نبی ﷺ سے بھی استناد اور ان کی احتیاج بے وجہ بلکہ گمراہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کی (میزان اور فرقان ہونے کی) یہ حیثیت ہے جو اس نے خود اپنے لیے ثابت قرار دی ہے۔ لہٰذا اس کی بنیاد پر جو باتیں قرآن کے بارے میں بطور اصول ماننی چاہییں وہ یہ ہیں:

پہلی یہ کہ قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القا، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

دوسری یہ کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں۔ وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ اس کے شہرستان معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اس کے الفاظ ہیں۔ وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ اس میں کسی ریب و گمان کے لیے ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔'' [میزان: ۲۵]

ان فرمودات سے اصل مقصد قرآن کی تمام تشریحات سے برگشتہ کرنا ہے:

جیسا کہ واضح ہے، ان بظاہر قرآن کی قطعیت وغیرہ سے لبریز دعووں کے پیچھے اصل مدعا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سمیت تمام شخصیات کی بتلائی ہوئی تشریحات پر سے اعتبار ختم کر دیا جائے اور حدیث

شریف سمیت دیگر تمام مآخذ کو ناقابلِ اعتماد باور کروا دیا جائے۔ لہٰذا اسی اصول کے ضمن میں موسیو نے قرآن مجید کی سات قراءتوں کا کھلا انکار کر دیا ہے جو تواتر سے ثابت ہیں۔ اس کے بعد حدیث سے قرآن کے نسخ کا بھی صاف انکار کر دیا ہے۔ پھر پہلے ذکر کردہ غامدی دھرم کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں یہ شبہ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ سب کچھ قرآن مجید کی حیثیت اور مرتبے کے پیش نظر یا اس کو مرکزی مقام دینے کے لیے ہے۔ غامدی دھرم میں قرآن مجید تو بالآخر کافوری سنت کا طفیلیہ بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ان ساری کاوشوں کا مقصد صرف اور صرف قرآن کی ہمہ اقسام تشریحات و توضیحات سے امت کو کاٹنا ہے، چاہے وہ قراءاتِ متواترہ ہی ہوں یا حدیث شریف ہی ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ اور یہ مقصد اسلامی روایت اور شرعی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے اور اس کو رد کرنے کے لیے کسی لمبی چوڑی علمی تحقیق اور تدقیق کی ضرورت نہیں بلکہ صرف اس کی حقیقت جان لینا ہی کافی ہے۔

اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''میزان اور فرقان'' کے اس عنوان کے تحت موسیو غامدی نے قرآن مجید کو باقی ساری کتابوں وغیرہ کے لیے میزان، فرقان، کسوٹی اور معیار وغیرہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

''کتاب الٰہی کا اصل قابلِ اعتماد نسخہ قرآن مجید ہی ہے۔ چنانچہ دوسرے صحیفوں کے متن جب گم کر دیے گئے اور ان کے تراجم میں بھی بہت کچھ تحریفات کر دی گئی ہیں تو ان کے حق و باطل میں امتیاز کے لیے بھی کسوٹی اور معیار ہے۔ جو بات اس پر کھری ثابت ہوگی وہ کھری ہے اور جو اس پر کھری ثابت نہ ہو سکے وہ یقیناً کھوٹی ہے جسے لازماً رد ہو جانا چاہیے۔'' [میزان: ۲۵]

اس تلبیس سے یہ دھوکہ ہو سکتا ہے کہ موسیو بائبل کو نہیں بلکہ قرآن کو واقعی اصل مانتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے یہاں فرمایا ہے وہی ان کا عقیدہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے ''میزان اور فرقان'' وغیرہ ہونے کی تفصیلات بیان کر کے انہوں نے اس خوش گمانی کا خود ہی سدباب کر دیا ہے۔ ان تفصیلات کے مطابق میزان اور فرقان ہونے کا تقاضا بس یہی ہے کہ:

''اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں بھی اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا'' [میزان: ۲۵]

جس کے نتیجے میں:

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا...... بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم،

اشعری و ماتریدی اور جنید وشبلی، سب پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی.....[میزان: ۲۵]

ان تلبیسات سے موسیو کا مقصد بس یہی ہے کہ قرآن کو قطعی قطعی کہہ کر اس کی ہر قسم کی اسلامی تشریحات سے اپنے پیروکاروں کا رابطہ ختم کر دیں۔ اگر واقعی موسیو قرآن کو میزان، فرقان، کسوٹی اور معیار وغیرہ تسلیم کرتے تو اپنی کافوری سنت کو کبھی بھی قرآن سے مقدم نہ قرار دیتے۔ نہ ہی امم سابقہ کی تاریخ کے لیے اصل ماخذ قدیم صحیفوں کو شمار کرتے اور نہ ہی قرآن کے انفرادی احکام کو مخصوص زمانے اور مخصوص لوگوں کے ساتھ خاص قرار دیتے۔ لہٰذا قرآن مجید کو کسوٹی اور معیار وغیرہ تسلیم کرنے کا مقصد دجل وفریب کے علاوہ صرف اور صرف یہی ہے کہ اس کی ہر معتبر تشریح وتفسیر کو بے اعتبار باور کروا دیا جائے اور حدیث کے ساتھ ساتھ متواتر قراءتوں کو بھی خیر باد کہہ دیا جائے۔

غامدی دھرم کے قرآن کے بارے میں عقیدے کا اجمالی خاکہ:

مذکورہ تمام تفصیلات کے پیش نظر اگر غامدی دھرم میں دین کی حقیقت اور قرآن کی حیثیت یہ ہے کہ:

۱.....دین کی ابتدا حضرت آدمؑ سے ہوئی اور تکمیل حضرت ابراہیمؑ پر ہوگئی۔ مزید کچھ ضمیمہ جات اور تتمہ نما چیزیں بھی حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک عطا کر دی گئیں۔ یہاں تک دین مکمل ہو گیا اور اسی پر نجات کا مدار ہے۔ کوئی شخص انہی امور پر ایمان واعتقاد رکھے تو یہ اس کی نجات کے لیے کافی ہے، قرآن اور اسلام وغیرہ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔

۲.....اسی دین کے حاملین کی روایت اور اجماع سے ہی آئندہ کے سارے احکامات کا علم ہوگا اور قرآن مجید کو بھی اسی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔

۳.....اس دین کے جو احکام قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، انہیں قرآن جیسے ثانوی ماخذ کی بجائے اصل دین سے ہی اخذ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں جو امم سابقہ کی تاریخ وغیرہ قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ بھی اس کے اصل ماخذ یعنی قدیم صحیفوں وغیرہ سے اخذ کرنی چاہیے۔

۴.....رہے وہ نئے اور انفرادی احکام جو قرآن میں ذکر ہوئے ہیں تو وہ صرف تاریخ کی حیثیت سے مذکور ہیں، ہمیشہ کے لیے زیر عمل لانے کی غرض سے نہیں۔ اس لیے قرآن کی تفصیلات وتشریحات، تفاسیر اور قراءات وغیرہ کے پیچھے پڑنے کی بجائے اصل دین کو اس کے حاملین کی روایت کے تواتر اور اجماع سے ہی اخذ کرنا چاہیے۔

اسلام یا غامدیت؟

غامدی دھرم کے بارے میں ذکر کیے گئے حقائق سے باخبر ہونے کے بعد ہر مسلمان با آسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کے سامنے اب دو ہی راستے ہیں:

۱: یا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے لے کر اب تک ساری امت کے علماء و مفسرین کے بیان کردہ اصولوں کو درست مانے اور ان کی پیروی کرے۔ جب کہ ان اصولوں کے بارے میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ان اصولوں کا ضابطہ اور متعدد سلسلہ اور اسناد ہر دور میں موجود رہا ہے جو بالآخر مفسرین صحابہ کرامؓ سے ہوتا ہوا خود رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات تک پہنچتا ہے اور اہلِ اسلام کے دریافت کردہ روایت و درایت کے ہر کڑے سے کڑے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔

۲: یا غامدی دھرم کے اصول کو قبول کرنے کے لیے اس پوری اسلامی روایت کو قربان کر دے اسے یکسر غلط اور سراسر گمراہی و ضلالت سمجھے اور قرآن کے بارے میں "صحیح نقطہ نظر" اختیار کرنے کے لیے موسیو جاوید احمد غامدی کے خود ساختہ عجیب انوکھے اور نرالے اصول کو درست مان کر ان کی پیروی کرے۔ جب کہ ان کے بارے میں بھی یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ یہ سارے ہی اصول ان کی اپنی تراشیدہ "قطعیت وغیرہ" کے بلند بانگ دعووں کی گونج میں محض ان کی اپنی فہم تک یا اصلاحی و فراہی کی فہم تک پہنچتے ہیں اور راستے میں حسب دستور، ساری امت کے فکر و تدبر کو بھی ساتھ ہی روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

دونوں مذاہب میں ترجیح اور انتخاب کا یہ فیصلہ کسی بھی مسلمان کے لیے اس وقت اور مزید آسان ہو جاتا ہے جب اسے یہ نظر آتا ہے کہ ملتِ غامدیہ کے اصول و ضوابط ایک ایسے مذہب اور اس کے جزوی مسائل کو جنم دیتے ہیں، جو مذہب اسلام اور اس کے مسائل سے بالکل مختلف ہیں۔ اسلام اور غامدیت کے اصول و فروع کا تقابلی جائزہ لینے والوں کے لیے یہ بات بالکل واضح ہے۔

غامدی اصول کسی بھی پہلو سے اہل اسلام پر حجت نہیں:

غامدی دھرم کی ان ساری تفصیلات کے بیان کے بعد آخر میں اس بات کا تذکرہ بھی مناسب ہے کہ عقل و نقل کے مقتضیٰ کے علاوہ خود موسیو جاوید احمد غامدی کی تصریحات کے مطابق بھی ان کی یہ ساری خامہ فرسائی اور محنت کم از کم اہلِ اسلام کو دعوت دینے کی حد تک بالکل بے کار اور خلاف اصول ہے۔ یوں تو غامدی اصول کی اسلام سے مخالفت واضح ہو جانے کے بعد قرآن سے عقیدت و محبت رکھنے والے اور اسلام کو مدار نجات سمجھنے والے کسی بھی مسلمان کے دل میں ایمانی حرارت کی بنا پر ہی غامدیت کی پیروی کا وہم تک نہیں آ سکتا، لیکن اس بارے میں یہ حقیقت بھی اپنی جگہ بالکل اٹل ہے کہ مکالمہ اور بحث و مناظرہ

کے مسلمہ اصولوں کے مطابق بھی ان کی یہ نادر تحقیقات کسی مسلمان پر کسی بھی درجے میں حجت نہیں ہیں۔

اصول مناظرہ ومباحثہ کے تحت کوئی بھی بات مخاطب کے لیے لائق تسلیم اور قابل تقلید صرف اس صورت میں بنتی ہے جب وہ اس کے مسلمات اور معتقدات کے مطابق ہو۔ جب کہ موسیو جاوید احمد غامدی نے اپنے سارے اصول بیان کرتے ہوئے ایک بار بھی ان مسلمات کو بنیاد نہیں بنایا جن کو اہل اسلام تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا ان کی کسی بھی بات سے اہل اسلام پر کسی بھی درجے میں حجت قائم نہیں ہوتی۔ ان کے طرزِ استدلال کا تقاضا گویا یہ ہے کہ اپنے معتقدات اور تمام اسلامی علوم وشخصیات سے یکسر قطع تعلق کر کے مخاطبین وقارئین صرف اس بات پر بھروسہ کریں اور تسلیم کریں کہ جو میں نے اسے بیان کیا ہے۔ موسیو غامدی کے اصولوں پر غور کرنے والے ہر شخص پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہی دعویٰ ان کے استدلال کی بنیاد اور اس کا ماحصل ہے۔ کسی اصول کی بحث میں بھی موسیو غامدی نے اسلامی علوم سے کوئی دلیل پیش نہیں کی، مشہور مسلمانوں کے ہاں معروف ومتبوع کسی عالم کا قول پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ معروف ومعتبر علوم سے استناد کو بے کار سمجھتے ہوں یا ان کی تحریروں میں کسی بھی شخص کا حوالہ نہ آتا ہو۔ اپنے باطل اور فریب کے سہارے کے لیے اگر وہ کسی مسلمان عالم یا امام کی کوئی عبارت توڑ موڑ کر اپنے مطلب کے لیے مفید بنا سکتے ہوں تو اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی علم یا فن کا کوئی مسئلہ، یا اس کی بگڑی ہوئی شکل انہیں اپنے نظریات کے پرچار کے لیے موزوں محسوس ہو تو وہ بھی ان کے استدلال کا حصہ بن جاتا ہے اور ان کے اس طرزِ عمل کی بیسیوں مثالیں آسانی سے جمع کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان کے مجموعی افکار اور نظریات کے بیان میں کہیں بھی نہ کسی مسلمان عالم، امام یا مجتہد کا کوئی حوالہ نظر آئے گا نہ ہی اسلامی علوم سے استفادہ اور استناد تلاش کیا جا سکے گا۔ شخصیات کی حد تک لے دے کر ان کی کل کائنات اصلاحی اور فراہی تک محدود ہے۔ لہٰذا اگر ان کی تحقیقات اگر کسی کے لیے دعوت بن پائیں اور کسی پر حجت بن سکیں تو وہ اہل سنت مسلمان نہیں بلکہ فراہی یا اصلاحی کے متبعین ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ غامدی طرزِ عمل کی مذکورہ حقیقت کے پیش نظر یہ کہنا عین سچائی کی ترجمانی ہے کہ موسیو غامدی کا تقاضا یہ ہے کہ بغیر کسی لائق تسلیم دلیل اور حوالے کے ان کی باتیں تسلیم کی جائیں اور پوری اسلامی روایت سے محض ان کی بے تکی فرمائش پر روگردانی کر لی جائے۔ اس طرزِ عمل کا بے اصل اور باطل ہونا کسی دلیل اور وضاحت کا محتاج نہیں۔ لہٰذا اگر موسیو غامدی کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ائمہ اور علماء کی تحقیقات صرف ان کے بے حوالہ اور بے دلیل، الجھے ہوئے اور بے اصل استدلال کی بنا پر چھوڑ دی جائیں، تو اس کا آسان جواب یہ ہے کہ ایسا کرنے کی بجائے موسیو غامدی کی ہی تلبیسات کو رد کر دینا نہ صرف عقل کا اور دین کا تقاضا ہے، بلکہ خود غامدی اصول کے مطابق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔

موسیو غامدی کے اپنے اصول کے مطابق ان کی دعوت رد کرنا واجب ہے:

خود موسیو غامدی کے فرمودات اور طرز بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کی اپنی نظر میں بھی یہ اصول اہلِ اسلام کے لیے نہیں ہیں۔ موسیو نے قرآن مجید کی یہودی اور عیسائی تشریحات پر اعتماد کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"الہامی لٹریچر کے خاص اسالیب، یہود و نصاریٰ کی تاریخ، انبیاءِ بنی اسرائیل کی سرگذشتوں اور اس طرح کے دوسرے موضوعات سے متعلق قرآن کے اسالیب و اشارات کو سمجھنے اور اس کے اجمال کی تفصیل کے لیے قدیم صحیفے ہی اصل ماخذ ہوں گے۔ بحث و تنقید کی ساری بنیاد انہی پر رکھی جائے گی۔ اس باب میں جو روایتیں تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں اور زیادہ تر سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں، انہیں ہر گز قابلِ التفات نہ سمجھا جائے گا۔ اِن موضوعات پر جو روشنی قدیم صحیفوں سے حاصل ہوتی ہے اور قرآن کے الفاظ جس طرح ان کی تفصیلات کو قبول کرتے یا ان میں بیان کردہ کسی چیز سے متعلق اصل حقائق کو واضح کرتے ہیں، اس کا بدل ہر گز یہ روایتیں نہیں ہو سکتیں جن سے نہ قرآن کے کسی طالب علم کے دل میں کوئی اطمینان پیدا ہوتا ہے اور نہ اہل کتاب ہی پر وہ کسی پہلو سے حجت قرار پا سکتی ہیں۔"

[میزان: ۴۷]

یعنی چونکہ تفسیر کی کتابوں میں منقول روایات اہل کتاب کے معتقدات کے مطابق نہیں، اور ان کے مسلمات کی بنیاد پر قائم نہیں ہیں، اس لیے وہ "کسی پہلو سے" اہل کتاب پر حجت نہیں بن سکتیں۔ تو اسی غامدی اصول سے استفادہ کرتے ہوئے اہلِ اسلام بھی ان سے یہ گزارش کر سکتے ہیں کہ چونکہ آپ کا دھرم نہ تو مسلمانوں کے معتقدات کے مطابق ہے اور نہ ہی اسلام کے مسلمات کی بنیاد پر قائم ہے اس لیے وہ اسلام اور اہلِ اسلام پر کسی بھی پہلو سے حجت نہیں بن سکتا۔

یہی کچھ غامدی دھرم کے اصولِ تفسیر کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے آیا ہے۔ دین کے ساتھ اور خود اپنی ذات کے ساتھ اخلاص کا تقاضا یہی تھا کہ اپنی سمجھ کے مطابق ان افکار میں موجود خلافِ اسلام عنصر اور جوہر کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان معروضات کو مسلمانوں کے لیے اور غامدی حضرات کے لیے بھی ہدایت کا ذریعہ بنائیں اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں۔

☆......☆......☆......☆

شیخ الحدیث مولانا عبدالقدوس قارن مدظلہم

تفسیر کے لیے بنیادی شرط اور غامدی صاحب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم. أما بعد

علمائے امت نے قرآن کریم کی تفسیر کرنے والے کے لیے جو شرائط مقرر فرمائی ہیں ان میں حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علوم بلاغت، صرف، نحو اور اسباب نزول وغیرہ علوم میں مہارت تامہ ہونا ضروری ہے۔ اور سب سے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ عربی لغت میں انتہا ماہر ہو۔ عربی کلمات کے لغوی و اصطلاحی معانی اور کلمات کے استعمال کے مواقع بخوبی جانتا ہو۔ عربی لغت میں مہارت صرف تفسیر کرنے والے کے لیے ہی نہیں بلکہ اُس کے لیے بھی ضروری ہے جو پہلے سے لکھی گئی تفسیر کو اپنی زبان میں نقل کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے حضرات علماء کرام نے ناقل کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ عربی زبان میں بیان کردہ مفہوم کو اپنی زبان میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔

بعض حضرات کو یہ درجہ حاصل نہیں ہوتا مگر وہ خود یا ان کے متعلقین ان کو اس درجہ کا سمجھ لیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ گمراہی پھیلانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے حضرات کی حقیقت سے عوام الناس کو آگاہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ محض کسی کی توہین وتذلیل کے لیے اس کے عیب اور کمزوری کو ظاہر کرنا پسندیدہ عمل نہیں ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ مگر جب عوام الناس کو کسی فتنہ گر کے فتنہ سے بچانا اور دین کی حفاظت مقصود ہو تو فتنہ گر کے عیب اور کمزوری کو ظاہر کرنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ واجب اور ضروری ہو جاتا ہے تاکہ عوام الناس اس کی بات اور عمل کو اسی درجہ میں سمجھیں جس درجہ کا وہ اہل ہے۔ حضرات محدثین کرامؒ کے ہاں جرح وتعدیل کا اصول بھی اسی مصلحت کے تحت ہے۔ راوی پر جرح کرتے ہوئے اُس کے عیب اور کمزوری کو ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ اس راوی کی روایت اور اس کے قول کو اس کی حیثیت کے مطابق درجہ دیا جا سکے۔

بعض لوگوں کو مبالغہ آرائی کے ساتھ ایسے مقام تک پہنچا دیا جاتا ہے، جس کے وہ اہل نہیں ہوتے۔ ان کی حیثیت سے عوام کو آگاہ کرنا دینی راہ نماؤں اور پیشواؤں کا فریضہ ہے۔ جب مودودی صاحب نے اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو اور ان کے پیروکاروں نے مبالغہ آرائی کے ساتھ اُن کو اجتہاد کے منصب کا اہل سمجھ لیا تو علماء امت نے نہ صرف ان کے باطل نظریات کی تردید کی بلکہ ان کی علمی کمزوریوں کو بھی ظاہر فرمایا تاکہ عوام الناس آگاہ ہو جائیں کہ ان کمزوریوں والا اجتہاد کے منصب کا اہل

نہیں ہو سکتا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تقریر میں فرمایا کرتے تھے کہ: ''جب مودودی صاحب ایک وفد کے ہمراہ مصر گئے تو ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ کب آئے؟ تو مودودی صاحب نے جواب دیا: جئتُ غداً۔ عربی میں ''غد'' اگلے کل کو اور امس گزشتہ کل کو کہا جاتا ہے، مگر مودودی صاحب امس کی بجائے غداً کہہ کر مذاق کا باعث بن گئے۔ مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو ''امس'' اور ''غد'' میں فرق معلوم نہیں وہ مجتہد بنا پھرتا ہے۔

موجودہ دور میں میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ نے انتہائی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے آزاد خیال پروفیسر جاوید احمد غامدی صاحب کو بہت شہرت دی، وہ خود بھی اپنے آپ کو قرآن کریم کی براہ راست تفسیر کرنے کا اہل سمجھتے ہیں اور ان کے پیروکار تو ان کو اجتہاد کے منصب کا اہل سمجھنے لگ گئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ صاحبِ مطالعہ، صاحب معلومات اور صاحبِ لسان ضرور ہیں، اور اپنے اندازِ بیان سے سامعین کو مطمئن کرنے میں مہارت تو رکھتے ہیں مگر ان کے بیانات اور تصانیف میں وہ علمی جھلک ذرا بھی نظر نہیں آتی جو ''اہل علم'' کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ دورِ حاضر کے کئی فضلاء کرام اور پروفیسر حضرات کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے، ان کے انداز اور بالخصوص عربی اور فارسی عبارات کے مفہوم کو اپنی زبان میں واضح کرنے کی صلاحیت دیکھ کر دیانتداری سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کا درجہ اور مرتبہ اس معاملہ میں غامدی صاحب سے بہت بلند ہے، غامدی صاحب اپنے آپ کو قرآن کریم کی براہ راست تفسیر کرنے کا اہل سمجھتے ہیں، حالانکہ حقیقت کی دنیا میں ان کو ناقلین کے زمرہ میں شمار کرنا بھی بددیانتی ہے، اس لیے کہ ناقل کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ عبارت کے مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اس کی وضاحت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جبکہ غامدی صاحب اس صلاحیت سے یکسر محروم دکھائی دیتے ہیں۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اُن کی ایک کتاب ''میزان'' ہے جو ان کی معرکۃ الآراء کتاب سمجھی جاتی ہے اور ان کے میڈیائی عروج کے زمانہ میں لکھی گئی ہے، اِس میں انہوں نے اپنے افکار و نظریات پیش کرتے ہوئے نہ صرف مسلمات کو نظر انداز کیا ہے بلکہ عقل و شعور کے خلاف بھی کئی باتیں لکھ دی ہیں، یہ ایک الگ بحث ہے جس پر مستقل تبصرہ کی ضرورت ہے، اس وقت ہم صرف اُن شگوفوں کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے اپنی اس کتاب میں عربی عبارات کا ترجمہ کرتے ہوئے کھلائے ہیں۔ انہوں نے کئی احادیث کا جو عجیب و غریب ترجمہ کیا ہے اس کو بھی ہم زیرِ بحث نہیں لائے، اس لیے کہ انہوں نے ان احادیث کا متن ذکر نہیں کیا۔ ہم صرف اُن عبارات کو زیرِ بحث لائے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے جن کا متن ذکر کر کے انہوں نے ترجمہ کیا ہے۔

قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں!

(۱)...... غامدی صاحب نے قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کا ذکر کرتے ہوئے السیرۃ النبویۃ اور ابن کثیر کے حوالہ سے ولید بن مغیرہ کا کلام نقل کیا ہے، جس کے ابتدائی الفاظ ہیں:

”واللہ ما منکم رجل أعرف بالأشعار منی، ولا أعلم برجزہ ولا بقصیدۃ منی ولا بأشعار الجن“

بخدا تم میں سے کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر نہ شعر سے واقف ہے نہ رجز اور قصیدہ سے اور نہ جنوں کے الہام سے۔[میزان:۱۷]

اس عبارت میں ولا بأشعار الجن کے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ غامدی صاحب نے کیا ہے ”اور نہ جنوں کے الہام سے۔“ یہ ترجمہ بالکل مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ جب کسی لفظ یا کلام کا قریب معنی مفہوم کو ادا کرتا ہو تو بعید معنی کی جانب جانا مناسب نہیں ہوتا اور یہاں ولا بأشعار الجن کا قریب معنی ”اور نہ جنوں کے اشعار سے“ مفہوم کو ادا کرتا ہے اور سیاق وسباق کے اعتبار سے بہتر بھی ہے۔ پھر ترجمہ کرتے وقت عبارت کے مفہوم میں پائے جانے والے عموم وخصوص کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے اور یہاں عبارت میں کلام کی فضیلت بیان کی جارہی ہے جس کے مناسب بھی ہے کہ ولا بأشعار الجن کا معنی کیا جائے ”اور نہ ہی جنوں کے اشعار سے“ تاکہ کلام کی فضیلت کا مقصد حاصل ہو سکے۔ جبکہ الہام کبھی کلامی ہوتا ہے اور کبھی قلبی ہوتا ہے۔ اِس لیے یہاں اشعار کا ترجمہ ”الہام“ کرنا بالکل مناسب نہیں ہے۔

(۲)...... غامدی صاحب نے مسلم شریف کی روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے، الفاظ یہ ہیں:

”البکر بالبکر جلد مائۃ ونفی سنۃ، والثیب جلد مائۃ والرجم.“ اسی طرح کے مجرموں میں کنوارے کنواریوں کے ساتھ ہوں گے اور انہیں سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا دی جائیگی۔ اس طرح شادی شدہ مرد وعورت بھی سزا کے لحاظ سے ساتھ ہوں گے اور انہیں سو کوڑے اور سنگ ساری کی سزا دی جائے گی۔[میزان:۳۹و۶۱۳]

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ کنوارہ مرد کنواری عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ان کی سزا ہے۔ اور شادی شدہ مرد عورت سے زنا کرے تو سو کوڑے اور سنگ ساری ان کی سزا ہے۔ اس عبارت کی تعبیر شارحین نے یوں کی ہے:

”البکر زنی بالبکر“ کنوارہ مرد جس نے کنواری لڑکی سے زنا کیا۔

”الثیب زنی بالثیب“ شادی شدہ مرد جس نے شادی شدہ عورت سے زنا کیا۔

اس عبارت میں پہلے جملہ میں کنوارے مرد وعورت کی اور دوسرے جملہ میں شادی شدہ مرد وعورت کی سزا بیان کی گئی ہے کہ کنوارے مرد وعورت کی سزا سو کوڑے اور جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد وعورت کی سزا سو کوڑے اور رجم ہے۔ بیشک کنوارہ مرد شادی شدہ عورت سے یا شادی شدہ مرد کنواری عورت سے زنا کریں۔ اس لحاظ سے بالبکر اور بالثیب میں باء کا تعلق زنی فعل کے ساتھ ہے، مگر غامدی صاحب باء کو مع کے معنی میں لے کر ترجمہ کرتے ہیں کہ کنوارے کنواریوں کے ساتھ ہوں گے اور شادی شدہ مرد وعورت بھی سزا کے لحاظ سے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ حالانکہ با کو مع کے معنی میں لینے کا نہ کوئی قرینہ موجود ہے اور نہ ہی اس ترجمہ کے ساتھ عبارت کا مفہوم واضح ہوتا ہے۔

(۳).....غامدی صاحب نے دوجگہ امام اللغۃ زمخشری کی الکشاف سے عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے جس کا آخری حصہ ہے:

"ولاعتبار العادة والتعارف قالوا: من حلف لايأكل لحما فأكل سمكا لم يحنث، وإن أكل لحما في الحقيقة" چنانچہ عرف وعادت ہی کی بنا پر فقہا نے کہا ہے کہ جس نے قسم کھائی کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا پھر اس نے مچھلی کھالی تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی دراں حالیکہ اس نے حقیقت میں گوشت ہی کھایا ہے۔[میزان: ۲۱و۶۳۴]

اس عبارت کے آخری حصہ وإن أكل لحما في الحقيقة میں واؤ وصلیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ "اگرچہ اس نے حقیقت میں گوشت کھایا ہے" مگر غامدی صاحب اس واؤ کو حالیہ قرار دے کر معنی کرتے ہیں: "دراں حالیکہ اس نے حقیقت میں گوشت کھایا ہے۔" ذوالحال اور حال کی تعریفات اور ان کے استعمال کے مقامات کو جاننے والا کبھی اس مقام میں واؤ کو حالیہ نہیں مان سکتا، حال ذوالحال کے لیے قید اور شرط ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبارت کا مفہوم یہ بن جاتا ہے کہ جس حال میں اس نے مچھلی کا گوشت کھایا اس حال میں وہ حانث نہیں ہوا، اور جس حال میں اس نے گوشت نہیں کھایا تو وہ حانث ہوگیا۔ حالانکہ یہ مفہوم بالکل غلط ہے اور یہ ساری خرابی حال بنانے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے جس کی جانب غامدی صاحب نے توجہ ہی نہیں کی۔

(۴).....غامدی صاحب خطیب بغدادی کی کتاب الكفاية في علوم الرواية کی عبارت نقل کر کے اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

"ولا يقبل خبر الواحد في منافاة حكم العقل وحكم القرآن الثابت المحكم والسنة المعلومة والفعل الجاري مجرى السنة وكل دليل مقطوع به. خبر واحد اس صورت میں قبول نہیں کی جاتی جب عقل اپنا فیصلہ اس کے خلاف سنادے، وہ قرآن کے کسی ثابت اور محکم حکم کے خلاف

ہو، سنت معلومہ یا ایسے کسی عمل کے خلاف ہو جو سنت کی طرح معمول بہ ہو، کسی دلیل قطعی سے اس کی منافات بالکل واضح ہو جائے۔'' [میزان: ۶۳]

اس عبارت کے آخری حصہ و کل دلیل مقطوع بہ کا عطف ما قبل پر ہے، اس لیے اس کا ترجمہ یوں ہوگا: ''اور وہ کسی دلیل قطعی کے خلاف ہو'' مگر غامدی صاحب اس جملہ کو معطوفہ بنانے کی بجائے مستقل جملہ قرار دے کر معنی کرتے ہیں کہ: ''کسی دلیل قطعی سے اس کی منافات بالکل واضح ہو جائے۔'' عبارت کا مطلب تو واضح ہے کہ جس طرح خبر واحد قرآن کریم کے کسی ثابت اور محکم حکم کے خلاف ہو تو وہ قبول نہیں کی جاتی اسی طرح اگر کسی دلیل قطعی کے خلاف ہو تو قبول نہیں کی جائے گی، مگر غامدی صاحب نے ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ''کسی دلیل قطعی سے اس کی منافات بالکل واضح ہو جائے۔'' حالانکہ عبارت میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جن کا یہ ترجمہ ہو یا مفہوم کی وضاحت کے لیے ان کلمات کے اضافہ کی ضرورت ہو۔

(۵)......غامدی صاحب بخاری شریف کی ایک روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کرتے ہیں:

فرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ الفطر صاعا من تمر او صاعا من شعیر علی العبد والحر الخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر ہر مسلمان پر لازم ٹھیرایا ہے۔ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو۔ ہر فرد کے لیے غلام ہو یا آزاد۔

اس ترجمہ میں ''ہر فرد'' کے لیے کا اضافہ فضول ہے، اس لیے کہ روایت میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جن کا یہ ترجمہ بن سکے، اگر ان الفاظ کو فضول نہ مانا جائے تو ترجمہ کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ''ہر مسلمان پر صدقہ فطر لازم ٹھیرایا ہے ہر فرد کے لیے۔'' حالانکہ یہ مفہوم بالکل غلط ہے۔

(۶)...... غامدی صاحب نے مکہ کی حرمت سے متعلق بخاری شریف کی روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں لایعضد شوکۃ کا ترجمہ کیا:

''نہ اس کے کانٹوں والے درخت کاٹے جائیں گے۔'' [میزان: ۳۸۴]

اس ترجمہ میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ اس جملہ کا معنی مضارع مستقبل کا کیا گیا ہے، حالانکہ شراح حدیث نے وضاحت فرمائی ہے کہ یہ فعل مضارع کا صیغہ ہونے کے باوجود فعل نہی کے معنی میں ہے۔ فعل مضارع میں خبر اور فعل نہی میں حکم ہوتا ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو فرما رہے ہیں کہ اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔

اور دوسری خرابی یہ ہے کہ شوک کا معنی کانٹوں والے درخت کیا گیا، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ حرم کے رقبہ کے کانٹوں والے درخت کاٹنا منع ہے اور بغیر کانٹوں کے درختوں کا کاٹنا منع نہیں ہے،

حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، اس لیے کہ حرم کے ہر قسم کے درخت کا ٹنا منع ہے۔

صحیح روایات میں حرم کے درخت کاٹنے کی ممانعت الگ اور شوک کاٹنے کی ممانعت الگ آئی ہے، اسی لیے علماء امت نے فرمایا کہ حرم کے درختوں کا کانٹا بھی اکھاڑنا منع ہے، بے شک وہ اذیت کا باعث بنے۔ جن روایات میں صرف لا یعضد شوکۃ کے الفاظ ہیں، ان کے بارہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ جب کانٹا اکھاڑنا منع ہے تو درخت کاٹنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ غامدی صاحب کا ''شوک'' کا معنیٰ ''کانٹوں والے درخت'' کرنا بالکل غلط ہے۔

(۷)......راقم الحروف نے علم ادب عربی کی اکثر کتابیں مفسر قرآن عم مکرم حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی ہیں۔ دیگر فنون کی طرح اس فن میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو کمال ملکہ عطا فرمایا تھا، وہ لفظ کی لغوی، اصطلاحی، صرفی اور نحوی ابحاث کے ساتھ ساتھ کلام میں پائے جانے والے حسن و قبح کے اسباب بھی واضح فرماتے تھے کہ اس وجہ سے اس کلام میں خوبی پیدا ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے قباحت پیدا ہوگئی ہے۔ ایک دفعہ ایک شعر کے بارہ میں بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا ترجمہ ایک شاعر نے اردو میں کیا ہے مگر اس نے ستیاناس کر کے رکھ دیا، اس لیے کہ شعر میں جس جملہ کی وجہ سے حسن پیدا ہوتا ہے اس نے اس حصہ کو بالکل نظر انداز کر دیا اور مفہوم کا ستیاناس کر دیا۔

راقم الحروف نے غامدی صاحب کی جانب سے پیش کردہ ایک عبارت اور اس کا ترجمہ جب دیکھا تو بے ساختہ زبان سے نکلا کہ اس نے تو ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی تو اس کے بعد دوسرے آدمی نے اس عورت سے نکاح کرلیا۔ دوسرے آدمی کے نکاح میں آنے کے بعد اس عورت کے دل میں دوبارہ پہلے خاوند کے نکاح میں جانے کی چاہت پیدا ہوگئی تو اس نے اپنے دوسرے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا، لیکن اس نے انکار کردیا۔ پھر ان کا معاملہ حضور علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو اس عورت نے اپنے اس خاوند کے بارے میں کنایہ کے ایسے الفاظ استعمال کر کے عیب لگایا جن سے اس کا نامرد یعنی شادی کے لائق نہ ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے جواب میں خاوند نے اپنی قوت کو ظاہر کرنے کے لیے کہا: ''کذبت واللہ یارسول اللہ إنی لأنفضها نفض الأدیم. اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول یہ عورت جھوٹ کہتی ہے، بیشک میں اس کو ایسے جھنجھوڑتا یا جھٹکتا ہوں جیسے دباغت دینے والا چمڑے کو اِدھر اُدھر جھٹکتا ہے۔'' اس سے اُس نے اپنی قوت کو بیان کیا ہے۔ غامدی صاحب نے یہ روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کرتے ہوئے إنی لأنفضها نفض الأدیم کا ترجمہ کیا:

''میں تو اس کے ساتھ وہی کرتا ہوں جو دباغت دینے والا چمڑے کے ساتھ کرتا ہے۔'' [میزان: ۴۵۰]

اس جملہ میں قائل کی مراد کا مدار نفض کے صیغہ پر ہے جس کو غامدی صاحب نے یکسر نظر انداز کر کے مفہوم کا ستیاناس کر دیا ہے۔ پھر غامدی صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے وہ یقیناً عربی زبان سے کچھ مناسبت رکھنے والے حضرات کے ہاں مضحکہ خیز ہے، اس لیے کہ دباغت دینے والا تو چمڑے کو نمک یا پتے ملتا ہے اور آج کل کیمیکل پاؤڈر ملتا ہے اور اس چمڑے کے بال اکھاڑتا ہے۔ تو کیا وہ شخص بھی اپنی بیوی کے ساتھ وہی کچھ کرتا تھا؟ تعجب ہے کہ یہ ترجمہ وہ شخص کر رہا ہے جو اپنے آپ کو قرآن کریم کی براہ راست تفسیر کرنے کا اہل سمجھتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ

(۸)......غامدی صاحب نے بخاری شریف کی ایک روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے:

"الا کلکم راع و کلکم مسؤل عن رعیتہ" آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنایا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ [میزان: ۵۵۶]

غامدی صاحب نے راع کا معنی چرواہا اور رعیت کا معنی گلہ کیا ہے، حالانکہ احادیث کی تشریح اور ترجمہ کرنے والے حضرات نے راع کا معنی حاکم و نگران اور رعیت کا معنی ماتحت کیا ہے اور یہی معنی درست ہے، اس لیے کہ لفظ کا وہی معنی لیا جاتا ہے جو تمام صورتوں میں پایا جا سکے۔ غامدی صاحب نے رعیت کا معنی "گلہ" کیا ہے اور گلہ جانوروں کے ریوڑ کو کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ ریوڑ ہو تو پوچھ گچھ ہوگی اگر ایک ہو تو سوال نہ ہوگا، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی کا یک ماتحت ہی ہو تب بھی نگران سے اس کے بارہ میں سوال کیا جائے گا۔

(۹)......غامدی صاحب نے بخاری شریف کی ایک روایت نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے:

"إنما نزل أول ما نزل منہ سورۃ من المفصل فیھا ذکر الجنۃ و النار." سب سے پہلی چیز جو قرآن مجید میں نازل ہوئی وہ مفصل کی ایک سورۃ تھی جس میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا۔

[میزان: ۵۶۲]

غامدی صاحب نے اول ما نزل میں ما کو عموم کے لیے لے کر اس کا ترجمہ "چیز" کیا ہے، حالانکہ یہاں ما عموم کے لیے نہیں ہے، اس لیے کہ پہلی جو چیز وحی کے طور پر حضور علیہ السلام پر اتاری گئی وہ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات ہیں۔ اگر ما عموم کے لیے ہو تو اس کا ترجمہ چیز کیا جاتا ہے اور جہاں عموم کے لیے نہ ہو وہاں سیاق وسباق یا قرینہ کے ساتھ اس کا معنی متعین کیا جاتا ہے۔ اور یہاں ما عموم کے لیے نہیں اسی لیے علماء امت نے اس عبارت میں سورۃ من المفصل کے پیش نظر ما سے مراد سورۃ لی ہے، کہ مکمل سورتوں میں سے پہلی سورۃ وحی کے ذریعہ سے مفصل کی ایک سورۃ اتاری گئی۔ اس لحاظ سے مطلب صاف اور واضح ہو جاتا ہے کہ مکمل سورتوں میں سے پہلی سورۃ مفصل کی ایک سورۃ تھی جبکہ سب

سے پہلی وحی اس کے علاوہ ہے جو کہ سورۃ العلق کی ابتدائی آیات ہیں۔

پھر قاعدہ یہ ہے کہ بحث سے متعلق تمام روایات کو ملحوظ رکھ کر پھر الفاظ کا معنی بیان کیا جاتا ہے، مگر غامدی صاحب پر تعجب ہے کہ انہوں نے بحث بھی حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے کی ہے جو کہ خود غار حراء میں پہلی وحی میں سورۃ العلق کی ابتدائی آیات کے نزول والی حدیث کی روایت کرنے والی ہیں۔ اس کو چھوڑ کر اسی بحث سے متعلق روایت کے الفاظ کا ترجمہ کرنے کو اصول سے ناواقفیت نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟

(۱۰)......غامدی صاحب نے حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا ہے:

"حدث الناس کل جمعة مرة "لوگوں کو ہر جمعہ کے دن وعظ و نصیحت کیا کرو۔[میزان:۵۶۵]

غامدی صاحب کا کل جمعة مرہ کا ترجمہ "ہر جمعہ کے دن" کرنا بالکل غلط ہے، اس لیے کہ اس سے خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے دن وعظ و نصیحت کرنا ظاہر ہوتا ہے، جبکہ مراد ہفتہ میں ایک مرتبہ ہے، جیسا کہ اگلے جملے میں خود غامدی صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ہفتہ میں دو مرتبہ۔ جب فإن أبيت فمرتين کا ترجمہ ہے پھر اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دو مرتبہ تو کل جمعہ مرۃ کا ترجمہ بھی ہفتہ میں ایک مرتبہ ہی ہوگا۔ اس کا ترجمہ ہر جمعہ کے دن کرنا بالکل غلط ہے۔

قارئین کرام!

ہم نے غامدی کی صرف ایک معرکۃ الآراء کتاب سے چند مثالیں پیش کی ہیں جن سے ان کی عربی زبان میں دسترس کو اجاگر کیا ہے تا کہ عوام الناس جان لیں کہ عربی عبارات کا صحیح ترجمہ بھی نہ کر سکنے والے کے بارہ میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر براہ راست کرنے کی اہلیت رکھتا ہے؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو ناقلین کے زمرہ میں شمار کرنا بھی بددیانتی ہے۔ پھر غامدی صاحب اپنی اسی مزعومہ استعداد و صلاحیت کے بل بوتے پر جن ملحدانہ اور گمراہانہ نظریات کا پرچار کر رہے ہیں ان کے اور ان جیسے دیگر باطل نظریات کا پرچار کرنے والوں کے شر سے اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین یا الہ العالمین

مولانا مفتی ابولبابہ شاہ منصور

غامدی صاحب کی قرآن فہمی

غامدی صاحب اور ان کا مکتب فکر آج کل اپنے اجتہاد جدید کی روشنی میں وطن عزیز کو چکا چوند کرتی روشنیوں اور دما دم کرتی روشن خیالیوں کا مرکز بنانا چاہتے ہیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اُمت کے تمام پہلے اور پچھلے اہلِ علم کی تحقیقات کی نفی کرتے ہوئے قرآن کریم سے براہِ راست استنباط اور نام نہاد اجتہاد کی طرح ڈالی ہے۔ اب یہ تو دنیا کو معلوم ہو چکا ہے کہ علوم عربیت سے ان کی واقفیت اور جدید مغربی علوم سے ان کی شناسائی کس قدر ہے؟ آیئے! آج ذرا قرآن فہمی کے حوالے سے ان کے کام کا جائزہ لیتے ہیں جو ان کی تمام کاوشوں کی بنیاد اور سہارا ہے۔ قرآن فہمی کے جھوٹے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے ان کا پہلا اور آخری سہارا عربیت دانی کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی لغت اور ادب عربی کو اتنا اچھا سمجھتے ہیں کہ اس کے سہارے قرآن کے معنی و مفاہیم کو خود سے متعین کر سکتے ہیں۔ چاہے اس سے اجماع کا انکار ہو، اسلام کے مسلمہ احکام کی تردید کرنا پڑے یا پھر سرے سے خود قرآن ہی سے ہاتھ دھولیا جائے۔ آنجناب کو ''عربی مُعلّٰی'' (بامحاورہ عربی) جاننے کا بڑا زعم ہے اور ان کا یہ فرمان مستند سمجھا جاتا ہے کہ خالص عربیت کو سامنے رکھ کر قرآن کا معنی متعین کرنے میں ان کا مدِ مقابل کوئی نہیں ہے۔ یہ دعویٰ اتنا ہی بے اصل ہے جتنی آنجناب کی عربی سے واقفیت کا زعم۔ ہم اگر اپنے قارئین کو یہ حقیقت سمجھنے سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں کہ ان کی عربیت سے واقفیت اتنی ہی ہے جتنی ملعون رشدی کو انگریزی سے تو یہ سمجھنے میں مشکل نہ رہے گی کہ ملعون کو ''سر'' کا خطاب اور غامدی صاحب کو ''اسکالر'' کا اعزاز کس مقصد سے ملا ہے؟ ملعون رشدی اور غامدی صاحب میں قدرِ مشترک صرف یہی نہیں کہ جہالت عظمیٰ کے علی الرغم وہ مغرب کی طرف سے پشت پناہی اور کفالت و حمایت کے حق دار سمجھے جاتے ہیں بلکہ توہینِ رسالت کے پہلو کے حامل کچھ جملے جناب غامدی صاحب کی طرف بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔

آیئے! تعصب اور جانبداری کو ایک طرف رکھتے ہوئے ان ''مجتہدینِ عصر'' کے اس دعوے کا کھلے دل اور کھلی نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اگر اس کی حقیقت آشکارا ہو جائے تو ان کے بقیہ اُٹھائے ہوئے مباحث کی حقیقت سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ ہم پہلی مثال ذرا تفصیلی، دوسری مختصر اور بقیہ ۶ مثالیں بہت ہی مختصر دیں گے۔ کیونکہ یہ کوئی مقالہ تو ہے نہیں، بات سمجھنے سمجھانے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ جتنی صاف

ستھری، براہِ راست اور پیچیدگی سے پاک ہو اتنی ہی مفید رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اسے میری قوم کے لوگوں کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔

سورۂ اعلیٰ میں ہے: ''وَالَّذِیْ أَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَاءً أَحْوٰی.''

اپنی تفسیر ''البیان'' (اس کو بعض صاحب ذوق ''الٹی تفسیر'' اس لیے کہتے ہیں کہ یہ آخری سپارے سے الٹی طرف لکھی جا رہی ہے۔ پہلی جلد میں سورۂ ملک سے سورۂ ناس تک کی تفسیر ہے، بقیہ جلدیں نامکمل ہیں) میں غامدی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''اور جس نے سبزہ نکالا پھر اسے گھنا سرسبز و شاداب بنا دیا۔''

[البیان:۱۶۵]

اس کے علاوہ غامدی صاحب کے فکری و نظریاتی ''امام'' امین احسن اصلاحی بھی اس مقام کا ترجمہ یوں کرتے ہیں: ''اور جس نے نباتات اُگائیں، پھر ان کو گھنی سرسبز و شاداب بنایا۔'' [تدبر قرآن:۹/۳۱۱]

یہ دونوں ترجمے بالکل غلط ہیں اور یہ بات ہم اتنی قطعیت کے ساتھ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اس ترجمے اور مفہوم پر درج ذیل اعتراضات ہوتے ہیں: (۱) یہ ترجمہ و مفہوم عربیت کے خلاف ہے۔ عربی زبان کی کسی لغت میں ''غثاء'' کا لفظ ''گھنے سبزے'' کے معنوں میں نہیں آتا۔ (۲) یہ ترجمہ خود قرآن مجید کے نظائر کے خلاف ہے۔ (۳) یہ ترجمہ احادیث کے شواہد کے بھی خلاف ہے۔ (۴) یہ ترجمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال کے بھی خلاف ہے۔ (۵) یہ ترجمہ اجماعِ اُمت کے بھی خلاف ہے کیونکہ کسی مفسر نے آج تک ''غثاء'' کے معنی ''گھنے سبزے'' کے نہیں کیے۔ (۶) یہ ترجمہ اُردو کے تمام مترجمین کے ترجموں کے خلاف ہے۔ آج تک کسی ایک مفسر نے ان آیات کا یہ ترجمہ نہیں کیا۔

اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: ''اور جس نے سبز چارہ نکالا اور پھر اسے سیاہ کوڑا بنا دیا۔'' اللہ تعالیٰ اس دنیا میں ہر چیز کی چمکتی دمکتی ابتدا و عروج اور پھر جلد ہی بھولا بسرا فنا و زوال سمجھانا چاہتے ہیں۔ آیت کا جو معنی ہم نے بیان کیا ہے اس کی تائید حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ خود اصلاحی صاحب کے دوسری جگہ ترجمے سے بھی اور اُردو کے تمام مترجمین کے ترجموں سے بھی۔

☆ حدیث شریف سے اسی معنی کی تائید یوں ہوتی ہے کہ قیامت کے بارے میں ایک حدیث میں ''غثاء'' کا لفظ یوں آیا ہے: ''کما تنبت الحبة فی غثاء السیل'' [سنن دارمی:۱/۶۱، مسند احمد: ۱۲۰۱۳] ''جیسے سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اُگتا ہے۔''

☆ خود تدبر قرآن میں غامدی صاحب کے ''امام'' امین احسن اصلاحی نے جہاں قرآن میں دوسرے مقام پر ''غثاء'' کا لفظ آیا ہے اس کا ترجمہ خس و خاشاک ہی کیا ہے: ''فاخذتهم الصیحة بالحق فجعلنهم غثاء'' [المؤمنون:۴۱] ''تو ان کو ایک سخت ڈانٹ نے شدت کے ساتھ آ دبوچا۔ تو

ہم نے ان کو خس وخاشاک کر دیا۔'' [تدبر قرآن: ۵/۳۱۲]

اس طرح خود ان کے اپنے ترجمہ میں صریح تضاد ہے اور ایک ترجمہ یقیناً غلط ہے۔ قرآنی لفظ غثاء کے معنی ''امام صاحب'' ایک جگہ خس وخاشاک اور دوسری جگہ ''گھنی سرسبز یا گھنا سبزہ'' کے لیتے ہیں ع

جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی!

☆اردو کے قدیم وجدید تمام مترجمین ومفسرین نے بالاتفاق اس آیت کا ترجمہ خس وخاشاک اور سیاہ کوڑا کیا ہے۔ کیا یہ سب حضرات عربیت سے نابلد تھے اور ان کو عربی نہیں آتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مذکورہ آیت کے ایک ہی ترجمے اور مفہوم پر صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ سمیت پوری اُمت مسلمہ کے مفسرین متفق ہیں تو یہی ترجمہ لغت کی رو سے درست ہے۔ قرآن وحدیث کے نظائر وشواہد کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہے۔ اس سے ہٹ کر اس آیت کا کوئی اور ترجمہ اخذ کرنا گمراہی اور جہالت کے سوا کچھ نہیں!!

الغرض سورۂ اعلیٰ کی زیر بحث آیات کا وہی مفہوم صحیح اور معتبر ہے جس کی تائید لغت سے ہوتی ہے اور جس کی موافقت قرآنی نصوص اور نظائر سے بھی موجود ہے اور جو اُمت مسلمہ کے تمام جلیل القدر مفسرین کرام کی متفقہ تفسیر کے بالکل مطابق ہے۔ غامدی صاحب اور ان کے شیخ اجل کے ذوقِ اختلاف اور شوقِ اجتہاد نے یہاں ان سے وہ سنگین غلطی کروائی ہے، جس سے ان کی اہلیت کی قلعی بالکل اس طرح اُتر گئی ہے جیسے نقلی زیور کی پالش ایک دھوپ کھاتے ہی پول کھول دیتی ہے۔

دوسری مثال:

''وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ.'' (الذاریات: 47)

غامدی کے شیخ اور امام، اصلاحی صاحب اس آیت کا پہلے یہ ترجمہ کرتے ہیں: ''اور آسمان کو ہم نے بنایا قدرت کے ساتھ اور ہم بڑی ہی وسعت رکھنے والے ہیں۔'' پھر اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ایید کے معروف معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ قوت وقدرت کی تعبیر کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس قدرت وعظمت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص اپنے سر پر پھیلے ہوئے آسمان اور اس کے عجائب کے اندر کر سکتا ہے۔'' [تدبر قرآن: ۷/۶۲۶]

اس مقام پر مولانا اصلاحی صاحب کی سنگین غلطی یہ ہے کہ انہوں نے لفظ ''اید'' کو ''ید'' کی جمع سمجھ لیا جو کہ قطعاً غلط ہے۔ ''أید'' کے معنی طاقت اور قوت کے ہیں جیسا کہ دوسری آیت میں آیا ہے: ''واذكر عبدنا داؤد ذاالأيد'' اور ہمارے بندے داؤد کا تذکرہ بیان کرو جو قوت والا تھا۔ جمہور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔ اب سوچنے کی یہ بات ہے کہ جو لوگ قرآنی الفاظ کے مادوں (Roots) ہی سے بے خبر ہوں اور اس کے دو مختلف الفاظ میں امتیاز نہ کر سکتے ہوں، ان کی عربیت پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا

ہے؟ اور جب استاد کی عربیت کا یہ حال ہے تو شاگردوں کی تفسیر اور من مانے اجتہادات کا کیا حال ہوگا؟؟

تحریفِ قرآن کی چند مختصر مثالیں:

غامدی صاحب کے ہاں تحریفِ قرآن، تلعب بالقرآن اور مذموم تفسیر بالرائے کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ تفصیلی مثالوں کے بعد ذیل میں ہم ان کی کتاب ''البیان'' سے چند مختصر مثالیں بلاتبصرہ پیش کرتے ہیں۔ اہلِ علم غور فرمائیں اور عوام اپنے ایمان کی حفاظت کی فکر کریں کہ یہ لوگ انہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں جن کے دعوائے اجتہاد کی واحد دلیل و معیار اتنا ہی ہے جتنا عقل کو گالی دینے والی بات کا ہوتا ہے۔

(۱) سورۃ الاخلاص میں ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: ''وہ اللہ سب سے الگ ہے۔'' (البیان، صفحہ 261) ''احد'' کا ترجمہ ''الگ'' کس قاعدے سے کیا گیا ہے۔ یہ تو ''ابدأ، احد'' کی تختی پڑھنے والے بچے بھی جانتے ہیں کہ ''احد'' کے معنی ایک ہیں۔

(۲) سورۃ الفیل میں ''تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ'' کا ترجمہ یہ کیا ہے: ''تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر انہیں مار رہا تھا۔'' (البیان: ۲۴۰) اناللہ وانا الیہ راجعون۔ علمائے کرام غور فرمائیں ''ترمیهم'' کو یہ شخص واحد حاضر کا صیغہ سمجھ رہا ہے۔ یہ غلطی تو درجہ صرف کا ناسمجھ بچہ بھی نہ کرے گا۔

(۳) سورۃ البروج میں ''قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ٥ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ.'' کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''مارے گئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے۔'' [البیان: ۱۵۷]

اور پھر اس کی تفسیر یوں فرمائی ہے: ''یہ قریش کے ان فراعنہ کو جہنم کی وعید ہے جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے ظلم و ستم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو دوزخ کی اس گھاٹی میں پھینک دیے جائیں گے جو ایندھن سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی آگ نہ کبھی دھیمی ہوگی اور نہ بجھے گی۔'' [البیان: ۱۵۷] ہمارا دعویٰ ہے کہ غامدی صاحب سے پہلے دنیا کے کسی مفسر نے اس آیت کا مصداق قریش کو نہیں مانا۔ یہ تو اقوامِ سابقہ میں سے ''خندق والوں'' کے نام سے مشہور قصے کا ذکر ہے جو جمہور مفسرین کے مطابق یمن میں پیش آیا تھا۔

قارئین محترم! یہ ہے جاوید احمد غامدی صاحب کی قرآن دانی اور قرآن فہمی کی حقیقت جو آج کل کبھی پس پردہ اور کبھی پردۂ اسکرین پر آ کر تحریفِ قرآن کی رسم زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ فتنۂ انکارِ حدیث کی آبیاری کر رہے ہیں۔ صیہونی مستشرقین کی اختراع کردہ روشن خیال اعتدال پسندی (Enlightened Moderation) کی پُرجوش نمایندگی فرما رہے اور دینِ اسلام کا نیا ایڈیشن تیار کر رہے ہیں تاکہ یہودی

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ وہ کچھ کرسکیں جو انہوں نے عیسائیت اور عیسائیوں کے ساتھ کیا۔ جہاں تک اظہارِ حقیقت کی بات ہے تو علمائے کرام نے اپنا فرض ادا کردیا اب جہاں تک اقرارِ حقیقت کی بات ہے یہ آپ کا اور آپ کے ایمان اور ضمیر کا معاملہ ہے۔ میں اپنے اور آپ کے ایمان کو اللہ ربّ العزت کی پناہ میں دینے کی دعا کرتا ہوں جس کی نظر کرم ہو تو فتنہ خیز زہریلی ہوائیں کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

بات کیا ہے؟

قارئین کرام! آپ سوچتے ہوں گے غامدی صاحب کی سرپرستی کرنے والی قوتیں اور خود یہ اور ان کے شاگرد اپنی اس جہالت کے باوصف اتنے بڑے بڑے تحریفی دعوؤں کے ذریعے چاہتے کیا ہیں؟ بات یہ ہے کہ یہ دورِ حاضر کا تجدد پسند گروہ (Miderbusts) ہے جو مغرب سے مرعوب و متاثر ہوکر دین اسلام کا جدید ایڈیشن تیار کرنے کے لیے قرآن و حدیث کے الفاظ کے معانی اور دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ہمارے ہاں اس فتنے کی ابتدا سرسید احمد خان نے کی۔ پھر اُن کی پیروی میں دو فکری سلسلوں نے اس فتنے کو پروان چڑھایا۔ ان میں سے ایک سلسلہ عبداللہ چکڑالوی اور اسلم جیراج پوری سے ہوتا ہوا غلام احمد پرویز تک پہنچتا ہے۔ دوسرا سلسلہ حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی سے گزرتا ہوا جناب جاوید احمد غامدی تک آتا ہے۔ گویا یہ دونوں فکری سلسلے ''دبستانِ سرسید'' کی شاخیں اور برگ و بار ہیں اور ''نیچریت'' والحاد کے نمایندہ ہیں۔ اگرچہ پرویز صاحب اور غامدی صاحب کا طریقِ واردات الگ الگ ہے تاہم نتیجے کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں۔ دونوں تجدد، انکارِ حدیث، الحاد اور گمراہی کے علم بردار ہیں۔ دونوں اجماعِ اُمت کے مخالف اور معجزات کے منکر ہیں۔ دونوں لغتِ عرب کا سہارا لے کر دین اسلام کا تیا پانچا کرنے کے درپے ہیں۔ دونوں فاسد تاویلوں کے ذریعے اسلامی شریعت میں تحریف وتبدل اور ترمیم و تنسیخ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دونوں اکابرینِ امت کے مسلمہ و متفقہ تعبیر کے خلاف ذاتی فہم اور رائے کو دین کی بنیاد بنا کر ٹھوکر کھاتے اور گمراہ کرتے ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ ان کی اکثر تحریرات اسلام دشمن یہودی اور عیسائی عالموں کا سرقہ اور چربہ ہیں۔ یہ جو کچھ تحقیق بگھارتے ہیں ان کی یہ باتیں طبع زاد نہیں، رٹو طوطے کی سمع خراش چیخیں ہیں جو وہ چوری کی حرص میں لگاتا رہتا ہے۔ ان کی تحریریں بھان متی کا کنبہ ہیں جو کہیں سے اینٹ اور کہیں سے روڑا اُٹھا کر تیار کی گئی ہیں۔ بطور مثال کے ایک نمونہ دیکھ لیجیے اور اس پر ان حضرات کی دیگر ''نادر علمی تحقیقات'' کو قیاس کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ہر طرح کے فتنے سے محفوظ رکھے۔ ☆☆☆☆

مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم

قرآن پاک کی قراآت......اور......غامدی صاحب

حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے رسالہ ''تحفہ غامدی'' سے انتخاب

پیش لفظ

بسم اللہ حامدا و مصلیا جاوید غامدی صاحب کا نام پہلی دفعہ آج سے تقریباً تیس سال پہلے سنا تھا۔ ہمارے ایک مرحوم استاد نے غامدی صاحب کے میراث سے متعلق ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں ایک مضمون لکھا جو رسالہ منہاج میں شائع ہوا۔ پھر کچھ اور حضرات کے کہنے پر غامدی صاحب کے اور چند مضامین کو دیکھا اور ان کی کچھ اور غلطیوں کی نشاندہی کی جو جامعہ مدنیہ کے رسالہ انوار مدینہ میں شائع ہوئیں۔ اب کچھ عرصہ سے کراچی کے ہمارے کرم فرما اور بزرگ اور رسالہ بینات کے مدیر مولانا سعید احمد جلالپوری مدظلہ کا اصرار ہوا کہ تم لاہور میں رہتے ہو اور جاوید غامدی صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہو لہٰذا اس پر کچھ کام کرو۔ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور غامدی صاحب کی تین کتابیں۔ مقامات، برہان اور میزان خرید کران کا نئے سرے سے مطالعہ کیا اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحقیق حق کے ساتھ ان کی چند غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اگر ہم مختصر ترین الفاظ میں غامدی صاحب کے بارے میں تبصرہ کریں تو وہ یہ ہے کہ جو شخص بہت سی باتوں میں یہ سمجھتا ہے کہ چودہ صدیوں سے پوری امت گمراہی وضلالت میں مبتلا رہی اور جو دلیل کے نام کا استحصال کرتا ہے تو شریعت کا ہی نہیں بلکہ عقل ودانش کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ وہ شخص عقل وسمجھ سے بالکل عاری ہے۔

ہماری پوری کوشش رہی ہے کہ کوئی بات حق کے دائرے سے متجاوز نہ ہو۔ کہیں کہیں ہمارے الفاظ میں ترشی ملے گی لیکن جب غامدی صاحب تہذیب وشرافت کو بالائے طاق رکھ کر ہمارے بڑوں یعنی ائمہ مجتہدین اور فقہاء ومحدثین کو بہت کچھ کہہ جائیں تو یہ بھی تو غیرت کے منافی ہے کہ آدمی پر اس کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ اس لئے ہمارے جو الفاظ ترش نظر آئیں ان پر ہمیں معذور سمجھیں اور ان کا ذمہ دار بھی غامدی صاحب کو ہی سمجھیں۔

غامدی صاحب کے بقول یہ دور ان کی امامت کا ہے اور ہم مدارس کے لوگ تو بازی ہارے ہوئے

ہیں لہٰذا ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہماری بات کو خاطر میں بھی نہ لائیں گے لیکن ہم ان کو ان کا سبق یاد دلاتے ہیں کہ علم کے میدان میں اصل اہمیت دلیل کی ہے لہٰذا وہ ہمارے دلائل کو دیکھیں اور اگر ہم سے اختلاف کریں تو مسلمہ اصول وضوابط کی روشنی میں کریں۔ان کے اختراعی اصول وضوابط کو ہم پر کاہ کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ان کے ذریعہ سے بعض لاعلم لوگوں کو وہ اپنا ہمنوا بنالیں تو یہ حقانیت کی کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ تو ان کا وبال بھی اپنے سر لینا ہے۔

تو کیا جاوید غامدی صاحب ہمارے اس ''تحفہ'' کو قبول کر کے اپنی اصلاح کرنے پر آمادہ ہیں؟

آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

عبدالواحد......دارالافتاء۔جامعہ مدنیہ۔لاہور......صفر ۱۴۲۳ھ

غامدی صاحب کا ایک سبق:

جناب جاوید غامدی صاحب نے اپنی کتاب مقامات میں ایک قصہ نقل کیا ہے۔اس میں ان سے ایک سنتری نما عالم نے کہا:

''تم جو کتاب لے کر جا رہے ہو اسے پڑھ لو۔یہ ایک بڑے آدمی کی کتاب ہے۔میں تمہیں ایک اور کتاب دوں گا جس میں اس کتاب پر علمی تنقید کی گئی ہے۔تم کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اسے بھی پڑھ لو۔علم کی دنیا میں اشخاص کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔یہاں ساری اہمیت صرف دلیل کو حاصل ہے''۔[ص:۱۲]

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں دلیل کی اہمیت سے واقف ہوا۔میری یہی واقفیت آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی متاع ہے''۔

اور یہ ان کی اتنی بڑی متاع ہے کہ اس کے بل بوتے پر یہ کسی کو بھی بلکہ پوری امت کو بھی غلط ٹھہرا سکتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''ہمیں اس امر واقعی سے انکار نہیں کہ ہمارے یہ اکابر (یعنی ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء و محدثین......ناقل) علم دین میں مسلمہ حیثیت کے حامل تھے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی نے اسے اس دلیل کی بنیاد پر منوانے کی کوشش نہیں کی کہ یہ چونکہ اس کی اور اس طرح بعض بڑے بڑے لوگوں کی رائے ہے اس لئے اسے لازماً تسلیم کرلیا جائے۔اس کے برعکس ان میں سے ہر ایک نے اپنی کتابوں میں جہاں اپنا یہ موقف پیش کیا ہے وہاں اس کے عقلی ونقلی دلائل بھی بیان کئے ہیں۔اب یہ ظاہر ہے کہ بات اگر دلیل سے کی جائے گی تو اس کے رد وقبول کا فیصلہ بھی دلیل ہی کی بنیاد پر ہوگا۔دلیل قوی ہے تو ہر اس شخص کو جو

دیانت داری کے ساتھ حق کا طالب ہے، اسے قبول کر لینا چاہئے اور دلیل کمزور ہے تو اسے پیش کرنے والے سلف وخلف کے اکابر ہی کیوں نہ ہوں، طالب حق کو پوری قوت کے ساتھ اسے رد کر دینا چاہئے۔ آپ کسی بات کو دلیل سے منوانا چاہتے ہیں تو دوسروں کا یہ حق بھی تسلیم کیجئے کہ وہ اسے دلیل ہی کی بنیاد پر ماننے سے انکار کر دیں۔ علم واستدلال نہ کسی گروہ کی میراث ہے، نہ کسی دور کا خاصہ۔ اگلوں کو اگر ایک اصول بنانے کا حق تھا تو ہمیں دلائل کے ساتھ اس کے ابطال کا بھی حق ہے" [برہان:۴۵]

دلیل کی اہمیت سے تو انکار نہیں لیکن یہ بھی تو دیکھا جائے گا کہ مسلمہ حیثیت کے حامل اکابر کی تغلیط میں آپ جو دلائل پیش کر رہے ہیں کیا وہ "دلائل" کہلانے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ غامدی صاحب کے اصول ودلائل کا جو نقشہ آگے آ رہا ہے اس کی بنا پر ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ؎

چیونٹی کو لگے پر تو کہنے لگی اڑ کر
ہم بھی مثل سلیماں ہیں ہوا میں کئی دن سے

غامدی صاحب اپنی نامزد "دبستان شبلی" کے ایک رکن جناب امین احسن اصلاحی صاحب کے خوشہ چینوں میں سے ہیں۔ خود لکھتے ہیں:

"میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لئے اس وقت ان کا دروازہ "در نکشودہ" ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اس بند دروازے پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ دروازہ کھلا اور اس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اس دن سے آج تک علم و عمل کی جو دولت بھی ملی ہے خدا کی عنایت سے اور اسی دروازے سے ملی ہے"۔ [مقامات]

اور انجام کار یہاں تک لکھتے ہیں:

"فکر فراہی واصلاحی میرے نزدیک...... ان اصولوں کا نام ہے جو فراہی واصلاحی نے قرآن وسنت میں تفقہ اور ان سے اخذ واستنباط کے لئے اختیار کئے ہیں۔ ان اصولوں کو میں بالکل صحیح سمجھتا ہوں اور اپنی تحقیق میں ہمیشہ انہیں پیش نظر رکھتا ہوں"۔ [اشراق جون:۹۳ص:۴۴]

غامدی صاحب اسی دبستان شبلی کے بارے میں بہت پر امید ہو کر لکھتے ہیں:

"آنے والے دور کی امامت 'دبستان شبلی' ہی کے لئے مقدر ہے۔ تاریخ کے مرحع پر اب پس پردہ اسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے ؎

عالم تو ہے ابھی پردہ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

[مقامات:۲۱]

غامدی صاحب کے برعکس ہمارا جس گروہ سے تعلق ہے اس کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول و مبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے بالاتر ہو کر اور براہ راست قرآن و سنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اس کے علوم اس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھہریں۔ اس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیوبندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثانی کے نام بہت نمایاں ہیں''۔[مقامات:۱۸]

اور اس گروہ کے بارے میں غامدی صاحب کا فیصلہ ہے:

''اس گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ اس کی مثال اب اس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی''۔

خیر آئندہ پردہ عدم سے وجود میں کیا آتا ہے یہ ہم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ البتہ غامدی صاحب کے ذکر کردہ سبق نے ہمیں ان کے بارے میں کلام کرنے کی ایک مشترکہ بنیاد فراہم کر دی اور اسی کے حوالہ سے ہم اپنی کچھ گزارشات پیش کرتے ہیں۔

غامدی صاحب اکابر اور امت کے اتفاق کو بھی رد کر دیتے ہیں جب کہ امین احسن اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

''کسی اجتہاد پر اجماع ہو جانے کے بعد اس کی حیثیت صرف ایک رائے کی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ شریعت کے نصوص کی طرح ایک حجت شرعی بن جاتا ہے، جس کی مخالفت کسی کے لئے جائز نہیں''۔

[اسلامی قانون کی تدوین:۶۰]

''اسی طرح ائمہ اربعہ اگر کسی بات پر متفق ہوں تو اس کی حیثیت بھی محض ایک رائے کی نہیں رہ جاتی، اگرچہ ہم اس کو اصطلاحی اجماع کا درجہ نہ دے سکیں اور اس سے اختلاف کرنے کو ناجائز نہ ٹھہرائیں۔

[اسلامی قانون کی تدوین:۶۲]

اصلاحی صاحب کی عبارتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر تمام ائمہ مجتہدین کسی ایک بات پر متفق ہوں تو اس سے اختلاف جائز نہیں، خواہ ان کی دلیل بظاہر غلط ہی معلوم ہوتی ہو۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ائمہ اربعہ بھی اگر کسی ایک بات پر متفق ہوں تو وہ محض ایک رائے نہیں بلکہ اس سے کچھ اوپر درجہ رکھتی ہے یہ حضرات وہ اکابر ہیں جو خود جاوید غامدی صاحب کے بقول ''علم دین میں مسلمہ حیثیت کے حامل تھے''۔ تو علم دین کے میدان میں بارہ تیرہ صدیوں سے مسلمہ حیثیت کے حامل حضرات جن کی متفقہ بات محض ایک رائے سے کہیں اونچا درجہ رکھتی ہے۔ اگر امین احسن اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب اپنی محض ایک

رائے کی بنا پر اس کی مخالفت کریں بلکہ اجماعی مسئلہ کی بھی مخالفت کریں تو ہم اس کے علاوہ اور کیا کہیں کہ ۔

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

قراآت قرآن اور غامدی صاحب:

پوری امت کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ قرآن پاک کی قراءت کی مختلف نوعیتیں جن میں سے کئی ایک کا تعلق الفاظ کی ادائیگی سے ہے خود رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں اور اسلامی دنیا میں تواتر سے لاکھوں افراد ان کے پڑھنے پڑھانے میں لگے ہیں اور ان کے مطابق تصنیف شدہ ہزاروں کتابیں موجود ہیں، یہاں تک کہ ان کے مطابق طبع شدہ قرآن پاک بھی کھلے عام فروخت ہوتے ہیں اور لوگ ان میں پڑھتے ہیں۔ چونکہ ان اختلافات کی کوئی خاص ترتیب متعین نہیں تھی اس لئے خیر القرون تابعین اور تبع تابعین میں سے بعض بڑے قراء نے اپنی ترتیب دے کر قرآن پڑھا اور پڑھایا جس کو قراءت اور روایت کہتے ہیں۔ مثلاً نبی ﷺ سے مُوْسٰی پڑھنا بھی منقول ہے اور مُوْسَے بھی منقول ہے۔ مِنْهُمْ پڑھنا بھی منقول ہے اور مِنْهُمُ بھی منقول ہے ارجلکم کا لفظ لام کے زبر کے ساتھ پڑھنا بھی منقول ہے اور لام کے زیر کے ساتھ بھی منقول ہے اور ان میں کوئی خاص ترتیب واجب نہیں۔ تو ان تین نوعیتوں کو پڑھنے کی مندرجہ ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں۔

۱...... مُوْسٰی . مِنْهُمْ . اَرْجُلَكُمْ
۲...... مُوْسٰی . مِنْهُمْ . اَرْجُلِكُمْ
۳...... موسٰی . مِنْهُمُ . اَرْجُلَكُمْ
۴...... موسٰی . مِنْهُمُ . اَرْجُلِكُمْ
۵...... موسَے . مِنْهُمْ . اَرْجُلَكُمْ
۶...... موسَے . مِنْهُمْ . اَرْجُلِكُمْ
۷...... موسَے . مِنْهُمُ . اَرْجُلَكُمْ
۸...... موسَے . مِنْهُمُ . اَرْجُلِكُمْ

تنبیہ: ۱...... موسٰی کے بجائے موسَے پڑھنا ایسے ہی ہے جیسا کہ مَجْرٰاھا کی جگہ ہم قرآن پاک میں مَجْرٖے ھَا پڑھتے ہیں۔

۲...... ان اختلافات سے آیت کے مجموعی معنی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور نہ کوئی تضاد پیدا ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا طریقے سے کچھ قراءتیں رائج ہیں جن میں سے دو روایتوں یعنی قراءت حفص اور قراءت ورش کے مطابق چھپے ہوئے قرآن پاک مل جاتے ہیں۔ قراءت ورش کا رواج شمالی افریقہ کے ممالک میں زیادہ ہے جب کہ باقی دنیا میں قراءت حفص کا زیادہ رواج ہے۔ تیرہ صدیوں تک امت ان قراءتوں کو مانتی رہی ہے اور پڑھتی پڑھاتی چلی آئی ہے اور ان کی بنیاد پر قرآن میں کسی قسم کا کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوا لیکن تیرہ صدیوں کے بعد علامہ شوکانی، نواب صدیق حسن خان، امین احسن اصلاحی اور جاوید غامدی صاحب ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں جن کو پوری امت گمراہی میں مبتلا نظر آئی اور انہوں نے ان قراءتوں کے انکار میں اپنی ہدایت سمجھی۔

غامدی صاحب کے استاذ اصلاحی صاحب تو یہ فرماتے ہیں:

''غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ قراءتوں کا اختلاف دراصل قراءتوں کا اختلاف نہیں بلکہ اکثر و بیشتر تاویل کا اختلاف ہے۔ کسی صاحب تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قراءت کا اختلاف سمجھ لیا گیا، حالانکہ وہ قراءتوں کا اختلاف نہیں بلکہ تاویل کا اختلاف ہے، مثلاً سورہ تحریم میں بعض لوگوں نے فَقَدْ زَاغَتْ بھی پڑھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی یہ پڑھا ہے اس نے یہ قراءت نہیں بتائی بلکہ اپنے نزدیک اس نے فَقَدْ صَغَتْ کی تاویل کی ہے لیکن لوگوں نے اس کو بھی قراءت سمجھ لیا۔'' [تدبر فروری ۸۳ء]

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے''

[میزان: ۲۵]

''لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قراءت ہے جو ہمارے مصاحف میں ثبت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی جو قراءتیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں یا مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں وہ سب اسی فتنہ عجم کے باقیات ہیں جس کے اثرات سے ہمارے علوم کا کوئی شعبہ، افسوس ہے کہ محفوظ نہیں رہ سکا''۔ [میزان: ۳۲]

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ حضرات جو بات بھی کرتے ہیں کسی معقول دلیل و بنیاد کے بغیر کرتے ہیں بلکہ درحقیقت ان کو

دلیل کی اتنی فکر بھی نہیں۔

اب دیکھیے اصلاحی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ تاویل کا اختلاف تھا۔ایک معلم نے قرآن کے ایک لفظ کا مطلب بتایا لیکن شاگرد سب کے سب ایسے باکمال نکلے کہ انہوں نے مطلب بتانے والے لفظ کو خدا کی جانب سے نازل شدہ سمجھ کر علیحدہ قراءت بنالیا۔اور صرف کسی ایک استاد کے شاگردوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اور بہت سے حضرات کے شاگردوں نے ایسا کیا اور یہ غلطی پوری امت میں پھیل گئی اور اس نے پورے فن کا روپ دھار لیا۔اس کے بارے میں ہزار ہا کتابیں لکھی گئیں اور اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے، تیرہ صدیوں تک پوری امت ایک عظیم گمراہی میں مبتلا رہی۔اگر اب بھی اصلاحی صاحب اس غلطی کی نشاندہی نہ کرتے اور غامدی صاحب ان سے بھی آگے بڑھ کر یہ نہ بتاتے کہ یہ تو فتنہ عجم کا اثر ہے تو امت کو اپنی غلطی کا شاید قیامت تک احساس نہ ہوتا۔لیکن یہ امت پھر بھی ان صاحبان کا احسان لینے کو تیار نہیں اور اصلاحی صاحب کی اس بات کو دلیل بناتے ہوئے کہ جس بات پر اجماع ہو جائے اس کی مخالفت جائز نہیں خود ان صاحبان کو کھلی غلطی پر سمجھتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن پاک کے ساتھ دو طرح کے معاملے ہوئے۔

پہلا معاملہ:

قرآن قریش کی لغت پر نازل ہوا لیکن شروع میں جب کہ لوگ بھی زیادہ تر ان پڑھ تھے نبی ﷺ کے مطالبہ پر رخصت ملی کہ آپ ﷺ لوگوں کو دشواری محسوس ہونے پر مرادف لفظ سکھا سکتے ہیں اور یہ مرادفات سات تک ہو سکتے ہیں۔

"عن أبي بن كعب قال: لقي رسول الله ﷺ جبريل عند أحجار المروة، قال: فقال رسول الله ﷺ لجبريل: إني بعثت إلى أمة أميين منهم الشيخ الفاني والعجوز الكبيرة والغلام، قال: فمرهم فليقرء و القرآن على سبعة أحرف۔ [الترمذي]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مروہ (پہاڑ) کے پتھروں کے پاس رسول اللہ ﷺ کی ملاقات جبرئیل علیہ السلام سے ہوئی تو آپ نے ان سے کہا کہ میں ان پڑھ لوگوں میں مبعوث ہوا ہوں جن میں لب گور بوڑھے بھی ہیں، بوڑھیاں بھی ہیں اور بچے (بچیاں) بھی ہیں۔"

اور مسلم کی روایت کے مطابق آپ نے مزید فرمایا کہ میں اللہ سے عافیت و مغفرت مانگتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں یہ عرض پیش کرتا ہوں کہ میری امت کے یہ تمام افراد ایک ہی لفظ کو (فی الحال) ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔(اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرادف لفظ کے ساتھ پڑھنے کی اجازت

ملی، پہلے ایک کی۔ پھر مزید درخواست پر دو کی۔ پھر مزید درخواست پر تین کی یہاں تک کہ سات مرادفات کی اجازت ملی تو جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا آپ اپنی امت کو حکم دیں کہ وہ سات مرادفات تک میں پڑھ سکتے ہیں۔)

اور مسند احمد میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرادفات کی مثال بھی دی۔

نحو قولک تعال و أقبل و هلم و أسرع و عجل یعنی تعال کہہ لو یا اس کی جگہ **أقبل** یا **هلم** کہہ لو اور اسی طرح **أسرع** کا لفظ ہو تو اس کی جگہ **عجل** کہہ لو۔

نبی ﷺ کی حیات کے آخری سال میں تمام مرادفات منسوخ کر دیئے گئے، (چنانچہ) امام طحاوی رحمہ اللہ مشکل الآثار میں فرماتے ہیں:

''چنانچہ جن لوگوں کے لئے قرآن کریم کے اصلی الفاظ سے تلاوت مشکل تھی ان کے لئے خود آنحضرت ﷺ نے ایسے مرادفات متعین فرما دیئے تھے جن سے وہ تلاوت کر سکیں۔ یہ مرادفات قریش اور غیر قریش دونوں کی لغات سے منتخب کئے گئے تھے اور یہ بالکل ایسے تھے جیسے تعال کی جگہ هلم یا اقبل یا أدن پڑھ دیا جائے۔ معنی سب کے ایک ہی رہتے ہیں۔ لیکن یہ اجازت صرف اسلام کے ابتدائی دور میں تھی جب کہ تمام اہل عرب قرآنی زبان کے پوری طرح عادی نہیں ہوئے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس قرآنی زبان کا دائرہ اثر بڑھتا گیا۔ اہل عرب اس کے عادی ہو گئے اور ان کے لئے اسی اصل لغت پر قرآن کی تلاوت آسان ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے وفات سے پہلے رمضان میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا آخری دور کیا جس کو عرضہ اخیرہ کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر مرادفات سے پڑھنے کی یہ اجازت ختم کر دی گئی اور صرف وہی طریقہ باقی رہ گیا جس پر قرآن نازل ہوا تھا۔ [بحوالہ علوم القرآن۔ مولانا تقی عثمانی:۱۰۴]

محقق ابن جزری رحمہ اللہ بھی اپنی مندرجہ ذیل عبارت سے یہی بات بتانا چاہتے ہیں:

''ولا شك أن القران نسخ منه و غير فيه في العرضة الأخيرة فقد صح النص بذلك عن غير واحد من الصحابة. [النشر في القراءات العشر:۳۲/۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ عرضہ اخیرہ کے موقع پر قرآن پاک میں نسخ اور تبدیلی ہوئی۔ اس کی تصریح متعدد صحابہ سے صحیح سند کے ساتھ منقول ہے۔''

امام زرکشی نے اپنی البرہان میں ابو عبد الرحمٰن سلمی کے الفاظ میں القراءۃ العامۃ کہا اور اس نام سے موسوم ہونے کی وجہ بتائی کہ وهي القراءة التي قرأها رسول الله ا على جبرئيل مرتين في العام الذي قبض فيه یہ وہی قراءت ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات کے سال جبرئیل امین کو قرآن

سنایا۔[میزان:۲۸]

یہاں القراءۃ العامۃ سے مراد نبی ﷺ کے آخری سال والی قراءت ہے، لیکن جاوید غامدی صاحب نے اس کے مطلب کو بھی بدل دیا اور القراءۃ العامۃ کو قراءۃ العامۃ سے تبدیل کرتے ہوئے اس کو قراءت عامہ یعنی عام مسلمانوں کی قراءت کے طور پر پیش کیا، لکھتے ہیں:

''نبی ﷺ دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ کی قراءت یہی تھی۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین اور تمام صحابہ مہاجرین وانصار اسی کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ بعد میں یہی قراءت ''قراءت عامہ'' کہلائی۔ صحابہ کرام کا قولی تواتر صرف اسی قراءت کو حاصل ہے'' [میزان:۲۷]

''اس زمانے سے لے کر آج تک خلفائے راشدین کی حکومتوں کے علاقوں میں عام مسلمانوں کی قراءت یہی ہے بلکہ ان علاقوں سے باہر بھی مسلمان مغرب کے چند ملکوں کو چھوڑ کر سارے عالم میں ہر جگہ اسی کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔ ہمارے علماء اسے قراءت حفص کہتے ہیں دراں حالیکہ یہ قراءت عامہ ہے''۔[میزان:۲۸]

غامدی صاحب نے قراءت عامہ کا جو غلط اور من گھڑت تصور دیا ہے وہ اس لیے دیا ہے کہ وہ مغرب کے جن چند ملکوں میں قراءت ورش پر قرآن پڑھا جاتا ہے اس کو فتنہ عجم کی کاریگری بنا دیں اور مدارس میں مختلف قراءتوں کے پڑھنے پڑھانے کا جو وسیع سلسلہ تسلسل اور تواتر سے رائج ہے اس کو فتنہ عجم کے باقیات میں سے شمار کر لیں۔ علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ کے قول کو غامدی صاحب نے اپنے دعوے پر بطور مہر سمجھ لیا۔

القراءۃ التی عرضت علی النبی ا فی العام الذی قبض فیہ ھی القراءۃ التی یقرءھا الناس الیوم. [الاتقان]

نبی ﷺ کو آپ کی وفات کے سال جس قراءت پر قرآن سنایا گیا یہ وہی قراءت ہے جس کے مطابق لوگ اس وقت قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں۔[میزان:۲۸]

اور علامہ سیوطی کی اتقان اور علامہ زرکشی کی برہان سے ایک ایک حوالہ نقل کر کے غامدی صاحب نے سمجھا ہے کہ انہوں نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا ہے اور یہ نہیں دیکھا کہ خود یہی حضرات اپنی انہی کتابوں میں قراآت مروجہ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

مترادفات منسوخ ہونے کے بعد جو عرضہ اخیرہ ہے قراآت مروجہ اسی عرضہ اخیرہ کے مطابق بھی ہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے تیار کرائے گئے مصاحف کے مطابق بھی ہیں۔ لہٰذا غامدی صاحب کا قراآت مروجہ کی مخالفت میں عرضہ اخیرہ کو دلیل بنانا ان کو چنداں مفید نہیں ہے۔ عرضہ اخیرہ میں جو منسوخ

ہوا وہ نازل شدہ قرآن کے علاوہ صرف مرادفات تھے۔

دوسرا معاملہ:

رہے وہ اختلافات جو موجودہ قراآت میں پائے جاتے ہیں اور جو مصاحف عثمانیہ کے خلاف نہیں۔ یہ اختلافات نازل شدہ تھے۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب میزان کے ص ۲۹ر۳۰ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے قراءت کے اختلاف کے قصہ میں جو حدیث نقل کی ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''إن هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف (یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔)

یہاں حروف سے مراد اختلاف کی سات نوعیتیں ہیں یعنی لہجوں کا اختلاف، اسم میں واحد وجمع یا مذکر ومونث کا اختلاف، فعل میں ماضی، مضارع یا امر کا اختلاف، کسی لفظ کے مقدم یا مؤخر ہونے کا اختلاف، اعراب کا اختلاف، لفظ کا اختلاف اور لفظ کی کمی بیشی کا اختلاف۔

حدیث میں مرادفات کو بھی سات حروف کہا گیا اور اختلاف کی مذکورہ بالا سات نوعیتوں کو بھی سات حروف کہا گیا ہے۔ دونوں کو سات حرف کہنے سے علماء نے مختلف پہلوؤں سے ان کے بارے میں غور کیا اور دونوں کو ایک سمجھتے ہوئے کوئی بات ایسی نہ کہہ سکے جس سے پوری تسلی ہو۔ اور بعض حضرات کچھ فیصلہ ہی نہ کر پائے اور انہوں نے سات حرفوں والی بات کو متشابہات میں سے قرار دیا جس کو غامدی صاحب نے میزان کے ص: ۳۰ر پر نقل کیا۔ اور اپنی شان بے نیازی سے فرما دیا کہ ''یہ ایک بالکل ہی بے معنی روایت ہے''۔ [میزان: ۳۰]

ہم نے جب سات حروف والی احادیث پر غور کیا تو ہمیں یہ نظر آیا کہ ان میں سے بعض کا تعلق تو مرادفات سے ہے اور بعض کا تعلق سات نوعیتوں سے ہے۔ مرادفات تو منسوخ ہو گئے لیکن سات نوعیتوں والی بات اب تک موجود ہے اور وہی قراآت مروجہ کے نبی ﷺ سے منقول ہونے کی دلیل ہے۔

اور کچھ نہیں تو غامدی صاحب ان قراآت میں پائے جانے والے تواتر عملی یعنی تواتر سے پڑھنے پڑھانے ہی کا اعتبار کر لیتے۔ صحابہ نے نبی ﷺ سے جیسے سیکھا اس کو آگے سکھایا اور ہر ایک سے سیکھنے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوئی اور پھر ان سیکھنے والوں نے آگے کثیر تعداد میں اپنے شاگردوں کو سکھایا۔ لیکن غامدی صاحب کی نظر میں نہ کوئی اشخاص ٹھہریں اور نہ ہی کسی اور کے دلائل کوئی وزن رکھیں۔ ہدایت دینے والی ذات تو فقط اللہ تعالیٰ کی ہے وہی اگر کسی کو ہدایت نہ دیں تو کوئی اس کو ہدایت پر نہیں لا سکتا۔

☆......☆......☆......☆

مفتی سید عبد القدوس ترمذی مدظلہم
جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

اختلاف قرآآت اور جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمن الرحیم. بعد الحمد و الصلاۃ

احقر ناکارہ کو عزیز محترم مولوی حمزہ احسانی سلمہ اللہ تعالیٰ سے معلوم ہوا کہ وہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار و نظریات باطلہ کے رد میں حال ہی میں اپنے ماہنامہ ''صفدر'' کا ایک خاص نمبر نکالنا چاہتے ہیں جس میں ان کے خلاف جمہور نظریات کا رد کیا جائے گا۔ انہوں نے احقر ناکارہ سے بھی فرمائش کی کہ اس سلسلہ میں کوئی مضمون لکھ دیں۔ اس مقصد کے لیے عزیز محترم نے غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' بھی ارسال کی، احقر نے اسے مختلف مقامات سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ موصوف جہاں اور بہت سے باطل نظریات کے حامل ہیں وہاں وہ قرآن کریم کی متواتر قرآآت کے بھی منکر ہیں۔ قرآن کریم کے خدام میں شامل ہونے کی نیت اور دفاع عن الحق کی غرض سے خیال آیا کہ قرآآت عشرہ کی حجیت اور احرف سبعہ کی تشریح کے عنوان پر کچھ معروضات پیش کر دی جائیں، اس سے عزیز موصوف سلمہ کی فرمائش بھی پوری ہو جائے گی اور احقاق حق و ابطال باطل کا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، واللہ الموفق۔

مختلف قرآآت کے متعلق غامدی صاحب کا نظریہ:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے قرآآت سبعہ و عشرہ کے بارے میں غامدی صاحب کا نظریہ تحریر کر دیا جائے تا کہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ وہ اس بارہ میں کیا نقطہ نظر رکھتے ہیں، چنانچہ ان کی تحریر کے چند اہم اقتباسات ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہیں:

(۱) قرآن کریم صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے، اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے، یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۲) قرآن کی یہی آخری قراءت ہے جسے اصطلاح میں عرضہ اخیرہ کی قراءت کہا جاتا ہے۔

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ کی قراءت یہی تھی، آپ کے

بعد خلفاء راشدین اور تمام صحابہ مہاجرین وانصار اسی کے مطابق قرآن کی تلاوت کرتے تھے، اس معاملہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا، بعد میں یہی قراءت، قراءت عامہ کہلائی۔

(۴) چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلمانوں کا قولی تواتر صرف اسی قراءت کو حاصل ہے، ہمارے علماء اسے قراءت حفص کہتے ہیں، درآنحالیکہ یہ قراءت عامہ ہے۔

(۵) مدرسہ فراہی کے اکابر اہل علم نے جو کام اس زمانہ میں قرآن کریم پر کیا ہے، اس سے یہ بات بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ قرآن کا متن اس کے علاوہ کسی دوسری قراءت کو قبول ہی نہیں کرتا۔

سبعہ احرف کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

(۶) یہ ایک بالکل ہی بے معنی روایت ہے جسے اس بحث میں ہرگز قابل اعتنا نہیں سمجھنا چاہئے۔

(۷) یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن ایک ہی قراءت ہے جو ہمارے مصاحف میں ثبت ہے اس کے علاوہ اس کی جو قراءتیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں، یا مدرسہ میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں، یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں وہ سب انہی فتنوں کی باقیات ہیں، جن کے اثرات سے ہمارے علوم کا کوئی شعبہ افسوس ہے کہ محفوظ نہیں رہ سکا۔ [میزان: ۲۷ تا ۳۲]

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ قراآت سبعہ وعشرہ کے بارہ میں غامدی صاحب کا نظریہ بھی وہی ہے جو روافض اور اہل تشیع کا ہے کہ قرآن کریم کی قراءت صرف اور صرف ایک ہے جیسا کہ ''اصول کافی'' میں ہے۔

غامدی صاحب کی ''تحقیق انیق'' سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا متن دوسری قراآت کو قبول ہی نہیں کرتا اور سبعہ احرف کی روایت جس پر اختلاف قراآت مبنی ہے، وہ حدیث سرے سے بالکل بے معنی ہے، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، نہ ہی یہ حدیث بے معنی ہے اور نہ ہی قرآن کریم کا متن ان قراآت کے قبول کرنے سے آبی ہے، صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم کی یہ قراآت تواتر سے ثابت ہیں اور معنی کے اعتبار حدیث سبعہ احرف بھی متواتر ہے، اسے بے معنی قرار دینا خود بے معنی اور غلط ہے، پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ روایت حفص کو غامدی صاحب قراءت سے تعبیر فرما رہے ہیں اور اسے بہ نسبت دیگر روایات اور قراآت کے زیادہ مقبولیت ہونے کی وجہ سے قرآن کریم قرار دے کر دیگر قراآت کا انکار فرما رہے ہیں۔

روایت حفص کو قراءت کہنا اور دیگر قراآت کا انکار کرنا سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے غامدی صاحب کی لاعلمی کے سوا کس عنوان سے تعبیر کیا جائے، علم قراآت کے ادنیٰ طالب علم کو بھی یہ حقیقت معلوم ہے کہ یہ روایت ہے، قراءت نہیں ہے اور یہ کہ قرآن کریم اس روایت میں منحصر نہیں ہے بلکہ عرضہ اخیرہ میں جو قراءتیں باقی رکھی گئیں تھیں یہ سات بلکہ دس قراءتیں ان میں شامل ہیں۔

مدرسہ فراہی کے اکابر اہل علم کا قراآت سبعہ اور عشرہ کو قرآن کے متن سے خالی قرار دینا انتہائی افسوس ناک ہے۔ یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے رخصت ہوئے تو جو قراءت حفص اب پڑھی باتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی قراءت تھی، خلفاء راشدین اور تمام صحابہ کرام بھی اس کے مطابق قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے، ایک ایسا دعویٰ ہے جس پر دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ قراآت مختلفہ خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں پڑھی گئیں۔ ان کو پرفتن زمانہ کی باقیات قرار دینا سراسر غلط اور تاریخ قراءت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ کوئی قراءت اس وقت تک قراءت کہلا ہی نہیں سکتی جب تک اس کی سند جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تواتر سے ثابت نہ ہو یہ سب قراآت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ذریعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت اور بلاشبہ قرآن ہیں اور ان سب کا نمازوں میں پڑھنا صحیح اور جائز ہے۔

جن حضرات علماء کرام نے حدیث سبعہ احرف کے معنیٰ میں بحث کی ہے ان میں سے کسی نے بھی قراآت قرآنیہ سبعہ وعشرہ کا انکار نہیں فرمایا، یہ غامدی صاحب کا اپنا فلسفہ ہے کہ وہ اختلافی ابحاث کی حقیقت کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی بنا پر قراآت عشرہ کی حجیت کا انکار کر رہے ہیں فیاللعجب۔

اس تمہیدی مضمون کے بعد ہم اب یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے ضابطہ قراءت بیان کر دیا جائے، اس کے بعد سبعہ احرف کی تفصیلی بحث ذکر کی جائے گی اور آخر میں حضرت القاری المقری فضیلۃ الاستاذ حضرت مولانا قاری طاہر صاحب مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عظیم کتاب ''دفاع قراآت'' سے قراآت کے سماعی اور توقیفی ہونے کی عظیم الشان بحث کا خلاصہ نقل کیا جائے گا۔ ان دونوں بحثوں سے غامدی صاحب اور دیگر منکرین قراآت عشرہ کے شبہات کا کافی وافی شافی جواب ہو کر روز روشن کی طرح ثابت ہو جائے گا کہ قراآت مختلفہ یقیناً قرآن ہیں اور اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ اب قارئین کرام اسی ترتیب کے مطابق اصل مضامین ملاحظہ فرمائیں، اللہ تعالیٰ نافع ومفید اور مقبول بنائیں، آمین۔

قراءاتِ عشرہ کا تواتر اور حدیثِ سبعہ اَحرف کی تشریح

الحمدللّٰه رب العلمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد:

ضابطہ قراآت:

ضابطہ قراءات کے متعلق شیخ القراء حضرت قاری محی الاسلام رحمہ اللہ تعالیٰ شرح سبعہ قراءات میں

تحریر فرماتے ہیں:

جو قراءت عربیت کے موافق ہو، اگر چہ یہ موافقت بوجہ ہو، اور مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک کے مطابق ہو، خواہ یہ مطابقت اِحتمالاً ہو، اور سند صحیحہ متصلہ سے ثابت اور ائمہ فن کے یہاں مشہور ہو، وہ قراءۃِ صحیحہ اور ان احرف سبعہ میں سے ہے جن پر قرآن نازل ہوا۔ محقق کہتے ہیں جو قراءات اس طرح ثابت ہو اُس کا اِنکار جائز نہیں بلکہ مسلمانوں پر اس کا قبول کرنا واجب ہے خواہ ائمہ سبعہ کی قراءات میں سے ہو یا عشرہ کی یا مافوق عشرہ کی، اور اگر ان ارکانِ ثلاثہ میں سے کوئی رکن مختل ہو جائے تو وہ ضعیف، شاذ اور فاسد و باطل ہے خواہ سبعہ میں سے ہو یا مافوق سبعہ سے، تمام محققین ائمہ سلف وخلف اس تعریف کو صحیح کہتے ہیں۔ ابوعمرو دانی، ابومحمد مکی اور مہدوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی تصریح کی ہے۔ باقی تمام متقدمین کا بھی یہی مذہب ہے اور ان میں سے کوئی بھی اِسکے خلاف نہیں۔ ابوشامہ المرشد الوجیز میں کہتے ہیں:

ہر اس قراءۃ کو جو ائمہ سبعہ کی جانب منسوب ہو اور صحیح کہلاتی ہو اسے اسی وقت منزل من اللہ اور صحیح کہہ سکتے ہیں جب وہ اس ضابطہ میں آ جائے الخ [ص ۱۰۴]

قرآن میں جو کچھ روایت کیا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جس میں ارکان ثلاثہ مجتمع ہوں اس کی صحت وصدق پر قطعی حکم لگایا جائے گا اور اس کو پڑھا جائے گا، کیونکہ بلحاظ مصحف وہ اِجماع سے لی گئی ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔

(۲) آحاد (ثقہ) سے منقول ہو اور عربیت کی کسی وجہ کے مطابق ہو مگر رسم کے خلاف ہو۔ اس کو قبول کیا جائے گا مگر پڑھا نہیں جائے گا، کیونکہ

اوّلاً: تو اس کو اِجماع سے نہیں آحاد سے لیا گیا ہے اور خبرِ واحد سے قرآن ثابت نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً: وہ اس کے خلاف ہے جس پر اِجماع ہو چکا ہے لہٰذا اس کی صحت کا قطعی حکم نہیں دیا جاسکتا۔ اور جس کی صحت کا حکم نہ کریں اس کو قرآن میں پڑھ نہیں سکتے اور نہ اِس کا منکر کافر ہے مگر بلاشک اِنکار بُرا ہے۔

(۳) لغت وعربیت سے، جس پر قرآن نازل ہے، بہر وجہ خلاف اگر ثقہ سے مروی ہو، وہ نہ قبول کی جائے گی اور نہ پڑھی جائے گی۔ [ص: ۱۰۶]

نیز محقق کہتے ہیں:

بعض متاخرین نے صحتِ قراءۃ کے لیے رسم وعربیت کی موافقت کے ساتھ تواتر کی شرط لگائی ہے اور صحتِ سند کو کافی نہیں سمجھا، وہ کہتے ہیں کہ تواتر کے بغیر قرآن ثابت نہیں ہو سکتا، مگر ان لوگوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ جب کوئی حرف تواتر سے ثابت ہو جائے تو اس کے لیے نہ عربیت کی موافقت کی شرط ہے اور نہ

رسم کی مطابقت کی بلکہ اس کا قبول کرنا بلا شرط واجب ہے، کیونکہ وہ قطعاً قرآن ہے لیکن جب ہم حروف کے لیے تواتر کی شرط لگادیں تو قراءِ سبعہ کی بہت سی اختلافی وجوہ مرتفع ہو جائیں گی پہلے میرا بھی یہی خیال تھا مگر جب مجھے اس کی خرابی معلوم ہوئی تو میں نے ائمہ سلف کی رائے کی جانب رجوع کر لیا۔ الخ

نتیجہ بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں:

(۱) باجماع متواتر۔

(۲) ایک جماعت کے نزدیک متواتر کی پہلی قسم میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا اور دوسری قسم جن حضرات کو تواتراً پہنچی اُن کے طرق کا اس پر اجماع ہونا چاہیئے، ان دونوں اقسام کے حروف کیلئے نہ عربیت کی موافقت کی شرط ہے اور نہ رسم کی مطابقت کی، مگر نا ممکن ہے کہ یہ عربیت کی کسی وجہ اور رسم کے احتمالاً مطابق نہ ہوں اور اگر بالفرض محال خلاف ہوں تب بھی کوئی پرواہ نہیں۔

(۳) صحیح و مشہور، جن کو حضور نبی کریم ﷺ سے ثقات و ضابط و عادل بسندِ متصلہ روایت کریں اور ائمہ فن کے نزدیک مشہور ہو مگر تواتر کی حد کو نہ پہنچی ہو۔ اس کو اسی شرط سے قبول کیا جائے کہ وہ اس ضابطہ کے موافق ہو ورنہ ضعیف و شاذ و باطل ہے۔ کَمَا مَرَّ

جمہور اہلِ اَدا اور اَکثر ائمہ قراءۃ نیز فقہاء وغیرہ کے نزدیک قراءۃِ شاذہ سے نماز درست نہیں بلکہ شاذ کو قرآن اعتقاد کر کے یا بایہام قرآنیت پڑھنا بھی حرام ہے۔ علامہ ابن عبدالبر نے تمہید میں اس پر اِجماع نقل کیا ہے۔ مدوّنہ میں کہتے ہیں:

جو شخص حضرت ابن مسعود کی قراءت پڑھتا ہو اس کے پیچھے نماز درست نہیں اگر کوئی پڑھ لے تو اِعادہ کرے۔ یہی ابن شاسی اور ابن حاجب کہتے ہیں لیکن اَحکام شرعیہ اور اَدبیت کے لحاظ سے اُن کا پڑھنا اور مدوّن کرنا جائز ہے۔ الخ (ص ۱۰۹)

حدیثِ سبعہ اَحرف کی تفصیلی بحث:

حضورِ اکرم ﷺ کا اِرشادِ گرامی: إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ (صحیح البخاری: ۴۹۹۸) حدیثِ متواتر ہے اور محقق ابن الجزری نے اس پر مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے اس حدیث پاک کو حضرت عمر، حضرت ہشام بن حکیم بن حزام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت اُبی بن کعب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت اَبوسعید خدری، حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت اَبوبکرہ، حضرت عمرو بن العاص، حضرت زید بن اَرقم، حضرت اَنس بن مالک، حضرت سمرۃ بن جندب، حضرت عمر بن اَبی سلمہ، حضرت اَبوجہم، حضرت اَبوطلحہ اور

حضرت اُم اَیوب اَنصاریہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک روز منبر پر کھڑے ہوکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا میں اِن حضرات کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے یہ اَلفاظ سنے ہوں إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ كُلُّهَا شَافٍ كَافٍ وہ کھڑے ہوجائیں۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اتنی بڑی جماعت مسجد میں کھڑی ہوگئی کہ جس کی گنتی نہیں ہوسکتی اور سب نے اس پر گواہی دی پھر حضرت عثمان نے فرمایا میں بھی اِس پر گواہ ہوں۔

اَحادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی رحمت ﷺ کی درخواست پر اُمت کی سہولت کے واسطے قرآن کریم اَحرفِ سبعہ پر نازل فرمایا تھا کہ ہر بوڑھا، بچہ، مرد، عورت اپنے اپنے لغت پر تلاوت کرسکے۔ علامہ دانی کی تحقیق کے مطابق قراءت کا ایک معنی لغات بھی ہے۔ اکثر محققین اور اَہل اَدا کے نزدیک اَحرف کا مقصد لغات مختلفہ ہیں، اور یہ صواب معلوم ہوتا ہے، مگر اس پر اِجماع ہے کہ ہر حرف سات طرح نہیں پڑھا جاتا اور اس پر بھی اِجماع ہے کہ اس کا مدلول قراءِ سبعہ مشہورہ کی قراءات نہیں ہیں، جیسا کہ عوام میں مشہور ہے۔ نیز اس پر بھی اِجماع ہے کہ ان کی قراءاتِ اَحرف سبعہ میں داخل ہیں، چونکہ عرب کی لغات فصیحہ سات تھیں، اس لیے اُنہیں اَحرفِ سبعہ سے تعبیر کیا گیا جب کہ بعض کے نزدیک خاص عدد مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ اَحرف سبعہ سے مراد قراءِ سبعہ کی قراءات ہیں۔ یہ وہم ہے، کیونکہ قراءِ سبعہ کا حضورِ اکرم ﷺ کے عہدِ اَقدس میں کوئی وجود نہیں تھا۔ حضرت ابن عامر (۲۱ھ) میں، امام ابن کثیر (۴۵ھ) میں، امام عاصم بھی اس کے قریب، حضرت امام نافع (۷۰ھ) میں اور حضرت امام کسائی تقریباً (۱۱۹ھ) میں پیدا ہوئے، ابن عامر نے کبار تابعین اور بعض صحابہ کرام سے اور حضرت اِمام عاصم نے کبار تابعین سے حضرت ابن کثیر نے تابعین اور صغار صحابہ کرام سے اِمام نافع نے تابعین سے ابوعمرو حمزہ نے تابعین کے آخری طبقہ سے اور حضرت امام کسائی نے تبع تابعین سے قراءات پڑھیں اور ان حضرات کا زمانہ باعتبار اکثر دوسری صدی کا دور ہے۔ حضرت صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں ان کی قراءات موجود نہ تھیں۔

قراءاتِ سبعہ جن پر شاطبی نے اِقتصار کیا اور قراءاتِ ثلاثہ یعنی اَبوجعفر و یعقوب و خلف کی قراءتیں متواترہ، معلومہ اور ضرورتِ دین سے ہیں اور اسی طرح ہر وہ حرف جس کو عشرہ میں سے کوئی روایت کرے نبی کریم ﷺ پر منزل من اللہ اور ضروریاتِ دین سے ہے۔ اور یہ قراءات صرف انہی اَشخاص کے لیے متواتر نہیں ہیں جنہوں نے ان کو روایۃً پڑھا ہو بلکہ ہر مسلمان کے لیے، جو کلمہ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ کہے خواہ ایسا عامی ہو جس نے قرآن کا ایک حرف بھی نہ پڑھا ہو، متواتر ہیں۔ (ص۱۲۴)

عنایاتِ رحمانی میں امام القراء حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی ارشاد فرماتے ہیں:

علامہ دانی، اکثر محققین اور جمہور اہل اَدا کی رائے کے مطابق سات حروف سے سات لغات مراد ہیں، ان کے خیال کے مطابق ان سات قراءِ سبعہ کی قراءتیں مراد نہیں ہیں، کیونکہ جب نبی نے سات حروف کی حدیث اِرشاد فرمائی تھی اس وقت قراءِ سبعہ تو پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، ان کی قراءتوں کو سب سے پہلے چوتھی صدی میں ابوبکر ابن مجاہد نے جمع کیا، قراءِ سبعہ کی قراءتیں بھی ان سات حروف میں داخل ہیں۔
(۲۹/۱)

حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی اپنے رسالہ تشنیف السمع بمعنی الأحرف السبع میں رقمطراز ہیں:

الف: جبریل علیہ السلام نے اولاً ایک ہی طریقہ پر حضور کو قرآن پڑھایا۔

ب: پھر حضور ﷺ کو حکم ہوا کہ اُمت کو بھی اسی طریقہ پر قرآن پڑھائیں۔ حضور اکرم ﷺ نے درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی کی جائے میری اُمت اس سے عاجز ہے۔ تو سات طریقوں سے پڑھنے کی اِجازت دی گئی۔ یہ درخواست حضور ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر ہجرت کے بعد کی ہے، جبکہ اہلِ عرب اِسلام میں کثرت سے داخل ہونے لگے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہجرت سے پہلے صرف ایک ہی طریقہ پر قراءت تھی۔

ج: رسول اللہ ﷺ نے اس درخواست کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں اُمی قوم کی طرف مبعوث ہوا ہوں جن میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے لکھا پڑھا نہیں، اور ان میں بوڑھی عورتیں، بوڑھے مرد اور لڑکے اور لڑکیاں بھی ہیں (جو اپنی زبان کو جلدی نہیں بدل سکتے)۔

د: اَب یہ گفتگو باقی رہی کہ سبعہ اَحرف (یعنی ان سات طریقوں) سے کیا مراد ہے، جن کی ہجرت کے بعد اِجازت دی گئی، اور وہ طریقہ کون سا تھا جس پر اَولاً قرآن نازل ہوا، سو محققین اُمت کا قول یہ ہے کہ قرآن اَوّلاً قریش کے لغت پر نازل ہوا، جو رسول اللہ ﷺ کی قوم کی زبان تھی چنانچہ قرآن میں بھی اِرشاد ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ (ابراهيم ٤)

ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی ہی زبان میں تا کہ اُن کو سمجھا سکے

حضور ﷺ کی قوم قریش تھی، پس ضروری ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہو اور حدیث میں بھی حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا قول موجود ہے کہ قرآن لغتِ قریش میں نازل ہوا ہے۔

پس اَوّلاً قرآن کا نزول لغتِ قریش میں ہوا اور ہجرت سے پہلے چونکہ اِسلام لانے والے زیادہ تر

اہل مکہ تھے جو سب قریش تھے یا قریش کی زبان میں تکلم کرنے والے تھے، اس لیے عرب کے دوسرے لغات میں پڑھنے کی ضرورت نہ تھی، پھر ہجرت کے بعد چونکہ دوسرے قبائل عرب بھی اسلام میں داخل ہونے لگے تھے اور گو تمام قبائل عرب کی مشترک زبان عربی تھی، مگر تلفظ و اعراب میں بہت کچھ اختلاف تھا مثلاً قریش حَتّٰی حِیْنٍ کو حاء سے پڑھتے تھے اور ھذیل عَتّٰی حِیْنٍ عین کے ساتھ پڑھتے تھے، قریش اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ (الکوثر:۱) پڑھتے، اور بعض قبائل اَعْطَیْنَا کو اَنْطَیْنَا پڑھتے یعنی بجائے عین کے نون ادا کرتے تھے، لغتِ قریش میں حروف مضارع کو فتح یا ضمہ ہوتا ہے بعض قبائل ان کو کسرہ سے پڑھتے تھے مثلاً: تَعْلَمُوْنَ کو تِعْلَمُوْنَ کہتے، لغت قریش میں ہمزہ بھی ایک حرف ہے اور بعض قبائل ہمزہ بالکل ادا نہ کرتے تھے، (اور اس اختلاف کی نظیر ہر زبان میں موجود ہے، مثلاً دہلی اور لکھنؤ کی اردو زبان میں اختلاف ہے، ایک کھارا پانی کہتا ہے ایک کھاری پانی بولتا ہے، کوئی میٹھا دہی کہتا ہے کوئی میٹھی دہی، اسی طرح کسی جگہ چھاچھ بولتے ہیں کہیں مٹھا کسی جگہ چھالیہ بولتے ہیں کہیں ڈلی یا سپاری کہتے ہیں، دہلی والے عموماً ہاء کو یاء بولتے ہیں، مثلاً میں جار یا تھا میں یہ کہہ ریا تھا اور لکھنؤ والے اس طرح نہیں بولتے) اور قاعدہ ہے کہ مادری زبان کا دفعۃً بدل جانا دشوار ہے، گو پوری کوشش اور اہتمام سے کام لیا جائے تو ممکن ہے، مگر قدرے دشوار ضرور ہے خصوصاً ایسی قوم کے لیے جس میں لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ ہو، بلکہ محض سننے سنانے پر مدار ہو۔ اور ان کے یہاں قرآن کا مدار محض اسی پر تھا، لکھنے پڑھنے والے بہت کم تھے، بس جتنا قرآن جس کے پاس تھا وہ حفظ ہی میں تھا، اور اس حالت میں دوسرے قبائل اپنے تلفظ ہی کے موافق قرآن کو پڑھتے تھے دفعۃً لغت قریش اور تلفظ قریش کو ادا نہ کر سکتے تھے (جیسا کہ لکھنؤ والا دفعتاً دلی کے محاورات میں گفتگو نہیں کر سکتا، اگر وہ اردو کا کوئی مضمون لکھ کر دیکھ کر نہ پڑھے بلکہ یادداشت سے پڑھے تو ضرور اپنے لکھنوی تلفظ اور محاورات سے اس کو ادا کرے گا، ہاں کوشش کے ساتھ یاد کرنے سے بہت جگہ دہلی کے محاورات کو ملحوظ رکھنا ممکن ہے، لیکن کہیں کہیں اس کی مادری زبان کا تلفظ بھی ضرور ادا ہوگا۔

اس لیے حضور ﷺ نے درخواست کی کہ چونکہ اہلِ عرب زیادہ تر اُمّی ہیں اور اُن کے تلفظ و اعراب مختلف ہیں تو دفعۃً سب کو لغتِ قریش کا مکلف کرنے میں اندیشہ ہے کہ ان سے ان میں کوتاہی ہوگی اور اس کوتاہی کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہوں گے، اس لیے اس میں توسیع فرمائی جائے، چنانچہ درخواست منظور ہوئی اور سات طریقوں سے قرآن پڑھنے کی اجازت دی گئی اور ان سات طریقوں سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں، جن کے نام بھی روایات میں مذکور ہوئے ہیں، یعنی اس کی اجازت دی گئی کہ جو شخص لغتِ قریش میں قرآن کا تلفظ نہ کر سکے وہ ان قبائل میں سے کسی قبیلہ کے تلفظ میں قرآن کے الفاظ کو ادا کر لیا

کرے اور غالباً سات لغات میں انحصار اس لیے کیا گیا کہ ان کے سوا دوسرے قبائل کا تلفظ فصیح نہ تھا، یا یہ کہ ان قبائل کے تلفظ کے تابع دوسرے قبائل تھے، اس لیے زیادہ توسیع کی ضرورت نہ تھی، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لغتِ قریش کے علاوہ جو چھ لغات ان میں تھے ان میں حقیقۃً قرآن کا نزول نہیں ہوا، بلکہ حقیقی نزول لغتِ قریش میں تھا، مگر چونکہ سہولت کے لیے دوسرے چھ قبائل کے تلفظ میں بھی قرآن پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی اس لیے حکماً وہ بھی منزل من اللہ ہو گئے۔

فکل ما ورد فیه أن القرآن أنزل علی سبعة أحرف، أو قال لرجلین فرائتهما مختلفة هکذا أنزلت محمول علی التوسع فی الکلام بطریق التجوز، أی أن کلها منزلة حکماً۔

نیز روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان سات لغات میں پڑھنا ہر شخص کی رائے پر نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ سے سن کر پڑھنے کی اجازت تھی، حضور ﷺ نے خود دوسرے لغات میں پڑھا کر بتلایا تھا کہ لغتِ قریش کے سوا ان لغات میں اس طرح بھی پڑھنا جائز ہے۔

ھ: بخاری کی حدیث میں فاقرء وا ما تیسر منه سے مفہوم ہوتا ہے کہ لغت قریش کے علاوہ دوسری لغات میں پڑھنا واجب نہ تھا صرف جائز تھا اور اس کا منشا ہی ہے کہ دوسرے لغات کی اجازت سہولت اور تیسیر کے لیے دی گئی تھی۔

و: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معلوم تھا کہ قرآن کا نزول اوّلاً لغتِ قریش میں ہوا ہے اور ہجرت سے پہلے زمانہ قیام مکہ میں تیرہ سال تک ایک ہی قراءت اور ایک ہی لغت میں حضور ﷺ کو قرآن پڑھایا گیا اور حضور ﷺ نے بھی ایک ہی لغت میں مسلمانوں کو قرآن سکھلایا، پھر مدینہ میں ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے اس میں توسع کی درخواست کی جو منظور ہوئی، ان سب اُمور کو صحابہ جانتے تھے کہ قرآن کی اَصلی لغت، قریش کی لغت ہے اور دوسری لغات کی اجازت عارضی بغرض تیسیر ہے اور جو حکم عارضی کسی خاص غرض کے لیے ہوتا ہے وہ حصولِ غرض تک محدود ہوتا ہے، پس جب غرض حاصل ہو گئی اور اہلِ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج ہو گیا، ادھر دوسرے قبائل کا اِختلاط بھی قریش سے زیادہ ہو گیا اور اب سب کو لغتِ قریش میں قرآن پڑھنا آسان ہو گیا ہے، ادھر یہ دیکھا گیا کہ جن لغات میں قرآن پڑھنے کی اجازت، سہولت و تیسیر کے لیے دی گئی تھی اب ان کا باقی رکھنا موجب اختلاف اور سبب فتنہ بن رہا ہے کہ دوسرے قبائل کے لوگ اپنے ہی طریقہ کو صحیح اور دوسرے طریقوں کو غلط کہتے ہیں اور ایک دوسرے کی تکفیر کرتے ہیں تو صحابہ نے اِجماع کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیا کہ اب دوسری قراءتوں کو باقی رکھنا مناسب نہیں، بلکہ قرآن کو صرف لغت قریش پر جمع کرنا چاہیے، چنانچہ حضرت عثمان کے زمانے میں تمام اَجلّہ صحابہ کے اتفاق سے صرف ایک قراء

ت اور ایک ہی لغت پر قرآن جمع کیا گیا کہ یہی قرآن کی اصلی زبان تھی اور بقیہ زبان میں قرآن کا پڑھنا بند کر دیا گیا کہ وہ عارضی زبان تھی جو خاص غرض کے لیے جائز کی گئی تھی اور اب وہ غرض حاصل ہوگئی۔

ز: اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ اَحرفِ سبعہ سے مراد وہ قراءاتِ سبعہ نہیں ہیں جو اس وقت قراء میں رائج اور شاطبیہ وغیرہ میں مدوّن ہیں، کیونکہ یہ قراءاتِ سبعہ سب کے سب لغت قریش کے مواقق ہیں، دوسرے لغاتِ عرب ان میں موجود نہیں ہیں۔ رہا یہ سوال کہ لغت قریش میں قراءاتِ سبعہ کیوں ہیں، ایک ہی قراءت کیوں نہ ہوئی، سو اللہ تعالیٰ کے اسرار کو پوری طرح کون سمجھ سکتا ہے۔ لیکن محققین کی برکت سے جو حکمت معلوم ہوتی ہے اس کو عرض کرتا ہوں۔ اس میں ایک حکمت تو یہ ہے کہ تھوڑے لفظوں میں بہت سے اَحکام بیان ہو جاتے ہیں، اگر اختلاف قراءات نہ ہوتا تو اس حکم کے لیے جو قراءات کے اِختلاف سے ظاہر کیا گیا ہے، مستقل آیت نازل ہوتی، اور اس طرح قرآن بھی انجیل و توراۃ کی طرح ضخیم کتاب کی صورت اِختیار کر جاتا، اور قرآن کے حفظ میں دشواری ہو جاتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اَحکام کو ایک ہی آیت میں چند قراءتیں نازل کر کے بیان فرما دیا۔ دوسری حکمت یہ ہے کہ قرآن کو معجزہ قرار دیا گیا تھا اور بلغاء و فصحاءِ عرب سے اس کی نظیر کا مطالبہ کیا گیا تھا اور عام طور پر انسان کے کلام بلیغ فصیح کا حال یہ ہے کہ اگر اس میں کچھ تغیر کیا گیا تو اس کی فصاحت و بلاغت میں فرق آ جاتا ہے، اور یہ تو ضرور ہے کہ تغیر کے بعد دونوں میں ایک درجہ کی بلاغت نہیں رہتی بلکہ ایک میں فصاحت زیادہ دوسرے میں کم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہمت پست کرنے کے لیے قرآن میں بعض الفاظ کو کئی کئی طرح استعمال فرمایا اور دکھلا دیا کہ کسی کی فصاحت و بلاغت میں ذرہ برابر فرق نہیں اور جس طرح بھی پڑھا جائے ہر حالت میں یہ کلام معجزہ ہے اور یقیناً یہ اَمر متکلم کی اعلیٰ درجہ کی قدرت کلامی کی دلیل ہے کہ وہ فصاحت و بلاغت پیدا کرنے میں ایک ہی طرز کا محتاج نہیں بلکہ وہ کئی طرح تکلم کر کے بھی کلام کو ایک ہی درجہ پر فصیح و بلیغ رکھ سکتا ہے۔ رہا یہ کہ وہ خاص خاص اَلفاظ کہاں کہاں قرآن میں وارِد ہیں تو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت اب نہیں رہی، کیونکہ حضرت عثمان ہی کے زمانہ میں تمام اَہل عرب قرآن کو لغتِ قریش میں پڑھنے پر قادر ہوگئے تھے اور یہ حالت دیکھ کر صحابہ نے قرآن کو لغت قریش ہی پر جمع کیا اور بقیہ لغات کو جمع نہیں کیا بلکہ ان میں قرآن کے پڑھنے سے لوگوں کو روک دیا گیا، کیونکہ اس کی اِجازت عارضی تھی اور اب ضرورت باقی نہیں رہی جیسا کہ اُوپر تفصیل کے ساتھ اس کے دلائل مذکور ہو چکے، قراءت منزل من اللہ صرف ایک تھی، یعنی لغتِ قریش اور حضور ﷺ کی درخواست سے جو دوسرے لغاتِ عرب میں قراءت کی اجازت مل گئی ان کو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے حضور ﷺ نے بیان فرما دیا اس لیے وہ بھی حکماً منزل تھیں، حقیقۃً ان کا نزول نہیں ہوا، اور نہ ان کے نزول کی ضرورت تھی، کیونکہ

اہلِ عرب خود جانتے تھے کہ اس لفظ کو قریش کس طرح بولتے ہیں اور دوسرے قبائل کس طرح۔ نیز حضور ﷺ بھی تمام لغات عرب سے واقف تھے کہ وہ کہاں کہاں قریش کے تلفظ سے اختلاف رکھتے ہیں اور اس پر یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے برابر مخلوق کا کلام نہیں ہوسکتا، پھر کلام الٰہی میں حضور ﷺ نے کیوں دخل دیا، کیونکہ حضور ﷺ کا یہ دخل خدا تعالیٰ کی اجازت سے تھا، اور اس دخل کا حاصل یہ نہیں تھا، کہ کلام الٰہی میں زیادت یا کمی کی گئی، بلکہ کلامِ الٰہی کے الفاظ میں دوسرے قبائل کو اِجازت دی گئی کہ وہ ان کو اپنے تلفظ کے موافق اَدا کرلیں، (جیسا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اجازت ہے کہ جب تک ان کا تلفظ صحیح ہو اس وقت تک الحمد کو الھمد اور انعمت کو انامت اور غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کو غیر المغذوب علیھم ولا الدوالین پڑھ لیں اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے غلط تلفظ میں بھی کلام الٰہی کو ہی پڑھتے ہیں، کوئی اور کتاب نہیں پڑھتے، یہی حال اس تلفظ کا تھا جس کی اِجازت حضور ﷺ کی دعا سے ہوئی کہ سات لغات میں قرآن کو پڑھ لو، اِتنا فرق ہے کہ اہلِ عرب کے تلفظ میں کہیں لفظ بدلتا تھا، کہیں اِعراب بھی بدلتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ قراءات منزل من اللہ میں کیا تکلیف تھی الخ، تو اس سوال کا جواب ہمارے ذمہ نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس تکلیف کا احساس فرمایا اور اس کو تکلیف سمجھا، ہمیں اگر اس کا احساس نہ ہو تو ہمیں اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت نہیں، لیکن پھر بھی میں نے تبرعاً اس کی اُوپر مثال لکھ دی کہ جیسے دہلی والوں کے لیے لکھنؤ کا تلفظ اختیار کرلینا دفعتاً سہل نہیں، یہی حال قبائلِ عرب کا تھا، رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ:۲۸۶) تو حق تعالیٰ نے اس تکلیف کا لحاظ کیوں نہیں فرمایا، کہ حضور ﷺ کی دعا کی ضرورت ہوئی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک لغت میں سب قبائل کا قرآن پڑھنا گو دشوار تھا مگر قدرت واختیار سے باہر نہ تھا اگر قدرت واختیار سے باہر ہوتا تو بعد میں سب کو لغت قریش کیونکر آسان ہوگیا اور یقیناً جو کام انسان ایک مہینہ کے بعد کرسکتا ہے وہ پہلے دن بھی اس کے اختیار سے باہر نہیں گو پہلے دن میں اس کا بجالانا زیادہ دشوار ہو، پس حق تعالیٰ کا حکم لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ: ۲۸۶) کے خلاف ہرگز نہ تھا البتہ حضور ﷺ نے اس میں زیادہ سہولت لی۔ اور اگر فرض کرلیا جائے کہ لغتِ قریش کا دفعۃً سیکھ لینا دیگر قبائل کی قدرت سے خارج تھا تب بھی اللہ تعالیٰ کا حکم لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ :۲۸۶) کے خلاف نہ تھا، کیونکہ اس صورت میں ایک قراءت کے واجب ہونے کا حاصل یہ ہوتا کہ جب تک یہ قراءت صحیح طور پر حاصل نہ ہو اس وقت تک نمازیں درست نہ ہوں گی، بعد میں ان نمازوں کی قضا واجب ہوگی اور یہ قدرت سے باہر نہ تھا ہاں اُمت پر گرانی ہوتی، حضور ﷺ نے

اس کو رفع کرنا چاہا۔ یا اس کا حاصل یہ ہوتا کہ جو قبائل قرآن کو قریش کے تلفظ میں ادا نہیں کر سکتے وہ جب تک قریش کے تلفظ کو نہ سیکھ لیں اس وقت تک خود قرآن نہ پڑھیں، نہ ایسا شخص امام بنے، بلکہ ان قبائل کو چاہیے کہ وہ کسی قریشی مسلمان کو اپنے یہاں لے جا کر رکھیں، اس سے قرآن سنا کریں اور اسی کو امام بنایا کریں۔ یہ قدرت سے باہر تو نہ تھا مگر گراں ضرور تھا۔ حضور ﷺ نے اس مشکل کے رفع کی درخواست کی، جیسا کہ پچاس نمازوں سے پانچ تک تخفیف کی درخواست کی تھی۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (البقرۃ: ۲۸۶) کے خلاف وہ حکم بھی نہ تھا، کیونکہ پچاس نمازیں بھی طاقت سے باہر نہیں ہاں گرانی ضرور ہوتی اسی طرح اس کو سمجھو۔

(امداد الاحکام: ص ۲۶۳ تا ۲۶۷، ص ۲۶۹ تا ۲۷۱)

اَحرفِ سبعہ سے متعلق ایک دوسرا نظریہ:

حضرت علامہ عثمانی کی بیان کردہ اس تفصیل سے قراءاتِ عشرہ کی حجیت وقطعیت اور قرآنیت واضح ہے اور ساتھ ہی حدیثِ سبعہ اَحرف کی جو تشریح آپ نے فرمائی ہے اس کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس سے مراد مختلف قبائل کی لغات ہیں۔ قرآن کریم کا حقیقی نزول اگرچہ ایک ہی لغت، لغت قریش پر ہوا لیکن اُمت کی تیسیر اور آسانی کے لیے اُنہیں ابتداء میں دیگر لغات میں پڑھنے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی، اس طرح ان کا نزول حکماً تھا۔ بعد میں جب تمام قبائل کے لیے لغتِ قریش میں پڑھنا ممکن ہوا تو باقی لغات میں تلاوت کی اجازت منسوخ کر دی گئی اور صرف لغت قریش میں پڑھنے کا حکم باقی رکھا گیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مشاورت سے لغت قریش میں ہی جمع فرمایا۔ قراءتِ سبعہ وعشرہ یہ سب اسی لغت قریش پر ہی ہیں۔ حضرت علامہ ابن جریر طبری وغیرہ کی طرف بھی یہی نظریہ منسوب ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں صرف ایک حرف پر قرآن کریم کو جمع فرمایا گیا ہے اور باقی حروف باقی نہیں رہے لیکن حضرت امام مالک، علامہ ابن قتیبہ، علامہ ابوالفضل رازی، قاضی اَبوبکر، ابن طیب، امام ابوالحسن اَشعری، قاضی عیاض، علامہ ابن حزم، علامہ اَبوالولید باجی، حضرت امام غزالی، ملا علی قاری (محقق اعظم فی القراءات محمد بن الجزری) جیسے علمائے کرام نے اس نظریے سے شدید اختلاف کیا ہے اور وہ اس پر متفق ہیں کہ ساتوں حروف آج بھی محفوظ اور باقی ہیں۔ عرضہ اَخیرہ کے وقت جتنے حروف باقی رہ گئے تھے ان میں سے کوئی نہ منسوخ ہوا نہ اسے ترک کیا گیا بلکہ محقق ابن الجزری نے اپنے اس قول کو اپنے سے پہلے علماء کا مسلک قرار دیا ہے۔ علمائے متاخرین میں حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت اَنور شاہ کشمیری اور علامہ زاہد الکوثری کا بھی یہی قول ہے نیز مصر کے مشہور مفتی علامہ محمد بخیت مطیعی، علامہ حضرت دمیاطی، شیخ عبد العظیم زرقانی نے بھی اس کو اختیار کیا ہے لہٰذا دلائل سے قطع نظر محض شخصیات سے بھی یہ قول

بڑا وزنی ہے۔(علوم القرآن ص۱۳۶)

سبعہ اَحرف اوراختلاف قراءت کے متعلق بحث کرتے ہوئے حضرت محقق العصر علامہ محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ رقم طراز ہیں:

پورے ذخیرہ اَحادیث میں ہمیں کوئی ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ قرآن کریم کی تلاوت میں دو قسم کے اختلافات تھے، ایک سات حروف کا اختلاف اور دوسرے قراءتوں کا اختلاف۔ اس کے بجائے بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک چیز ہیں، کیونکہ ایک ہی قسم کے اختلاف پر بیک وقت اختلاف قراءت اوراختلاف اَحرف دونوں اَلفاظ کا اختلاف کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت اُبی بن کعب فرماتے ہیں:

كنت بالمسجد، فدخل رجل يصلي فقرأ قراءة أنكرتها عليه، ودخل آخر فقرأ قراءة سوى قراءة صاحبه، فلما قضينا الصلوة، دخلنا جميعا على رسول الله ! ۔ فقلت :إن هذا قرأ قراءة أنكرتها عليه، ودخل آخر، فقرأ قراءة سوىٰ قراءة صاحبه، فأمرهما رسول اللهصلى الله عليه وسلم فقرأ فحسن النبي صلى الله عليه وسلم شأنهما فسقط في نفسي من التكذيب ولا إذ كنت في الجاهلية، فلما رأى رسول الله ! ما قد غشيني، ضرب في صدري ففضت عرقا، وكأنما أنظر إلى الله فرقا، فقال لي :يَا أُبَيُّ !إِنَّ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ أَرْسَلَ إِلَيَّ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ عَلٰى حَرْفٍ، فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلٰى أُمَّتِي فَرَدَّ إِلَيَّ الثَّانِيَةَ، اِقْرَأْهُ عَلٰى حَرْفَيْنِ، فَرَدَدْتُ إِلَيْهِ أَنْ هَوِّنْ عَلٰى أُمَّتِي، فَرَدَّ إِلَيَّ الثَّالِثَةَ، اِقْرَأْهُ عَلٰى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ۔ (صحيح مسلم ۸۲۰)

میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص داخل ہوکر نماز پڑھنے لگا، اس نے ایک ایسی قراءت پڑھی جو مجھے اَجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کی قراءت کے سوا ایک اور قراءت پڑھی، پس جب ہم نے نماز ختم کرلی تو ہم سب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، میں نے عرض کیا اس شخص نے ایک ایسی قراءت پڑھی ہے جو مجھے اجنبی معلوم ہوئی، پھر ایک دوسرا شخص آیا اس نے پہلے شخص کی قراءت کے سوا ایک دوسری قراءت پڑھی، اس پر آپ ﷺ نے دونوں کو پڑھنے کا حکم دیا، ان دونوں نے قراءت کی تو حضور ﷺ نے دونوں کی تحسین فرمائی، اس پر میرے دل میں تکذیب کے ایسے وسوسے آنے لگے کہ جاہلیت میں بھی ایسے خیالات نہیں آئے تھے۔ پس جب رسول اللہ ﷺ نے میری حالت دیکھی تو میرے سینے پر ہاتھ مارا جس سے میں پسینہ میں شرابور ہوگیا اور خوف کی حالت میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اللہ کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے اُبی میرے پروردگار نے میرے پاس پیغام بھیجا تھا، کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمایئے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ پیغام بھیجا کہ میں قرآن دو حرفوں پر پڑھوں، میں نے جواب میں درخواست کی کہ میری اُمت پر آسانی فرمایئے، تو

اللہ تعالیٰ نے تیسری بار پیغام بھیجا کہ میں اسے سات حرفوں پر پڑھوں۔

اِس روایت میں حضرت اُبی بن کعب دونوں اَشخاص کے اختلاف تلاوت کو بار بار اختلافِ قراء ت سے تعبیر فرمارہے ہیں اور اسی کو آنحضرت ﷺ نے سات حروف کے اختلاف سے تعبیر فرمایا ہے۔اس سے صاف واضح ہے کہ قراءت کے اختلاف اور حروف کے اختلاف کو عہدِ رسالت میں ایک ہی چیز سمجھا جاتا تھا اور اس کے خلاف کوئی دلیل ایسی نہیں جو دونوں کی جداگانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہو۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں اور جب قراءات کا محفوظ ہونا تواتر اور اِجماع سے ثابت ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اَحرفِ سبعہ آج بھی محفوظ ہیں۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ حروفِ سبعہ کا جتنا حصہ عرضہ اَخیرہ کے وقت باقی رہ گیا تھا وہ سارے کا سارا عثمانی مصاحف میں محفوظ کرلیا گیا تھا اور وہ آج تک محفوظ چلا آتا ہے، نہ اسے کسی نے منسوخ کیا اور نہ اس کی قراءت ممنوع قرار دی گئی۔(علوم القرآن: ص۱۳۸ تا ۱۴۰)

اس پورے بیان سے معلوم ہوگیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مصاحف عثمانیہ میں حرف و لغت قریش کے علاوہ دیگر لغات واَحرف کو بالکلیہ منسوخ نہ فرمایا تھا بلکہ صرف بالجزئیہ فقط اُنہی لغات کو موقوف فرمایا تھا جو قریش کے ہاں معتبر ومتداول ومستعمل نہ تھے۔باقی بالاغلبیہ ان احرف ولغات ستہ کو یقیناً ثابت و باقی رکھا تھا جو قریش کے نزدیک معتبر ومتداول ومستعمل تھے۔نیز اس تقریر سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ محض سطحی نظر سے جو بعض علمائے کرام یہ فرمادیا کرتے ہیں کہ عہدِ عثمانی میں صرف ایک ہی لغت باقی رہ گیا تھا اور باقی سب لغات ختم ہوگئے تھے،اس لیے آج اختلاف قراءت کی گنجائش نہیں، یہ بات سراسر خلافِ واقعہ ہے، کیونکہ جملہ قراءات عشرہ لغت قریش اور باقی لغات ستہ فصیحہ معتبرہ عند قریش کی روشنی میں عرضہ اَخیرہ والے سبعہ لغات وسبعہ وجوہ اِختلافِ قراءت کے مطابق مدوّن ہوئی ہیں، جو حضور ﷺ نے آخری سال وفات میں حضرت جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ ماہ رمضان المبارک میں فرمایا تھا۔اس مضمون کی مزید تفصیلات وتحقیقات ناچیز راقم کی تازہ ترین تالیف دفاعِ قراءات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب:

شبہ یہ ہے کہ علامہ ابن جریر طبری کے بقول دورِ عثمانی میں سبعہ اَحرف میں سے صرف ایک قریشی حرف ہی کو باقی رکھا گیا تھا اور باقی غیر قریشی چھ اَحرف کو موقوف قرار دے دیا گیا تھا پھر سبعہ اَحرف کی بقائیت کا قول کیونکر درست ہوا؟

الجواب: طبری نے جمع عثمانی میں سبعہ اَحرف میں سے جو صرف ایک ہی حرف قریش کے بقاء کا

قول کیا ہے طبری کے یہاں راجح اور آخری تحقیق کے مطابق اس کا مقصد یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں بدوی صحابہ کرام کی رعایت رکھتے ہوئے سات کلمات ولغات کی حد تک ہم معنی متبادل کلمہ ولغت پڑھنے کی اجازت تھی۔ لیکن پھر اوّلاً حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں یہ اجازت ختم کردی گئی اس کے بعد ثانیاً جمع عثمانی کے وقت ان ستہ مترادفات کی منسوخیت کی مزید اشاعت وتشہیر کی گئی اَب خاص اس ایک ہی قریشی کلمہ مترادفہ کے پڑھنے کی اجازت ہے جس کے مطابق اوّلاً قرآن کریم نازل ہوا تھا مثلاً ھلم کی جگہ تعال پڑھنے کی اجازت قطعاً موقوف قرار دے دی گئی۔ علامہ طبری قطعاً اس کے قائل نہیں کہ سبعہ لغات غیر مترادفات اور سبعہ وجوہ وانواع اختلاف قراءت میں سے بھی صرف ایک ہی قریشی لغت اور صرف ایک ہی اختلافی وجہ قراءت پڑھنے کی اجازت ہے اور باقی چھ لغات اور چھ اختلاف وجوہ قراءات ختم کردی گئی ہیں۔ اس کی قوی ترین دلیل یہ ہے کہ علامہ طبری نسخ مترادفات ستہ کے باوجود اختلاف قراءات کے یقیناً قائل ہیں۔ جیسا کہ:

(۱) تفسیر طبری میں مختلف قراءات کا تذکرہ موجود ہے۔

(۲) نیز طبری مقدمہ کتاب المبانی ص ۲۳۰ میں فرماتے ہیں:

إن القراءات التی تختلف بها المعانی صحیحة منزلة من عند الله ولكنها خارجة من هذه السبعة الأحرف۔

یہ سب قراءات جن میں معانی بھی مختلف ہوجاتے ہیں صحیح اور من جانب اللہ نازل شدہ ہیں، لیکن بایں ہمہ یہ ان سبعہ اَحرف (بمعنی کلمات مترادفہ مختلفة المادة) سے خارج وجداگانہ ہیں۔

(۳) نیز خود طبری قراءۃِ حمزہ اور روایت ورش بطور خاص پڑھا پڑھایا کرتے تھے۔
[مقدمہ تفسیر طبری ص ۱۴]

(۴) بلکہ طبری نے الجامع نامی ایک بڑی کتاب قراءات پر تالیف کی جس میں بیس سے زائد قراءات کا تذکرہ کیا ہے۔ (النشر ۱/۳۴)

ظاہر ہے کہ یہ تمام قراءتیں سبعہ لغاتِ غیر مترادفہ اور سبعہ اَنواع اِختلاف قراءات کی روشنی ہی میں مدون ہوکر معرض وجود میں آئی ہیں لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ طبری کے یہاں بھی سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ مترادفات اور سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ لغات غیر مترادفہ اور سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ اَنواع اِختلاف قراءات تین مستقل اَنواع واَقسام کی اَحادیث ہیں جن میں سے سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ مترادفات والی اَحادیث تو صرف اِبتدائے اسلام کے زمانے میں معمول تھیں اور اس کے بعد موقوف ومنسوخ ہوچکی ہیں۔ لیکن سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ لغات غیر

مترادفہ نیز سبعہ اَحرف بمعنی سبعہ انواعِ اختلاف قراءات والی اَحادیث اب بھی یقیناً معمول و باقی ہیں اور یہ لغات واختلاف قراءاتِ عرضہ اخیرہ اور قریشی لغات کی روشنی میں بدستور موجود ہیں، قطعاً منسوخ نہیں ہیں۔

چنانچہ خود علامہ طبری نے کتاب القراءات میں اپنی تحقیقی رائے کی ترجمانی یوں فرمائی ہے:

كل ما صح عندنا من القراءات أنه علمه رسول الله ﷺ لأمته من الأحرف السبعة التي أذن الله له ولهم أن يقرءوا بها القرآن، فليس لنا أن نخطئ من قرأ إذا كان ذلك به موافقا لخط المصحف۔ (الإبانة ص ۱۲، ۲۰)

ہر وہ قراءت جس کے متعلق بروئے صحت یہ بات ہمارے نزدیک ثابت ہو چکی ہو کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی اُمت کو اس کی تعلیم دی ہے وہ ان اَحرف سبعہ میں سے ہے جن کے موافق اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کی اُمت کو تلاوت قرآن کی اجازت عنایت فرمائی لہٰذا جب کوئی شخص ایسی قراءت پڑھے بشرطیکہ وہ رسم عثمانی کی موافقت کرنے والا ہو ہمیں قطعاً اس کی تغلیط کا حق نہیں پہنچتا، واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ [حیات ترمذی مؤلفہ راقم الحروف: ص ۶۹۰ تا ۶۸۲]

حاصلِ کلام:

اَحرفِ سبعہ سے کیا مراد ہے اور یہ کہ اب وہ باقی ہیں یا نہیں اور قراءاتِ سبعہ اور عشرہ کا تعلق کس لغت سے ہے تفصیل بالا سے واضح ہے کہ اس میں حضرات اہل علم کے مابین شدید اختلاف پایا جاتا ہے علامہ دانی، اکثر محققین اور جمہور اہل اَدا کے نزدیک اَحرف سبعہ سے مراد مختلف قبائل کی سات لغات ہیں اور علامہ طبری اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک اَحرف سبعہ میں سے اب صرف ایک حرف باقی ہے دیگر اَحرف ستہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں منسوخ ہو گئے تھے، اب وہ باقی نہیں رہے۔ ہمارے اَکابر میں سے حضرت علامہ ظفر اَحمد عثمانی کی رائے گرامی بھی یہی ہے خود احقر کے والد ماجد فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور صاحب ترمذی جو اپنے دور میں ایک جید عالم دین اور عظیم فقیہ و مفسر ہونے کے ساتھ ساتھ قراءات سبعہ بلکہ عشرہ کے باقاعدہ قاری اور حضرت شیخ القراء جناب قاری محی الاسلام کے خاص تلمیذ رشید تھے ان کی رائے بھی یہی تھی۔ جیسا کہ انہوں نے علامہ شمس الحق اَفغانی سے متعلق اپنے مقالہ حضرت مولانا افغانی کی تفسیری خدمات میں اس کا اِظہار بھی فرمایا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جمہور علماءِ کرام کا ایک دوسرا طبقہ جس کا تفصیلی ذکر علوم القرآن کے حوالہ سے گزر چکا ہے، ان کا نظریہ یہ ہے کہ اَحرف سبعہ اب بھی باقی ہیں۔ لیکن یہ ایک خالص علمی اور نظریاتی اِختلاف ہے اس سے اس حقیقت ثابتہ، کہ قرآن کریم چودہ سو سال سے آج تک بغیر کسی اَدنیٰ تغیر وتبدل، اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے تحت محفوظ چلا آرہا ہے اور اس کی جتنی قراءتیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں وہ سب صحیح ہیں، پر ذرا بھی اَثر نہیں پڑتا۔ حضرت علامہ محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالیٰ نے

اس بارہ میں نہایت صائب اور فیصلہ کن بات تحریر فرمائی ہے:

یہ سارا اختلاف محض نظریاتی نوعیت کا ہے اور عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت وصداقت اور اس کے بعینہٖ محفوظ رہنے پر اس اختلاف کا کوئی اثر بھی مرتب نہیں ہوتا۔ [علوم القرآن:۱۵۶]

قراآت مختلفہ کے توقیفی اور سماعی ہونے کے دلائل

دلیل اول: اعجاز قرآنی

ایک ہی مضمون ومقصد کو مختلف پیراؤں میں بیان کرنا علم فصاحت وبلاغت اور علم بیان کی خوبیوں میں سے ہے قرآن کریم جو افصح الکلام ہے ایسی خوبیوں سے قطعاً خالی نہیں ہوسکتا، جس آیت میں مختلف قراآت ہیں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قراآت کے اعتبار سے وہ آیت ایسی معجزانہ شان رکھتی ہے کہ کوئی اس کا مثل نہیں پیش کرسکتا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پہلی مثال:

یـایھاالـذیـن امـنـو اذاضربتم فی سبیل اللّٰہ فتبینوا. اس کی دوسری قراءت اس طرح ہے یـایھاالذین امنو اذاضربتم فی سبیل اللّٰہ فتثبتوا اس آیت میں فتبینوا اور فتثبتوا دونوں ہی لفظ اعجازی شان کے حامل ہیں، تبیـن والی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ کسی نومسلم کو جلدی سے قتل نہ کرو بلکہ تحقیق کرلو اور اس سے بیان لےلو اور تثبت والی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ اطمینان سے کام لو جلدی نہ کرو تا کہ صورت حال واضح ہوجائے (روح المعانی ۱۴۵/۲۶) ظاہر ہے کہ دونوں باتوں میں کوئی ضدیت نہیں کیونکہ اولاً اطمینان حاصل ہوگا تو ثانیاً اس کے نتیجہ میں تحقیق کا وقوع ہوگا۔ ایسے دو الفاظ کا انتخاب قرآنی اعجاز ہی کا کمال ہوسکتا ہے جو کسی بشر کی طاقت میں نہیں، کیا قرآنی اعجاز اس کا نام ہے کہ فصحاء خالص عرب تو کجا محض موالی اعجام ایسا معجزانہ کلام ایجاد واختراع کرلیتے، یہ سراسر قرآنی اعجاز کی توہین وگستاخی ہے لھذا ماننا پڑے گا کہ ان موالی نے اپنے پاس سے کچھ نہیں کہا بلکہ جو قراءت نقلاً ان تک پہنچیں بعینہٖ انہی کو ان حضرات نے آگے روایت کردیا ہے۔

دوسری مثال:

فتلقی ادمُ من ربہ کلمٰتٍ، دوسری قراءت میں یہ آیت یوں ہے: ادمَ من ربہ کلمٰتٌ، پہلی قراءت میں یہ پیرایہ واسلوب اختیار کیا گیا کہ ''آدم نے اپنے پروردگار کی جانب سے کچھ کلمات حاصل کرلیے'' دوسری قراءت میں اسی مفہوم کو دوسرے طرز وانداز میں یوں ذکر کیا کہ ''آدم کو اپنے پروردگار کی

جانب سے چند کلمات حاصل ہو گئے" یعنی پہلی قراءت سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام نے جب بارگاہ الٰہی میں الحاح وزاری اور تضرع وگریہ کیا تو بارگاہ الٰہی میں وہ قبول ہو گیا، دوسری قراءت میں یہ بیان ہوا کہ بالآخر انہیں قبولِ توبہ کے تمہیدی مظہر ومصداق کے طور پر چند دعائیہ کلمات حاصل ہو گئے جو قبولیت پر منتج ہوئے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ کوئی کہے فلانٌ قائمٌ اور دوسرا کہے فلانٌ لیس بقاعدٍ یا کوئی یوں کہے عرضت الناقة علی الحوض اور دوسرا کہے عرضت الحوض علی الناقة۔ یا کوئی یوں کہے سلب زیدٌ ثوبه اور دوسرا کہے سلب ثوب زیدٍ ظاہر ہے کہ سب مثالوں میں ہر دو تعابیر کا مقصد وحاصلِ مفہوم ایک ہی ہے۔ قراآت وروایات مختلفہ کی یہی شان ہے کہ باوجود اس کے کہ الفاظ کی شکلیں متعدد ہو جاتی ہیں مگر بایں ہمہ مفہوم متحد ہی رہتا ہے بلکہ ہر قراءت پر دوسری سے اعلیٰ ترین معنی نکلتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا کوئی مخلوق ایسی شاندار معجزانہ تعبیر اور اس کے لئے ایسے مختلف الاعراب کلمات کا چناؤ کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، موالی تو کجا پوری دنیا کے خالص آزاد فصحاء لوگ بھی ایسی تعبیرات اور ان کے لئے ایسے کلمات کا انتخاب قطعاً نہیں کر سکتے ہیں، معلوم ہوا کہ اختلاف قراءت کو موالی کی ایجاد وگھڑت قرار دینا کلامِ الٰہی کی معجزانہ عبارت کی شان میں بے ادبی اور اس کا استخفاف ہے کہ اس کی عبارت کو ایسا ہلکا اور معمولی درجہ کا سمجھ لیا گیا ہے کہ ہرا ایرا غیرا اس کو بنا کر پیش کر سکتا ہے (العیاذ باللہ)

تیسری مثال:

بما کانوا یکذبون (البقرہ) کے معنی ہیں "بسبب اس کے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے" اور بما کانوا یکذِّبون کے معنی ہیں "بسبب اس کے کہ وہ جھٹلاتے تھے" اور منافقین میں دونوں ہی صفتیں پائی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایمان کے دعوے میں جھوٹے بھی تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتے بھی تھے۔

دلیل دوم: داخلی شہادت:

قراآت کی توقیفیت ومنقولیت اور ان میں قیاس واجتہاد واختراع کے قطعی غیر معتبر ہونے کے متعلق اندرونی شواہد وقرائن:

دو اور دو چار "یہ دعویٰ بھی ہے اور خود ہی اپنی دلیل بھی ہے" تمام قراآت مختلفہ سماعی ونقلی وتوقیفی ونزولی ہیں نہ کہ اختراعی ایجادی قیاسی عقلی" یہ دعویٰ بھی ہے اور خود اسی دعوے میں اس کی دلیل بھی موجود ہے چنانچہ ذیل میں اس کے متعلق چند داخلی شہادتیں پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی داخلی شہادت:

امام حمزہ کے لئے مصاحف عثمانیہ کے مرسوم بالیاء تمام کلمات میں قاعدۂ کلیہ کے طور پر ہر جگہ امالہ محض ہوتا ہے لیکن چند کلمات تلہا طحہا دحہا سجی میں انہوں نے امالہ نہیں کیا باوجودیکہ یہ کلمات بھی مرسوم بالیاء ہی ہیں اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ روایۃً انہیں ان کلمات کا امالہ نہیں پہنچا تھا اور یہ امالہ روایتاً ونقلاً ان کی قراءت میں ثابت ووارد نہیں ہوا تھا معلوم ہوا کہ قراآت میں اصل حقیقی اتباع روایت ونقل ہے۔

دوسری داخلی شہادت:

حفص کے لئے صرف مجرھا میں امالہ ہے اس کے علاوہ پورے قرآن میں ان کے لئے کسی جگہ بھی امالہ نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ حفص نے متصل وصحیح سند کے ذریعہ فقط اسی ایک کلمہ کو امالہ سے نقل کیا ہے۔

تیسری داخلی شہادت:

ابن عامر کی قراءت بروایت ہشام میں صرف ۳۳ مخصوص موقعوں میں ابراہیم کی جگہ ابراھام ہے نہ کہ پورے قرآن مجید میں جس کی وجہ سوائے نقل وروایت کے کچھ نہیں۔

چوتھی داخلی شہادت:

حضرت محقق ابن الجزری فرماتے ہیں ''اختلاف قراءت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کی صداقت وحقانیت پر عظیم الشان اور واضح ترین وقطعی دلیل ہے کیونکہ قراآت مختلفہ میں قسم قسم کے اختلافات کے باوجود ان میں ذرا برابر ضدیت ومخالفت وتناقض نہیں بلکہ تمام قراءتیں باہم ایک ہی طرز وطریق پر منظم ومرتب اور ایک ہی اسلوب وانداز پر باہم ایک دوسری کی تصدیق وتشریح اور تائید وتفسیر کرتی ہیں اور ہر عاقل وفہیم جانتا ہے کہ یہ صفت وشان صرف اور صرف کلامِ الٰہی کی ہی ہوسکتی ہے پس جب قرآن کلامِ الٰہی ہے تو جس ذات کریم پر وہ نازل ہوا ہے وہ بھی یقیناً صادق ہے'' [النشر ۵۲/۱]

پانچویں داخلی شہادت:

امت مسلمہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن پاک میں کسی حرف یا کلمہ کی تبدیلی کا قطعاً حق حاصل نہ تھا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے قل مایکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی ان اتبع الا مایوحی الی (یونس) تو کہہ دے میرا کام نہیں کہ اس کو بدل ڈالوں اپنی طرف سے میں تابعداری کرتا ہوں اسی کی جو حکم آئے میری طرف۔ دوسری جگہ فرمایا وماینطق عن

الھوی ان ھوالاوحی یوحی (النجم) اور آپ نہیں بولتے اپنے نفس کی خواہش سے یہ تو حکم ہے بھیجا ہوا۔ تیسری جگہ ارشاد خداوندی ہے ولوتقول علینابعض الاقاویل لاخذنامنہ بالیمین ثم لقطعنامنہ الوتین فمامنکم من احدعنہ حجزین (الحاقہ) اور اگر یہ بنالاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑ لیتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن پھر تم میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے بچالے۔ قراآت بھی قرآن کریم ہی کا داخلی جزو اور حصہ ہیں لہٰذا وہ بھی اللہ عزوجل ہی کی جانب سے وحی کی شکل میں نازل شدہ ہیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تبدیلی کا حق نہ تھا تو غیر رسول کو کس طرح ہوسکتا ہے اگر وحی الٰہی اور روایت ونقل سے ثبوت کے بغیر کوئی شخص تبدیلی کرے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ تحفظ قرآن کے وعدہ کی وجہ سے رائج نہ ہونے دیں گے باوجود یکہ یہ قراآت مختلفہ ہر دور میں مروج وشائع رہی ہیں یہ دلیل ہے اس امر کی کہ یہ سب نازل شدہ اور حضرۃ نبویہ سے صحیح ومتصل سند کے ذریعہ ثابت ومروی ہیں۔

چھٹی داخلی شہادت:

سبعہ احرف پر قرآن کریم کے نزول والی احادیث واضح دلیل ہیں اس پر کہ قراآت منزل من اللہ ہیں اور ان کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی محض تبلیغ کا ہے۔ معاذ اللہ اپنی جانب سے کمی بیشی کرنے کا حق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں ہے۔ یہی احادیث اس امر پر بھی دال ہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان قراآت کو مشافہۃً اور تلقی کے طور پر حاصل کیا پھر تابعین نے وہ قراءتیں صحابۂ کرام سے حاصل کیں حتیٰ کہ سلسلہ درسلسلہ نسل درنسل طبقہ درطبقہ بطریق تواتر یہ قراآت ہم تک پہنچ گئیں۔

دلیل سوم: تواتر

کسی چیز میں تواتر کے ثابت ہوجانے کے بعد اس متواتر چیز کے رجال سند سے بحث نہیں کی جاسکتی مستشرقین نے قرآن کی قراآت مختلفہ اور سبعہ احرف ولغات کو تحریف قرآن ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے حالانکہ یہ استدلال بالکل غلط ہے تحریف اس کا نام ہے کہ کسی شاہی دستاویز وکلام میں اصل متکلم اور دستاویز مرتب کرنے والے کے علاوہ کوئی اور شخص الفاظ میں ردوبدل کرکے کچھ گھٹا بڑھادے اور متکلم کے کلام کو بدل ڈالے لیکن اگر خود بادشاہ اپنی دستاویز کے الفاظ میں بیشمار محاسن ومصالح کے اظہار کے ماتحت ردوبدل اور کوئی تبدیلی کردے تو اس کو کوئی عقل مند تحریف نہیں کہہ سکتا۔ قرآن پاک کی قراآت کی دوقسمیں ہیں۔ متواتر، غیر متواتر۔ پس قراءۃ غیر متواترہ قرآن نہیں کیونکہ ائمہ اصول متفق ہیں کہ قرآنیت کے لئے تواتر شرط ہے اور قراءۃ متواترہ قرآن ہے اس سے تحریف ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ تحریف

اس کا نام ہے کہ یا غیر قرآن کو قرآن میں داخل کیا جائے یا قرآن کے کسی جزو کو قرآن سے خارج کر دیا جائے اور اختلاف قراءت میں دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہیں۔ برہان میں علامہ زرکشی نے لکھا ہے کہ قرآن ان الفاظ وحی کا نام ہے جو حضور علیہ السلام پر بیان احکام کے لئے معجزانہ انداز میں اترے ہیں اور قراءت (اختلاف لغات کے موقع پر) قرآنی الفاظ منزلہ کے طرز تلفظ اور کیفیت ادا کا نام ہے ۔سات قراآت ''سات قراء'' تک متواتر طریق سے ثابت ہیں اور یہ کیفیات واسالیب بھی حضور علیہ السلام تک متواتر ہیں وقدنص علی تواترذلك كله ائمة الاصول كالقاضی ابی بكروغيره وهوالصواب لانه اذاثبت تواتراللفظ ثبت تواترهيئة ادائه لان اللفظ لايقوم الابه ولايصح الابوجوده۔

ترجمہ: ائمہ اصول قاضی ابوبکر وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ سات قراآت از اول تا آخر (اصول وفروع سمیت) حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک بالکلیہ متواتر ہیں اور یہی درست ہے کیونکہ جب الفاظ کا تواتر ثابت ہے تو طرز ادا، اور تلفظ کی ہیئت کا تواتر بھی ثابت ہے کیونکہ الفاظ کا تلفظ طرز ادا کے بغیر ممکن نہیں اور الفاظ کی صحت ودرستی، طرز تلفظ کے وجود ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ قراآت سبعہ متواتر اس لئے ہیں کہ ہر امام نے بلاواسطہ یا بالواسطہ صحابہ کرام سے اور صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام سے اخذ کیا ہے مثلاً نافع نے ابوجعفر مدنی وغیرہ کل ستر تابعین سے قراءت حاصل کی انہوں نے ابن عباس اور ابوہریرہ سے، اور ان ہر دو نے ابی بن کعب سے اور ابی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قراءت حاصل کی۔ ابن کثیر نے قراءت مجاہد سے انہوں نے ابن عباس سے بسند مذکور حاصل کی ابوعمرو نے قراءت مجاہد وسعید بن جبیر سے حاصل کی اور ان دونوں نے ابن عباس سے اور انہوں نے ابی بن کعب سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی وعلی هذاالقياس۔ یہ سب قراآت متواترہ، قرآن ہیں لہٰذا قراآت سے نہ قرآن میں کمی آتی ہے نہ بیشی، موجودہ قراآت سبعہ، بتواتر صحت واتصال سند کے ساتھ ثابت ومنقول ہیں ان کے برخلاف کسی ایک فرد کا بیان قطعی ناقابل اعتبار ہے جیسا کہ شہر بغداد شہر مکہ شہر مدینہ کا وجود تواتر سے ثابت ہے اب اگر کوئی شخص قطعی متواتر چیز کے برخلاف دلائل قیاسیہ قائم کردے تو وہ قطعاً قابل اعتبار نہیں ہوسکتے ان دلائل کو دیوانگی اور عقلی ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔

قراآت سبعہ اور عشرہ کے تواتر کے متعلق اقوال علماء:

قول نمبر(۱) مفتی انام علامہ ابوعمرو عثمان بن صلاح ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

يشترط ان يكون المقروء به قدتواترنقله عن رسول الله صلى اللهعليه وسلم قرآناواستفاض نقله كذلك وتلقته الامة بالقبول كهذه القرآات السبع لان المعتبرفی ذلك

الیقین والقطع۔[النشر ۴۰/۱]

ترجمہ: جس قراءت کی تلاوت کی جائے اس کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کا قرآن ہونا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقہ پر منقول ہو اور اسی طرح ہر زمانہ میں وہ قراءت مشہور وشائع رہی ہو اور اس کو امت نے شرف قبولیت بخشا ہو جیسے یہ مروجہ قرآآت سبعہ اور تواتر وشہرت کی قید اس لیے لگائی ہے کہ صحیح ومقبول قراءت میں تیقن وقطعیت معتبر ہے۔

قول نمبر(۲)......علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

القرآن الذی تجوزبہ الصلوۃ بالاتفاق ھو المضبوط فی مصاحف الائمۃ التی بعث بھا عثمان رضی اللہ عنہ الی الامصار وھو الذی اجمع علیہ الائمۃ العشرۃ وھذا ھو المتواتر جملۃ وتفصیلا فمافوق السبعۃ الی العشرۃ غیر شاذ وانما الشاذ ماوراء العشرۃ وھو الصحیح وتمام تحقیق ذلک فی فتاوی العلامۃ قاسم ۔[شامی ۳۵۸/۱۔۳۵۹]

ترجمہ: وہ قرآن جس کے ذریعہ بالاتفاق نماز جائز ہو جاتی ہے یہ وہ ہے جو ائمہ کے ان قرآنوں میں درج شدہ ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شہروں کی جانب روانہ فرمائے تھے اور یہ وہ ہے جس پر ائمہ عشرہ متفق الروایت ہیں۔ یہ حصہ مجموعی اور تفصیلی افراد وجزئیات یعنی اتفاقی واختلافی ہر دو قسم کے الفاظ کے لحاظ سے متواتر ہے پس سبعہ سے اوپر عشرہ تک والی قرآآت شاذہ نہیں بلکہ شاذ صرف ماوراء العشرہ ہی ہے یہی صحیح ہے اور اس بحث کی پوری تحقیق فتاوی علامہ قاسم میں درج ہے۔

قول نمبر(۳)......قاضی القضاۃ عبدالوہاب ابونصر بن الامام علی السبکی جمع الجوامع فی الاصول کی شرح منع الموانع میں فرماتے ہیں:

والصحیح ان ماوراء العشرۃ فھو شاذ......علی ان القول بان القرآآت الثلاث غیر متواترۃ فی غایۃ السقوط ولا یصح القول بہ عمن یعتبر قولہ فی الدین وھی قراءۃ یعقوب وخلف وابی جعفر بن القعقاع لاتخالف رسم المصحف (النشر ۴۴/۱۔۴۵)

ترجمہ: صحیح بات یہ ہے کہ عشرہ کے علاوہ باقی قراءتیں شاذ ہیں اور یعقوب خلف ابوجعفر بن قعقاع کی تین قراءتوں کو غیر متواتر کہنا حد اعتبار سے انتہائی گرا ہوا قول ہے جس شخص کی بات کا دین میں اعتبار کیا جاتا ہے وہ ہرگز ایسی بات نہیں کہہ سکتا ہے اور یہ تینوں قراءتیں بھی عثمانی مصحف کی رسم کے مخالف نہیں ہیں۔

قول نمبر(۴)......علامہ قاضی القضاۃ ابونصر موصوف حضرت محقق ابن الجزری کے ایک استفتاء متعلقہ قرآآت عشرہ کے جواب میں رقمطراز ہیں:

الحمدللہ القرآآت السبع التی اقتصر علیھا الساطبی والثلاث التی ھی قراءۃ ابی جعفر وقراءۃ

یعقوب وقراءة خلف متواترة معلومة من الذي بالضرورة كتبه عبدالوهاب بن السبكي الشافعي.
(النشر ۱/۴۶)

ترجمہ: الحمدللہ وہ قراآت سبعہ جن پر شاطبی نے انحصار کیا ہے نیز ابوجعفر یعقوب خلف کی قراآت ثلاثہ یہ دسوں قراءتیں متواتر و معروف اور بالبداہت ضروریات دین میں سے ہیں (یعنی ان کا منجملہ دین کے ہونا بجد واضح و عیاں اور بدیہی امر ہے)

قول نمبر (۵).....علامہ محقق تفتازانی فرماتے ہیں:

ان القرآت السبع متواترة لايحل الطعن فيها بل ينبغي ان يرد بها قول من يخالفه ويجعل ذلك شاهدا على وقوعه. (شرح شاطبیہ ملا علی قاری ص ۲۵۹)

ترجمہ: قراآت سبعہ متواتر ہیں ان پر اعتراض کرنا ناجائز ہے، بلکہ مناسب یہ ہے کہ ان کے ذریعہ مخالف کے قول کی تضعیف و تردید کی جائے اور قراءت کو نحو کے قاعدۂ شاذہ کے وقوع و جواز کا شاہد و مستدل قرار دیا جائے۔

قول نمبر (۶).....علامہ دکتور حسن ضیاء الدین عتر فرماتے ہیں:

والقرآت المتواترة انماتواترت الى الرسول صلى الله عليه وسلم لاالى ائمة القراءة فحسب وليس هناك مجال للاجتهادفي القراءة بل هي توقيفية وسيرة العلماء والسلف الصالح وتوقفهم في قبول القراءة على قوة اسنادهااكبردليل على ذلك بالاضافة الى الادلة الكثيرة السابق سردهالقدتلقى القرآن باحرفه السبعة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم جمع من الصحابة وتلقاه عنهم جمع غفيرمن التابعين هكذاالى عصرناهذاو لقداشتهر كثيرون من الصحابة باقراء القرآن منهم ابى بن كعب وزيدبن ثابت وعبدالله بن مسعودواشتهرمن التابعين سعيدبن المسيب وعروة وسالم وعطاء وسليمان ابنايسارواناس كثرون في كل بلدة من بلادالاسلام واشتهربعدذلك قراء كثيرون منهم السبعة وباقي العشرة وغيرهم وقدلقي بعض السبعة الصحابة والتابعين مثل ابن عامروابن كثيروعاصم وهذاكله ساعدعلى نقل القرآن بقرآته الينامتواترا(الاحرف السبعة ومنزلة القرآت منها: ص ۳۶۵ و ۳۶۶)

ترجمہ: قراآت متواترہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر متواتر ہیں نہ یہ کہ وہ صرف ائمہ قراءت تک متواتر ہیں۔ قراآت میں اجتہاد کی کوئی مجال نہیں بلکہ وہ توقیفی ہیں۔ علاوہ سابق الذکر دلائل کثیرہ کے اس کی بڑی دلیل یہ کہ علماء و سلف صالحین کا ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ قبول قراءت کو قوت سند قراءت پر موقوف قرار دیتے رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احرف سبعہ سمیت قرآن کو صحابہ کی ایک جماعت نے حاصل کیا پھر صحابہ سے تابعین کے جم غفیر نے اور اسی طرح ہمارے اس زمانہ تک ہر زمانہ کے بے شمار لوگ مسلسل اور برابر اسے حاصل کرتے کراتے چلے آ رہے ہیں۔ تعلیم قراآت میں

بہت سے صحابہ کو خصوصی شہرت حاصل ہوئی منجملہ ان کے ابی بن کعب زید بن ثابت عبداللہ بن مسعود ہیں۔
تابعین میں سے سعید بن مسیب، عروہ، سالم، عطاء بن یسار، سلیمان بن یسار اور اسی طرح ہر اسلامی شہر میں بہت سے تابعین وغیرہم کو تعلیم قراآت میں نمایاں مقام حاصل ہوا، ان کے بعد بہت سے قراء کرام کو مقام افضلیت حاصل ہوا جن میں قراء سبعہ اور قراء ثلاثہ وغیرہم بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ بعض قراء سبعہ مثلاً ابن عامر ابن کثیر عاصم کو صحابہ و تابعین سے شرف لقاء حاصل ہوا ہے یہ پوری تفصیل اس امر کی مؤید ہے کہ قرآن کریم اپنی قراآت سمیت ہم تک بطریق تواتر منقول ہوتا چلا آ رہا ہے۔

دلیل چہارم: صحت واتصال سند

مروجہ تمام قراآت صحیح و متصل سند کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، آپ سے یہ قراآت سات مشہور قراء صحابہ نے حاصل کیں اور ان سے قراء سبعہ کو پہنچیں جس سے قراآت سبعہ کا وجود عہد نبوت میں ثابت ہوتا ہے اگر چہ باقاعدہ فن کی شکل میں تدوین قراآت بعد کے زمانہ میں ہوئی۔

قراآت کی سندات کی صحت واتصالیت کے متعلق چند اقوال علماء:

ا۔ علامہ عبدالعظیم زرقانی نے مناہل العرفان میں ان مشہور سات قراء صحابہ کے نام ذکر کیے ہیں جن تک قراء سبعہ کی سند قراءت پہنچتی ہے۔ ان صحابہ نے حضور علیہ السلام سے قراءت حاصل کی اور پھر وہ بالذات یا بالواسطہ بعد کے زمانہ کے ان قراء کے شیوخ واساتذہ بنے جن کی قراآت بلاد اسلامیہ میں پھیلیں اور آج تک ان کا سلسلہ قراءت چل رہا ہے۔ وہ سات صحابہ یہ ہیں (۱) عثمان (۲) علی (۳) ابی بن کعب (۴) زید بن ثابت (۵) عبداللہ بن مسعود (۶) ابوالدرداء (۷) ابوموسی الاشعری (مناہل العرفان ۱/۴۰۷)

۲۔ علامہ ذہبی نے معرفۃ القراء میں اولاً ان سات حضرات صحابہ کرام عثمان، علی، ابی بن کعب، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابوموسی اشعری، ابودرداء کے حالات ذکر کیے ہیں اس کے بعد فرماتے ہیں: فھؤلاء الذین بلغنا انھم حفظوا القرآن فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم واخذ عنھم عرضا وعلیھم دارت اسانید قرآت الائمۃ العشرۃ (معرفت القراء الکبار ۱/۳۹)

ترجمہ: یہ وہ صحابہ ہیں جن کے متعلق ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ انہوں نے حیات نبویہ میں مکمل قرآن حفظ کر لیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے خود پڑھ کر انہیں قرآن کریم کی تعلیم دی تھی اور پھر آگے ان ہی سات صحابہ پر قراء عشرہ کی قراآت کی سندات کا دارومدار ہے۔

۳۔ علامہ محقق ابن الجزری فرماتے ہیں: صحابۂ کرام کے بعد جو حضرات تابعین قراآت کی وجوہ کو نقل کرنے میں ان کے قائم مقام ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

[۱]......مدینہ میں گیارہ حضرات: (۱) ابن مسیب (۲) عروہ (۳) سالم (۴) عمر بن عبد العزیز (۵) سلیمان بن یسار (۶) عطا بن یسار (۷) معاذ بن حارث جو معاذ قاری کے نام سے مشہور ہیں (۸) عبد الرحمٰن بن ہرمز اعرج (۹) ابن شہاب زہری (۱۰) مسلم بن جندب (۱۱) زید بن اسلم۔

[۲]......مکہ میں چھ حضرات: (۱) عبید بن عمیر (۲) عطاء (۳) طاؤس (۴) مجاہد (۵) عکرمہ (۶) ابن ابی ملیکہ۔

[۳]......کوفہ میں پندرہ حضرات: (۱) علقمہ (۲) اسود (۳) مسروق (۴) عبیدہ (۵) عمرو بن شرحبیل (۶) حارث بن قیس (۷) ربیع بن خیثم (۸) عمرو بن میمون (۹) ابو عبد الرحمٰن سلمی (۱۰) زر بن حبیش (۱۱) عبید بن نضیلہ (۱۲) ابو زرعہ بن عمرو بن جریر (۱۳) سعید بن جبیر (۱۴) ابرہیم نخعی (۱۵) شعبی۔

[۴]......بصرہ میں دس حضرات: (۱) عامر بن عبد قیس (۲) ابو العالیہ (۳) ابو رجا (۴) نصر بن عاصم (۵) یحیٰی بن یعمر (۶) معاذ (۷) جابر بن یزید (۸) حسن (۹) ابن سیرین (۱۰) قتادہ۔

[۵]......شام (دمشق) میں دو حضرات: (۱) مغیرہ بن ابی شہاب مخزومی جو قراءت میں عثمان بن عفان کے شاگرد ہیں (۲) خلید بن سعد جو ابو الدرداء کے شاگرد ہیں۔

پھر تابعین کے بعد ایک بہت بڑا گروہ صرف قرآن پڑھنے پڑھانے اور اس کا طریقہ ادا سیکھنے سکھانے کے لئے مخصوص و فارغ ہو گیا اور انہوں نے قراءات کے ضبط و نشر میں اتنی سعی و توجہ کی کہ وہ اپنے وقت کے ایسے امام بن گئے جو لوگوں کے مقتدا (پیشوا) اور شہرۂ آفاق قراء تھے اور لوگ سفر کر کے ان سے قراءات حاصل کرتے تھے (یہاں تک کہ) ان کے شہر والوں نے ان کی قراءات کی قبولیت پر اتفاق کر لیا اور کوئی سے دو افراد نے بھی اس بارہ میں ان سے اور باہم سر مو اختلاف نہیں کیا (جو اختلاف والوں کا سب سے کم تر عدد ہے) اور چونکہ ان حضرات نے اپنے آپ کو قرآن اور اس کی قراءات میں پوری طرح مشغول و منہمک کر دیا تھا (اور ان کے ذریعہ اس فن نے خوب رواج و شہرت پائی تھی) اس لئے قراءات کی نسبت انہی کی طرف ہونے لگ گئی (یعنی چونکہ اس زمانہ میں شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ان حضرات کے بعد اتنے بڑے عالم پیدا نہ ہو سکیں گے اس بنا پر اس وقت کے ارباب حل و عقد (یعنی بڑے بڑے علماء) فن کی امامت کا عہدہ انہی حضرات کے سپرد کر دیا اور ان کو امام مان کر خود ان کے مقلد بن گئے اور قریب و بعید سب کے مقابلہ میں انہیں کو پسند کر لیا پھر ان کے تلامذہ شاخ در شاخ ہو کر ملکوں میں پھیل گئے اور ان کے تمام علوم کو ان سے نقل کر کے دنیا میں پھیلا دیا (اور مشہور کر دیا) اور ان ائمہ اور قراء کی تفصیل یہ ہے:

[۱]......مدینہ میں: (۱) ابو جعفر یزید بن قعقاع پھر (۲) شیبہ بن نصاح ان کے بعد (۳) نافع بن

ابی نعیم۔

[۲]......مکہ میں: (۱) عبداللہ بن کثیر (۲) حمید بن قیس اعرج (۳) محمد بن محیصن۔

[۳]......کوفہ میں: (۱) یحیٰ بن وثاب (عاصم بن ابی النجود (۳) سلیمان اعمش (ان تینوں کے بعد (۴) حمزہ پھر (۵) کسائی۔

[۴]......بصرہ میں: (۱) عبداللہ بن ابی اسحٰق (۲) عیسیٰ بن عمر (۳) ابوعمرو بن علاء یہ تینوں ہم عصر ہیں ان کے بعد (۴) عاصم حجدری (۵) پھر یعقوب حضرمی

[۵]......شام (دمشق) میں: (۱) عبداللہ بن عامر (۲) عطیہ بن قیس کلابی (۳) اسمٰعیل بن عبداللہ بن مہاجر۔ ان کے بعد (۴) یحیٰ بن حارث ذماری (۵) شریح بن یزید حضرمی۔ [النشر ۱/۸-۹]

دلیل پنجم: خارجی شہادات واقوال علماء:

قرآءت کے سماعی اور توقیفی ہونے پر بیرونی شواہد اقوال علماء وا کابر امت کی روشنی میں پہلی خارجی شہادت:

علامہ محقق ابن الجزری فرماتے ہیں:

وکل ماصح عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من ذلك فقد وجب قبوله ولم یسع احدا من الامة رده ولزم الایمان به وان کله منزل من عندالله اذ کل قراءة منها مع الاخری بمنزلة الآیة مع الآیة یجب الایمان بها کلها۔ [النشر ۱/۵۱]

ترجمہ: ان قرآءت میں سے ہر وہ قراءت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ ثابت ہو جائے اس کا قبول کرنا واجب ہے اور امت میں سے کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اس کو رد کردے اور اس کی قرآنیت وصحت پر ایمان لانا واجب ہے اور اس پر بھی کہ انکی ہر قراءت یقیناً من جانب اللہ نازل شدہ ہے کیونکہ ہر صحیح قراءت کا دوسری کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ ہے پس ہر آیت کی طرح ہر قراءت پر بھی ایمان لانا ضروری ولازمی ہے۔

دوسری خارجی شہادت:

امام حافظ ابوعمرو دانی جامع البیان میں احرف سبعہ کے متعلق اپنا مذہب اور ان کی وجوہ اختلاف کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وان القراء السبعة ونظائرهم من الائمة متبعون فی جمیع قراآتهم الثابتة عنهم التی لاشذوذ فیها [illegible] ۱/۴۷]

ترجمہ: بلاشبہ قراء سبعہ اور ان کے ہم پلہ دوسرے ائمہ کی ان جملہ قراآت کی پیروی واجب ہے جو ان سے صحیح طور پر ثابت ہوئی ہیں اور جن میں شذوذ نہیں ہے۔

تیسری خارجی شہادت:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

وتجوز القراءة فی الصلوة وخارجها بالقرآت الثابتة الموافقة لرسم المصحف كما ثبتت هذه القرآت فی العشر وغيرها وليست شاذة حينئذ [النشر: ۱/۴۱]

ترجمہ: نماز کے اندر نیز نماز سے باہر ہر دو حالت میں ان قراءتوں کی تلاوت بلاشبہ جائز ہے جو ان مروجہ قراآت عشرہ وغیرہ کی طرح صحیح سند سے ثابت اور عثمانی مصاحف کی رسم کے موافق ہوں، نیز وہ اب تک شاذ نہ بنی ہوں (اس وقت چونکہ غیر عشرہ، شاذ بن چکی ہیں لہٰذا اس معیار پر صرف عشرہ ہی پوری اترتی ہیں)۔

چوتھی خارجی شہادت:

امام شاطبی فرماتے ہیں:

وما للقیاس فی القراءة مدخل فدونک ما فیه الرضاء متکفلا

ترجمہ: قراءت میں قیاس کا ذرا بھی دخل نہیں لہٰذا تو نقل کا ذمہ دار بن کر صرف اس چیز کو لے لے جس میں ائمہ کی پسندیدگی ہو (یعنی جسے وہ موثوق ومعتمد علیہ گردانتے ہوں)۔

دلیل ششم: اجماع امت

دور نبوی سے لے کر آج تک ہر زمانہ میں قراآت سبعہ پر پوری امت کا اجماع رہا ہے ہر دور میں ائمہ قراءت، اختلاف قراءت کی حفاظت پر کمربستہ رہے اور کسی بددین کو ان قرآآت میں ردوبدل کرنے کا یا انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا موقع ہاتھ نہیں آنے دیا اور اللہ تعالیٰ پوری امت کو کسی غلط بات پر متفق نہیں فرماسکتے ہیں۔ ازمنۂ متقدمہ کے مقابلہ میں زمانہ حال، شرور وفتن، کثرت جہل وقلت علم، قرب قیامت، تسلسل فساد وفتنہ، طعنِ اکابر ومتقدمین، اعجاب وخودرائی اور کبر وتعلّی کا زمانہ ہے ایسے گئے گزرے زمانہ میں بھی یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ان قراآت سبعہ کے کسی ایک اختلاف کو بھی مٹا دے یا ان اختلافات میں اپنی طرف سے کچھ کمی وبیشی کردے۔ اگر کسی میں جرأت وہمت ہے تو آئے اور تجربہ کے طور پر کوئی اختلاف مٹا کر دکھائے یا تحریف کر کے کوئی اختلاف بڑھا کر دکھائے کہ پھر اس کے ردعمل کے طور پر فی الفور تمام اہل اسلام اس کے دجل کا پول کھول کر رکھ دیں گے اس کی اس خیانت وبددیانتی وجعلسازی کا تعاقب کر کے اس

تحریف کا پردہ چاک کر دیں گے اگر ایسے دور انحطاط وفساد میں غلط بات نہیں چل سکتی اور خیانت وبددیانتی رواج نہیں پا سکتی تو پھر ادوار وازمنہ سابقہ میں جو خیر کے ادوار تھے یہ کیونکر ممکن ہے کہ قراآت مختلفہ کو محض تحریف واختراع کے طریقہ سے حوالی وغیرہم نے اپنی جانب سے ایجاد کر کے پوری امت میں پھیلا دیا ہو اگر اس وقت ایک بھی غلط اختلاف نہیں چل سکتا تو اس وقت پوری قراآت جو آپ کے گمان میں غلط ہیں کیونکر چل گئیں؟ خیر کے ازمنہ سابقہ میں بطریق اولیٰ ایسی بددینی وتحریف کے عدم رواج کا قول کرنا پڑے گا اور یہ ماننا ہوگا کہ یہ تمام قراآت توقیفی وسماعی ثابت ومروی صحیح ومنزل من اللہ ہیں، اگر اختلاف قراءت کو حاشا وکلا عجمی غلاموں کی سازش قرار دیں تو دس صدیوں سے زائد عرصہ تک اربوں کھربوں خواص وعوام تابعین تبع تابعین ائمہ مجتہدین مفسرین محدثین فقہاء فضلاء اس سے کس طرح بے خبر وغیر متنبہ رہے۔ ہر صدی کے مجددین بھی اس کا پتہ نہ لگا سکے ہر دور میں طائفہ منصورہ علی الحق بھی اس کا سراغ نہ لگا سکا ہم ایسا کیوں نہ کر لیں کہ پوری امت کے جمیع علماء وخواص اکابر واسلاف کی تفسیق وتجہیل وتغلیط کے مقابلہ میں صرف آج کے اس ناقد مبتدع ہی کو غلط اور خارج عن الحق قرار دیدیں؟ آج کوئی ماں کا لعل موجودہ اختلافات قراءت کے برخلاف صرف ایک اختلاف ہی کی کمی بیشی کر کے دکھائے اور پھر وہ دیکھے کہ کیا اس کی یہ کمینی حرکت چل گئی؟ اگر نہ چل سکی اور یقیناً نہیں چل سکے گی تو یقین کر لیجئے کہ قرون اولیٰ میں بھی ہرگز تحریف نہیں ہوسکی ہے۔ یہ زمانہ تو قلت علم کا ہے وہ زمانے کثرت علم کے تھے، یہ زمانہ کثرت شر وجہل کا ہے وہ زمانے کثرت خیر وعروج علم کے تھے۔ اگر اختلاف قراءت کے متعلق تحریف آج نہیں چل سکتی تو ماننا پڑے گا کہ ہر زمانہ میں اس سے کہیں بڑھ کر اختلاف قراءت کی منزل طریق کے عین مطابق بکمال طور پر بخوبی حفاظت ہوتی رہی ہے۔

قراآت سبعہ پر اجماع امت کے متعلق چند اقوال علماء:

ا۔ صاحب مصابیح علامہ ابو محمد محی السنہ حسین بن مسعود فراء بغوی اپنی تفسیر کے شروع میں فرماتے ہیں:

فذكرت قراءة هؤلاء ـ أبي جعفر ونافع وابن كثير وابن عامر وأبي عمرو ويعقوب وعاصم وحمزة والكسائي ـ للاتفاق على جواز القراءة بها. [النشر ۱/۳۸]

ترجمہ: میں نے ان قراء سبعہ اور ابو جعفر ویعقوب کی قراآت اس لئے بیان کی ہیں کہ ان کی تلاوت کے جائز ہونے پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

۲۔ علامہ بدر الدین زرکشی فرماتے ہیں:

ان القراآت توقيفية وليست اختيارية وقد انعقد الاجماع على صحة قراءة القراء السبعة

وانهاسنة متبعة ولامحال للاجتهادفيهاوانماكان كذلك لان القراءة سنة مروية عن النبي صلى الله عليه وسلم ولاتكون القراء ةبغيرماروى عنه (البرهان ۱/۳۲۱-۳۲۲)

ترجمہ: یقیناً قراآت توقیفی ہیں اختراعی نہیں، قراء سبعہ کی قراآت کی صحت پر نیز اس بات پر کہ قراءت سنتِ متبوعہ ہے جس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں اجماعِ امت منعقد ہو چکا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ قراءت ایسی سنت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور غیر منقول وجہ کی تلاوت جائز نہیں۔

۳۔ علامہ ابوالقاسم ہذلی متوفی ۴۶۵ھ فرماتے ہیں:

ان الامالة والتفخيم لغتان ليست احداهمااقدم من الاخرى بل نزل القرآن بهماجميعا ......والحملة بعدالتطويل ان من قال ان الله تعالى لم ينزل القران بالامالة احطاواعظم الفرية على الله تعالى وظن بالصحابة خلاف ماهم عليه من الورع والتقى وقداجمعت الامة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم الى يومناهذاعلى الاخلوالقراءة والاقراء بالامالة والتفخيم، ومااحدمن القراء الاروىت عنه امالة قلت او كثرت وهى يعنى الامالة لغة هوازن وبكربن وائل وسعدبن بكر
(كتاب الكامل بحواله منجدالمقرئين ص۵۹-۶۰)

ترجمہ: یقیناً امالہ اور فتح دو ایسے لغات ہیں کہ ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر تقدم و فوقیت حاصل نہیں بلکہ دونوں ہی کے موافق قرآن نازل ہوا ہے، اس کی بابت طویل بحث کا حاصل یہ ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو امالہ پر نہیں اتارا وہ خطاوار ہے اس نے ذات خداوندی پر بڑا اتہام لگایا اور صحابہ کے متعلق ایسا گمان کیا جو ان کی پرہیزگاری و پارسائی کے سراسر برخلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے لے کر ہمارے اس زمانہ تک امالہ و فتح کے پڑھنے پڑھانے اور اخذ کرنے پر پوری امت کا اتفاق ہے اور کوئی قاری بھی ایسا نہیں جس سے امالہ نہ منقول ہو کم ہو خواہ زیادہ اور امالہ ہوازن بکر بن وائل سعد بن بکر کا لغت ہے۔ (ماخوذ از دفاع قراآت)

حواشی وحوالہ جات:

(۱) عن ابن عباس مرفوعا قال: أقرأني جبريل على حرف فراجعته، فلم أزل استزيده ويزيدني حتى انتهى إلى سبعة أحرف. (أخرجه البخاري ج۲ ص۷۴۶، م الحسن)

(۲) وفي رواية مسلم عن أبي ابن كعب بلفظ أن النبي صلى الله عليه وسلم كان عند أضاة بني غفار فأتاه جبريل فقال: إن الله يأمرك أن تقرئ أمتك القرآن على حرف، فرددت إليه أن هون على أمتي۔ وفي رواية له إن أمتي لا تطيق ذلك۔ (صحيح مسلم ج۱ ص۲۷۳، م، آرام باغ كراچی)

(۳) وللترمذي من وجه آخر أنه صلى الله عليه وسلم قال: يا جبريل إني بعثت إلى أمة أميين منهم العجوز والشيخ الكبير والغلام والجارية والرجل الذي لم يقرأ كتابا قط۔ الحديث (جامع الترمذي ج۲ ص۱۲۲ م الحسن)

(۴) وأخرج البخاري عن عمر في قصة طويلة، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن هذا

القرآن أنزل على سبعة أحرف فاقرء وا ماتيسر منه۔ (صحيح البخاری ج۲ ص۷٤۷،م الحسن)

(۵) وقال تعالىٰ : وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراهیم:٤)

(٦) وأخرج البخاری عن عثمان أنه قال للرهط القرشيين الثلاثة :إذا اختلفتم و زيد بن ثابت في شيء من القرآن فاكتبوه بلسان قريش، فإنما نزل بلسانهم۔ ففعلوا۔ (صحيح البخاری ج۲ ص٧٤٦، م الحسن)

(۷) وأخرج أبوداؤد من طريق كعب الأنصاری أن عمر كتب إلى ابن مسعود :أن القرآن نزل بلسان قريش فأقرئ الناس بلغة قريش، لا بلغة هذيل۔ وعن عمر أيضا أنه قال :إذا اختلفتم في اللغة فاكتبوها بلسان مضر۔ (سنن ابی داؤد ج۲ ص٤٢٠،م دهلی)

أخرجه الحافظ في الفتح وعزاه إلى ابن أبي داؤد في المصاحف وزياداته في الفتح صحاح وحسان۔

(۸)وأخرج البخاری وحذيفة أنه أفزعه اختلافهم في القراءة فقال حذيفة لعثمان :يا أمير المؤمنين أدرك هذه الأمة قبل أن يختلفوا في الكتاب اختلاف اليهود والنصاری۔ الخ۔ قال الحافظ :وفي رواية يونس فتذاكروا القرآن فاختلفوا فيه حتى كاد يكون بينهم فتنة۔ وفي رواية عمارة بن عزية أن حذيفة قدم من غزوة، فلم يدخل بيته حتى أتى عثمان، فقال :يا أمير المؤمنين أدرك الناس۔ قال :وما ذاك؟ قال: غزوت أرمينية فإذا أهل الشام يقرء ون بقراءة أبي بن كعب فيأتون بما لم يسمع أهل العراق، وأهل العراق يقرئون بقراءة عبدالله بن مسعود فيأتون بما لم يسمع أهل الشام، فيكفر بعضهم بعضا۔ وأخرج ابن أبي داؤد في المصاحف من طريق أبي قلابة، قال :لما كان في خلافة عثمان جعل المعلم يعلم قراءة الرجل والمعلم قراءة الرجل فجعل الغلمان يتلقون فيختلفون، حتى ارتفع ذلك إلى المعلمين، حتى كفر بعضهم بعضا، فبلغ ذلك عثمان، فخطب فقال :أنتم عندی تختلفون فمن نأى مني من الأمصار أشد اختلافا۔

(۹)وأخرج ابن أبي داؤد بإسناد صحيح من طريق سويد بن غفلة قال:قال علي :لاتقولوا في عثمان إلا خيرا۔ فقال :فوالله ما فعل الذی فعل في المصاحف إلا عن ملأ منا۔ قال :ما تقولون في هذه القراءة فقد بلغني أن بعضهم يقول :إن قراءتي خير من قراءتك وهذا يكاد أن يكون كفرا۔ قلنا :فما ترى؟ قال :أرى أن نجمع الناس على مصحف واحد فلا تكون فرقة ولا اختلاف۔ قلنا :فنِعْمَ ما رأيت۔ (ص ١٦ ج۹،ص٤٢٤ ج۲،م دهلی)

قال الحافظ :وذهب أبوعبيد وآخرون إلى أن المراد بالأحرف السبعة اختلاف اللغات وهو اختيار ابن عطية، وتعقب بأن لغات العرب أكثر من سبعة، وأجيب بأن المراد أفصحها فجاء عن أبي صالح عن ابن عباس قال :نزل القرآن على سبع لغات منها خمس بلغة العجز من هوازن قال :والعجز سعد بن بكر وجشيم بن بكر ونصر بن معاوية وثقيف وهولاء كلهم من هوازن ويقال لهم :عليا هوازن ولهذا قال أبوعمرو ابن العلاء :أفصح العرب عليا هوازن وسفلى تميم يعني بني دارم۔ وأخرج أبوعبيد من وجه آخر عن ابن عباس قال :نزل القرآن بلغة الكعبين، كعب قريش و كعب خزاعة۔ قيل :وكيف ذلك؟ قال :لأن الدار واحدة يعني أن خزاعة كانوا جيران قريش، فسهلت عليهم لغتهم۔ قالوا :أبوحاتم السجستاني نزل بلغة قريش وهذيل وتميم الرباب والأزد وربيعة وهوازن وسعد بن بكر۔اه ونقل أبوشامة عن بعض الشيوخ أنه قال :أنزل القرآن أولا بلسان قريش ومن جاورهم من العرب الفصحاء ثم أبيح لسائر للعرب أن يقرئه بلغاتهم التي جرت عادتهم باستعمالها على اختلافهم في الألفاظ والأعراب ولم يكلف أحد منهم الانتقال من لغتهم إلى لغة أخرى للمشقة ولما كان فيهم من الحمية ولطلب تسهيل تفهيم المراد۔

(۱۰) قال الحافظ :وتتمة ذلك أن يقال :إن الإباحة المذكورة لم تقع بالتشهي -أی أن كل

أحد بفيد الكلمة بمرادفها في لغته -بل المرعى في ذلك السماع من النبي صلى الله عليه وسلم۔(ص٢٤ ج٩،ص٤٢٩ ج٢٠م دهلي)

(١١) وعلى هذا وفيه أيضا أما من أراد قراءته من غير العرب فالاختيار له أن يقرأه بلسان قريش لأنه الأولى وعلى هذا يحمل ما كتب به عمر إلى ابن مسعود لأن جميع اللغات بالنسبة لغير العربي مستوية في التعبير۔ فإذا لابد من واحدة فلتكن بلغة النبي صلى الله عليه وسلم۔ وأما العربي المجبول على لغته فلو كلف قراءته بلغة قريش لعثر عليه التحول مع إباحة الله له أن يقرأه بلغته۔ ويشير إلى هذا قوله في حديث أبي كما تقدم :هون على أمتي۔ قوله :وإن أمتي لا تطيق ذلك۔ قال الحافظ :ويدل على ما قرره (أبوشامة) إنه أنزل أولا بلسان قريش، ثم سهل على الأمة أن يقرأه بغير لسان قريش وذلك بعد أن كثر دخول العرب في الإسلام، فقد ثبت أن ورود التخفيف بذلك كان بعد الهجرة كما تقدم في حديث أبي بن كعب أن جبريل لقي النبي صلى الله عليه وسلم عند أضاة بني غفار۔ الحديث، وهو موضع بالمدينة النبوية) (ص٢٥ ج٩،ص٤٣٠ ج٢٠م دهلي)

(١٢) قال الجزري في النشر :كل قراءة وافقت العربية ولو بوجه ووافقت أحد المصاحف العثمانية ولو احتمالا وصح إسنادها فهي القراءة الصحيحة التي لا يجوز ردها ولا يحل إنكارها بل هي من الأحرف السبعة التي نزل بها القرآن ووجب على الناس قبولها سواء كانت عن الأئمة السبعة أم عن العشرة أم عن غيرهم من الأئمة المقبولين ومتى اختل ركن من هذه الأركان الثلاثة أطلق عليها ضعيفة أو شاذة أو باطلة سواء كانت عن السبعة أم عمن هو أكبر منهم۔ هذا هو الصحيح عند أئمة التحقيق من السلف والخلف صرح بذلك الداني ومكي والمهدوي وأبوشامة۔ وهو مذهب السلف الذي لا يعرف من أحدهم خلافه۔

(١٣)وفي الاتقان للحافظ السيوطي أن القراءة أنواع :

الأول :المتواتر، وهو ما نقله جمع لا يمكن تواطئهم على الكذب من مثلهم إلى منتهاه وغالب القراءة كذلك۔

الثاني :المشهور، وهو ما صح سنده ولم يبلغ درجة المتواتر ووافق العربية والرسم۔ واشتهر عند القراء فلم يعدوه من الغلط ولا من الشذوذ و يقرأ به على ما ذكر ابن الجزري ويفهمه كلام ابن شامة السابق ومثاله ما اختلف الطرق في نقله عن السبعة فرواه بعض الرواة عنهم دون بعض وأمثلة ذلك كثيرة في فرش الحروف من كتب القراءات كالذي قبله۔

الثالث: الآحاد وهو ما صح سنده وخالف الرسم أو العربية أو لم يشتهر إلا اشتهار المذكورة ولا يقرء به وقد عقد الترمذي في جامعه والحاكم في مستدركه لذلك بابا إخراجا فيه كثيرا صحيح الإسناد۔ هـ ملخصا۔ (٨١،١)،(ص٧١ ج١)

(١٤) قال في الشامية :القرآن الذي تجوز به الصلاة بالاتفاق،هو المضبوط في المصاحف الأئمة التي بعث بها عثمان إلى الأمصار وهو الذي أجمع عليه الأئمة العشرة وهذا هو المتواتر جملة وتفصيلا،فما فوق السبعة إلى العشرة غير شاذ،وإنما الشاذ ما وراء العشرة وهو الصحيح۔ هـ ۔ (شامية ص٣٥٨ ج١م رشيديه كوئته)

(١٥)قال أبوالخير محمد بن الجزري :أما كون المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الأحرف السبعة فإن هذه مسألة كبيرة اختلف العلماء فيها، فذهب جماعات من الفقهاء والقراء والمتكلمين إلى أن المصاحف العثمانية مشتملة على جميع الأحرف السبعة ابنوا ذلك على أنه لا يجوز على الأمة أن تهمل نقل شيء من الحروف السبعة التي نزل القرآن بها، وقد أجمع الصحابة على نقل المصاحف

العثمانية من الصحف التي كتبها أبوبكر وعمر، وإرسال كل مصحف منها إلى مصر من أمصار المسلمين وأجمعوا على على ترك ما سوىٰ ذلك، قال هؤلاء :ولا يجوز أن ينهىٰ عن القرائة ببعض الأحرف السبعة ولا أن يجمعوا على ترك شيء من القرآن، وذهب جماهير العلماء من السلف والخلف وأئمة المسلمين إلى أن هذا المصاحف العثمانية مشتملة على ما يحتمله رسمها فقط، جامعة للعرضة الأخيرة التي عرضها النبي صلى الله عليه وسلم على جبريل متضمنة لها، لم تترك حرفا منها۔قلت :وهذا القول هو الذي يظهر صوابه لأن الأحاديث الصحيحة والآثار المشهورة المستفيضة تدل عليه وتشهد له۔ (النشر في القراء ات العشر:ص۳۱ ج۱)

(۱۶)قال العلامة بدرالدين العيني :واختلف الأصوليون هل يقرأ اليوم على سبعة أحرف؟ فمنعه الطبري وغيره وقال: إنما يجوز بحرف واحد اليوم، وهو حرف زيد ونحى إليه القاضي أبوبكر۔وقال أبوالحسن الأشعري:أجمع المسلمون على أنه لا يجوز حظر ما وسعه الله تعالىٰ من القرائة بالأحرف التي أنزلها الله تعالىٰ ولا يسوغ للأمة أن تمنع ما يطلقه الله تعالىٰ، بل هي موجودة في قرائتنا مفرقة في القرآن غير معلومة بأعيانها، فيجوز على هذا وبه قال القاضي :أن يقرأ بكل ما نقله أهل التواتر من غير تمييز حرف من حرف، فيحفظ حرف نافع بحرف الكسائي و حمزة ولا حرج في ذلك۔ (عمدة القاري كتاب الخصومات ج۱۲ ص۲۵۸)

(۱۷)قال القاضي أبوبكر :والسابع اختاره القاضي أبوبكر وقال :الصحيح أن هذه الأحرف السبعة ظهرت واستفاضت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وضبطها عنه الأئمة وأثبتها عثمان والصحابة في المصحف۔ (البرهان في علوم القرآن ج۱ ص۲۲۳)

وأما قول من قال :أبطل الأحرف الستة۔فقد كذب من قال ذلك،بل الأحرف السبعة كلها موجودة عندنا قائمة كما كانت مثبوتة في القراء ت المشهورة المأثور۔(ابن حزم، الفصل في الملل والاهواء والنحل ج۲ ص۷۷،۷۸)

(۱۸) قال ابوالوليد الباجي المالكي :فإن قيل هل تقولون إن جميع هذه السبعة الاحرف ثابتة في المصحف فالقرائة بجميعها جائزة قيل لهم كذلك،نقول:والدليل على صحة ذلك قوله عزوجل: إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۹)ولا يصح انفصال الذكر المنزل من قرائته فيمكن حفظه دونهما، ومما يدل على صحة ما ذهبنا إليه إن ظاهر قول النبي صلى الله عليه وسلم يدل على أن القرآن أنزل على سبعة أحرف تيسيرا على من أراد قرائته ليقرأ كل رجل منهم بما تيسر عليه وبما هو أخف على طبعه وأقرب إلى لغته،لما يلحق من المشقة بذلك المألوف من العادة في النطق۔ونحن اليوم مع عجمة ألسنتنا وبعدنا عن فصاحة العرب أحوج۔ (أبوالوليد الباجي، المنتقى شرح الموطا ج۱ ص۳۴۷)

(۱۹)قال الإمام الغزالي :ما نقل إلينا بين دفتي المصحف على الأحرف السبعة المشهور نقلا متواترا۔ (المستصفى: ج۱ ص۶۵)

(۲۰)قال الملا على القاري :وكأنه عليه الصلوٰة والسلام كشفَ له أن القرائة المتواترة تستقر في أمته على سبع وهي الموجودة الأن المتفق على تواترها، والجمهور على أن ما فوقها شاذ، لا يحل القرائة به۔ (مرقاة المفاتيح: ج۵ ص۱۶)

الإنتباه:

وما قال الملا على القاري والجمهور على أن ما فوقها شاذ الخ، ليس بصحيح لأن ما وراء السبعة ليس بشاذ، بل العشرة كلها متواترة، وما فوقها شاذ وهذا مالا شك فيه كما لا يخفىٰ على أحد، (عبدالقدوس ترمذی غفرله)

(۲۱) قال الشاہ ولی اللہ:
ودلیل بر آنکہ ذکر سبعہ بجہت تکثیر است نہ برائے تحدید اتفاق ائمہ است بر قرائات عشرہ وہر قرآئے را از یں عشرہ دو راوی است و ہر یکے با دیگرے مختلف است پس مرتقی شدہ عدد قرائۃ تا بیست۔ (المصفّٰی ۱۸۷)

(۲۲) قال العلامۃ محمد أنور شاہ کشمیری: واعلم أنهم اتفقوا علی أنه لیس المراد من سبعة أحرف القراءة السبعة المشهورة، بأن یکون کل حرف منها قراءة من تلك القراءات، أعنی أنه لا انطباق بین القراءات السبع والأحرف السبعة کما یذهب إلیه الوهم بالنظر إلیٰ لفظ السبعة فی الموضعین، بل تلك الأحرف والقراءة عموم وخصوص وجهی، کیف، وإن القراءات لا تنحصر فی السبعة، کما صرح ابن الجزری فی رسالة النشر فی القراءة العشر، وإنما اشتهرت السبعة علی الألسنة لأنها التی جمعها الشاطبی۔ ثم اعلم إن بعضهم فهم أن بین تلك الأحرف تغایرا من کل وجه، بحیث لا ربط بینها ولیس کذلك، بل قد یکون الفرق بالمجرد والمزید والأخریٰ بالأبواب، ومرة باعتبار الصیغ من الغائب والحاضر، وطورا بتحقیق الهمزة وتسهیلها، فکل هذه التغییرات یسیرة کانت أو کثیرة حرف برأسه، وغلط من لهم إن هذه الأحرف متغایرة کلها بحیث یتعذر اجتماعها أما إنه کیف عدد السبعة فتوجه إلیه ابن الجزری وحقق أن التصرفات کلها ترجع إلی السبعة، وراجع القسطلانی والزرقانی، بقی الکلام فی أن تلك الأحرف کلها موجودة أو رفع بعضها وبقی البعض فاعلم أن ما قرأه جبریل فی العرضة الأخیرة علی النبی صلی اللہ علیه وسلم کله ثابت فی مصحف عثمان، ولما یتعین معنی الأحرف الستة منها وبقی واحد فقط (فیض الباری: ج۳ ص ۳۲۱، ۳۲۲)

(۲۳) قال المحقق العلامة محمد زاهد الکوثری: والأول رأی القائلین بأن الأحرف السبعة کانت فی مبدء الأمر ثم نسخت بالعرضة الأخیرة فی عهد النبی صلی اللہ علیه وسلم فلم یبق إلا حرف واحد ورأی القائلین بأن عثمان جمع الناس علی حرف واحد ومنع من الستة الباقیة للمصلحة، وإلیه نحی ابن جریر وتهیاه ناس فتابعوه لکن هذا رأی خطیر، قام ابن حزم بأشد الکبیر علیه فی الفصل وفی الأحکام، وله الحق فی ذلك، والثانی رأی القائلین بأنها هی الأحرف السبعة المحفوظة کما هی فی العرضة الأخیرة الخ۔ (مقالات الکوثری: ص ۲۰، ۲۱، مطبعة الانوار قاهره ۱۳۷۲ھ) فقط وفی هذا کفایة لمن له ادنیٰ درایة واللہ ولی التوفیق والهدایة۔

احقر عبد القدوس ترمذی غفرلہ......جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا......۲۱ رصفر الخیر ۱۴۳۶ھ

مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم

احسان وتصوف......اور......غامدی صاحب کی بدفہمی

......حضرت مفتی صاحب مدظلہم کے رسالہ "تحفۂ غامدی" سے انتخاب......

غامدی صاحب عربی اشعار کی کچھ واقفیت اور اسلوب بیان کی نزاکتوں کے اختراع کو اپنی پونجی بنا کر عالمگیر منصف بن گئے ہیں اور ان کے قلم نے یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا ہے کہ امام غزالی، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید اور سلسلہ تصوف سے منسلک تمام ہی حضرات عالمگیر ضلالت وگمراہی میں مبتلا تھے۔

لکھتے ہیں:

"اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کی ہدایت یعنی اسلام کے مقابلے میں تصوف وہ عالمگیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متاثر کیا ہے"۔[برہان:۱۵۶]

غامدی صاحب کے ایسا کہنے کی وجہ دراصل ان کی بدفہمی ہے۔صوفیاء کی بعض باتوں کی حقیقت یہ کچھ سمجھ نہ پائے اور جو کچھ غلط سلط سمجھا اسی پر اپنا فیصلہ دے دیا۔

بات یہ ہے کہ یہ انسانی فکری تاریخ کا پرانا سوال ہے کہ عالم کی حقیقت کیا ہے اور خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا ہے؟ دیگر مذاہب والوں نے بھی اس بارے میں خیال آرائی کی ہے اور فلاسفہ بھی اس عقدہ کو حل کرنے میں لگے رہے۔ محققین صوفیاء نے قرآن وسنت کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے اس سوال کا جواب دیا اور اس عقدہ کو حل کیا اور اس حل کا نام وحدۃ الوجود مشہور ہوا۔

ہمارے مادی عالم کی حقیقت کیا ہے؟ سائنسدان کہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے صرف Energy اور توانائی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ توانائی کہاں سے آئی؟

ہم آگے کچھ کہیں، اس سے پہلے اس پر غور کریں کہ انسان جب عالم خیال میں عمل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اپنی ذہن کی دنیا میں مثلاً بادشاہی مسجد کو پیدا کروں تو وہ ارادہ کرتا ہے اور بغیر کسی پتھر چونے کے محض اپنے علم اور اپنی معلومات کی بنیاد پر بادشاہی مسجد کو اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے۔اس طرح وہ اپنے علم میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر قسم کی چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔فلاسفہ اسلام اور صوفیہ کا نظریہ ہے کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں اس کی

قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی شے کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے اور یہی انسان کا تخلیقی عمل ہے۔

انسان کی خیالی و علمی مخلوقات کے ساتھ اس کے تعلقات ملاحظہ ہوں۔

(۱)......ہمارے خیال و علم میں بھی کوئی مادہ نہیں ہوتا محض اپنے ارادہ سے اپنی معلومات کو ہم وجود عطا کرتے ہیں۔

ہماری تخلیقی قوت چونکہ ضعیف ہوتی ہے اس لئے عام طور سے ہماری ذہنی مخلوقات کا وجود صرف ذہنی ہوتا ہے خارجی نہیں ہوتا۔ صرف ذہنی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم عام طور سے کسی خیالی مخلوق پر چند سیکنڈ سے زیادہ اپنی توجہ قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن وہ لوگ جو دیر تک کسی ایک نقطہ پر توجہ کو مرتکز کرنے کی مشق بہم پہنچا لیتے ہیں بتدریج ان کی ذہنی مخلوقات بھی خارجی وجود کا بھیس بدلنے لگتی ہیں حتیٰ کہ دوسروں کو بھی اس کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کی نظر بندی سے رسیاں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگے۔ بعض بیماریوں میں Hallucinations یعنی خیالات جسمانی تشکلات اختیار کر لیتے ہیں جن کو آدمی اپنے حواس سے محسوس کرتا ہے۔

(۲)......صرف توجہ ہٹا لینے سے ہماری خیالی مخلوقات کوئی مادہ چھوڑے بغیر معدوم ہو جاتی ہیں۔

(۳)......ہماری خیالی مخلوقات ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے قیام و بقا میں بھی ہماری توجہ اور التفات کی محتاج ہوتی ہیں۔

(۴)......زید اپنی تخلیقی قوت سے جس وقت عالم خیال میں بادشاہی مسجد کو پیدا کرتا ہے تو نہ زید بادشاہی مسجد بن جاتا ہے اور نہ ہی بادشاہی مسجد زید بن جاتی ہے۔ اس کے باوجود خیالی اور علمی بادشاہی مسجد کا وجود زید کے وجود اور ارادہ سے جدا نہیں ہے۔

(۵)......زید جس وقت اپنی خیالی بادشاہی مسجد کو ذہن میں پیدا کرتا ہے تو اس کے کسی بھی حصہ سے اپنے آپ کو غائب نہیں پاتا۔

(۶)......زید اپنی ذہنی و علمی مسجد کے مینار کو توڑ دے یا اس کے کسی حصہ میں کوئی خوشبو فرض کر لے تو اس توڑ پھوڑ اور خوشبو کا اثر زید پر نہیں پڑتا۔

(۷)......زید جب خیالی بادشاہی مسجد کو پیدا کرتا ہے تو جہاں زید ہوتا ہے وہیں بادشاہی مسجد بھی ہوتی ہے۔

اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ ازل میں صرف اللہ تعالیٰ تھے اور ان کے ساتھ ان کے لامحدود کمالات و

صفات تھے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات وصفات کا علم تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں اپنی متعدد صفات کی بنیاد پر لاتعداد اشیائے عالم کا تصور کیا مثلاً انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم، صفت کلام، صفت قدرت، صفت سمع و بصر، صفت حیات وغیرہ بہت سی صفات و کمالات کو ایک خاص مقدار میں اور ایک خاص ترتیب میں تصور کیا۔ ان کو اسمائے کونیہ اور اعیان ثابتہ کہا جاتا ہے اور ان کے تصور کرنے کو وہ تواناۓ سمجھے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ پھر اس ترتیب کے ظہور کے لئے ایک وقت بھی مقرر فرما دیا۔ جب وہ مقررہ وقت آتا ہے تو علم الٰہی میں موجود یہ صورتیں شفاف آئینہ کی طرح پھیلے ہوئے نور کے وجود منبسط پر عکس کی طرح نظر آنے لگتے ہیں۔

جیسے آئینہ میں جو عکس نظر آتا ہے وہ محض خیال اور وہم ہوتا ہے اس کا مستقل وجود نہیں ہوتا اور اس کی حقیقت وہ جسم ہوتا ہے جو آئینہ کے محاذی ہوتا ہے۔ اسی طرح اصل حقائق تو وہ اعیان ثابتہ ہیں جو علم الٰہی میں موجود ہیں اور سرسری نظر میں ہمیں خارج میں جو اشیاء نظر آتی ہیں وہ دراصل ان حقائق کے عکوس ہیں۔ خارجی وجود تو حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو حاصل ہے۔ اور اعیان ثابتہ کو اس حیثیت سے کہ وہ صفت علم ہے ان کو بھی خارجی وجود حاصل ہے۔ ان کے علاوہ اس طرح کا سا خارج میں موجود کوئی اور نہیں ہے۔ مذکورہ بالا امور کی بنا پر صوفیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی طرح کا کسی کو خارج میں ماننا شرک ہے۔ یہ نہیں کہ وہ عالم کے وجود کو نہیں مانتے بلکہ ذات وصفات کے مقابلہ میں ان کے وجود کو عکس کی حیثیت دیتے ہیں۔

یہ وجود منبسط کیا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ سے صادر ہونے والا سب سے پہلا نور ہے۔ اس کو ایسے خیال کریں جیسے آدمی کے لئے اس کا ذہنی میدان یا اس کی خواب کی دنیا کہ ان کا صدور آدمی سے ہوتا ہے اور ان کا وجود آدمی کے وجود سے ہوتا ہے لیکن ان کا وجود بعینہ آدمی کا وجود نہیں ہوتا۔

اس کے باوجود آدمی نہ تو اپنے ذہنی میدان اور اپنی خواب کی دنیا کے کسی حصہ سے جدا ہوتا ہے اور نہ ہی آدمی اس ذہنی میدان اور خواب کی دنیا کی اشیاء میں حلول کرتا ہے اور نہ ہی ان کے ساتھ متحد ہوتا ہے۔

کچھ ایسا ہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا وجود منبسط پر پھیلے ہوئے اس عالم کے ساتھ سمجھیں۔

یہ بھی سمجھیں کہ جیسے آئینہ ان عکوس کے قیام اور تعین کے لئے جو اس میں نظر آتے ہیں اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس اعتبار سے آئینہ کو ان عکوس کا قیوم کہا جا سکتا ہے اسی طرح وجود منبسط کو بھی اشیاء عالم کا قیوم کہا جا سکتا ہے۔

یہ صوفیہ کی ذوقی اور کشفی تحقیق ہے جو بہرحال قرآن وسنت کے منافی نہیں ہے۔

لیکن غامدی صاحب اگر کچھ نہ بولیں تو لوگوں کو ان کے محقق ہونے کا کیسے پتہ چلے۔ لکھتے ہیں:

''قرآن کی رو سے توحید بس یہ ہے کہ اللہ صرف اللہ ہی کو مانا جائے جو ان تمام صفات کمال سے متصف اور عیوب ونقائص سے منزہ ہے جنہیں عقل مانتی اور جن کی وضاحت خود اللہ پروردگار عالم نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے کی ہے''۔ [برہان:۱۴۶]

صوفیہ کے نظریہ کی جو تفصیل ہم نے اوپر ذکر کی وہ ذرہ برابر بھی غامدی صاحب کی بیان کی ہوئی توحید کے معارض نہیں لیکن غامدی صاحب یہ کہنے پر بضد ہیں کہ ''تصوف اس دین کے اصول ومبادی سے بالکل مختلف ایک متوازی دین ہے جس کی دعوت قرآن مجید نے ابن آدم کو دی ہے''۔ [برہان:۱۴۶] اس لئے لکھتے ہیں:

''اہل تصوف کے دین میں یہ (یعنی غامدی صاحب کا ذکر کردہ) توحید کا پہلا درجہ ہے۔ وہ اسے عامۃ الناس کی توحید قرار دیتے ہیں۔ توحید کے مضمون میں اس کی اہمیت ان کے نزدیک تمہید سے زیادہ نہیں۔ توحید کا سب سے اونچا درجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ موجود صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مانا جائے جس کے علاوہ کوئی دوسری ہستی درحقیقت موجود نہیں ہے۔ تمام تعینات عالم، خواہ وہ محسوس ہوں یا معقول، وجود حق سے منتزع اور محض اعتبارات ہیں۔ ان کے لئے خارج میں وجود حق کے سوا اور کوئی وجود نہیں ہے۔ ذات باری ہی کے مظاہر کا دوسرا نام عالم ہے۔ یہ باعتبار وجود خدا ہی ہے اگرچہ اسے تعینات کے اعتبار سے خدا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی ماہیت عدم ہے۔ اس کے لئے اگر وجود ثابت کیا جائے تو یہ شرک فی الوجود ہوگا لا موجود الا اللہ سے اسی کی نفی کی جاتی ہے''۔ [برہان:۱۴۸]

اوپر ہم نے وجود منبسط کی حقیقت ذکر کی تھی۔ اشیائے عالم کی اصل ہونے کی وجہ سے اس کو قیوم اور مابہ التعین بھی کہتے ہیں۔ اس کے برعکس غامدی صاحب عدل وانصاف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کی حقیقت یہ بتاتے ہیں۔

''مابہ التعین یعنی جس سے کوئی چیز موجود ہوتی ہے مثلاً لوہے سے تلوار اور چھری وغیرہ''

[برہان:۱۵۳]

یعنی ذات باری مرتبہ وجود منبسط میں۔ یہ ذات باری کا وہی مرتبہ ہے جسے ابن عربی ظاہر الوجود کہتے ہیں۔ اس مرتبہ میں ان کے نزدیک ذات باری کے لئے عالم کے ساتھ وہ نسبت وجود میں آتی ہے جو مثلاً لوہے کو اس تلوار کے ساتھ جو اس سے بنائی جاتی ہے''۔ [برہان:۱۵۳]

غامدی صاحب نے ان عبارتوں میں جو غلطیاں کی ہیں ہم انہیں کھول کر بیان کرتے ہیں۔

(۱)......صوفیہ جسے عامۃ الناس کی توحید یا توحید کا پہلا درجہ کہتے ہیں وہ خود اس کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس کو

مانتے ہیں۔توحید کے اوپر کے جو مدارج صوفیہ بیان کرتے ہیں وہ اس کے معارض نہیں اور نہ ہی قرآن و سنت کی نصوص میں کوئی ایسی بات مذکور ہے جو ان کے خلاف ہو۔

(۲)......غامدی صاحب نے لکھا کہ توحید کا سب سے اونچا درجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ موجود صرف اللہ ہی کو مانا جائے جس کے علاوہ کوئی دوسری ہستی در حقیقت موجود نہیں۔صوفیہ یہ تو نہیں کہتے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسری ہستی سرے سے موجود نہیں، ورنہ پھر آخر صوفیہ اپنا وجود کیسے ثابت کرتے، حالانکہ ابن عربی ہوں یا غزالی ہوں وہ اپنا وجود مان کر ہی اپنے افکار پیش کرتے ہیں۔ان کی مراد تو فقط یہ ہے کہ جیسا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو حاصل ہے ویسا وجود اشیائے عالم کو حاصل نہیں۔ان کے مقابلہ میں اشیائے عالم کا وجود عکوس کی سی حیثیت رکھتا ہے۔آخر خود اپنی ذات کے اعتبار سے عکس بھی تو وجود رکھتا ہے۔

(۳)......غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ صوفیہ کے نزدیک عالم باعتبار وجود خدا ہی ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔صوفیہ خدا اور عالم کے درمیان نہ تو اتحاد کے قائل ہیں اور نہ ہی حلول کے قائل ہیں پھر غامدی صاحب کس بنیاد پر یہ بات ان کی طرف منسوب کرتے ہیں کہ وجود کے اعتبار سے عالم خدا ہی ہے۔زید جب ذہن میں بادشاہی مسجد کا تصور کرتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہے کہ ذہنی بادشاہی مسجد وجود کے اعتبار سے زید ہے۔

(۴)......وجود منبسط کی حقیقت ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ امکانی وجود کا ایک پھیلاؤ ہے جو سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے صادر ہوا اور اس کی قریب ترین مثال ہم ذہن کے میدان یا خواب کی دنیا سے دے سکتے ہیں۔خواب کی دنیا یا ذہن کا میدان جب خود زید نہیں ہے تو وجود منبسط کب خدا ہو سکتا ہے۔لیکن غامدی صاحب یہ کہنے پر بضد ہیں کہ صوفیہ کے نزدیک ذات باری کے لئے عالم کے ساتھ وہ نسبت وجود میں آتی ہے جو مثلاً لوہے کو اس تلوار کے ساتھ جو اس سے بنائی جاتی ہے یعنی دوسرے لفظوں میں جیسے لوہے سے تلوار اور چاقو بنتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات اشیائے عالم کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

برا ہو اس بدفہمی کا جس نے غامدی صاحب کو حق و توحید کے درخشندہ ستاروں پر کفر وضلالت کی تاریک مہریں لگانے پر مجبور کر دیا لیکن کیا ایسی باتوں سے کہیں روشنی چھپائی جا سکتی ہے۔

یہ تو توحید کے بارے میں غامدی صاحب کے فہم کا حاصل تھا۔اب ذرا نبوت کے بارے میں بھی ان کے فرمودات سن لیجئے۔لکھتے ہیں:

”قرآن کی رو سے نبوت محمد عربی ﷺ پر ختم ہو گئی۔اس کے معنی بالبداہت یہی ہیں کہ اب نہ کسی کے لئے وحی والہام اور مشاہدہ غیب کا کوئی امکان ہے اور نہ اس بنا پر کوئی عصمت وحفاظت اب کسی کو حاصل ہو

سکتی ہے۔ختم نبوت کے یہ معنی خود نبی ﷺ نے بالصراحت بیان فرمائے ہیں۔آپ کا ارشاد ہے۔

لم يبق من النبوة إلا المبشرات. قالوا و ما المبشرات. قال الرويا الصالحة.

نبوت میں سے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں۔لوگوں نے پوچھا یہ مبشرات کیا ہیں۔نبی ﷺ نے فرمایا اچھا خواب۔

اہل تصوف کے دین میں یہ سب چیزیں اب بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ان کے نزدیک وحی اب بھی آتی ہے فرشتے اب بھی اترتے ہیں۔عالم غیب کا مشاہدہ اب بھی ہوتا ہے اور ان کے اکابر اللہ کی ہدایت اب بھی وہیں سے پاتے ہیں جہاں سے جبریل امین اسے پاتے اور جہاں سے یہ کبھی اللہ کے نبیوں نے پائی تھی۔

ان اکابر کا الہام ان کی عصمت کی وجہ سے قرآن مجید ہی کی طرح ہر شائبہ باطل سے پاک اور ہر شبہ سے بالا ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک مقامات وہبیہ میں سے پہلے مقام پر فائز ہستی اگر نبی کی مقلد بھی بظاہر نظر آتی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ اسے غیب سے اس کی تائید کا حکم دیا جاتا ہے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ ہدایت الٰہی اور علوم غیب کو پانے کے لئے کسی نبی یا فرشتے کی محتاج نہیں ہوتی۔

یہ ہستی جب زمین پر موجود ہوتی ہے تو حق وہی قرار پاتا ہے جو اس کی زبان سے نکلتا ہے اور اس کے وجود سے صادر ہوتا ہے۔قرآن وحدیث کی حجت بھی اس کے سامنے اس کی اپنی حجت کے تابع ہوتی ہے۔

چنانچہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی طرح ان کے بعض اکابر بھی آسمان پر گئے،تجلیات کا نظارہ کیا اور وہاں آپ ہی کی طرح مخاطبہ الٰہی سے سرفراز ہوئے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کامل کی حیثیت سے نبی ﷺ ہی ہر زمانے میں ان اکابر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔وہ بالصراحت کہتے ہیں کہ ختم نبوت کے معنی صرف یہی ہیں کہ منصب تشریع اب کسی شخص کو حاصل نہ ہو گا۔نبوت کا مقام اور اس کے کمالات اسی طرح باقی ہیں اور یہ اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے بعد وہ آگے بڑھتے ہیں اور حریم نبوت میں یہ نقب لگانے کے بعد...... یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ، کا نعرہ مستانہ لگاتے ہوئے لامکاں کی پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔اس وقت ان کے علم وتصرف کا عالم کیا ہوتا ہے۔

چنانچہ خدا کی بادشاہی میں وہ اس شان سے اس کے شریک ہو جاتے ہیں کہ خامہ تقدیر کو لوح محفوظ پر لکھتے ہوئے ہر لحظہ دیکھتے،دل کے خیالات کو جانتے،اس عالم کی صبح وشام تھامتے،سنبھالتے اور عالم امر میں ذات خداوندی کا آلہ بن جاتے ہیں۔[برہان:ص 157-167 بحذف حوالجات]

توحید کی طرح نبوت کے میدان میں بھی غامدی صاحب نے صوفیہ کے بارے میں اپنی بدفہمی کا بھر پورا اظہار کیا ہے ذیل میں ہم ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

(۱)...... یہ حدیث کہ نبوت سے صرف مبشرات باقی رہ گئے ہیں اور ان سے مراد اچھا خواب ہے اس سے غامدی صاحب کا اس پر استدلال کرنا کہ الہام اور کشف اور مشاہدہ غیب کی اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی باطل ہے۔ کیونکہ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے نبی ﷺ نے فرمایا:

ولقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احد فانه عمر.

تم سے پہلی امتوں میں محدث یعنی ایسے لوگ ہوتے تھے جن سے فرشتے باتیں کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی ایک بھی ایسا ہے تو وہ عمر ہیں۔

اس حدیث کا مقصد یہی بتانا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی فرشتے باتیں کرتے ہیں۔ اور نبی ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ان کا یہ وصف صرف میری حیات تک ہے۔ بلکہ ان کا یہ وصف زندگی بھر کا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث مبشرات والی حدیث کے لیے مزید تخصیص کا باعث ہے۔ علاوہ ازیں کشف، الہام اور مشاہدہ غیب نبوت کا خاصہ نہیں ہے۔ نبوت کا خاصہ تو وحی ہے جو اس کلام الٰہی کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی طرف اتارا گیا ہے۔ ختم نبوت کی وجہ سے خواص نبوت کا انقطاع تو معقول ہے غیر خواص کے انقطاع کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات انسانی تجربات کے بھی خلاف ہے اگر چہ یہ تجربات خاص خاص لوگوں کو ہوئے ہوں مثلاً شاہ ولی اللہ کو اور مجدد الف ثانی کو اور امام غزالی کو رحمہم اللہ۔ غرض ان تمام وجوہ سے یہ بات واضح ہے کہ حدیث کا مطلب صرف انقطاع وحی کو ذکر کرنا ہے اور انکشاف غیب کے دیگر ذرائع جو خواص نبوت نہیں ہیں مثلاً اچھے خواب اور کشف اور الہام وغیرہ یہ مستثنیٰ ہیں۔ آخر اچھا خواب بھی تو انکشاف غیب ہی کا ذریعہ ہے۔

(۲)...... فرشتوں کی بات سننے اور ان سے فائدہ اٹھانے کو یہ کہنا کہ وحی آتی ہے بہت ہی بڑی نادانی ہے اور وحی کے شرعی معنی سے ناواقفی کی بڑی دلیل ہے۔ وحی تو صرف اس کلام الٰہی کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی طرف نازل کیا گیا ہو۔

جب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ صرف وحی خاصہ نبوت ہے اور وحی اس کلام الٰہی کو کہتے ہیں جو کسی نبی کی طرف نازل کیا گیا ہو تو کسی غیر نبی کا فرشتوں کو دیکھنا یا ان کی بات سننا یا اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا نظارہ کرنا یا باذن خداوندی کسی امر غیب کو جان لینا اگر چہ لوح محفوظ پر نظر کر کے ہو یا اس کا آسمان کی سیر کرنا یا اللہ تعالیٰ کا اس سے گفتگو کرنا۔ ان باتوں کی وجہ سے یہ الزام دھرنا کہ وہ غیر نبی حریم نبوت میں نقب لگا چکا کس قدر

انصاف سے بعید ہے۔

(۳)......غامدی صاحب کا یہ اعتراض کہ یہ اکابر عصمت کے بھی مدعی ہیں تو اس کی حقیقت شاہ اسماعیل شہید اپنی کتاب عبقات میں یوں دیتے ہیں۔ عبقات ان کتابوں میں سے ہے جس کے بکثرت حوالے نقل کر کے غامدی صاحب نے اپنے مضمون ''اسلام اور تصوف'' میں صوفیہ کی گمراہی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

''بعض لوگوں کو اس مسئلہ پر شدت سے اصرار ہے کہ پیغمبروں کے سوا عصمت کی صفت کا انتساب کسی دوسرے کی طرف جائز نہیں ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس سے کیا مطلب ہے؟ اگر یہ غرض ہے کہ پیغمبروں کے سوا کسی دوسرے کے لیے عصمت کی صفت شریعت سے ثابت نہیں تو علاوہ اس اعتراض کے یعنی آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو یہ فرمایا ہے کہ الحق ینطق علی لسان عمر (یعنی حق عمر کی زبان پر بولتا ہے) یا حضرت علی کے متعلق فرمایا دار الحق مع علی حیث دار (یعنی علی کے ساتھ حق گھوم گیا جدھر بھی علی گھومے) پیغمبر کے ان اقوال کی یا ان ہی جیسے دوسرے اقوال جن کا مفاد بھی یہی ہے ان سب کی خواہ مخواہ تاویل کرنی پڑے گی۔

اور اگر ان کی غرض یہ ہے کہ واقعہ میں پیغمبروں کے سوا عصمت کی صفت کسی دوسرے انسان کے لیے ثابت نہیں ہو سکتی تو ظاہر ہے کہ اس دعوی کے اثبات میں دلیل پیش کرنا ان کا فرض ہے کیونکہ شرعی طور پر زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ شریعت پیغمبروں کے سوا دوسروں کی عصمت کے متعلق خاموش ہے، لیکن کسی چیز سے خاموشی کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ شریعت اس کی منکر ہے۔

(علاوہ ازیں) مسئلہ میں کچھ تفصیل بھی (ہو سکتی) ہے یعنی عصمت کی دو قسمیں ہیں: ایک عصمت مطلقہ جس کا مطلب یہ ہے کہ (زندگی کے سارے شعبوں) اقوال و اعمال و افعال و علوم میں عصمت کو ثابت کیا جائے اور دوسری قسم عصمت مقیدہ کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خاص خاص قسم کے افعال و اعمال و اقوال و علوم میں عصمت کو ثابت کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ جس منصب کے فرائض اس شخص کے سپرد ہوئے ہیں اس منصب سے جن امور کا تعلق ہے ان میں وہ معصوم ہوتا ہے یعنی غلطی ان خاص امور میں اس سے صادر نہیں ہو سکتی......''۔ [عبقہ:۱۱، اشارہ:۴]

اس کا حاصل یہ ہے کہ عصمت مطلقہ نبی کو حاصل ہو اور عصمت مقیدہ کسی ولی کو حاصل ہو۔

(۴)......غامدی صاحب نے ابن عربی پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ ان کے نزدیک ختم نبوت کے معنی صرف یہی ہیں کہ منصب تشریع اب کسی شخص کو حاصل نہ ہوگا۔ نبوت کا مقام اور اس کے کمالات اسی طرح باقی ہیں اور یہ اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ غامدی صاحب یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ابن عربی وغیرہ کے

نزدیک صاحب شریعت نبی تو نہیں البتہ ایسا نبی ہوسکتا ہے جو صاحب شریعت نہ ہو۔ غامدی صاحب اگر ابن عربی کی فتوحات کا یہ ٹکڑا بھی ملاحظہ کر لیتے تو شاید ان کو بہتر فیصلہ کرنے کی توفیق ہوتی۔

"اعلم أن الملک یاتی النبی بالوحی علی حالین تارة ینزل علی قلبه و تارة یاتیه فی صورة جسدیة من خارج ...... و هذا باب أغلق بعد موت محمد ﷺ فلا یفتح لأحد إلی یوم القیامة ولکن بقی للأولیاء وحی الإلهام الذی لا تشریع فیه......

[باب: ۱۴]

فرشتہ نبی پر دو حالت میں وحی لاتا ہے۔ کبھی تو اس کے قلب پر نازل ہوتا ہے اور کبھی اس کے پاس خارج سے صورت جسدیہ میں آتا ہے...... یہ ایک باب ہے جو وفات نبوی کے بعد بند کر دیا گیا ہے اور قیامت تک کسی کے لئے نہ کھلے گا۔ لیکن اولیاء کے لئے وہ وحی جس کی حقیقت الہام ہے باقی رہ گئی ہے جس میں تشریع (یعنی احکام) نہیں ہیں۔

لایصح لأحد منا دخول مقام النبوة [باب: ۴۶۲]

ہم (اولیاء) میں سے کسی کو مقام نبوت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔

البتہ کمالات نبوت تو وہ اوصاف نبی ہیں جن کی تحصیل امتیوں کے لئے مطلوب ہے۔ ہاں اس درجے تک جو نبی کو حاصل تھے امت کے لئے تحصیل ممکن نہیں۔

(۵)......سورہ کہف میں حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں صراحت ہے کہ وہ عالم امر میں ذات خداوندی کے آلہ اور غلام تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے ہی کسی اور کو بھی بنالیں تو کیا مستبعد ہے۔ لیکن غامدی صاحب کو قرآن کی یہ بیان کردہ غلامی خدا کی بادشاہی میں شرکت نظر آتی ہے اور یہ غامدی صاحب کی دینی بصیرت کے انتہائی ضعف پر واضح دلیل ہے۔ ☆☆☆☆

شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمٰن سومرو مد ظلہم

اسلام و تصوف کا صحیح تصور......اور......جاوید غامدی

احقر کی نظر میں جاوید غامدی صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اسلام پر بعض اہل عقل کے اعتراضات دیکھ کر ہتھیار ڈال دیئے اور بے بس ہو کر ان کو مطمئن کرنے کے لیے دین میں تحریفات کو اپنا شیوہ بنایا اور دین کے اصلی حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ دین میں عقل کے گھوڑے دوڑانے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے نالی کے پانی پہ تنکا ہو، جس پر مکھی بیٹھ کر تیرنے لگے اور تصور کرے کہ میں دریائے فرات کی سیر کر رہی ہوں۔ انسان اور دیگر تمام حیوانات میں مابہ الامتیاز عقل انسانی ہے، اِس قوت کا اصل کام یہی ہے کہ احساسات اور حواس سے متصورہ اشیاء جب اس کے محل میں داخل ہوتی ہیں تو ادراک صحیح حاصل ہوتا ہے اور اس کو دل کے پاس آ کر مرتبہ تصدیق حاصل ہوتا ہے اور اشیائے کاذبہ کا اِدراک خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے عقل کے لیے محل قلب کو بنایا، فرمایا: "لهم قلوب لا يفقهون بها" [الأعراف: ۷۹]. (ترجمہ: اُن کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں) حیوانوں میں مراتب 'شعور' کے لحاظ سے اور انسانوں میں "عقل اور علم" کے اعتبار سے ہیں۔ قرآن کریم نے انسانیت کو آفاق اور انفس میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی، جس کے بعد وہ بزبان قال وحال یہی کہے گا کہ "ربنا ما خلقت هذا باطلا، سبحنك فقنا عذاب النار" [آل عمران: ۱۹۱]. (ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا، آپ [ایسے فضول کام سے] پاک ہیں، پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجیے۔) اِس آیت کو گہری نظر سے دیکھا جائے تو دو چیزیں سامنے آتی ہیں:

۱......ایک وہ طبقہ ہے جن کا مشغلہ نظام ارضی وفلکی کی تحقیقات ہے، وہ اپنی تحقیقات کی روشنی میں اتنا ہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ نظام باطل اور بے فائدہ نہیں ہے۔

۲......اور ایک طائفہ وہ ہے جو اس سے آگے کی ترقی کر کے حق سبحانہ وتعالیٰ کی خالقیت کے تصور کے ساتھ تسلیم ورضا اور انقیاد باطنی کی دولت سے مالا مال ہوگا اور پکار اُٹھے گا: "سبحانك فقنا عذاب النار".

طائفہ اولی نے عقل کو استعمال کیا، لیکن خالق تک رسائی حاصل نہیں کی۔ جبکہ طائفہ ثانیہ تصدیق کے مراتب تک پہنچا۔ پہلا طبقہ ایمان کی دولت سے عاری ہے اور دوسرا مالا مال۔ جس سے صاف واضح ہے

کہ عقل اگر دل کے میدان میں اتر کر تسلیم و رضا کے نشانات (مقامات) طے نہ کرے تو اِس عقل کا دین میں کوئی فائدہ نہیں۔"فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التى فى الصدور"[الحج:٤٦]. (ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دِل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔) سائنسی تحقیقات کرنے والوں کو اگر قلب کے ذریعہ حق تک رسائی نہ ہوئی تو سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے دل اندھے ہیں اور صحیح اِدراک کی صلاحیت اُن میں مفقود ہے۔

غامدی صاحب کی دین میں عقلی گھوڑے دوڑانے کی روش اُن اہل عقول سے مختلف نہیں جو قرون اولیٰ سے یونانی اور الحادی نظریات سے متاثر ہو کر احکام الٰہی سے کھیلنے لگے اور انہیں عقل کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی فاسد کر کے نہ صرف ہدایت والے راستے سے کوسوں دور ہو گئے بلکہ قعر ضلالت میں ایسے گرے کہ پھر واپس نہ آسکے۔ غامدی صاحب اسلام اور تصوف اور توحید کے معنی تو کھول کر بیان کرتے ہیں، لیکن عقل کا معنی کیا ہے؟ اس سے بحث نہیں کرتے۔ اس کے سمجھنے میں شاید ظلمات کے پردے چھا جاتے ہیں! عقل سمجھنے کو کہتے ہیں دوسرے پر اپنی سمجھ مسلط کرنے کو نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معصوم جماعت انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والتسلیمات کو منتخب کیا اور سراپا ہدایت والے احکامات وحی کا مرکز ان کے قلوب کو بنایا۔ تمام انسانیت کو عقل دے کر اس معصوم جماعت سے سمجھنے کا پابند کیا۔ عام انسانوں کے قلوب محل ایمان تو ہیں یا ہو سکتے ہیں لیکن مرکز وحی نہیں ہو سکتے۔ اگر ہر انسان میں یہ صلاحیت رکھنی منظور ہوتی تو سارے احکامات الٰہی ہر انسان کے دماغ میں اللہ تعالیٰ ڈال دیتا۔ جب ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ایک انسان کو کس طرح یہ اجازت ہو سکتی ہے کہ اپنا عقلی نظریہ دوسروں پر مسلط کرے؟ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ طریقہ بالکل غلط ہے اور جو اس راہ پر چلنے کی کوشش کریں گے وہ بالآخر مبتلائے عذاب ہوں گے اور رو رو کر پکاریں گے: "لو كنا نسمع او نعقل ما كنا فى اصحب السعير". (اگر ہم اپنے آپ میں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتے تو (آج) جہنمیوں کی جماعت میں نہ ہوتے۔) "فاعترفوا بذنبهم". وہاں اپنے اِس گناہ کا اعتراف کریں گے۔ بہتر ہے کہ وہاں کے بجائے یہاں ہی اعتراف گناہ کر کے عقل کی پیروی چھوڑ دیں اور وحی الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم ہو جائیں۔ کیونکہ محض عقل کی اتباع نے ہمیشہ اعتزال، اِنکارِ حدیث اور اِنکارِ معجزات کا بیج ہی بویا، اور الحاد و زندقہ کے راستے ہموار کیے۔ اس لیے اِس سے بچنا اور احتراز کرنا ضروری ہے۔

غامدی صاحب نے دین کے تمام احکامات حتیٰ کہ قرآن و سنت کی طرح ''تصوف'' کو بھی اپنی عقل پر پرکھنے کی کوشش کی اور زبردست ٹھوکریں کھائیں۔ ذیل میں غامدی صاحب کی بعض عقلیات اور تصوف پر ان کے چند اعتراضات کا سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

غامدی صاحب اپنی کتاب ''برہان'' [ص:۱۸۱] میں لکھتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''توحید کا تصور اور اِلٰہ کا تصور وہی ہے جسے عقل مانے۔ اور جس کی تشریح انبیاء نے کی۔ الخ''

یہ تو یقیناً تسلیم ہے (کہ توحید اور الٰہ کا تصور وہی ہے جس کی تشریح انبیاء نے کی)، لیکن عقل کے ماننے کا کیا مطلب؟ حالانکہ ہر عقلمند جانتا ہے کہ اِس جہان کی بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق عقل اور دلائل سے نہیں بلکہ 'وجدان' سے ہے، جیسے: بھوک اور پیاس وغیرہ۔ اگر بھوک کا مریض ڈاکٹر کے پاس جائے تو ڈاکٹر اُس کے لیے بھوک و پیاس کو دلائل سے پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوا تجویز کرتا ہے، تاکہ وجدان صحیح ہو اور اُس کو بھوک و پیاس کا اِحساس ہو۔ اور جب بھوک لگ جائے تو عقل سلیم بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے خوراک طلب کرتی ہے۔ اِسی مثال سے سمجھ لیا جائے کہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سمجھنے کی نہیں، پانے کی ہے۔ انبیائے کرام علیہم الصلوات والتسلیمات روحانی دوا دے کر انسانوں کے وجدان کو ٹھیک کر کے قلب سلیم پیدا کرتے ہیں تاکہ بندہ اپنے رب کو پا سکے۔ اِسی کا نام تزکیہ ہے جو فرائض نبی میں داخل ہے۔ اور جو لوگ تزکیہ سے مبرا رہے (جیسے: ارسطو، فیساغورث، ذی مقراط، سقراط وغیرہ۔) کیا اُن کے نزدیک الٰہ اور توحید کا تصور ٹھیک تھا؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ عقل بغیر وحی اور تزکیہ کے، اونٹ کے پاؤں کی طرح ہے، کہ جہاں بھی لگ گیا، لگ گیا۔ اُسے اپنے قدم کے محل وقوع کا کوئی علم نہیں۔

روایات میں آتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا فرمایا، (جس سے کلیہ نکلا کہ) ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ تو (یہ بتائیں کہ) اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے عقلی دلائل دینے اور سمجھانے کے بجائے استعاذہ کی ترغیب دی۔ حالانکہ عقلی دلائل سے اُسے سمجھایا اور مطمئن کیا جاسکتا تھا۔ لیکن رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس عمل سے بتلا دیا کہ شیطان انسان کے قلب پر حملہ کر کے وجدان کو کمزور کرنے اور دبانے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر استعاذہ ضروری ہے۔ جب استعاذہ سے شیطان دور ہو جائے گا تو وجدان صحیح ہوگا۔ وجدان صحیح ہوگا تو حقیقت اِلٰہ کی معرفت حقہ نصیب ہوگی۔ جب آئینہ خراب ہو تو فلسفیوں کو تلاش کرنے کے بجائے مصفی کرنے والوں کے پاس جانا چاہیے۔ انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات نے تو ایسی جماعت تیار فرمائی جو دلائل کا مطالبہ کرنے والی نہیں تھی بلکہ عام حالات میں بھی اللہ ورسولہ أعلم کہنے والی تھی۔ اگر غامدی صاحب سمجھدار ہوتے تو نامعلوم چیزیں دوسروں سے سمجھنے کی کوشش کرتے اور اُن کی صحیح سمجھ پیدا کرتے، نہ کہ خود سمجھے بغیر دوسروں کو سمجھانے کے درپے ہو جاتے......!!

غامدی صاحب اِسی صفحہ پر مزید لکھتے ہیں:

”لفظ اِلٰہ عربی میں اس ہستی کے لیے بولا جاتا ہے جس کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں اسباب و علل سے ماوراء تصرف ثابت کیا جائے۔“

غامدی صاحب سے سوال ہے کہ: لفظ الٰـــہ کا عربی میں یہ معنی آپ نے کہاں سے اخذ کیا ہے؟ اگر واقعی یہی معنی ہے تو کسی لغت کا حوالہ تو پیش کرتے! لگتا ہے ان کو ”الٰہ“ اور ”اللہ“ کا فرق بھی معلوم نہیں۔ قرآن کریم میں ہے: "افرأيت من اتخذ الهه هواه"[الجاثية:٢٣] .(ترجمہ: پھر کیا تم نے اُسے بھی دیکھا جس نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا؟) اب بتلایئے! کیا کوئی بھی کافر اپنے نفس و خواہشات کا تصرف، اسباب و علل سے ماوراء مانتا ہے؟فيا أسفي على هذا التشريح

ص:۱۸۲/۱۸۳ پر لکھتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے:

”اہل تصوف نے متوازی دین بنا کر توحید کے درجات قائم کیے اور عامۃ الناس اور خواص کی توحید کو الگ الگ قرار دیا، حالانکہ توحید تو ایک ہی قسم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات و صفات میں یکتا ماننا۔“

کیا واقعی تصوف ایک متوازی دین ہے؟ اس کا جواب تو، ان شاء اللہ آگے چل کر دیں گے۔ یہاں توحید کی حقیقت بیان کی جاتی ہے۔

غامدی صاحب ویسے تو بہت سمجھدار اور عقلمند ہیں، لیکن اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ سکے کہ کسی بھی ملک میں حکومت کا جو نظام چل رہا ہوتا ہے، اُس کی سمجھ رکھنے کے اعتبار سے عام آدمی اور سلاطین کے مقربین میں واضح فرق ہوتا ہے۔ حکومت تو حاکم کے امر سے چلتی ہے، لیکن مقرب لوگ اُس کو جتنا یقین سے سمجھتے ہیں، کیا عام آدمی بھی اتنا ہی جانتا ہے؟ حیرت ہے کہ غامدی صاحب کھلی آنکھ سے دیکھنے اور چشمہ لگا کر دیکھنے میں بھی فرق نہیں کرسکتے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ آنکھ (بینائی) سے ہی محروم ہوں، اس صورت میں ان کے لیے چشمہ لگانا یا نہ لگانا برابر ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر وہ معذور سمجھے جائیں گے۔

اِسے ایک اور مثال سے بھی، اگر سمجھ ہو تو، سمجھا جاسکتا ہے کہ دریا سے نکلنے والے چھوٹے نالے سے زمین سیراب کرنے والا شخص اور دریا کے کنارے بیٹھا شخص دریا کی وسعت، روانی اور بہاؤ وغیرہ کو سمجھنے میں برابر ہیں؟ یقیناً نہیں!...... غامدی صاحب! اللہ تعالیٰ کے انوارات کی بجلی اگر آپ کے مٹی والے جسم کو کراس نہیں کرتی تو اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ جن کے پاس محبت خداوندی کی تار ہے وہ بھی آپ جیسے ہی کورے ہیں۔ یاد رکھیے! اندھے کبھی بیناؤں کا اِنکار نہیں کیا کرتے، بلکہ اُن کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہیں۔ آپ اپنی کور باطنی چھپانے کے لیے بیناؤں کا ہی انکار کیے جارہے ہیں۔ یورپ کے نظاروں اور بند کمروں میں انٹرنیٹ پر بیٹھ کر توحید کو سمجھنے والے کی عقلِ خام پر کائنات ماتم نہ کرے تو اور کیا کرے؟ صحیح

ہے کہ الناس أعداء لما جھلوا. (ترجمہ: جو چیز لوگ نہیں جانتے، اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔)

غامدی صاحب! ذرا بتلایئے کہ کیا انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات اور عامۃ المؤمنین کی توحید کا درجہ بھی ایک ہے؟ مومن بہ تو بے شک برابر ہو سکتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم کہتا ہے: "کل امن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ" نبیوں کا اور مؤمنین کا ایمان اللہ تعالیٰ نے ساری چیزوں میں برابر بتلایا۔ لیکن کیا درجاتِ ایمان میں تفاوت نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کیوں فرمایا: "آمنت بما آمن بہ جبریل ولا أقول مثل جبریل". (ترجمہ: جس پر جبرائیل ایمان لایا میں بھی اُسی پر ایمان لایا، لیکن میں جبرائیل کے ایمان جیسا ایمان نہیں کہتا۔)

حقیقت یہ ہے کہ توحید کے ماننے میں کیفیات کے اعتبار سے درجات ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ کی توحید اور سیدنا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی توحید ایک ہے؟ ہوش کے ناخن لیجیے! اور خاطر جمع رکھیے۔ ان شاء اللہ آپ کا خیال خیال ہی رہے گا کہ '' امت کا طبقہ میری باتوں کو قبول کرلے۔'' مودودی صاحب کے ماننے والوں نے اپنے قائد کے بعض ہفوات کے اوراق پھاڑ کر کتابوں سے نکال دیئے، آپ اور آپ کے متبعین اِس سے زیادہ نشانِ عبرت نہ بن جائیں!!

غامدی صاحب برہان ص:۱۸۳ پر لکھتے ہیں، خلاصہ:

> ''اہلِ تصوف کے نزدیک توحید کا سب سے اونچا درجہ یہ ہے کہ موجود صرف اللہ کو مانا جائے، جس کے علاوہ کوئی ہستی موجود نہیں۔ تمام تعینات عالم، خواہ وہ محسوس ہوں یا معقول، وجودِ حق سے متزع اور محض اعتبارات ہیں۔ عالم، ذاتِ باری کے مظاہر کا دوسرا نام ہے۔ تعینات کی ماہیت چونکہ عدم ہے، اس لیے اس کو خدا قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

ہم غامدی صاحب سے ایک عام فہم اور آسان بات پوچھتے ہیں کہ: ہمارے ہاں جو بجلی کا نظام ہے، اس کا مرکز (بجلی گھر) ایک ہے۔ لیکن عوام الناس اس کی نسبت متعدد مقامات کی طرف کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: 'میرے گھر کی بجلی'، کوئی کہتا ہے: 'ہمارے گاؤں کی بجلی'، کوئی کہتا ہے: 'ہمارے تھرمل پاور ہاؤس کی بجلی'' ......!! آپ بتائیں! کہ بجلی کا مرکز ایک ہے یا متعدد؟ یقیناً آپ کہیں گے کہ ایک۔ لیکن اِس وحدت کا پتہ کب چلے گا؟ جب مرکز سے بجلی بند کر دی جائے تو سب کے گھر، گاؤں اور تھرمل پاور ہاؤس اندھیرے میں ڈوب جائیں گے۔ اب سمجھئے کہ یہاں بجلی کا مرکز ایک ہے، لیکن اس کے تعینات میں تعدد ہے۔ لہٰذا جو مرکز کی طرف نسبت کرے گا وہ وحدت کا دعویٰ کرے گا اور جو تعینات کو سامنے رکھے گا وہ تعدد کا۔ اور دعویٰ دونوں کا درست ہے۔

اسی طرح صفتِ ''وجود'' حقیقت میں صرف اللہ تعالیٰ کے لائق ہے، باقی موجودات کو جو وجود حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ وجود کے انتزاعات اور تعینات ہیں، انتزاعات اور تعینات اگرچہ اعراض میں ہوتے ہیں، لیکن حق سبحانہ وتعالیٰ کے صفات کی قوت کی وجہ سے جواہر میں بھی ہے۔ لہٰذا وہ صوفیائے کرام جن کا نظریہ وحدت الوجود کا ہے، ان میں سے کسی نے بھی ''وحدتِ موجود'' نہیں کہا۔ اور آپ جانتے ہی ہوں گے کہ صفات کی وحدت، ذوات کی کثرت کے منافی نہیں۔ جس طرح بجلی کی وحدت لائٹوں اور پنکھوں کی کثرت کے منافی نہیں۔

ابن عربی کے اِس نظریہ کی تشریح حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے بھی کی ہے کہ دونوں میں کوئی منافاۃ نہیں۔ البتہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے ابن عربی کو بعض احوال میں مغلوب الحال لکھا ہے۔ دین کے وہ احکام جو سب کے لیے حجۃ ہیں، اُن کو چھوڑ کر ایک شخص کے غلبۂ حال سے دلیل لے کر دین کی بنیادیں گرانے کا ''فریضہ'' وہی انجام دے سکتا ہے جسے کسی لابی کی طرف سے دین کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر مامور کیا گیا ہو۔

غامدی صاحب سے عرض ہے کہ: تصوف محبت کی راہ ہے، اور محبت کی ترقی فنا فی المحبوب میں ہے۔ اگر مجنوں فرطِ محبت میں اپنے وجود میں لیلیٰ کو پائے اور غیر اُسے نہ دکھائی دے تو کیا آپ یہ نظریہ قائم فرمالیں گے کہ محبت کا وجود ہی نہیں ہے؟ آپ نے اگر ایمان میں محبت کی راہ نہیں پائی تو اِس میں کسی کا کیا قصور؟ اگر کوئی گھر میں بیٹھ کر مرکز بجلی سے اپنے آپ کو مستغنی اور جدا سمجھے تو اپنی ہی عقل کو کوسے۔ اعتراض کرنے والا تو عزائم ابن عمرؓ اور رخص ابن عباسؓ کو لے کر بھی اعتراضات کی بھرمار کرسکتا ہے۔ اس طرح علمائے امت کے تفردات کو لے کر پورے دین پر اعتراضات جڑ دیئے جائیں تو پھر دین کا کون سا حصہ بچ سکتا ہے؟

غامدی صاحب کو یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہیے کہ اہل تصوف اَقسام توحید میں سے کسی قسم کا انکار نہیں کررہے بلکہ انہوں نے عمیق نظر سے مراتب قائم کیے ہیں۔ غامدی صاحب جہاں اپنا کوئی نظریہ منوانا چاہتے ہیں وہاں تو بڑی فراخدلی سے ایک چیز کی کئی اقسام کرکے مختلف مراتب قائم کردیتے ہیں۔ لیکن یہاں فرق مراتب پر چیں بجبیں ہورہے ہیں ؏ راہِ تصوف رفتنی بود نہ گفتنی

جو اس منزل کا رہرو نہ ہو، اُسے یہ راہ سمجھانا اِس طرح ہے جس طرح مسئلہ تقدیر۔ غامدی صاحب کو یہ بات تسلیم کرلینی چاہیے کہ ہر چیز کا انسانی سمجھ میں اور خاص طور پر آپ کی سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔ کچھ ایسے امور بھی ہیں جو آپ کی عقل سے بالاتر ہیں، جیسے روح کی حقیقت۔ تصوف اور اس سے متعلقہ تمام امور جسم

کے جزو اعظم حقیقی یعنی روح سے تعلق رکھتے ہیں، آپ اپنی عقل سے اِسے سمجھنے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہے۔

ص:۱۸۵ پر امام غزالیؒ سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

''توحید کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ بندہ صرف ذات باری کو موجود دیکھے، یہ فنا فی التوحید ہے، یہ استغراق ہے، جس میں اپنے آپ کو نہیں دیکھتا اور توحید میں فنا ہو جاتا ہے۔ بمعنی "انہ فنی عن نفسه والخلق"۔

عرض یہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ ''فنائیت'' کی بات کر رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ غامدی صاحب کو پھر بھی مقامات محبت سمجھ نہیں آتے!! کاش کہ غامدی صاحب جلوہ طور سے واقف ہوتے اور "خر موسیٰ صعقا". والے مقام فنائیت سے بہرور ہو کر "فلما افاق". کے بقاء سے مشرف ہوتے تو کون و مکاں سے آگے مقامات کھل کر سامنے آجاتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ص:۱۸۶ پر فصوص الحکم سے ابن عربی کی عبارت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس جس نے حقائق کو حق سے حق میں چشم حق سے دیکھا، وہ عارف ہے۔ اور جس نے بچشم خود دیکھا وہ عارف نہیں۔''

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک لوہے کو آگ سے کوئی نسبت نہیں، لیکن لوہا اگر آگ میں گرم ہو کر آگ ہو جائے اور آگ کو اپنے وجود میں سمو دے تو دیکھنے والا یہی کہے گا یہ آگ ہے۔ حالانکہ حقیقۃً وہ لوہا ہے۔ صرف اِس نے آگ کو اپنے وجود میں سمو دیا ہے۔ اگر خاکی کو اپنے رب سے نسبت حقیقی حاصل ہو جائے تو عام آدمی کی اور اس کی رویت میں فرق کیوں نہیں ہوگا؟ عام آدمی کی رویۃ جو عقیدۃً ہے اور اِس کی رویۃ کشفاً اور مشاہدۃً ہے۔ یہ دیکھنے کا فرق ہے۔ کسی حبشی کے کالے بیٹے کو کوئی دوسرا شخص دیکھے تو اور جذبات ہوتے ہیں، لیکن حبشی خود اپنے بیٹے کو دیکھے تو اور جذبات ہوتے ہیں۔ خلاصہ ساری بات کا یہ ہے کہ جو قلب محبت سے عاری ہے اُسے یہ چیزیں سمجھ نہیں آسکتیں۔

ص:۱۸۶ پر اعتراض کرتے ہوئے ابن عربی کی عبارت نقل کرتے ہیں:

"فالأمر الخالق المخلوق، والأمر المخلوق الخالق، كل ذلك من عين واحدة...... هو العين الواحدة وهو العيون الكثيرة".

حالانکہ ابن عربی کی مراد یہاں سے ''وحدۃ الوجود'' ہے، نہ کہ ''وحدۃ موجود''، جسے حضرت مجدد

الف ثانی رحمہ اللہ راستہ فنا میں آنے والے ''حال'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب بندہ فنائیت سے مشرف ہوتو حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وحدۃ الشہود ہے۔

ص: ۱۸۸ ر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوب کی عبارت نقل کر کے لکھتے ہیں:

''توحید شہودی یہ ہے کہ تنہا ذات حق ہی دکھائی دے، یعنی سالک کا مشہود اس ذات کے سوا کوئی دوسرا نہ ہو۔''

پھر لکھتے ہیں کہ:

''یہ تعبیر کا فرق ہے۔''

لگتا ہے کہ یہ بات غامدی صاحب کی سمجھ میں آگئی ہے کہ دونوں میں فرق نہیں، گویا شیخ نے رویۃ کی عینیت کو واقعی سمجھا اور حضرت مجدد رحمہ اللہ نے اس کو عینیت فی الشہود قرار دیا جو محبت والی آنکھ سے دیکھنے میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد تعبیری فرق واضح کرنے کے لیے شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ عبارت نقل کی:

''اتفق أهل الكشف والوجدان'' یعنی وہ سب لوگ جو کشف و وجدان اور ارباب شہود والعرفان اس بات پر متفق ہیں کہ تمام مخلوقات کے لیے مابہ التعین ایک ہی متعین وجود ہے، عقل و نقل اس کی تائید کرتے ہیں۔''

اب اصل مسئلہ واضح ہو گیا کہ یہ وحدت و تعدد بجلی کی طرح ہے جس میں وحدت و تعدد ہے۔ البتہ مابہ التعین سے تعینات کو مخلوق کی مثال والے انتزاعی تعین کے ساتھ کلی مماثلت نہیں، یہ صرف سمجھانے کے لیے ہے۔ ''ليس كمثله'' کا ہتھیار جس کے پاس ہو وہ اس حقیقت کو سمجھنے میں ورطۂ ظلمت سے نکل سکتا ہے۔

ص: ۱۸۸ ر پر غامدی صاحب لکھتے ہیں، خلاصہ:

''قرآن کریم کی صراط مستقیم میں ممکن کے لیے وجود کائنات نہ تو شرک ہے اور نہ موجود یا مشہود صرف اللہ ہی کو قرار دینا توحید کا کوئی مرتبہ ہے۔''

پہلی بات تو ٹھیک ہے، اور اس کا کوئی بھی منکر نہیں۔ البتہ دوسری بات کو غامدی صاحب سمجھ نہیں سکے، جس میں، مسئلہ کے بجائے غامدی صاحب کی سمجھ کا قصور مان لینا ہی بہتر ہے۔ غامدی صاحب سے سوال ہے کہ جب ساری کائنات نہ تھی، یعنی عالم کون نہ تھا، اُس وقت اگر آپ ہوتے تو توحید کس چیز کا نام تھا؟...... اِسی طرح یہ سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی عالم اَمر میں ہو اور عالم کون، اُس کے لیے مغیبات میں ہو تو اُس وقت توحید اُس کے ہاں یہی ہوگی جو دوسرے نمبر پر بیان ہوئی۔ اور اُس کے نزدیک اِس مرتبہ میں عالم کون کا اثبات شرک ہوگا۔ اور یہ شرک فی الواقع نہیں بلکہ فی اعتقادہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''عن شداد بن أوسؓ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''من صلى يرائي فقد أشرك، ومن صام يرائي فقد أشرك، ومن تصدق يرائي فقد

أشرك". [مسند أحمد،رقم: ۱۷۱۴۰......مسند البزار،رقم: ۳۴۸۲......المعجم الكبير،رقم: ۱۷۳۹]

یعنی جو دکھلاوے کے لیے نماز، روزہ، صدقہ کرے یہ شرک ہے۔ہم پوچھتے ہیں کہ: غامدی کے نزدیک یہ شرک کا کون سا درجہ ہے؟ یقیناً یہاں وہ شرک کے مراتب قائم کرنے پر مجبور ہوں گے۔اگر شرک کے مراتب ہیں تو توحید کے مراتب کیوں نہیں؟ البتہ ہر درجہ کی توحید اور شرک الگ الگ ہیں۔لیکن توحید کے ہر عالی درجہ میں اُس سے نیچے والا درجہ موجود ہے۔غور کیجیے! اللہ کا نبی جب نماز میں "اهدنا الصراط المستقيم" پڑھے، تو اِس سے کون سی ہدایت مراد ہے؟ نبی تو ہادی ہونے کے ساتھ مہدی کامل ہوتا ہے۔یہاں "اهدنا الصراط المستقيم" کا معنی آپ کیا کریں گے؟ اب تو آپ کو بتلانا پڑے گا کہ ہدایت کے کتنے درجات ہیں؟

ص:۱۹۱ر پر لکھتے ہیں:

"اہل تصوف کے دین میں جب سالک اس توحید کے اسرار پر مطلع ہوتا ہے تو الفاظ تعبیر سے قاصر اور زبان اس کی تعریف اور تبلیغ سے عاجز ہو جاتی ہے۔کمافی المنازل"

افسوس ہے کہ یہ بات بھی غامدی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی۔حالانکہ بدیہی بات ہے کہ آگ کو دُور سے دیکھ کر اُس کی ماہیت کو بیان کیا جاتا ہے، لیکن اُس کے بالکل قریب جا کر جھلسنے کی کیفیت کو اَلفاظ میں کیسے بیان کیا جائے؟ سائنسدان یہاں سے سورج کی ماہیت کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے ہیں، لیکن اگر اُس کے قریب چلے جائیں تو کیا حال اور کیفیت ہوگی؟ غامدی صاحب اِس راہ کے طفلِ مکتب بھی ہوتے تو کچھ بات بنتی، اَب انہیں کون سمجھائے؟

اسی مضمون کے اول میں ص:۱۸۱ر پر لکھتے ہیں، خلاصہ:

"تصوف ایک متوازی دین ہے۔جس دین کی دعوت قرآن مجید نے بنی آدم کو دی اس سے بالکل مختلف ہے۔"

اور ص:۱۹۲ر پر لکھتے ہیں:

"اہل تصوف کی توحید کا تصور اور نقطۂ نظر اپنشدوں کے شارح شری شنکرا چاریہ، شری رام نوج اچاریہ، حکیم فلوطین اور اسپنوزا کا ہے۔......اپنشد، برہم سوتر، گیتا اور فصوص الحکم کو اِس دین میں وہی حیثیت حاصل ہے جو نبیوں کے دین میں تورات، زبور، انجیل اور قرآن کو حاصل ہے۔اِس لحاظ سے اللہ کی ہدایت اسلام کے مقابلے میں تصوف وہ عالم گیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متاثر کیا ہے۔"

غامدی صاحب تصوف کو ایک متوازی دین قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو قرونِ اولیٰ میں دین کی خدمت کرنے والی تمام ہستیاں شریعت وطریقت کی جامع نظر آتی ہیں۔ کوئی ایسی شخصیت بتلایئے جس نے دین کی خدمت کی ہو اور اِس نعمت (تصوف) سے بے بہرہ ہو؟ ایک مثال پیش کریں تو ہم مان لیں گے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمام علوم مدونہ قرونِ اولیٰ میں موجود تھے، البتہ نام سے تدوین بعد میں ہوئی، جیسے: صرف، نحو، فقہ، اشتقاق، لغۃ، معانی، بیان اور بدیع وغیرہ۔ اِسی طرح ''تصوف'' نام بعد کا ہے، لیکن اصل تو قرونِ اولیٰ بلکہ انسانِ اول سے موجود ہے۔ اس لیے کہ تصوف نام ہے تعمیر الظاهر والباطن کا، اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح کرنا۔ فرائضِ انبیاء میں اصلاحِ قلب عام اور مقصود تھا، جس کے لیے قرآن کریم نے ''تزکیہ'' کا نام استعمال کیا ہے جو فریضۂ انبیاء سے ہے۔ پورے قرآن کریم میں مہبط اور اترنے کی جگہ اور محل ایمان قلب کو قرار دیا گیا ہے، دماغ کا کہیں بھی ذکر نہیں، دماغ تو ایک کمرہ ہے، جس کا بلب دل میں ہے، اگر دل روشن ہو تو دماغ خود بخود روشن ہو جاتا ہے، جس کو قرآن کی اصطلاح میں ''شرحِ صدر'' کہا جاتا ہے۔ جس کی شرح كتاب التفسير للترمذی میں ہے۔ شرحِ صدر کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے قلب میں نور ڈالتے ہیں، جس سے سینہ کھل جاتا ہے۔ یہ ایک باطنی امر ہے، جس کی ظاہری علامات بھی ایک حدیث میں مذکور ہیں کہ: دنیا سے دُوری، آخرت کی طرف انابت اور موت سے پہلے مرنے کی تیاری کرنا۔ اس سے سمجھ آیا کہ ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ قرآن میں فرمایا: ''وذروا ظاهر الاثم وباطنه'' یعنی ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑ دو! ظاہری نجاست کے لیے ظاہری طہارت ہے اور باطنی نجاست کے لیے باطنی طہارت ہے۔ جیسے ''انما المشركون نجس''. میں نجاست باطنی کا بیان ہے، کون کہتا ہے کہ یہ نجاست ظاہری ہے؟ ''ويزكيهم''. سے باطنی نجاست کا صفایا ہوتا ہے۔ جیسے: کبر، حسد، بغض، نفاق وغیرہ صفات ذمیمہ۔ پاؤں کی نجاست ہاتھ دھونے سے تو نہیں جا سکتی۔ حدیثِ جبرائیل میں توحید، اعتقادیات بیان کرنے کے بعد ''احسان'' کا مرتبہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

''أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه، فإنه يراك''

[بخاری، رقم: ۵۰...... مسلم، رقم: ۵...... أبوداؤد، رقم: ۴۶۹۵...... ترمذی، رقم: ۲۶۱۰]

یعنی اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ تو اگر یہ مرتبہ نصیب نہ ہو تو یہ دھیان تو رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

منافقین کو قرآن کا اعلان ہے کہ تم کہو: ہم مسلمان ہیں، لیکن اب تک ایمان تمہارے قلوب میں نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ''كأنهم خشب مسندة''. یعنی ظاہر میں ٹھیک اور اندر سے کھوکھلے ہیں۔ غامدی صاحب نے ظاہر کو لیا اور باطن کو چھوڑا۔ ''افتؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض''. اور اہل تصوف

نے پوری شریعت اور دین کو لیا، ظاہر و باطن کی اصلاح کی کوشش کی اور دونوں پہلوؤں کو بیان کیا۔ دین کا حصہ چھوڑنے والے، پورے دین پر عمل پیرا ہونے والوں پر اعتراض کر رہے ہیں کہ وہ متوازی دین کے قائل ہیں..... !! ؏ الزام اُن کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''اہل تصوف کی توحید کا نقطۂ نظر شری شنکر وغیرہ کا ہے۔''

اگر کوئی انبیاء کے دین کو نقل کرے تو کیا اس کا یہی مطلب ہے کہ انبیاء اس سے دستبردار ہو جائیں؟ قرآن کہتا ہے کہ اہل کتاب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت تھی، اقرار بھی کرتے تھے۔ اور منافقین تو توحید کا اقرار بھی کرتے تھے۔ کیا ان کے اقرارِ توحید کی وجہ سے ہم توحید ترک کر دیں؟ یہ الگ بات ہے کہ آج کل کے کئی نام نہاد صوفیوں نے صرف باطن پر اکتفا کیا اور ظاہر شریعت کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن اُن کی بنا پر اصل اہل تصوف کو الزام دینا قرین انصاف نہیں۔ ہمارے نزدیک تو شریعت چھوڑ کر صرف طریقت پر عمل پیرا ہونا بھی غلط ہے اور طریقت چھوڑ کر صرف شریعت پر اکتفا بھی درست نہیں۔ کسی ایک کو چھوڑنے کا طرزِ عمل بالکل غلط ہے۔ اور اس سے اُخروی نجات نہیں ہو سکتی۔

اہل تصوف صرف اُس باطن کو مانتے ہیں جس کے ظاہر پر شریعت کا رنگ ہو۔ اور اُس ظاہر کو مانتے ہیں جس کی بشاشت اور حلاوت باطن میں ہو۔ غامدی صاحب! دین کے کسی حصہ کو چوری کرنے سے چور کا نقصان ہوتا ہے، دین پر قدح نہیں لگائی جاتی۔

جن کے نام غامدی صاحب گنوا رہے ہیں، ان کے بارے میں تحقیقی امر یہی ہے کہ انہوں نے انبیائے کرام کے تزکیۂ باطن کے حصہ کو لے کر پھیلایا اور ظاہر پر کفر کا غلبہ رہا، جیسے آج کل تصوف کے نام پر بعض خانقاہوں میں ظاہر شریعت کا انکار کر کے لوگوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے، ان کو کوئی اہل علم صحیح نہیں سمجھتا۔ غامدی صاحب تو ان ذی قدر اشخاص کو بھی ان گمراہ لوگوں کے زمرہ میں لے آئے ہیں جن کے علم، عمل اور اصلاحی و علمی خدمات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ لگتا ہے کہ غامدی صاحب کو اسلامی تاریخ اور احکام قرآن مٹانے کی مہم میں باقاعدہ مہرہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

غامدی صاحب اپنے اسی مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں:

''فصوص الحکم کو دین میں ان کے نزدیک وہی حیثیت حاصل ہے جو تورات، انجیل اور قرآن کو حاصل ہے۔''

حالانکہ ہمارے ہاں کسی نے بھی نہیں کہا کہ فصوص الحکم کی یہ حیثیت ہے، نہ کوئی اِس کا قائل ہے۔ البتہ غامدی صاحب کے بیان سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں تورات، انجیل اور قرآن اَب بھی ایک ہی چیز ہیں!!

غامدی صاحب کہتے ہیں:

''تصوف، اسلام کے مقابلے میں وہ عالمگیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متاثر کیا۔''

اگر یہی بات ہے کہ تصوف کا کام ذہین ترین لوگوں کو متاثر کرنا ہے تو غامدی صاحب جیسا ذہین آدمی کیوں متاثر نہیں ہوا؟ غامدی صاحب نے جس طبقہ کی عبارتیں نقل کر کے تصوف پر اعتراضات کیے ہیں وہ سب تو شریعت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور شریعت اُن میں رچی بسی ہوئی تھی۔ جبکہ غامدی صاحب اور اُن کے تلامذہ کا حال یہ ہے کہ نہ ظاہراً شریعت پر عمل ہے اور نہ باطن میں صفائی۔ اَب فیصلہ کر لیجیے کہ ضلالت کا گھر کہاں ہے؟ یہ ضلالت کو بھی پتہ ہے کہ مجھے کہاں رہنا ہے!!

برہان، ص: ۱۹۲ ر پر نبوت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ختم نبوت کا معنی یہ ہے کہ نہ کسی کے لیے وحی، الہام، مشاہدہ غیب کا امکان ہے، نہ اس بنا پر کوئی عصمت وحفاظت اب کسی کو حاصل ہوسکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "لم يبق من النبوة إلا المبشرات، قالوا وما المبشرات؟ قال: الرؤياء الصالحة"۔

یہاں بھی غامدی صاحب نے صحیح بات کے ساتھ اپنی من گھڑت بات جوڑ دی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وحی بے شک لازم نبوت سے ہے۔ ختم نبوت سے سلسلہ وحی اختتام پذیر ہوا۔ لیکن غامدی صاحب نے الہام، کشف وکرامات اور مشاہدۂ غیب کو وحی کے ساتھ جوڑ کر بلا دلیل لوازم نبوت میں سے قرار دیدیا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں تو ولایت کے لیے بھی ثابت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاید غامدی صاحب ختم نبوت کی طرح ختم ولایت کے بھی قائل ہیں۔ اِسی سے اُن کو دھوکہ لگا۔ پتہ نہیں اُن کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے لیے بھی ولایت ثابت ہے یا نہیں۔ جبکہ یہ چیزیں تو صحابہ کرامؓ میں بھی موجود تھیں۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں محدَّث ہوتے تھے، اگر میری امت میں کوئی ہے تو وہ عمر ہے۔ حدیث یہ ہے:

"عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: إنه قد كان فيما مضى قبلكم من الأمم محدثون، وإنه إن كان في أمتي هذه منهم فإنه عمر بن الخطاب". [بخاری، رقم: ۳۴۶۹]

محدَّث اسے کہتے ہیں جس کو ملاء اعلیٰ سے اِلقاء ہو۔ جیسے جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں بہت سارے اِس قسم کے واقعات ہیں۔ اب غامدی صاحب ہی بتائیں کہ کیا یہ اِلہامات ختم نبوت کے منافی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب نے ختم نبوت کا یہ معنی اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے۔

اور غامدی صاحب نے ''الہام، کشف'' وغیرہ کے ساتھ ''کرامات'' کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے

کہ احادیث میں ''باب الکرامات'' لکھا ہوا ہے۔ غامدی صاحب سے یہ سوال ہے کہ آپ نے کرامت کا ذکر نہیں کیا۔ گویا آپ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اور کرامت نام ہے خوارق عادت فعل کسی غیر نبی لیکن نیک انسان کے ہاتھ پر ظاہر ہونا۔ اگر خوارق عادت کام غیر نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوسکتا ہے تو الہام یا کشف غیر نبی کو کیوں نہیں ہوسکتا؟ اس میں کیا چیز مانع ہے؟ کون سا استبعاد ہے؟ حالانکہ صحابہ کرام کا کشف والہام احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر غزوۂ موتہ کا کشف ہوا اور آپ نے صحابہ کو بتایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دورانِ خطبہ کشف ہوا اور آپ نے فرمایا: "یاساریة الجبل!" [فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل: ۳۵۵] وہاں موجود لشکر نے میدان جنگ میں یہ الفاظ سنے۔ غامدی صاحب بتائیں کہ کیا یہ ختم نبوت اور "لم یبق من النبوة إلا المبشرات"۔ کے منافی ہے؟

رہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مطلب، وہ یہ ہے کہ چونکہ خواب مبادی نبوت سے تھے، اس لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مبادی تو باقی ہیں، البتہ نبوت کا ظہور میرے بعد نہیں ہوگا۔ اور خواب عامۃ المؤمنین کے لیے بھی ہیں۔ جبکہ خواصِ ولایت ہی سے متعلق ہیں۔

اور غامدی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ:

''ختم نبوت کے بعد عصمت اور حفاظت کا بھی امکان نہیں۔''

کیا عصمت اور حفاظت ایک ہی چیز ہے؟ اگر ایک ہی چیز ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے؟

"لعل الله اطلع علی أهل بدر، فقال: اعملوا ماشئتم، فقد غفرت لکم"

[بخاری: ۳۰۰۷......مسلم: ۱۶۱......ابو داؤد: ۲۶۵۰......ترمذی: ۳۳۰۵]

کیا یہ عصمت ہے یا حفاظت؟ یا کچھ بھی نہیں؟ نیز حدیث مبارک کہ:

"ماعلیٰ عثمان ما عمل بعد الیوم"۔

کس زمرہ میں ہے؟ صحابہ کرام کے لیے رضوان، جنت، مغفرت کے وعدے، بشارتیں کس زمرہ میں ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ ''عصمت'' خاصہ نبوت ہے اور محفوظ جماعت صحابہ کرام کی ہے۔

ص: ۱۹۳ ر پر غامدی صاحب لکھتے ہیں، خلاصہ:

''اہل تصوف کے دین میں وحی بھی آتی ہے، فرشتے بھی اترتے ہیں، عالم غیب کا مشاہدہ، اللہ سے ہدایت پانا، جہاں سے جبرئیل نے ہدایت پائی اور جہاں سے اللہ کے نبیوں نے پائی۔''

اِس کی دلیل میں غامدی صاحب نے امام غزالیؒ کی عبارت پیش کی جس میں مکاشفات، مشاہدات، نبیوں کی ارواح اور فرشتوں کا مشاہدہ اوران کی آوازیں سننا، فائدے حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ اور صاحب ''عبقات'' کی عبارت پیش کر کے اُس سے دلیل پکڑی کہ اِن اُکابر کا اِلہام عصمت کی وجہ سے قرآن کی طرح شائبہ سے پاک ہے۔ اور اِس طرح متعدد اُکابر کی عبارات سے مختلف چیزیں اُخذ کی ہیں۔

اِس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ پہلے تو غامدی صاحب یہ ثابت کریں کہ جبرائیل امین کا آنا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بند ہو گیا ہے۔ جبکہ اُحادیث مبارکہ میں ہے کہ جبرئیل امین قدر کی رات نازل ہوتے ہیں، اور ''تنزل الملئكة والروح'' تو قرآن میں ہے۔ غامدی صاحب بتائیں کہ کیا قدر کے دن سارے مسلمان (معاذ اللہ) نبی بن جاتے ہیں؟ صحابہ کرام، جبرائیل امین کی آمد اور فرشتوں کی آمد کا مشاہدہ کرتے تھے، کیا وہ غیر نبی نہیں تھے؟ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''یاسعد! واللہ إني لأجد ريح الجنة دون أحد''

[مسند احمد: ۱۳۶۵۸......صحیح ابن حبان: ۴۷۷۲......المعجم الکبیر: ۷۶۹]

یعنی مجھے احد پہاڑ سے جنت کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ غیر نبی نہیں تھے؟ کیا غیر نبی کے ناک کا کشف کام کرتا ہے، آنکھ کا نہیں کرتا؟ کیا جبرائیل امین قدر کی رات جماعت کے ساتھ آتے ہیں، باقی سال بھر ان کے اکیلے آنے پر آپ نے پابندی لگا رکھی ہے؟! غامدی صاحب! کسی اللہ والے کے پاس بیٹھ کر اپنے دل کی نظر ٹھیک کروائیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جن بزرگوں نے ملاءِ اعلیٰ کی سیر کا ذکر فرمایا ہے، یہ روحانی سیر ہے۔ اور روح ایک لطیف چیز ہے، اِس کی سیر میں کوئی استبعاد نہیں۔ جب ذکر اللہ کی برکت سے جسم عنصری سے مفارقت نصیب ہو تو یہ سیر نصیب ہوتی ہے۔ غامدی صاحب نے روح کو عنصر کی قید میں ایسے بند کیا ہوا ہے کہ بے چاری آزاد نہیں ہو سکتی۔ شاید آپ کا جسم ہاتھی اور روح بکری کی طرح بن گئی ہے۔ یہ دبلی پتلی بیچاری روح آپ کے ہٹے کٹے جسم کے پنجرے سے کیسے جان چھڑا سکتی ہے؟ بات وہی ہے کہ: ''الناس أعداء لما جهلوا''۔

نیز یہ ضرور ملحوظ رہے کہ الہام، کشف و کرامات اور مشاہدات و مراقبات کے ثبوت کے باوجود عقیدے کا مسئلہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ: ''کشف و کرامت اُمت کے لیے حجت نہیں۔'' اور تمام اہل تصوف کا یہی عقیدہ ہے۔ سب اکابر کا عقیدہ واضح ہونے کے باوجود اُن پر بلاوجہ رد کی غامدی صاحب کو کیا ضرورت محسوس ہوئی؟ اہل تصوف پر تو آپ کا قلم خوب گرج برس رہا ہے، لیکن مرزا قادیانی جو روز

نئے نئے دعوے کرتا تھا، وہ آپ کو نظر نہیں آیا؟ بلکہ آپ کے متبعین تو مرزا اور اس کے متبعین پر کفر کا فتویٰ لگانے کے لیے بھی تیار نہیں، کیا وہ آپ کو متوازی دین نظر نہیں آتا؟

غامدی صاحب ص:۱۹۶ر پر لکھتے ہیں:

''ان کا عقیدہ ہے کہ انسان کامل کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمانے میں ان کے اکابر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔''

صورۃِ رسول جامع شریعت سے ہے۔ کسی راہ نما کی صورت میں آنے سے اُس کے مقتدا ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہ خواب اور مکاشفہ کی چیزیں ہیں جو کسی پر حجت نہیں۔ ہر ولی کی ہر چیز قابل حجت نہیں۔ کسی کی ننانوے خوبیاں نظر انداز کر کے ایک کمزوری بیان کرنے پر اُڑے رہنا کہاں کا انصاف ہے؟

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں:

''ان کے نزدیک ختم نبوت کا معنی منصب تشریع کسی کے لیے نہیں۔ مقام نبوت اور کمال نبوت اب بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔''

غامدی صاحب کی ''غامدی عقل'' پر ماتم کیا جائے تو بجا ہی ہوگا۔ کیونکہ منصب تشریع کے لیے ہی تو مقام نبوت ہوتا ہے۔ اہل تصوف جب نبی کے علاوہ کسی کے لیے منصب تشریع نہیں مانتے تو مقام نبوت ماننے کا کیا مطلب؟ البتہ کمالات نبوت اور چیزیں ہیں۔ جیسے علم وغیرہ، اس کا حصہ کسی کو حاصل ہو جائے تو اس پر نبوت کا اطلاق کرنا درست نہیں۔ جیسے اگر سورج کی شعاعوں کو شیشے میں ایسے محدود کیا جائے کہ کاغذ جل جائے تو اس شیشے کو کمال سورج تو حاصل ہے لیکن اس پر سورج کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔ ہاں عکس کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ عکسِ نبوت تھے۔

ص:۲۰۶ر پر لکھتے ہیں:

''دین "الیوم اکملت لکم". کے اعلان کے بعد کامل ہو چکا ہے، اس میں کسی اضافے یا کمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔''

یہ تو بالکل صحیح اور ہمارا ایمان وعقیدہ ہے۔ اور تمام اہل تصوف اسے جانتے اور مانتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اہل تصوف پر دین میں کمی بیشی کا الزام لگانے والے غامدی صاحب خود اِس جرم کے مرتکب ہیں۔ قطعیات تک کو نہیں چھوڑا۔ محکم اور مسلم احکامات میں دخل دے کر رخنہ اندازی کی کوشش کی ہے۔ اور پورے دین کا حلیہ بگاڑنے کی ناپاک جسارت کر ڈالی ہے۔ غامدی صاحب نے اپنی عقل کے مطابق ''میزان'' قائم کر کے دین کو اس پر تولا، قرآن وحدیث کی حجیت سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنی ''برہان''

قائم کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں معبودانِ باطلہ کی اتنی تردید نہیں کی جتنی غامدی صاحب نے ''برہان'' میں اکابرینِ حق پر جرح کردی ہے۔ اب بھی وہ دین میں کمی بیشی کا الزام دوسروں کو دیں گے؟

ص:۲۰۸ پر لکھتے ہیں:

''اس تصور کے تحت اوراد واشغال، چلوں، مراقبوں کی پوری شریعت ہے جو خدا کی شریعت سے آگے اور قرآن وسنت سے باہر۔ جن کو اہلِ تصوف نے طریقت کے نام سے رائج کرنے کی کوشش کی۔''

چلہ تو شریعت محمدیہ بلکہ سابقہ شریعتوں میں بھی ثابت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''جاورت بحراء شهرا'' ایک مہینہ غارِ حرا میں مَیں نے اعتکاف کیا۔

[صحیح مسلم، رقم: ۲۵۷......مسند احمد، رقم: ۱۴۲۸۷......صحیح ابن حبان، رقم: ۳۵]

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے چلہ پورا کروایا۔ اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ:

''كان يذكر الله على كل أحيانه'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذکر فرماتے۔

[بخاری، رقم: ۳۰۴......مسلم، رقم: ۱۱۷......ترمذی، رقم: ۳۳۸۴]

اور ''مراقبہ'' تو اللہ تعالیٰ کے دھیان کا نام ہے۔ یہ بھی اَحادیث سے ثابت ہے۔ غامدی صاحب بتائیں کہ یہ قرآن حدیث والی شریعت ہے یا اس سے باہر؟

غامدی صاحب کی مثال اُس شخص کی ہے جو اپنی برادری کے کسی بھی جنازے وغیرہ میں نہیں جاتا تھا اور سب سے قطع تعلق کیے ہوئے تھا۔ کسی نے پوچھا کہ اِس طرح کیوں کر رہے ہو؟ تو اس شخص نے کہا کہ میں نے گاؤں والوں کو برادری سے نکال دیا ہے!! (حالانکہ درحقیقت اس نے پورے گاؤں کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو برادری سے باہر نکالا ہوا تھا۔) غامدی صاحب بھی خود اہلِ دین کا بائیکاٹ کر کے سمجھتے ہیں کہ: میں نے اہلِ تصوف کو دین سے نکال دیا ہے۔ اَب ہر کوئی سمجھ لے کہ شریعت سے کون نکلا ہوا ہے؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''ومن يعش عن ذكر الرحمن نقيض له شيطانا فهو له قرين، وانهم ليصدونهم عن السبيل ويحسبون انهم مهتدون''. جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے تو ہم اُس کے لیے شیطان مسلط کردیتے ہیں، پس وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ ان کو سیدھے راستے سے ہٹاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم صحیح راستے پر ہیں۔ وما علينا إلا البلاغ

فقط...... کتبہ: العبد الفقير إلى الرحمن، حبيب الرحمن، حال جنهان

۲۴ صفر ۱۴۳۶ھ......19/12/2014

مولانا مفتی رب نواز

حجیتِ اجماع اور غامدی صاحب کے شبہات کا اِزالہ

لغت میں ''اجماع'' متفق ہونے کو کہتے ہیں، لغوی معنی کے اعتبار سے اتفاق اور اجماع ایک ہی چیز ہے مگر اصطلاح شریعت میں ایک خاص قسم کے اتفاق کو ''اجماع'' کہا جاتا ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر متفق ہوجانا ''اجماع'' ہے۔(الاحکام فی اصول الاحکام للآمدی: ۱/۱۰۱ط: مصر)

یہ ''اجماع'' فقہ کا تیسرا ماخذ اور احکام شرعیہ کے چار دلائل میں سے ایک ہے۔(نوادر الفقہ: ۷۳)

قرآن سے حجیتِ اجماع کا ثبوت:

اجماع کا حجت ہونا جن دلائل سے ثابت ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱)......وکذلک جعلنکم امة وسطالتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا.[بقرة: ۱۴۳]

ترجمہ:''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایسی امت بنایا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ بنیں''۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''قرطبی نے فرمایا کہ یہ آیت اجماع امت کے حجت ہونے پر ایک دلیل ہے کیونکہ جب امت کو اللہ تعالی نے شہداء قرار دے کر دوسری امتوں کے بالمقابل ان کی بات کو حجت بنا دیا تو ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے اور عمل اس پر واجب ہے..... تفسیر مظہری میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس امت کے جو افعال واعمال متفق علیہ ہیں وہ سب محمود ومقبول ہیں کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی خطا پر تسلیم کیا جائے پھر یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ یہ امت وسط اور عدل ہے''۔

''اور امام جصاصؒ نے فرمایا کہ: اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں کا اجماع معتبر ہے۔ اجماع کا حجت ہونا صرف قرن اول یا کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں کیونکہ آیت میں پوری امت کو خطاب ہے اور امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف وہ نہ تھے جو اس زمانے میں تھے بلکہ قیامت تک آنے والی نسلیں جو مسلمان ہیں وہ سب آپ کی امت ہیں تو ہر زمانے کے مسلمان شہداء اللہ ہو گئے جن کا قول حجت ہے وہ سب کسی خطا اور غلطی پر متفق نہیں ہو سکتے۔''[معارف: ۱/۳۷۲]

حضرت مولانا مفتی رفیع عثانی صاحب دام ظلہ مذکورہ بالا آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ اس امت کے جو اقوال وافعال متفقہ طور پر ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست اور حق ہیں کیونکہ اگر سب کا اتفاق کسی غلط بات پر تسلیم کیا جائے تو اس ارشاد کے کوئی معنی نہیں رہتے کہ ''یہ امت نہایت اعتدال پر ہے'' نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس امت کو گواہ قرار دے کر دوسرے لوگوں پر اس کی بات کو حجت قرار دیا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ اس امت کا اجماع حجت ہے''۔(نوادر الفقہ:۷۶)

(۲)......''ومن يشاقق الرسول من بعد ماتبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ماتولى ونصله جهنم وساء ت مصيرا''(نساء:۱۱۵)

ترجمہ:''جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق راستہ اس پر ظاہر ہو چکا ہو اور سب مسلمانوں کے (دینی) راستہ کے خلاف چلے گا''۔ ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔''

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس آیت میں دو چیزوں کا جرم عظیم اور دخول جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے، ایک مخالفت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفت رسول کفر اور وبال عظیم ہے، دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اسے چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجماع امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن وسنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے اسی طرح امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے جیسا کہ آپ نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: يد الله على الجماعة ،من شذ شذ في النار یعنی جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو شخص جماعت مسلمین سے علیحدہ ہو گا وہ علیحدہ کر کے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

حضرت امام شافعیؒ نے مذکورہ آیت کو علماء کے سامنے بیان کیا تو سب نے اقرار کیا کہ اجماع کی حجیت پر یہ دلیل کافی ہے۔''[معارف القرآن:۲/۵۴۶]

حضرت مولانا مفتی رفیع عثانی صاحب دام ظلہ مذکورہ بالا قرآنی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''معلوم ہوا کہ امت کے متفقہ فیصلے (اجماع) کی مخالفت گناہ عظیم ہے''[نوادر الفقہ:۷۶]

زبیر علی زئی صاحب غیر مقلد نے اپنے مضمون ''اجماع امت حجت ہے'' میں مذکورہ بالا قرآنی آیت ذکر کر کے درج ذیل علمائے امت کے اقوال نقل کیے ہیں:

۱۔ ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد الشاطبی (متوفی ۷۹۰ھ) نے لکھا ہے:

''ثم إن عامة العلماء استدلوا بها على كون الإجماع وان مخالفه عاص وعلى أن

الابتداع فی الدین مذموم۔" پھر عام علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ اجماع حجت ہے اور اس کا مخالف گناہگار ہے اور یہ استدلال بھی کیا ہے کہ دین میں بدعت نکالنا مذموم ہے"۔

[الموافقات ۴/۳۸، الفصل الرابع فی العموم والخصوص :المسألة الثالثة/محقق مشہور حسن]

۲۔ برھان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) نے اس آیت کی تشریح وتفسیر میں لکھا:

"وھذہ الآیة دالة علی أن الإجماع حجة' اور یہ آیت دلیل ہے کہ اجماع حجت ہے"۔(نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور:۲/۳۱۸)

۳۔حنفی فقیہ ابو اللیث نصر بن محمد السمرقندی (متوفی ۳۷۵ھ) نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں لکھا ہے:

"وفی الآیة دلیل أن الإجماع حجة ؛لأن من خالف الإجماع فقد خالف سبیل المؤمنین ،اور آیت میں (اس پر) دلیل ہے کہ اجماع حجت ہے کیونکہ جس نے اجماع کی مخالفت کی تو اس نے سبیل المومنین کی مخالفت کی" [تفسیر سمرقندی، بحر العلوم:۱/۳۸۷۔۳۸۸]

۴۔قاضی عبداللہ بن عمر البیضاویؒ (متوفی ۶۹۱ھ) نے اس آیت کی تشریح میں کہا:

"والآیة تدل علی حرمة مخالفة الإجماع ۔اور آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اجماع کی مخالفت حرام ہے"۔(انوار التنزیل واسرار التنزیل تفسیر بیضاوی:۱/۲۴۳) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۱/۵۶۸،دوسرا نسخہ ۲/۳۶۵۔۳۶۶ وغیرہ" (علمی مقالات:۵/۷۷)

صلاح الدین یوسف صاحب غیر مقلد مذکورہ آیت "ومن یشاقق الرسول ...... کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"بعض علماء نے سبیل المومنین سے مراد اجماع امت لیا یعنی اجماع امت سے انحراف بھی کفر ہے اجماع امت کا مطلب ہے کسی مسئلے میں امت کے تمام علماء فقہاء کا اتفاق یا کسی مسئلے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق ۔یہ دونوں صورتیں اجماع امت ہیں اور دونوں کا انکار یا ان میں سے کسی ایک کا انکار کفر ہے، تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق تو بہت سے مسائل میں ملتا ہے یعنی اجماع کی یہ صورت تو ملتی ہے لیکن اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد کسی مسئلے میں پوری امت کے اجماع واتفاق کے دعوے تو بہت سے مسائل میں کیے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت ایسے اجماعی مسائل بہت کم ہیں جن میں فی الواقع امت کے تمام علماء فقہاء کا اتفاق ہو۔تاہم ایسے (اجماعی) جو مسائل بھی ہیں ان کا انکار بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کے انکار کی طرح کفر ہے، اس لیے کہ صحیح حدیث میں ہے: اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر اکٹھا نہیں کرے گا اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے۔صحیح ترمذی للالبانی نمبر ۱۷۵۹"۔(تفسیر حواشی:۲۵۶)

اعتراض ۱: اجماع امت کو حجت نہ ماننے والوں میں سے ایک نمایاں نام جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ہے۔غامدی صاحب مذکورہ آیت "ومن یشاقق الرسول ......" سے حجیتِ اجماع پر استدلال کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ اہلِ ایمان کی تعبیرات، آراء اور اجتہادات سے اختلاف نہیں ہوسکتا یا وہ بالا جماع کوئی نقطۂ نظر اختیار کرلیں اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر تنقید کی جائے تو آدمی جہنم کا مستحق ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آیت میں یہ مسئلہ سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہدایت کا راستہ پوری طرح واضح ہوجانے کے بعد اگر کوئی شخص خدا کے بھیجے ہوئے ہادی کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اپنی الگ پارٹی کھڑی کرنے کی جسارت کرتا ہے تو یہ سراسر کفر ہے، جس کے ساتھ ایمان کے کوئی معنی نہیں ہیں۔'' [اشراق اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۴]

جواب: (۱).....غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ فقہاء کرام نے اس آیت سے حجیت اجماع پر استدلال کیا ہے چنانچہ وہ مذکورہ زیر بحث آیت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''فقہاء کے استدلال کی تقریر یہ ہے کہ ایمان والوں کا راستہ چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا جائے تو آیت میں اس پر جہنم کی وعید ہے۔'' [اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۳]

ہم کہتے ہیں کہ فقہاء سے غامدی صاحب نے اختلاف کیا ہے، فقہاء کرام کے نزدیک زیرِ بحث آیت سے حجیت اجماع ثابت ہے اور غامدی صاحب کے بقول اس سے اجماع کا حجت ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ صاف ظاہر ہے کہ ترجیح تو فقہاء کرام کی بات کو ہے، اس لیے کہ وہ غامدی صاحب کی بہ نسبت قرآن کو بہت زیادہ جانتے ہیں۔

(۲) غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن کے طالب علموں کو بھی چاہیے کہ وہ قرآن کو سمجھتے، سمجھاتے اور اس کی کسی آیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت کم سے کم تفسیر کی امہات کتب پر ایک نظر ضرور ڈال لیں''۔ [میزان:۵۶]

ہم نے الحمدللہ اجماع کی حجیت پر تفسیر کی امہات الکتب کے حوالے پچھلے صفحات میں نقل کردیے ہیں کہ زیر بحث آیت سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ غامدی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ دوسروں کو جو نصیحت کر رہے ہیں خود بھی اس پر عمل پیرا ہوجاتے وہ تفسیر کی امہات الکتب کا حوالہ پیش کرتے کہ اس آیت سے اجماع کی حجیت ثابت نہیں ہوتی۔ رسالہ اشراق میں اجماع کی عدم حجیت والے غامدی صاحب کے مضمون کو ہم نے اول سے آخر تک پڑھا ہے، پورے مضمون میں کہیں بھی کسی ایک کتاب تفسیر کا حوالہ اپنی تائید میں وہ نقل نہیں کرسکے۔

اعتراض ۲: غامدی صاحب اس آیت سے جمہور کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ اہلِ ایمان کی تعبیرات، آراء اور اجتہادات سے اختلاف نہیں ہوسکتا یا وہ بالا جماع کوئی نقطۂ نظر اختیار کرلیں اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر تنقید کی جائے تو آدمی

جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں یہ مسئلہ سرے سے زیر بحث ہی نہیں ہے۔ اس میں جو بات کہی گئی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہدایت کا راستہ پوری طرح واضح ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص خدا کے بھیجے ہوئے ہادی کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی کرنے کی جسارت کرتا ہے تو یہ سراسر کفر ہے جس کے ساتھ ایمان کے کوئی معنی نہیں ہے"۔ [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص: ۴۰]

غامدی صاحب کی ساری عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ آیت کافروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی علیحدہ جماعت بنا چکے تھے۔

جواب: ہم یہاں بھی کہتے ہیں کہ غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ آیت کی تفسیر وہی لینی چاہیے جو تفسیر کی امہات کتب میں ہو کما مر۔ لہٰذا انہیں تفسیر کی امہات کتب کا حوالہ دینا چاہیے تھا کہ چونکہ یہ آیت کافروں کے متعلق نازل ہوئی ہے، لہٰذا اجماع کی حجیت کا اس سے استدلال درست نہیں۔

مفسرین کا مسلمہ اصول ہے کہ آیات کا شانِ نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ یا خاص افراد و قوم کا معاملہ ہوتا ہے، مگر اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے۔ [کتاب الام: ۲۴۱/۵۔ اتقان ۴۱/۱۷۔ نیل الاوطار ۲/ ۱۲۹۔ دلیل الطالب: ۴۱۳۔ بدور الاھلہ: ۲۰۹......بحوالہ احسن الکلام: ۱۷۲/۱]

لہٰذا آیت اپنے عموم کے لحاظ سے ان تمام افراد کو شامل ہے۔ جو بھی ساری امت کے اتفاقی مسئلہ سے اعراض کرے.....خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پابند ہو۔

حدیث سے اجماع کی حجیت:

علمائے امت نے اجماع کی حجیت کا استدلال جن احادیث مبارکہ سے کیا ہے ان میں سے دو حدیثیں یہاں درج کرتے ہیں:

۱......سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرمار ہے تھے: لاتزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق، ظاهرين إلى يوم القيامة۔ [صحیح مسلم: ۱۴۳/۲]

میری امت کا ایک گروہ (قرب) قیامت تک حق کے لیے سربلندی کے ساتھ قتال کرتا رہے گا۔ یہ حدیث بخاری میں بھی ہے۔ [صحیح بخاری: ۱۰۸۷/۲]

اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ قیامت تک ہر زمانے میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی۔ اب اس زمانے میں اگر کوئی شخص کسی ایسے نظریے کو غلط کہتا ہے جس پر اب تک کی ساری امت متفق چلی آئی ہے تو در حقیقت وہ یہ کہتا ہے کہ اب تک کی ساری امت میں کوئی بھی اس بارے میں حق پر قائم نہیں رہ سکا، اور یوں وہ قیامت تک ایک جماعت کے حق پر قائم رہنے کی نبوی پیش گوئی کا انکار کرتا ہے۔

اور اس پیشین گوئی سے ثابت ہوتا ہے کہ جب بھی ساری امت کسی بات پر متفق ہوگی تو وہ بات حق ہی ہوگی اگر وہ بات حق نہ ہوتی تو حق پر قائم رہنے والی یہ جماعت حقہ باقی امت کے ساتھ اتفاق نہ کرتی، اس جماعت حقہ کا باقی امت کے ساتھ مل کر اتفاق کرنا دلیل ہے کہ اجماع حجت ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اجماع کی حجیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی مزید تفصیل اس حدیث سے معلوم ہوجاتی ہے جس میں یہ ارشاد ہے کہ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت حق پر قائم رہے گی اور انجام کار وہی غالب رہے گی، اس سے بھی واضح ہوگیا کہ پوری امت کبھی گمراہی اور غلطی پر جمع نہ ہوگی۔'' [معارف القرآن:۱/۱۸۵]

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دام ظلہ مذکورہ حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس حدیث میں صراحت ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہر زمانے میں حق پر قائم رہے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس امت کا مجموعہ کبھی کسی گمراہی یا غلط کاری پر متفق نہیں ہوسکتا۔'' [نوادر الفقہ:۱/۸۴]

زبیر علی زئی صاحب غیر مقلد نے بھی مذکورہ حدیث کو اجماع کی حجیت کے دلائل میں ذکر کیا ہے۔ [علمی مقالات:۵/۸۷]

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ مذکورہ حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''فیہ دلیل لکون الاجماع حجۃ، وھو أصح مایستدل بہ من الحدیث'' [شرح مسلم:۲/۱۴۳]

''اس میں اجماع کے حجت ہونے کی دلیل ہے اور حجیت اجماع پر جن حدیثوں سے استدلال کیا جاتا ہے ان میں سب سے زیادہ صحیح حدیث یہی ہے۔''

۴......رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لایجمع اللہ امتی علی ضلالۃ ابدا۔ اللہ میری امت کو کبھی بھی کسی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔''

[مستدرک حاکم:۱/۱۱۶]

علمائے امت نے اس حدیث کے پیش نظر کہا ہے کہ چونکہ ساری امت کسی گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی اس لیے امت کا اتفاقی مسئلہ حجت ہوگا۔

اس حدیث سے اجماع کی حجیت پر دلیل لینے والوں میں زبیر علی زئی صاحب غیر مقلد بھی ہیں۔ [علمی مقالات ۵/۷۷]

اعتراض ۲: جاوید احمد غامدی صاحب مذکورہ حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ ایک کمزور روایت ہے اور اسی بناء پر حدیث کی امہات کتب یعنی بخاری، مسلم اور موطا میں سے کسی میں بھی جگہ نہیں پاسکی۔'' [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۴]

جواب: (۱)......اس حدیث کی بعض سندیں اگر چہ ضعیف ہیں، مگر بعض اسناد صحیح بھی ہیں۔ غامدی صاحب نے نہ جانے کس سند کو مدار بنا کر اسے ضعیف کہا ہے؟ انہوں نے اس حدیث کو لکھ کر اس پر ضعف کی چھاپ لگا دی ہے، مگر اس کا کوئی ماخذ نہیں بتایا۔ جب اس حدیث کے بعض طرق صحیح بھی ہیں تو انہی کے پیشِ نظر اسے صحیح ہی تسلیم کیا جائے گا۔

(۲)......اس حدیث کے متعدد طرق ہیں، سات سندیں تو امام حاکم رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔ اگر بالفرض یا علی سبیل التنزل ساری سندوں کو ضعیف مان لیں تو بھی مضائقہ نہیں، کیونکہ خود غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ بہت سی ضعیف سندوں والی حدیث تعدد طرق سے ضعف سے نکل جاتی ہے۔

چنانچہ غامدی صاحب ایک ضعیف حدیث، حدیثِ رکانہ در مسئلہ طلاقِ ثلاثہ درج کر کے لکھتے ہیں:

''یہ روایتیں سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں لیکن ان کو جمع کیا جائے تو ضعف کا ازالہ ہو جاتا ہے''[میزان:۴۵۱]

(۳)......حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دام ظلہ جیت اجماع پر دس حدیثیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ان میں سے ہر حدیث الگ الگ اگر چہ متواتر نہ ہو مگر ان سب احادیث کا مشترکہ مضمون جو اجماع کی جحیت کو ثابت کرتا ہے متواتر ہے۔ لہٰذا تواتر سے اجماع کا حجت ہونا اور فقہ کے لیے عظیم مآخذ ہونا قرآن وسنت کی روشنی میں روز روشن کی طرح واضح ہے۔''[نوادر الفقہ:۱/۱۰۱]

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم رہے کہ تواتر، اسنادی ضعف سے بے نیاز ہوا کرتا ہے۔

(۴)......اجماع کی حجیت کا انکار غیر مقلد طبقہ میں پایا جاتا ہے، مگر اس طبقہ کے متعدد علماء نے زیر بحث حدیث کو قابلِ استدلال تسلیم کیا ہے، مثلاً: زبیر علی زئی نے مستدرک کی مذکورہ حدیث کو ''سندہ صحیح'' کہا ہے۔[علمی مقالات:۵/۷۷]

اسی طرح علامہ البانی نے المعجم الکبیر للطبرانی میں مذکور اس حدیث کی تصحیح کی ہے

''هذا إسناد صحيح، رجاله ثقات.''[السنة لابن أبي عاصم بتحقيق الألباني:۱/۸۰]

غیر مقلدین کے یہ دونوں لکھاری حدیث کی تصحیح میں متشدد ہیں، مگر اس کے باوجود انہوں نے حجیت اجماع کی اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے۔ اور بھی بہت سے علمائے غیر مقلدیت سے اس حدیث کا قابل استدلال ہونا ثابت ہے۔ ان میں صلاح الدین یوسف صاحب بھی ہیں۔[تفسیری حواشی صفحہ ۲۵۶]

غامدی صاحب کا کہنا کہ یہ حدیث صحیح نہ ہونے کی وجہ سے بخاری، مسلم اور مؤطا میں جگہ نہیں پا سکی....درست نہیں، کیونکہ کسی حدیث کی صحت کے لیے اس کا بخاری ومسلم اور مؤطا میں ہونا ضروری

نہیں۔حدیث کی صحت کے اپنے اصول ہیں جب حدیث ان اصولوں پر پوری اترے وہ صحیح سمجھی جاتی ہے اگر چہ وہ بخاری، مسلم اور موطا میں نہ ہو۔

ہم غامدی صاحب کی کتابوں میں جگہ جگہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان حدیثوں سے بھی استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم اور موطا میں نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں پائی جاتی ہیں، بلکہ جو انہوں نے حدیث رکانہؓ نقل کی ہے اس کے لیے بھی ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی اور احمد کا حوالہ دیا ہے۔ان کے اپنے طرز عمل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کے قابل استدلال ہونے کے لیے اس کا بخاری، مسلم اور موطا میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ورنہ غامدی صاحب آئندہ ایڈیشنوں میں دیگر کتب کی حدیثیں اپنی کتابوں سے حذف کردیں۔پھر ہم دیکھیں گے کہ غامدی کتب میں باقی بچتا کیا ہے؟ یہاں ایک اور بات بھی ہم عرض کرنا مناسب سمجھتے ہیں: غامدی صاحب زیرِ بحث حدیث (امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی) کے بارے میں یہ تاثر دے رہے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہونے کی بناء پر بخاری، مسلم اور موطا میں نہیں آسکی۔اس سے شاید کسی کی ذہن میں آئے کہ اگر یہ حدیث مذکورہ تین کتابوں میں سے کسی کتاب میں ہوتی تو غامدی صاحب اِسے مان لیتے۔(ایسا بالکل نہیں، یہ محض اُن کا فریب ہے۔) حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب نے حدیث کے ردو قبول میں اپنے خود ساختہ اصول بنا رکھے ہیں، جو حدیث ان کے اپنے اصول پر پوری نہ اترے وہ اسے قبول کرنے اور ماننے سے انکار کردیتے ہیں اگر چہ وہ حدیث بخاری، مسلم اور موطا کی کیوں نہ ہو۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غامدی صاحب نے بخاری، مسلم اور موطا کی کئی حدیثوں کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ دنیا میں آنے کی پیشگوئی والی حدیثیں بخاری ومسلم کی ہیں۔مگر غامدی صاحب ان حدیثوں کو قبول نہیں کرتے۔[میزان:۱۷۸]

شادی شدہ زانی کی حد ''رجم'' یعنی سنگساری ہے اور یہ بخاری ومسلم کی حدیثوں سے ثابت ہے، خود غامدی صاحب نے لکھا: ''یہودی اور یہودیہ کے رجم کا واقعہ بخاری ومسلم اور حدیث کی بعض دوسری کتابوں میں نقل ہوا ہے۔'' [برہان:۴۳] مگر اس کے باوجود غامدی صاحب شادی شدہ زانی، زانیہ کے لیے ''رجم'' کی سزا کے قائل نہیں، اس پر انہوں نے مفصل مضمون لکھا جو ان کی کتاب ''برہان'' میں شامل ہے۔

قرآن کی سات قراءتوں کے حوالہ سے جو حدیث پیش کی جاتی ہے کہ قرآن ''سات حروف'' پر نازل ہوا۔یہ حدیث منجملہ کتب حدیث کے موطا امام مالک میں بھی ہے، جیسا کہ خود غامدی صاحب نے موطا سے اسے میزان[ص:۳۰] میں نقل کیا مگر اس کے باوجود قرآن کی سات قراءتوں کے وہ منکر ہیں۔ دیکھیے ان کی کتاب، میزان۔اسی طرح وہ موطا کی ایک حدیث کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"دوسری بات جو ان میں سے بالخصوص مؤطا امام مالک کی روایت سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ سارا قرآن یہی نہیں جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے بلکہ اس سے بعض آیات نکال دی گئی ہیں، یہ بات ظاہر ہے کہ نہایت خطرناک ہے۔ اور جس منافق نے بھی اِسے وضع کیا ہے اُس کا مقصد صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ ٹھہرایا جائے اور اہل فتنہ کے لیے راستہ نکالا جائے کہ وہ اس طرح کی بعض دوسری آیات وضع کر کے اپنے عقائد و نظریات بھی اللہ کی کتاب میں داخل کر سکیں۔" [برہان:۶۱]

معلوم ہوا کہ جب غامدی صاحب نہ ماننے پہ آئیں تو نہ صرف بخاری، مسلم اور مؤطا کی حدیثیں نہیں مانتے بلکہ اُن کے راویوں پر "نفاق" اور "وضع" کا الزام لگانے سے بھی نہیں چوکتے۔

یہاں یہ بھی پڑھتے جائیں کہ غامدی صاحب کے تصحیح و تضعیف کے اصول خود ساختہ ہیں وہ محدثین کے اصولوں کو نظر انداز کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے، مثلاً: ایک جگہ لکھتے ہیں:

"نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محلِ نظر ہیں۔" [میزان:۱۷۸]

یہاں غامدی صاحب نے محدثین کی تسلیم شدہ حدیثوں کو خود ساختہ اصول کی بناء پر رد کر دیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے کوئی حدیث بھی قرآن کے خلاف نہیں۔ (تفصیل اسی موضوع سے متعلقہ مضامین میں دیکھیے۔)

اعتراض ٤: جاوید احمد غامدی صاحب زیرِ بحث حدیث "حجیت اجماع" کے حوالہ سے جمہور کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ خطا اور ضلالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اس کا تعلق ضلالت سے ہے، خطا سے نہیں ہے۔ پوری امت کسی ضلالت پر جمع ہو جائے، یہ ناممکن ہے...اس کے برخلاف جو چیزیں محلِ تدبر یا محلِ اجتہاد ہیں ان کے سمجھنے میں غلطی ہو سکتی ہے اور امت کے سب لوگ اس غلطی پر جمع بھی ہو سکتے ہیں۔" [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۵/۴]

جواب: (۱)......غامدی صاحب کہتے ہیں کہ خطا اور ضلالت میں فرق ہے۔ عرض ہے کہ جن علمائے امت اور فقہاء کرام نے اس حدیث سے حجیت اجماع پر دلیل لی ہے وہ خطا اور ضلالۃ کا فرق خوبی سمجھتے تھے، اس کے باوجود انہوں نے اس حدیث کو "حجیت اجماع" کی دلیل بنایا ہے۔

(۲)......غامدی صاحب کو اعتراف ہے کہ ضلالہ کا معنی صرف ایک یعنی گمراہی ہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی معنی ہے، چنانچہ انہوں نے "ووجدك ضالا فهدى" آیت سے متعلقہ ایک بحث [برہان:۲۹۳] میں درج ذیل شعر پیش کیا ہے

ولقد ضللت اباک تطلب دارما کضلال ملتمس طریق و بار

ضلالت کا ایک معنی غلطی اور خطا بھی ہے۔قرآن کریم میں ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے ابا جان سیدنا یعقوب علیہ السلام کے متعلق کہا تھا: ان ابانا لفی ضلال مبین. یہاں آیت میں لفظ ''ضلال''، غلطی کے معنی میں ہے کہ ہمارے ابا (سیدنا یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبت کرنے میں) واضح غلطی پر ہیں۔

اسی طرح قصہ یوسف میں ''انك لفی ضلالك القديم '' میں بھی ضلال، غلطی کے معنی میں ہے کہ آپ اسی پرانی غلطی پر ہیں۔مزید دیکھیے معارف القرآن، مفتی اعظم :تفسیر سورۃ یوسف۔

اتنا بتا دینے کے بعد ہم عرض کرتے ہیں حدیث نبوی (میری امت ضلالت پر جمع نہیں ہوسکتی) میں ضلالت کا لفظ گمراہی اور غلطی دونوں کو شامل ہے۔لہٰذا ساری امت گمراہ نہیں ہوسکتی اور امت کا مجموعہ خطا و غلطی پر بھی قائم نہیں رہ سکتا۔غامدی صاحب اگر گمراہی پر جمع نہ ہونے کی تخصیص کرتے ہیں تو اس کی دلیل دیں۔

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ امت کا مجموعہ خطا اور غلطی پہ جمع ہوسکتا ہے، تو ہم انہیں گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے علاوہ علمائے متقدمین میں سے صرف دو ہی حوالے پیش کردیں جنہوں نے یہ کہا ہو کہ فلاں فلاں مسئلہ میں پوری امت کا اجماع ہے، مگر ساری امت خطا اور غلطی پر جمع ہوئی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ آخر غامدی صاحب کو مذکورہ بالا نظریہ گھڑنے اور اپنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ غامدی صاحب بہت سے اجماعی مسائل کے خلاف اپنی الگ راہ اختیار کرچکے ہیں، اس لیے انہوں یہ مخلص نکالا کہ پوری امت ان مسائل میں غلطی اور خطا پر جمع ہے اور غامدی صاحب ہی راہ راست پر ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایک طرف پوری امت جس میں صلحاء، فقہاء، محدثین، مؤرخین، محققین نہ جانے کن کن صفات کی حامل شخصیات ہیں اور دوسری طرف غامدی الگ کسی ٹیلہ پہ جا بیٹھے ہوں تو یہ فیصلہ کون کرے گا کہ ساری امت غلطی پہ ڈٹی ہوئی ہے اور غامدی صاحب ہی صرف حق کو تھامے ہوئے ہیں؟

کیا یہ اچھا نہیں کہ ساری امت کو غلط کار کہنے کی بجائے غامدی صاحب ہی کو غلطی کا شکار کہا جائے۔جب ان کے زعم میں پوری امت خطا پہ قائم رہ سکتی ہے تو تنہا غامدی یا چند دانش وروں سے خطا کیونکر نہیں ہوسکتی؟ یہاں ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے، ہوسکتا ہے کہ غامدی صاحب یا ان کا کوئی ہم نوا یوں کہنے لگے کہ امت سے الگ ہوکر رائے قائم کرنے والے سے اگرچہ غلطی ہوسکتی ہے مگر وہ شخص قرآن وحدیث کی دلیل اپنے پاس رکھتا ہو تو اب تقابل اس کا اور امت کا نہیں کہ امت کے مقابلہ میں

اسے غلط نہ کہا جائے بلکہ یوں دیکھا جائے گا کہ ایک طرف قرآن وحدیث ہے اور دوسری طرف امت۔ تو قرآن وحدیث کے مقابلہ میں امت کو غلط کہا جا سکتا ہے۔

تو عرض ہے اول تو قرآن وحدیث کے خلاف اجماع ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے ساری امت سے الگ راہ اختیار کرنے والا اپنے خودساختہ موقف کو اپنے زعم میں قرآن وحدیث سے ماخوذ مانے ہوئے ہوتا ہے، ورنہ وہ قرآن وحدیث کا صریح فیصلہ نہیں ہوتا، اگر وہ قرآن وحدیث کا صریح مسئلہ ہوتا تو پوری امت بھی اس کے برخلاف موقف کو نہ اپناتی۔

اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ تقابل شاذ رائے والے (مثلاً غامدی صاحب) کا اور امت کے مجموعی فہم کا ہوتا ہے، اب اگر منقولی دلائل حجیتِ اجماع کو نہ دیکھا جائے تو بھی عقلِ سلیم کا تقاضا یہی ہے کہ امت کے مقابلہ میں فردِ واحد کو غلطی میں مبتلا کہا جائے، بالخصوص جب کہ غامدی صاحب کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ''اجماع کی بلاشبہ ایک اہمیت ہے۔'' [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۳]

بلکہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جو اجماعی بھی ہیں اور احادیث بھی انہی کی تائید کرتی ہیں، مثلاً: سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ دنیا میں آمد، مگر غامدی صاحب نہیں مانتے۔ یہاں تو وہ اجماعِ امت سے روگردانی کے ساتھ احادیث سے بھی اعراض کیے ہوئے ہیں، جبکہ انہیں یہ تسلیم بھی ہے نزولِ مسیح کی حدیثیں محدثین کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔

غامدی صاحب کے مزید دو اعتراضات کا جائزہ:

جمہور علمائے امت اجماع کو حجتِ شرعی تسلیم کرتے ہیں، حجیتِ اجماع پر جو دلائل دیے جاتے ہیں ان میں سے بعض ہم ذکر کر آئے ہیں اور جو ان پر اعتراضات تھے ان کا جواب بھی عرض کر دیا ہے۔ اب غامدی صاحب کے دو مزید اعتراضات کو بھی ہم سامنے لاتے ہیں تاکہ قارئین ان کی حقیقت جان سکیں۔

اعتراض ۵: جناب جاوید احمد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد صحابہ وتابعین نے بھی یہ روایت قائم رکھی، لیکن جب فقہاء کا دور شروع ہوا تو اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اس کے بعد سے اب تک بالعموم مانا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ایک مصدر یہ اجماع بھی ہے۔'' [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء ص:۲]

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اجماع کو فقہائے کرام تو حجت سمجھتے ہیں، مگر صحابہ وتابعین اسے حجت نہ مانتے تھے۔

جواب: قاضی شریح تابعی کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے خط بھیجا جس میں یہ بھی ہے کہ:

"اگر کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں بھی (مسئلہ کا حل) نہ ملے تو دیکھنا کہ کس بات پر لوگوں کا اجماع ہے پھر اسے لے لینا۔" [مصنف ابن ابی شیبہ: ۲۴۰/۷ بحوالہ علمی مقالات: ۸۲/۵]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"فمارأی المسلمون حسنا فھو عنداللہ حسن و مارأہ سیءا فھو عنداللہ سیء"

جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے ہاں بھی اچھی ہے اور جسے وہ برا خیال کریں وہ اللہ کے نزدیک بھی بری ہے۔ [مسند احمد: ۳۷۹/۱۔ واللفظ لہ موطا امام محمد: کتاب الصلوۃ، باب قیام شھر رمضان]

صحابہ کرام کے مذکورہ بالا ارشادات سے معلوم ہوا کہ وہ اجماع کو حجت سمجھتے تھے۔ تابعین کے ہاں اجماع کی اہمیت مسلم ہے، مشہور تابعی سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا:

"لیقضی کل قوم بمااجتمع علیہ فقہاء ھم" ہر قوم کو اسی پر فیصلہ کرنا چاہیے جس پر ان کے فقہاء کا اجماع ہو۔ [سنن دارمی، حدیث: ۶۵۲]

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ فقہاء کرام اجماع کو حجت مانتے ہیں... ہم کہتے ہیں کہ فقہاء احادیث کے مفہوم کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔ (ترمذی) لہٰذا فقہائے امت کی بات غامدی صاحب جیسے لوگوں پر ترجیح کا حق رکھتی ہے۔

اعتراض ۶: جاوید احمد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"دین کے ماخذ میں یہ اضافہ یقیناً بدعت ہے۔ قرآن وسنت کے نصوص میں اس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی۔" [اشراق: اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص: ۲]

جواب: غامدی صاحب کہتے ہیں اجماع کی حجیت قرآن وسنت سے ثابت نہیں، جبکہ فقہائے امت قرآن وسنت سے اس کا حجت ہونا مانتے ہیں، فقہاء چونکہ نصوص کے معانی کو زیادہ جانتے ہیں اس لیے بات انہی کی معتبر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ غامدی صاحب کے ہاں بدعت کا کیا مفہوم ہے؟ انہوں نے کس بنیاد پر حجیت اجماع کے نظریہ کو بدعت قرار دیا۔ ہمارے نزدیک اسے بدعت کہنا بہت بڑی جرأت ہے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ قرآن وسنت سے ماخوذ فقہاء ومجتہدین کی آراء کو "بدعت" نہیں کہتے۔ اگر غامدی صاحب اسے بدعت قرار دینے میں حق بجانب ہیں تو وہ مستند علمائے امت میں سے دو چار ہی کے حوالے پیش کردیں جنہوں نے حجیت اجماع کے نظریہ کو "بدعت" کہا ہو۔ غامدی صاحب جب فقہائے امت کے مقابلہ میں اپنی الگ راہ اختیار کیے ہوئے ہیں تو وہ اپنے اصولوں کے مطابق بدعت کا جامع ومانع مفہوم قرآن وسنت سے بیان کر کے حجیت اجماع کا بدعت ہونا ثابت کریں۔

☆......☆......☆......☆

مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم

چند اجماعی مسائل اور...... جاوید احمد غامدی

قارئینِ کرام!

اِس دور کا سب سے بڑا فتنہ اکابرین سے اعتماد اٹھا کر دین کی نئی شرح کرنے کا ہے۔ دورِ حاضر میں باقی فتنوں کی طرح ایک جاوید غامدی کا فتنہ ہے۔ اس نے اسلام کی چودہ سو سال سے چلی آنے والی اصطلاحات کو بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ قرآن پاک نے مؤمنین کے راستہ چھوڑنے والے کو جہنمی کہا ہے۔[النساء] اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا کہ جو جماعت سے کٹے گا وہ جہنم میں جائے گا۔[مشکوٰۃ] ایک راویت میں فرمایا کہ: جس طرح بھیڑیوں کا دشمن بھیڑیا ہے، اسی طرح انسانوں کا بھیڑیا شیطان ہے۔ جو بکری ریوڑ سے جدا ہوتی ہے اُس پر بھیڑیا حملہ کرتا ہے، جو ریوڑ کے ساتھ رہے وہ بھیڑیے کے حملہ سے بچ جاتی ہے۔ اِسی طرح جو جماعت کے ساتھ ملا رہے شیطان اس پر حملہ نہیں کرتا، اور جو جماعت سے جدا ہوتا ہے، شیطان اس کو گمراہ کر دیتا ہے۔[مشکوٰۃ] اور ایک روایت میں ہے کہ: جو اجماع سے کٹ گیا تو گویا اس نے اسلام کا پٹہ اپنے گلے سے اتار کر پھینک دیا۔ جاوید احمد غامدی بھی بہت سے اجماعی مسائل کا انکار کر کے اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو جہنم کا ایندھن بنانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حفاظت فرمائیں۔ اس کے خلاف اجماع مسائل میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱)......ایمان بالغیب کی تعریف:

ایمان بالغیب کی تعریف میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، انہیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے۔“[مقامات:۱۳۵]

نیز فرماتے ہیں:

”قرآن نے جو حقائق پیش کیے ہیں، ان پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ بیشک حواس سے ماوراء ہیں، لیکن عقل سے ماوراء نہیں، ہم نے انہیں عقل کی میزان میں تولا ہے اور ان میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم ان پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم انہیں عقل وفطرت کے قطعی دلائل کی بنا پر مانتے ہیں۔“[مقامات:۱۳۶]

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے ہاں ایمان بالغیب کے لیے غائب اشیاء کا بداہۃً عقل

میں آنا ضروری ہے۔ حالانکہ جمہور کے نزدیک غائب وہ چیزیں ہیں جو حواس اور بداہت عقل سے خارج ہوں، چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں:

''لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں۔'' [معارف القرآن: ۱/۹۶]

نیز فرماتے ہیں

''قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہت عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔'' [معارف القرآن: ۱/۹۶]

(۲)...... جہاد اور جزیہ:

اسی طرح جہاد اور جزیہ کے بارہ میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''اس (جہاد و قتال) کی دو صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، ایک کفر کے خلاف جنگ، دوسرے ظلم و عدوان کے خلاف جنگ، پہلی صورت کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے، جو اس دنیا میں ہمیشہ اس کے براہ راست حکم اور انہی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اس قانون کے تحت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا، جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اس کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ آپ پر نبوت ختم کردی گئی۔ چنانچہ لوگوں کی خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا ان پر جزیہ عائد کرکے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے، قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کرسکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کرسکتا ہے۔'' [مقامات: ۱۴۵، ۱۴۶]

حالانکہ امت کا اجماع ہے کہ جہاد اور جزیہ اپنی شرائط کے ساتھ قیامت تک باقی رہیں گے۔ چنانچہ ''درمختار'' میں ہے کہ:

''جہاد ابتداءً فرض کفایہ ہے اگرچہ کافر لڑائی میں ہم سے ابتداء نہ کریں۔ [الدر المختار مع الشامیۃ: ۳/۱۲۲، ۱۲۳]

(۳)......مروف ومنکر کا مصداق:

معروف ومنکر کا ذکر قرآن پاک میں متعدد جگہ ہے، قرآن پاک نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ایک جماعت تشکیل دینے کا حکم دیا ہے۔ غامدی صاحب نے اجماع امت کے خلاف اس کی تشریح کی ہے، چنانچہ منکر کے بارہ میں لکھا ہے:

''اس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنہیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب وملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بددیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ منکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ (من رأی منکم منکراً الخ) ارشاد انہی برائیوں سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا جو حکم قرآن میں بیان ہوا ہے، وہ اسی کی فرع ہے۔'' [مقامات:۱۵۰]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ ''ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر، الآیۃ'' کے تحت فرماتے ہیں:

''دوسرے بھائیوں کو احکام قرآن وسنت کے مطابق اچھے کاموں کی ہدایت اور برے کاموں سے روکنے کو ہر شخص اپنا فریضہ سمجھے۔'' [معارف القرآن:۲/۱۳۶]

نیز حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''معروف میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں داخل ہیں جن کا اسلام نے حکم دیا ہے۔ اور ہر نبی نے ہر زمانے میں اس کی ترویج کی کوشش کی اور چونکہ یہ امور خیر جانے پہچانے ہوئے ہیں، اس لیے معروف کہلاتے ہیں۔ اسی طرح منکر میں تمام وہ برائیاں اور مفاسد داخل ہیں جن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ناجائز قرار دینا معلوم ومعروف ہے۔'' [معارف القرآن:۲/۱۴۱]

(۴)......ڈاڑھی:

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھیاں بڑھانے کا حکم دیا ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ مشت سے کم ڈاڑھی نہ کٹائی جائے۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ:

''مٹھی سے کم ڈاڑھی کا کٹانا جیسا کہ بعض مغربی لوگ اور ہیجڑے کرتے ہیں اس کو کسی نے مباح قرار نہیں دیا۔'' [بحوالہ حاشیہ بنایہ:۴/۳۲۴]

لیکن جاوید غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''یہ (ڈاڑھی رکھنا) دین کا کوئی حکم نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر ڈاڑھی نہیں رکھتا تو ہم یہ نہیں کہہ

سکتے کہ وہ کسی فرض وواجب کا تارک ہے۔ یا اس نے کسی حرام یا ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے۔''

[مقامات:۱۵۴]

اسی طرح اسبال کا معنی ہے کہ: کپڑے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانا، خواہ ازار ہو یا شلوار۔ مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مشابہت (متکبرین کے ساتھ) تہ بند ہی میں ہوتی ہے، ہماری شلوار پاجامے اور پتلون سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' [مقامات:۱۵۶]

(۵)......مقدارِ وصیت:

حدیث پاک میں ہے کہ: ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعدؓ کو ثلث مال کی وصیت کی اجازت دی اور فرمایا کہ ثلث مال کثیر ہے۔'' امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر وارث ہوں تو ثلث سے زائد کی وصیت وارثوں کی رضا کے بغیر جائز نہیں، چنانچہ ابن رشد فرماتے ہیں کہ:

''تمام لوگ اس بات کی طرف گئے ہیں کہ جس شخص کا کوئی وارث ہو، اس کے لیے ثلث سے زائد وصیت جائز نہیں۔'' [بداية المجتهد:۲/۲۵۱]

مگر غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ایک (سوال) یہ کہ وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے وصیت کر سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

[مقامات:۱۵۷]

اور حدیث سعدؓ کے بارہ میں خلاف جمہور کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ خاص صورت حال میں ایک خاص شخص کے فیصلے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تبصرہ ہے۔ اس کا کسی قانونی تحدید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' [مقامات:۱۵۷]

(۶)......وارث کے لیے وصیت:

سورۂ بقرۃ آیت نمبر ۱۸۰ میں والدین اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کا ذکر ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ یہ حکم لا وصية لوارث (یعنی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں) والی حدیث سے منسوخ ہو چکا ہے۔ چنانچہ معارف القرآن میں ہے کہ:

''حاصل اس حدیث کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وارثوں کے حصے خود مقرر فرما دیے ہیں۔ اس لیے اسے وصیت کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وارث کے حق میں وصیت کرنے کی اجازت بھی نہیں۔ ہاں! اگر دوسرے ورثا اس وصیت کی اجازت دے دیں تو جائز ہے۔'' [معارف القرآن:۱/۴۴۰]

پھر قرطبیؒ سے یہ نقل فرمایا کہ:

''اگر چہ یہ حدیث ہم تک خبر واحد کے طریق پر پہنچی ہو، مگر اسکے ساتھ حجۃ الوداع کے سب سے بڑے اجتماع میں ایک لاکھ سے زائد صحابہ کے سامنے اس کا اعلان فرمایا اور اس پر اجماع صحابہ اور اجماع امت نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قطعی الثبوت ہے۔ ورنہ شک شبہ کی گنجائش نہ ہوتے ہوئے اس کی وجہ سے آیت قرآن کے حکم کو چھوڑ کر اس پر اجماع نہ کرتے۔'' [معارف القرآن:۱/۴۴۰]

مگر غامدی صاحب اس آیت کو منسوخ نہیں سمجھتے اور فرماتے ہیں کہ

''وارثوں کے حق میں خود اللہ تعالیٰ نے وصیت کر دی ہے۔ اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔'' [مقامات:۱۵۸]

مگر اللہ تعالیٰ کی وصیت کا حکم مطلق تھا، غامدی صاحب اس کو ضرورت کے ساتھ مقید کرتے ہیں کہ:

''اگر ایک وارث خدمت گذار یا برسر روزگار نہ ہو یا اس کا پرسان حال نہ ہو تو اس کے لیے وصیت کر دے۔''

معلوم ہوا کہ اجماع امت کو بھی چھوڑا اور قرآن کا حکم بھی پورا نہ مانا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

بہر حال غامدی صاحب نے پورے دین کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے اور مسلمانوں کو اس جدت کے زہر سے محفوظ فرمائے۔ [آمین] ☆☆☆☆

جناب اشتیاق احمد صاحب، [لیکچرر: پنجاب یونیورسٹی، لاہور]

جاوید احمد غامدی......اور......سزائے رجم

مذاہب کے سیاسی دورِ زوال میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب جیسے اصحابِ فکر و نظر کا اٹھنا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ مذہب جب انتظامی طور پر معاشرے کے اوپر اپنی قوت نافذہ سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر مذہب کے بارے میں من بھاتی بات کو کہے جانے سے روک لگانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کے اندر عمومی طور پر دین کی احسانی کیفیت پیدا کرنے کی چاہت چونکہ ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا کوئی بڑی سے بڑی بے تکی بات بھی سماعتوں کو عوامی سطح پر جلد متوجہ کرتی ہے۔ یہ دونوں اسباب سبز جھنڈی دکھاتے ہیں اور تجدد کے انجن کے پیچھے مختلف ناموں اور رنگوں سے ''مزین'' نفس پرستی کی بوگیاں بھاگ کھڑی ہوتی ہیں۔ متجددین پر شاعر کی وہ بات صادق آتی ہے کہ۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

یہ حضرات اپنے اُفکار پر سے وقتاً فوقتاً پرت پرت اُتارتے رہتے ہیں، بالفاظ دیگر یہ معاشرے کا درجہ حرارت ماپتے رہتے ہیں کہ کتنی بات قبول کی جارہی ہے اور کتنی پر وا یلا مچتا ہے۔ دورِ زوال میں معاشرے کی سیاسی قیادت چوں کہ مذہب بے زار ہی ہوتی ہے، لہٰذا وہ ایسوں ہی کی پذیرائی چاہتی ہے۔ دوسری قوت جو اِس سیلِ عصیاں کے سامنے بند باندھ سکتی ہے وہ ''رسوخ فی العلم'' کی صفت سے متصف حضرات علماء کی ہوسکتی ہے، مگر اس ضمن میں خاص برصغیر میں مسلم سماج کے ساتھ وہ المیہ ہو گزرا ہے کہ ہم عوام کو بحیثیت مجموعی اِس ڈاکہ زنی کا ادراک تک نہیں ہے۔

تحریکِ استشراق کے ذریعے انگریزی استعمار اس بات کو بخوبی سمجھ چکا تھا کہ مسلم سماج، زوال کی انتہاء کو پہنچنے کے باوجود علماء کی محنت سے دوبارہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اِس حقیقت کو دیکھتے ہوئے اُس نے عوام کی نظروں میں علماء کی اہمیت کو کم کرنے کی منصوبہ بندی کی جس کی دو جہات یا دو سطحیں تھیں:

اوّل: جنگی حکمت عملی:

اس پہلو سے استعمار نے یہ کیا کہ قتل و غارت کے ذریعے ان علماء کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جو اس کے برصغیر پر راج کی راہ میں رکاوٹ تھے اور ہوسکتے تھے۔ برصغیر کے طول و عرض میں جہاد کے معرکوں میں مسلمانوں کی شکست کے بعد انگریزی استعمار نے آئندہ اس نوعیت کا فوری خطرہ بن سکنے

اہلیت رکھنے والے علمی ناموں اوران کے متعلقین کوشہید کردیا۔ جی ہاں! یہ ہمارے اسی برصغیر کی بات ہے کہ علماء کودرختوں پر لٹکایا گیا اور لاشیں اتارنے کی بھی اجازت نہ ہوتی تھی تا کہ لوگ عبرت پکڑیں اور توپوں کے دھانوں کے سامنے باندھ کران مبارک اجسام کو چیتھڑوں میں اڑادیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی مدنظر رہے کہ راقم کے علم کی حد تک زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چل سکنے والے''جدید اسلام'' کا داعی کوئی نام بھی اس سزا کا مستحق نہیں ٹھیرا تھا۔ یہ سب جدید یے''گھی شکر'' کی چوری کھانے والے اپنے منہ میاں مٹھو تھے جن سے دشمن اسلام کو ذرا سا بھی خوف نہ تھا۔

دوم: فکری حکمت عملی:

اِس جنگی حکمت عملی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری جارحانہ حکمت عملی برصغیر کے مسلم سماج میں ''راسخ فی العلم'' حضرات کو معاشرتی قیادت کی سطح پر''کھڈے لائن''(Marginalized) کرنا تھا۔ جب انگریز نے دیکھا کہ''بالاکوٹ''اور''شاملی'' جیسے محاذ کسی بھی وقت علاقائی سطح پر طاقت کا توازن بگاڑ سکتے ہیں تو اس نے اِن واقعات کے اسباب کوختم کرنے کے لیے باقی ماندہ علماء کو طاقت کے ذریعے روکنے کی بجائے نیا ہتھکنڈہ استعمال کیا کہ انھیں معاشرے میں بے وقعت کردیا جائے۔ اس سے پہلے مسلم سماج کی قیادت ہمیشہ علماء کے ہاتھ رہی تھی۔ دربار خلافت میں پذیرائی حاصل کر لینے والا''فتنہ خلق قرآن'' عوامی سطح پر نفوذ نہ کرسکا اور یہاں برصغیر میں اکبر کا دین الٰہی بھی معاشرے کو قائل نہ کرسکا۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے انگریز نے ایک متبادل قیادت اُٹھانے کی منصوبہ بندی کی۔ نفس انسانی کا نقلی اور عقلی مطالعہ بتاتا ہے کہ نفس کو بھلی لگنے والی بات سماجی سطح پر بہت آسانی سے قبولیت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

برصغیر میں اِس متبادل قیادت کے سرخیل''سر'' سید احمد خان ہیں۔ ان کے بعد ان کے بہت سے جانشینوں کے ہاتھوں یہ سلسلہ مختلف ناموں اور مختلف انداز سے جاری رہنے کے بعد اب موجودہ دور میں خطۂ پاکستان میں تجدد کے قائدین میں سب سے بڑا اور معتبر نام جاوید احمد غامدی صاحب کا ہے۔ آئندہ بحث میں' جرم زنا کی سزائے''رجم'' کے ضمن میں موصوف نے سنت کے مقام کو گھٹاتے اور مشکوک کرنے اور امت کے چودہ سو سالہ علمی سرمائے کو یک قلم مسترد کردینے کی سعی نامشکور میں جس دجل سے کام لیا ہے' اس کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے گا۔

غامدی منہج استنباط کا مقصد:

مسائل شرعیہ میں غامدی صاحب کے منہج استنباط کا مطالعہ کیا جائے تو ایک نتیجہ بالکل عیاں ہوجاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریعی حیثیت کو مشکوک کردینا چاہتے ہیں۔

اپنے اس مقصد کو پانے کے لیے وہ انکارِ حدیث جیسا قدم اٹھانے کی جرأت تو کر نہیں سکتے، کیوں کہ اس صورت میں وہ ایک عامی کے سامنے بھی اپنی وقعت کھو بیٹھیں گے۔ چنانچہ وہ کبھی سنت کی تعیین کے سلسلے میں ایسی تراش خراش کرتے ہیں کہ فقہائے کرام تو ایک طرف خود حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم بھی معاذ اللہ اس اعلیٰ سطح تک نہ پہنچ سکا کہ ان کی اپنی ''معاشرتی اقدار'' کے ''مطابق'' کیا جانے والا کون سا نبوی عمل سنت ہے اور کون سا عرب معاشرے کا رواج ہے؟ کبھی وہ یہ کرتے ہیں کہ علوم دینیہ کی خدمت میں اپنی عمریں کھپا ڈالنے والے اصحاب علم سے بالکل ہٹ کر احادیث میں ''تعارض'' کی تعیین کرتے ہیں کہ پوری امت جس کو ''عام'' اور ''خاص'' کا فرق قرار دیتی آئی ہے ان صاحب کے نزدیک وہ ''تعارض'' قرار پاتا ہے۔

قرآن وسنت میں سزائے رجم کا بیان:

امت کے تمام فقہی مکاتب کے ہاں سزائے رجم کے درست ہونے اور ثابت بالسنۃ ہونے کے ضمن میں کبھی دو رائیں نہیں رہیں۔ ماضی کے جبالِ علم میں سے کسی نے بھی سزائے رجم کے سلسلے میں مروی ''متواتر المعنیٰ'' [سنگ ساری کی سزا سے متعلق سنت ۱۵ صحابہ کرام سے مروی ہے (عدالتی فیصلے، جسٹس (ر) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی ۱/۴۰ تا ۴۴)] سنت کی روایات کے بظاہر اختلاف کو ''تعارض'' کا نام دیا ہو، بلکہ وہ اسے ہمیشہ ''عام'' اور ''خاص'' کا فرق کر کے بیان کرتے رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورہ نور کی آیت ۲ [فٹ نوٹ: الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ] میں زانی اور زانیہ کی سزا ہر قسم کے زانی کے لیے عام ہے، جب کہ سنت میں مذکور سزا یعنی ''رجم'' ایک خاص قسم کے زانی یعنی محصن کی سزا ہے، لہٰذا اسے کسی بھی صورت قرآنی سزا کے معارض نہیں کہا جا سکے گا۔ اور ایسا معاملہ دنیا کے ہر قانون میں ہوتا ہے کہ کسی قانون شکنی پر ایک عام سزا ہوتی ہے اور جرم کی شدت کے اعتبار سے بعض صورتوں میں اس سزا کو سخت بھی کر دیا جاتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے ایک پہلو کی تشریح سے ہو جاتی ہے جو آئندہ سطور میں آئے گا۔

قرآن کو بیان کرنے کے نبوی منصب کا مفہوم:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور ذمہ داری کی تفصیل قرآن میں جا بجا آئی ہے۔ اسی سے متعلق ایک ارشاد مبارک ہے:

''و انزلنا الیك الذکر لتبین للناس منزل الیھم'' [۱۶/۴۴]

(اے نبی) ہم نے آپ کی طرف قرآن اس لیے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اس چیز کا

یون ترین جو ان کی طرف نازل کیا گئی ہے۔

جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب اس آیت میں بیان ہوئے منصب نبوت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب یہ بتایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کا بیان فرمائیں اور بیان کے مفہوم میں جہاں کسی مجمل بات کی تشریح داخل ہے وہاں کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق (Unqualified) کی تقیید (Qualifying) بھی داخل ہے۔"

[عدالتی فیصلے، ۱/۳۵]

گزشتہ سطور میں جرم زنا کی سزائے رجم کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس ضمن میں مروی سنت متواتر المعنیٰ ہے، لہٰذا آپ علیہ الصلوۃ والسلام کے منصب کی اس مندرجہ بالا تشریح کے مطابق بغیر کسی شک اور ریب کے یہ کہنا جائز ہوگا کہ زانی کی قرآنی سزا کے "عموم" میں اس سنت نے "تخصیص" پیدا کر دی ہے۔

اس کے ساتھ بعض روایات سے علم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی شدہ زانی کے لیے صرف رجم نہیں بلکہ کوڑوں کی سزا اور پھر سزائے رجم بیان فرمائی ہے، تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو اس صورت میں قرآن کے حکم پر اضافہ ہوا!!! مگر عملی فیصلہ نافذ ہونے کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سنگ ساری کی سزا پر ہی اکتفاء فرمایا تو ایسا کیوں ہوا؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلہ ایسا ہے کہ اس میں انھوں نے زانیہ کو اوّلاً کوڑے لگوائے اور بعد میں رجم کروایا [الجامع الصحیح للبخاری: ۳/۰۳۵] اسی طرح بعض فقہاء اس علوی فیصلے کے مطابق رائے دیتے رہے ہیں۔ [فتح الباری: ۲۱/۵۰۱]

شاہ ولی اللہ کوڑوں اور رجم کی سزائیں سے صرف رجم کی سزا پر اکتفاء کرنے کے نبوی فیصلے سے متعلق بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"و الحکمة في ذلك أن الرجم عقوبة تاتي على النفس، فأصل الزجر المطلوب حاصل به، و الجلد زيادة عقوبة رخص في تركها، فهذا هو وجه الاختصار على الرجم عندي." [المسوىٰ مع المصفىٰ شرح موطا: ۲/۱۳۵]

"رجم ایسی سزا ہے جس سے جان چلی جاتی ہے، لہٰذا عبرت کا اصل مقصد اس سے حاصل ہو جاتا ہے، اور کوڑے محض زیادہ سزا دینے کے لیے ہیں۔ اس لیے ان کو چھوڑنے کی اجازت دی گئی۔ میرے نزدیک رجم پر اکتفاء کرنے کی یہی وجہ ہے۔"

غامدی موقف کا تنقیدی جائزہ:

اس موضوع پر اہل علم کا اتنا مفصل کلام موجود ہے کہ یہاں کی جانے والی بحث تحصیل حاصل ہی کے ضمن میں آئے گی۔ ایک مضمون کی وسعت کے پیش نظر ہم جناب غامدی کے موقف کے ایک پہلو کو

لے کر اس کا تنقیدی جائزہ لیں گے کہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے ''معجن'' کی اس دیگ میں سے چاول کے یہ چند دانے ہی اس کی پوری حقیقت واضح کر دیں۔

غامدی صاحب کی کتاب برہان میں ''رجم کی سزا'' کے عنوان کے تحت ان کے موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ سورہ نور کی آیت نمبر۲ میں مذکور سزائے زنا (سو کوڑے) کنوارے اور شادی شدہ زانی دونوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے زنا پر ''سنگ ساری'' کی جو سزا مروی ہے، یہ ہے تو ثابت مگر یہ صرف شادی شدہ ہونے پر نہیں دی گئی، بلکہ ان کا یہ جرم ''حرابہ'' [المائدۃ:۳۳] سے تعلق رکھتا تھا، لہٰذا اِس بنا پر ان پر یہ سزا نافذ کی گئی تھی۔ اِس سلسلے میں جو روایات بیان کی جاتی ہیں وہ اپنے باہمی تعارض 'جو نا قابل ارتفاع ہے' کی بنا پر نا قابل اعتبار ہیں۔ اور امت کے فقہاء نے اس ضمن میں ان احادیث سے جو حکم بیان کیا ہے وہ سب غلطی پر تھے۔ [خلاصہ از برہان]

اب ذیل میں ہم غامدی صاحب کے موقف کا جائزہ لیں گے۔

کیا رجم کی علت اوباشی 'غنڈہ گردی اور حرابہ ہے؟!

جناب غامدی صاحب اپنے استاد صاحب سے ایک بات لے کر آئے ہیں جس کی طرف امت کی تیرہ صدیوں میں کسی کا ذہن بھی نہیں گیا ہے، مگر اس ''علت'' کو ڈھونڈ نکالنے میں ان کے پاس کوئی نقلی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ نقلی دلیل ان کے لیے ہے ہی غیر اہم!!! موصوف کے مطابق شادی شدہ زانی پر آپ نے سنگ ساری کی جو سزا نافذ کی اس کی وجہ اوباشی اور غنڈہ گردی تھی یا وہ حرابہ کے ضمن میں آئے گی کہ شادی شدہ ہو کر یہ جرم کرنا اسلامی معاشرے کے لیے حرابہ ہی کی طرح کا جرم ہے۔

ہم یہاں طوالت سے بچتے ہوئے صرف دو سوالات اٹھائیں گے کہ غامدی صاحب ان کا جواب عنایت فرما دیں۔

۱۔ عہد نبوی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی مقدمات زنا کو سنا، اُن میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بات کی تفتیش اور تحقیق کروائی کہ زانی کا کردار کیسا ہے؟!

۲۔ اسی طرح یہ کہ کوئی ایک روایت ایسی ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پوچھے بغیر کسی واقف حال نے زانی کے کردار کے بارے میں بتایا ہو کہ یہ شخص اوباش اور بد کردار ہے تو اِس اطلاع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سزا کو شدید کر کے نافذ کیا ہو؟!

۳۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ایسا منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا (جسے آپ بھی ثابت مانتے ہیں) کو نافذ کرتے ہوئے صراحتاً یا کنایتاً اسے حرابہ قرار دیا ہو؟

[illegible] کی بنا پر رجم کیا؟ کیا اوباش صرف شادی

شدہ لوگ ہی ہوتے ہیں؟

غامدی استنباط کی کمزوری:

حضرت ماعزؓ کے جس واقعے پر غامدی اوران کے استاد جناب امین احسن اصلاحی صاحب کے موقف کی ساری عمارت کھڑی ہے، اس بارے میں انھوں نے اپنے دلائل کو جس طرح سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں جگہ جگہ پر جھول موجود ہیں۔ اِس ضمن میں ایک گزارش تو ہم آئندہ عنوان کے تحت کریں گے، مگر یہاں پر کچھ ضروری نکات اُٹھائے جائیں گے۔

ان کی تقریر سے ایسا تاثر بنتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدمے کا فیصلہ کرنے کے دوران چند غیر اہم اور ادھر ادھر کے سوالات تو بڑی تفصیل سے دریافت فرمائے مگر ''شہوت کی بنا پر بکرے کی طرح بلبلانا اور عورتوں سے دست درازیوں'' جیسا جرم تھا اس بارے میں کوئی تفتیش نہ کی۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ بات تصور میں نہیں آسکتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے سارے غیر متعلق سوالات فرما لیے ہوں اور جس چیز کو ''رجم'' جیسی ہولناک سزا کی اصل بنیاد بنتا تھا اس کے بارے میں کوئی بات نہ پوچھی ہو، اس کو راویوں کی فروگذاشت کہنا بھی نا قابل تسلیم ہے، اِس لیے کہ حضرت ماعزؓ کا واقعہ سولہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے، اور یہ بات نا قابل تصور ہے کہ یہ سولہ کے سولہ صحابہ غیر متعلق یا ثانوی سوالات کا تو تفصیل سے ذکر کریں اور اصل جرم کے بارے میں کوئی ایک راوی ایک لفظ بھی روایت نہ کرے۔

پھر زنا کا جرم تو حضرت ماعزؓ کے اپنے اعتراف سے ثابت ہوگیا تھا، لیکن اگر ''خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی عام عادت کا جرم'' اُن پر عائد کر کے انھیں سنگسار کیا گیا تو جرم کا ثبوت کیسے ہوا؟ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی سنگین سزا مجرم کے اعتراف یا گواہیوں کے بغیر صرف سنی سنائی بات پر جاری کردی؟ حضرت ماعزؓ کے بارے میں تو ایک زنا کے واقعے کے سوا عام بدکرداری کا کوئی ادنیٰ ثبوت کسی روایت میں نہیں ملتا، لیکن ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسی تھی جس کے چال چلن سے بدکرداری ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "لو رجمت أحدا بغير بينة رجمت هذه" [عدالتی فیصلے، ۱/۶۰]

سزائے رجم: غامدی کے اپنے اصول کی زد میں:

حضرت ماعزؓ کے کردار کے بارے میں جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے مسلم کی ایک روایت کا حوالہ دیا ہے کہ ''کیا یہی نہیں ہوا کہ جب کبھی ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے تو ہمارے اہل

وعیال میں سے ایک شخص پیچھے رہ گیا جو شہوت کے جوش میں بکرے کی طرح بلبلاتا تھا! سنو مجھ پر لازم ہے کہ اس طرح کا کوئی مجرم میرے پاس لایا جائے تو میں اسے عبرت ناک سزا دوں۔[مسلم: رقم، ۸۲۴۴]

اس ماعزؓ کے کردار اور ان کی توبہ کی تحسین کے بارے میں کئی روایات کا ذکر کرکے یہ کہا ہے کہ:

''لیکن حق یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اُس (ماعزؓ) کے اُس کردار کی نفی کی جاسکے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے نمایاں ہوتا ہے۔ اعتراف جرم اور ندامت سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ یہ کوئی مردِ صالح تھا جس سے یہ جرم اتفاقاً سرزد ہو گیا تھا۔'' (برہان، جاوید غامدی)

جناب غامدی صاحب اپنے روایتی دجل وفریب سے یہاں بھی باز نہ رہ سکے۔ اتنی روایات لے آئے کہ کوئی یہ نہ کہہ دے کہ میں نے اپنے مؤقف کو مدلل کرنے میں غلط بیانی کی ہے، مگر ایک بہت واضح روایت چھوڑ آئے جو ان کے اور ان کے استاد موصوف کے دجل کا پردہ فاش کرنے والی ہے۔ حضرت ماعزؓ کے اعتراف کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے قبیلے کے لوگوں سے معلومات لیں تو انھوں نے جواب دیا:

"ما نعلمه إلا و في العقل من صالحينا فيما نرىٰ" [مسلم، ۲/۸۶ باب من اعترف علی نفسه بالزنا]

''ہمارے علم میں تو وہ کامل العقل ہیں اور جہاں تک ہمارا خیال ہے وہ ہمارے نیک لوگوں میں سے ہیں۔''

اب جناب غامدی کے موقف، جو پوری امت میں یہی سمجھے ہیں، اس کی کمزوری ملاحظہ کیجیے:

سزائے رجم کے سلسلے میں اسی کتاب برہان کی اسی بحث میں آگے چل کر روایات کے ''تعارض'' پر بظاہر بڑی محققانہ بات کرنے کی کوشش کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اب کس پر یقین کریں اور کس پر نہ کریں (لہٰذا سب کچھ ردی کی ٹوکری میں)۔ مگر یہاں پر حضرت ماعزؓ کے کردار کے بارے میں دو مختلف موقف (بدکرداری والا موقف غامدی اور ان کے استاد کی طرف سے حضرت ماعزؓ پر چسپاں کیا گیا ہے، جب کہ اصل میں وہ اس سے مراد نہیں ہیں) صرف مسلم کی روایت سے ثابت ہیں، مگر موصوف چودھویں صدی میں جس تعارض کو رفع کرنے والے واحد محقق ہوئے ہیں، انھوں نے اس تعارض کو رفع کرنے کا ایک ہی طریقہ ڈھونڈھا ہے کہ اس موخر الذکر روایت کو ذکر ہی نہ کیا جائے۔

لہٰذا ''اصول غامدی'' کے تحت اس رفع نہ ہو سکنے والے تعارض کی بنا پر یہ سب روایات ردی کی ٹوکری میں پھینک دی جانی چاہیں اور اس صورت میں یہاں سے پوری امت کے برخلاف نبوی فیصلے سے ''حرابہ کی سزا'' کرکے نافذ کیا جانے والا استنباط خود سے کالعدم ہو جائے گا۔

لہٰذا غامدی صاحب سے یہی عرض کیا جاسکتا ہے

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مولانا مفتی عبد الواحد مد ظلہم

زانی محصن کی سزائے رجم اور غامدی صاحب

......"تحفہ غامدی" سے انتخاب

ابن منذر رحمہ اللہ اپنی کتاب الاجماع میں لکھتے ہیں

"وأجمعوا على أن الحر إذا تزوج حرة تزويجا صحيحا، ووطئها في الفرج أنه محصن يجب عليهما الرجم إذا زنيا". تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جب آزاد شخص کسی آزاد عورت سے صحیح نکاح کر لے اور آگے کی راہ میں اس سے جماع کر لے تو وہ محصن ہے اور یہ دونوں جب زنا کریں تو ان کی سزا رجم ہے۔"

ابن حزم رحمہ اللہ اپنی کتاب مراتب الاجماع میں لکھتے ہیں:

"واتفقوا انه اذا زنى كما ذكرنا و كان قد تزوج قبل ذلك ان عليه الرجم بالحجارة حتى يموت." سب فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جب کوئی شخص مذکورہ طور سے زنا کرے اور وہ اس سے پہلے نکاح کر چکا ہو تو اس کی سزا رجم (سنگساری) ہے یہاں تک کہ وہ (اسی میں) مر جائے۔"

ان دو حوالوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوئی کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور اس پر پوری امت کا اتفاق و اجماع ہے اور امین احسن اصلاحی صاحب کے بقول اس کی مخالفت کسی کے لئے جائز نہیں، لیکن خود اصلاحی صاحب یہاں اجماع کی مخالفت کرتے ہیں اور غامدی صاحب ان کی مکمل تائید کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنی کتاب برہان میں "رجم کی سزا" کے عنوان سے کچھ مضامین لکھے ہیں جو ان کے بقول:

"ان تنقیدوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں جو رجم کی سزا کے بارے میں استاذ امام امین احسن اصلاحی کے اس موقف پر ہوئی ہیں جو انہوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں بیان کیا ہے" [برہان: ۳۴]

اجماع ثابت ہونے کے بعد اب دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اصلاحی اور غامدی صاحب بلکہ ان کے بھی امام جناب حمید الدین فراہی صاحب اس اجماع کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔

یہ تینوں حضرات یہ بات تو مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں بعض لوگوں کو رجم کیا گیا لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ رجم زنا کی حد کے طور پر نہیں تھا بلکہ فساد اور سرکشی کی سزا کے طور پر تھا۔ حمید الدین فراہی صاحب لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ (شادی شدہ اور غیر شادی شدہ) دونوں صورتوں میں پہلی حد سو کوڑوں ہی کی ہے لیکن اگر مجرم سزا پانے کے بعد پھر اسی گناہ میں مبتلا ہوں تو انہیں سخت سزا دینا اولی ہے کیونکہ اب ان کا

گناہ حدود اللہ کے مقابلہ میں جسارت دکھانے کا ہے اور قرآن نے مفسدین فی الارض اور حدود اللہ سے معاملہ میں سرکشی کرنے والوں کے لئے ان کے گناہ کے درجات کے لحاظ سے سزا کے مختلف درجے بیان کئے ہیں مثلاً تقتیل (بری طرح قتل)، سولی، قطع اطراف (یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹنا) اور جلاوطنی وغیرہ چنانچہ حضور نے ماعز کے قضیہ میں یہ تصریح فرمائی۔ چونکہ وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کی بداخلاقی حد سے بڑھی ہوئی تھی اس لئے اس کو جو سزا دی گئی وہ نکال (عبرت کی سزا) ہے"۔

اصلاحی صاحب فرماتے ہیں:

"اسی طرح شادی شدہ زانی کی اصل سزا جیسا کہ روایت سے واضح ہے، ہے تو تازیانہ، لیکن اگر کوئی شخص تازیانہ کی سزا سے قابو میں نہیں آرہا ہے اور معاشرے کے لئے ایک خطرہ بن چکا ہے تو اس کو حکومت تقتیل یعنی رجم کی سزا از روئے سورہ مائدہ دینے کا اختیار رکھتی ہے"۔ [تدبر قرآن: ۳/۵۰۷]

نبی ﷺ کے دور میں رجم کے جو دو تین واقعات پیش آئے مثلاً ماعز رضی اللہ کا اور غامدیہ رضی اللہ عنہا کا وغیرہ تو تفتیش و جستجو کے باوجود یہ بات نہیں ملتی کہ ان کو پہلی مرتبہ زنا کرنے پر کوڑے لگے ہوں اور اس پر بھی باز نہ آنے اور دوبارہ ارتکاب کرنے پر ان کو رجم کیا گیا ہو بلکہ ان کو پہلی ہی دفعہ اور وہ بھی ان کے خود آکر متعدد بار اعتراف جرم کرنے اور پاک صاف کرنے کے مطالبہ پر رجم کیا گیا تو بظاہر ان کی جانب سے حدود اللہ کے مقابلہ میں سرکشی نہ پائی گئی۔ لہٰذا فراہی اور اصلاحی صاحبان کے ضابطہ کے مطابق ان کو رجم کی سزا نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس مشکل کے حل کے لئے اصلاحی صاحب نے پہلے تو یہ ضابطہ نکالا کہ

"رجم یعنی سنگسار کرنا ہمارے نزدیک تقتیل کے تحت داخل ہے۔ اس وجہ سے وہ غنڈے اور بدمعاش جو شریفوں کی عزت و ناموس کے لئے خطرہ بن جائیں جو اغوا اور زنا کو پیشہ بنالیں جو دن دہاڑے لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کے مرتکب ہوں ان کے لئے رجم کی سزا اس معنی میں داخل ہے"۔ [تدبر قرآن ۲:۳۷۲]

پھر یہ حضرات اس کے درپے ہوئے کہ ان بے چاروں کو نہایت خطرناک قسم کے بدمعاش ثابت کیا جائے، اس لئے فراہی صاحب لکھتے ہیں۔

"چونکہ وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوا اور اس کی بداخلاقی حد سے بڑھی ہوئی تھی ....
التبیس" [اشراق: مارچ ۸۸ء، ص:۳۹]

اور اصلاحی صاحب لکھتے ہیں:

"ماعز کے بارے میں کتابوں میں جو روایات ملتی ہیں ان میں نہایت عجیب قسم کا تناقض ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑا بھلا مانس آدمی تھا اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت

خصلت غنڈا تھا۔ میری رہنمائی کے لئے یہ بات کافی ہے کہ نبی ﷺ نے اس کو رجم کی سزا دلوائی۔ اس وجہ سے میں ان روایات کو ترجیح دیتا ہوں جن سے اس کا وہ کردار سامنے آتا ہے جس کی بنا پر یہ مستحق رجم ٹھہرا۔" [تدبر قرآن ص:۴/۵۰۵]

دیکھئے اصلاحی صاحب کو چاہئے تو یہ تھا کہ وہ یہ ثابت کرتے کہ رجم کی سزا حدود اللہ کے مقابلہ میں سرکشی کرنے اور فساد کرنے کی بنا پر دی گئی۔ اس کے بجائے رجم کی بنیاد پر وہ بدکرداری اور فساد و سرکشی کو ثابت کر رہے ہیں، فیاللعجب! دعوے کو دلیل سے ثابت کرنے کے بجائے وہ دعوے کو ہی دلیل بھی بنا رہے ہیں۔ پھر اصلاحی صاحب کی نظر میں حضرت ماعز اور غامدیہ رضی اللہ عنہما کا کردار کیا ہے؟ اس کی تفصیل بھی پڑھئے۔

"اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بہت سے ڈیرے والیاں ہوتی تھیں جو پیشہ کراتی تھیں اور ان کی سرپرستی زیادہ تر یہودی کرتے تھے جو ان کی آمدنی سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسلامی حکومت قائم ہو جانے کے بعد ان لوگوں کا بازار سرد پڑ گیا لیکن اس قسم کے جرائم پیشہ آسانی سے باز نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قماش کے کچھ مرد اور بعض عورتیں جو زیر زمین یہ پیشہ کرتے رہے اور تنبیہ کے باوجود باز نہیں آئے۔ بالآخر جب وہ قانون کی گرفت میں آئے تو مائدہ کی اسی آیت کے تحت آپ نے ان کو رجم کرایا"۔ [تدبر قرآن:۴/۵۰۶]

اصلاحی صاحب کی مزید تحقیق ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ کو اس (یعنی ماعز) کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آیا تھا اس وجہ سے آپ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ آپ نے اس کو بلوا کر تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب اقرار کر لیا تو آپ نے اس کے رجم کا حکم دے دیا"۔

[تدبر قرآن:۴/۵۰۶]

اب کوئی اصلاحی صاحب کے لائق شاگرد غامدی صاحب سے ہی پوچھے کہ ماعز اور غامدیہ کے مسلمان ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی نماز جنازہ بھی پڑھی گئی اور نبی ﷺ نے ان کی توبہ کے عظیم ہونے کی خبر بھی دی۔ کیا خود مسلمان ہونے کے بعد بھی وہ ڈیرے چلاتے تھے اور بدمعاشیاں کرتے تھے؟ اور نبی ﷺ نے ان کو تنبیہ کس وقت کی تھی؟ اور آپ قانون کی کونسی شق کے تحت ان کے خلاف اقدام سے باز رہنے پر مجبور تھے؟ پھر وہ قانون کی گرفت میں کس طرح سے آئے اور آپ نے کن لوگوں کے ہاتھ ماعز کو گرفتار کرایا؟ اور کیا ماعز ایسا بزدل قسم کا بدمعاش اور غنڈا تھا کہ تنبیہ سے تو باز نہیں آیا محض ایک تیکھی نظر سے اس نے سب کچھ اگل دیا؟ اور سزا سے پہلے اس غنڈے بدمعاش نے توبہ کس وقت کی تھی یا کسی سرکش مجرم کی

سزا خود بخود اس کی توبہ بن جاتی ہے اگرچہ اس کی جانب سے توبہ کے کچھ آثار بھی ظاہر نہ ہوں؟

کیا غامدی صاحب کی نظر میں ان سوالات کا حل کرنا قابل التفات نہیں اور کیا فراہی صاحب اور اصلاحی صاحب کی شخصیتیں ایسی ہیں جن کے آگے دلیل اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے؟

غامدی صاحب نے اصلاحی صاحب کی تائید میں جو لکھا ہے وہ بھی پڑھ لیجئے۔ لکھتے ہیں:

''بعض روایات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو سب سے پہلے اسی نے اپنے جرم کے بارے میں بتایا، لیکن ابن عباس کی ایک روایت میں بالصراحت بیان ہوا ہے کہ حضور ﷺ اس سے پہلے ہی اس کے جرم سے مطلع تھے۔ (یہ بات مستحضر رہے کہ ماعز از خود اپنی توبہ کے لئے آئے تھے انہیں پکڑ کر نہیں لایا گیا تھا۔ ناقل) صحیح مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ماعز سے پوچھا مجھے تمہارے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا ہے کیا وہ درست ہے؟ اس نے کہا آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے فلاں قبیلہ کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے چار مرتبہ اقرار کیا تب اس پر حد نافذ کرنے کا حکم دیا گیا، چنانچہ اسے رجم کر دیا گیا۔ اس کے جرم کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں کوئی واضح بات اگرچہ روایات میں بیان نہیں ہوئی لیکن ابن سعد کی روایت کے مطابق جس عورت سے اس نے بدکاری کی اسے چونکہ حضور ﷺ نے بلایا مگر اس سے کچھ مواخذہ نہیں کیا اس وجہ سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا تھا''۔ [برہان: ۴۳۔۴۵]

اوپر کی باتوں کے ساتھ غامدی صاحب کی اس تحقیق کو ملائیے تو یہ نتیجہ سامنے آیا کہ اگر کوئی شادی شدہ شخص کسی عورت کو بہلا پھسلا کر اور اس کے ساتھ خفیہ آشنائی رکھ کر اگر زنا کرے تو اس کو تو صرف سو کوڑے لگاؤ۔ کیونکہ اس نے زمین میں فساد نہیں کیا اور حدود اللہ کے مقابلہ میں کوئی سرکشی نہیں کی اور کوئی زنا بالجبر کر بیٹھے تو وہ حدود اللہ کے مقابلہ میں سرکش ہے اور مفسد فی الارض ہے۔

پھر کوئی غامدی صاحب سے پوچھے کہ یہ کیسی ریاست کے خدوخال ہیں کہ جس میں نبی ﷺ کو ایک شخص کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہے لیکن آپ اس کی گرفت نہ کریں اور جب وہ زنا بالجبر کر چکے تب بھی کسی کو اس کی گرفتاری کے لئے نہ بھیجیں ہاں وہ خود ہی لوگوں کے ساتھ آ جائے تو بس نبی ﷺ صرف تیکھے انداز سے پوچھیں اور وہ ایسا پکا غنڈہ بدمعاش اور حدود اللہ سے سرکش انسان بلا طلب چار بار اقرار کرے حالانکہ خود غامدی صاحب اس بات کو مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دو جلیل القدر ساتھیوں یعنی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بار بار لوٹایا اور تلقین کی کہ سزا پانے کی بجائے اسے اپنی اصلاح کرنی چاہئے اور اس کے سرپرست سے بھی یہی بات کہی اور عام لوگوں کو بھی اسی کی نصیحت کی۔ [برہان: ۷۷]

ان حضرات کی تحقیق کی کیا شان ہے۔ جس شخص کی گرفت کے آپ ﷺ منتظر تھے وہ جب زنا بالجبر کر کے یعنی پوری غنڈہ گردی کا مرتکب ہو کر اب آپ کی گرفت میں آیا تو آپ ﷺ اور آپ کے جلیل القدر ساتھی یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو بار بار واپس جا۔نے کو اور محض توبہ و استغفار کرنے کو کہیں اور اس کے سرپرست کو بھی یہی بات کہیں۔ تـقـتـیـل کے تحت رجم کرنا تو ایک طرف ان حضرات کی کوشش یہ ہو کہ اس کو کوڑے بھی نہ لگیں۔

اور ماعز اور غامدیہ کی حد سے بڑھی ہوئی بداخلاقی اور غنڈہ گردی کو فراہی، اصلاحی اور غامدی صاحبان جس دلیل سے ثابت کرتے ہیں اس کو بھی دیکھ لیجیے۔ صحیح مسلم میں دو روایتیں ہیں جن میں یہ مضمون ہے:

۱......حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے:

"فرجمه ثم خطب فقال ألا كلما نفرنا غازين في سبيل الله خلف أحدهم له نبيب كنبيب التيس يمنح احدهم الكثبة أما و الله لا يمكني من احدهم الا نكلته عنه"

اس کو رجم کیا پھر نبی ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا ''آگاہ رہو جب بھی ہم اللہ کے رستے میں غزوے کے لئے نکلتے ہیں ان لوگوں میں سے کوئی پیچھے رہ جاتا ہے اور شہوت زدہ بکرے کی طرح آواز نکالتا ہے۔ وہ تھوڑے سے دودھ کی بخشش کرتا ہے۔ خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے ایسے شخص پر قدرت دی تو میں اس کو عبرتناک سزا دوں گا۔''

۲......حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"ثم قام رسول الله خطيبا من العشى فقال أو كلما انطلقنا غزاة في سبيل الله تخلف رجل في عيالنا له نبيب كنبيب التيس علىّ ان لا أوتى برجل فعل ذلك إلا نكلت به"۔

پھر شام کے وقت رسول اللہ ﷺ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ جب بھی ہم اللہ کے رستے میں غزوے کے لئے نکلتے ہیں تو کوئی شخص ہمارے عیال میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ وہ شہوت زدہ بکرے کی طرح بولتا ہے۔ مجھ پر لازم ہے کہ ایسا شخص جب بھی میرے پاس لایا جائے گا میں اس کو عبرتناک سزا دوں گا۔''

ان حدیثوں سے جو تصویر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب مسلمان کسی غزوہ کے لئے نکلتے تو کچھ منافقین پیچھے رہ جاتے اور مجاہدین کے گھر والوں کی دیکھ بھال کے پردے میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں ان کے پاس لے جاتے اور بعض اوقات دبے لفظوں میں کچھ بے حیائی کے کلمات کہہ دیتے۔ ماعز رضی اللہ عنہ کو چونکہ رجم کیا گیا تھا جو خود عبرتناک سزا ہے اس کی مناسبت سے نبی ﷺ نے تنبیہ فرما دی کہ منافقین ایسی حرکتوں سے باز آ جائیں ورنہ ان کو عبرتناک سزا دی جائے گی۔ نبی ﷺ کی حکومت اتنی کمزور نہیں تھی

اور یہ منافق اتنے جری نہیں تھے کہ اعلانیہ لوگوں کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈال سکیں اور کھلم کھلا زنا بالجبر کر سکیں۔ وہ تو بس دبے دبے لفظوں میں کچھ بے حیائی کے کلمات کہہ دیتے تھے لیکن نبی ﷺ نے ان کی اس معمولی بے حیائی کو بھی برداشت نہیں کیا اور تنبیہ فرمادی۔ لیکن فراہی، اصلاحی اور غامدی صاحبان کی عقل کی داد دیجئے کہ انہوں نے شہوت زدہ بکرے کی آواز سے یہ سمجھ لیا کہ ماعز رضی اللہ عنہ جیسے مسلمان بھی شہوت زدہ سانڈ کی طرح کھلم کھلا ڈکراتے تھے اور زنا بالجبر کرتے تھے اور لوگوں کی عزت و آبرو پر ڈاکے ڈالتے تھے اور اسلامی حکومت ان کے مقابلے میں بالکل بے بس تھی۔

غامدی صاحب یہ تو کہتے ہیں کہ:

"عقل و دانش کی جو مقدار ہمارے مدرسوں میں باقی رہ گئی ہے اس کے بل بوتے پر اس سے زیادہ کیا چیز ہے جس کی توقع ان لوگوں سے کیا جا سکتی ہے"۔ [برہان: ۷۸]

لیکن مذکورہ تحقیقات ملاحظہ کرنے کے بعد ہم بھی ان حضرات کی عقل و دانش پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

مذکورہ بالا تحقیق سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ اصلاحی اور غامدی صاحبان نے رجم سے متعلق جو کہانی گھڑی ہے وہ نہ صرف یہ کہ پوری کی پوری بلا دلیل ہے بلکہ عقل سے بھی کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔

اب ہمارے ذمہ صرف اتنی بات رہ جاتی ہے کہ ہم شادی شدہ زانی کے لئے رجم کے حد ہونے کی دلیل کو واضح کر دیں۔ اس کو اگلے عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں۔

رجم کی حد اور قرآن کا سنت سے نسخ:

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"زنا کی سزا کے بارے میں ہمارے فقہاء کے ان مسالک پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان حضرات نے قرآن مجید کی بیان کردہ سزا میں سنت کے ذریعے سے اضافہ کر دیا ہے یا اسے کنوارے اور کنواری کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ فقہاء کے ایک گروہ کے نزدیک یہ تخصیص ہے اور دوسرا اسے نسخ سے تعبیر کرتا ہے...... بہر حال اسے نسخ کہئے یا تخصیص اس کی دلیل چونکہ سنت ہی سے دی جاتی ہے اس وجہ سے یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ سنت کیا قرآن مجید کے کسی حکم میں اس نوعیت کا تغیر و تبدل کر سکتی ہے"۔ (برہان: ۳۴۔۳۵)

آگے اس کے بارے میں اپنا ضابطہ لکھتے ہیں:

"وہ (معاملات) جن میں قرآن مجید نے کوئی حکم یا قاعدہ بیان فرمایا ہے تو ان کے بارے میں یہ بات بالکل قطعی ہے کہ سنت نہ قرآن مجید کے کسی حکم اور کسی قاعدے کو منسوخ کر سکتی ہے اور نہ اس میں کسی

نوعیت کا کوئی تغیر و تبدل کر سکتی ہے۔ سنت کو یہ اختیار قرآن مجید نے نہیں دیا ہے اور اب کسی امام و فقیہ کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بطور خود سنت کے لئے یہ اختیار ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید کے کسی حکم میں تغیر و تبدل کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے کہ آپ عقلی قیاسات کی بنا پر اس کے بارے میں حکم لگائیں"۔ [برہان: ۳۷]

غامدی صاحب نے یہ سارا تکلف کیا ہے، فقہاء کی بات سمجھ نہیں پائے اور ان پر طعنہ زنی شروع کر دی۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن پاک میں زنا سے متعلق پہلے پہل یہ آیتیں نازل ہوئیں:

۱..... وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا۔ [سورہ نساء: ۱۵]

"اور جو عورتیں بے حیائی کا کام کریں تمہاری بیویوں میں سے سو تم لوگ ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں میں سے گواہ کر لو۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو تم ان کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرما دیں"۔

۲..... وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا [سورہ نساء: ۱۶]

"اور وہ مرد و عورت جو تم میں سے یہ برائی کریں انہیں ایذا پہنچاؤ، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اصلاح کر لیں تو ان سے درگزر کر دو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے"۔

ان دو آیتوں سے دو حکم ملے:

۱..... اگر شوہر بیویوں پر زنا کا الزام رکھیں اور ان کے جرم پر چار گواہ بھی لے آئیں تو ان کو گھروں میں محبوس رکھا جائے۔

۲..... اگر مرد و عورت زنا کریں خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا کنوارے ہوں تو ان کو حسب حال تعزیر کی جائے۔

خود غامدی صاحب کے بقول:

"زنا کی سزا کا پہلا حکم سورہ نساء میں آیا ہے۔ اس میں کوئی متعین سزا بیان نہیں کی گئی [میزان: ۲۹۹]

مذکورہ بالا پہلے حکم کے بعد دوسرا حکم سنت میں بیان ہوا، امام مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا:

"قال رسول الله ﷺ خذوا عنی خذوا عنی قد جعل الله لهن سبيلا البكر بالبكر جلد مائة و نفی سنة و الثيب بالثيب جلد مائة و الرجم"۔

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے لے لو! مجھ سے لے لو! اللہ تعالیٰ نے جو حکم نازل کرنے کا وعدہ کیا وہ نازل فرما دیا۔ غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لئے سو کوڑے اور ایک سال

کی جلا وطنی (ہے) اور شادی شدہ مرد کی شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لئے سو کوڑے اور رجم (ہے)''۔ [برہان:۵۳]

اسی سنت سے اس بیوی کا حکم بھی معلوم ہوا جو زنا کی مرتکب ہوئی ہو اور شوہر نے اس کے جرم پر چار گواہ فراہم کر دیے ہوں کہ اس کی سزا بھی رجم ہے کیونکہ وہ شادی شدہ ہے۔

اس کے بعد پھر تیسرا حکم قرآن کی سورہ نور میں نازل ہوا جس میں کچھ شقیں بیان ہوئیں کچھ نہیں ہوئیں اور سنت کے حکم میں تبدیلی بھی کی۔ تبدیلی تو یہ ہوئی کہ غیر شادی شدہ کے لئے جلا وطنی کی سزا اور شادی شدہ کے لئے کوڑوں کی سزا منسوخ کر دی گئی۔ جو شق ذکر ہوئی وہ غیر شادی شدہ کی سزا کی ہے اور جو شق ذکر نہیں ہوئی وہ شادی شدہ کی سزا ہے یعنی رجم اور ایک نیا حکم دیا گیا جو سنت میں ذکر نہیں ہوا تھا یعنی شوہر بیوی پر زنا کا الزام رکھیں لیکن چار گواہ فراہم نہ کر سکیں تو اس صورت میں لعان ہوگا۔

یہ سادہ سی ترتیب ہے جس میں نہ تو سنت سے قرآن کے نسخ کا مطلب نکلتا ہے اور نہ ہی تخصیص کا اور اس سے قرآن، سنت اور احادیث سب میں عمدہ تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

لیکن غامدی صاحب ہماری بات کیوں ماننے لگے۔ ایک تو وہ ہمارے ذکر کردہ سنت والے دوسرے حکم کو تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرے وہ سورہ نساء کی آیت کا ترجمہ بھی غلط کرتے ہیں۔

غامدی صاحب سنت سے ثابت دوسرے حکم کو اپنی دھونس سے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سورہ نور میں زنا کی باقاعدہ سزا کے نازل ہونے تک شریعت کا حکم یہی (یعنی سورہ نساء والا) تھا۔ نور کی زیر بحث آیات نے اسے ختم کر دیا اور زنا کے عام مرتکبین کے لئے ایک متعین سزا ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی''۔ [میزان:۲۹۹]

غامدی صاحب کی دھونس بھی ان کی ایک دلیل ہے اس لئے ہمیں ان سے مزید کوئی دلیل مانگنے کی ضرورت نہیں۔

سورہ نساء میں غامدی صاحب کے ترجمہ کے غلطی کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ بات اپنے دل میں جمائے بیٹھے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمان ہو جانے والی کچھ عورتیں اپنی بدکاری کے اڈے چلاتی تھیں۔ غامدی صاحب اور ان کے امام استاذ اصلاحی صاحب کے ذہنوں میں نبی ﷺ کے دور کی اسلامی ریاست کے دار الحکومت کا تصور یہ ہے کہ وہاں مسلمان ہونے والی عورتیں قحبہ خانے چلاتی تھیں اور مسلمان ہو جانے والے مرد شہوت زدہ سانڈ کی طرح ڈکراتے پھرتے تھے اور اعلانیہ غنڈہ گردی کرتے تھے۔ اسی لئے وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ کا ترجمہ وہ یہ کرتے ہیں ''اور تمہاری (یعنی مسلمانوں کی..... ناقل) عورتوں میں سے جو بدکاری کرتی ہیں'' اور لکھتے ہیں:

''ان کا اسلوب دلیل ہے کہ یہ فحبہ عورتوں کا ذکر ہے۔اس صورت میں اصل مسئلہ چونکہ عورت ہی کا ہوتا ہے اس لئے مرد زیر بحث نہیں آئے''۔[میزان:۲۸۷]

اور آیت میں جو چار گواہ طلب کرنے کا حکم ہے تو:

''وہ اس بات کے گواہ ہوں کہ وہ فی الواقع زنا کی عادی فحبہ عورتیں ہی ہیں''۔[میزان:۲۸۷]

چونکہ غامدی اور اصلاحی صاحب نے جو تصور قائم کیا ہے کسی بھی باغیرت مسلمان میں یہ جرأت نہیں کہ وہ اپنے دل و دماغ میں ایسے تصور کو قائم ہونے دے بلکہ وہ اس کو سمجھنے اور ماننے پر تیار ہو ہی نہیں سکتا اس لئے غامدی صاحب اپنا فیصلہ یوں سناتے ہیں۔

''یہی وہ چیز ہے جس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ آیت ہماری تفسیروں میں ایک لاینحل معمابنی ہوئی ہے''۔[میزان:۲۸۷]

ہم نے غامدی صاحب کی ان باتوں کو کھول کر بیان کر دیا ہے۔اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی کتاب کے ساتھ ایسے مذاق پر وہ انجام کو مدنظر رکھیں۔

نہ جانے غامدی صاحب کو اسلوب میں کیا فرق نظر آیا کہ وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ کا وہ یہ ترجمہ کرتے ہیں ''جو بدکاری کرتی ہیں'' جبکہ والذان یاتیانھا کا ترجمہ یوں کرتے ہیں وہ مرد و عورت جو یہ برائی کریں۔ پہلے الفاظ کا ترجمہ یہ کر کے کہ وہ بدکاری کرتی ہیں یہ مطلب نکالا کہ وہ زنا کی عادی فحبہ عورتیں ہیں لیکن بعینہ اسی اسلوب کے باوجود دوسرے الفاظ میں عادت ثابت نہیں ہو رہی۔

پھر غامدی صاحب کے بقول فحبہ اور زنا کی عادی عورتوں کے بارے میں پہلے سورہ نساء میں یہ فرمایا کہ ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرما دیں۔غامدی صاحب کے الفاظ میں:

''سورہ نور میں زنا کی باقاعدہ سزا کے نازل ہونے تک شریعت کا حکم یہی تھا۔نور کی زیر بحث آیات نمبر 2-3 جن میں اتنی سزا مذکور ہے کہ زانی مرد ہو یا عورت اس کو سزا میں سو کوڑے مارو) نے اسے ختم کر دیا اور زنا کے عام مرتکبین کے لئے ایک متعین سزا ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی''۔[میزان:۲۹۹]

لیکن غامدی صاحب کا کمال دیکھئے کہ جب قرآن نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اس میں ان کے بقول ہر قسم کے مجرم کے لئے سو کوڑوں کی سزا ذکر ہوئی تو ان کی اس سے تسلی نہیں ہوئی اور انہوں نے اس سزا کو صرف عام مرتکبین زنا کی سزا بنا دیا اور فحبہ عورتوں اور بدکرداری کے عادی مجرموں کے لئے ان کو سخت تر سزا کی ضرورت محسوس ہوئی۔اب یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ اس ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے۔قرآن کے بارے میں سنت کو یہ حضرات جو درجہ اور حیثیت دیتے ہیں وہ تو سامنے آ چکی ہے۔لیکن اب جو اپنی

ضرورت پیش آئی تو سنت ہی کو لے کر انہوں نے قحبہ عورتوں اور بدکردار لوگوں کا قرآنی حکم بدل دیا اور ان کی سزا کا حکم ایک آیت سے توڑ کر دوسری آیت سے جوڑ دیا۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

اس جوڑ توڑ کو غامدی صاحب بڑے فخر سے یوں ذکر کرتے ہیں:

''اس (یعنی رجم کی) سزا کا ماخذ درحقیقت کیا ہے؟ یہی وہ عقدہ ہے جسے امام حمید الدین فراہی نے اپنے رسالہ ''احکام الاصول باحکام الرسول'' میں حل کیا ہے۔ اپنے اصول کے مطابق انہوں نے ان مبہم اور متناقض روایات سے قرآن مجید کے حکم میں کوئی تغیر کرنے کے بجائے انہیں اسی کتاب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے''۔ [برہان:۸۱]

چودہ صدیوں تک جو عقدہ عقدہ ہی رہا کسی سے حل نہ ہو سکا فراہی صاحب نے اس طرح سے حل کیا کہ سنت کو قرآن پر حاکم بنا دیا۔ لکھتے ہیں:

''حضور کے مذکورہ ارشاد میں واضح طور پر آیا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کے لئے سزا سو کوڑے اور جلاوطنی کی ہے۔ دوسری روایت میں **ثم تغریب عام** (یعنی سو کوڑے اور پھر ایک سالہ جلاوطنی) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ اس طرح شادی شدہ زانیوں کے لئے الفاظ ثم الرجم (یعنی سو کوڑے پھر رجم) بھی آئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صورتوں میں پہلی حد سو کوڑوں ہی کی ہے۔ لیکن اگر مجرم سزا پانے کے بعد پھر اسی گناہ میں مبتلا ہوں تو انہیں سخت سزا دینا اولیٰ ہے کیونکہ اب ان کا گناہ حدود اللہ کے معاملہ میں جسارت دکھانے کا ہے''۔ [اشراق مارچ:۸۸ء]

فراہی صاحب نے تو سنت کا مطلب بھی بگاڑ دیا۔ غامدی صاحب کے مطابق اس کا ترجمہ یوں ہے:

''غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لئے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد کی شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لئے سو کوڑے اور رجم ہے''۔ [برہان:۵۳]

لیکن فراہی صاحب اس کا مطلب یہ نکال رہے ہیں کہ پہلی دفعہ کرے تو سو کوڑے اور دوسری دفعہ کرے تو غیر شادی شدہ کی صورت میں ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ ہونے کی صورت میں رجم ہے۔ یہ بھی ان کے کسی اختراعی اسلوب ہی کی بنا پر ہوگا ورنہ سنت کے الفاظ عربی کے ہوں یا اس کا اردو ترجمہ ہو کسی بھی اسلوب سے فراہی صاحب کا ذکر کردہ مطلب نہیں نکلتا۔

لیکن یہ دور ''دبستان شبلی'' کے فراہی، اصلاحی اور غامدی صاحب جیسے حضرات کی امامت کا ہے جن کی ہر بات حجت کا درجہ رکھتی ہے اور کس کی مجال ہے جو ان کے سامنے کچھ لب کشائی کر سکے۔

☆......☆......☆......☆

مولانا احسن خدامی

جاوید احمد غامدی سے عمار خان ناصر تک

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم أما بعد..... !

جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان نبوت سے آج سے چودہ سو سال پہلے ہی یہ معجزانہ پیشین گوئی فرمادی تھی کہ جس طرح بنی اسرائیل میں بہتر فرقے ہو گئے تھے اس طرح آنحضرت ﷺ کی امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، آپ ﷺ نے ان فرقوں کا انجام بھی ارشاد فرمادیا تھا کہ وہ سب جہنم میں جائیں گے سوائے ایک فرقے کے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا کہ وہ فرقہ کون سا ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "ما انا علیه و أصحابی" یعنی جس راستے پر میں اور میرے صحابہ ہیں، وہی راستہ اہل حق اور اہل جنت کا راستہ ہوگا۔

آپ ﷺ کی اس پیشین گوئی کے مطابق قرن اول سے لے کر اب تک مسلسل ایسے بہت سے فتنے پیدا ہوئے جن کا کام ہی اسلام کا نام لے کر اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلانا اور امت محمدیہ کو گمراہ کرنا تھا۔ اپنے اپنے وقت میں انہوں نے کچھ بدنصیب لوگوں کو گمراہ کیا بھی، مگر اللہ جل شانہ نے اپنے دین کی حفاظت کا خود ذمہ لیا ہے اور عالم اسباب میں اس حفاظت کا سبب علمائے حق کو بنایا ہے جو ہر دور میں حق کو اہل زمانہ کے سامنے واضح کرتے اور اہل باطل کی تلبیسات کے تار و پود بکھیرنے کا فریضہ انجام دیتے آئے ہیں اور تا قیامت انشاء اللہ یہ فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ علمائے حق کی مخلصانہ و سرفروشانہ محنتوں اور اللہ جل شانہ کے فضل کے نتیجے میں ایک محدود وقت میں کچھ لوگوں کو گمراہ کرنے کے بعد ان تمام فتنوں کا نام ونشان مٹ گیا، چنانچہ معتزلہ، جبریہ، قدریہ، کرامیہ وغیرہ کا بحیثیت گروہ اب نام ونشان تک موجود نہیں ہے اور "ما انا علیه و أصحابی" کی مصداق اہل سنت والجماعت کی پاکیزہ جماعت بحمد اللہ آج بھی اسی طرح موجود اور زندہ و تابندہ ہے جس طرح قرن اول سے چلی آرہی ہے۔ اور انشاء اللہ قیامت تک آنے والے چھوٹے چھوٹے فتنے اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے حصے کی گمراہی پھیلانے کے بعد مٹ جائیں گے اور اہل حق کا نشان نہ کبھی پہلے مٹ سکا ہے اور نہ انشاء اللہ تا قیامت کبھی مٹ سکے گا۔

ماضی قریب میں انگریز بدبخت نے مسلمانوں کے ممالک پر غاصبانہ و جابرانہ قبضہ کے بعد اپنی حکومت کو مضبوط اور مسلمانوں میں اپنے خلاف مزاحمت کو کمزور کرنے کی خاطر مسلمانوں میں فرقہ بندی

اور فتنہ پروری کا طریقہ اپنایا اور اپنے مقصود ہے مسلمانوں میں نت نئے فتنے پیدا کرتے اور ان کو پال پوس کر نہ صرف مسلمانوں کو کمزور کیا بلکہ مسلمانوں کا اپنے دین اور قرآن وسنت سے رشتہ بھی توڑنے کی پوری پوری مذموم کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے اپنی یونیورسٹیوں میں مستقل شعبے قائم کیے جن میں اسلامی علوم کے تمام شعبہ جات مثلاً صرف، نحو، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام وغیرہ کی مکمل تعلیم دی جاتی اور انگریز کے خاص کارندے ان تمام اسلامی علوم میں مہارت حاصل کر کے مسلمانوں میں الحاد وزندقہ پھیلانے اور انہیں ان کے دین سے ہٹانے کی تربیت حاصل کرتے، بالواسطہ یا بلا واسطہ اپنے زہریلے نظریات مسلمانوں میں پھیلاتے اور اسلام کے جواحکامات وعقائد ان کے لئے خطرہ ہیں، انہیں مسخ کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری وساری ہے۔ برصغیر میں مرزا غلام احمد قادیانی، سرسید احمد خان، چوہدری غلام احمد پرویز[1] علامہ عنایت اللہ مشرقی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن[2] اور تمنا عمادی وغیرہ اسی قبیل کے لوگ تھے۔ جو دین اسلام کو ذبح کرنے اور مسلمانوں کو انگریز کا دل وجان سے غلام بنانے کی اپنی سی پوری کوشش کر کے اپنی اپنی قبروں میں پہنچ گئے۔ یہ لوگ پوری امت کا استہزا کرتے، فقہائے کرام کا مذاق اڑاتے، محدثین کرام پر پھبتیاں کستے، علمائے کرام کے بارے میں سخت دریدہ ذہنی کرتے، اپنے آپ کو "عقل کا

---

[1] غلام احمد پرویز کا طوطی ایوان صدارت میں بولتا تھا مگر آج لاہور کے علاقے گلبرگ میں جا کر دیکھیے پرویز کے کاشانے اور ادارہ طلوع اسلام پر خاک اڑ رہی ہے۔ دیواروں کی قلعی بھی مرور زمانہ کے ساتھ گھسا گئی ہے۔ سائن بورڈ پر کوئی پینٹ کرانے والا بھی نہیں۔ اس کی ایک کتاب بھی آپ بازار سے خریدنے چلے جائیں قسمت ہے تو ملے گی۔ لائبریریوں میں بھی "مطالب الفرقان" کے ادھورے سیٹ ملیں گے۔

پرویز کا ہمنوا ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی تجدد کے افق پر ایک دمکتا ستارہ تھا۔ لیکن موت دیار مغرب میں یونیورسٹی کی لیکچر شپ پر گذر بسر کرتے ہوئی۔ جنازہ بھی نصیب ہوا یا نہیں۔ قبر کی تفصیلات تک معلوم نہیں۔ لائبریریاں تو دور کی بات نیٹ پر تلاش کرنے سے بھی ایک آدھ تحریر بمشکل ملے گی۔

[2] ڈاکٹر فضل الرحمٰن ملک:

ڈاکٹر فضل الرحمٰن ملک (۱۹۱۹ء۔۱۹۸۸ء) بھی انگریز کے صاحبزادوں کی کنعانی فہرست کا ایک نام اور حق تعالیٰ کی صفت مخرج المیت من الحی کا مظہر ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے عربی کی تعلیم حاصل کی اور پھر مستشرقین کی شاگردی کے لیے آکسفورڈ (برطانیہ) چلے گئے، وہاں پہلے شاگردی کی اور پھر ایک دوسری یونیورسٹی میں لیکچر شپ حاصل ہوگئی۔ صدر ایوب کے دور میں جب اسلامی نظریاتی کونسل کی بنیاد رکھی گئی تو صدارتی حکم نامے کے تحت ملک میں اسلام کاری کی ذمہ داری اٹھائی، اس دور کے ماہنامہ "فکر ونظر" میں اپنے گمراہ کن افکار کا پرچار شروع کیا اور اسلام کی تعمیر نو کا منصوبہ شروع کیا، علماء امت نے بر وقت تعاقب کیا، جس کی جھلک "بینات" کے ہوری اداریوں کے علاوہ "عصر حاضر کے تجدد پسندوں کے افکار" مؤلفہ مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر)

دیگرے نیست'' کا مصداق سمجھتے اور دنیائے عقل ودانش کا بے تاج بادشاہ خیال کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا خیال تھا کہ چودہ سو سال کی پوری امت مسلمہ کے علماء وفقہاء، محدثین و متکلمین، سب کے سب ہی نعوذ باللہ کم عقل اور احمق تھے اور عقل وسمجھ کی دولت پہلی مرتبہ پوری امت میں اسی کو نصیب ہوئی ہے۔ مگر یہی شیخ چلی جیسے خیالات دماغ میں پکاتے پکاتے ہر ایک اس دنیا سے رخصت ہو گیا، دینِ اسلام کا نہ پہلے کچھ بگڑ سکا تھا اور نہ انشاء اللہ قیامت تک اسے کوئی بگاڑ سکتا ہے۔

موجودہ دور میں اس طبقے کے نمائندے جناب جاوید احمد غامدی ہیں جو انہی لوگوں کی ناکام کوششوں کا ایک تسلسل ہیں۔ انہی کے منشور کو آگے بڑھانے اور ان کے مشن کو پھیلانے میں دل وجان سے شب وروز خود کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ انہی کے افکار کی پرانی شراب کو نئی شیشیوں میں ڈال کر سادہ لوح گاہکوں کے لئے دوبارہ ٹھیلا جما رہے ہیں۔ اپنے ان پیشواؤں کی طرح ان کے سر میں بھی یہ سودا سمایا ہوا ہے کہ دین اسلام کے چودہ سو سالہ پرانے ایڈیشن کی عمر اب پوری ہو چکی ہے اور آنے والے وقت میں مشرق و مغرب میں انہی کے نام اور انہی کے ایجاد کردہ جدید اسلام کا ڈنکا بجنے والا ہے۔ اس خیالی خوشی کے نشے میں مدہوش ہو کر اور خود پسندی وخود رائی کے فضائی تخت پر سوار ہو کر ان پر سرور کی جو کیفیت طاری ہے اس نے

(گزشتہ صفحے کا حاشیہ) انہی دنوں کی بات ہے کہ مفتی اعظم فلسطین کی سربراہی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی گل افشانیاں شروع کیں تو مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ نے گرجدار لہجے میں فرمایا: ''سماحة الرئيس! أرجو كم أن تلجموا هذا الخطيب'' (جناب صدر! اس خطیب کو لگام دیں)۔ جناب صدر نے اس موقع پر لگام دی یا نہیں لیکن اس زمانے کے اہل علم نے اس کا ملحدانہ افکار کے آگے ایسا بند باندھا کہ ڈاکٹر کو پاکستان سے روانگی میں عافیت نظر آئی۔ دوبارہ دیارِ مغرب میں یونیورسٹی کی لیکچر شپ کے نشیمن پر بسیرا کیا اور وہی آنجہانی ہوئے۔

ڈاکٹر کے والد مولانا شہاب الدین صاحب رحمہ اللہ تھے، مولانا دار العلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے تلامذہ میں سے تھے، مولانا کا قیام لاہور کے چوبرجی کے علاقے میں تھا، پہلے چوبرجی کوارٹر کی مسجد میں قیام پذیر رہے اور پھر چوبرجی پارک میں لال مسجد (موجودہ جامعہ دار التقویٰ لاہلال مسجد) میں اخیر زمانے تک فروکش رہے، بڑی بارعب اور پُر نور شخصیت کے مالک تھے۔ لاہور کے ان علاقوں میں مولانا کا درس قرآن وحدیث اس زمانے میں اسی طرح مشہور تھا جیسے اندرون کے علاقوں میں مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کا تھا۔ بعض لوگوں نے خاص طور سے مولانا کے درس میں شرکت اور استفادے کی خاطر مکان کرائے پر حاصل کیے تھے۔

ان دنوں بیٹے (ڈاکٹر فضل الرحمٰن) کا ستارۂ مادی اعتبار سے بام عروج پر تھا لیکن مولانا نے اس کی چکا چوندیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا قیام مسجد ہی کے حجرے میں رکھا اور نہ صرف یہ کہ اس سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے گمراہ کن افکار کی وجہ سے اس سے مکمل قطع تعلق کیا، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اور محبت پدری پر دینی حمیت کو ترجیح دیتے ہوئے یہ وصیت کی کہ اگر میرا انتقال ہو جائے تو یہ شخص میرے جنازے میں شریک نہ ہو......!!

ہاں! ایسے بھی باپ ہوتے ہیں۔!!

انہیں دنیاو مافیہا سے بے خود کر رکھا ہے، ہر ایک فتنے کے موجد کی طرح کچھ جاہل و کم علم لوگ، کچھ "أضله الله علیٰ علم" کے مصداق پڑھے لکھے جاہل، کچھ شریعت کی پابندیوں سے نالاں عیش پرست، کچھ خود پسندی، خود نمائی کا شکار، اپنے آپ کو مسندِ اجتہاد پر امام ابوحنیفہ و امام بخاری کے ہم درجہ دیکھنے کے شوقین اور کچھ نفس شہوات کے اندھے مقلدان کے حصے میں بھی آئے ہیں جنہیں اپنے آگے پیچھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہے اور اہل حق کا نام ونشان مٹادینے کے خوش نما خواب دیکھ رہے ہیں، تاہم انہیں نہ تو "لا یضرهم من خذلهم و لا خالفهم" کا نبوی فرمان یاد ہے اور نہ وہ تاریخ پر نظر دوڑا کر یہ دیکھنا پسند فرماتے ہیں کہ ان سے پہلے کتنے لوگ یہ خواہش اپنے سر میں لئے بے بسی کی مثال بنے دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں مگر اہل حق کی جماعت کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ کاش کہ وہ ان کی ناکامی اور ان کے انجام سے ہی کچھ عبرت حاصل کرتے۔

دین اسلام چونکہ قیامت تک کے لئے ہے، ابدی ہے، اس لئے وہ تو ایک ہی ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا، مگر اہل باطل اور ابلیس کے کارندے ہر زمانے میں اہل زمانہ کے مزاج اور خواہشات کے مطابق اپنے من گھڑت دین کا ایک نیا ایڈیشن بناتے اور ہر بدلتے وقت کے ساتھ اس میں تغیر و تبدل کرتے چلے جاتے ہیں۔ گویا

الغرض ہر دن نئے سانچے میں ڈھلنا چاہیے
ہر ہوا کے رُخ پہ اپنا رخ بدلنا چاہیے

مرزا غلام احمد قادیانی ملعون نے توظلی بروزی کی بھول بھلیوں میں قوم کو گھماتے ہوئے بالآخر نبوت ہی کا دعویٰ کر ڈالا تھا اور صاف صاف نیا دین لوگوں کے سامنے پیش کر دیا تھا، اس پر لوگوں نے لعنتیں اور پھٹکاریں برسائیں تو چوہدری غلام احمد پرویز، عبداللہ چکڑالوی، عنایت اللہ مشرقی وغیرہ نے "مرکزِ ملت" اور عمل بالقرآن کے خوشنما دام بچھا کر بھولی بھالی قوم کو انکار حدیث کے گڑھے میں گرانا چاہا، علمائے حق نے ان کے فریب و مکر کا پردہ چاک کیا تو یہی منکرین حدیث ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی شکل میں دوبارہ نمودار ہوئے اور ایوب خانی آمریت کے سائے تلے "ارتقاء" کے نئے فلسفے کا بین بجا کر اسلام کی دیواروں کو گرادینے کی تیاری ہونے لگی، مگر حضرت اقدس حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ اور حضرت اقدس حضرت مولانا یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ جیسے مردِ مجاہد میدان میں آئے تو فضل الرحمانی فتنہ ناکامی و نامرادی کی تصویر بن کر رہ گیا اور آخرش قعرِ گمنامی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر دبیز مدفون ہو گیا۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب بھی انہی لوگوں کا ایک تسلسل ہیں، باتیں انہی کی سی کرتے ہیں، مگر اخلاقی جرأت کی کمی کی بناء پر صاف صاف نہیں کہتے بلکہ گھما پھرا کر کہتے ہیں۔ قارئین کرام آگے چل کر ملاحظہ کریں گے کہ غامدی صاحب کی کوئی بات بھی نئی یا اپنی نہیں، وہ انہی منکرینِ حدیث کے مشن

کو لے کر چل رہے ہیں، ان کی محنت صرف یہ ہے کہ وہ ان منکرین حدیث کے افکار کو نرم سے نرم انداز میں اور ایسے طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ جس سے دین دار طبقہ بھی ان کی بات سے متوحش نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ ان کی بات کے اثر کو قبول کر سکے۔ باقی افکار بھی وہی ہیں اور چند پیچیدہ تار ہائے عنکبوتی کے علاوہ دلائل بھی اکثر و بیشتر وہی ہیں۔ یہی جناب غامدی صاحب کی کل کائنات ہے۔

اللہ جل شانہ کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ وہ زندہ سے مردہ، اور مردہ سے زندہ کو پیدا کرتا ہے، وہ نمرود کے گھر میں ابراہیم علیہ السلام کو پیدا کرتا ہے اور اپنے برگزیدہ پیغمبر حضرت نوح علیہ السلام کی صلب سے کنعان جیسے کافر کو وجود بخشتا ہے، رات سے دن کو نکالتا اور دن سے رات کو پیدا کرتا ہے۔ یہ اس سبحان ذات کے افعال ہیں جس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو وہی جان سکتا ہے، انسان کا علم اور اس کی بساط اس قدر نہیں کہ اس علیم وخبیر ذات کے فیصلوں کی تہہ تک پہنچ سکے۔ اسلام اور کفر کے مقابلے میں، سنت و بدعت کے معرکے میں، حق و باطل کے کارزار میں ایسا ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ ہوا ہے کہ ایک طرف کوئی شخصیت اہل حق کی سپہ سالار ہے تو اسی شخصیت کا کوئی قریبی ترین عزیز اہل باطل کی صف میں سینہ تان کر کھڑا ہے۔ نوح علیہ السلام کے بیٹے، لوط علیہ السلام کی بیوی کی مثال تو خود قرآن پاک نے دی ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے حقیقی چچا ابولہب کے خلاف قرآن پاک کی ایک پوری سورت قیامت تک کے انسانوں کو عبرت حاصل کرنے کا سبق دے رہی ہے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کے بیٹے یزید سے لے کر ماضی قریب کے جلیل القدر محدث حضرت علامہ ظفر احمد عثمانیؒ کے بیٹے عمر عثمانی تک، ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر سے لے کر امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے پوتے عمار خان ناصر تک...... تاریخ میں نجانے ایسے کتنے ہی کردار ہیں جنہیں اللہ جل شانہ نے اپنے خاص بندوں سے نسبت و تعلق کا شرف بخشا مگر انہوں نے اللہ کے اس عظیم انعام کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کے دشمنوں کے ساتھ کھڑا کرنا پسند کیا۔

بندہ کے عم زاد بھائی عمار خان ناصر ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اللہ جل شانہ نے اپنی نعمتوں سے خوب نوازا، حضرت امام اہل سنتؒ کی اولاد میں ہونے کے شرف کے علاوہ اللہ جل شانہ نے انہیں بے مثال ذہانت و فراست کی دولت سے بھی مالا مال کیا۔ مگر افسوس کہ اللہ جل شانہ کی ان عظیم نعمتوں کا انہوں نے یہ شکر ادا کیا کہ اپنی ذہنی و دماغی تمام تر صلاحیتوں کو غامدی فتنہ کی ترویج کے لئے وقف کر دیا۔ اب ان کی زندگی کا اہم ترین اور قیمتی ترین مشغلہ جناب غامدی صاحب کی ہر الٹی یا سیدھی بات کے حق میں ایران و توران کے دلائل ڈھونڈنے کے لئے مارا مارا پھرنا ہے، اسی مقصد کے لئے وہ شب و روز سرگرداں ہیں اور یہی ان کی زندگی کا منشور ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

چنانچہ قارئین آئندہ سطور میں ملاحظہ کریں گے کہ جس طرح غامدی صاحب نے منکرین حدیث

اور دیگر متجددین کے افکار کی تہذیب جدید کر کے اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول بنانے کی خدمت انجام دی ہے، اس طرح جناب عمار ناصر صاحب نے اصولی طور پر غامدی صاحب کی مکھی پر مکھی مارتے ہوئے ان کے نقطۂ نظر کے دلائل اہل سنت والجماعت کی کتابوں سے ڈھونڈنے اور غامدی صاحب کے الحاد کو اجتہاد بنا کر پیش کرنے کو ہی اپنی فانی زندگی کا مشن بنا رکھا ہے۔ چنانچہ انشاء اللہ اگلے صفحات میں قارئین کرام غامدی صاحب اور عمار خان ناصر صاحب کی فکری یکجہتی اور نظریاتی ہم آہنگی کا نظارہ دیکھیں گے۔ وفا شعار اور سعادت مند شاگرد جب استاد کے نقش قدم پر حذو النعل بالنعل چلتا ہے اور سطر بسطر دونوں کے خیالات میں یکسانیت نظر آتی ہے تو بے اختیار یہ مصرع یاد آ جاتا ہے کہ:

ع سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

جناب عمار خان ناصر صاحب کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ اول تو اپنے علم وفضل کا پورا زور جناب غامدی صاحب کی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے صرف کرتے ہیں، اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو پھر ان کے مخالف موقف کو ممکنہ حد تک کمزور ثابت کر کے اور غامدی صاحب کے موقف کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچا کے اور قارئین کو ان کی طرف بھیج کر خود پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ بھی نہ ہو سکے اور غامدی صاحب کی بات کفریہ حد تک گمراہ کن ہو تو پھر اسے ''گمراہی'' کے درجے سے نکال کر ''اجتہاد'' کے دائرے میں داخل کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کے علمی وتحقیقی روٹ کا آخری سٹاپ ہے، اس سے آگے نہ وہ کبھی گئے ہیں اور نہ ہی غالباً جا سکتے ہیں۔ ان کی ساری علمی وتحقیقی جدوجہد اور کشمکش بس انہی مقاصد کے گرد گھومتی ہے۔ اس ضروری تمہید کے بعد اب ہم ان چند مقامات کا ذکر کرتے ہیں جہاں غامدی وعمار صاحبان ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو شاہراہِ ضلالت پر محوِ خرام ہیں۔

مقامِ حدیث:

ہم اہل السنۃ والجماعۃ الحمدللہ حدیث کو حجت مانتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جس طرح قرآن پاک اللہ جل شانہ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہوتا تھا اسی طرح حدیث بھی اللہ جل شانہ کی طرف سے وحی خفی تھی جو آنحضرت ﷺ کے قلب اطہر پہ نازل ہوتی تھی۔ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدرؒ فرماتے ہیں:

''جس طرح کتاب اللہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اسی طرح حکمت اور سنت بھی منزل من اللہ ہے اور کتاب وسنت کے ذریعہ جو جامع شریعت اور اکمل دین اللہ تعالیٰ نے آپ کو مرحمت فرمایا ہے وہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل اور احسان ہوا ہے''۔ [تبلیغ اسلام: ۱۲۳]

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"قرآن پاک میں بے شمار دلائل ہیں جن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت اور فرمانبرداری کو لازم قرار دیا گیا ہے اور نافرمانوں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے اگر آپ ﷺ کا قول اور فعل حجت نہ ہوتے یا بالفاظ دیگر حدیث حجت نہ ہوتی تو قرآن کریم میں اتنی تاکید کبھی نہ ہوتی اور نہ ہی آپ کی مخالفت کے سلسلہ میں تہدید ہوتی"۔[احسان الباری:۱۶]

اہل السنۃ والجماعۃ کے برخلاف جتنے فرقے اور فتنے دین اسلام کا ربقہ اپنے گلے سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہیں، حدیث نبوی ﷺ ان کے راستے میں بہت مضبوط رکاوٹ ہے، اس لئے کہ قرآن پاک میں اجمال ہے اور حدیث پاک میں پورے دین کی تعبیر وتشریح ہے۔ احادیث میں بہت سے آئندہ پیش آنے والے فتنوں کی امت کو اطلاع دی گئی ہے اور قرآن پاک کے اجمال کی تشریح وتفسیر کی گئی ہے۔ لہٰذا شیعہ ہوں یا خوارج، معتزلہ ہوں یا قدریہ، جبریہ ہوں یا کرامیہ، کچھ عرصہ قبل کے منکرین حدیث ہوں یا آج کل کے حضرات غامدیان کرام، سب اچھی طرح اور خوب اچھی طرح جانتے تھے اور جانتے ہیں کہ جب تک رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک کی مضبوط دیوار ان کے سامنے موجود ہے، وہ اس دیوار کے اُس پار خواہشات و نفسانیت کی وادی میں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتے، لہٰذا یہ سب لوگ سب سے پہلے حدیث کو اپنے راستے سے ہٹانے اور پھر قرآن پاک کے معانی و مفاہیم کو من چاہا جامہ پہنا کر توڑنے اور مروڑنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ شیعت اور خارجیت کی بنیاد چونکہ صحابہؓ دشمنی ہے، لہٰذا جب وہ صحابہ کرام کو اپنے اعتراض کا ہدف بناتے ہیں تو انہی صحابہ کرامؓ کی روایت کردہ احادیث کا انکار خود بخود ہو جاتا ہے۔ اعتزال عقل پرستی کا فتنہ ہے، لہٰذا جو حدیث بھی انہیں اپنی نارسا عقل کے خلاف نظر آتی ہے، اس کی ظالمانہ باطل تاویل کر کے یا اس کو قرآن کے خلاف قرار دے کر رد کرنا ان کا عام معمول ہے، انگریز کے دور میں پیدا ہونے اور قیام پاکستان کے بعد ہمارے ہاں پھلنے پھولنے والے منکرین حدیث واضح طور پر حدیث کا انکار کرتے، اس کا مذاق اڑاتے اور اس کے ساتھ تمسخر کرتے نظر آتے ہیں، بعض یہ گوہر افشانی کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیثیت محض نعوذ باللہ ایک ڈاکیے کی تھی اور آپ ﷺ کو لوگوں سے اپنی اطاعت کروانے کا کوئی حق نہیں تھا، بعض راویوں کے ضعف کی من پسندانہ اور یکطرفہ ٹریفک چلا کر احادیث سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں، بعض خبر واحد کے حجت نہ ہونے کی بحث چھیڑ کر اپنی من مانی مراد پانے کی کوشش کرتے ہیں، بعض حدیث کو ظنی کہہ کر اسے مسترد کرنے کی نامشکور سعی کرتے ہیں اور بعض حدیث کے انکار کی بنیاد اس ڈھکوسلے کو بناتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ان کی فرمانبرداری لوگوں پر بحیثیت حکمران ضروری تھی، آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد اب آپ کی اطاعت وفرمانبرداری ضروری نہیں بلکہ "مرکز ملت" کی حیثیت سے جو بھی حکمران مسلمانوں کی باگ ڈور سنبھالے گا اس کی فرمانبرداری لوگوں پر اسی

طرح ضروری ہوگی، وغیر ذلک من الخرافات الکثیرۃ.

جناب جاوید احمد غامدی صاحب چونکہ ہمارے دیانت دارانہ نقطہ نظر کے مطابق منکرین حدیث کی ہی لڑی کا تسلسل ہیں، لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم غامدی دعمار صاحبان کی ہم آہنگی سے قارئین کرام کو روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی منکرین حدیث کے ساتھ یکسانیت کے بھی کچھ نمونے دکھاتے جائیں تاکہ صاحبِ نظر حضرات اس شجرِ ملعونہ کی شاخوں کے ساتھ ساتھ اس کی جڑوں کو بھی پہچان لیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی حدیث پاک کے بارے میں منکرین حدیث کے خیالات وافکار اور حدیثِ رسول ﷺ سے ان کے بغض وعداوت اور اس کے خلاف ان کے ہذیانات وبکواسات کی ایک جھلک قارئین کرام ملاحظہ کریں،

سرسید احمد خان کے بعد انکارِ حدیث کے فتنے کے اہم سرخیل جناب عبداللہ چکڑالوی لکھتے ہیں:

''کتاب اللہ کے مقابلے میں انبیاء ورسولوں کے اقوال وافعال یعنی احادیث قولی وفعلی پیش کرنے کا مرض ایک قدیم مرض ہے''۔[ترجمۃ القرآن بآیات القرآن:۹۷]

گوجرانوالہ کے معروف منکرِ حدیث جناب ڈاکٹر احمد دین صاحب صحاح ستہ کے مصنفین کے نام لکھنے کے بعد خوفِ خدا سے بے نیاز ہوکر لکھتے ہیں:

''یہ مذکورہ لوگ صحاح ستہ روایات کے طوفان کے تیار کرنے والے ہیں، جو مسلمانوں میں فرقہ بندی کے اصل موجد ہیں......ان اماموں نے بائبل کی جھوٹی روایات اور اپنی ذاتی افترائات رسول اللہ ﷺ کے نام پر لوگوں سے منوائی ہیں''۔[پیغام اتحاد بالقرآن:۴، بحوالہ انکارِ حدیث کے نتائج:۸۸]

مشہور ومعروف منکرِ حدیث جناب علامہ مشرقی لکھتے ہیں:

''حتیٰ کہ کسی یقینی اور غیر یقینی حدیث کی بھی ضرورت نہیں ہے''۔[دیباچہ تذکرہ:۲۶، بحوالہ انکار حدیث:۹۴]

ایک اور جگہ حدیث کے خلاف اپنے ماؤف دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہتے ہیں:

''کہیں حدثنا اور قال قال کا بے سُرا راگ ہے''۔[ایضاً]

منکرین حدیث کے بدبخت ٹولے کے قافلہ سالار کہلانے کے حقدار جناب چوہدری غلام احمد پرویز حدیث کے بارے میں اپنا نظریہ یوں ظاہر کرتے ہیں کہ:

''اس بات پر بھی غور کیجیے کہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے ہوں، تمام احادیث روایات بالمعنیٰ ہیں''۔[طلوع اسلام:۲۹، اکتوبر ۱۹۴۹ء، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج:۱۰۶]

فتنۂ انکارِ حدیث کے ایک بڑے ستون جناب اسلم جیراج پوری لکھتے ہیں:

''حدیث پر نہ ہمارا ایمان ہے اور نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے...... پھر کس قدر عجیب

بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں"۔

[مقام حدیث ۱/۱۹۶، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۴۲]

قرآن پاک میں اللہ جل شانہ نے ایمان والوں کو صاف الفاظ میں جناب رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے، یہ آیت چونکہ منکرین حدیث کی ضلالت کی جڑ کاٹ دیتی ہے، لہٰذا اسلم صاحب اس آیت کی یہودیانہ تحریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے"۔[مقام حدیث ۱/۱۵۵، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۵۴]

یہ تو ان منکرین حدیث کے حوالہ جات تھے جو صاف صاف حدیث شریف کا انکار کرتے ہیں۔

غامدی صاحب بھی نظریہ انہی جیسا رکھتے ہیں، مگر دجل وفریب اور مکاری وعیاری کے پردوں میں اسے چھپا کر پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ حدیث کے ساتھ کھلم کھلا تمسخر اور مذاق تو نہیں کرتے، نہ ہی صاف طور پر حدیث کو باطل اور غلط کہتے ہیں، مگر اپنے قاری کو ادھر اُدھر کی وادیوں میں گھما پھرا کر جب اسے کہیں کھڑا کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ان منکرین حدیث ہی کے پاس کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ان کی عیاری و ابلہ فریبی سے ناواقف آدمی جب ان کی کتاب میں "مبادی تدبر حدیث" کے عنوان سے احادیث کے رد و قبول کے ضابطے دیکھتا ہے تو اپنی جہالت کی بناء پر انہیں کوئی محدث سمجھ بیٹھتا ہے، اور جب وہ ان کی کتاب میں جابجا احادیث کے حوالے دیکھتا ہے تو اسے وہم وگمان بھی نہیں ہوسکتا کہ غامدی صاحب درحقیقت منکر حدیث ہیں، مگر وہی قاری جب آگے چل کر ان کی کتاب میں ان کے موقف کے خلاف صحیح ومتواتر احادیث پر ان کو ظالمانہ طریقے سے آری چلاتا دیکھتا ہے اور محض من گھڑت قاعدوں، بے حقیقت واہموں اور خود تراشیدہ ضابطوں کی بنیاد پر انہیں چاند ماری کی مشق کرتا دیکھتا ہے تو حیرت سے انگلیاں دانتوں میں داب لیتا ہے۔ کچھ تفصیل ان شاء اللہ آگے مضمون میں پیش کی جائے گی، یہاں ہم صرف ایک مثال دے کر بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ زکوۃ کے نصاب کے سلسلے میں جناب غامدی صاحب احادیث مبارکہ میں بیان کردہ نصاب کو تفصیل سے لکھتے ہیں، قاری اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ دیکھئے غامدی صاحب تو نصاب کے سلسلے میں احادیث مبارکہ میں بیان کردہ ایک ایک تفصیل اور ایک ایک جزئی بیان کررہے ہیں، مگر تھوڑا ہی آگے چل کر یہ خوش فہمی کافور ہو جاتی ہے جب وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے اور جن چیزوں سے زکوۃ وصول کرے، ان کے لئے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کرسکتی ہے"۔[میزان: ۳۵۱]

دیکھ لیجئے! غامدی صاحب نے زکوۃ کے نصاب سے متعلق تمام احادیث کو بڑے ادب سے

کتاب میں درج کر کے اپنے آپ کو حدیث کا متبع بھی ثابت کر دیا اور آخر میں دو سطروں میں ان تمام احادیث پر بڑی معصومیت اور سادگی سے خط تنسیخ بھی پھیر دیا۔ یہی مکاری اور شیطنت جناب غامدی صاحب کا طغرائے امتیاز ہے جو انہیں باقی تمام منکرین حدیث سے ممتاز کرتی ہے۔ یاد رہے کہ زکوۃ کے نصاب سے متعلق دوسرے منکرین حدیث بھی یہی بات کہتے ہیں اور غامدی صاحب نے انداز بدل کر ترجمانی انہی کی کی ہے۔ چنانچہ جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب تحریر کرتے ہیں:

"اس لیے زکوۃ اس ٹیکس کے علاوہ کچھ نہیں جو اسلامی حکومت مسلمانوں پر عائد کرے، اس ٹیکس کی کوئی شرح متعین نہیں کی گئی"۔ [طلوع اسلام، جنوری، ۱۹۴۹ء، ص: ۸۲، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۱۲۳]

مزید لکھتے ہیں:

"میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر خدا کا منشاء یہ ہوتا کہ زکوۃ کی شرح قیامت تک کے لئے اڑھائی فیصدی ہونی چاہئے تو وہ اسے قرآن میں خود بیان نہ کر دیتا؟ اس سے ہم اس ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ منشائے خداوندی تھا ہی نہیں کہ زکوۃ کی شرح ہر زمانے میں ایک ہی رہے"۔

[مقام حدیث ۲/۳۹۲، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۱۲۴]

قائین کرام دیکھ لیں کہ پرویز نے بھی وہی بات کہی اور غامدی صاحب نے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا، مگر پرویز نے اپنی بات حدیث کا انکار کر کے کہی اور غامدی صاحب نے احادیث کے اقرار کا جھانسا دے کر وہی بات کہہ دی، یہ ہے فتنہ غامدیت کا دجل وفریب اور عیاری ومکاری......!

قارئین کرام کہیں اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ جناب غامدی صاحب یوں تو اصولی طور پر احادیث کی حجیت کو تسلیم کرتے ہیں، ویسے کہیں ایک دو احادیث کا کسی عارضے کی بناء پر انکار کیا ہے...... نہیں نہیں ......! وہ اصولی طور پر سرے سے ہی حدیث کی حجیت کے منکر ہیں، اور حدیث ان کے یہاں حجت کا درجہ نہیں رکھتی، چنانچہ لکھتے ہیں:

"نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں، اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا" [میزان: ۶۱]

لیجئے! رسول اللہ ﷺ کی قول وفعل اور تقریر کی تمام روایات، (جو زیادہ تر خبر واحد ہیں، مگر خبر مشہور اور متواتر بھی ان میں شامل ہیں) ان سے دین میں "کسی" عقیدے اور "کسی" عمل کا "کوئی" اضافہ نہیں ہوتا۔ قارئین کرام غور فرمائیں کہ کس قدر دوٹوک اور واضح انداز میں قطعی حصر کے ساتھ تمام تر احادیث کو بیک قلم جناب غامدی صاحب نے شہید کر ڈالا ہے، کیا اب بھی ان کے انکارِ حدیث میں کوئی

کسر باقی رہ گئی ہے؟ مگر اس کے باوجود انہیں اصرار ہے کہ وہ منکرِ حدیث نہیں بلکہ حدیث کو ماننے والے ہیں، چنانچہ بڑی معصومیت سے آگے چل کر فرماتے ہیں کہ:

''لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبی ﷺ کی سیرت وسوانح، آپ کے اسوۂ حسنہ، اور دین سے متعلق آپ کی تفہیم وتبیین کے جاننے کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ حدیث ہی ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت ایسی مسلم ہے کہ دین کا کوئی طالب علم اس سے کسی طرح بے پروا نہیں ہو سکتا'' [ایضاً]

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کی سیرت وسوانح کو جاننے کا اہم ترین ذریعہ حدیث ہے، مگر اس حدیث سے نہ تو ''کسی'' عقیدے میں ''کوئی'' اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ''کسی'' عمل میں۔

ظاہر میں اور رنگ ہے، باطن میں اور رنگ
خصلت مزاجِ یار میں رنگِ حنا کی ہے

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ جناب غامدی صاحب کے اس واضح انکار حدیث کے باوجود بھی ان کی ضد ہے کہ انہیں منکرِ حدیث نہ کہا جائے، اپنے منکرِ حدیث نہ ہونے کے ''ثبوت'' کے طور پر انہوں نے اپنی کتاب ''میزان'' میں ''مبادی تدبرِ حدیث'' کے عنوان سے ایک پورا باب بھی لکھا ہے جس میں احادیث کے ردّ وقبول کے ''زرّیں اور سنہرے'' اصول بھی درج فرمائے ہیں، غامدی صاحب کی مندرجہ بالا عبارت پڑھنے کے بعد جب قاری آگے چل کر ''مبادی تدبر حدیث'' کو پڑھتا ہے تو شش وپنج میں پڑ جاتا ہے کہ غامدی صاحب جب حدیث کی بنیاد پر کسی عقیدے یا عمل میں اضافے کو تسلیم نہیں کرتے، تو پھر ''مبادی تدبر حدیث'' بیان کرنے کی انہیں کیا حاجت ہے؟ مگر چند سطور پڑھ کر قاری پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ جناب غامدی صاحب مطلقاً حدیث کا اِنکار نہیں کرتے، وہ صرف اس حدیث کا انکار کرتے ہیں جو ان کے مطلب کے خلاف ہو، جو حدیث ان کے مطلب کی ہو، یا اس کی کوئی ان کے مطلب کی تاویل ممکن ہو، اسے وہ بڑے شوق سے اپنے ''تدبر حدیث'' کے اصولوں سے پاس کر کے اپنی کتابوں میں سجا لیتے ہیں، اور جو حدیث ان کی منشاء ومطلب سے میل نہ کھاتی ہو، اس کی کوئی احمقانہ سے احمقانہ تاویل بھی ممکن نہ ہو، تو وہ اپنے من گھڑت ''تدبر حدیث'' کے اصولوں کی بناء پر اسے صاف صاف ٹھکرا دیتے ہیں، بے شک پوری امت اس حدیث کی صحت پر متفق ہی کیوں نہ ہو اور بے شک وہ حدیث صحیح بخاری یا مؤطا امام مالک ہی کی روایت کیوں نہ ہو۔ بندہ کی باتوں کی دلیل ذرا غامدی صاحب کی اس عبارت میں ملاحظہ فرمائیے! فرماتے ہیں:

''اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس (سندِ حدیث کو پرکھنے کے) معیار کا اطلاق آپ ﷺ سے متعلق ہر روایت پر بغیر کسی رُو رعایت کے اور نہایت بے لاگ طریقے پر کیا جائے، اور صرف وہی روایتیں قابلِ اعتناء سمجھی جائیں جو اُس پر ہر لحاظ سے پوری اترتی ہوں (اور غامدی صاحب کے کسی ارشاد یا سوچ کے خلاف نہ

ہوں،[ناقل])۔اس کے علاوہ کسی چیز کو بھی، خواہ وہ حدیث کی امہات کتب، بخاری و مسلم اور مؤطا امام مالک ہی میں کیوں نہ بیان ہوئی ہو، آپ کی نسبت سے ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے'' [میزان: ۶۲]

یہ تو صرف ایک اصول تھا، اب ذرا لگے ہاتھوں اس اصول کا غامدی صاحب کے ہاتھوں اجراء بھی دیکھتے جایئے! بخاری شریف اور مؤطا امام مالک، دونوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ شادی شدہ آدمی کو رجم کی سزا دینے کے بارے میں قرآن پاک میں آیت موجود تھی، پھر اس آیت کی تلاوت منسوخ کر دی گئی اور اس کا حکم باقی رکھا گیا، غامدی صاحب شادی شدہ کے لئے رجم کی سزا کو حد تسلیم نہیں کرتے اور یہ حدیث ان کے من گھڑت اور مردود مؤقف کو جڑ سے اکھاڑ رہی تھی، لہذا اس کی کوئی من چاہی تاویل نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے اس حدیث کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ اسے ''منافق راویوں'' کی کارستانی قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''جس منافق نے بھی اسے وضع کیا ہے، اس کا مقصد صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو لوگوں کی نگاہوں میں مشتبہ ٹھہرایا جائے'' [برہان: ۶۱]

لیجئے! بخاری شریف اور مؤطا امام مالک کی یہ حدیث نہ صرف موضوع ہے، بلکہ اس کو وضع کرنے والا بھی کوئی منافق ہے اور اس منافق نے بھی محض دل لگی کے لیے نہیں بلکہ خاص قرآن پاک کو مشتبہ بنانے کے لیے اس حدیث کو گھڑا ہے، اور امام بخاری و امام مالک رحمہما اللہ نعوذ باللہ نادان محض ہیں کہ کسی منافق کی قرآن کو مشتبہ ٹھہرانے والی اس روایت کو اپنی اپنی کتابوں میں بڑے ذوق سے درج کر رہے ہیں، اور ساری کی ساری امت تب سے لے کر اب تک ایسی بے سمجھ واقع ہوئی ہے کہ قرآن کو مشتبہ ٹھہرانے والی اس حدیث پر ایمان و یقین رکھتی چلی آ رہی ہے اور بڑے ذوق و شوق سے اسے پڑھتی پڑھاتی ہے، اور کسی کو بھی اس کے قرآن کے مخالف ہونے کا علم نہیں ہوا، چودہ سو سال تک اس امت میں الف سے لے کر یا تک جاہل ہی جاہل اور نادان ہی نادان پیدا ہوتے رہے اور اب جا کر خداوند قدوس کو اس امت کی حالت پر رحم آیا تو اسے غامدی صاحب جیسا محقق و مدقق اور محدث و مفسر عطاء کیا جس نے اس عظیم اور اجتماعی جہالت سے امت کو باہر نکالا......انا للہ وانا الیہ راجعون......!

قارئین کرام......! اگر غامدی صاحب کی تحقیق کو مانا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم نے اوپر درج کیا، اور اگر اس نتیجے کو قبول کرنے پر ایمان و ایقان اور عقل و دانش آمادہ نہیں تو پھر دوسرا اور درست راستہ یہی ہے کہ جناب غامدی صاحب کو ہی اول نمبر کا احمق اور جاہل قرار دے کر ان کی اس بے وقوفانہ تحقیق کو جوتے کی نوک پر رکھ کر ٹھکرا دیا جائے۔

یہ تو رجم کی ایک حدیث کے ساتھ غامدی صاحب کا سلوک تھا، یہی نہیں، رجم کی تمام احادیث

جو متواتر ہیں، ان سب کو ذکر کرنے اور ان میں بزعم خویش تضادات ثابت کرنے کے بعد یہ خودساختہ محقق صاحب ان سب کے بارے میں یوں گوہرافشانی فرماتے ہیں کہ

''یہ ہے ان روایات کی حقیقت جن سے قرآن کے حکم میں تبدیلی کی جاتی اور شادی شدہ کے لئے رجم کا قانون اخذ کیا جاتا ہے، ان کے اس ابہام وتناقض کو دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ کسی انسان کے لئے سنگ ساری کی سزا تو بڑی بات ہے، اگر کسی مچھر کو ذبح کردینے کا قانون بھی اس طریقے سے بیان کیا جائے تو کوئی عاقل کیا اسے قبول کرسکتا ہے؟''۔ [برہان:۶۴]

یہ ہے جناب غامدی صاحب کا حدیث کے بارے میں بغضِ باطنی جو اُبل اُبل کر باہر آرہا ہے۔

اسی طرح ''سبعۃ احرف'' والی حدیث جو مؤطا امام مالک اور دیگر امہات کتب میں بیان ہوئی ہے اور محدثین کے نزدیک صحیح ہے، اس کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''اِس روایت کے بارے میں ذیل کے چند حقائق اگر پیش رہیں تو صاف واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ایک بالکل ہی بے معنی روایت ہے جسے اس بحث میں ہرگز قابلِ اعتناء نہیں سمجھنا چاہئے۔'' [میزان:۳۰]

پھر وہی نادانی کی بات! کہ ساری امت ایک بے معنی روایت کو صدیوں سے سینے سے لگائے بیٹھی ہے اور آج جاکر ایک مغربی بولی بولنے والے دانشور کو اس کے بے معنی ہونے کا علم ہوتا ہے۔ غامدی صاحب کی یہ ژاژ خائی اور لن ترانی کسی بھی عقل مند کے نزدیک ایک ذرہ بھی قابلِ التفات نہیں ہے۔ اسی طرح نزولِ مسیح علیہ السلام کی روایات جو متواتر کے درجے تک پہنچتی ہیں، ان سب کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھئے تو وہ بھی محلِ نظر ہیں''۔ [میزان:۱۷۸]

نجانے قرآن مجید کی وہ کون سی روشنی ہے جو جناب غامدی صاحب سے پہلے آج تک چودہ صدیوں میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی اور چودہ صدیوں بعد جناب غامدی صاحب ہی کو وہ کہیں سے دستیاب ہوئی ہے۔ عہدِ صدیقی میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی مشاورت سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں جمعِ قرآن کی روایت جو بخاری [رقم:۴۶۷۹] میں موجود ہے، اس کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہی معاملہ ان روایتوں کا بھی ہے جو سیدنا صدیق اور ان کے بعد سیدنا عثمان کے دور میں قرآن کی جمع و تدوین سے متعلق حدیث کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ قرآن، جیسا کہ اس بحث کی ابتداء میں بیان ہوا، اس معاملے میں بالکل صریح ہے کہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی حین حیات مرتب ہوا ہے، لیکن یہ روایتیں اس کے خلاف ایک دوسری ہی داستان سناتی ہیں جسے نہ قرآن قبول کرتا ہے اور نہ عقلِ عام ہی کسی طرح ماننے کے لیے تیار ہوسکتی ہے۔'' [میزان:۳۱، طبع پنجم]

معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کا قرآن بھی ساری امت سے الگ کوئی اپنا ہی ہے اور عقل عام سے اُن کی مراد بھی غالباً اُن کی اور اُن کے ''لائق وفائق'' شاگردوں کی عقل ہی ہے جو ساری امت کی عقل سے ماورا اور بالاتر ہے۔ اس قدر صحیح اور متواتر احادیث کو ٹھکرانے کے لیے جناب غامدی صاحب نے ''تدبر حدیث'' کے جو زرّیں اصول ایجاد کیے ہیں، مناسب ہوگا کہ ان میں سے ایک آدھ کی زیارت بھی قائین کرام کو کروادی جائے، فرماتے ہیں:

''لیکن ہر انسانی کام کی طرح حدیث کی روایت میں بھی جو فطری خلا اس کے باوجود باقی رہ گئے ہیں، ان کے پیش نظر یہ دو باتیں اُس کے متن میں بھی لازماً دیکھنی چاہییں:

ایک یہ کہ اُس (حدیث) میں کوئی بات قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو...

دوسری یہ کہ علم وعقل کے مسلمات کے خلاف نہ ہو''۔ [میزان: ۶۲، طبع ۴]

یعنی اگر کوئی حدیث محدثین کرام کے کڑے معیار پر پوری اترتی ہو، پوری امت اسے صحیح مانتی ہو، پھر بھی ''انسانی کام میں رہ جانے والے خلا'' (جو صرف غامدی عینک سے نظر آسکتے ہیں جو کہ حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے) کے پیش نظر یہ ضرور دیکھ لیں کہ یہ حدیث قرآن وسنت اور ''علم وعقل کے مسلمات'' کے خلاف تو نہیں، اور یاد رہے کہ ''علم وعقل کے مسلمات'' سے جمہور امت کے علمی وعقلی مسلمات ہرگز مراد نہیں چونکہ وہ تو ''انسانی کام'' ہیں جن میں خلا باقی رہ سکتا ہے، بلکہ یہاں صرف ''المورد'' کی فیکٹری میں تیار کردہ علم وعقل کے جدید ترین غامدی مسلمات مراد ہیں جو کہ غالباً آسمان سے نازل ہوئے ہیں اور جن کی بدولت آپ اب کسی بھی متفق حدیث کو باسانی ٹھکرا سکتے ہیں۔ جناب غامدی صاحب اپنی کتابوں میں جو احادیث پیش کرتے ہیں، وہ انہیں حجت سمجھ کر پیش کرتے ہیں یا کسی اور نظریے سے؟ اس سوال کا جواب بھی ہم غامدی صاحب کے حوالے سے پیش کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نبی ﷺ کی سنت سے جو چیزیں روایتوں میں بیان ہوئی ہیں، وہ اس میں متابعات کی حیثیت سے آئی ہیں''۔ [میزان: ۶۵۰]

یعنی احادیث بذات خود حجت نہیں ہیں، صرف قرآن کی تائید کے لیے انہیں ''متابعت'' میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ''میزان'' میں جابجا انہوں نے اپنی مرضی کی بعض احادیث کو کھینچ تان کر قرآن پاک ہی کے کسی حکم کی ''تبیین'' یا ''توسیع'' قرار دے کر قبول فرمایا ہے اور جس کو دل چاہا قرآن کے مخالف قرار دے کر ٹھکرادیا ہے۔ بات وہی ہے کہ جن احادیث سے جناب غامدی صاحب کے کسی نظریے اور موقف پر زد نہیں پڑتی، وہ بڑے شوق سے قبول کی جاتی ہیں، اور جو ان کے کسی باطل نظریے کو ٹھیس پہنچاتی ہیں، وہ بلاتردد مسترد کردی جاتی ہیں۔

عمار خان ناصر کی غامدی صاحب سے ہم نوائی......!

جناب عمار خان ناصر صاحب جناب غامدی صاحب کے قابل اعتماد اور مایہ ناز شاگرد ہیں۔ غامدی صاحب کے جو باطل خیالات ونظریات اوپر درج کئے گئے، سب جناب عمار خان صاحب کے سامنے کھلی کتاب کی طرح واضح ہیں، چنانچہ خود لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اس موضوع پر''المورد'' میں دسیوں طویل نشستوں میں ان (غامدی صاحب) کا موقف براہ راست سمجھنے کا موقع ملا ہے۔'' [جوابی مکتوب بنام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ]

اور غامدی صاحب اپنی کتاب''میزان'' کے آخر میں لکھتے ہیں:

''اسی طرح اپنے ان تلامذہ واحباب کا بھی شکر گذار ہوں جن کے مشوروں اور تنقیدات سے مجھے اس کتاب کی خامیوں کو دور کرنے میں مدد ملی ہے، ان میں جناب عمار خان ناصر......الخ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں''۔ [میزان:۶۵۱]

لیکن مقام افسوس ہے کہ جناب غامدی صاحب کے انکارِ حدیث کے اِس قدر واضح اور ناقابل تردید ثبوتوں اور حوالہ جات کے باوجود بھی جناب عمار خان ناصر صاحب نہ صرف انہیں 'منکر حدیث' ماننے سے انکاری ہیں بلکہ ان کی بے بنیاد اور گمراہ کن باتوں کی تائید وتاویل بھی کرتے نظر آتے ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون...... چنانچہ قارئین کرام ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جناب عمار خان صاحب کی طرف سے جناب جاوید غامدی صاحب کی اس کھلی گمراہی کی تائید ونصرت کا دلخراش نظارہ ملاحظہ فرمائیں، حضرت اقدس مولانا تقی عثمانی صاحب نے جناب عمار خان ناصر صاحب کو جو''ناصحانہ مکتوب'' تحریر فرمایا تھا، جو مجلّہ صفدر کے شمارہ ۴۴ر میں شائع ہو چکا ہے، اس میں حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے عمار خان صاحب سے سوال کیا کہ''جناب غامدی صاحب کے اِس اظہار کے بعد، کہ'اخبارِ آحاد سے دین میں کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہوسکتا'، بھی آپ اپنے آپ کو غامدی صاحب کا شاگرد کہلانے پر مطمئن ہیں؟'' تو عمار خان صاحب جواباً فرماتے ہیں:

''اخبارِ آحاد سے متعلق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کے حوالے سے گذارش یہ ہے کہ اگر ''اخبارِ آحاد سے دین کا کوئی نیا حکم ثابت نہ ہونے'' کا مطلب یہ سمجھا جارہا ہے کہ خبر واحد قرآن سے''زائد'' کسی حکم کے لئے مأخذ نہیں بن سکتی تو یقیناً یہ بات اہل السنۃ والجماعۃ کے فکری منہج سے ہٹی ہوئی ہے، لیکن یہ بات بھی اتنی ہی یقینی ہے کہ مذکورہ جملے سے غامدی صاحب کا یہ مدعا ہرگز نہیں، مجھے اس موضوع پر المورد میں دسیوں طویل نشستوں میں ان کا مؤقف براہِ راست سمجھنے کا موقع ملا ہے اور ان کا تصنیفی کام بھی مذکورہ جملے کی اس تعبیر کی کلی طور پر نفی کرتا ہے۔''دین کے نئے حکم'' سے غامدی صاحب کی مراد'' قرآن سے زائد حکم'' نہیں، بلکہ دین کا ایسا مستقل بالذات حکم ہے جو کسی بھی اعتبار سے قرآن کے حکم پر مبنی اور اس سے متعلق نہ

ہوسکتا ہو۔ غامدی صاحب کے نزدیک اخبار آحاد میں بیان ہونے والے تمام احکام قرآن مجید یا سنت متواترہ کے احکام کی تفصیل وتفریع سے عبارت ہیں اور قرآن سے بظاہر زائد دکھائی دینے والے احکام بھی اپنی لِم کے اعتبار سے قرآن ہی کے حکم کی توسیع ہیں۔'' [جوابی مکتوب بنام مولانا مفتی محمد تقی عثانی مدظلہم:٦]

دیکھ لیجئے! جناب عمار خان صاحب نے جناب غامدی صاحب کے انکار حدیث کے بے شمار واضح دلائل اور براہین کو نظر انداز کر کے کس طرح ان کی غلط اور باطل بات کی ناجائز تاویل کر کے ان کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ جناب غامدی صاحب کا وہ حوالہ جس کا حضرت مفتی صاحب نے ذکر کیا ہے، ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیے!

''نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں، اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا'' [میزان:٦١]

قارئین کرام بار بار غامدی صاحب کے اس فرمان کو بغور دیکھیں! اس میں ''کسی عقیدے یا عمل'' اور ''کوئی'' کا حصر بھی ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں کہ کیا یہاں عمار خان صاحب کی پیش کردہ کسی تاویل کی کوئی گنجائش باقی ہے؟ ایک طرف جناب غامدی صاحب پورے طنطنے سے قطعی حصر کے ساتھ یہ دعویٰ کررہے ہیں کہ حدیث سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا، صرف دعویٰ ہی نہیں، بے شمار صحیح اور متواتر احادیث کا عملاً انکار بھی کررہے ہیں، اور پھر جناب عمار خان ناصر صاحب لایعنی تاویلات کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ ''غامدی صاحب کے نزدیک اخبار آحاد میں بیان ہونے والے تمام احکام قرآن مجید یا سنت متواترہ کے احکام کی تفریع وتفصیل سے عبارت ہیں''...... کیا جناب عمار خان صاحب بتاسکتے ہیں کہ غامدی صاحب کے اصولی موقف اور عمار خان صاحب کی اس تشریح کا آپس میں کیا جوڑ ہے؟ کیا وہ بتاسکتے ہیں کہ اوپر بیان کی گئی جن احادیث کا جناب غامدی صاحب نے کھلے بندوں صراحت سے انکار کیا ہے، وہ قرآن کے کسی حکم سے متعلق تھیں یا نہیں؟ اگر تھیں تو اُن کا انکار کیوں کیا؟ اور اگر نہیں تھیں تو پھر جناب عمار صاحب کا وہ دعویٰ کیا ہوا کہ ہر حدیث لازماً قرآن کے ہی کسی حکم سے متعلق ہے؟

یوں تو جناب عمار خان صاحب بھی اپنے مرشد جناب غامدی صاحب کی طرح اپنے موقف کی تائید کے لئے احادیث واقوال صحابہ سے دل کھول کر استدلال فرماتے ہیں، مگر اپنے موقف کے خلاف احادیث کے ساتھ ان کا وہی رویہ ہوتا ہے جو ان کے استاد جناب غامدی صاحب نے انہیں سکھایا ہے۔ چنانچہ کم سے کم دو مقامات تو ایسے ہیں جہاں انہوں نے بخاری شریف کی احادیث پر بھی بلادریغ جرح وانکار کا تیشہ چلایا ہے بلکہ ''دلائل وبراہین'' کے ہتھیار کے ساتھ صحیحین کی روایات پر تیشہ چلانے کی ہر خاص وعام کو

دعوت عام بھی دی ہے، چنانچہ اپنے ایک طویل اقتباس کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ:

''صحیح علمی رویہ یہ ہے کہ نقد روایت کے باب میں نئے تنقیدی زاویوں کے امکان کی نفی نہ کی جائے بلکہ دلائل وشواہد پر مبنی کوئی بھی تنقید سامنے آنے پر متعلقہ روایات کا از سر نو روایتاً ودرایتاً جائزہ لیا جائے اور رد وقبول کے مستند ترین معیارات کے مطابق ان کی صحت وسقم کا فیصلہ کیا جائے۔ محض حسن ظن کی بناء پر صحیحین کی روایات کی نقد وجرح کے دروازے کو بند کر دینا یا کسی روایت میں سامنے آنے والی کمزوری سے اس مفروضے کی بنیاد پر صرف نظر کر لینا کہ اس کو قبول کرنے کے حق میں شیخین کے پاس یقیناً کوئی نہ کوئی دلیل ہوگی، محض تحکم کا درجہ رکھتا ہے۔'' [براہین: ۱۲۹]

دیکھ لیجئے! پورے وثوق اور اطمینان سے جناب عمار خان ناصر صاحب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا نام لے کر وہی بات کہہ رہے ہیں جو ان کے استاد گرامی صاحب کہہ آئے تھے، یعنی چودہ سو سال کے محدثین کرام احادیث کی جرح وتعدیل کے سلسلے میں جو کام کر چکے ہیں، وہ حرف آخر نہیں ہے بلکہ اس کو از سر نو شروع کیا جا سکتا ہے، اور عام احادیث نہیں بلکہ بخاری ومسلم کی احادیث پر بھی بلا تکلف جرح کا تیشہ چلایا جا سکتا ہے۔ قارئین کرام! جب احادیث کے ذخیرے میں سے ہر حدیث کو جرح کی چھری سے ذبح کرنے کی اجازت ہو، جرح کی وہ چھری عمار وغامدی صاحبان کے بے رحم ہاتھوں میں ہو اور اس جرح کے اصول وہی ہوں جو غامدی صاحب نے ارشاد فرما دیے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا کیا حشر ہوگا..... ؟ آہ.....!

گربہ میر و سگ وزیر و موش را دیواں کنند

ایں ہمہ ارکان دولت ملک را ویراں کنند

یہ تو ان کا ارشاد فرمودہ ایک اصول تھا، اب اس اصول پر ان کو عمل کرتے دیکھنا چاہیں تو سر دست یہ حوالے ملاحظہ فرمائے جائیں:

۱:..... اپنی کتاب ''براہین'' میں انہوں نے ایک پورا باب بخاری شریف کی ایک حدیث میں ''راویوں کے تصرفات'' کو ثابت کرنے کے لئے لکھا ہے۔ [دیکھئے! براہین: ۶۰۷]

۲:..... اپنی کتاب حدود وتعزیرات [ص: ۱۵۷] میں انہوں نے بخاری شریف کی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک صحیح روایت کا انکار کیا ہے۔

اسی طرح آیت رجم کے قرآن پاک میں ہونے اور پھر منسوخ ہونے کی روایت کا، جو مسند احمد، موطا امام مالک، سنن بیہقی اور السنن الکبریٰ للنسائی میں موجود ہے، اپنی سمجھ کے مطابق ان میں تضاد ظاہر کر کے ان کا انکار کیا ہے۔ [حدود وتعزیرات: ۱۵۸]

مزے کی بات یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک صحیح اور مشہور احادیث کا تو جناب عمار

خان ناصر صاحب محض عقل کے گھوڑے دوڑا کر انکار کرتے یا ان میں تشکیک پیدا کر دیتے ہیں، لیکن یہی عمار خان ناصر صاحب شیعوں کی من گھڑت اور واہی تباہی کتابوں کی بے اصل روایات کو حدیث کو طور پر پیش فرماتے ہیں، چنانچہ اپنی کتاب حدود وتعزیرات [حاشیہ، ص ۱۵۴] میں انہوں نے "فـــــــروع کافی" اور "من لا یحضرہ الفقیہ" کے حوالے کو حضرت امام محمد باقر اور حضرت امام جعفر صادق رحمہما اللہ کے قول کے طور پر پیش کیا ہے۔

اجماع کا انکار:

قرآن وسنت کے بعد سب سے اہم اور مضبوط دلیل اجماع ہے، یوں تو اس کا درجہ قرآن اور حدیث کے بعد ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث تک پہنچنے کے لیے بھی ہمارے پاس واحد راستہ اجماع ہی ہے، اس لیے کہ اجماع امت سے ہی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن ہے اور یہ حدیث، اجماع امت کے واسطے کے بغیر نہ ہم قرآن تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ ہی حدیث تک۔ اسی لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اجماع امت قطعی دلیل ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔ چنانچہ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صاحب صفدر رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اجماع بھی قطعی ادلّہ میں سے ہے، اس لیے اجماع کا منکر بھی کافر ہے"۔ [ارشاد الشیعہ: ۲۰۹]

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"قرآن کا منکر بھی کافر ہے، متواتر حدیث کا انکار بھی کفر اور امت کے اجماع کا انکار بھی کفر ہے"۔

[خطبات امام اہل سنت: ۲/۱۸]

مگر قرآن وحدیث کی طرح چونکہ اجماع امت بھی نفس پرستوں کی شیطانی خواہشات کے راستے میں پہاڑ کی طرح حائل ہے، اس لیے یہ لوگ نہ صرف اجماع امت کو قطعی دلیل ماننے سے انکار کرتے ہیں بلکہ موقع بموقع اس کے خلاف بھڑاس بھی نکالتے رہتے ہیں، جناب غامدی صاحب حیات عیسیٰ علیہ السلام، رجم کی سزا، وراثت میں عول کے قانون، اور ارتداد کی سزا سمیت بہت سے اجماعی مسائل کے منکر ہیں، ایک جگہ صراحتاً اجماع کی حجیت کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"لیکن فقہاء کا دور شروع ہوا تو اس کے ساتھ ایک چوتھی چیز کا اضافہ کر دیا گیا، یہ مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اُس کے بعد سے اب تک بالعموم مانا جاتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ایک مصدر یہ اجماع بھی ہے۔ دین کے ماخذ میں یہ اضافہ یقیناً ایک بدعت ہے۔ قرآن وسنت کے نصوص میں اس کے لیے کوئی بنیاد تلاش نہیں کی جاسکتی"۔ [اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص: ۳]

نجانے ساری امت کے بے وقوف، کم علم، کم عقل اور اب "بدعتی" ہونے کا یہ بھوت کہاں سے

غامدی صاحب کے سر پر سوار ہو گیا ہے کہ انہیں کسی بھی جگہ اپنے سوا کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ ساری دنیا میں علم وعقل کے وہی بے تاج بادشاہ ہیں اور باقی ساری دنیا ان کے سامنے بونی، جو وہ فرمائیں وہی صحیح ہے اور باقی سب جہالت ونادانی، غامدی صاحب کی خود پرستی اور حماقت کی اس بیماری کا اللہ پاک ہی کوئی علاج فرمائیں تو فرمائیں، بظاہر تو اس تکبر ونخوت کے ہوتے ہوئے ان کا کوئی علاج بھی ممکن نظر نہیں آتا۔

اجماعِ امت کے صراحۃً انکار کے بعد اب ذرا غامدی صاحب کے ادیبانہ قلم سے جمہور اکابر کی اجماعی آراء کی ''مؤدبانہ'' بے ادبی ملاحظہ فرمایئے اور سر دھنئے! لکھتے ہیں:

''ہمارے نزدیک چونکہ یہ سب حضرات (صدرِ اول سے لے کر اب تک کے تمام فقہائے کرام وعلمائے کرام، ناقل) پیغمبر نہیں تھے، اس لیے ان کے دلائل کی صحت وعدم صحت کا جائزہ لینے کی جسارت بھی ہم نے کی ہے۔ برسوں کے مطالعہ اور فکر وتدبر کے بعد ہم اس عقیدت واحترام کے باوجود جو ان حضرات کی علمی خدمات کے لیے ہمارے دل میں ہے، یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اپنے اس موقف کی تائید میں جتنے دلائل انہوں نے پیش فرمائے ہیں، وہ سب منطقی مغالطوں پر مبنی اور بے حد کمزور ہیں۔ [برہان:۴۷]

یعنی چودہ صدیوں کے جمہور اہل علم جو دلائل پیش فرما رہے ہیں، وہ سب اس لیے مغالطوں پر مبنی ہیں کہ وہ سب پیغمبر نہیں تھے، اور جناب غامدی صاحب کے دلائل حق وانصاف کے بہتے دریا ہیں، اس لیے کہ شاید انہیں نبوت کا مقام مل گیا ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''علم واستدلال نہ کسی گروہ کی میراث ہے، نہ کسی دور کا خاصہ۔ اگلوں کو اگر ایک اصول بنانے کا حق تھا تو ہمیں دلائل کے ساتھ اس کے ابطال کا بھی حق ہے۔'' [برہان:۳۶]

عمار خان ناصر کی اجماع دشمنی:

جب استادِ محترم، امت کے عظیم فقہاء کو اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتے اور نہ ہی امت کے علماء کے اجماع کو حجت تسلیم کرتے ہیں، تو شاگردِ رشید صاحب بھلا ان سے کچھ کم ہیں جو غامدی صاحب جیسے محقق اعظم کی بات کو چھوڑ کر پرانے زمانے کے فقہاء کی آراء یا ان کے اجماع کو حجت تسلیم کریں؟ چنانچہ وہ ''آنکہ پدر نہ کرد پسر تمام کرد'' پر عمل کرتے ہوئے اجماع کے وجود ہی کے کسی امکان کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں حقیقی معنوں میں کسی اجماع کے امکان یا انعقاد کا تصور محض ایک علمی افسانہ ہے جس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہیں''۔

[براہین:۱۴۵]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال (اجماع کے وقوع کے امکان اور اس کے حجت ہونے کا، ناقل) جس قدر عام ہے، اتنا ہی حقیقت واقعہ سے دور اور امت مسلمہ کی علمی روایت کے نہایت محدود، سطحی اور عامیانہ مطالعے کا نتیجہ ہے''۔ [براہین:۱۱۶]

ایک مقام پر اپنے مرشد جناب غامدی صاحب ہی کی طرح دجالی انداز اپناتے ہوئے پہلے تو اپنے قاری کو یہ تأثر دیتے ہیں کہ وہ اجماع کی حجیت کے قائل ہیں، لکھتے ہیں:

''اجماع چونکہ اجتہاد ہی کی ایک صورت اور اس کی فرع ہے، اس لئے اس کے فی نفسہ ایک قابلِ اتباع شرعی دلیل ہونے میں کلام نہیں''۔ [الشریعہ اشاعت خاص:۱۸۰]

مگر فوراً ہی کسی مداری کی طرح کرتب دکھاتے ہوئے پینترا بدل کر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''اگر اجماع کی اساس بننے والے شرعی دلائل قطعی اور یقینی ہیں تو اجماع کا درجہ بھی یہی ہوگا، اور اگر دلائل ظنی اور استنباطی ہیں تو اجماع بھی اسی درجے کی دلیل ہوگا''۔[الشریعہ اشاعت خاص:۱۸۰]

یعنی اجماع خود کوئی دلیل نہیں بلکہ اگر ''اجماع کی دلیل'' قطعی ہے تو اجماع بھی قطعی ہوگا اور اگر ''اجماع کی دلیل'' ظنی ہے تو اجماع بھی ظنی ہوگا، سبحان اللہ! اجماع کے حجت قطعیہ ہونے کا انکار بھی کر دیا اور اس کا نام لے کر بھولے بھالے مسلمانوں کو خوش بھی کر دیا۔ کوئی اس بزعمِ خود مجتہد سے پوچھے کہ جب کسی دوسری دلیل ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرنا ہے تو اجماع بے چارے کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

حیات ونزول عیسیٰ علیہ السلام:

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی حیات اور نزول کا عقیدہ امت کے اجماعی عقائد میں سے ہے، یہ عقیدہ چونکہ مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو زندہ وتابندہ رکھنے کا باعث بنتا ہے، لہٰذا طاغوت کے ایجنٹ اور انگریز کے وظیفہ خور کسی اور معاملے میں کچھ بھی موقف اختیار کریں، اس عقیدے کا انکار کرنے میں یک زبان نظر آتے ہیں۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اس عقیدے کی اہمیت وحیثیت کیا ہے؟ حضرت امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمانوں پر اُٹھائے گئے ہیں اور ان کی حیات قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے ان کی حیات کا منکر پکا کافر ہے اور اس کے کفر میں جو شک کرے وہ بھی کافر ہے''۔[ذخیرۃ الجنان:۔/۳۱۶]

مگر دوسری طرف مشہور منکر حدیث جناب عنایت اللہ مشرقی لکھتے ہیں:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں''۔[دیباچہ تذکرہ:۱۷، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج:۱۰۲]

اور چوہدری غلام احمد پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اب تک زندہ ہونے کی تائید قرآن کریم سے نہیں ملتی،

قرآن کریم آپ کے وفات پا جانے کا بصراحت ذکر کرتا ہے''۔[معارف القرآن:۵۳۲/۳، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج:۱۳۲]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''کوئی روایت جو حضرت عیسیٰ کے آنے کی خبر دیتی ہے، وضعی اور جھوٹی ہے جو ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتی''۔[معارف القرآن:۵۷۵/۳، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج، ایضاً]

انہی شیاطین الانس کے نقش قدم پر چلتے اور ان کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے جناب جاوید احمد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''سیدنا مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید سے میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اٹھا لیا گیا تھا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔

[ماہنامہ ''اشراق'' اپریل ۱۹۹۵ء صفحہ ۴۵......بحوالہ ''تحفہ غامدی'' از: مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم ص:۵۸]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''حضرت مسیح کو یہود نے صلیب چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی ان کا جسم بھی اٹھا کر لے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے۔''

[اشراق جولائی ۱۹۹۴ء صفحہ ۳۴......بحوالہ ''تحفہ غامدی'' از: مولانا مفتی عبدالواحد مدظلہم ص:۵۸]

اسی طرح جناب غامدی صاحب کے ممتاز شاگرد جناب رفیع مفتی بھی غامدی صاحب کے رسالے ''اشراق'' میں حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کا قرآن مجید میں دو مقامات پر ذکر موجود ہے۔...... ان دونوں آیات سے پتہ چلتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو یہود نے ہرگز قتل نہیں کیا تھا، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، البتہ اللہ نے انھیں وفات دی تھی اور پھر اللہ نے ان کے بے جان جسم کو یہود کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے اپنے پاس اٹھا لیا تھا۔ چنانچہ یہی بات صحیح ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں''۔[اشراق، مئی ۲۰۰۸ء، ص:۶۷]

غامدی صاحب نے اپنی بنیادی اور مشہور کتاب ''میزان'' میں بھی صراحت کے ساتھ اس عقیدے کو بیان کیا ہے۔ [میزان، علامات قیامت، ص:۱۷۸، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

عمار خان، غامدی صاحب کے قدم بقدم:

جناب عمار خان ناصر صاحب کھل کر تو یہ بات نہیں کہتے، ایک ''مجتہدانہ'' ادا سے اس کا نیم دلانہ سا اقرار کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ اس کے بارے میں شکوک وشبہات بھی ڈالتے جاتے ہیں، اور اِس عقیدے کے عقیدہ ہونے کا اِنکار بھی کرتے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے! ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک سیدنا مسیح علیہ السلام کے دوبارہ تشریف لانے کے مسئلے کا دین کے اصولی تصورات اور عقائد سے کوئی تعلق نہیں'' [براہین:۶۰۹]

مگر دوسری جگہ اس کا اقرار کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ

''کتب حدیث میں متعدد روایات میں قیامت کے قریبی زمانے میں سیدنا مسیح علیہ السلام کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے اور دجال کو قتل کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ محدثین کے معیار کے مطابق یہ روایات مستند اور قابل اعتماد ہیں، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بہت سی پیش گوئیوں کی طرح، اس پیش گوئی کے سچا ہونے پر بھی یقین رکھنا آپ پر ایمان کا تقاضا ہے''۔ [الشریعہ اشاعت خاص، جون ۲۰۱۴ء، ص ۱۸۴]

مگر آگے چل کر پھر اپنی عادت کے مطابق ''رسول اللہ ﷺ کی اس سچی پیش گوئی'' کے بارے میں تشکیک پیدا کر کے اقرار خود اپنے ایمان میں خلل ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس پیش گوئی سے متعلق علمی طور پر بعض اشکالات یقیناً پیش آتے ہیں، مثلاً قرآن مجید کا اس اہم واقعے کی صراحت سے صرف نظر کرنا اور متعلقہ احادیث میں بیان ہونے والے بعض امور کا بظاہر تاریخی واقعات کے مطابق نہ ہونا''۔ [ایضاً]

اس کے فوراً بعد پھر اقرار کی طرف قلابازی کھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاہم چونکہ باعتبار سند یہ روایات قابل اعتماد ہیں اور ان میں وضع کے آثار نہیں پائے جاتے، اس لیے اشکالات کو اشکالات ہی کے درجے میں رکھنا زیادہ قرین احتیاط ہے۔ ان کی بنیاد پر پیش گوئی کا مطلقاً انکار کر دینا درست نہیں''۔ [ایضاً]

مگر اپنی عادتِ بد سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ پھر کسی ماہر بازیگر کی طرح الٹی زقند لگاتے ہوئے اس حدیث میں شبہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

''خاص طور پر جبکہ روایات سے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ بالمعنی نقل ہوئی ہیں اور کسی بھی واقعے سے متعلق تفصیلات کے نقل کرنے میں راویوں کا سوءِ فہم کا شکار ہو جانا ذخیرۂ حدیث میں ایک جانی پہچانی چیز ہے''۔ [ایضاً]

اور آخر میں پھر عجیب و غریب نکتہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ ایک پیش گوئی کے طور پر سیدنا مسیح علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری پر ''اعتقاد'' رکھتے ہوئے، یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اپنی بنیادی نوعیت کے لحاظ سے یہ ''عقیدے'' کا مسئلہ نہیں''۔ [الشریعہ، اشاعت خاص: ۱۸۵]

انکار و اقرار کی طویل ہیرا پھیری کے آخر میں جناب نے جو یہ دانشمندانہ نتیجہ نکالا ہے اس پر تو ان سے کہنے کو جی چاہتا ہے کہ: ؏ جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی

یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ پیش گوئی بھی ہے، پیش گوئی بھی سچی ہے، اس پر یقین رکھنا آپ ﷺ پر ''ایمان'' کا تقاضا بھی ہے، مگر اس کے باوجود یہ عقیدے کا مسئلہ نہیں، اس پر ''اعتقاد'' بھی ضروری ہے اور یہ ''عقیدہ'' بھی نہیں ہے......!

کس پر یقین کیجئے، کس پر نہ کیجئے!
آئی ہیں بزمِ یار سے خبریں الگ الگ

اب اس بحث کے شروع میں تحریر کیا گیا حضرت امام اہل سنتؒ کا یہ فتویٰ دوبارہ پڑھ کر خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام کو عقیدہ نہ سمجھنے والے اور اس کے منکر کو مسلمان کہنے والے جناب عمار خان ناصر صاحب، اپنے دادا محترم کے فتوے کی رُو سے کیا قرار پاتے ہیں:

''حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمانوں پر اُٹھائے گئے ہیں اور ان کی حیات قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہے، ان کی حیات کا منکر پکا کافر ہے اور اس کے کفر میں جو شک کرے وہ بھی کافر ہے''۔ [ذخیرۃ الجنان: ۲۱۶]

توہینِ رسالت کی سزا:

جناب رسول اللہ ﷺ کی توہین و تنقیص کرنے والے ملعون کے بارے میں امت کے جمہور اہل علم کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ واجب القتل ہے۔ اس کا سرتن سے جدا کر کے اس کے ناپاک وجود سے زمین کو پاک کر دیا جائے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے لے کر اب تک امت مسلمہ اس بارے میں بے حد حساس اور غیرت مند واقع ہوئی ہے اور اس گئے گذرے دور میں بھی جب کبھی ناموسِ رسالت کی بات آئی ہے تو اس امت کے جاہل سے جاہل اور گناہگار سے گناہگار اشخاص بھی آپ ﷺ کی ناموس پر کٹ مرنے کو تیار نظر آئے ہیں۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے لے کر غازی علم الدین شہید اور غازی عامر چیمہ شہید تک تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی ملعون نے دامنِ رسالت مآب ﷺ پر کوئی ناپاک چھینٹا اڑانے کی کوشش کی، اس امت کے کسی نہ کسی بطلِ جری نے اسے ٹھکانے لگا کر واصلِ جہنم کر دیا۔ نیز علمائے کرام اور حکامِ اسلام نے ہمیشہ اور ہر دور میں اس کے گندے اور نجس وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا حکم جاری فرمایا۔ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:۔

''جناب رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ادنیٰ ترین توہین اور تنقیص بھی حضرات فقہاء کرام کے نزدیک موجب کفر ہے اور یہ کہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ ہے کہ اس شخص کو قتل کر دے''۔ [ازالۃ الریب: ۴۴۱]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''قومی اسمبلی نے قانون پاس کیا کہ توہین رسالت کے مرتکب کی سزا موت ہے۔ رسالت کا لفظ عام

ہے تمام پیغمبروں کو شامل ہے۔ جس پیغمبر کی بھی کوئی توہین کرے گا اس کو سزائے موت ہوگی لیکن امریکہ بہادر اس بات پر مصر ہے کہ اس قانون کو ختم کرواور اپنے پیغمبر کی توہین کرنے کا ہمیں حق دو''۔
[ذخیرۃ الجنان: ۵/۲۰۸]

جبکہ جناب جاوید احمد غامدی امریکہ بہادر کی لے میں لے ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''توہین رسالت کی سزا کا جو قانون ریاست پاکستان میں نافذ ہے، اُس کا کوئی ماخذ قرآن وحدیث میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ موجودہ قانون قرآن کے بھی خلاف ہے، حدیث کے بھی خلاف ہے اور فقہائے احناف کی رائے کے بھی خلاف ہے۔ اسے لازماً تبدیل ہونا چاہیے۔ یہ پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے''۔[اشراق، مارچ تا مئی ۲۰۱۱ء]

سبحان اللہ! حضرت امام اہل سنتؒ اور جمہور اہل علم تو اس قانون کو اسلامی قانون کہیں، پاکستان کی اسمبلی سے بھی اسے پاس کروائیں، اور یہ خود ساختہ محقق صاحب محض کفار ومشرکین کی رضا کے لیے اسے ''غیر اسلامی قانون'' کہے، یاللعجب!

جبکہ لائق و فائق شاگرد جناب عمار خان ناصر بھی امتِ مسلمہ سے غداری اور جناب رسول اللہ ﷺ سے بے وفائی کرتے ہوئے، اسلامی غیرت اور شرم وحیاء کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اور اپنے استاد کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے فرماتے ہیں:

توہین رسالت سے متعلق حالیہ قانون چند بنیادی اور اہم پہلوؤں سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔

مجرم سے پہلی مرتبہ جرم سرزد ہوا ہو تو اسے توبہ، معذرت اور معافی کا موقع دیا جائے۔

جرم کی نوعیت اور اثرات کے لحاظ سے سزائے موت کے ساتھ ساتھ متبادل اور کم تر سزاؤں کی گنجائش بھی قانون میں شامل کی جائے۔

اگر توہین رسالت کا الزام جھوٹا ثابت ہو تو الزام لگانے والے کو سخت سے سخت سزا دی جائے تاکہ شخصی اور گروہی وطبقاتی نزاعات میں اس الزام کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے رجحان کی حوصلہ شکنی کی جائے۔[ماہنامہ الشریعہ، اشاعت خاص (ملخصاً)]

یعنی توہین رسالت کا جرم، مجرم سے پہلی مرتبہ سرزد ہوا ہو تو اسے معافی کا موقع دیا جائے، (تاکہ پاکستان کا ہر کافر بھی ایک ایک مرتبہ آپ ﷺ کی شان اقدس میں گستاخی کرلے تو عمار خانی دھرم کی بدولت ان میں سے کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوسکے، اگر مجرم بار بار اس ملعون فعل کو دہرائے تب بھی موت سے کم سزا کی گنجائش رکھی جائے، البتہ اگر توہین رسالت کا الزام جھوٹا ثابت ہو تو الزام لگانے والے کو سخت ترین سزا دی جائے۔ یہ ہے عمار خانی دھرم......! کہ توہین رسالت کے ملعون مرتکب کے لئے تو معافی، توبہ کا موقع، سزا میں حتی الامکان تخفیف......اور اس کو پکڑ کر قانون کے حوالے کرنے والے کے لیے نہ توبہ کا

موقع اور نہ ہی معافی کی گنجائش.....نجانے عمار خان ناصر صاحب نے یہ کفریہ اور الحادی سبق کہاں سے یاد کیے ہیں کہ ان کی عقل نے کام ہی کرنا چھوڑ دیا ہے۔مقام عبرت ہے کہ ایک طرف تو چند شیطان نما انسان علی الاعلان جناب رسول اللہ ﷺ کی بار بار توہین کا ارتکاب کر رہے ہیں اور پوری دنیا کی طاغوتی حکومتیں ان کے اس ناپاک فعل کو ان کا حق قرار دے رہی ہیں، اور دوسری طرف عمار خان ناصر جیسے کرائے کے محقق ملعون شاتم رسول کے لیے معافی کے بہانے تلاش کر رہے ہیں ع تر اا ے کاش کہ مادر نہ زاد ے

''اتمام حجت'' کی غامدی تشریح اور اس سے پھوٹنے والے برگ و بار:

اللہ جل شانہ کا تکوینی قانون ہے کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کے ذریعے کسی قوم تک اپنی دعوت پہنچاتے ہیں، اگر وہ قوم حق کو پہچاننے کے بعد اس کا انکار کر دے تو اس قوم پر اللہ کی طرف سے ''اتمام حجت'' ہو جاتا ہے، تب اس قوم کے منکرین پر اللہ جل شانہ کی طرف سے عذاب نازل ہوتا ہے۔یہ اللہ جل شانہ کی ایک سنت اور تکوینی قانون ہے، مگر غامدی سرکس کے شعبدہ بازوں نے اس تکوینی قانون کو تشریعی ضابطہ میں تبدیل کر کے اس سے اپنی مرضی کے عجیب وغریب نتائج اخذ کئے ہیں اور پھر ان نتائج پر اپنے بدبودار مذہب کی بنیاد رکھی ہے، غامدی پارٹی کے اس من گھڑت اصول کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ:

> ''اللہ کا کوئی رسول جب کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے اور کافی عرصہ اپنی دعوت وتبلیغ کے ساتھ اس قوم میں وقت گذارتا ہے تو آخر اس قوم پر ''اتمام حجت'' ہو جاتا ہے اور اس ''اتمام حجت'' کے بعد بھی جو اس نبی پر ایمان نہ لائے اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔اس ''اتمام حجت'' کی یقینی خبر صرف اللہ کا رسول ہی وحی کی بنیاد پر دے سکتا ہے، جناب رسول اللہ ﷺ چونکہ اللہ کے آخری پیغمبر ہیں، اس لئے اب آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد کوئی شخص کسی پر ''اتمام حجت'' کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔'' [میزان:۵۳۲]

غامدیان کرام کی تلبیس سے ناواقف ایک انجان قاری حیرت سے منہ کھول کر خوشبو میں پیشاب ملی، اور دو صحیح، دو غلط باتوں پر مبنی ان کی اس ''علمی'' تقریر کو سن کر سر ہلاتا رہتا ہے اور اس کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے اسے ایک بے ضرر سی بات سمجھ کر نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے تسلیم کر لیتا ہے.....بظاہر اس میں کوئی ایسی خرابی بھی نظر نہیں آتی .....مگر.....!

۱.....جب دین کے غلبے کے لئے اللہ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کی بات آتی ہے تو غامدیان کرام فوراً بول پڑتے ہیں کہ جناب! دین کے غلبے کے لیے جہاد تو اس قوم کے ساتھ ہوتا ہے جس پر ''اتمام حجت'' ہو چکا ہو، اور ''اتمام حجت'' چونکہ اب کسی پر نہیں ہو سکتا، لہٰذا اب غلبۂ دین کے لیے جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔

۲:.....جب کوئی قادیانیوں یا شیعوں جیسا کوئی بدبخت فرقہ اسلام کے نام پر کفر و زندقہ پھیلانے لگتا ہے اور دین کے چوکیدار، علمائے کرام اس کے کفریہ عقائد کی بناء پر اسے کافر ٹھہراتے ہیں تو

یہی غامدی ٹولہ پھر میدان میں آ نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب! کسی کو کافر تو اس وقت کہا جاتا ہے جب اس پر ''اتمام حجت'' مکمل ہو چکا ہو۔ اب چونکہ کسی بھی شخص یا گروہ پر ''اتمام حجت'' مکمل ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، سو اب کسی پر کفر کا فتویٰ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

۳:......اسی طرح جب اہل حق کی طرف سے یہ آواز اٹھتی ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کے فرمان، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عمل اور امت مسلمہ کے اجماع کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے اور اس سزا کو نافذ ہونا چاہیے، تو یہی غامدی پارٹی پھر وہی گھسا پٹا استدلال لے کر درمیان میں کود پڑتی ہے کہ مرتد کو قتل تو اس وقت کیا جاتا ہے جب اس مرتد پر ''اتمام حجت'' ہو چکا ہو۔ اب چونکہ کسی مرتد پر ''اتمام حجت'' نہیں ہو سکتا، لہٰذا کسی مرتد کو سزا کے طور پر قتل بھی نہیں کیا جا سکتا۔

چار صحیح اور دو غلط باتوں کو جوڑ کر آشیانہ بنانے کے ماہر فنکار غامدیوں کو کون سمجھائے کہ بے شک یہ تو درست ہے کہ جس قوم پر اللہ جل شانہ کی طرف سے ''اتمام حجت'' ہو جائے اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو جاتا ہے، مگر یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ یہ ''اتمامِ حجت'' صرف انبیائے کرام علیہم السلام کی موجودگی میں ہی ہو سکتا ہے؟ اور یہ کس نے کہا کہ جہاد، تکفیر اور ارتداد کی سزا کے شرعی و ابدی احکام جو قیامت تک کے لیے اس امت کو عطاء کیے گئے ہیں، یہ بھی اس ''اتمام حجت'' کے ساتھ معلق ہیں؟

اگر رسول اللہ ﷺ کے بعد اب کسی پر ''اتمام حجت'' نہیں ہو سکتا، اور ''اتمام حجت'' کے بغیر کسی کے ساتھ جہاد درست نہیں، تو غامدی ٹولہ کے سرغنہ حضرات، اُن حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں کیا فرمائیں گے جو قیصر و کسریٰ سے ٹکراتے ہوئے، افریقہ و یمن اور شام کو روندتے ہوئے بلوچستان تک ''لا الٰہ الا اللہ'' کا پھریرا لہراتے چلے گئے؟

المختصر یہ کہ ''اتمام حجت'' کے تکوینی قانون کو تشریعی قانون بنا کر اور اس میں اپنی طرف سے بہت سی باتیں داخل کر کے اس کی بنیاد پر بہت سے شرعی احکام و عقائد کا انکار کرنا صرف اور صرف ایک بازیگری اور سرکس کا کرتب ہے جس سے کم علم عوام اور سادہ دل عوام کو پھنسا کر اپنا گرویدہ بنانا تو ممکن ہے مگر ذرا سی سمجھ بوجھ اور علم رکھنے والے حضرات کے نزدیک اس کی پرِ کاہ جتنی بھی وقعت نہیں۔ اس ضروری تمہید اور اصولی بات کے بعد اب ہم ''اتمام حجت'' کے غامدی مارکہ قانون سے پھوٹنے والے برگ و بار کا ایک جائزہ لیتے ہیں۔

مسئلہ تکفیر:

جناب غامدی صاحب اور ان کی پارٹی کی ایک نرالی تحقیق یہ ہے کہ:

''موجودہ زمانے کے یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں، سکھوں، یا قادیانیوں جیسے کسی بھی یا گروہ یا فرد کو آپ غیر مسلم تو کہہ سکتے ہیں، کافر نہیں کہہ سکتے''۔

پوری امتِ مسلمہ کا صدرِ اول سے اب تک اس بات پر اتفاق چلا آ رہا ہے کہ یہودی، عیسائی اور دیگر غیر مسلم ''کافر'' ہیں، نیز اسلام کا دعویٰ کرنے والا بھی کوئی شخص اگر ضروریاتِ اسلام میں سے کسی کا انکار کرے گا تو اسے بھی ''کافر'' قرار دیا جائے گا اور اس کے اوپر ''کفار'' کے احکامات بھی جاری کیے جائیں گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، منکرینِ زکوۃ اور مرتدین کے ساتھ قتال سے لے کر مرزا غلام احمد قادیانی ملعون اور اس کی ذریت کو کافر ٹھہرانے تک، امت مسلمہ نے ہمیشہ یہی فیصلہ کیا ہے کہ جو شخص بھی کفریہ عقائد کو اختیار کرے گا، اسے ''کافر'' ہی کہا جائے گا۔ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''اور کافر وہ ہے جسے شریعت کافر کہے صرف عوام کی اصطلاح والا کافر نہیں ہے، شریعت کی زبان میں مرزائی کافر ہے، مشرک کافر ہے، شیعہ کافر ہے، منکر حدیث کافر ہے''۔ [ذخیرۃ الجنان: ۵/۲۷۵]

اور ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''جو شخص ختم نبوت کا انکار یا تاویل کرے تو وہ یقیناً کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے کیونکہ جس طرح ضروریات دین میں سے کسی امر کا انکار کفر ہے اسی طرح اس کی تاویل بھی کفر ہے اور خوبصورت سے خوبصورت تاویل بھی کفر سے نہیں بچا سکتی''۔ [ختم نبوت کتاب وسنت کی روشنی میں: ۱۲]

جبکہ جناب غامدی صاحب کو اہل السنۃ والجماعۃ کے اس اجماعی و اتفاقی موقف سے اختلاف ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اب کسی نظریے کو کفریہ نظریہ تو کہا جا سکتا ہے، مگر اس کفریہ نظریے کے حامل کو کافر نہیں کہا جا سکتا، چنانچہ لکھتے ہیں:

''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے، یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں''۔ [ماہنامہ اشراق، ص: ۵۴، دسمبر ۲۰۰۰ء، بحوالہ: غامدیت کیا ہے؟]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے کسی فرد کی تکفیر کا حق قرآن وسنت کی رو سے کسی داعی کو حاصل نہیں ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ دین سے جہالت کی بنا پر مسلمانوں میں سے کوئی شخص کفر و شرک کا مرتکب ہو، لیکن وہ اگر اس کو کفر و شرک سمجھ کر خود اس کا اقرار نہیں کرتا تو اس کفر و شرک کی حقیقت تو بے شک، اُس پر واضح کی جائے گی، اُسے قرآن وسنت کے دلائل کے ساتھ ثابت بھی کیا جائے گا، اہل حق اُس کی شناعت سے اُسے آگاہ بھی کریں گے اور اُس کے دنیوی اور اُخروی نتائج سے اُسے خبردار بھی کیا جائے گا، لیکن اُس کی تکفیر کے لیے چونکہ اتمامِ حجت ضروری ہے، اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ حق اب قیامت تک کسی فرد یا جماعت کو بھی حاصل نہیں رہا کہ وہ کسی شخص کو کافر قرار دے''۔ [اسلام اور انتہا پسندی: ۱۲...... بحوالہ ماہنامہ بینات]

اسی لیے غامدی صاحب چوہدری غلام احمد پرویز جیسے بد بخت منکرِ حدیث، جس کے کفر کا فتویٰ عرب وعجم کے ایک ہزار جید علمائے کرام نے دیا تھا، کو بھی کافر قرار نہیں دیتے، ایک سوال کے جواب میں ان کے شاگرد اپنے استاد کی پڑھائی ہوئی پٹی کی روشنی میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں:

سوال: علمائے کرام نے پرویز صاحب پر کفر کے بہت فتوے لگائے تھے، غامدی صاحب کی پرویز صاحب کے بارے میں کیا رائے ہے؟ (صفدر اقبال)

جواب: ہمارے نزدیک کسی پر کفر کا فتویٰ لگانا درست نہیں ہے۔ ہم دوسرے کی آراء سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ اس کے خیالات کو غلط قرار دے سکتے ہیں، لیکن کسی کو کافر کہنے کا حق ہمیں حاصل نہیں۔ [اشراق، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص: ۶۷......محمد رفیع مفتی]

جناب عمار خان ناصر صاحب اُصولی طور پر تو اپنے استاد گرامی کی ''اتمام حجت'' والی اس نادر و نایاب تحقیق انیق سے متفق ہیں، اسی لیے وہ بہت سے مقامات پر اس سے استدلال بھی کرتے ہیں، مگر ایک خاص مقام ایسا ہے کہ جہاں ان کے لیے اپنا اور اپنے مرشد جناب غامدی صاحب کا یہ نظریہ گلے کی ایسی ہڈی بن جاتا ہے کہ جسے نہ وہ اگل سکتے ہیں اور نہ ہی نگل سکتے ہیں......وہ مقام قادیانیوں کی تکفیر کا ہے۔

''اتمام حجت'' کا یہ سارا من گھڑت اصول اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب کسی بھی فرد یا گروہ کو اب کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، تو قادیانیوں کو بھی کافر قرار نہ دیا جائے، اور جناب عمار خان ناصر صاحب کافی عرصہ تک اسی نظریہ کے حامل رہے ہیں کہ قادیانی مسلمان ہیں، کافر نہیں ہیں۔ [الشریعہ مئی ۲۰۱۲] مگر دوسری طرف قادیانیوں کی تکفیر کا مسئلہ اس قدر نازک اور حساس ہے کہ اگر وہ اپنے اسی موقف پر قائم رہتے ہیں تو یہ بات پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ناقابل برداشت اور ختم نبوت کے پروانوں کے لیے شدید اشتعال کا باعث ہے، جس کی بناء پر اہل السنۃ والجماعۃ کے بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرنے کا ان کا ''شرعی فریضہ'' متاثر ہوتا ہے، نیز ان کے اور ان کے سرپرستان حضرات کے لیے شدید مشکلات پیدا ہوتی ہیں جن کو برداشت کرنے کا ان میں حوصلہ نہیں ہے، لہٰذا یہاں بھی وہ اپنی ''جرأت مندانہ'' عادت کے مطابق ایک طرف تو ''اتمام حجت'' کا وہ 'غامدی مارکہ' قانون سینے سے لگائے بیٹھے ہیں جو قادیانیوں کو کسی طور کافر کہنے کی اجازت نہیں دیتا، دوسری طرف جب قادیانیوں کو کافر قرار دینے کی بات آتی ہے تو وہ ''قادیانی کافر ہیں'' کے بجائے ''قادیانی عملی طور پر کافر ہیں'' کہتے اور بڑے غیر محسوس طریقے سے ''عملی'' کے لفظ کا اضافہ کر کے بھولے بھالے مسلمانوں کو بہلانے اور پھسلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ میں نے قادیانیوں کو کافر کہہ دیا ہے، اور اپنے دلِ نادان کو بھی خوش کر لیتے ہیں کہ میں نے قادیانیوں کو حقیقی واعتقادی طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر کافر قرار دیا ہے (جس کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ

نہیں ہوسکتا کہ قادیانی درحقیقت تو کافر نہیں ہیں البتہ عملی طور پر ان کے ساتھ کافروں کا سا سلوک کیا جا سکتا ہے) ع خوش رہے رحمٰن بھی، راضی رہے شیطان بھی

یہ ہے جناب عمار خان ناصر صاحب کی وہ ''حق گوئی'' اور ''جرأت و بہادری'' جس کا پرچم اٹھا کر وہ دنیا بھر کے اہل علم کو للکارے مار رہے ہیں اور یہی وہ عمار خان ناصر ہیں جو تحریک ختم نبوت کی خاطر جانیں قربان کرنے، جیلوں کو آباد کرنے اور دیوانہ وار جانوں کے نذرانے پیش کرنے والے اکابرینِ امت اور علمائے کرام کو محض اپنی سیاست کے تحفظ اور معاشرتی بقاء کی خاطر تحریک چلانے کا طعنہ دیتے ہیں۔

مرتد کی سزا:

مرتد کی سزا کا مسئلہ بھی، جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے، ''اتمامِ حجت'' کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل میں سے ایک ہے۔ حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کا موقف ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور اس سزا کے نفاذ کے لیے فقہائے اہل السنۃ والجماعۃ نہ تو کسی غامدیانہ ''اتمامِ حجت'' کی شرط لگاتے ہیں اور نہ ہی اس سزا کو جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص کرتے ہیں۔ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جب دنیا کی کسی حکومت میں باغی کسی رعایت کا مستحق نہیں بلکہ تختۂ دار پر لٹکائے جانے کے قابل ہے تو اللہ تعالیٰ کے باغی کے لیے رعایت کی گنجائش کیسے؟ بلکہ اگر قتل سے کوئی زیادہ سزا ہوتی تو وہ اس کا بھی مستحق ہے، مرتد کا قتل کرنا قرآن وحدیث اور اجماعِ امت سے ثابت ہے''۔ [مقالہ ختم نبوت: ۵۳]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مرتد کا حکم یہ ہے کہ اس کا نکاح ختم، وراثت سے محروم اور مسلمانوں کے قبرستان میں اس کو دفن نہیں کیا جائے گا''۔ فوائد صفدریہ: ۹۸]

تیسری جگہ فرماتے ہیں:

''اگر کوئی مسلمان عورت مرتد ہو کر عیسائی مذہب قبول کر لے تو اس سے نکاح جائز نہیں ہے، کیونکہ مرتد ہونے کے بعد دنیا کے سارے احکام اس سے اُٹھ گئے ہیں''۔ [ذخیرۃ الجنان: ۱۸۳/۲]

یہ تو اہل سنت والجماعت کا نظریہ اور موقف تھا، اب جناب غامدی صاحب کی راگنی بھی سنتے جائیں، فرماتے ہیں:

''دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے...... ہمارے فقہاء اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق اُن سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک اِس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ اُن کی

رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اُسے اِس حدیث کی رو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔لیکن فقہاء کی یہ رائے محل نظر ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تو بے شک ثابت ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا، بلکہ صرف اُنھی لوگوں کے ساتھ خاص تھا جن پر آپ نے براہ راست اتمام حجت کیا اور جن کے لیے قرآن مجید میں 'مشرکین' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے......!

ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے 'الناس' کی طرح اسے قرآن میں اِس کی اصل سے متعلق کرنے اور قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اِس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے، اِسے عام ٹھیرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اِس طرح اسلام کے حدود وتعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے''۔[برہان:۱۴۷تا۱۴۶،طبع ششم،فروری ۲۰۰۹]

غامدی صاحب کی طرح ان کے مایہ ناز شاگرد جناب محمد رفیع مفتی بھی غامدی صاحب کی طرح ارتداد کی شرعی و ابدی سزا، یعنی قتل کو ''اتمام حجت'' کے ساتھ معلق کر کے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''ہمارے خیال میں مرتد کے لیے قتل کی سزا صرف رسول کے براہ راست مخاطبین تک ہی محدود تھی۔آج اس کا اطلاق کرنا غلط ہوگا۔''[اشراق، اگست ۲۰۰۸ء،ص:۵۹]

ارتداد کی سزا سے متعلق آپ نے جناب غامدی صاحب اور ان کے شاگرد جناب رفیع مفتی صاحب کی عبارات ملاحظہ فرمائیں کہ یہ دونوں حضرات اسے ''اتمام حجت'' کے ساتھ معلق کر کے پھر جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص کرتے ہیں، آیئے اب اس بارے میں جناب عمار خان ناصر صاحب کی سنتے ہیں کہ وہ کیا کہتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''اس (ارتداد کی) سزا کی شرعی اساس ''اتمام حجت'' کا اصول ہے، یعنی حق واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کرنا، جیسا کہ امام شافعیؒ کا موقف ہے (معاف کیجئے! یہ امام شافعی کا نہیں بلکہ آپ کے ''امام'' غامدی کا موقف ہے۔[ناقل])۔[ماہنامہ الشریعہ، اشاعت خاص، جون ۲۰۱۴ء،ص:۱۸۱]

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''اس تناظر میں اگر دور جدید میں مسلم ریاستوں میں علی العموم ارتداد کی سزا کے نفاذ سے گریز کیا گیا ہے تو فقہی طور پر یہ فیصلہ درست اور زیادہ قرین حکمت ہے''۔[ایضاً]

چونکہ یہاں جناب عمار خان ناصر صاحب کے موقف کا تفصیلی جائزہ لینا اور جواب لکھنا مقصود نہیں، صرف ان کی اور ان کے استاد محترم جناب غامدی صاحب کی فکری ہم آہنگی دکھانا مقصود ہے، اس لیے ہم نے ان کے یا اپنے دلائل کو چھیڑے بغیر محض ان کا مؤقف نقل کر دیا ہے، قارئین کرام اوپر جناب غامدی صاحب، اور نیچے

جناب عمار خان ناصر صاحب کی عبارتوں پر ایک نظر ڈال لیں، اور اگر جی چاہے تو یہ شعر بھی پڑھ لیں کہ:

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

غلبۂ دین کے لیے جہاد کا انکار:

''اتمام حجت'' کے قانون کے غامدی ایڈیشن سے پھوٹنے والے مسائل میں سے ایک مسئلہ جہاد کا ہے۔ غامدیان کرام کا فرمان عالیشان ہے کہ ''غلبہ دین کے لیے جہاد'' صرف اس قوم سے ہوسکتا ہے جس پر ''اتمام حجت'' کا عمل مکمل ہو چکا ہو۔ اب چونکہ غامدیوں کے بقول کسی پر ''اتمام حجت'' نہیں ہوسکتا، لہٰذا غلبۂ دین کے لیے جہاد بھی نہیں ہوسکتا۔ حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک اقدامی و دفاعی، دونوں قسم کا جہاد جاری وساری ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت جاری وساری رہے گا۔ امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگرچہ رضا کارانہ طور پر بعض تنظیمیں جہاد کشمیر میں مصروف ہیں مگر مسلمانوں کی ترپن (۵۳) سے زائد بے غیرت حکومتیں خاموشی میں ہی مصلحت سمجھتی ہیں تا کہ ان کا آقا (امریکہ اور اسکے پٹھو) ان سے ناراض نہ ہو جائیں مگر ایک وقت ضرور آئے گا کہ غیرت مند مسلمان انڈیا سے ٹکر لگا کر فاتح ہوں گے۔''
[توضیح المرام: ۵۷]

صاف واضح ہوا کہ حضرت امام اہل سنتؒ جہاد کو زمانہ نبوت کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تا قیامت ایک عام حکم قرار دیتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے جب جہاد شروع کیا تو خوشاب کے پہاڑوں سے لے کر ناران کے درے تک چھ ماہ اقتدار ان کے ہاتھ میں آیا تھا۔ شرعی سزائیں نافذ تھیں اور ان علاقوں میں کوئی بے نماز نظر نہیں آتا تھا اگر کسی نے اسلامی نظام کا نفاذ دیکھا ہے تو وہ شاہ احمد شہیدؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کے دور میں اس مخصوص علاقے میں دیکھا ہے''۔ [ذخیرۃ الجنان: ۱۳/۲۳۱]

اب ذرا جناب غامدی صاحب کی سنتے چلیں، فرماتے ہیں:

''یہ جہاد وقتال ہے، لیکن اس کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے:

ایک، ظلم وعدوان کے خلاف،

دوسرے، اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف۔

پہلی صورت شریعت کا ابدی حکم ہے اور اسی کے تحت جہاد اسی مصلحت سے کیا جاتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے

جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہِ راست حکم سے اور انھی ہستیوں کے ذریعے سے روبعمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے" [میزان، قانون جہاد، ص:۵۷۷، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق (کافروں) کے خلاف (غلبۂ اسلام کے لیے [ناقل]) جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح قوم کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے" [میزان، طبع نہم، ص:۵۹۹]

اور جناب عمار خان ناصر صاحب بھی اپنے استادِ گرامی کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مذکورہ بحث میں راقم الحروف نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد نبوی وعہد صحابہ میں غیر مسلم حکومتوں کے خلاف قتال ایک مخصوص شرعی اساس یعنی "اتمام حجت" کے قانون پر مبنی تھا جو شریعت کا عمومی قانون نہیں۔" [الشریعہ اشاعتِ خاص، جون ۲۰۱۴ء ص:۱۸۲]

کاش کہ یہ نادان اور کم عقل مجتہد شریعت کے ابدی قوانین کو محض اپنی عقل نارسا کے زور پر منسوخ کرنے کی مکروہ کوششوں سے پہلے چند لمحے کے لئے اپنی اوقات تو دیکھ لیتے ......! کاش کہ یہ ساری امت کے متفقہ نظریات کو ٹھکرا کر نیا دین ایجاد کرنے سے پہلے اپنے بونے وجود پر تو ایک نظر ڈال لیتے......! کاش کہ یہ حضرات جہاد کے اس دائمی وابدی حکم پر قلمِ تنسیخ پھیرنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیتے کہ اس کے نتیجے میں مجاہدین اسلام کی چودہ سو سالہ جہادی کاروائیوں پر کیا حکم لگایا جائے گا؟ ہزاروں شہدائے کرام کا خون جو خیر القرون سے لے کر جناب غامدی صاحب کے ظالمانہ فتوے تک اللہ کے راستے میں بہہ چکا ہے اس کا کیا حکم ہوگا؟ لاکھوں سربکف، سرفروش غازیوں نے جو اللہ کی رضاء کی خاطر بارہا جان ہتھیلیوں پر رکھ کر موت سے ٹکر لی ہے اور آگ وخون کے دریا میں کودے ہیں، افسوس کہ ان سب کی سرفروشانہ قربانیوں پر غامدی صاحب نے بیک قلم خطِ تنسیخ پھیر دیا اور ان سب کو رائیگاں قرار دے دیا، اور عمار خان ناصر ہیں کہ ان کی ہر بات پر بلا سوچے سمجھے سر ہلاتے چلے جا رہے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون......!

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ

آج یہ نادان اور نام نہاد مجتہد اقدامی جہاد اور مرتد کی سزا جیسے شرعی وابدی قوانین کو "اتمام حجت" کا بہانہ بنا کر رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص کر رہے ہیں، کل کو اگر کسی اور نے اٹھ کر کہہ دیا کہ:

"جناب! نماز روزہ حج زکوۃ وغیرہ کے احکامات تو صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص تھے جن کا براہ راست خود رسول اللہ ﷺ نے تزکیہ فرمایا تھا، آج کے دور میں چونکہ اس قسم کا تزکیہ نہیں ہے، لہٰذا یہ تمام احکامات بھی ساقط ہیں......"۔

تو دین اسلام کا کیا حشر نشر ہوگا اور شریعت میں آخر باقی ہی کیا بچے گا، اور ان بے فکرے مجتہدین کے پاس بغلیں جھانکنے کے علاوہ اِس الحاد و گمراہی کا جواب ہی کیا ہوگا جس کی بنیاد یہ خود رکھ رہے ہیں اور جس کا دروازہ یہ خود کھول رہے ہیں؟ کاش کہ یہ نادان ٹولہ جوشِ اجتہاد میں دینِ اسلام کی تجدید سے پہلے اس کے انجام پر بھی کچھ غور کر لیتا......! کاش کہ اس ٹولے میں اتنا احساس باقی ہوتا......!

مسجدِ اقصیٰ:

یہود کے ٹکڑوں پر پلنے والے غامدی ٹولے نے اپنے یہودی آقاؤں کی نمک حلالی کرتے ہوئے پوری امتِ مسلمہ سے ہٹ کر مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں بھی ایسا موقف اپنایا ہے جو نہ آج تک کسی مسلمان نے اپنایا ہے اور نہ غیرت وشرم سے عاری غامدیوں کے علاوہ کوئی اپنا سکتا ہے۔ امتِ مسلمہ کا بچہ بچہ اس صدمے اور حزن وملال سے مغموم ہے کہ ہمارا قبلۂ اول، ہماری مسجد اقصیٰ ظالم یہودیوں کے پنجۂ استبداد میں ہے اور دنیا بھر کے، یہاں تک کہ فلسطین کے مسلمان بھی اس میں نماز پڑھنے اور اس کی زیارت کی سعادت سے محروم ہیں۔ جبکہ بے غیرت غامدی ٹولہ یہ راگ الاپ رہا ہے کہ مسجدِ اقصیٰ کے احاطے میں موجود گنبدِ صخرہ پر اپنی عبادت گاہ تعمیر کرنا یہودیوں کا حق ہے اور مسلمان ان کا یہ حق غصب کر کے ظالم ہیں، امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ مسجدِ اقصیٰ پر یہودی قبضے اور امت مسلمہ کی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے پُر درد انداز میں فرماتے ہیں:

"بیت المقدس کے شہر میں جو مسجد اقصیٰ ہے جس پر ۱۹۶۷ء میں یہودیوں نے قبضہ کیا ہے اور ابھی تک ان کے قبضہ میں ہے اور بے غیرت مسلمان ابھی تک ان سے قبضہ چھڑا نہیں سکے"۔ [ذخیرۃ الجنان: ۷۹/۳]

دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

"حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی اس کے بعد جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انہوں نے بڑی شاہی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ مسجد اقصیٰ کو تعمیر کیا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بیت المقدس فتح ہوا اور ہمارے پاس رہا، ۱۹۶۷ء میں یہود نے ہم سے چھین لیا اور ابھی تک یہود کے قبضہ میں ہے اور بے غیرت مسلمان سوئے ہوئے ہیں"۔ [ذخیرۃ الجنان: ۱۹۷/۳......۲۹۵/۳]

جبکہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب مسجد اقصیٰ کو یہودیوں کا حق قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو، اشراق جولائی، اگست ۲۰۰۳ء اور اشراق مئی، جون ۲۰۰۴ء، ایضاً)

اور جناب عمار خان ناصر صاحب نے تو اس موضوع پر اپنی کتاب ''براہین'' کا ایک پورا باب اس موضوع کی نذر کیا ہے۔اور الشریعہ کی اشاعتِ خاص میں بھی اپنے اسی نقطۂ نظر کو دوہرایا ہے، لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کا وہ حصہ جسے حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کی عبادت کے لیے خاص کیا، اس پر تولیت وتصرف تاریخی وشرعی طور پر مسلمانوں کا حق ہے۔تاہم اس کے علاوہ عبادت گاہ کا وہ حصہ جہاں اصل ہیکل سلیمانی تعمیر کیا گیا تھا اور جو یہود کے قبلے کی حیثیت رکھتا ہے، اس پر بنی اسرائیل کا حق اصولی طور پر حسب سابق برقرار ہے۔'' [اشاعت خاص:۱۷۹]

رجم کی سزا:

غامدی حضرات چونکہ پورے دین ہی کی عمارت ڈھا کر اسے نئے سرے سے تعمیر کرنے کے درپے ہیں، اور اسی مقصد کے لیے احادیث کا انکار کر کے، قرآن کی آیات کو اپنی مرضی کے معانی ومفاہیم پہنا کر شریعتِ اسلامیہ اور دینِ محمدی کا ایک ایک ستون گرا رہے ہیں۔ان کا مقصد یہ ہے کہ بڑی حد تک تو دین کا حلیہ بگڑ جائے اور جو باقی بچے اس کے ڈھانے کے لئے ہر فتنہ گر کو ایسی بنیاد مل جائے جس کی بناء پر کوئی بھی شیطانی کارندہ کسی بھی وقت دین میں کوئی بھی تبدیلی وتغیر کر سکے اور ساتھ ساتھ اپنے من گھڑت مؤقف کو اسلام، اور چودہ سو سالہ اسلام کو ''فقہاء کی آراء'' قرار دے سکے۔اسلامی وشرعی قوانین کی بنیادوں اور درودیوار پر اپنے خودساختہ اجتہاد کا کلہاڑا چلاتے ہوئے جن قوانین کو انہوں نے شہید کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں ایک رجم کا قانون بھی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی بیسیوں احادیث اور پوری امت کے اجماع کی رُو سے شادی شدہ زانی کے لئے شریعت میں رجم کی سزا ہے، امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مسلمان اس امر پر تاہنوز متفق رہے ہیں کہ زانی محصن کی سزا جو صحیح احادیث سے ثابت ہے صرف رجم اور سنگساری ہے''۔[انکار حدیث کے نتائج:۱۶۷]

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو اس کو رجم کیا جائے، جس کو انگریزی تعلیم یافتہ ظالم حکمران وحشیانہ سزائیں کہتے ہیں، حالانکہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے وہ حق ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے غافل ہیں''۔[ذخیرۃ الجنان:۱/۱۹۱]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''شادی شدہ زانی کو رجم کرنا، ڈاکوؤں کو سولی پر لٹکانا اور ہاتھ پاؤں کاٹنا، چور کا ہاتھ کاٹنا اور غیر شادی شدہ کو کوڑے مارنا اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں''۔[ذخیرۃ الجنان:۳/۳۹]

جبکہ منکرین حدیث کا ٹولہ شروع ہی سے رجم کی شرعی سزا کا انکار کرتا آیا ہے، منکرین حدیث کے آرگن، طلوع اسلام کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

''باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری میں کیا حرج ہے، سو حرج یہ ہے کہ جب خدا نے حکم دے دیا کہ اس کی سزا سو کوڑے ہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم کو کسی دوسرے حکم سے بدل دے''۔

[طلوع اسلام ص ۵۶، نومبر ۱۹۴۹ء، بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۱۶۸]

جبکہ جناب جاوید احمد غامدی صاحب اس اجماعی و اتفاقی شرعی حکم پر تاویل کی تیز چھری چلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امام حمید الدین فراہی کی اس تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ زانی کنوارہ ہو یا شادی شدہ، اس کی اصل سزا تو سورۂ نور میں قرآن کے صریح حکم کی بناء پر سو کوڑے ہی ہے، لیکن مجرم اگر زنا بالجبر کا ارتکاب کرے، یا بدکاری کو پیشہ بنالے یا کھلم کھلا اوباشی پر اتر آئے، یا اپنی آوارہ منشی، بدمعاشی اور جنسی بے راہ روی کی بناء پر شریفوں کی عزت کے لئے خطرہ بن جائے، یا مردہ عورتوں کی نعشیں قبروں سے نکال کر اُن سے بدکاری کا مرتکب ہو، یا اپنی دولت واقتدار کے نشے میں غرباء کی بہو بیٹیوں کو سرِ بازار برہنہ کرے، یا کم سن بچیاں بھی اس کی درندگی سے محفوظ نہ رہیں تو مائدہ کی اس آیت محاربہ کی رُو سے اسے رجم کی سزا بھی دی جاسکتی ہے''۔[برہان: ۹۱]

یاد رہے کہ مشہور منکر حدیث جناب عبداللہ چکڑالوی بھی رجم کی سزا کا مأخذ فراہی و غامدی کی طرح آیت محاربہ کو قرار دیتے ہیں۔[رد النسخ، حصہ دوم: ۳۷......بحوالہ انکار حدیث کے نتائج: ۱۶۸]

غامدی صاحب آگے چل کر اپنے استاد اور امام جناب فراہی صاحب کی اس تحقیق کی تائید کرتے ہوئے موج میں آکر لکھتے ہیں:

''امام فراہی کی یہ تحقیق قرآن مجید کے نصوص پر مبنی ہے اور روایات میں بھی، جیسا کہ ہمارے تبصرے سے واضح ہے، اس کے شواہد موجود ہیں، اس سے کسی شخص کو اگر اختلاف ہے تو اسے دلائل کے ساتھ اس کا محاکمہ کرنا چاہئے، یہ وہ چیز نہیں ہے جسے جذباتی تحریروں اور بے معنی فتووں کے ذریعے سے رد کیا جاسکتا ہے، اس وقت لوگ جو جی چاہے کہیں، لیکن وہ وقت اب غالباً بہت زیادہ دور نہیں ہے جب علم و دانش کی مجالس میں اس تحقیق کے لئے داد و تحسین کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے گا، ان شاء اللہ العزیز''۔[برہان: ۹۱]

مزید لکھتے ہیں:

''زنا کی سزا کی بارے میں اپنا جو نقطۂ نظر ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس سے یہ حقیقت بالکل مبرہن ہو جاتی ہے کہ کنوارے زانیوں کی طرح شادی شدہ زانیوں کی سزا بھی قرآن مجید کی رُو سے ضرب تازیانہ ہی ہے''۔[ایضاً: ۹۲]

اہل السنۃ والجماعۃ تو اجماعی اور اتفاقی طور پر رجم کی سزا کو برحق مانتے ہیں اور اس کی علت ''احصان'' یعنی شادی شدہ ہونا قرار دیتے ہیں، یہی رسول اللہ ﷺ کا قطعی، برحق، اور دوٹوک فیصلہ ہے، یہی پوری امت کا موقف ہے۔ مگر جناب غامدی صاحب صحیح وصریح احادیث سے ثابت شدہ امت کے اس اجماعی موقف کو قرآن کے خلاف مانتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ رجم کی سزا ''شادی شدہ'' زانی کو نہیں بلکہ ''غنڈہ گرد'' زانی کو دی جائے گی، ان کے نزدیک رجم کی علت ''شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کرنا'' نہیں بلکہ ''غنڈہ گردی کے ساتھ زنا کرنا'' ہونا ہے اور اگر کوئی شادی شدہ شخص غنڈہ گردی نہ کرے بلکہ ''شرافت'' کے ساتھ زنا کرلے تو اسے رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ جناب عمار خان ناصر صاحب اس موضوع پر کلی طور پر اپنے استاد صاحب کی بات کو ثابت نہیں کر سکے، یا کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکے، تو بجائے اس کے، کہ وہ ساری امت کے اجماعی واتفاقی عقیدے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیتے اور جناب رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے آگے سر جھکا لیتے، انہوں نے اپنی قیل وقال اور کٹ حجتی کی شاندار روایت کو برقرار رکھا ہے، اور اپنی کتاب ''حدود وتعزیرات'' میں پہلے تو رجم کی تمام احادیث وروایات اور اس پر ائمہ کرام کے اقوال کو ذکر کر کے ان پر اپنی ٹیڑھی عقل کے شبہات وارد کر کے اُلجھاؤ پیدا کیا ہے، اور پھر ان صحیح ومتواتر احادیث اور امتِ مسلمہ کی اجماعی رائے کو قرآن کے ساتھ متصادم قرار دیا ہے، اور پھر آخر میں یہ شاہانہ فیصلہ صادر فرما دیا ہے کہ لوگو! یہ ہے قرآن، اور یہ ہے حدیث، اور ان دونوں میں تطبیق ممکن نہیں، لہٰذا دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے، اب تمہاری مرضی ہے کہ قرآن پر عمل کر کے حدیث کو چھوڑ دو! یا حدیث کو لے کر قرآن کو چھوڑ دو! مجھے تو اس بارے میں اب اور کچھ نہیں کہنا......!

اب ذرا مرحلہ وار جناب عمار خان ناصر صاحب کی یہ الٹ بازیاں اور فنکاریاں ملاحظہ کرتے جائیں، بیسیوں صحیح وصریح احادیث اور پوری امت کے فقہاء کی آراء درج کر کے ان میں کیڑے نکالنے کے بعد اپنے استاد جناب غامدی صاحب کا مؤقف اپنے دادا استاد جناب امین احسن اصلاحی صاحب کی زبان سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا کا کہنا ہے کہ شادی شدہ زانی کے لئے بھی اصل سزا سو کوڑے ہی ہے، جلاوطنی یا رجم دراصل اوباشی اور آوارہ منشی کی سزا ہے، جو فساد فی الارض کے تحت آتی ہے''۔[حدود وتعزیرات:۱۶۱]

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس رائے کو درست ماننے کے نتیجے میں ''رجم'' کی بنیاد زانی کا شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونا نہیں، بلکہ اس کے جرم کی نوعیت قرار پاتی ہے۔ اس طرح نہ ہر شادی شدہ کو رجم کرنا لازم رہتا ہے، اور نہ کوئی غیر شادی شدہ محض اپنے کنوارے ہونے کی بناء پر اس سزا سے محفوظ قرار پاتا ہے''۔[ایضاً:۱۶۳]

اس کے بعد اس رائے کی فی الجملہ تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''مذکورہ توجیہ کو قبول کرلیا جائے تو قرآن مجید اور روایات کا ظاہری تعارض باقی نہیں رہتا''۔[ایضا:۱۶۳]

خوب......! یعنی پہلے خود ہی اپنی من مانی سے قرآن پاک اور احادیث میں بلا وجہ تعارض پیدا کر دیا، اور پھر خود ہی لال بجھکو بنتے ہوئے ساری امت کے اجماعی موقف کو اٹھا کر ایک طرف رکھ کر اپنے دادا استاد صاحب کے حق میں سیٹی بجادی......! جناب جاوید احمد غامدی صاحب سے اتنا عرصہ فیضیاب ہونے کے بعد انسان کو اتنی کاریگری تو خیر آ ہی جانی چاہیے......!

ابھی ابھی تو یہ کہا تھا کہ دادا استاد صاحب کے موقف کو مان لیا جائے تو پھر قرآن اور روایات میں تعارض باقی نہیں رہتا۔ مگر تھوڑا ہی آگے چل کر پھر اپنی بات سے پھرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''مذکورہ بحث سے ظاہر ہے کہ اگر قرآن مجید کے ظاہر حکم کو مانا جائے تو زنا کے عام مجرموں کے حوالے سے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کرنا بے حد مشکل ہے۔ دوسری طرف اگر روایات کے ظاہر اور ان پر مبنی تعامل کو فیصلہ کن مأخذ مانا جائے تو تو شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کی نفی یا اس کی ایسی توجیہ و تاویل بظاہر ممکن نہیں دکھائی دیتی جس سے روایات کے متبادر مفہوم و مدعا کو برقرار رکھتے ہوئے قرآن مجید کے ساتھ ان کا ظاہری تعارض فی الواقع دور ہو جائے''۔[حدود و تعزیرات:۱۶۵]

لیجئے! ابھی تو استادِ گرامی سے حاصل کردہ جادو کی چھڑی گھمانے کی بدولت چودہ صدیوں سے لاینحل چلا آنے والا قرآن و حدیث میں تعارض دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو کر گم ہو گیا تھا، اور اب دو ہی صفحے آگے چل کر پھر وہی تعارض دوبارہ پیدا ہو گیا اور سینہ تان کر آن کھڑا ہوا، غامدی سرکس کے تماشے بھی کیا عجیب ہیں۔ یہ سب لکھ چکنے کے بعد اب آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یہ بحث ان چند مباحث میں سے ایک ہے جہاں توفیق و تطبیق کا اصول مؤثر طور پر کارگر نہیں، اور جہاں ترجیح ہی کے اصول پر کوئی متعین رائے قائم کی جاسکتی ہے''۔[ایضا:۱۶۵]

کوئی باور کر سکتا ہے کہ جناب عمار خان ناصر صاحب نے یہ سطور ہوش و حواس کی حالت میں لکھی ہیں؟ پہلے تو قرآن و حدیث میں فرضی تعارض قائم کیا، پھر یہ اعلان کیا کہ اس تعارض کو اگر دور کیا جاسکتا ہے تو صرف اور صرف اصلاحی و غامدی فارمولے کے ذریعے، اور پھر آگے جا کر دوبارہ اعلان کر دیا کہ نہیں جناب، ان دونوں میں کوئی تطبیق و توفیق ممکن ہی نہیں ہے، لہٰذا لازماً قرآن اور حدیث میں سے ایک کو ترجیح دے کر دوسرے کو رد کرنا پڑے گا، یہ ہے بے مثل و بے مثال محقق جناب عمار خان ناصر کی دماغی حالت، جس کے بل بوتے پر وہ چودہ صدیوں کے طے شدہ فیصلوں کو لات مار کر ایک نیا اور جدید اسلام

ایجاد کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔فاعتبروا یا اولی الابصار......!

آخری بات:

جناب عمار خان ناصر صاحب کی اپنے استاد جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی گمراہیوں میں ان کی ہمنوائیوں کی ایک لمبی اور طویل فہرست ہے، ہم نے اس میں سے محض چند مقامات کو ذکر کر کے ان دونوں حضرات کی یکسانیت، نیز ان کے طریقہ واردات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، دیگر مسائل و عقائد کو بھی انہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ وقت کا یہ عظیم فتنہ جو ماضی کے بیشتر فتنوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ''آزاد فورم'' اور ''صلح کلیت'' کی آڑ میں اپنا زہر تیزی سے اہل حق میں پھیلا رہا ہے۔ علمائے حق جو دین کے چوکیدار اور حضرت محمد عربی ﷺ کے وارث ہیں، ان کا فرض ہے کہ ہر قسم کی مصلحت، ذاتی تعلقات اور دنیاوی تشویشات و مفادات سے بالاتر ہو کر بلا خوف لومۃ لائم اسی طرح اس فتنہ کا مقابلہ کریں جیسے ہمارے اکابر رحمہم اللہ نے مودودیت، انکار حدیث اور اعتزال جدید کے فتنوں کا مقابلہ کیا۔ حق کو کبھی مٹایا نہیں جا سکتا، یہ ہمارا ایمان ہے، لیکن جب حق و باطل کا نظریاتی معرکہ گرم ہو جائے چنگاریاں اڑنے لگیں، صفیں جدا جدا ہو جائیں تو ایک مرتبہ یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ ہم کس کی صف میں کھڑے ہیں۔ اللہ جل شانہ اہل السنۃ والجماعت کو محض اپنی رضا کی خاطر اس فتنے کا مقابلہ کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں اور اس فتنے کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے نابود فرما دیں، و ما ذلک علی اللہ بعزیز......!

☆......☆......☆......☆

مولانا محمد صدیق قریشی [معاون مدیر: مجلہ المصطفیٰ بہاول پور]

غامدی صاحب کا نظریۂ سیاست

جاوید غامدی صاحب کے افکار ونظریات حق وباطل کی تلبیس کا شاہکار ہیں۔ان کا کوئی بھی نظریہ دیکھ لیں نہ تو وہ پورا مسلمان ہوگا نہ ہی کافر۔ ہر وہ مسئلہ جو سیکولر اور مادی طرز فکر سے ٹکراتا ہوا گرچہ مسلمانوں میں تواتر کے ساتھ متفقہ چلا آ رہا ہو، غامدی صاحب بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اس کے تواتر کو مشکوک بنا کر اسے ''مشرف بہ سیکولرازم'' کر دیں۔ غامدی صاحب کا متاع حیات ہی یہ ہے کہ کسی طرح اسلام اور سیکولرازم کا ملا جلا ایڈیشن ترتیب دیکر مسلمانوں میں مقبول اور نافذ کر دیا جائے۔ افکار غامدی کا کوئی باب کھول لیں، ہر جگہ ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' ہی ملے گا۔ پچھلے دو تین ہفتوں سے غامدی صاحب سوشل میڈیا پر اسلامی فلسفۂ سیاست کے حوالے سے کچھ جدید نظریات اور جوابی بیانیوں کی باتیں کر رہے تھے۔ آخر مؤرخہ ۲۲ رجنوری ۲۰۱۵ء کو روزنامہ جنگ میں ''اسلام اور ریاست۔ ایک جوابی بیانیہ'' کے نام سے غامدی صاحب کے مضطرب سیاسی نظریات کا نیا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کالم کے لیے ''جوابی بیانیہ'' کی بجائے ''تضاد بیانیہ'' کا عنوان زیادہ موزوں تھا۔ کیونکہ اس میں اتنی تضاد بیانیاں ہیں کہ مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ جیسی بردبار شخصیت کو بھی لکھنا پڑا کہ:

> ''ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سی تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا''

[اسلام اور ریاست۔ روزنامہ جنگ: ۲۷ رجنوری ۲۰۱۵ء]

یہ بیانیہ دس نکات پر مشتمل ہے۔ جن میں غامدی صاحب نے مسلمانوں کی ریاست کے قیام اور بقا کے حوالے سے کچھ بنیادی نظریات کا تعین اور مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی قیادت کے دائرۂ اختیارات کی تحدید کی ہے۔ غامدی صاحب سمجھتے ہیں کہ پوری دنیا میں جاری دہشت گردی ''اس فکر کا نتیجہ ہے جو ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔'' اس کے مقابل اسلام کا صحیح فکر کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ ''اس کو ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں دلائل کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ (یہ جملہ مطبوعہ مضمون میں نہیں ہے۔ لیکن غامدی صاحب کے فیس بک پیج پر موجود ویڈیو میں درج ہے۔)'' دلچسپ بات یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جس میں مضمون اور کتاب میں بھی تضاد ہے۔ اب غامدی صاحب کے تازہ سیاسی نظریات پر نظر ڈالتے ہیں۔

ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا:

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔ اور اُس کو بھی کسی قرار داد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اِس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔''

اس عجیب وغریب منطق کی دلیل یہ ہے کہ اسلام کی دعوت اصلافرد کے لیے ہے اور ریاست کیونکہ فرد نہیں ہوتی لہٰذا کسی فرد کا تو مذہب ہوسکتا ہے مگر ریاست کا مذہب نہیں ہوسکتا۔ اور آئین میں قرآن وسنت کی پابندی لگانے سے غیر مسلموں کی حق تلفی ہوتی ہے اور وہ خود کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ریاست کو مذہب سے آزاد قرار دینا چاہیے۔ جناب کا پورا اقتباس پڑھیے:

''اسلام کی دعوت اصلاً فرد کے لیے ہے۔ وہ اُسی کے دل ودماغ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے جو احکام معاشرے کو دیے ہیں، اُس کے مخاطب بھی درحقیقت وہ افراد ہیں جو مسلمانوں کے معاشرے میں ارباب حل وعقد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری کر رہے ہوں۔ لہٰذا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے اور اُس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اِس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُس میں کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا۔ یہ خیال جن لوگوں نے پیش کیا اور اِسے منوانے میں کامیابی حاصل کی ہے، اُنھوں نے اِس زمانے کی قومی ریاستوں میں مستقل تفرقے کی بنیاد رکھ دی اور اُن میں بسنے والے غیر مسلموں کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ درحقیقت دوسرے درجے کے شہری ہیں جن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک محفوظ اقلیت (protected minority) کی ہے اور ریاست کے اصل مالکوں سے وہ اگر کسی حق کا مطالبہ کر سکتے ہیں تو اِسی حیثیت سے کر سکتے ہیں۔''

نکتہ نمبر۹ میں غیر مسلموں کے جذبات پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

۹۔ ''مسلمانوں کی حکومت اگر کسی جگہ قائم ہوتو اس سے بالعموم نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تعبیر مغالطہ انگیز ہے، اس لئے کہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکام ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کردے، حالانکہ قرآن وحدیث میں یہ حق کسی حکومت کے لئے بھی ثابت نہیں ہے۔''

ظاہر ہے یہ مغالطہ کسی غیر مسلم ہی کو ہوسکتا ہے کہ شریعت کے تمام احکامات ریاست کی طاقت سے لوگوں پر نافذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس غلط فہمی کا ازالہ غامدی صاحب کی صحیح اسلامی فکر اس طرح کرتی ہے کہ

اپنے دین کے مسلمات میں تحریف کر دینی چاہیے تاکہ اسلام کا امیج کفار کی نظر میں بہتر ہو جائے۔ معمولی سی دینی فہم رکھنے والا شخص بھی با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ غامدی صاحب کا یہ فلسفہ کتنا صحیح اور کتنا اسلامی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ارباب حل وعقد کے لیے قرآن وسنت کی پابندی لازم نہیں اور حکمرانوں کو قرآن وسنت کا پابند بنانا یا بنانے کی کوشش کرنا سب لغو اور فضول کام ہیں۔ غامدی صاحب کا یہ جدید موقف قرآن کریم کی صریح آیات اور احادیث کی واضح ہدایات سے متصادم ہے۔ سورۂ نور میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر اقتدار عطا کرنے اور اپنے دین کو نافذ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر مذہب ریاست کے لیے نقصان دہ ہوتا تو خدا تعالیٰ اہل ایمان سے یہ وعدہ ہرگز نہ فرماتے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ [النور:۵۵]

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح کہ ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو ضرور اقتدار بخشے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا۔ اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتے۔ اور جس شخص نے اس کے بعد کفر کیا پس وہی لوگ فاسق ہیں۔

اسی طرح سورۂ حج میں اسلامی حکومت کے فرائض میں سب سے پہلے نماز قائم کرنے کو ذکر کیا ہے، جو کہ خالصۃً مذہبی فریضہ ہے۔ جبکہ غامدی صاحب بھی اس قرآنی حکم کو تسلیم کرتے ہیں:

اَلَّذِينَ اِن مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ [الحج:۴۱]

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ لوگ نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''سورہ حج کی یہ آیت وہ دینی فرائض بیان کرتی ہے جو کسی خطۂ ارض میں اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد مسلمانوں کے نظم اجتماعی پر عائد ہوتے ہیں۔'' [میزان: ۴۸۷]

غامدی صاحب ایک طرف تو ریاست کے لیے مذہب کو غیر ضروری اور لغو قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اپنی سیکولر فکر سے تیار شدہ حکومتی ڈھانچے کو سہارا دینے کے لیے اسلام کے ریاستی احکامات کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ اپنے اسی کالم میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

ے''۔اسلام جس جہاد کا حکم دیتا ہے، وہ خدا کی راہ میں جنگ ہے،اس لئے اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا..... اسلام کا قانون یہی ہے کہ اگر کوئی زبان سے حملہ کرے گا تو اس کا جواب زبان سے دیا جائے گا،... قرآن میں جہاد کا حکم جس آیت میں دیا گیا ہے،اس کے الفاظ ہی یہ ہیں کہ ''اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑیں اور اس میں کوئی زیادتی نہ کرو، اس لئے کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔''

''۸۔دور حاضر کے مغربی مفکرین سے صدیوں پہلے قرآن نے اعلان کیا تھا کہ امرهم شوری بينهم (مسلمانوں کا نظم اجتماعی ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوگا) اس کے صاف معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت ان کے مشورے سے قائم ہوگی۔ نظام مشورے ہی سے وجود میں آئے گا..... علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ، پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔' امرهم شوری بينهم' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی، وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی،خواہ اس کے سربراہ کی پیشانی پر سجدوں کے نشان ہوں یا اسے امیر المومنین کے لقب سے نواز دیا جائے۔''

''۹:...اسلامی شریعت میں دو طرح کے احکام ہیں، ایک جو فرد کو بحیثیت فرد دیئے گئے ہیں، اور دوسرے جو مسلمانوں کے معاشرے کو دیئے گئے ہیں......رہے دوسری قسم کے احکام تو وہ درحقیقت دیئے ہی حکومت کو گئے ہیں۔ اس لئے کہ اجتماعی معاملات میں وہی معاشرے کی نمائندگی کرتی ہے۔.....علماء ارباب حل وعقد سے ان پر عمل کا مطالبہ کریں تو یقیناً حق بجانب ہوں گے اور اپنے منصب کے لحاظ سے ان کو کرنا بھی چاہئے۔مگر یہ شریعت پر عمل کی دعوت ہے،نفاذ شریعت کی تعبیر اس کے لئے بھی موزوں قرار نہیں دی جا سکتی۔''

نیز''میزان'' میں اسلامی سیاست کے بنیادی اصول کے زیر عنوان آیت "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا [نساء:۵۹]'' کے تحت لکھتے ہیں:

''چنانچہ مسلمان اپنی ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتے جو اللہ ورسول کے احکام کے خلاف ہو یا جس میں ان کی ہدایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہو۔اہلِ ایمان اپنے اولی الامر سے اختلاف کا حق بیشک رکھتے ہیں لیکن اللہ اور رسول سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔بلکہ اس طرح کا کوئی معاملہ اگر اولی الامر سے بھی پیش آ جائے اور اس میں قرآن وسنت کی کوئی ہدایت موجود ہو تو اس کا فیصلہ لازماً اس ہدایت کی روشنی ہی میں کیا جائے گا۔'' [میزان:۴۸۲ طبع نہم مئی ۲۰۱۴ء]

''اولی الامر کی اطاعت کا حکم ظاہر ہے کہ صرف مسلمان حکمرانوں کے لیے ہے۔ سورۂ نساء کی آیہ زیر بحث میں اولی الامر کے ساتھ منکم کے الفاظ سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی نے وضاحت فرمائی ہے کہ کسی شخص کے مسلمان قرار پانے کے جو شرائط قرآن میں بیان ہوئے ہیں، ان سے انحراف کے بعد اطاعت کا یہ حکم اس سے متعلق نہیں رہتا''۔ [میزان: ۴۸۴ طبع نہم مئی ۲۰۱۴ء]

ان سب باتوں میں کتنا تضاد ہے۔

(۱)......: غامدی صاحب اپنی کتاب میزان کو اپنے نظریات کا ترجمان قرار دیتے ہیں۔ کتاب میں ارباب ریاست کے لیے قرآن وسنت کی پابندی لازم قرار دیتے ہیں جبکہ کالم میں اسے لغو اور اقلیتوں کے حقوق کی خلاف ورزی بتاتے ہیں۔

(۲)......: ریاست کے وجود کے لیے قرآن وسنت کی پاسداری لازم نہیں ہے مگر ریاست کے دفاعی نظام یعنی جہاد کے لیے قرآن وسنت کی پابندی ازحد ضروری ہے۔

(۳)......: ریاست تو مسلمان ہو ہی نہیں سکتی مگر ''امرھم شوریٰ بینھم'' کے قرآنی حکم کی روشنی میں پارلیمنٹ کو مکمل خود مختاری اور ایسی خود مختاری کہ جسے قرآن وسنت کے ذریعہ بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا حاصل ہے۔

(۴)......: ریاست کے لیے مذہب کا تعین کرنے سے غیر مسلم اقلیت کی حق تلفی ہوتی ہے۔ مگر جن معاشرتی احکامات کو موصوف تسلیم کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان پر عملدرآمد کو حکومت کے فرائض میں سے بتاتے ہیں، کیا ان پر عملدرآمد کرنے سے اقلیتوں کی حق تلفی نہیں ہوتی؟ ظاہر ہے کہ اقلیتوں کو حق تلفی کا خوف معاشرتی احکامات سے ہی ہوگا نہ کہ انفرادی نوعیت کے احکامات سے۔

(۵)......: غامدی صاحب علماء کے حکومت سے شریعت پر عملدرآمد کے مطالبے کو ان کے منصب کے مطابق قرار دیتے ہیں۔ ریاست کا مذہب نہ ہونے کے بعد علماء حکومت سے یہ مطالبہ کس بنیاد پر کرسکتے ہیں؟ نیز غامدی صاحب کو یہ بھی واضح کرنا چاہیے کہ شریعت پر عمل کی دعوت کے لیے نفاذِ شریعت کا عنوان کیوں موزوں نہیں؟ دونوں باتوں میں فرق ہی کیا ہے؟

اس کے بعد غامدی صاحب نے یہ تاثر دیا ہے کہ پاکستان میں قراردادِ مقاصد مذہبی طبقے کے دھونس اور جبر سے منوائی ہے۔ یہ بات پاکستان کی تاریخ اور زمینی حقائق سے سو فیصد متصادم ہے۔ یہ ایسی ہی بے بنیاد بات ہے جیسے کوئی شخص کھڑا ہو کر دعویٰ کردے کہ پاکستان کو گاندھی جی نے بنایا تھا اور پاکستان دو قومی نظریہ پر نہیں بلکہ ہندوستانی قومیت یا اکھنڈ بھارت کے نظریے پر بنا ہے۔ مفکر اسلام مولانا مفتی محمد

تقی عثمانی دامت برکاتہم کے الفاظ میں قراردادِ مقاصد کی اجمالی تاریخ ملاحظہ فرمائیے:

''یہ قرارداد ۱۹۵۴ء ۱۹۵۶ء ۱۹۶۲ء اور ۱۹۷۳ء کے تمام دستوری مسودوں کا الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جزبنی رہی اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں، چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہوگیا۔ پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسودات دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کیخلاف نہیں بنایا جاسکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا سن ۱۹۷۳ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے اس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا اور اس پر بفضلہ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں جس کا مظاہرہ اور اس کی مزید تاکید حال ہی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہوگئی ہے اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس دستور کی بنیادی روح کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔'' [جنگ: ۲۷ر جنوری 2015]

خلافت نہ کوئی دینی اصطلاح ہے نہ ہی اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے:

غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''جن ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہ اپنی ایک ریاست ہائے متحدہ قائم کرلیں۔ یہ ہم میں سے ہر شخص کا خواب ہوسکتا ہے اور ہم اس کو شرمندہ تعبیر کرنے کی جدوجہد بھی کرسکتے ہیں، لیکن اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم ہے جس کی خلاف ورزی سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہورہے ہیں۔ ہرگز نہیں، نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہا ان کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہوچکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا، اس لئے کہ اس معاملے میں سرے سے کوئی حکم قرآن وحدیث میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف یہ بات سب نے کہی اور ہم بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا نظم اجتماعی اگر کسی جگہ قائم ہوجائے تو اس سے خروج ایک بدترین جرم ہے جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے مرتکبین جاہلیت کی موت مریں گے۔''

اس عبارت میں غامدی صاحب نے دو دعوے کیے ہیں:

(۱)......: خلافت دینی اصطلاح نہیں ہے۔

(۲)......: خلافت کا قیام اسلام کا حکم نہیں ہے اور نہ ہی قرآن وحدیث میں اس حوالے سے

کوئی حکم سرے سے موجود ہے۔

ان دونوں دعووں پر غامدی صاحب کے پاس قرآن وسنت سے یا دیگر اسلامی ماخذ سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ جبکہ یہ دونوں دعوے اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ اور قرآن وسنت کے صریح احکامات سے انکار کے مترادف ہیں۔

خلافت اسلام کی متواتر اصطلاح ہے:

غامدی صاحب کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اسلام کی متواتر اور معروف اصطلاح ہے، جسے اپنے اور پرائے سب تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث اور اسلامی تاریخ میں اسلامی اقتدار کے لیے 'خلافت' کی اصطلاح استعمال کی گئی اور خلافت کے نظریہ کی بنیاد پر امتِ مسلمہ کے متفقہ حکمران کو 'خلیفہ' کہا جاتا رہا ہے۔ اور امت کے ہر طبقے کے اہل علم ان کو خلیفہ کہتے اور لکھتے چلے آئے ہیں۔

خلافت کا ذکر قرآنِ مجید میں:

سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اقتدار عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اقتدار کے لیے خلافت کا صیغہ استعمال فرمایا ہے۔ ملاحظہ کیجیے غامدی صاحب کے استاد امین احسن اصلاحی صاحب کا ترجمہ اور تشریح:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنكُم وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَستَخلِفَنَّهُم فِى الاَرضِ كَمَا استَخلَفَ الَّذِينَ مِن قَبلِهِم. (النور:۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے۔" [تدبرِ قرآن:۵/۴۱۸]

آگے اصلاحی صاحب اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ پوری راست بازی کے ساتھ ایمان وعملِ صالح کی راہ اختیار کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہو چکا ہے کہ اللہ ان کو اس سرزمین میں اسی طرح اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلے رسولوں کی امتوں کو اس نے اقتدار بخشا۔" [تدبرِ قرآن:۵/۴۲۶]

سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ میں اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان کیا ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

"وَاِذ قَالَ رَبُّكَ لِلمَلٰئِكَةِ اِنِّى جَاعِلٌ فِى الاَرضِ خَلِيفَةً" [البقرہ:۳۰]

اور یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

[تدبر قرآن:۱/۱۵۵]

”خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ اپنا یا زمین میں بسنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ...... خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام و انصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پاکر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے؟“ [تدبرِ قرآن:۱/۱۵۸]

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الارضِ فَاحکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. [ص:۲۶]

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹادے۔ [تدبرِ قرآن:۶/۵۲۰]

اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت واضح الفاظ میں یہ ہدایت فرمائی کہ اے داؤد میں نے اپنی طرف سے کچھ اختیار و اقتدار دیکر تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔ تو اس خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس اختیار و اقتدار کو اپنے مستخلف کی مرضی کے مطابق استعمال کرو۔ [تدبرِ قرآن:۶/۵۲۷]

لیجیے! غامدی صاحب کے استاد اصلاحی صاحب نے خلافت اور خلیفہ کا معنی اقتدار اور صاحب اقتدار سے کیا ہے۔

خلافت کا ذکر حدیث میں:

”أول هذه الأمة نبوة ورحمة ثم خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا. [الفتن لنعیم:۹۸]

اس امت کے اول ایام میں نبوت اور رحمت ہوگی۔ پھر خلافت اور رحمت ہوگی۔ پھر ظلم وستم والی بادشاہت ہوگی۔“

”فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين. [مشکاۃ:۱/۲۶۳ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ]

تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔“

”یکُونُ بَعدِی مِنَ الخُلَفَاءِ عِدَّةُ نُقَبَاء مُوسَی. [الفتن لنعیم:۹۵]

میرے بعد اتنے خلفاء ہونگے جتنے (قومِ) موسیٰ کے سردار تھے۔“

بے شمار احادیث، فقہ کے لاتعداد مسائل اور پوری اسلامی تاریخ خلافت اور خلیفہ کی اصطلاح سے بھری ہوئی ہیں۔ خلافتِ راشدہ سے خلافتِ عثمانیہ تک دنیا کے جس خطے میں بھی مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں وہ خلافت کے تصور پر ہی قائم ہوئیں اور ان حکومتوں کے سربراہ کو خلیفہ ہی کہا جاتا رہا ہے۔ دوست دشمن سب مسلمانوں کے نظامِ حکومت کو خلافت کے عنوان سے جانتے تھے اور اب بھی جانتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء

کے مشہور معاہدۂ لوزان میں سابق وائسرائے ہند لارڈ کرزن [1] کی طرف سے سیکولر ترکی کی بنیاد رکھنے کے لیے جو شرائط رکھی گئی اس میں صراحتاً مطالبہ کیا گیا تھا کہ ترکی اسلام سے اپنے تعلقات ختم کردے اور خلافتِ اسلامیہ کا کلی خاتمہ کیا جائے، خلیفہ اور اس کے معاونین کو ترکی کی حدود سے جلاوطن کیا جائے۔ [الدولة العثمانیہ لعلی محمد الصلابی: ۴۷۲/۲۔ سلطنتِ عثمانیہ (اردو ترجمہ الدولۃ العثمانیۃ): ۵۱۷] افغانستان پر حملے کے بعد جارج بش اور ٹونی بلیئر بارہا کہہ چکے ہیں کہ طالبان خلافت کو واپس لانا چاہتے ہیں۔ ان تمام حقائق کے باوجود خلافت کو اسلامی اصطلاح نہ ماننا غامدی صاحب جیسی شخصیت کا ہی حوصلہ ہوسکتا ہے۔

دوسرے دعویٰ کی تردید:

> ''اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔ پہلی صدی ہجری کے بعد ہی، جب مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء ان کے درمیان موجود تھے، ان کی دو سلطنتیں، دولت عباسیہ بغداد اور دولت امویہ اندلس کے نام پر قائم ہوچکی تھیں اور کئی صدیوں تک قائم رہیں، مگر ان میں سے کسی نے اسے اسلامی شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی قرار نہیں دیا، اس لئے کہ اس معاملے میں سرے سے کوئی حکم قرآن و حدیث میں موجود ہی نہیں ہے۔''

غامدی صاحب جب خلافت کو اسلامی اصطلاح ہی نہیں مانتے تو آگے خلافت کا علم بیان کرتے ہوئے ''عالمی'' کا سابقہ معلوم نہیں کس مصلحت سے لگا دیا ہے۔ حالانکہ اسلام میں علاقائی اور ملکی خلافت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ عالمی اور علاقائی نظمِ اجتماعی کا الگ الگ مفروضہ غامدی صاحب کا اپنا تراشیدہ ہے۔ جبکہ قرآن وسنت کی رو سے اسلامی خلافت کا مطلب ہی امتِ مسلمہ کا عالمگیر سیاسی اتحاد ہے۔ متعدد

---

[1] خلافت کے سقوط اور مسلمانوں کے سیاسی زوال میں لارڈ کرزن نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ قدرتی طور پر بہت ذہین اور چالاک شخص تھا۔ دو بار انڈیا کا وائسرائے بنا۔ پہلی بار ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک گیارہویں وائسرائے ہند کی حیثیت سے ہندوستان میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے دو نمایاں کام کیے۔ ایک، پنجاب اور بنگال کو تقسیم کیا اور دوسرا، عثمانی خلافت کے سقوط کی راہ ہموار کرنے کے لیے ۱۹۰۳ء میں خلیجی ممالک کا دورہ کیا۔ کرزن کے اس دورے میں جس چیز نے شہرت حاصل کی وہ اس کی تقاریر تھیں جو بوشہر اور شیرگاہ کے سواحل پر مقامی عمائدین اور رؤسا کے روبرو عربی میں پڑھی گئیں۔ جس میں عربوں کی تاج برطانیہ سے وفاداری برقرار رکھنے کے لیے برطانیہ کی عظمت و ہیبت اور احسانات کا ذکر بڑے تزک واحتشام کے ساتھ کیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تقاریر غامدی صاحب کے دادا استاد جناب حمید الدین فراہی مرحوم نے لکھیں۔ خدا تعالیٰ نے سقوطِ خلافت کی راہ میں جس شخصیت کی خدمات کو قبول کیا، آج ان کے تربیت یافتہ خلافت کے دینی اصطلاح ہونے کا ہی سرے سے انکار کرتے ہیں تو یہ اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

احادیث میں مسلمانوں کو متحدہ ریاست قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں کو بیک وقت دو دو خلفاء کی بیعت کرنے سے منع فرمایا ہے جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام میں اسلام کی بنیاد پر مسلمانوں کا نظم اجتماعی صرف عالمی ہو سکتا ہے، ملکی یا علاقائی نہیں:

"عن النبي صلى الله عليه و سلم قال: "كانت بنو إسرائل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي، وإنه لا نبي بعدي، وستكون خلفاء فتكثر." قالوا فما تأمرنا؟ قال "فوا ببيعة الأول فالأول."[مسلم: كتاب الأمارة،باب الوجوب الوفاء ببيعة الخلفاء.]

نبی ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے سیاسی امور انبیاء چلاتے تھے۔ جب بھی کوئی نبی فوت ہو جاتا تو اور نبی اس کا خلیفہ بن جاتا اور واقعہ یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور عنقریب بہت سے خلفاء ہونگے اور بڑھتے چلے جائیں گے"۔ صحابہ نے عرض کیا، پس آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا جو پہلا ہے اس کی بیعت پوری کرو! پھر اس کے بعد جس نے پہلے بیعت لی اس کی۔"

"من بايع إمامًا فأعطا صفقة يده وثمرة قلبه فليطعه إن استطاع، فإن جاء آخرينازعه فاضربوا عنق الآخر.[مسلم: كتاب الأمارة،باب الوجوب الوفاء ببيعة الخلفاء]

جس شخص نے ایک امام کی بیعت کی پس اس کو اپنے ہاتھ کی ضرب (بیعت) دی اور اپنے دل کا پھل دیا (یعنی اس پر اعتماد کیا)، پس اسے چاہیے کہ حتی الوسع اس کی اطاعت کرے۔ پھر اگر کوئی دوسرا شخص آکر اس (امام) سے جھگڑے تو تم دوسرے کی گردن اڑا دو۔"

اسی طرح فقہاء اور مؤرخین نے بھی خلافت کی تعریف میں عالمگیریت کو ملحوظ رکھا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن عابدین شامی نے امامت کبریٰ جو کہ خلافت کا مترادف ہے کی تعریف کی ہے:

"رِيَاسَة عَامَّة فِي الدِّينِ وَالدّنيا خِلَافَةً عَن النَّبِيّ صَلَّى اللّهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ [رد المحتار:۲/۲۷۶]

"نبی ﷺ کی نیابت میں دین اور دنیا کی عام سربراہی کا نام امامت کبریٰ ہے۔"

"والخلافة هي حمل الكافّة على مقتضى النّظر الشّرعي في مصالحهم الأخرويّة والدّنيويّة ...... في الحقيقة خلافة عن صاحب الشّرع في حراسة الدّين وسياسة الدّنيا به. [ابن خلدون ۱/۲۳۶]

لوگوں کو اخروی اور دنیاوی معاملات میں شرعی احکامات کے تقاضے پر عملدرآمد کرنے کے لیے آمادہ کرنا......پس یہ حقیقت میں صاحب شریعت کی نیابت ہے دین کے تحفظ اور دنیا کی سیاست کے لیے۔"

دوسری بات غامدی صاحب نے فرمائی کہ قیام خلافت کے حوالے سے قرآن وحدیث میں کوئی حکم سرے سے موجود ہی نہیں۔ قرآن وحدیث میں اہل ایمان کو ایمان کی بنیاد پر حکومت عطاء کرنے کا وعدہ موجود ہے، حکمرانوں کی ذمہ داریاں تفصیل سے بیان کر دی گئی ہیں، جنہیں ایک حد تک غامدی صاحب تسلیم بھی

کرتے ہیں۔مگر اس کے باوجود بھی خلافت کے بارے میں قرآن وحدیث کے احکامات سے لاعلمی ظاہر کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔مثلاً قرآن پاک میں چور کا ہاتھ کاٹنے اور قاذف وزانی کو کوڑے لگانے کا جو حکم ہے، یہ حکم غامدی صاحب کے نزدیک اُفراد کو ہے یا ریاست کو؟ اگر اُفراد کو ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی فرد اُٹھ کر از خود اِن سزاؤں کو نافذ کر سکتا ہے،اور اگر ریاست کو ہے تو پھر غامدی صاحب کی وہ بات کہاں گئی کہ اسلام ریاست کو نہیں صرف افراد کو مخاطب کرتا ہے؟

اسی طرح فقہاء کرام نے خلافت کا قیام واجب قرار دیا ہے اور بعض نے تو جہاد اور علم کی طرح فرضِ کفایہ بھی کہا ہے۔اور ایسے حالات میں کہ جب خلیفہ کا تعین یا تقرر نہ ہو سکے، امت کے اربابِ حل وعقد اور علماء کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر انہیں گناہ گار بھی قرار دیا ہے۔کیونکہ خلیفہ کا تعین انہی دو اتھارٹیز (authorities) کا کام ہے[الأحکام السلطانية لماوردی:۴]۔اس بارے میں فقہاء کرام کی چند تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

(وَنَصبُهُ أَهَمّ الوَاجِبَاتِ) أي مِن أهَمِّهَا لِتَوَقُّفِ كَثِيرٍ مِنَ الوَاجِبَاتِ الشَّرعِيَّةِ عَلَيهِ. [رد المحتار:۲/۲۷۸]

اور امام کا تقرر اہم واجبات میں سے ہے۔اس لیے کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں۔"

"الإمامة موضوعة لخلافة النبوة في حراسة الدين وسياسة الدنيا وعقدها لمن يقوم بها في الأمة واجب بالإجماع." [الأحكام السلطانية لماوردی:۳]

"امامت، دین کی حفاظت اور دنیا کی سیاست میں نبوت کی خلافت کے طور پر واجب کی گئی ہے۔اور امامت کو ایسے شخص کے سپرد کرنا جو اسے امت میں قائم کرے بالا جماع واجب ہے۔"

"فإذا ثبت وجوب الإمامة ففرضها على الكفاية كالجهاد وطلب العلم. [الأحكام السلطانية لماوردی:۴]

پس جب امامت کا وجوب ثابت ہو گیا تو اس کا فرض، فرضِ کفایہ ہے مثل جہاد اور حصولِ علم کے۔"

"نصب الإمام عند الإمكان واجب [غياث الأمم لإمام الحرمين أبي المعالي الجويني:۱۵]

"امام کا تقرر حتی الامکان واجب ہے۔"

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کی تدفین سے قبل بالاجماع خلیفہ کا تقرر کیا، بعد میں رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین عمل میں آئی۔

(فلذا قدموه على دفن صاحب المعجزات) حيث توفى ﷺ يوم الاثنين ودفن يوم الثلاثاء أوليلة الأربعاء أو يوم الأربعاء حلبي عن المواهب وهذه السنة باقية إلى الآن لم يدفن خليفة حتى يولى غيره [حاشية الطحطاوی على در مختار:۱ / ۲۳۸]۔غياث

الأمم:١٦۔رد المحتار:٢/٢٨٠]

(اسی وجہ سے انہوں نے اس امر کو صاحب معجزات ﷺ کی تدفین پر مقدم کیا) جبکہ آپ ﷺ کا انتقال پیر کے روز ہوا اور منگل یا بدھ یا بدھ کی رات کو دفن کیے گئے، حلبی نے مواہب سے یہی نقل کیا ہے۔ اور یہی سنت تا حال باقی ہے کہ خلیفہ کی تدفین سے قبل ہی خلافت کی ذمہ داری دوسرے خلیفہ کو سونپ دی جاتی ہے۔

اس کے بعد غامدی صاحب نے عالمی خلافت کی تردید کرتے ہوئے اندلس اور بغداد کی مثال دی کہ پہلی صدی کے بعد یعنی دوسری صدی میں ہی مسلمانوں کے جلیل القدر فقہاء کی موجودگی میں ہی یہ دو ریاستیں قائم ہوئیں اور فقہاء نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی، لہٰذا یہ دلیل ہے مسلمانوں میں قومی ریاستوں کے وجود کی۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یہ ہم ثابت کر چکے کہ اسلام میں قومی یا علاقائی ریاست کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں۔ جہاں تک بات ہے اندلس کی تو بیشک دوسری صدی ہجری میں اندلس پر بنی امیہ کا خودمختار اقتدار قائم ہوا مگر اموی حکمران تمام تر دشمنی اور خونریزی کے باوجود خود کو مرکزی خلافت کے تابع سمجھتے تھے۔ خلافت کے احترام میں اموی حکمران اپنے لیے امیر المومنین (یہ خلیفۃ المسلمین کا لقب ہے جو سب سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا۔) کا لقب استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ صرف امیر کے لقب پر اکتفا کرتے تھے۔ چنانچہ بنوامیہ کے پہلے تاجدار عبدالرحمٰن الداخل جب نئے نئے اندلس میں وارد ہوئے تو وہ لوگوں سے امیر المؤمنین ابوجعفر منصور کے لیے بیعت لیتے تھے اور اقتدار قائم ہو جانے بعد ایک عرصہ تک جمعہ کے خطبہ میں امیر المومنین ابوجعفر منصور کا نام پکارتے رہے۔ بعد میں خطبہ سے ابوجعفر کا نام تو ختم کر دیا مگر ساری عمر اپنے لیے امیر المومنین کا لقب استعمال نہیں کیا۔ عبدالرحمٰن کی اولاد میں سات نسلوں تک یہی روایت جاری رہی، حتیٰ کہ بنوامیہ کے آٹھویں تاجدار عبدالرحمٰن الناصر پہلے حکمران تھے جس نے امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔ عبدالرحمٰن الناصر کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ مرکزِ خلافت پر عجمیوں کا تسلط بڑھتا جا رہا ہے اور خلیفہ عباسی برائے نام ہی خلیفہ رہ گیا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خلیفہ ناصر خلافت کی وحدت اور مرکزیت کا تو قائل تھا لیکن اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر وہ اپنے آپ کو زیادہ اہل اور مستحق سمجھتا تھا۔ اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ وحدت اور مرکزیت اب میری طرف منتقل ہونی چاہیے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ عبدالرحمٰن الداخل کے خود کو امیر المؤمنین نہ کہلوانے پر مستشرقین بہت پروپگنڈا کرتے ہیں اور اسلام میں قومی ریاستوں کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ عبدالرحمٰن کے اس فعل سے مسلمانوں کے خلافت اور مرکزیت پر پختہ یقین کا قوی ثبوت ملتا ہے۔ اس بارے میں علامہ مقریؒ کی شہادت ملاحظہ کیجیے۔ مقریؒ کے حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہے کہ

اندلس کے سیاسی حالات پر مقریؒ کی اتنی گہری نظر تھی اور اہلِ اندلس کی تہذیب وتمدن پر اتنا وسیع مطالعہ تھا کہ مغربی مؤرخین اندلس کے بارے میں مقریؒ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مقریؒ کے بعد اندلس کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اور جس کسی نے بھی لکھا، مقریؒ کے بغیر نہیں لکھا:

وكان يدعو للمنصور، ثم قطع دعوته، ومهّد الدولة بالأندلس،[نفح الطيب:١/ ٣٢٩]...وكان يسمّى بالأمير، وعليه جرى بنوه من بعده، فلم يدع أحد منهم بأمير المؤمنين تأدّباً مع الخلافة بمقر الإسلام ومنتدى العرب، حتى كان من عقبه عبد الرحمن الناصر، وهو ثامن بني أمية بالأندلس، فتسمّى بأمير المؤمنين على ما سنذكره، لما رأى من ضعف خلفاء بني العباس بعد الثلاثمائة، وغلبة الأعاجم عليهم، وكونهم لم يتركوا لهم غير الإسم، وتوارث التلقيب بأمير المؤمنين بنو عبد الرحمن الناصر واحداً بعد واحد[نفح الطيب من غصن اندلس الرطيب:١/٣٣٠]

عبدالرحمٰن منصور کے لیے دعوت دیتا تھا۔پھر اس نے منصور کی دعوت چھوڑ دی اور اندلس میں مستقل حکومت کی بنیاد رکھی......وہ اپنا نام امیر رکھتا تھا اور اس کے بعد اس کی اولاد نے اسی طریقہ کو جاری رکھا ۔ان میں سے کسی نے بھی امیر المؤمنین ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اسلام کے مرکز اور عرب کے جلو میں خلافت کا ادب بجالاتے ہوئے۔یہاں تک کہ اس کے جانشینوں میں عبدالرحمٰن الناصر آیا جو بنوامیہ کا اندلس میں آٹھواں تاجدار تھا۔اس نے اپنا نام امیر المؤمنین رکھا جیسا کہ اس کا تذکرہ ہم آگے کریں گے۔یہ اقدام اس نے تیسری صدی کے بعد بنوعباس کے خلفاء کا ضعف اور اس پر عجمیوں کا تسلط دیکھ کر اٹھایا کہ عجمیوں نے خلیفہ کے لیے بس نام ہی باقی چھوڑا تھا۔پھر عبدالرحمٰن الناصر کی اولاد میں یکے بعد دیگرے امیر المؤمنین کا لقب رکھنے کی ریت چل پڑی۔

صرف اندلس ہی کیا، بعد میں مختلف خطوں میں جو بھی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، وہ ہمیشہ خود کو خلافت کے تابع سمجھتی رہیں اور اپنے وجود کے لیے مرکزِ خلافت سے سند حاصل کرتی رہیں۔ ماضی قریب کے غیر مسلم عرب مؤرخ جُرجی زیدان کا تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

ومع كل ما انتاب الخلفاء في أواخر الدولة العباسية من الضعف واستبداد الأمراء فيهم حتى جردوهم من كل قوة دنيوية وأنشأوا الدول دونهم ولقبوا أنفسهم بالسلاطين، رغم ذلك كله لم يخطر لأحد منهم أن يدعي الخلافة أو أن ينصب نفسه خليفة.

هذه دول بني بويه والسلاجقة والغزنوية والطاهرية والأيوبية وغيرهم، قد استقلوا في الأحكام، وفيهم من غلب على الخلفاء، ولكنهم لم يسموا أنفسهم إلا سلاطينَ، بل كانوا يتزلفون إلىَ الخلفاء، ليثبتوهم في الحكم وكذلك فعل صلاح الدين الأيوبي في مصر، ......لما أراد الاستقلال بالملك دعا على المنابر للخليفة العباسي، ولم يسم نفسه خليفة بل اكتفى بلقب السلطان. [تاريخ تمدن اسلامي لجُرجي زيدان:١/١٢٢]

اس کے باوجود کہ دولتِ عباسیہ کے آخری دور میں ان کی کمزوری اور امراء کی سرکشی کی بناء پر جتنے بھی

حکمرانوں نے تسلط حاصل کیا، حتیٰ کہ وہ دنیاوی قوت میں ان سے علیحدہ ہو گئے، ان کے بغیر نئی حکومتیں قائم کر لیں اور اپنے لقب سلطان رکھ لیے، مگر ابھی تک ان میں سے کسی کے دل میں یہ بات نہیں کھٹکی تھی کہ وہ خلافت کا دعویٰ کرے یا اپنے آپ کو خلیفہ کے طور پر پیش کرے۔

یہ بنی بویہ، سلجوقی، غزنوی، طاہری، ایوبی وغیرہ ہیں۔ یقیناً یہ خودمختار حکمران بنے، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو خلیفہ پر غالب آئے، لیکن انہوں نے اپنے لیے ''سلطان'' کے علاوہ کوئی لقب اختیار نہیں کیا۔ بلکہ وہ لوگ خلفاء کی طرف اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے، تاکہ فیصلے کے وقت ان سے وابستہ رہیں۔ صلاح الدین نے بھی مصر میں یہی کیا۔ جب اس نے مستقل حکومت قائم کی تو منبر پر عباسی خلیفہ کا نام پکارا۔ اپنا نام خلیفہ نہیں رکھا بلکہ سلطان کے لقب پر اکتفاء کیا۔

یہ الگ موضوع بحث ہے کہ مسلم حکمرانوں کی اس طوائف الملوکی سے خلافت کے ادارے کو اور مسلمانوں کی سیاسی وحدت کو کیا نقصان پہنچا، مگر یہ اٹل حقیقت ہے کہ خلافت کا ادارہ اور خلیفہ کا منصب سب کے ہاں مسلم رہا۔ ان حقائق کے باوجود بھی غامدی صاحب متحدہ اسلامی ریاست کو خواب قرار دیں تو کیا کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک بات ہے فقہاء کرام کی، تو فقہاء کرام نے بالعموم ہر دور میں ایک سے زائد خلفاء کے تقرر کو حرام قرار دیا ہے۔ عبدالرحمٰن الناصر نے چوتھی صدی ہجری میں عباسی خلیفہ کے مقابل خلیفہ کا لقب اختیار کیا تھا اس کے بعد اس کی اولاد میں بھی یہ ریت چل نکلی۔ چوتھی صدی کے بعد کے فقہاء میں ہمیں دو خلفاء کے مسئلہ کی صراحت زیادہ ملتی ہے۔ غامدی صاحب کا فرمان بالکل بے بنیاد ہے کہ فقہاء نے اس بارے میں کوئی نکیر نہیں کی۔

امام ابوالحسن ماوردیؒ [متوفی ۴۵۰ھ] لکھتے ہیں:

"وَإِذَا عُقِدَتِ الإِمَامَةُ لِإِمَامَيْنِ فِي بَلَدَيْنِ لَمْ تَنْعَقِدْ إِمَامَتُهُمَا؛ لِأَنَّهُ لَا يَجُوزُ أَنْ يكونَ لِلأُمَّةِ إِمَامَانِ فِي وَقْتٍ وَاحِدٍ، وَإِنْ شَذَّ قَومٌ فَجَوَّزُوهُ [الأحكام السلطانية:١٠]

جب دو مختلف شہروں میں دو اماموں کے لیے امامت طے کر لی جائے تو ان دونوں کی امامت منعقد نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ یہ بات جائز نہیں ہے کہ امت کے لیے ایک وقت میں دو امام ہوں۔ اگرچہ ایک گروہ نے خلاف ضابطہ اسے جائز کہا ہے۔"

امام الحرمین ابوالمعالی الجوینیؒ [متوفی ۴۷۸ھ] لکھتے ہیں:

"ذهب أصحابنا إلى منع عقد الإمامة لشخصين في طرفي العالم...... والذي عندي فيه أن عقد الإمامة لشخصين في صقع واحد متضايق الخطط والمخالف غير جائز وقد حصل الإجماع عليه. وأما إذا بعدى المدى، وتخلل بين الإمامين شسوع النوى

فلاحتمال في ذلك محال، وهو خارج عن القواطع.[الإرشاد:۴۲۵]

ہمارے اصحاب اس طرف گئے ہیں کہ اطراف عالم میں دو شخصوں کے لیے امامت منعقد کرنا منع ہے...اور میرے نزدیک ایک ہی ملک میں جس کے علاقے مختصر ہوں دو شخصوں کو امام مقرر کرنا ناجائز ہے۔ اور اس حکم پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ بہرحال جب فاصلے بڑھ جائیں اور دونوں اماموں کے درمیان طویل مسافت حائل ہو جائے تو اب اس میں جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ صورت قطعیات سے خارج ہے۔"

امام ابن حزم ظاہری اندلسیؒ متوفی ۴۵۶ھ جن کی کتاب "محلی" بیک گراؤنڈ میں رکھ کر غامدی صاحب اپنے پروگرامز کی شوٹنگ کرواتے ہیں۔ امام صاحبؒ نے امت کے لیے بیک وقت ایک امام کے تقرر پر اجماع نقل کیا ہے۔

"واتفقوا انه لايجوزان يكون على المسلمين في وقت واحدفي جميع الدنيا امامان لا متفقان ولا مفترقان ولا في مكانين ولا في مكان واحد" [مراتب الاجماع:۲۰۷]

اور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں پر ایک وقت میں پوری دنیا میں دو امام مقرر کرنا جائز نہیں ہیں۔ خواہ وہ دونوں متفق ہوں یا مخالف، نہ دو علاقوں میں نہ ایک علاقے میں۔

امام شرف الدین نوویؒ [متوفی ۶۷۶ھ] مسلم شریف کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وَمَعنَى هذا الحَدِيثِ إِذَا بُويِعَ لِخَلِيفَةٍ بَعدَ خَلِيفَةٍ فَبَيعَةُ الاَوَّلِ صَحِيحَةٌ يجبُ الوَفَاءُ بِهَا وَبَيعَةُ الثَّانِي بَاطِلَةٌ يحرمُ الوَفَاءُ بِهَا وَيحرمُ عَلَيهِ طَلَبُهَا وَسَوَاء عَقَدُوا لِلثَّانِي عَالِمِينَ بِعَقدِ الأول جَاهِلِينَ وَسَوَاء كانَا فِي بَلَدَينِ او بَلَدٍ أَو أَحَدُهُمَا فِي بَلَدِ الإِمَامِ المُنفَصِلِ.[كتاب الأمارة،باب الوجوب الوفاء، ببيعة الخلفاء]

حدیث کا معنی یہ ہے کہ جب ایک خلیفہ کے بعد دوسرے خلیفہ کی بیعت کی جائے تو پہلے کی بیعت صحیح ہے اور اس کو نبھانا واجب ہے۔ دوسرے کی بیعت باطل ہے اور اسے نبھانا اور نبھانے کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔ خواہ لوگوں نے دوسرے سے بیعت جان بوجھ کر کی ہو یا انجانے میں۔ خواہ دونوں امام دو مختلف شہروں میں ہوں یا ایک ہی شہر میں، یا ان میں سے کوئی امام سے دور کسی شہر میں ہو۔"

اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں:

"اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے، جس طرح کے عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی جگہ یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہئے۔"

غامدی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ ان کے خواب وخیال میں جو اسلام ہے یقیناً اس میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں، بلکہ سیکولرازم اور مادیت ہے۔مگر جو اسلام چودہ صدیاں قبل حضور ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اس میں تو قومیت کی بنیاد اسلام ہی تھی، اس میں تو کلمہ پڑھنے کے بعد کوئی قریشی، ہاشمی، خزرجی، اوسی، حجازی، مہاجر یا انصاری نہیں رہتا تھا، سب ایک ہی قومیت میں سما جاتے تھے۔اگر کبھی ان کی قبائلی نسبتیں اسلامی قومیت پر غالب آنے لگتیں تو سورۂ تکاثر نازل ہو جایا کرتی تھی:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (١) حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (٢)

غفلت میں رکھا تم کو کثرتِ مال کی حرص نے۔حتیٰ کہ تم نے (اپنے آباؤ اجداد کی) قبروں کی زیارت کی۔

کبھی کسی حبشی کے سامنے کسی کی عربیت جوش مارنے لگتی تو سورۂ حجرات میں تنبیہ کر دی جاتی تھی:

يَا ايها النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُم مِن ذَكَرٍ وَّاُنثٰى وَجَعَلنٰكُم شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا اِنَّ اكرَمَكُم عِندَ اللّٰه اَتقٰكُم اِنَّ اللّٰهَ عَلِيم خَبِير. (حجرات:۱۳)

اے لوگو! بیشک ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں چھوٹے اور بڑے قبیلوں میں بنایا تا کہ تم آپس میں پہچان رکھو، یقیناً اللہ کے ہاں تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے، بیشک اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

حضور ﷺ کے اسلام میں جو قرآن ہے وہ تو بتاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے سیاسی وحدت اور جزا سزا کے لیے دو ہی قومیں بنائی ہیں مومن اور کافر:

هُوَ الَّذِى خَلَقَكُم فَمِنكُم كَافِر وَمِنكُم مُؤمِن وَاللّٰهُ بِمَا تَعمَلُونَ بَصِير. [تغابن:۲]

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہیں تخلیق کیا، پھر تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن ہیں، اور اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

اس اسلام کے راہبر حضور ﷺ نے جب مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم کی تو یہود کے مقابلے میں مسلمانوں میں قریشی اور یثربی کا فرق مٹا کر ایک ہی قوم قرار دیا:

بِسمِ اللّٰهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ، هٰذَا كِتَابٌ مِن مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰه عَلَيهِ وَسَلَّمَ، بَينَ المُؤمِنِينَ وَالمُسلِمِينَ مِن قُرَيشٍ وَيَثرِبَ، وَمَن تَبِعَهُم، فَلَحِقَ بِهِم، وَجَاهَدَ مَعَهُم، اَنَّهُم اُمَّةٌ وَاحِدَةٌ مِن دُونِ النَّاسِ. [سیرۃ ابن ہشام:۱۴۳/۲۔کتاب الاموال لابن عبید ا/۲۲۵]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔یہ کتاب ہے محمد نبی ﷺ کی طرف سے قریش اور یثرب کے مومنین اور مسلمین اور

ان لوگوں کے درمیان جوان کے تابع ہو گئے اور ان سے آ ملے اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کیا۔ یہ کہ وہ لوگ تمام لوگوں کے مقابل ایک امت ہیں۔

اب غامدی صاحب فرمادیں وہ کونسا اسلام ہے جس کی بنیاد اسلام نہیں بلکہ پاکستانی، ہندوستانی، سعودی، عراقی، امریکی، بلوچ، قریشی، سندھی یا مہاجر ہے۔ وہ کونسا قرآن ہے جس میں ان کے دعوے کے مطابق مسلم قومیت کا ذکر نہیں۔ وہ کونسی حدیث ہے جو مسلم قومیت کا انکار کرتی ہے۔[1]

☆......☆......☆......☆

---

[1] واضح رہے کہ غامدی وغیرہ سیکولر لوگوں کے نظریۂ قومیت اور ہمارے اکابر کے متحدہ قومیت کے نظریہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے اکابر متحدہ قومیت کے قائل تھے جبکہ یہ لوگ وطنی قومیت کے۔ ہمارے تمام اکابر کے ہاں مسلم قومیت مسلم تھی، اختلاف اس بات پر تھا کہ آزادی کے لیے متحدہ قومیت کی بناء پر جدوجہد کی جائے یا دوقومی نظریہ پر۔ متحدہ قومیت کا مطلب ہے ایک وطن میں بسنے والے تمام مذاہب اور اقوام کے لوگ متحد ہو کر وطن کی حفاظت کریں اور نظم ونسق چلائیں۔ یہ نظریہ عین اسلام کے مطابق ہے۔ جبکہ سیکولر ذہنیت کے نزدیک قومیت کے مفہوم کو ہمارے اکابر ''جدید قومیت'' کے عنوان سے جانتے تھے اور اس کا انکار کرتے تھے حتی کہ مولانا ابوالکلام آزاد'' جیسی شخصیت بھی جدید قومیت کا انکار کرتے تھے کیونکہ یہ نظریہ اسلام کے مسلمات سے متصادم ہے۔ [تفصیل کے لیے دیکھیے قاضی زاہد الحسینیؒ کی کتاب: چراغ محمد ﷺ: ۶۴۷]

آج کل قوم پرستی کا یہ نظریہ Nationalism کے نام سے معروف ہے اور دنیا بھر کے سیکولر اسی نظریہ قومیت کے قائل ہیں، یہی نظریہ اتاترک نے ترکی میں نافذ کیا تھا اور غامدی صاحب جیسے لوگ اسے اسلام کا لبادہ اوڑھا کر پاکستان میں نافذ کروانا چاہتے ہیں۔ غامدی صاحب نے 21 فروری کو روزنامہ جنگ میں اپنے اسی مضمون کی وضاحت شائع کی ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے نظریۂ قومیت کو واضح کرتے ہوئے اسی جدید قومیت کا اعتراف کیا ہے:۔

''تیسری دورِ حاضر کی قومی ریاستیں جن کی حدود بین الاقوامی معاہدات سے متعین ہوتی اور جو وجود میں آتے ہی اپنے باشندوں کے لیے بنائے قومیت بن جاتی ہیں۔ لہٰذا رنگ، نسل، زبان، مذہب اور تہذیب وثقافت کے اشتراک واختلاف سے قطع نظر وہ اپنے آپ کو ہندی، مصری، امریکی، افغانی اور پاکستانی کہتے اور اپنی قومیت کا اظہار اسی حوالے سے کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی کسی کا حاکم یا محکوم نہیں ہوتا، بلکہ سب ہر لحاظ سے برابر کے شہری سمجھے جاتے ہیں اور اسی حیثیت سے کاروبارِ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر کی یہی ریاستیں ہیں جن کے بارے میں میں نے لکھا ہے کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہوسکتا۔ ریاست پاکستان اسی نوعیت کی ایک ریاست ہے۔

[ریاست اور حکومت: جنگ 21 فروری 2015ء]''

مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم (شیخ الحدیث و نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی)

''اسلام اور ریاست'' جوابی بیانیہ

غیر منقسم ہندوستان میں قائداعظم کی قیادت میں قیام پاکستان کی جو تحریک چلی' اس کی بنیاد مسلم قومیت کے نظریے پر تھی' انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں جو تمام ہندوستانیوں کو ایک قوم قرار دے کر اکھنڈ بھارت کے حق میں تھے' جناب قائداعظم محمد علی جناح صاحب نے پورے زور وشور اور دلائل کی روشنی میں یہ نعرہ لگایا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم۔ (بہت سے) مسلمان رہنماؤں' اہل فکر اور علمائے کرام نے اس کی بھرپور تائید کی اور میرے بچپن میں ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کی جو صدائیں گونجتی تھیں' ان کی دل کش یاد آج بھی کانوں میں محفوظ ہے۔

آخر کار مسلم اکثریت نے قائداعظم محمد علی جناح صاحب کی اس پکار پر لبیک کہا' اور ناقابل فراموش قربانیوں کے بعد ہمالیہ کے دامن میں ارض پاک ایک حقیقت بن کر ابھری' نظریہ پاکستان کی بنیاد تو واضح تھی لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے دستور پاکستان کے لیے وہ قرارداد مقاصد باتفاق منظور کی جس نے ملک کا رخ واضح طور پر متعین کر دیا کہ حاکیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے' اور عوام کے منتخب نمائندے اپنے اختیارات قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر استعمال کر سکیں گے' اور یہ قرارداد 1954' 1956' 1962 اور 1973 کے تمام دستوری مسودوں کا الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ لازمی جزبنی رہی' اور آج بھی وہ ہمارے دستور کی وہ دستاویز ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔

چوتھائی صدی تک بنتی ٹوٹتی اسمبلیوں میں بھی اور باہر بھی اس پر کھلے دل سے بحث ومباحثہ بھی ہوا' اور بالآخر اس پر پورے ملک کا اتفاق ہو گیا، پھر اس کی بنیاد پر دستور کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو یہ دفعہ بھی تمام مسودات دستور میں کسی قابل ذکر اختلاف کے بغیر موجود رہی کہ پاکستان میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جا سکے گا اور موجودہ قوانین کو بھی ان کے سانچے میں ڈھالا جائے گا۔ سن 1973ء کا دستور جو آج بھی نافذ ہے' اس وقت کے تمام سیاسی اور دینی حلقوں کے اتفاق سے منظور ہوا' اور اس پر بفضلہ تعالیٰ آج بھی تمام سیاسی پارٹیاں متفق ہیں اور اس کا مکمل تحفظ چاہتی ہیں جس کا مظاہرہ اور اس کی مزید تاکید حال ہی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تاریخی اتفاق سے دوبارہ ہو گئی ہے' اعلیٰ عدالتوں نے بھی اس دستور کی بنیادی روح کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔

اب کچھ عرصے سے کچھ آوازیں پھر گونجنے لگی ہیں کہ ملک کو اس دہشت گردی سے پاک کرنے کے لیے اسے سیکولر بنانا چاہیے' یعنی نصف صدی سے زائد جو فکری' سیاسی اور عملی جدوجہد ملک کا صحیح رخ متعین کرنے کے لیے ہوئی ہے' اس کی بساط لپیٹ کر پھر ''الف با'' سے آغاز کرنا چاہیے' ایک ایسے موقع پر جب ملک کے تمام طبقات دہشت گردی کے عفریت کو مل کر شکست دینے کے لیے کمر بستہ ہیں ملک کی بنیاد اس کے قیام کے نظریے اور اس کے متفقہ رخ کو تبدیل کرنے کی کوشش اس فضا میں جو پنڈورا بکس کھول سکتی ہے' اور اس سے جو انتشار جنم لے سکتا ہے' اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

اسی فضا میں سیکولرازم کے حامی حضرات جو کچھ فرما رہے ہیں اس کی بازگشت مذہب کے نام پر ایک مذہبی بیانیہ کے عنوان سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے نام سے سامنے آئی ہے جو روزنامہ جنگ کے 22 جنوری 2015ء کے شمارے میں ''اسلام اور ریاست' ایک جوابی بیانیہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے بجائے اپنے افکار کو ''مذہبی بیانیہ'' قرار دیا ہے اس ''بیانیہ'' کا مقصد انہوں نے شروع ہی میں یہ بیان فرمایا ہے کہ سیکولرازم کی تبلیغ نہیں' بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورت حال کی اصلاح کر سکتا ہے'' اس جوابی بیانیے کے جو نکات انہوں نے بیان فرمائے ہیں' ان کو بار بار پڑھنے کے باوجود مجھے شاید اپنی کم فہمی کی وجہ سے وہ ایک عجوبے سے کم نہیں لگتے اور ان کے باہمی تضادات سے مجھے بہت سی تاویلات کے باوجود چھٹکارا نہیں مل سکا۔ اس مضمون میں یوں تو بہت سی باتیں قابل تبصرہ ہیں، لیکن ان تمام نکات پر تبصرہ بہت طول چاہتا ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں، لیکن ان میں سے چند متضاد نکات اور ان کے مضمرات کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے، کیونکہ وہ نکات نہ صرف پاکستان کے قیام کے نظریے ہی کی نفی کرتے ہیں' بلکہ ملک کو ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام اجتماعی کی طرف دعوت دیتے ہیں جن کے عملی اطلاق کی کوئی معقول صورت کم از کم مجھ کم فہم کی سمجھ میں نہیں آ سکی۔

سب سے پہلے نکتے میں انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ ریاست کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے' اور اس کو بھی کسی قرارداد مقاصد کے ذریعے سے مسلمان کرنے اور آئینی طور پر اس کا پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس میں کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا'' اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں جو قرارداد مقاصد درج ہے' یا اس میں جو پابندی عائد کی گئی ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا' یہ قطعی طور پر نہ صرف غیر ضروری' بلکہ بے بنیاد خیال پر مبنی ہے، قرارداد مقاصد کا بنیادی تصور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اقرار

ہے' اور اسے غیر ضروری اور بے بنیاد قرار دینے کا نتیجہ ریاست کے لیے اس حاکمیت اعلیٰ کے اقرار کو بے بنیاد قرار دینے کے سوا اور کیا ہے؟

یہ بیانیہ وہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' کے مقابلے میں یا اس کے متبادل کے طور پر پیش کر رہے ہیں' لیکن اول تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ ''سیکولرازم کی تبلیغ'' اور ''مذہبی بیانیہ'' کے اس نکتے میں کیا فرق ہوا؟ سیکولرازم بھی یہی کہتا ہے کہ ''ریاست کا دین سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ دین ایک خالص انفرادی معاملہ ہے' وہ بھی یہی کہتا ہے کہ پارلیمان پر کسی دین کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی' لہٰذا قرارداد مقاصد کی کوئی ضرورت نہیں اور یہی باتیں جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے اس نکتے میں بھی ارشاد فرمائی گئی ہیں کیا عنوان بدل دینے سے حقیقت میں کوئی فرق آ جاتا ہے؟

پھر یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد آگے خود جناب غامدی صاحب نکتہ نمبر ۸ رمیں فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے ارشاد'' امرهم شورى بينهم '' کا تقاضا ہے کہ ملک میں ایک پارلیمان قائم ہونی چاہیے' اور ''علماؤں یا ریاست کی عدلیہ' پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہو سکتا۔ ''امرهم شورى بينهم '' کا اصول ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں، اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے، اس سے ہٹ کر جو حکومت قائم کی جائے گی' وہ ایک ناجائز حکومت ہوگی''۔

ان دونوں باتوں کے مجموعے سے مطلب یہی نکلتا ہے کہ پارلیمان وجود میں تو قرآنی حکم ''امرهم شورى بينهم '' کے تحت آئے گی مگر اس کے بعد اسے اس بات کا پابند نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہ بنائے' البتہ ملک کے افراد اور ادارے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ پارلیمان کے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیں۔ یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ریاست کا نہ کوئی مذہب ہوتا ہے' اور نہ پارلیمان کے فیصلوں کو قرآن وسنت کا پابند کیا جا سکتا ہے' تو ''امرهم شورى بينهم '' کا قرآنی اصول اس کے لیے کس بنیاد پر لازم ہو گیا؟ اور یہ بات کس بنیاد پر کہی جا رہی ہے کہ ''اسلام میں حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کا یہی ایک جائز طریقہ ہے'' جب کہ ریاست کا اسلام سے کوئی تعلق ہی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمان مغربی ممالک کی طرح ہم جنس شادیوں کا قانون نافذ کر دے' تو کیا قرآن کریم کا باہمی مشاورت کا یہ اصول پھر بھی ''ہر فرد اور ادارے کو پابند کرتا ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جب کہ پارلیمان پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی نہ کرے؟

پھر جناب غامدی صاحب نے آگے اپنے نکتہ نمبر ۹ر میں فرمایا کہ ''دین کے ایجابی احکام میں سے یہ صرف نماز اور زکوٰۃ ہے جس کا مطالبہ مسلمانوں کا کوئی نظم اجتماعی اگر چاہے تو قانون کی طاقت سے کرسکتا ہے۔''''نظم اجتماعی'' سے ان کی مراد غالباً حکومت ہی ہے' تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو بزور قانون لازمی قرار دے کر بے نمازیوں پر سزا جاری کرے؟ اگر یہ واقعی کوئی قرآن کریم کا حکم ہے کہ نماز کا مطالبہ قانون کی طاقت سے کیا جائے' جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے' تو پھر' اگر چاہے' کی جو شرط انہوں نے لگائی ہے' اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اس قرآنی حکم پر عمل حکومت کی چاہت پر موقوف ہے' لہٰذا اگر وہ نہ چاہے تو اس حکم پر عمل نہ کرے۔ اس صورت میں سورۃ احزاب کی اس آیت (نمبر ۳۶) کا کیا مطلب ہوگا جس میں فرمایا گیا ہے ''اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کردیں تو کسی مومن مرد یا عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں ہے کہ انہیں اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے''۔

آگے معاشرتی احکام کے حوالے سے اپنے نکتہ نمبر ار میں وہ فرماتے ہیں ''حکومت ان کی (عوام کی) رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس ان پر عائد نہیں کرسکے گی، ان کے شخصی معاملات، یعنی نکاح، طلاق، تقسیم وراثت، لین دین اور اس نوعیت کے دوسرے امور اگر ان میں کوئی نزاع ہو تو اس کا فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔'' یہاں پھر کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جب ریاست کا کوئی مذہب نہیں اور اس پر قرآن وسنت یا شریعت کے مطابق قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں، تو عدلیہ پر ان احکام میں شریعت ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابندی کس بنیاد پر ہوگی؟ اور اگر ان معاملات میں پالیمان شریعت کے بجائے کسی اور قانون کی پابندی کا حکم دے تو اس کے سامنے نکتہ نمبر ۸ر کے تحت سر تسلیم کیوں خم نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ''ان کی رضامندی کے بغیر زکوٰۃ کے علاوہ کوئی ٹیکس عائد نہیں کرے گی'' ظاہر ہے کہ اس میں عوام کی رضامندی سے مراد پارلیمان کی مرضی ہے، لہٰذا مذکورہ جملے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کوئی اور ٹیکس عائد کرنے کے لیے تو پارلیمان کی منظوری درکار ہے، لیکن زکوٰۃ حکومتی سطح پر عائد کرنے کے لیے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہیں ہے، اگر یہی مقصود ہے، تو حکومت پارلیمان کے کسی قانون کے بغیر زکوٰۃ کس بنیاد پر وصول کرے گی اور اس کی اس اتھارٹی کا سرچشمہ کیا ہوگا۔ اگر وہ سرچشمہ قرآن کریم ہے تو کہنا ہوگا کہ قرآن کریم پارلیمان پر بالادستی رکھتا ہے۔ پھر ریاست کا کوئی مذہب نہ ہونے کا اصول کہاں گیا؟

آگے جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے فرمایا ہے ''ریاست کا کوئی مسلمان شہری اگر زنا، چوری، قتل، فساد فی الارض اور قذف کا ارتکاب کرے گا اور عدالت مطمئن ہو جائے گی کہ اپنے ذاتی،

خاندانی، اور معاشرتی حالات کے لحاظ سے وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں، تو اس پر وہ سزائیں نافذ کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو پورے شعور اور شرح صدر کے ساتھ قبول کر لینے کے بعد ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنی کتاب میں مقرر کر دی ہیں۔ یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ایسی صورت میں پارلیمان اور حکومت پر لازم ہے کہ وہ ایسے مسلمانوں پر یہ قرآنی سزائیں جاری کرے؟ اگر قرآن کریم کے حکم کے تحت لازم ہے تو جب پارلیمان پر قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کی کوئی پابندی نہیں ہے، تو اس پر یہ پابندی کیسے لازم ہوگی کہ وہ قرآنی سزائیں ہی جاری کرے اور ان معاملات میں اپنی طرف سے کوئی اور سزا تجویز نہ کرے، یا ان میں سے کسی جرم (مثلاً زنا بالرضا) کو جائز قرار نہ دے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ سزائیں قرآن کریم ہی کی بنیاد پر دی جائیں گی تو کیا قرآن کریم میں کوئی ایسی تفریق ہے کہ یہ سزائیں صرف ان مسلمانوں کے لیے ہیں جو شعور کے ساتھ اسلام کی دعوت کو قبول کریں، اور غیر مسلم چوروں، قاتلوں اور فساد فی الارض پھیلانے والوں کو ان سے مستثنیٰ رکھا جائے، جیسا کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ سزائیں صرف مسلمانوں ہی کے لئے ہوں گی؟ انہوں نے اپنے اس ''بیانیے'' میں یہ بھی فرمایا ہے کہ ''اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام نہیں ہے جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے قرآن وحدیث میں کسی جگہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں، یا انہیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔'' یہ وہی دو قومی نظریہ کا مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر جناب قائد اعظم محمد علی جناح صاحب نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔

یہاں مؤدبانہ گزارش یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں پر لغت یا عرف عام کے مطابق لفظ ''قوم'' کا اطلاق درست ہے یا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ مستقل سیاسی اور اجتماعی وحدت کے لحاظ سے تمام مسلمانوں کو (چاہے وہ کسی رنگ ونسل سے تعلق رکھتے ہوں) غیر مسلموں سے الگ سمجھنا اور اس بنیاد پر ان کے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ قائد اعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اور جس کی بنیاد پر آج ہم ایک الگ ملک کی حیثیت سے بیٹھے ہیں، اس کا مطلب یہی تھا، اس دو قومی نظریہ پر بھی یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ''قوم'' کا لفظ استعمال کرنا لغت اور عرف عام کے اعتبار سے درست نہیں ہے، لیکن ان کا مقصد ''مستقل سیاسی وحدت'' تھا جس کی بنیاد پر اپنے اختیار سے کوئی حکومت قائم کی جائے۔ لغوی اعتبار سے تو تمام انبیاء علیہم السلام کی مخاطب ان کی قومیں ہی تھیں، لیکن انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی مستقل سیاسی وحدت قائم نہیں کی، اور اگر کوئی

ریاست قائم ہوئی تو وہ وطن اور رنگ و نسل کی بنیاد پر نہیں بلکہ اسلام کی بنیاد پر ہوئی، جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد و سلیمان علیہم السلام کی حکومتیں اور خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی حکومت، البتہ اس میں غیر مسلموں کو تمام شہری اور مذہبی حقوق برابر حاصل تھے۔

انہوں نے ایک اور بات اپنے نکتہ نمبر ۲ ر میں یہ ارشاد فرمائی ہے کہ "نہ خلافت کوئی دینی اصطلاح ہے، اور نہ عالمی سطح پر اس کا قیام اسلام کا کوئی حکم ہے۔" قرآن کریم نے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۳۰ ر میں حضرت آدم علیہ السلام کے تذکرے میں ارشاد فرمایا ہے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اور سورۂ ص آیت نمبر ۲۶ ر میں حضرت داؤد علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ "ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔" نیز سورۂ نور آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد فرمایا ہے: "تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں خلافت عطا فرمائے گا، جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی تھی، اور ان کے لیے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا۔ جسے ان کے لیے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے، اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا فرمائے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔" اس کے علاوہ متعدد احادیث ہیں جن میں اسلامی ریاست کے امیر کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ اور اس کی حکومت کو خلافت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ قرآن و حدیث کے ان ارشادات کی بنا پر اسلامی لٹریچر اس اصطلاح سے بھرا ہوا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے عبقری عالم ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ "خلافت" کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "لوگوں کو شرعی طرز فکر کے مطابق چلانا جس سے ان کی آخرت کی مصلحتیں بھی پوری ہوں اور وہ دنیوی مصلحتیں بھی جن کا نتیجہ آخر کار آخرت ہی کی بہتری ہوتا ہے۔"

[مقدمہ ابن خلدون باب: ۳ فصل: ۲۵ ص: ۱۸۹]

قرآن و حدیث کے ان ارشادات اور چودہ سو سال سے اس اصطلاح کے معروف و مشہور بلکہ متواتر ہونے کے باوجود یہ فرمانا کہ خلافت کوئی دینی اصطلاح نہیں ہے، اس پر تبصرے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ "مذہبی بیانیہ" دہشت گردی کے موجودہ مسائل کی اصلاح کرسکتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دستور پاکستان کو تلپٹ کر کے ان متضاد نکات کی بنیاد پر نئے سرے سے دستور بنایا جائے تو دہشت گرد اپنی دہشت گردی سے باز آجائیں گے یا ان کا خود بخود قلع قمع ہوجائے گا۔

حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ الحمد للہ ہمارے موجودہ دستور میں چند جزوی باتوں کے سوا

کوئی خرابی نہیں ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے جوہری احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہو رہا ہے ہمارے دستور میں جو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کو پوری طرح حاصل نہیں ہیں، پالیسی کے جو اصول بنائے گئے ہیں ان پر ایک دن عمل نہیں ہوا صوبوں کو جو حقوق ملنے چاہئیں، وہ نہیں مل رہے عوام کو قدم قدم پر مشکلات، رشوت ستانی اور ظلم وستم کا سامنا ہے، معیشت کے میدان میں اونچ نیچ حد سے بڑھی ہوئی ہے سرکاری دفتروں سے کام کرانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، عدل وانصاف کے دروازے غریبوں کے لیے تقریباً بند ہیں، دستور میں یہ لکھا ضرور ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور اس کے لیے دستور نے ایک میکنزم بھی تجویز کر دیا ہے، جس پر اگر ٹھیک ٹھیک عمل ہو تو وہ فرقہ واریت کا بھی سدباب کر سکتا ہے، لیکن اسے برسرکار لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہو رہی۔ یہ مجموعی صورتحال عوام میں مایوسی اور چڑچڑاہٹ پیدا کرتی ہے اور شر پسند لوگوں کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ملتا ہے کہ یہ اصلاحات پر امن ذرائع سے نہیں ہو سکتیں۔ اور حکومتوں کے اس طرز عمل نے اس بات کو مزید ہوا دی ہے کہ جو مطالبہ شریفانہ طور سے وعظ ونصیحت اور مشورے کے طور پر کیا جائے حکومت اسے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتی اور لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کوئی مطالبہ اسی وقت قابل سماعت ہو سکتا جب وہ ہڑتال اور جلاؤ گھیراؤ کے ساتھ کیا جائے اور اسی کا آخر حل یہ ہے کہ حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے جائیں۔ ملک کے دشمن مسلسل اس فکر کو ہوا دے رہے ہیں، اور اسی بنیاد پر جذباتی نوجوانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔

لہٰذا مسئلہ دستور میں کسی جوہری تبدیلی کا نہیں، مسئلہ اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کا ہے، اگر اس پر سنجیدگی سے عمل ہونے لگے، عوام کو اسلامی تعلیمات کے مطابق انصاف میسر ہو اور اسلام کے عادلانہ قوانین ان کی روح کے ساتھ نافذ کئے جائیں، مجرموں کو انصاف کے تمام تقاضوں کے ساتھ عبرت ناک سزائیں دی جائیں تو یہ مسلح تحریکیں اپنی موت آپ مرجائیں گی۔ خدا کے لیے نیا انتشار پھیلانے کے بجائے متحد ہو کر اس جہت میں کام کریں۔ [بشکریہ روزنامہ اسلام ۲۹،۳۰ جنوری ۲۰۱۵ء]

مولانا عبدالحمید تونسوی مدظلہ

جاوید غامدی کی جدت پسندی

جوابی خط:

اَلحمدُلِأَهلِهٖ والصلوة علىٰ أهلها، أمابعد!

عزیز محترم مولانا حمزہ احسانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....

آپ کا فکر انگیز مراسلہ موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ موجودہ دور کے پرآشوب حالات میں دین کی باتوں کے انکار سے کہیں زیادہ فتنہ الحاد و زندقہ کا دور دورہ ہے، ہر شخص دین کی من مانی تشریح کر کے خود کو ہدایت وارشاد کا ٹھیکہ دار سمجھتا ہے۔ یقین کریں کہ اس وقت ایسے لوگ کھلے منکرین سے کہیں زیادہ خطرناک ہیں، جن کے افکار تجدد پر مبنی ہیں۔ یہی حال جاوید احمد غامدی صاحب کا بھی ہے، جس کا آپ نے ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ آپکے اس جذبہ اور دینی حمیت کو قبول فرما کر دین اسلام کی حفاظت واشاعت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

متجددین زمانہ کے خیالات:

دین متین میں خدا اور اسکے آخری رسول ﷺ کی اطاعت فرض ہے اور عدم اطاعت نافرمانی و گناہ۔ مگر نافرمانی کے مراتب متعدد ہیں، جس طرح ایمان لانے کے بعد خدا اور رسول ﷺ کے احکام کی تعمیل نہ کرنا اور گناہوں سے نہ بچنا معصیت ہے اسی طرح خدا اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو اپنی اغراض کے مطابق بنا لینا، ان کے اصل الکلام کو اصل مفہوم اور مقصد سے پھیر کر اپنے مقصد پر منطبق کرنا بھی اس سے بڑھ کر نافرمانی اور معصیت ہے۔ اسی کو "الحاد" کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے!

"إِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا......الایہ"

جو لوگ ہماری آیتوں میں کج راہی کرتے ہیں وہ ہم سے پوشیدہ نہیں ہیں

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا!

"الإلحاد وضع الكلام على غير مواضعه" [تفسیر ابن کثیر]

اسی الحاد کو تحریف فی الدین، تفسیر بالرائے اور زندقہ بھی کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ کتاب وسنت کی تفسیر، تشریح اور تحقیق صرف وہی معتبر ہے جو رسول اللہ ﷺ حضرات

صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ نے فرمائی ہے، اس کے علاوہ کوئی تحقیق معتبر نہیں۔

عصر حاضر میں ایک طرف تو دین سے جہالت وغفلت انتہاء کو پہنچ گئی ہے اور دوسری طرف جدید ذہنیت اور مستشرقین کے گمراہ کن پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر بعض لوگوں نے اسلام کے مسلمہ اصولوں پر بحث وگفتگو شروع کر دی ہے، ایسے افراد علوم دینیہ سے پوری واقفیت نہیں رکھتے اور انہوں نے اسلام کے متعلق اگر کچھ معلومات حاصل بھی کیں تو اہل یورپ اور دشمنان اسلام کے ذرائع سے حاصل کیں۔ انہوں نے نصوص قطعیہ میں طرح طرح کی باطل تاویلیں کر کے شریعت کے متفق علیہ احکام کے تغیر وتحریف کو اسلام کی خدمت سمجھ لیا۔ ؎ ہرگز نہ ہوئے مغز سخن سے آگاہ...... لاحول ولاقوۃ إلا باللہ

محقق کی ذمہ داری:

دین اسلام کی تشریح اور تفہیم کیلئے چند چیزوں کا ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ محقق کا کام نظریہ قائم کر کے دلیل ڈھونڈنا نہیں ہوتا بلکہ دلائل دیکھ کر نظریہ قائم کرنا ہوتا ہے۔ مگر اہل تجدد کا طرز عمل اس کے بالکل خلاف ہے، وہ نظریات کو دلائل کے تابع بنانے کے بجائے، دلائل کو فیصلے کے تابع بنانے کے قائل ہیں۔ ان کا نعرہ یہ ہے کہ "ہم کتاب وسنت کی اس طرح تعبیر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے دور کی ضروریات کے مطابق ہو" یعنی وہ قرآنی آیات کی اور احادیث نبویہ کی ایسی تعبیر کریں گے جو اُن کی معین کردہ ضروریات کے مطابق ہو......(اسی کو تحریف معنوی کہتے ہیں) ؎

ہر شخص کے کردار سے تو اس کو پرکھ لے
خود اپنی کسوٹی پہ وہ کھوٹا کہ کھرا ہے

چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ امت میں جس قدر فرقے پیدا ہوئے انکا آغاز نقص علم اور غلط فہمی یا دنیوی غرض کی بناء پر ہوا، سوائے روافض کے کہ انکی اساس ہی دین متین کی بیخ کنی اور تخریب کاری پر رکھی گئی۔ بالکل اسی طرح تجدد پسندی کی بنیاد بھی فقہ اسلامی (جس کی افادیت اور عالمگیریت مسلمہ ہے) کو بیخ وبن سے اکھاڑنے کے لئے رکھی گئی اور تقلید کے طوق کو گلے سے اتار پھینکا گیا، جس کے نتیجہ میں افکار کو لامحدود آزادی ملی اور جولانگاہِ فکر کے اسپ نے اجتہاد کے نام پر اجماع امت اور اصول مسلمہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تمام حدود وقیود کو روند ڈالا۔ یہی وہ اساس ہے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر کے تمام متجددین کے افکار وخیالات کے تانے بانے الحاد وزندقہ سے جا ملتے ہیں اس وقت اسکی واضح مثال، زمانہ حال کا متجدد جاوید احمد غامدی ہے۔ ایسے افراد جو اسلاف کی پیروی کے بغیر محض کتاب وسنت کو ماننے کے دعویدار ہیں، ایسے لوگوں کے نظریات خوارج ومعتزلہ کے ہم آہنگ ہیں۔

دراصل وہ لوگوں کو اتباع سلف سے ہٹا کر اپنا تابعدار بنانا چاہتے ہیں اور اسی روش سے امت میں فرقہ بندی کی تخم ریزی ہوئی اور لوگ کئی فرقوں میں بٹ گئے۔

اجماع امت کی پیروی:

اسلامی قانون اور فقہ کیلئے ''اجماع'' کا حجت ہونا امت مسلمہ کا مسلمہ اور متفقہ عقیدہ رہا ہے۔ صحابہؓ و تابعینؒ اور تمام ائمہ مجتہدینؒ فقہی مسائل میں اجماع سے استدلال کرتے رہے۔ اور کتاب و سنت کے بعد اسے فقہ کا تیسرا ماخذ قرار دیا گیا۔

حدیث کے مشہور امام حاکم نیشاپوریؒ نے اپنی کتاب ''المستدرک'' میں حجیت اجماع پر ایک مستقل باب قائم فرمایا۔ فقہاء کرام نے اصول فقہ کی کتب میں حجیت اجماع کے دلائل خود کتاب و سنت سے پیش فرمائے ہیں، اجماع سے متعلق احادیث کو روایت کرنے والے صحابہؓ کی تعداد چالیس سے متجاوز ہے، اس لیے علماء نے اسے متواتر معنوی قرار دیا ہے۔ اجماع کا مطلب آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد کسی زمانہ کے تمام فقہاء مجتہدین کا کسی حکم شرعی پر متفق ہو جانا ہے۔ [المحصول للامام رازی: ۶۱/۴۔ تسہیل الوصول: ۱۶۷]

اجماع کو خود قرآن و سنت نے حجت قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے

☆...... ''وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيراً'' (النساء: ۱۱۵)

(اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کر دیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے اور اسے دوزخ میں جھونکیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔)

☆...... ''وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيداً'' (البقرۃ: ۱۴۳)

(اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔)

☆...... ''كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّهِ'' (آل عمران: ۱۱۰)

(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کیلئے وجود میں لائی گئی ہے تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

☆......"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" (التوبہ:۱۱۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔)

اسی طرح احادیث طیبہ میں......

☆......حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا!

"لاتزال طائفة من أمتي يقاتلون على الحق ظاهرين إلى يوم القيامة"

(صحیح بخاری کتاب الاعتصام ۲/۱۰۸۷۔ صحیح مسلم کتاب الایمان، ۱/۸۷)

(میری امت میں ایک جماعت (قرب) قیامت تک حق کے لیے سربلندی کے ساتھ برسرپیکار رہے گی۔)

☆......حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"إن الله لايجمع أمتي أو قال "أمة محمد" على ضلالة، ويد الله على الجماعة، ومن شذ شذ إلى النار" [جامع ترمذی: ابواب الفتن، باب لزوم الجماعۃ ۲/۳۹]

(اللہ میری امت کو کسی گمراہی پر متفق نہیں کریگا، اور اللہ کا ہاتھ (مسلمانوں کی) جماعت پر ہے، اور جو الگ راستہ اختیار کریگا جہنم کی طرف جائے گا۔)

☆......حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

"إن أمتي لاتجتمع على ضلالة، فإذا رأيتم اختلافاً فعليكم بالسواد الأعظم."

(سنن ابن ماجہ: ابواب الفتن، باب السواد الاعظم ۲۸۳)

(میری امت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوگی، پس جب تم (لوگوں میں) اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کو لازم پکڑ لو (یعنی اسکا اتباع کرو۔)

صحابہ کرامؓ کے استفسار پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "سواد اعظم سے مراد وہ لوگ جو اس طریقہ پر ہوں جو میرا اور میرے صحابہؓ کا ہے۔" [مجمع الزوائد: کتاب العلم ۱/۱۵۶]

حجیت اجماع کے یہی دلائل کافی ہیں۔ اس لیے دین کے شارح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اجماع امت کے اصول کو پیش نظر رکھے، مگر متجددین زمانہ اس شرعی اصول سے اعراض کر کے اپنی عقل وفطرت کو دین کا ماخذ سمجھ بیٹھے ہیں۔ چنانچہ جاوید احمد غامدی صاحب نے جب مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ومتاثر ہو کر اسلامی احکام کی تشریح نئے انداز میں شروع کی تو اہل علم نے اس کے رویہ کو متجددانہ قرار دیکر رد کر دیا ہے۔

غامدی کی جدت پسندی:

جاوید احمد غامدی (بی اے آنرز) ٹی وی کے مشہور سکالر، ماہنامہ اشراق کے مدیر، "المورد" کے منتظم

اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی ہیں۔

موصوف نے میڈیا کے ذریعے عوام الناس کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تنہا ہی وہ دین کا فہم رکھنے والا اور بدا شت عہد سے پیش آمدہ جدید مسائل کا حل پیش کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے، حاشا وکلا...... تفہیم دین سے اس خوبصورت عنوان کے ذریعے غامدی صاحب نے یہ منفرد خدمت بھی سرانجام دی کہ اسلاف کی تشریحات پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور اپنی ... کے ذریعے "الحاد" کا دروازہ کھولا۔ اور مادیت جدیدیت سے متاثر ہوکر قرآنی آیات اور احادیث نبویہ ﷺ کی خود ساختہ تشریح کر کے لوگوں کو علماء راسخین سے متنفر کرنے کی سعی لا حاصل کی۔

بلاشبہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں مگر محض اپنی محدود سوچ اور نارسا عقل کو معیار ٹھہرا کر اسلاف امت وائمہ مجتہدین کے بیان کردہ مسلمہ اصولوں سے روگردانی کرنا گمراہی کی پہلی سیڑھی ہے۔

گو فکر خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

جاوید احمد غامدی نے لوگوں کو تبلیغ دین کا تأثر دیتے ہوئے اپنے قلبی رجحان کا یوں اظہار کیا کہ اسلاف امت کی تشریحات سے ہٹ کر اسلام کے مسلمہ اصولوں کی نئی تعبیرات پیش کیں اور اپنے دلفریب انداز گفتگو اور تحریر سے فکری آزادی کا درس دینا شروع کر دیا جس سے سادہ لوح مسلمان اس کے دام تزویر میں آئے اور اسکی تعریف کرنے لگے۔ کاش وہ اسلاف کے بتائے ہوئے اصولوں پر کاربند رہ کر اسی مشن کو آگے بڑھاتے تو اس کے بہتر نتائج سامنے آتے۔

مگر اس نے جب اسلاف وائمہ دین کے ان اصولوں سے اعراض کیا، جن پر پوری امت کا اتفاق چلا آرہا ہے تو اس سے اہل بصیرت بھانپ گئے کہ فرقہ لامذھبیہ کے پرانے شکاری نیا جال لیکر آئے ہیں، جو کہ تفہیم دین کے نام پر تفریق امت کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اور یوں رفتہ رفتہ اسکی اصلیت ظاہر ہوگئی۔ ایسے ہواپرست افراد کے بارے میں ارشاد ربانی ہے!

"أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً" (الجاثیہ:۲۳)

(بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے اور باوجود جاننے بوجھنے کے (گمراہ ہو رہا ہو) اللہ نے (بھی) اسے گمراہ کر دیا اور اسکے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اسکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔)

اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟

بنیادی طور پر یہ ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ غامدی صاحب اور اہل سنت والجماعت کے مابین اختلاف، محض چند فقہی، فروعی مسائل ہی کا نہیں بلکہ دین کی تفہیم وتشریح کیلئے ان کے مابین اختلاف ماخذ دین کا ہے، یعنی دونوں کے ہاں اس کے ماٰخذ ومصادر الگ الگ ہیں۔ جاوید احمد غامدی کا منہج فکر اور طریق استنباط، اہل سنت والجماعت وجمہور امت سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ غامدی صاحب کے ہاں صرف دو ہی ماخذ ہیں: ۱۔کتاب ۲۔سنت

کتاب سے مراد صرف قرآن مجید نہیں بلکہ کلام خدا ہے جس میں تورات، زبور، انجیل اور صحف ابراہیم وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور سنت سے مراد سنت محمد مصطفےٰ ﷺ نہیں بلکہ سنت جو حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہے اور اسمیں انبیاء بنی اسرائیل بھی شامل ہیں۔

جبکہ اہل سنت کے ہاں ماخذ دین کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع امت اور قیاس شرعی ہیں۔ ان کے ہاں قرآن مجید کے علاوہ کوئی کتاب کلام خدا نہیں اور وہ تمام انبیاء کی نبوت وعصمت کے قائل ہونے کے باجود صرف حضرت خاتم النبیین محمد رسول ﷺ کی سنت وشریعت ہی کی پیروی کو اپنی نجات کیلئے کافی ولازم قرار دیتے ہیں اور سابقہ شریعتوں کو منسوخ سمجھتے ہیں۔

جب دونوں طبقات کے ماخذ اور اصول استنباط ہی الگ الگ ہیں تو فروعات کی بحث تو ثانوی حیثیت میں رہ جاتی ہے۔

☆......دوسرے یہ کہ اس نے بیسیوں مسائل میں اسلاف امت سے ہٹ کر دین کی جو نئی تعبیریں پیش کی ہیں، اس سے مغربی تہذیب کے ان اقدار ومقاصد کی تائید ہوتی ہے جو ملحدانہ نظریات پر مبنی ہیں۔

اہل حق کی ذمہ داری:

ایسے حالات میں علمائے حق کی یہ علمی ذمہ داری ہے کہ وہ احقاق حق وابطال باطل کیلئے اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لاتے ہوئے اہل اسلام تک کتاب وسنت کی وہی تعبیر وتشریح پہنچائیں جس پر امت کا اجماعی تعامل چلا آرہا ہے تاکہ لوگ ملحدین کی دھوکہ دہی اور اہل باطل کے دجل وفریب سے بچ سکیں۔ جیسا کہ علمائے حق کے بارے میں ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"قال النبی ﷺ یحمل هذا العلم من کل خلف عدوله ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین" [مشکوۃ: کتاب العلم، مسند الشامیین للطبرانی: رقم الحدیث ۵۹۹]

(نبی کریم ﷺ نے فرمایا! کہ اس علم (دین) کے (ہر زمانہ کے) بعد آنے والے معتبر لوگ حامل ہوں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کے ادل بدل کو اور اہل باطل کے جھوٹ کو اور جاہل کے غلط مطلب کو دور کریں گے)

غامدی صاحب کے نظریات:

غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"(۱)......قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔ دین میں ہر چیز کے رد و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔ ایمان و عقیدہ کی ہر بحث اس سے شروع ہوگی اور اسی پر ختم کر دی جائے گی۔ ہر وحی، ہر الہام، ہر القاء، ہر تحقیق اور ہر رائے کو اس کے تابع قرار دیا جائے گا اور اس کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے گی کہ ابو حنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اس کی حکومت قائم ہے اور اس کے خلاف ان میں سے کسی کی کوئی بھی چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے یہ کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے مفہوم پر بالکل قطعی ہے۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، پوری قطعیت کے ساتھ کہتا ہے اور کسی معاملے میں اپنا مدعا بیان کرنے سے ہرگز قاصر نہیں رہتا۔ اس کا مفہوم وہی ہے جو اس کے الفاظ قبول کر لیتے ہیں، وہ نہ اس سے مختلف ہے نہ متبائن۔ اس کے شہرستان معانی تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ ہے اور وہ اسکے الفاظ ہیں۔ وہ اپنا مفہوم پوری قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ اس میں کسی ریب و گمان کیلئے ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔" [میزان: ۲۵]

ایک اور جگہ غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے، کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔ قرآن کے بعض اسالیب اور بعض آیات کا موقع و محل جب لوگ نہیں سمجھ پائے تو ان سے متعلق نبی ﷺ کے ارشادات کی صحیح نوعیت بھی ان پر واضح نہیں ہو سکی۔" [میزان: ۳۵ طبع ۲۰۱۴ء]

تبصرہ:

حضرات [illegible] محترم [illegible] ام!

[illegible] غامدی صاحب [illegible] کا یہ نظریہ اجماع امت کے [illegible] خلاف ہے۔ [illegible] محدثین [illegible] کا اس بات پر اتفاق [illegible] قرآن [illegible] اور پیغمبر خدا کو اس

کا اختیار وحی ہی کے ذریعہ سے دیا گیا(ا) ''أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ '' (المائدہ:۹۲)

(اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو)

رسول اللہ ﷺ کی مطلق اطاعت امت پر مستقل واجب ہے۔

(ب) ''وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ'' [النحل:۴۴]

(ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کر دو جو ان کے لئے اتاری گئی ہیں، اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔)

احکام قرآن کی تحدید و تخصیص قرآنی حکم میں تغیر و تبدل نہیں بلکہ تبیین ہے۔

(ج) ''مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ''

رسول اللہ کی مطلق اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔

☆......علاوہ ازیں! غامدی صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ قرآن کا ہر ہر لفظ قطعی الدلالۃ ہے......جبکہ اہل سنت والجماعت کے فقہاء کے نزدیک قرآن کا بعض حصہ قطعی الدلالۃ ہے اور بعض ظنی الدلالۃ۔ قطعی الدلالۃ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی دلیل نہیں کہ جو ان الفاظ کے اپنے وضعی معنی پر دلالت میں مانع ہو۔ اگر کوئی دلیل یا قرینہ ہو تو تمام علماء کے نزدیک قرآن کے الفاظ قطعی الدلالۃ ہوں یا ظنی الدلالۃ، ان کو ان کے لغوی وضعی معنی و مفہوم سے پھیرا جا سکتا ہے، وہ دلیل حدیث بھی ہو سکتی ہے اور اثر صحابی بھی، نص قرآنی بھی ہو سکتی ہے اور اجماع امت بھی۔

(۲)......غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ان آیتوں میں ''ان یعرفن فلایؤذین '' کے الفاظ اور ان کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کیلئے الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی جو اوباشوں اور تہمت تراشنے والوں کے شر سے مسلمان عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی''

[میزان:۴۶۸ طبع ۲۰۱۴ء]

تبصرہ:

جبکہ غامدی صاحب کے استاذ و مربی مولانا امین احسن اصلاحی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''(ذلک ادنی ان یعرفن فلا یؤذین) اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کیلئے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اول تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی

نازل ہوئے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں۔" (تدبر قرآن: ۶/۲۷۰ فاران فونڈیشن لاہور طبع ۸ /۱۹۸۰ء)

مولانا امین احسن اصلاحی، جن سے غامدی صاحب نے نظم قرآن کی تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ فرما رہے ہیں کہ اس کو عارضی اور تدبیری حکم سمجھنا غلط ہے اور اسکی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ

"احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں۔"

نیز فقہائے امت نے بھی کتاب وسنت کی تشریح وتفسیر میں یہی اصول پیش کیا ہے۔

"العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب" [شرح التلويح على التوضيح]

کہ اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ سبب نزول کا۔

☆...... یہاں تک کہ غامدی صاحب کے استاذ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی نے بھی یہ لکھا ہے کہ نظم قرآن سے عورت کے چہرے کا پردہ ثابت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"حجاب کے مسئلہ میں تفاسیر اور فقہ میں پوری توضیح موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنا جائز ہے۔ میری رائے میں نظم قرآن پر توجہ نہ کرنے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ ایسی قدیم غلطیوں کا کیا علاج کیا جائے! کون سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری۔ فقہاء اور مفسرین کا گروہ ہم زبان ہے مگر صحابہ اور تابعین زیادہ واقف تھے۔ انہوں نے ٹھیک سمجھا ہے مگر متاخرین حضرات نے ان کا کلام بھی نہیں سمجھا۔ بہر حال الحق احق ان يتبع۔ میں اس مسئلے پر مطمئن ہوں اور میرے نزدیک اجنبی سے پورا پردہ کرنا واجب ہے اور قرآن نے یہی حجاب واجب کیا ہے جو شرفاء میں مروج ہے، بلکہ اس سے قدرے زائد۔"

(ماہنامہ اشراق: ۶۰ مئی ۱۹۹۲ء مولانا حمید الدین فراہی، المورد لاہور)

غامدی صاحب کے دونوں اساتذہ صاحبان کے بقول خواتین کے لیے ابھی بھی چہرے کا پردہ نص قرآنی اور نظم قرآنی سے ثابت ہے، مگر غامدی صاحب کے بقول وہ ایک عارضی وتدبیری حکم تھا لہذا غامدی صاحب اور انکے ہم مسلک افراد کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ غامدی صاحب کا خیال زیادہ درست ہے یا ان کے اساتذہ کا بیان کردہ نظم قرآن کے مطابق پردہ کا حکم؟

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

(۳)......غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

”بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اسی فطرت کا بیان ہے جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔[ہم اگر چاہیں تو ممنوعات کی اس فہرست میں بہت سی دوسری چیزیں بھی اس علم کی روشنی میں شامل کر سکتے ہیں۔ایڈیشن ۲۰۰۲ء] لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، دراں حالیکہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر حدیث سے قرآن کے نسخ یا اسکے مدعا میں تبدیلی کا کوئی مسئلہ پیدا کیا جائے۔“ [میزان: ۳۷ طبع ۲۰۱۴ء]

تبصرہ:

غامدی صاحب کی عبارت سے صاف معلوم ہوا کہ حلال وحرام ٹھہرانے کا اختیار جو اللہ اور اسکے رسول کے پاس ہوتا ہے وہ اختیار مخلوق کو دیا جارہا ہے کہ عام آدمی بھی اپنی فطرت سے جسے چاہے حلال بنادے اور جسے چاہے حرام ٹھہرالے۔حالانکہ کسی بھی ذی فہم سے مخفی نہیں کہ قرآن نے ایسے مشرکین کی بڑی مذمت کی ہے جنہوں نے بعض کھانے کی چیزوں کو حرام ٹھہرالیا۔

”وَحَرَّمُواْ مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ...... “[الانعام: ۱۴۰]

(اور اللہ نے جو رزق انکو دیا تھا اسے اللہ پر بہتان باندھ کر حرام کرلیا ہے۔)

”قُلْ آلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ أَمِ الْأُنثَيَيْنِ......“ (الانعام: ۱۴۳)

(کیا دونوں نروں کو حرام کیا ہے، یا دونوں مادہ کو؟)

”وَلَا تَقُولُواْ لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَـٰذَا حَلَالٌ وَهَـٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُواْ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ“[النحل: ۱۱۶]

(اور جن چیزوں کے بارے میں تمہاری زبانیں جھوٹی باتیں بناتی ہیں، ان کے بارے میں یہ مت کہا کرو کہ یہ چیز حلال ہے، اور یہ حرام ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ پر جھوٹا بہتان باندھو گے۔)

اگر حلت وحرمت کا فیصلہ انسانی فطرت پر ہوتا تو اللہ تعالی مشرکین کے اس فعل کی مذمت نہ فرماتے۔پھر غامدی صاحب نے یہ بھی نہ سوچا کہ اگر حلال وحرام کا تعین انسانی فطرت کرتی ہے تو یہ فیصلہ کون کریگا کہ اختلاف فطرت کی صورت میں کس کی فطرت کا اعتبار ہوگا؟ مثلاً غامدی صاحب موسیقی کو مباح سمجھتے ہیں جبکہ علمائے امت اسے محرمات میں شمار کرتے ہیں......اسی طرح جانور کی حلت کے بارے میں کس کے فیصلہ کا اعتبار ہوگا؟ بہت سارے لوگ اپنی فطرت سے خنزیر کو حلال سمجھتے ہیں اور آج کل فارمی سور کے حلال

ہونے کی باتیں تو عام ہو رہی ہیں۔صرف اہل مغرب ہی نہیں مسلمانوں میں بھی حلت و حرمت کے معیار پر کئی چیزوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔غامدی صاحب نے اس پر بھی کوئی فیصلہ نہیں فرمایا...... پھر تعجب خیز بات یہ ہے کہ صحیح احادیث میں جن چیزوں کو فطرت میں سے کہا گیا ہے ان میں ایک داڑھی رکھنا بھی ہے مگر غامدی صاحب اور ان کے ہم مشرب لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دین کی رو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں ہے۔اور نہ ہی غامدی صاحب نے اسے سنت میں شامل کیا ہے۔یا اسفا......!!

[مقامات:۱۵۵طبع ۲۰۱۰ء۔ براہین:۰۷ ۲ محمد عمار خان ناصر، دارالکتاب لاہور۲۰۱۱ء]

مقام حیرت ہے کہ غامدی صاحب عام انسانوں کو یہ مقام دینے کے تو قائل ہیں اور اپنی فطرت سے بھی احکام قرآنیہ میں تغیر کے قائل ہیں مگر احادیث رسول اور شریعت اسلامیہ کو یہ مقام دینے کو تیار نہیں۔

ع......حیران ہوں یہ شوخی آئی انہیں کہاں سے

بلاشبہ اسلام دین فطرت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے بندوں کو جو احکام دیے ہیں فطرت سلیمہ ان افعال کے کرنے کی طرف ایک فطری رجحان اپنے اندر محسوس کرتی ہے اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کردیا ہے، فطرت سلیمہ بھی اس فعل سے دوری چاہتی ہے۔احکام الٰہیہ فطرت انسانی کے مطابق تو ہیں، لیکن فطرت انسانی سے ان کا تعین نہیں ہوسکتا۔مگر غامدی صاحب فطرت کو مصادر دین میں شامل سمجھتے ہیں اور حلت و حرمت، اور طیبات و خبائث کا فیصلہ فطرت ہی سے کرتے ہیں۔در اصل معتزلہ کا بھی یہی نظریہ تھا کہ وہ بھی شریعت کے احکام کا تعین عقل ہی سے کرتے تھے، جن کا علمائے حق نے اپنی کتب میں جا بجا رد کیا ہے ۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز　　　　کبوتر با کبوتر باز با باز

(۴)......غامدی صاحب کا بیان ہے کہ:

''سیدنا مسیح کے بارے میں جو کچھ قرآن سے میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اٹھا لیا گیا تھا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔یہ میرے نزدیک ان کے منصب رسالت کا ناگزیر تقاضا تھا۔'' [ماہنامہ اشراق:۳۵، اپریل ۱۹۹۵ء]

ایک اور مقام پر غامدی صاحب یوں لکھتے ہیں کہ:

''ظہور مہدی کی روایتیں محدثانہ تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتیں.......... کسی مہدی موعود کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے۔نزول مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھئے تو وہ بھی محل نظر ہیں۔'' [میزان:۱۷۸طبع سوم مئی ۲۰۰۸ء]

تبصرہ:

قارئین کرام! حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غامدی صاحب کا یہ خودساختہ نظریہ کتاب وسنت کے سراسر خلاف اور امت مسلمہ کے اجماعی عقیدہ سے متصادم ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے نزول کا عقیدہ کتاب اللہ کے واضح حکم اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے جس کا انکار کفر ہے۔

☆......نیز غامدی صاحب کا یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے برعکس ہونے کے علاوہ عیسائیت اور قادیانیت کے نظریات کا ہم آہنگ بھی ہے۔اس غیر اسلامی فکر کے ذریعے وہ وحدت ادیان کی تحریک چلا کر اعدائے اسلام کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

☆......اور امام مہدی علیہ الرضوان کے بارے میں بھی غامدی صاحب امت مسلمہ سے الگ کھڑے ہوئے ہیں۔

☆......اہل السنّت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اخیر زمانے میں امام مہدی علیہ الرضوان کا ظہور برحق ہے اور انکا ظہور اس قدر روایات سے ثابت ہے کہ جن پر تواتر معنوی کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔کتب حدیث بشمول صحاح ستہ وغیرہا میں یہ روایات تقریباً (۳۷) صحابہؓ سے مروی ہیں۔

امام مہدی علیہ الرضوان کے متعلق روایات کے بارے میں امام سفارینی فرماتے ہیں کہ خروج مہدی کی روایات اتنی کثرت کے ساتھ موجود ہیں کہ وہ تواتر معنوی کی حد تک پہنچ چکی ہیں اور یہ بات علمائے اہل سنت کے درمیان اس قدر مشہور ہے کہ ان کے عقائد میں شمار ہوتی ہے، لہٰذا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔[شرح عقیدہ سفارینیہ:۸۰/۲]

پس جو شخص امام مہدی علیہ ارضوان کے ظہور کا انکار کرے اس کا یہ انکار احادیث صحیحہ، آثار صحابہ وتابعین اور جمہور علمائے امت کے عقیدہ ومسلک کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر مقبول اور مردود ہے۔

☆......اس عقیدہ کے ضمن میں غامدی صاحب نے دراصل احادیث کا انکار کر کے مستشرقین ومنکرین حدیث کی آشیرباد حاصل کرنے کی ناکام سعی کی ہے۔

غامدی صاحب کی تضاد بیانی:

قارئین کرام!

ہم نے یہاں غامدی صاحب کے افکار ونظریات کی ایک مختصر سی جھلک پیش کی ہے۔ارباب علم ودانش ان کی اصل کتب کی طرف مراجعت کر کے بنظر انصاف خود فیصلہ فرماسکتے ہیں کہ ان کے نظریات

مذہب حقہ اہل السنّت والجماعت سے کس قدر متصادم ہیں۔ پھر طرفہ تماشا یہ کہ ان کے خیالات اور بیانات میں بے حد تضاد پایا جاتا ہے۔

☆......غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

"دین حق جسے اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے اسکے ماخذ کی تفصیل ہم اس طرح کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ دین آپ کے صحابہؓ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے۔ ا:......قرآن مجید۔ ۲:......سنت۔" [میزان ص:۱۳، طبع ۲۰۱۴ء]

مگر ایک اور مقام پر غامدی صاحب یوں لکھتے ہیں!

"قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے وہ یہ ہیں!

ا:......فطرت کے حقائق۔ ۲:...... دین ابراہیمی کی روایت۔ ۳:......نبیوں کے صحائف۔"

[میزان ص:۴۵ طبع ۲۰۱۴ء]

جبکہ غامدی صاحب کے مجلّہ ماہنامہ [اشراق] کے مدیر اور غامدی صاحب کے شاگرد جناب منظور الحسن صاحب کا کہنا یہ ہے کہ [فطرت] غامدی صاحب کے مصادر دین میں شامل ہے۔ وہ غامدی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت کی شرح میں ان کے مصادر دین بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن مجید دین کی آخری کتاب ہے۔ دین کی ابتدا اس کتاب سے نہیں، بلکہ ان بنیادی حقائق سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے روز اول سے انسانی فطرت میں ودیعت کر رکھے ہیں۔ اس کے بعد وہ شرعی احکام ہیں جو وقتاً فوقتاً انبیاء کی سنت کی حیثیت سے جاری ہوئے اور بالآخر سنت ابراہیمی کے عنوان سے بالکل متعین ہو گئے۔ پھر تورات، زبور اور انجیل کی صورت میں آسمانی کتابیں ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے شریعت اور حکمت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے اور قرآن مجید نازل ہوا۔ چنانچہ قرآن دین کی پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب ہے اور دین کے مصادر قرآن کے علاوہ فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی کی روایت اور قدیم صحائف بھی ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کی تالیف "میزان" کے صفحہ ۴۷ پر "دین کی آخری کتاب" کے زیر عنوان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔"

غامدی صاحب نے ایک طرف تو کتاب و سنت کو ماخذ قرار دیا ہے مگر ان کی جو تعریف و ترتیب بیان کی ہے وہ بھی جمہور امت سے ہٹ کر ہے۔ خاص کر سنت کی تعریف جو پیش کی ہے عالم اسلام میں کوئی بھی اسکا ہم نوا نہیں اور دوسری طرف یہ دعوی کرتے ہیں کہ "سنت قرآن کے بعد نہیں، بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔" [میزان ص:۴۷، طبع ۲۰۱۴ء]

وہ قرآن وسنت کے دونوں ماخذات کی تعریف مسلسل بدلتے رہتے ہیں، مثلاً قرآن کے بارے میں انکا موقف یہ ہے کہ قرآن کی آیت کا مفہوم اس کے سیاق سباق میں صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔

[برہان:۲۵۶ سن ۲۰۰۶ء]

قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز گنجائش نہیں ہوتی۔[اصول ومبادی:۵۷ سن ۲۰۰۵ء]

مگر کبھی وہ یہ کہتے ہیں کہ:

''دین کے ماخذات مستقل نہیں ہوتے متغیر ہوتے ہیں، ان میں اصلاح، کمی بیشی، ترمیم وتنسیخ کا عمل جاری رہتا ہے، ماخذات کیلئے معین اصطلاحات لفظاً ظاہراً مستقل ہوتی ہیں جیسے قرآن وسنت لیکن ان کے مطالب ومفاہیم بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں......''

تبصرہ:

چونکہ قرآن وسنت کی تعریف غامدی صاحب کے ہاں بدلتی رہتی ہے اس لیے ۱۹۷۵ سے ۲۰۰۸ تک غامدی صاحب نے پردہ، حجاب سزائے قتل خواتین۔ طلاق، دعوت اتمام حجت مرتدین کی سزا جہاد، خروج، انقلاب، غلبہ دین، استخلاف فی الارض، حدود، زکوٰۃ کی شرح، مشرکین اہل کتاب، بنی اسرائیل کے حوالے سے قرآن کی آیات کے تین تین اور چار چار مختلف معانی بیان کئے اس کی تفصیل غامدی صاحب کی تحریروں برہان سن ۲۰۰۶، اصول ومبادی ۲۰۰۰ء اصول ومبادی ۵ قانون دعوت ۱۹۹۶ء دین کا صحیح تصور سن ۱۹۹۷ء میزن حصہ اول سن ۱۹۸۵، میزان سن ۲۰۰۲ء اور اشراق کے تمام مجلات میں شائع کئے جا چکے ہیں۔

غامدی نظریات مغربی تہذیب کے ہم آہنگ ہیں:

غامدی صاحب کے افکار ونظریات اور ان کی تحریرات مغربی تہذیب کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اہل مغرب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کسی طریقہ سے مسلمانوں میں روح جہاد کو ختم کیا جائے اور اس مقصد کے لیے ایسے افراد کی حمایت وسرپرستی کی جائے جو مسلمانوں کے اندر روح جہاد کو ختم کریں اور انہیں مغرب کے اقتدار کو قبول کرنے کی ترغیب دیں۔ چنانچہ برصغیر میں ان کی اس کاوش کا ایک مہرہ مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی تھا کہ جس نے جہاد کے منسوخ ہونے کا نعرہ لگایا تھا۔ اور بدقسمتی سے موجودہ دور میں غامدی صاحب اہل مغرب کی اس ضرورت کو پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں چنانچہ وہ خود اوران کے تربیت یافتہ افراد جہاد کے مختلف پہلوؤں کی یوں تشریح کررہے ہیں۔

☆......مسلم حکومت کی شکست کی صورت میں مسلمان عوام اور ان کے گروہوں کو جہاد کی اجازت نہیں۔

☆......افغانستان میں ہونے والا جہاد، غامدی صاحب کے نزدیک غلط تھا۔

☆ ..... منکرین حق کے خلاف جنگ اور اسکے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

[میزان: ۵۹۹، طبع ۲۰۱۴ء]

تبصرہ:

غامدی صاحب نے عالمی دنیا سے مرعوب ہو کر اسلامی تصور جہاد کا انکار کر کے مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو ختم کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ وہ کتاب وسنت کی بیسیوں نصوص اور اسلاف کی تشریحات کے برعکس اتحاد بین المذاہب کا درس دیکر اسلامی حمیت کو پامال کرنا چاہتے ہیں۔

☆ ..... اور کبھی غامدی صاحب اہل مغرب سے مرعوب ومتاثر ہو کر یوں لکھتے ہیں کہ:

"کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب ہمارا کام یہی ہے کہ ہم مختلف گروہوں کے عمل وعقیدہ کی غلطی واضح کریں اور جو لوگ نبی کریم ﷺ کی نبوت کو نہیں مانتے انہیں بس غیر مسلم سمجھیں اور ان کے کفر کا معاملہ اللہ پر چھوڑیں۔" [اشراق: ۵۴، دسمبر ۲۰۰۰ء]

تبصرہ:

غامدی صاحب مغربیت سے شدید مرعوبیت کا شکار ہیں اس لیے 'ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ' [التغابن: ۲] (وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مومن) کے فرق کو مٹا کر اتحاد بین المذہب کا درس دینا چاہتے ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ یہود ونصاریٰ اور ہنود کو غیر مسلم تو سمجھتے ہیں لیکن انہیں کافر کہنے کے لیے تیار نہیں جیسا کہ مندرجہ بالا عبارت سے واضح ہو رہا ہے حالانکہ قرآن کریم میں نبی اکرم ﷺ کے انکار کو کفر قرار دیا گیا ہے۔

"فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهِ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ" [البقرۃ: ۸۹]

(تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے پس کافروں پر اللہ کی لعنت)

"وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ" [المائدہ: ۴۴]

(اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔)

مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کر دے اور اسکی

جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کر لے۔ جیسا کہ یہود نے حکم ''رجم'' کے متعلق کیا تھا تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔[تفسیر عثمانی]

غامدی صاحب اور فتنۂ انکار حدیث:

نزول وحی کے زمانہ سے لے کر پہلی صدی ہجری تک صحیح احادیث کو متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا رہا، اسلامی عقائد سے لے کر اعمال و اخلاق تک ہر بات میں کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استدلال درست تسلیم کیا جاتا رہا، حافظ ابن حزم ظاہری (م ۴۵۶ھ) نے ''الاحکام فی اصول الاحکام'' جلد اول، ص ۱۱۴ میں لکھا ہے کہ تمام مسلمان اور اسلام کی طرف منسوب فرقے، اہلِ سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ وغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کو حجت مانتے رہے، یہاں تک کہ پہلی صدی کے آخر میں ''معتزلہ'' ظاہر ہوئے (جن کا پیشوا ''واصل بن عطاء'' تھا) جن کے دماغ پر فلسفہ کے غلبہ کی وجہ سے عقلیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا، انہوں نے آخرت میں دیدار خداوندی، راحت و عذابِ قبر، صراط و میزان، جنت و جہنم وغیرہ جیسے حقائق ثابتہ کا انکار شروع کیا اور اسی سلسلہ میں حجیت حدیث کا مکمل انکار کر دیا، معتزلہ میں ابو اسحاق ابراہیم بن سیار النظام معتزلی (م ۲۳۱ھ) نے احادیث کی حجیت پر سب سے زیادہ اعتراض کیے، یہ ''نظام معتزلی'' مشہور عربی ادیب ''الجاحظ'' کا استاذ اور مناظر تھا، قرآن اور عقل سے ظاہری طور پر مطابقت رکھنے والی حدیثوں کے علاوہ ہر قسم کی احادیث کا منکر تھا، معجزات کا مذاق اڑاتا تھا۔

دورِ حاضر اور مغربی اہلِ علم:

احادیث رسول کو مشکوک ٹھہرانے کے لیے اہلِ مغرب نے سرتوڑ کوششیں کی ہیں اور علم و تحقیق اور بے لاگ تنقید کا لبادہ اوڑھ کر مغربی اہلِ علم نے حدیث کی حیثیت کم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا، چنانچہ ''مسٹر اسپرنگر'' آف جرمنی نے ۱۸۵۱ء میں سیرت نبویؐ پر تین جلدوں میں کتاب لکھی، جس میں حدیث پر کھل کر تنقید کی اور لگی لپٹی کے بغیر دلِ ماؤف کی بھڑاس نکالی، جرمن مستشرق مسٹر ''گولڈ زیہر'' نے مغربی مصنفین میں سب سے زیادہ کام حدیث پر کیا، ان کی کتاب محمڈن سٹڈیز ۱۸۹۱ء (Muhammadan Studi s) ''محمدی تعلیمات'' کی دوسری جلد میں حدیث پر تفصیلی بحث کی گئی ہے، بعد کے تمام مستشرقین نے گولڈ ز۔ کو اپنا امام تسلیم کیا ہے اور اس کی کتاب سے خوشہ چینی کی ہے۔ پروفیسر شاخت نے اپنی کتاب The Origins of Muhammadan Juris uelence میں اس کام کو آگے بڑھایا اور حدیث نبویؐ کی حیثیت کو مشکوک قرار دیا۔ پروفیسر ''مارگولیتھ'' نے اپنی کتاب

Muhammadan and Muhamadanism ”محمد اور محمدیت“ میں تعصب کی نادر مثالیں قائم کیں، بعد میں انہی مغربی اہلِ علم کے اثرات دیگر ممالک مصر و پاک و ہند میں پہنچے، سرسید احمد خان، علامہ مشرقی، ڈاکٹر احمد دین، عبداللہ چکڑالوی، اسلم جیراجپوری، غلام احمد پرویز، طٰہٰ حسین، تمنا عمادی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے لوگوں نے اطراف عالم میں انکار حدیث کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ موجودہ زمانے میں جاوید احمد غامدی صاحب بھی اسلام کی تفہیم کے نام پر احادیث کی حیثیت کو کمزور کرنے اور اسکی اہمیت کو مشکوک بنانے کی فکر میں مصروف کار ہیں۔ چنانچہ عقیدہ حیات مسیح وظہور امام مہدی کے متعلق غامدی صاحب نے احادیث کا انکار کر کے دراصل مستشرقین ومنکرین حدیث کی اشیر باد حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے جب کہ وہ امام امین احسن اصلاحی کے شاگرد اور ان کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ حضرات اہل علم سے تو یہ بات مخفی نہیں کہ اگر امام اصلاحی صاحب کی تحریرات کو بنظر غائر دیکھا جائے تو ان سے بھی انکار حدیث کی بو آتی ہے۔ حجیت حدیث کے بارے میں جو کمزور موقف استاد اصلاحی نے اختیار کیا، شاگرد غامدی اسی کو پروان چڑھانے میں شب و روز کوشاں نظر آتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذالک) چنانچہ غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ”نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔“ [میزان ص:۶۱ طبع ۲۰۱۴ء]

حجیتِ حدیث کے قرآنی دلائل:

قرآن پاک کی ان گنت آیات سے واضح ہوتا ہے کہ رسول پاک ﷺ کا قول وفعل اور تقریر وتصویب بلکہ آپ کی پوری زندگی شرعی حجت ہے۔ جس کیلئے درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں!

۱......آنحضرت ﷺ امت کیلئے حکم اور فیصل ہیں۔

”فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ“ (النساء:۶۵)

(نہیں، (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اسوقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصل نہ بنائیں۔)

۲......آپ کتاب اللہ کے معلم ہیں۔

”وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ“ (البقرۃ:۱۲۹)

(انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے)

۳......رسول اللہ کے فیصلے کے بعد کسی ایماندار کو اس کیخلاف کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔

''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ'' [الاحزاب:۳۶]

(اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کردیں تو نہ کسی مومن مرد کیلئے گنجائش ہے نہ کسی مومن عورت کیلئے کہ ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہے۔)

۴......رسول اللہ ﷺ کی زندگی امت کیلئے بہترین نمونہ ہے۔

''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' [الاحزاب:۲۱]

(حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے۔)

۵......ہدایت آپ کی اطاعت سے وابستہ ہے۔

''وَإِن تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا'' [النور:۵۴]

(اگر تم انکی فرماں برداری کروگے تو ہدایت پاجاؤگے)

۶......رسول اللہ ﷺ قرآن کے مبیّن ومفسر ہیں۔

''وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ'' [النحل:۴۴]

(ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لیے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو!)

۷......حلال وحرام بتانا آپ ﷺ کے منصب میں شامل ہے۔

''الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوباً عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ'' [الاعراف:۱۵۷]

(وہ جو (محمد) رسول (اللہ) کی جو نبی امی ہیں پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔وہ انہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان (کے سر) پر (اور گلے میں) تھے اتارتے ہیں۔)

۸......رسول اللہ کا حکم، درحقیقت اللہ ہی کا حکم ہوتا ہے۔

''مَاقَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْتَرَكْتُمُوهَاقَائِمَةً عَلَى أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ'' [الحشر:۵]

(تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے، یا انہیں اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب اللہ کے حکم سے تھا اور اس لئے تھا تاکہ اللہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔)

۹......رسول کی بعثت کی غرض یہی ہے کہ لوگ اللہ کے حکم کے موافق اسکی اطاعت کریں۔

''وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ'' [النساء:۶۴]

(اور ہم نے رسول اس کے سوا کسی اور مقصد کیلئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔)

۱۰......آپ ﷺ کی اطاعت بعینہٖ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

''مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ'' [النساء:۸۰]

(جو شخص رسول کی فرمانبرداری کریگا تو بیشک اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی۔)

۱۱......آپ ﷺ کی مخالفت کرنا جہنم کو دعوت دینا ہے۔

''وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى......'' [النساء:۱۱۵]

(اور جو شخص اپنے سامنے ہدایت واضح ہونے کے بعد بھی رسول کی مخالفت کرے۔)

۱۲......پیغمبر کی حکم عدولی کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا پیش خیمہ ہے۔

''فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَن تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ'' [النور:۶۳]

(لہٰذا جو لوگ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، ان کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان پر کوئی آفت نہ آپڑے۔)

۱۳......جو کچھ آپ دیں اسے لینا اور جس سے منع کریں اس سے رکنا واجب ہے۔

''وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا'' [الحشر:۷]

(اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو!)

۱۴......نیز اس آیت کے بارے میں غور کیجئے!

''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا'' [النساء:۵۹]

(اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اسکے رسول کی بھی اطاعت کرو اور تم میں سے جو لوگ صاحب اختیار ہوں، انکی بھی۔ پھر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اگر واقعی تم اللہ اور یوم

آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور اسکے رسول کے حوالے کر دو۔ یہی طریقہ بہتر ین ہے اور اسکا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔)

(ا)......یعنی حکام یا علماء مجتہدین کی اطاعت لازم ہے یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ آیت کریمہ میں اطاعت الٰہیہ کی طرح اطاعت رسول کیلئے "أَطِيعُوا" کا لفظ مستقل لایا گیا ہے اور "أُولِي الْأَمْرِ" کی اطاعت کیلئے مستقل صیغہ نہیں لایا گیا، اس فرق سے واضح ہوا کہ رسول ﷺ کی اطاعت، اطاعت خدا کی طرح بالاستقلال لازم ہے اور "أُولِي الْأَمْرِ" کی اطاعت مستقل لازم نہیں بلکہ وہ پہلی دو اطاعتوں کے تابع ہے، اس سے پرویزی گروہ کی غلطی واضح ہوئی جو کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اطاعت بحیثیت "أُولِي الْأَمْرِ" کے تھی۔

(ب)......"أُولِي الْأَمْرِ" سے تنازع اور اختلاف ہو سکتا ہے مگر اللہ اور اسکے رسول اللہ ﷺ سے اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

(ج)......تیسری یہ بات واضح ہوئی "أُولِي الْأَمْرِ" سے اختلاف کے بعد اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ اللہ کیطرف مراجعت سے مراد اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کی طرف رجوع کرنا ہے، ایسے ہی رسول پاک ﷺ کیطرف مراجعت کرنے کا مطلب آپ ﷺ کی تعلیمات کیطرف رجوع کرنا ہے خصوصاً آپ ﷺ کی وفات کے بعد۔

۱۵......دینی امور میں آپ ﷺ کی ہر بات حجت ہے۔

"وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَى" [النجم:۳/۴]

(اور یہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔)

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"یعنی کوئی کام تو کیا، ایک حرف بھی آپکے دہن مبارک سے ایسا نہیں نکلتا جو خواہش نفس پر مبنی ہو، بلکہ آپ ﷺ جو کچھ دین کے باب میں ارشاد فرماتے ہیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی وحی اور اسکے حکم کے مطابق ہوتا ہے، اُس میں وحی متلو کو 'قرآن' اور غیر متلو کو 'حدیث' کہا جاتا ہے۔"

ضرورتِ حدیث:

بے شک قرآن پاک ایک مکمل ضابطہ حیات ہے لیکن اسکی حیثیت دستور کی سی ہے، دستور اصول وقواعد کے مجموعہ کا نام ہے، قرآن پاک میں دین کے اصول اور فلاح دارین کے متعلق ضروری امور تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ باقی جزئیات [illegible] سے خاموش ہے۔ کوئی دستور بغیر تفصیلی

جزئیات کے عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ یہ تفصیل حدیث نبوی ﷺ، اجماع امت اور قیاس شرعی سے حاصل ہوتی ہے،، الغرض کتاب اللہ اسلام کا مکمل دستور ہے اور سنت رسول اس کی جامع تشریح۔ اس آیت میں مکمل اشارہ ہے کہ:

''وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ'' [النحل:۴۴]

(اے پیغمبر! ہم نے تم پر بھی یہ قرآن اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے ان باتوں کی واضح تشریح کردو جوان کیلئے اتاری گئی ہیں اور تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں)

صحابہ کرامؓ قرآن پاک کے متبادر مفہوم سے بخوبی واقف تھے، اس کے باوجود قرآن دانی وقرآن فہمی میں بار بار حضور ﷺ کی طرف رجوع کرتے تھے۔

علامہ ابن قیم نے ''اعلام الموقعین ۴/۲۳۰ تا ۳۴۱'' تقریباً ایک سو دس صفحہ تک صحابہ کرامؓ کے سینکڑوں دین کے بارے میں سوالات اور حضور ﷺ کے جوابات نقل کئے ہیں۔ من شاء فلیراجع الیہ...... ۔

خلاف پیغمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

مولانا مدثر جمال تونسوی

جاوید احمد غامدی اور دینی مدارس

نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

"یحمل هذا العلم من كل خلف عدوله ينفون عنه تحريف الغالين و انتحال لمبطلين و تاويل الجاهلين[مشكوة، كتاب العلم] اس علم دین کو ہر آنے والی نسل میں سے عادل لوگ حاصل کریں گے جو اس سے غلو پسند لوگوں کی تحریفات کو، اہل باطل کے جھوٹے انتسابات کو اور جاہلوں کی تاویلات کو دور کریں گے۔"

اس حدیث سے دو باتیں خاص طور سے معلوم ہوتی ہیں:

(۱)......علم دین، اور اس کی تعبیرات و تشریحات وہی معتبر ہیں جو امت مسلمہ کی مسلمہ و مسلسلہ علمی روایت سے جڑی ہوئی ہوں، گویا علم دین ایک رسی ہے جس کا ابتدائی سرا جناب نبی کریم ﷺ کے دست مبارک میں ہے اور انتہائی سرا قیامت تک دراز کر دیا گیا ہے، اِس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر آنے والا دور اپنے گزشتہ دور کے ساتھ اِس تسلسل کے ساتھ جڑا ہوا ہو کہ ماضی میں جا کر اُس کا تعلق جناب نبی کریم ﷺ کے ساتھ جڑ جائے۔ اِسی وجہ سے اہل حق اور نجات یافتہ گروہ کو "اہل السنۃ والجماعۃ" کہا جاتا ہے کہ یہ وہ گروہ ہے جو علم دین کے باب میں کوئی خودرو پودا نہیں ہوتا بلکہ اِن کا علمی سلسلہ نبی کریم ﷺ کی سنت اور اُس سنت کے اولین حاملین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔

شیخ المجاہدین و امام المحدثین حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول اہل علم کے نہ صرف یہ کہ معروف و متداول ہے بلکہ قبولیت کی اعلیٰ سند پا چکا ہے کہ:

"إن هذا العلم دين فانظروا عمن تأخذون دينكم؟ فإذا قيل من حدثك بقي![الإسناد من الدين للشيخ عبدالفتاح أبي غدة] یہ دین کا علم خود دین ہے، چنانچہ تم غور کر لیا کرو کہ اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو؟ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کسی بھی بات کو بیان کرنے والے سے یہ پوچھا جائے گا: کہ تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟ تو اس طرح یہ دین بچ جاتا ہے۔"

یعنی جب کوئی شخص دین کی اپنی من مانی تعبیر و تشریح پیش کرے گا تو وہ اس پر کوئی ایسی دلیل اور حوالہ پیش کرنے سے عاجز ہوگا کہ جس کا انتساب "سنت" اور "جماعت" کی طرف ہو تو لامحالہ اس کی رہ نئی تعبیر و تشریح مردود ہوگی اور اس طرح دین میں کوئی کمی و بیشی نہ ہو سکے گی اور یہی دین کی حفاظت ہے۔

(۲)......دوسری بات درج بالا حدیث سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر زمانے کے معتبر اہل علم کا صرف یہ کام نہیں

کہ وہ دین کی مستند اور معتبر تشریح و تعبیر کے بیان پر اکتفاء کریں، بلکہ اِس سے بڑھ کر اُن کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ دین کے نام پر ہونے والی غلط تعبیرات اور تشریحات کا بھرپور رد کریں، چنانچہ جو غلو کا شکار ہو کر دین میں تحریف کر رہا ہے تو اُس کا بھی مقابلہ کریں، جو باطل پرست ہو کر اپنے باطل عقائد و نظریات کو جھوٹ کا سہارا لے کر دین کی طرف منسوب کر رہا ہے اُس کی دسیسہ کاریوں کا پردہ پوری قوت سے چاک کر دیں اور جو جہالت کی وجہ سے دین میں جاہلانہ تاویلات کر کے دین کا چہرہ مسخ کر رہا ہو اُس کی تاویلات کے مسترد کر دیں اور پھر اِس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی حفاظت کرنے والا علماء کا یہ طبقہ ہر زمانے میں موجود رہے گا۔

الحمد للہ! اس دور میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے اکابر علماء دیوبند کو اس خاص نسبت سے سرفراز فرمایا اور ... پاس امت کی مسلمہ اور مسلسل علمی روایت کے ذریعے سے جو دین اور علوم دین پہنچے تو انہوں نے ... علوم کی تعلیم و ترویج کا ایسا چراغ روشن کیا کہ اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے اور اسی کے ساتھ گمراہ ... باطل پرست فرقوں کی سرکوبی کے میدان میں ایسی جلیل القدر خدمات سرانجام دیں کہ ہر باطل پرست منہ چھپانے پر مجبور ہو گیا۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔

علماء دیوبند نے علوم دین کی ترویج اور دفاعِ دین کے لیے جس سلسلے کو بام عروج تک پہنچایا وہ دینی مدارس ہیں اور آج دینی مدارس کی خدمات کا دائرہ کار بلاشبہ وہاں وہاں تک پہنچ چکا ہے کہ دشمنانِ اسلام اس کا تصور کر کے ہی کانپ اٹھتے ہیں۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب دینی علوم میں اپنی رائے زنی اور اپنی آراء پیش کرنے، نیز سرکاری سرپرستی کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف نے اب تک جو شہرت حاصل کی ہے وہ کسی مثبت دینی خدمات کا ثمر نہیں بلکہ علماء کرام، دینی مدارس اور امت میں ایک تسلسل کے ساتھ چلے آنے والی دینی تعبیرات اور عقائد و نظریات کو منفی انداز میں پیش کرنا ہے۔ موصوف کی تمام جدوجہد کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت امت میں جتنے بھی علمی سلسلے اور دینی تعبیرات موجود ہیں بلکہ چودہ صدیوں سے ہی تعبیرات چلی آرہی ہیں وہ سب حرفِ غلط کی مانند ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اِسی لیے موصوف کے ہاں، کتاب اللہ سے لے کر سنت تک اور دین کے مآخذ سے لے کر دینی تعبیرات تک ہر چیز کا نیا معنیٰ نظر آتا ہے۔ گویا اگر یہ کہا جائے کہ غامدی صاحب ایک ''نیا اسلام'' ایجاد کر رہے ہیں تو ... بے جا نہ ہوگا۔

یہ صرف ہمارا دعویٰ نہیں ... میں اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہتا ہوں کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کے بارے میں بھی کوئی ایسی بات کہوں جو حقیقت کے خلاف ہو، بلکہ غامدی صاحب کا اپنا طرز عمل اور فکری ادعاء اس حقیقت کا گواہ ہے۔ اسی وجہ سے موصوف نے قرآن فہمی کے لیے جو انداز اپنایا ہے اور قرآن فہمی کے لیے

اس مختر عہ انداز کو "قطعیت" کا درجہ دیا ہے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اب تک چودہ صدیوں سے امت نے مجموعی حیثیت سے قرآن فہمی کا جو ذخیرہ فراہم کیا ہے وہ سب مجموعی حیثیت سے نا قابل اعتبار ہے۔ مجموعی حیثیت کی قید اس لیے لگائی کہ غامدی صاحب جزوی معاملات میں محض اپنی رائے کی تقویت کے لیے اس گزشتہ علمی ذخیرے سے بہر حال استفادہ کرتے ہیں، جس سے یہ دھوکہ بھی ہوتا ہے کہ شاید وہ اسے معتبر سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں بلکہ وہ محض اس لیے بعض سے جزوی استفادہ کرتے ہیں کہ وہ ان کی من گھڑت آراء کے لیے کسی نہ کسی درجے میں باعث تقویت ہوتے ہیں۔ اسی طرح موصوف نے "سنت" کے باب میں جو نت نیا دعوی کیا ہے، اُس سے ماضی میں تسلسل کے ساتھ چلا آنے والا سنت کا تصور یکسر باطل اور غلط ٹھہرتا ہے۔ اب آپ خود ہی بتایئے جب قرآن اور سنت کے لفظ تو استعمال کیے جائیں لیکن اس میں معانی وہ ڈالے جائیں جو چودہ صدیوں سے چلے آنے والے مسلسل علمی حقائق کے برخلاف ہوں تو اس سے جو عمارت قائم ہو گی اسے "غامدی صاحب کا نیا اسلام" کا نام نہ دیا جائے تو اور کیا کہا جائے؟؟

الغرض غامدی صاحب اور اُن کے افکار و نظریات ایک خودرو پودے کی حیثیت رکھتے ہیں اور اب وہ چونکہ یہ چاہتے ہیں کہ انہیں سند قبولیت حاصل ہو جبکہ دینی مدارس علم کا وہ سر چشمہ ہیں جن کا سرا مسلسل سند کے ساتھ چلتا ہوا "سنت و جماعت" تک پہنچتا ہے اور اسی مورچے سے غامدی صاحب کی ایجاد کردہ نئی عمارت کو خطرات لاحق ہیں تو غامدی صاحب نے بھی حسب فطرت اپنے دفاع کے لیے دینی مدارس کے کردار کو نشانہ بنایا ہے اور انہیں یکسر نا قابل اعتبار اور نا قابل اعتناء بتایا ہے۔

موصوف کی کتاب "مقامات" میں "ہماری تعلیم" کے عنوان کے ضمن میں دینی مدارس پر کچھ خامہ فرسائی فرمائی ہے اور خود غامدی صاحب اور ان کے متعلقین و تلامذہ غامدی صاحب کے اُن تاثرات کو اس قدر قابل اعتبار سمجھتے ہیں کہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی انہیں دینی مدارس کے عنوان پر بات کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ انہی تاثرات کو پوری قوت کے ساتھ دھراتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ ان تاثرات کو حتمی اور قطعی سمجھتے ہیں۔ اور ان تاثرات میں غامدی صاحب نے دینی مدارس کے کردار پر جو تین نشانات لگائے ہیں وہی حتمی ہیں، ایسے حتمی اور قطعی کہ اب اگر خود دینی مدارس والے جتنا بھی کہتے رہیں کہ جناب والا! آپ کی یہ باتیں غلط ہیں، آپ کے یہ تاثرات غلط ہیں، اور اس باب میں ہم اہل مدارس کی بات ہی زیادہ معتبر ہو گی نہ کہ آپ کی جن کا دینی مدارس سے کوئی تعلق نہیں، تب بھی وہ حضرات ایسی کسی صفائی کو ماننے سے انکاری نظر آتے ہیں، اس کی حقیقی وجہ وہی ہے جس کا اوپر اشارہ کیا کہ غامدی صاحب جس نئے اسلام کو متعارف کرانا چاہتے ہیں اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی دینی مدارس اور اس سے وابستہ علماء کرام

ہیں، تو غامدی صاحب اوران کے متعلقین کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ دینی مدارس کو ناقابل اعتبار ٹھہرائیں یا انہیں ختم کرائیں! علاوہ ازیں جب بنیادی طور پر خود غامدی صاحب کی اپنی راہ میں رکاوٹ بھی دینی مدارس ہیں اور اُدھر دشمنانِ اسلام کی فکری اور مادی جارحیت کے مقابلے میں سد سکندری کا کردار اَدا کرنے میں بھی یہ دینی مدارس شامل ہیں تو لامحالہ وہ لادین قوتیں ایسے افراد کو اپنے مقاصد کے لیے نہایت موزوں خیال کرتی ہیں جو اپنی ذاتی وجوہات کے پیش نظر دینی مدارس سے خار رکھتے ہوں، اِس لیے وہ ان شخصیات اوران کے اداروں کی پشت پناہی کرتی ہیں، تب اس پشت پناہی کے بدلے میں وہ بھی ان سے دینی مدارس کے خلاف آواز بلند کراتی ہیں۔ چنانچہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ غامدی صاحب کی مدارس پر ہونے والی تنقید اور جارحیت کی وجوہات میں ان کی ذاتی وجوہات کے علاوہ عالمی کفریہ طاقتوں کی ہموائی بھی شامل ہے اور اگر غامدی صاحب خلوص کے ساتھ اپنے اس رویے پر نظر ثانی کریں تو انہیں یہ حقیقت صاف نظر آجائے گی، مگر فی الحال ایسا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ لعل اللہ یحدث بعدذلک امرا

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ غامدی صاحب نے اپنی کتاب مقامات میں دینی مدارس پر کچھ اعتراضات کیے ہیں جس سے دینی مدارس کے بارے میں ان کے نکتہ نظر کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے اور اِس مضمون میں ہمارا بنیادی روئے سخن بھی اسی طرف ہے، تو اب تمہید سے گزر کر اس موضوع کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں غامدی صاحب نے دینی مدارس پر جس قدر فردِ جرم عائد کی ہیں ان میں کتنی حقیقت ہے؟؟

یہ بھی وضاحت کردوں کہ اِس وقت اُن کی کتاب ''مقامات'' کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے وہ طبع اول کا نسخہ ہے جس پر سنہ اشاعت ''نومبر ۲۰۰۸ء'' تحریر ہے اور ناشر کے طور پر ان کے ادارے ''المورد'' کا نام درج ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۷۵ پر ''ہماری تعلیم'' کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے جس کے آخر میں (۱۹۸۷ء) درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ مضمون بہت پہلے کا تحریر کردہ ہے مگر ۲۰۰۸ء میں شائع ہونے والی کتاب میں اس کو شامل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اِس وقت بھی وہ اپنی اس سوچ پر اسی طرح قائم ہیں جو انہوں نے کئی سال قبل قائم کی تھی۔ اِس لیے اس کے مندرجات کو بہت پرانی تحریر کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔

غامدی صاحب نے اس مضمون میں دینی مدراس اور عصری تعلیمی اداروں دونوں پر تبصرہ کیا ہے مگر ہمارا روئے سخن ان کے مضمون کے صرف اس حصے تک محدود رہے گا جو حصہ دینی مدارس سے متعلق ہے۔

غامدی صاحب نے اس مضمون میں دینی مدارس پر جو فردِ جرم عائد کی ہیں ہم نمبر وار ان کا جائزہ لیتے ہیں۔

دینی مدارس پر غامدی صاحب کی پہلی فردِ جرم اور حقیقت:

غامدی صاحب اپنے مضمون میں پہلا جرم گنواتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

'' پہلے دینی مدارس کو لیجیے۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ تقلید کے اصول پر قائم ہوئے ہیں۔ ان

میں یہ بات پہلے سے طے کر دی جاتی ہے کہ حنفی ہمیشہ حنفی رہے گا اور اہل حدیث کو ہر حال میں اہل حدیث ہی رہنا ہے۔ اپنے دائرے سے باہر کے اہل علم کی کسی تحقیق اور رائے کے بارے میں یہ تصور بھی ان کے ہاں ممنوعات میں سے ہے کہ وہ صحیح ہو سکتی ہے"

غامدی صاحب کی عائد کردہ یہ فردِ جرم اِس بات کی بیّن ثبوت ہے کہ موصوف یا تو تقلید کی حقیت کی سے بالکل جاہل ہیں یا اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ کیوں کہ تمام اہل علم کے ہاں یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ تقلید کا تعلق فروعات سے ہے، مجتہد فیہ مسائل سے ہے، اور تقلید اسلام کے متوازی کسی شئے کا نام نہیں ہے، بلکہ دائرہ اسلام میں داخل ایک جزو کا نام ہے۔ جن اِصحاب کو تقلید کے بارے میں معلومات مطلوب ہوں وہ امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کی کتاب مستطاب "الكلام المفيد فی إثبات التقليد" یا استاذِ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی کتاب "تقلید کی شرعی حیثیت" ملاحظہ فرمائیں۔ الغرض جب یہ طے ہے کہ تقلید' اسلام کے متوازی کسی چیز کا نام نہیں بلکہ اس کا ایک جزو ہے تو اگر یہی بات مان لی جائے کہ دینی مدارس کی بنیاد تقلید کے اصول پر رکھی جاتی ہے تو اس میں شرعاً کون سی قباحت ہے؟ کیا غامدی صاحب تقلید کے سرے سے منکر ہیں؟ اور کیا خود غامدی صاحب نے اپنے علمی حلقے اپنے استاذ اصلاحی اور دادا استاذ فراہی صاحب کی تحقیقات اور تعبیرات کے اصول پر قائم نہیں کیے؟؟ کیا غامدی صاحب کے ہاں جو مقام اپنے استاذ اصلاحی صاحب کا ہے وہ اس مقام پر یا اس کے قریب قریب ہی سہی کسی اور کو فائز کرتے ہیں؟ بلکہ ان کی تحریر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ان کے علاوہ دیگر معاصر علماء کو خاص کر علماء دیوبند کو ایک وجودِ کہنہ سمجھتے ہیں جو اَب گرا کہ تب گرا۔ اِسی لیے علماء دیوبند کے بارے میں اسی کتاب کے صفحہ ۶۰ پر لکھا ہے:

> "اب اِس وقت دیکھیے، پہلے گروہ (علماءِ دیوبند۔[ناقل]) کی عمر پوری ہو چکی۔ اِس کی مثال اب اُس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی (اس کے کچھ سطور بعد اپنے سلسلہ علمی یعنی فراہی و اصلاحی اور خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔[ناقل]) آنے والے دور کی امامت "دبستان شبلی" کے لیے مقدر ہے۔ تاریخ کے مرحج پر اب پس پردہ اسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے۔"

اس تحریر میں غامدی صاحب نے علماء دیوبند اور ان کے پورے علمی سلسلے کو جو آج بھی پوری آب وتاب سے پوری دنیا میں اپنی روشنی بکھیر رہا ہے اور اپنے تو کیا خود دشمن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں، مگر غامدی صاحب نے تعصب کی عینک لگا کر نصف النہار کی طرح روشن حقیقت کو اپنے دو لفظ "فرسودہ عمارت" کے تحت چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے تو کیا یہ علمی اور سنجیدہ طرزِ گفتگو ہے؟؟

چلیں! علماء دیوبند کو آپ فرسودہ عمارت کہیں یا نہ کہیں، آپ کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ مگر اسی کے

ساتھ موصوف نے یہ بھی واضح کر دیا کہ اب دین کی ایک نئی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور غامدی صاحب کی ساری دوڑ دھوپ اسی کے لیے ہے، اور علماء دیوبند یا دینی مدارس سے شکوہ وشکایت کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ اس عمارت کی تعمیر میں رکاوٹ ہیں!!

علاوہ ازیں یہاں جو بات تھی کہ موصوف مستقبل میں امامت کا سہرا اپنے دبستان کے سر باندھ رہے ہیں تو کیا یہ اسی تقلید کی دعوت بلکہ عالمگیر تقلید کی پیشین گوئی نہیں جس کو موصوف دینی مدارس میں جرم بتلا رہے ہیں؟؟ کیوں کہ امامت میں سب لوگ تو امام ہوتے نہیں بلکہ ایک دو ہی ہوتے ہیں اور باقی مقتدی و مقلد؟؟ عجیب بات ہے کہ اگر دینی مدارس والے مثلاً امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو امام کہہ کر ان کی تقلید اور ان سے رشتہ محبت اور تعلق استفادہ قائم کریں تو جرم اور سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی خرابی کہا جائے مگر غامدی صاحب اپنے دبستان کو "امامت" کے منصب پر فائز کریں اور آنے والی نسلوں کو اس سے وابستہ رکھنے کے خواب دیکھیں تو یہ ان کے لیے اعزاز؟؟

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی　　　وہ تیرگی جو میرے نامہ سیاہ میں تھی

عرب اس موقع پر کہتے ہیں:

تجر بائک وبائی لاتجر؟

واہ بھئی واہ! آپ کی "با" تو جر دے اور میری "با" جر نہ دے؟؟

اسی طرح غامدی صاحب! آپ کے دبستان کو "امامت" ملے تو حسن وخوبی اور احناف، یا شوافع وغیرہ کو "امامت" ملے تو یہ جرم؟؟

الغرض: جب اہل علم میں رائج تقلید جرم ہے ہی نہیں تو اس کو جرم بنا کر پیش کرنا غامدی صاحب کی محض اپنی اپج اور فضول الزام کے سوا کچھ نہیں، اور پھر الزام بھی ایسا جس میں خود سر تا قدم ڈوبے ہوئے ہیں، اسے کہتے ہیں: دیگراں را نصیحت خود میاں فضیحت!

پھر جب اہل علم میں رائج تقلید مذموم ہی نہیں تو اگر کوئی حنفی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ تمام عمر حنفی ہی رہے گا تو اس میں کون سی قباحت ہے؟ غامدی صاحب بھی تو عزم بالجزم کئے بیٹھے ہیں کہ انھوں نے تاحیات "دبستانِ شبلی" ہی سے وابستہ رہنا ہے۔

غامدی صاحب نے یہ بات بھی کہی تھی کہ: "اپنے دائرے سے باہر کے اہل علم کی کسی تحقیق اور رائے کے بارے میں یہ تصور بھی ان کے ہاں ممنوعات میں سے ہے کہ وہ صحیح ہو سکتی ہے" تو جناب! یہ بھی آپ کا محض الزام ہے، یہ امت ہمیشہ باہمی مسلک کے تنوع اور اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے استفادہ کرتی چلی آئی ہے، آج بھی انہی دینی مدارس میں صرف حنفیوں کی کتابیں نہیں پڑھائی جاتیں بلکہ

شافعیہ، مالکیہ اور اصحاب حدیث تقریباً سب ہی کی کتابیں شامل نصاب ہیں، کتب تفاسیر ہوں یا کتب حدیث اس میں اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک سے وابستہ ہر مکتب فکر کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے اور فقہ میں فقہ حنفی کو ترجیح تو دی جاتی ہے جو شریعت ہی کے اصولوں پر قائم ہے لیکن دوسروں کی نفی ہرگز نہیں کی جاتی ہے اور یہی توسط اور اعتدال کی راہ ہے جس سے خود غامدی صاحب محروم ہیں کیوں کہ وہ اس وقت باقی تمام علمی سلسلوں کو نفی کر کے ہی اپنے دبستان کو اسلام، قرآن اور سنت کا حقیقی ترجمان قرار دیتے ہیں اور اپنے دائرے سے باہر کسی کو بھی قبول نہیں کرتے بلکہ ان کے خاتمے کے خواب بھی دیکھ چکے ہیں!

☆......☆......☆......☆

اسی درج بالا فرد جرم کے ضمن میں اہل مدارس پر ایک اور بھی فرد جرم عائد کی ہے جو یوں ہے:

"کوئی شخص اِن مدارس میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اُس کے اکابر کی کوئی رائے اور تحقیق بھی کسی مسئلے کے بارے میں غلط ہوسکتی ہے۔"

حقیقت پسند اہل علم بخوبی جان لیں گے کہ غامدی صاحب کی یہ بات بھی حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ ہاں اگر ان کی مراد سے کچھ غیر پختہ لوگوں کا رویہ ہے تو وہ ہر جگہ اور ہر شعبے میں موجود ہوتے ہیں لیکن اگر اکابر مدارس اور محققین کے بارے میں یہ تبصرہ ہے تو بالکل فضول ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ علمی مسائل دو قسم کے ہوتے ہیں:

۱......اُصول وعقائد اور نظریاتی مسائل ۲......فقہی، فروعی اور اجتہادی مسائل

اِن میں سے اول الذکر قرآن وسنت کی نصوص سے قرن اول میں ہی متعین ہو چکے ہیں اِس لیے اس میں کسی بھی مخالف نئے نظریے اور نئی رائے کی گنجائش نہیں، جبکہ ثانی الذکر کا تعلق ہر زمانے میں پیش آنے والے غیر منصوص غیر مجمع علیہ عملی مسائل سے ہے اور عملی مسائل ہر شخص، ہر علاقے اور ہر زمانے کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں تو اس میں اجتہاد کی پوری گنجائش ہوتی ہے، چنانچہ اِن مسائل کو فروعی یا اجتہادی مسائل کہا جاتا ہے اور اِس باب میں ہر دور کے علماء نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اگر اِس میں دو رائیں سامنے آجائیں تو کسی کو بھی سو فیصد غلط نہیں کہا جائے گا بلکہ ہر مجتہد اپنے اجتہاد کو محض ترجیح دے گا اور ساتھ میں دوسرے کے اجتہاد کی گنجائش چھوڑ دے گا اور کسی بھی اجتہاد پر عمل کرنے والے کو مطعون نہیں کیا جائے گا۔ اَب غامدی صاحب کا یہ فرمانا کہ مدارس والے اپنے اکابر کی کوئی رائے اور تحقیق جو کسی بھی مسئلے سے متعلق ہو اس میں غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے محض الزام نہیں تو اور کیا ہے؟؟ نیز کیا خود غامدی صاحب کی جو آراء صریحاً دیگر معاصر علماء کے مخالف ہیں ان کے بارے میں یہی نظریہ نہیں رکھتے کہ ان کی اپنی رائے (ان کی اپنی حد تک) صحیح ہے اور ان کے مخالفین کی رائے غلط؟؟ کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو کسی رائے کو اپنائے بھی اور پھر یہ بھی کہے کہ یہ غلط

ہے؟؟ اہل علم میں معروف و مسلم یہ قول کیا غامدی صاحب نہیں جانتے جو اجتہادی مسائل میں جگہ جگہ بیان ہوتا ہے کہ:

"راینا صواب ویحتمل الخطا، ورای غیرنا خطا و یحتمل الصواب. یعنی ہماری رائے ہماری تحقیق کے مطابق درست ہے، البتہ ممکن ہے کہ حقیقت میں خطا ہو اور ہمارے غیر کی رائے ہماری تحقیق میں خطا ہے اگر چہ یہ ممکن ہے کہ حقیقت میں وہی درست ہو!"

کیا ایسا موقف ہوتے ہوئے بھی غامدی صاحب مدارس والوں پر وہی الزام دوہرائیں گے جو انہوں نے اوپر ذکر کردہ عبارت میں دوہرایا ہے؟؟ غامدی صاحب نے اب تک دینی تحقیق کے ضمن میں جو کچھ لکھا وہ یا تو ان کے دبستان کی تحقیق کے عین مطابق یا پھر غامدی صاحب کی اپنی تحقیق کے مطابق نہیں ہے؟؟ کیا غامدی صاحب نے کہیں علماء دیوبند کے محض دس فیصد مسائل کو بھی اپنے کتب میں جگہ دی یہ کہہ کر ان میں علماء دیوبند درست ہیں اور میں غلط ہوں؟؟ پھر کس منہ سے دوسروں کو یہ الزام دیتے ہیں؟؟ دوسروں کے تنکوں کو تو دیکھے جا رہے ہیں لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا؟؟

☆......☆......☆......☆

غامدی صاحب کا دینی مدارس پر دوسرا الزام اور اس کی حقیقت:

''دوسری بڑی خرابی اِن مدارس کے نظام میں یہ ہے کہ یہ اگر چہ دینی مدارس ہیں، لیکن دین میں جو حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے، وہ اِن میں اِسے کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔''

یہ الفاظ ہیں غامدی صاحب کے اور ان کا جو مدعا ہے وہ بھی واضح ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی جو الزام غامدی صاحب نے دینی مدراس کے نظام پر لگایا ہے وہ درست ہے؟؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی محض الزام ہی ہے اور حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس وقت اگر صرف اُن قرآنی خدمات کا مختصر جائزہ پیش کر دیا جائے جو محض اس ایک صدی میں دینی مدارس سے مستفید ہونے والے علماء کرام نے سرانجام دی ہیں تو ان کے ناموں سے ہی کئی صفحات بھر جائیں گے، اَب نہ معلوم غامدی صاحب کس بنیاد پر دینی مدارس کو یہ الزام دے رہے ہیں؟ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی دو وجہ ہیں: ایک تو یہ کہ غامدی صاحب فہم قرآن کے لیے کچھ ایسے اصول وضوابط وضع کیے ہوئے ہیں جو ان کی پیش کردہ تعبیرات کے مطابق مجموعی حیثیت سے دینی مدارس کے اصحاب وعلماء کے ہاں قابل اعتبار نہیں ہیں، اِس لیے غامدی صاحب اپنے فہم قرآن کو معتبر بنانے کے لیے یہ لازمی سمجھتے ہیں کہ پہلے سے موجود فہم قرآن کے علمی سرچشموں کو بے وقعت بنایا جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موصوف کو معلوم ہے کہ مسلم عوام کو قرآن جید سے ایک خاص جذباتی تعلق ہے اور یہ بھی انہیں معلوم ہے کہ مسلم عوام کو دینی مدارس

سے بھی اچھا خاصا جذباتی اور عقیدت مندانہ تعلق ہے، اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ عوام الناس جو دامے درمے سخنے ہر اعتبار سے ان دینی مدارس کے معاونین ہیں انہیں ان سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ذہنوں میں یہ بات ڈالی جائے کہ یہ مدارس جسے آپ دین کا سرچشمہ تصور کرتے ہیں وہاں تو دین کے سب سے پہلے اور بنیادی ماخذ قرآن کریم کو ہی بنیادی درجہ نہیں دیا گیا تو وہ دین کے سرچشمے اور دینی رہنمائی میں معتبر کیسے قرار پائیں گے؟ اور آپ لوگ کس بنیاد پر ان سے اپنی عقیدتوں کو وابستہ کیے ہوئے ہیں؟؟

غامدی صاحب کے علم میں ہونا چاہیے کہ دینی مدارس کے نصاب اور نظام میں قرآن کریم کو الحمد للہ بنیادی اہمیت ہی حاصل ہے۔ حفظ وتجوید قرآن سے لیکر فہم قرآن تک نہایت جانفشانی اور توجہ اس پر خرچ کی جاتی ہے۔ حفظ وتجوید سے تو شاید غامدی صاحب کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔ انہیں تفہیم قرآن کے بارے میں تسلی نہیں۔ تو عرض ہے کہ اس وقت دینی مدارس میں قرآن فہم کے لیے چار درجے ہیں:

اصول تفسیر اور علوم القرآن کی تدریس:

اس سلسلے میں اساتذہ کرام کے مفصل دروس کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر اور علامہ صابونی کی التبیان فی علوم القرآن باقاعدہ درساً درساً پڑھائی جاتی ہے اور طلبہ کو ذاتی مطالعے کے لیے دیگر متعدد مفید کتابوں کی رہنمائی خود اساتذہ ہی کر دیتے ہیں۔

تفسیر قرآن:

اس سلسلے میں سب سے پہلے چار سالوں میں استاذ کے مفصل دروس کی شکل میں قرآن کریم کی تفسیر مکمل تشریح واہم مباحث کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے۔ شروع والے سال میں صرف تیسواں پارہ، بعد میں دوسرے سال نو پارے اور اگلے دو سالوں میں دس، دس پارے اس طرح پڑھائے جاتے ہیں کہ استاذ اور شاگرد قرآن کریم اپنے سامنے کھولے ہوتے ہیں اور استاذ اپنے تفصیلی مطالعے اور تحقیق کے ساتھ متعلقہ آیات کا زبانی ترجمہ، حل لغات، ضروری تراکیب، عام فہم تفسیر اور حل مشکلات القرآن پر جامع تقریر کرتا ہے۔ اس مرحلے میں طلبہ کے مطالعے کے لیے اساتذہ انہیں کسی بھی مختصر اور آسان تفسیر کی رہنمائی بھی کر دیتے ہیں مثلاً صفوۃ التفاسیر علامہ صابونی کی، یا تفسیر ابن کثیر یا اردو میں تفسیر عثمانی وغیرہ...... بعد از اں پانچویں سال صرف قرآن کے متن تک محدود رہتے ہوئے تفسیر کا ذوق پیدا کرنے کے لیے تفسیر جلالین مکمل پڑھائی جاتی ہے، گویا پہلا دور مفصل تفسیر کا تھا اور یہ دوسرا دور بنیادی طور پر ترجمہ قرآن کا یعنی طالب علم میں تفسیر کی بنیادی صلاحیت پیدا کرنے کے بعد محض قرآن کو سامنے رکھ اس کے فہم کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے بعد ایک سال میں تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ پڑھایا جاتا ہے مگر اس کا مقصد تفسیر پڑھانا نہیں بلکہ طالب

علم کو ادق ترین تفسیری ذخیرے سے قدرے بصیرت افروز انداز میں متعارف کرانا ہوتا ہے۔

گویا اول مرحلہ استاذ سے تفسیر پڑھنے کا، دوسرا مرحلہ براہ راست قرآن سے قرآن فہمی حاصل کرنا، اور تیسرا مرحلہ ادق تفاسیر سے مناسبت پیدا کرنا تاکہ امت کے تاریخی علمی ورثے سے استفادہ کی راہیں کھل جائیں۔ اور الحمد للہ اب تک مدارس کا یہ نصاب ونظام دیگر تمام فہم قرآن کے نظاموں سے کامیاب جارہا ہے۔ فللہ الحمد و المنۃ

☆......☆......☆......☆

دینی مدارس پر تیسرا اور آخری الزام غامدی صاحب نے جو دوہرایا ہے وہ وہی فرسودہ اور حقیقت سے دُور الزام ہے کہ اِن مدارس کا نصاب نہایت فرسودہ ہے۔ یہ اعتراض کم وبیش ہر اُس شخص کی زبان پر جاری رہتا ہے جس نے دینی مدارس میں شاید ایک ہفتہ بھی نہیں گزارا ہوتا۔ (فرسودہ سے غامدی صاحب کی مراد اگر یہ ہے کہ وہ بہت پرانا ہے تو اس نظریے سے تو خود قرآن مجید بھی نعوذ باللہ فرسودہ قرار پائے گا، حدیث شریف بھی قابل رد ٹھہرائی جائے گی، اور اگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ نصاب دورِ جدید کی ضروریات کے لئے ناکافی ہے، تو یہ بات مکمل طور پر غلط ہے، مجموعی طور پر یہی نصاب الحمد للہ دورِ جدید کی ضروریات کو نہ صرف پورا کرتا ہے، بلکہ غامدی صاحب جیسے جدید فتنوں سے نمٹنے کے لئے بھی افراد مہیا کرتا ہے، شاید اسی وجہ سے غامدی صاحب جیسے لوگ اس کے درپے رہتے ہیں۔) ہاں یہ واضح رہے کہ نصاب میں جزوی تبدیلی الگ معاملہ ہوتا ہے اور اِس سے ارباب مدارس غافل نہیں اور نصاب کو فرسودہ ہی قرار دیدینا الگ معاملہ ہے اور غامدی صاحب نے یہ دوسرا رخ ہی اختیار کیا ہے۔ اگرچہ مناسب تو تھا کہ اِس الزام کی حقیقت بھی واضح کی جاتی مگر چونکہ یہ الزام نہایت فرسودہ اور گھٹیا ہے اور بہت پرانا بھی ہے جس کے بارے میں متعدد اکابر مدارس نے نہایت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اپنے موقف کی وضاحت بھی کردی ہے اور معترضین کے اعتراضات کی کمزوری کی بھی نشاندہی کردی ہے تو اس موضوع کے لیے ہم انہی تحریرات کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دے کر اپنی بات کو یہیں سمیٹتے ہیں۔

آخر میں اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ ہمیں ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ رکھے، اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک سے وابستہ رکھے، اور غامدی صاحب کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلام اور دین کی نئی عمارت کھڑی کرنے کے بجائے اسی عمارت میں رہائش اختیار کرلیں جس کی بنیاد جناب نبی کریم ﷺ نے رکھی اور اسے بام عروج تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پہنچایا اور اس وقت سے جو علمی ودینی تسلسل جاری ہوا اسی سے تمسک میں کامیابی ہے اور اس سے کٹ جانے میں ناکامی ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ ”: فرقہ بندیوں کے وقت کامیاب وہی ہوں گے جو میرے اور میرے صحابہ کے راستے پر ہوں“۔ اور اس راستے پر امت کا جو طبقہ تسلسل سے چلا آرہا ہے اسے اہل السنۃ والجماعۃ کہتے ہیں!! ☆☆

......باب نمبر٦......

فکر غامدی کا عمومی جائزہ

غامدی مذہب پر مختلف اہل علم و قلم کے تبصرے

غامدی صاحب کے فکر و فلسفے سے ہمارا ایک طویل عرصے سے واسطہ ہے۔ ان کے رطب و یابس اور غث و سمین کی الٹ پلٹ میں کئی دفعہ مسجد کے مناروں سے نداء صبح بلند ہوئی ہے۔ لکل داخل دهشة کے تحت شروع شروع میں بلند آہنگ دعووں اور مرعوب کن ادبی ڈینگوں سے ہم بھی متاثر سے ہوئے لیکن جوں جوں مطالعہ گہرا اور وسیع ہوا اور خود انہی کی بنائے ہوئے اصول ''فقط دلیل'' کو انہی پر آزمانا شروع کیا تو منظر نامہ بدلنے لگا، فلک بوس دعوے سر بسجود اور وضوح و بداہت کے سورج گہنانے لگے۔ عربیت اور ذوق زبان کے غازے (make up) تحقیق وجستجو کے ناخن سے کریدے گئے تو نیچے سے وہی کملائے ہوئے بوسیدہ اعتزالی چہرے اور تجددی مہرے نظر آنے لگے۔

غامدی صاحب کی تمام چھوٹی بڑی تحریرات اور ان کے پس منظر (فراہی تا اصلاحی) اور پیش منظر (یعنی تلامذہ مثلاً عمار صاحب وغیرہ) کا بغور اور بار بار مطالعہ و تجزیہ کرنے کے بعد ہم دیانتاً اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''غامدی صاحب کا تصور دین اس تصور سے یکسر مختلف ہے جس پر امتِ مسلمہ کے ارباب خرد و دانش چودہ سو سال سے کاربند ہیں۔''

اصول تفسیر ہوں یا اصول حدیث، اصول فقہ ہوں، اصول عقائد۔ ہر ایک دائرے میں انہوں نے جمہور امت سے ہٹ کر نئے دائرے تخلیق کیے ہیں۔

مولانا زبیر احمد صدیقی

دورِ حاضر کا غلام احمد

قربِ قیامت میں فتنوں کا ظہور اور گمراہی و بے دینی کے عروج کی پیشین گوئی احادیث میں بکثرت وارد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربِ قیامت میں رات کے اندھیروں کی طرح فتنہ کے نزول کی خبر ارشاد فرمائی، نیز فتنہ کی کثرت وہجوم کا یہ عالم ہوگا کہ لوگ صبح کو مسلمان اور شام کو کافر ہونگے۔

چنانچہ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے یہ حقیقت عوام وخواص کے مشاہدہ میں آتی جارہی ہے، نت نئے فتنے صادر ہورہے ہیں، راسخ العقیدہ اور راسخ العمل لوگ آنکھ جھپکنے میں فتنوں کا شکار ہورہے ہیں، جاہل تو جاہل ہیں کئی عالم اور مفتی بھی ان چقا چوند فتنوں میں مبتلا ہونے میں دیر نہیں لگاتے، وہ آنکھ جھپکنے اور رُخ پھیرنے کی دیر میں اپنی سابقہ علمی وعملی کاوشیں، اپنے آباؤ اجداد کی ایمانی، فکری، عملی تحقیقات ونظریات کو یکسر نظر انداز کرتے بلکہ انہیں ردی کے ٹوکرے میں پھینکتے فتنوں کے وکیل اور محافظ نظر آتے ہیں۔ اللھم احفظنا من ذالک.

برصغیر پر غیر ملکی تسلط کے بعد سے اَب تک آئے روز فتنوں میں اِضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، اہل حق اَبھی ایک فتنہ کی علمی سرکوبی میں مصروف ہوتے ہیں تو دوسرا فتنہ سر اُٹھالیتا ہے، اہل فکر ودانش ابھی اُس فتنہ کے اَفکار ونظریات کا بغور جائزہ لینے میں مصروف ہوتے ہیں تو تیسرا فتنہ منصۂ شہود پر آجاتا ہے، اِن فتنوں کو اِسلام دشمن عناصر کی مکمل پشت پناہی، غیر ملکی اِستبداد کی مکمل سرپرستی، پاکستان کے مقتدر طبقوں کی جانب سے مکمل حوصلہ اَفزائی اور جدید وبرقی ذرائع اَبلاغ تک مکمل رسائی حاصل ہوتی ہے۔ برق رفتاری سے نت نئے نظریات واَفکار کو فروغ دے کر دین میں تحریف وتبدیلی کا عمل جاری وساری ہے۔ مقصد اِس سب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین، چودہ سو سالہ اِجماعی مسائل اور متفقہ نظریات میں تشکیک پیدا کر کے اہلِ ایمان کے ایمان میں نقب لگا کر اُنہیں دین سے برگشتہ کرنا، ماہرینِ شریعت سے عوام الناس کو دُور کرنا، اسلاف واکابر پر بداعتمادی کے ذریعے پورے ذخیرۂ علم وعمل کو ناقابل اعتماد قرار دلا کر اسلام اور اسلام پسندوں سے مغرب اور مغربی نظریات کو نجات دلانا ہے۔

اُٹھارہویں صدی میں برطانوی سامراج کے خلاف برصغیر میں اِسلامیانِ ہند، سیسہ پلائی

ہوئی دیوار بن گئے تو انگریز نے مسلمانوں سے جذبۂ جہاد سلب کرنے، انہیں اپنے راستہ سے ہٹانے کے لیے مرزا غلام احمد قادیانی جیسی شخصیات کو کھڑا کر کے یہ مقاصد حاصل کرنے کی مذموم کوشش کی، مرزا غلام احمد قادیانی نے انکارِ ختم نبوت کرتے ہوئے شریعت اسلامیہ سے بغاوت کر کے ایک طرح کی نئی شریعت پیش کی تو دوسری جانب غلام احمد پرویز، اسلم جیراج پوری، عنایت اللہ مشرقی جیسے ملحدین نے انکارِ حدیث کا فتنہ بپا کر کے پورے دین کی عمارت ڈھانے کی سعیِ لاحاصل کی۔ فرقہ پرست مولویوں کی حوصلہ افزائی کر کے تفریق اُمت کی بھی پوری پوری کوشش کی گئی، چنانچہ ایک طرف تو انگریز کے خلاف برسرِ پیکار علماء ومشائخ پر گستاخی وکفر کے فتوے لگوائے گئے، دوسری جانب ایک طبقہ سے حلفِ وفاداری لیکر ایک نئے مسلک کا عنوان ونام رجسٹرڈ کیا گیا اور اس سے انگریزی اِستعمار کے مقابل ڈٹ جانے والوں کے اَسلاف واَکابر اور ان کے نظریات کو شرک وکفر قرار دلوایا، گویا کہ اہلِ حق کو ہر طرح سے تنہا کرنے اور ناکام کرنے کے سارے حربے آزمائے گئے۔

پرانے شکاریوں نے نیا جال لگا کر پھر سے اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمہ گیر اور ہمہ جہت جنگ شروع کی، یہ جنگ جغرافیائی، نظریاتی، فکری، معاشی اور سیاسی طور پر ہمہ گیر، ہمہ جہت جنگ ہے جو دنیا بھر میں دہشت گردی، انتہاپسندی، انسانی حقوق کی خلاف ورزی، آزادیٔ اظہارِ رائے، جدت پسندی جیسے خوبصورت ناموں سے لڑی جارہی ہے، اِن خوبصورت نعروں کے پس منظر میں صرف ایک ہی ایجنڈا کارفرما ہے اور وہ ہے اسلام دشمنی۔

اس مقصد کے لیے افغانستان، پاکستان، عراق، بنگلہ دیش، شام، فلسطین، کشمیر، بوسنیا، برما، یمن، مصر، لیبیا الغرض دنیا بھر میں خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جارہی ہے، تہذیب کی جنگ میں بھی مسلم معاشرہ میں غیر مسلم، حیا باختہ، مغربی تہذیب کو بزورِ بازو و بزورِ دولت اور بذریعہ میڈیا اور این جی اوز مسلط کیا جارہا ہے۔ اِس مقصد کے لیے جنسی تعلیم، مردوزن کے اختلاط اور آزادیٔ نسواں کے پُرفریب نعرے لگائے جارہے ہیں، خاندانی نظاموں کو تباہ وبرباد اور عفت وحیا سے مبنی معاشرہ کو شکست وریخت سے دوچار کیا جارہا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اَصل قرآن اور متوارث سنت، اِسلام دشمن عناصر کو کسی صورت قبول نہیں، گویا کہ یہود ونصاریٰ اور اُن کے ہمنواؤں کو شریعتِ اِسلامیہ اور اِسلام کے ہاتھوں ماضی کی اُٹھائی ہوئی ہزیموں نے اِسلام کے خلاف صف آرائی کرنے پر مجبور کیا، اَب اُنہیں ہر طرح سے اِسلام کو ختم کرنا ہے اور مسلمان کو بحیثیت مسلمان کے ختم کرنا ہے۔ اِس لیے دورِ حاضر میں مرزا غلام احمد قادیانی اور غلام احمد

پرویز کی طرح ایک شخصیت درکار تھی، سو اُنہیں وہ شخصیت جناب جاوید احمد غامدی کی شکل میں دستیاب ہوگئی، جنہوں نے اپنے فن ومہارت کے ذریعے مستشرقین وملحدین میں سے متعدد گمراہ شخصیتوں کے اَفکار اور نظریات کا سرقہ کر کے ایک نیا فتنہ ترتیب دیا اور پاکستان کے فوجی آمر جناب پرویز مشرف کے عہد میں انہیں میڈیا اور اِسلامی نظریاتی کونسل میں لاکر اس فتنہ کی خوب آبیاری کی گئی، موصوف نے بڑی مہارت کے ساتھ دین کے نام پر دین کا اِنکار کیا، شریعت سے بغاوت کر کے ایک نئی شریعت کی تدوین وترتیب وقیام کی ضرورت پر زور دیا، سنت محمدیہ مطہرہ کا کھلے عام اِنکار کر کے گویا اپنی سنت وشریعت کا غیر اعلانیہ دعویٰ کر ڈالا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جو کام مرزا غلام احمد قادیانی نے اِعلان نبوت کے ذریعے کرنے کی کوشش کی وہ خدمت جناب غامدی صاحب اِنکارِ سنت اور شریعت کے نئے ماڈل کے ذریعے کرنا چاہتے ہیں۔

غامدی صاحب کے ہاتھوں کی صفائی کی داد دیجئے کہ جو باتیں مرزا غلام احمد قادیانی، غلام احمد پرویز کی زبانی لوگوں نے نہ مانی، بہت سے علم کے دعویداروں نے جناب غامدی کی زبانی تسلیم کرلیں۔ مثلاً:

۱)......نزولِ مسیح علیہ السلام اور حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے، مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ نے اِس کا اِنکار کیا اور اپنے آپ کو مسیح موعود ثابت کرنے کی کوشش کی، اُمت نے مرزا کے اِس دَجل کا پردہ چاک کیا۔ جناب غامدی صاحب بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے دعویدار ہیں اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے قطعی قائل نہیں۔

۲)...... پرویزی، قادیانی وغیرہ زنا کی شرعی سزا رجم کے منکر ہیں، جناب غامدی بھی اِسی فکر کے بے باک داعی اور ترجمان ہیں۔

۳)......ملحدین، مرتد اور گستاخِ رسول کی شرعی سزا کے منکر ہیں اور یہی فکر جناب غامدی صاحب کی ہے۔

۴)......منکرینِ حدیث صرف قرآن کریم کی حرام کردہ اشیا کی حرمت کے قائل ہیں اور بس۔ جناب غامدی صاحب کے عقیدے میں بھی کھانے کی صرف چار چیزیں حرام ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے:

(۱) خون (۲) مردار (۳) سور کا گوشت (۴) غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔ اور کوئی چیز حرام نہیں۔

۵)......شراب نوشی کی سزا کے انکار میں ملحدین کے ساتھ غامدی صاحب بھی پیش پیش ہیں۔

۶)......غلبہ دین کی معروف آیات قرآنی لیظھرہ علی الدین کلہ کے مفہوم کی تحریف میں بھی جملہ ملحدین مساوی ہیں۔ اِن سب کے نزدیک صرف سرزمین عرب میں دین کا غلبہ مراد ہے، دنیا بھر میں دین

کا غلبہ اِس آیت کا مصداق نہیں۔

۷)......منکرینِ حدیث اور غامدی صاحب دونوں اِجماعِ اُمت کی حجیت کے منکر ہیں اور قریب قریب یہی طرز قادیانوں کا بھی ہے۔

۸)......غلام احمد پرویز، زکوٰۃ کی شرح اور نصاب کو حتمی نہیں سمجھتے۔ اور غامدی صاحب بھی اِسی فکر کے حامل وداعی ہیں۔

۹)......غلام احمد قادیانی، غلام احمد پرویز اور جاوید احمد غامدی حکم جہاد کے اِنکار میں بھی مشترک ہیں۔

۱۰)...... یہ حضرات عورت کے شرعی پردہ کے بھی منکر ہیں۔ غامدی صاحب کے نزدیک تو خواتین کا سر پر دوپٹا اور حجاب بھی کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔

افسوس کہ ضلالت وگمراہی کے مذکورہ بالا نظریات کو بعض ایسی شخصیات نے بھی قبول کرلیا جن کی قادیانیت اور پرویزیت کے خلاف علمی وعملی کاوشوں کی پوری ایک تاریخ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دجالِ اکبر میں سے بہت سے دجالِ اصغر جنم لے رہے ہیں، جن کے دجل کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی آنکھوں پر پٹی آگئی ہے، اِس وجہ سے اُنہیں نظر نہیں آتا، یہ لوگ **لھم قلوب لایفقھون بھا ولھم اعین لایبصرون بھا** کا مصداق بنتے جارہے ہیں۔

چند سال قبل ایک صاحب کمپیوٹر کی u.s.b میں ایک ریکارڈنگ لائے اور احقر کو سنائی، یہ جناب غامدی صاحب سے احقر کا پہلا تعارف تھا۔ ریکارڈنگ ایک ٹی وی پروگرام میں سوالات کے جوابات کی تھی، ایک خاتون منصب شریعت پر فائز ایک خود ساختہ شارع جناب غامدی صاحب سے گویا ہوئی کہ جنت میں ایک مرد کو بہتر حوریں ملیں گی تو میں خاتون ہوں، کیا میرا حق نہیں ہے کہ مجھے بھی جنت میں بہتر مرد ملیں؟ اِس بے باکانہ اور حیا باختہ سوال پر غامدی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ: اگر آپ کی خواہش ہوئی تو آپ کو بھی بہتر خاوند ملیں گے۔ (العیاذ باللہ) قارئین! غامدی صاحب کی اِس فکر کا اندازہ کیجئے کہ وہ اِس غیر فطری غیر شرعی عمل کو بھی جنت میں روا رکھ رہے ہیں، حالانکہ ایسی کوئی غیر فطری خواہش تو جنت میں پیدا ہی نہیں ہوگی چہ جائے کہ غیر فطری عمل جنت میں ہو۔

مغرب کی طرح جناب غامدی صاحب بھی آزادیٔ نسواں کے علمبردار اور گویا کہ مغرب کے ہی نمائندہ ہیں ان کے نزدیک:

(۱)......خاتون مرد حضرات کی امامت کراسکتی ہے۔

(۲)......عورت کے لیے برقعہ/دوپٹہ کوئی شرعی حکم نہیں۔

(۳)......عورت کی نصف شہادت کا قرآنی حکم بس دستاویزی شہادت کے متعلق ہے، ورنہ واقعات کی شہادت میں خاتون کی شہادت مرد کے برابر ہے۔

(۴)......خاتون نکاح خواں بھی ہوسکتی ہے۔

(۵)......دیت میں مرد وزن کا کوئی فرق نہیں وغیرہ۔

جناب غامدی صاحب کے نظریات کا حاصل وخلاصہ چند چیزیں ہیں:

۱)......حضور علیہ السلام کے افعال واعمال آپ کی ذاتی پسند ہیں یا عرب کا کلچر ہے، لہٰذا یہ صفات، اَفعال واَعمال نبوی، شریعت و دین نہیں، اسی لیے موصوف مسنون وضع قطع، لباس، داڑھی، پردہ وغیرہ کے منکر ہیں۔

۲)......آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ حاکم جو نظام مملکت قائم فرمایا وہ ''عرب تمدن'' تھا۔ نہ کہ شریعت کا حکم اور نہ ہی بعد کے لوگوں کے لیے اُس پر عمل ضروری ہے۔ اُس عرف اور آج کے ''عرف'' میں نمایاں فرق ہے، لہٰذا آج کے عرف کے مطابق یہ قانون بدلے جاسکتے۔ (العیاذ باللہ)

۳)......آپ کی سنت مطہرہ بس اُسی زمانے کے لیے تھی، بعد کے لوگوں کے لیے نہیں، لہٰذا آج کے متمدن زمانہ میں (معاذ اللہ) اس سنت پر عمل پیرا ہونا مشکل ہے۔

۴)......خلافت راشدہ کا نظام قبائلی نظام تھا۔

اہل علم نے غامدی صاحب کے مذکورہ بالا نظریات کا علمی انداز میں مدلل رد فرمایا ہے۔ اور مجلّہ صفدر کی یہ کاوش بھی اِسی کا حصہ ہے۔ ہم اپنے اِس مضمون میں بس اتنا عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ:

غامدی صاحب اور اُن کے ملحد و بے دین آقاؤں پر جو حقیقت پندرہ سو سال بعد منکشف ہوئی، کیا اُن سے پہلے بھی کسی نے اِس کو بھانپا؟

قرآن کریم نے اِطاعت رسول اور احادیث میں سنتِ نبوی کی تعمیل کا حکم دیا، کیا قرآن وسنت نے اِس مقصد کے لیے زمانہ کی حد بندی فرمائی؟

غامدی صاحب کے مذہب کے مطابق ہر تہذیب وعلاقہ کی الگ شریعت ہوگی، اس لیے کہ ظاہر ہے ہر علاقہ وخطہ کا کلچر جدا ہے، کیا دین کی آفاقیت وہمہ گیریت باقی رہے گی؟ وہ کتنے سال تک کے لیے نئی شریعتیں تدوین فرمائیں گے؟

کیا غامدی صاحب یا اُن کا کوئی نمائندہ یہ بتا سکتا ہے کہ اُمم سابقہ وشرائع سابقہ میں کوئی نظیر ایسی ہے کہ احکام شریعت کی زمانہ یا علاقہ کے لحاظ سے الگ الگ تقسیم کی گئی ہو؟

غامدی صاحب کے ان افکار کی روشنی میں گویا کہ ایک نیا دین جنم لے گا، جس کا خاکہ غامدی صاحب کے فکر کے مطابق کچھ یوں نظر آتا ہے۔

۱)......اسلام محض ایک برکت کی چیز ہوگی، ورنہ تو یہود و نصاریٰ بھی اگر توحید پرست ہوں اور اعمال صالحہ کریں تو وہ بھی جنتی ہی سمجھیں جائیں گے، یوں وحدتِ اَدیان کا خواب پورا ہو جائے گا۔

۲)......اسلام کا ایک نیا کلمہ اردو، اِنگلش اور دیگر زبانوں میں تشکیل پائے گا۔

۳)......ایک نئی نماز تشکیل دی جائے گی، جس میں شاید ہر کوئی اپنی مادری زبان میں تلاوت واَدعیہ و اَذکار اَدا کرے گا۔

۴)......زکوۃ کا بھی نیا ڈھانچہ، نیا نصاب اور نئی حد بندی ہوگی۔

۵)......حج کے اَحکام بھی پرانے کلچر کے مطابق ہیں، لہٰذا اَپنے کلچر کے مطابق غامدی صاحب 'ماڈرن حج' بھی شاید متعارف کرانے کی کوشش فرمائیں گے۔

۶)......جہاد فری معاشرہ ہوگا، جس میں مردوں کو لباس وشکل کی کھلی آزادی ہوگی، خواتین بھی برقعہ، حجاب، دوپٹہ کی پابندیوں سے مستثنیٰ ہوں گی۔ اِس رنگین معاشرہ میں مرد بے ریش اور خواتین بے حجاب ہوں گی، مردوں کے تسلط کا خاتمہ ہوگا۔ خواتین بھی امام، خطیب اور نکاح خواں ہوں گی۔

۷)...... بارگاہِ رسالت میں توہین کا ارتکاب کرنے والے کے بارے میں ملاؤں کی بیان کردہ سزائے موت کے خاتمہ کا بھی اِعلان ہوگا۔ اور شاتم رسول کو پورا پورا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔

۸)......قادیانی، بہائی، گوہر شاہی، یوسف کذاب جیسے مرتدین غامدی صاحب اور اُن کی جماعت کے بھائی قرار پائیں گے، کیونکہ اُن کے نزدیک کتنے ہی گمراہ کن نظریات کیوں نہ ہوں، کسی کی تکفیر نہیں کر سکتے۔ یہ تو نبی کا کام ہے اور وہ دنیا میں ہیں نہیں۔

۹)......اِسلامی سزائیں بھی غامدی شریعت میں اَز سرِ نو تشکیل پائیں گی۔

۱۰)......غامدی صاحب کی نئی طبع شدہ تفسیر قرآن سے متصادم چودہ سو سالہ علمی ذخیرہ بھی شاید دریا برد کیا جائیگا۔

قارئین! یہ ہے غامدی فکر کے مطابق دین کا ڈھانچہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ غیر اِعلانیہ طور پر شارع بن کر اُبھرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اِس فتنہ سے محفوظ فرمائیں۔ آمین

☆......☆......☆......☆

احمد مفتی

غامدی فکر۔ایک عمومی جائزہ

غامدی فکر عصرِ حاضر میں کئی پہلوؤں سے ایک جاذب فکر ہے۔اس فکر پر موافق اور مخالف آراء بکثرت پائی جاتی ہیں، کچھ لوگ غامدی صاحب کو خـالِـفْ تُـعـرَف :(الٹے چلو تا کہ نمایاں رہو) کے تحت سستی شہرت کا طالب وجویاں کہتے ہیں،اور کچھ ان کی ساری علمی واجتہادی تگ وتاز کے پیچھے معاشی مقاصد کو محرک گردانتے ہیں۔کچھ استعماری قوتوں (مغرب وامریکہ) کا آلہ کار کہہ کر نتائج فکر کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔بعض انانیت کو سبب ٹھہراتے ہیں،اور بعض انہیں فی الجملہ مخلص سمجھ کر اسلام کے ایک نادان دوست کا لقب دیتے ہیں،اور بعض انہیں اس زمانے میں اسلام کی تعبیر نو (تجدید) کا امام شمار کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کا ایسا ایڈیشن تیار کر دیا ہے جو جدید (یعنی الحاد کے مارے ہوئے مغربی) ذہن کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

ہمیں ان باتوں سے نفیاً یا اثباتاً سروکار نہیں،ہم نے اپنے تئیں غامدی فکر کا گہرا مطالعہ کیا ہے تاکہ ہم بھی جانیں تو سہی کہ غامدی فکر ہے کیا۔زیر نظر سطور ہمارے تاثرات کی عکاس ہیں۔اس میں کسی شخصیت کو زیرِ بحث نہیں صرف افکار کے نتائج ومظاہر کو دکھایا گیا ہے۔))))احمد مفتی((((

غامدی صاحب کے فکر وفلسفے سے ہمارا ایک طویل عرصے سے واسطہ ہے۔ان کے رطب ویابس اور غث وسمین کی الٹ پلٹ میں کئی دفعہ مسجد کے مناروں سے نداء صبح بلند ہوئی ہے۔لکل داخل دھشۃ کے تحت شروع شروع میں بلند آہنگ دعووں اور مرعوب کن ادبی ڈینگوں سے ہم بھی متاثر سے ہوئے لیکن جوں جوں مطالعہ گہرا اور وسیع ہوا اور خود انہی کی بنائے ہوئے اصول ''فقط دلیل'' کو انہی پر آزمانا شروع کیا تو منظر نامہ بدلنے لگا،فلک بوس دعوے سربسجود اور وضوح وبداہت کے سورج گہنانے لگے۔عربیت اور ذوق زبان کے غازے (make up) تحقیق وجستجو کے ناخن سے کریدے گئے تو نیچے سے وہی کملائے ہوئے بوسیدہ اعتزالی چہرے اور تجددی مہرے نظر آنے لگے۔

غامدی صاحب کی تمام چھوٹی بڑی تحریرات اوران کے پس منظر (فراہی تا اصلاحی) اور پیش منظر (یعنی تلامذہ مثلاً عمار صاحب وغیرہ) کا بغور اور بار بار مطالعہ وتجزیہ کرنے کے بعد ہم دیانتاً اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

"غامدی صاحب کا تصورِ دین اس تصور سے یکسر مختلف ہے جس پر امتِ مسلمہ کے

ارباب خرد و دانش چودہ سو سال سے کاربند ہیں۔"

اصول تفسیر ہوں یا اصول حدیث، اصول فقہ ہوں، اصول عقائد۔ ہر ایک دائرے میں انہوں نے جمہور امت سے ہٹ کر نئے دائرے تخلیق کیے ہیں۔

غامدی فکر کا اصل الاصول:

ان کے خیال میں ۳۵ رسنتوں کے علاوہ دین کے تمام احکامات کا اصلاً تنہا ماخذ قرآن پاک کا متن اور صرف متن ہے۔ پھر اصل الاصول اس متن پر وہ تحکمانہ / حاکمانہ فہم ہے جو صرف متن ہی کے مطالعہ سے وجود میں آتی ہے اور یہ مطالعہ نظم کلام اور عربیت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس فہم کی صحت وسقم کی جانچ پرکھ کے لیے سوائے وجدان اور ذوق کے کوئی اتھارٹی نہیں۔ حدیث اگر اس فہم کے موافق ہو تو لینے میں حرج نہیں[۲]، اگر معارض ہو تو خبر واحد بمقابلہ قرآن کہہ کر اڑا دی جائے۔ اقوال صحابہ حجت نیست[۳]۔ اور پھر امت کے بہترین دماغ اور علمی طبقے کے مکھن یعنی ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے بارے میں روش یہ ہے کہ جہاں تک وہ ساتھ دیں تو قابل احترام ہیں اور جہاں اس مکتب فکر کی حاکمانہ فہم سے ٹکرائے وہاں ان کے اجتہادات کو "غتربود" اور اجماع و اتفاق کو "بوالعجبیاں" اور سوءِ فہم جیسے القابات سے عالمانہ اور مہذب علمی القاب سے نوازا جاتا ہے۔[۴]

پھر قرآن پاک کی آیات بینات میں سے بھی ان کے خیال میں بیشتر حصہ احکام وہ ہے جس کے مخاطب صرف زمانہ رسالت کے لوگ تھے۔ بعد والوں کے لیے اسے بطور حکم نہیں لیا جاسکتا۔ جیسے جہاد اور حدود وتعزیرات کے بعض احکام۔

خلاصہ یہ کہ اصول تفسیر میں یہ مکتب تفسیر بالرائے کے اصول پر کاربند ہے اور تفسیر بالرائے بھی وہ جو مستفاد و مستند الی الروایۃ نہیں بلکہ جو حاکم علی الروایۃ ہے اور جس کی بنیاد میں سوائے وجدان و ذوق جیسی خوشنما بے اصولیوں کے اور کچھ نہیں۔

سنت وحدیث:

ان کے خیال میں سنت الگ ہے اور حدیث الگ، سنت صرف ۳۵ رہیں اور حدیث میں متواتر کوئی قابل ذکر چیز نہیں، جبکہ خبر واحد سے دین میں کسی عقیدہ یا عمل کا (کسی بھی درجے میں خواہ ظنی ہو) اضافہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ذخیرہ حدیث میں صحیح سقیم دیکھنے کی ضرورت نہیں جہاں سے حدیث اپنی فہم قرآنی کے موافق ملے لے لی جائے اور جہاں معارض محسوس ہو رد کردی جائے، بھلے وہ شیخین کی روایت ہو یا

صحاح و مؤطئین میں موجود ہو، البتہ جہاں روایتی فکر کو مانوس کرنے یا الزام دینے کی ضرورت ہو وہاں حدیث کی نقد و جرح لی جا سکتی ہے۔

فقہ و اصول فقہ:

اصول فقہ میں ایک پر کشش و خوشنما لیکن بہت بڑی بے اصولی الحمد کی الف سے ناس کی سین تک پورے کے پورے قرآن کو قطعی الدلالۃ کہنا ہے۔

لیکن یہ قطعیت ایسی بے باک نکلی کہ'' کلالہ'' کے مسئلہ میں، خود اسی مکتب فکر کی قطعیت آپس میں نبرد آزما ہو گئی۔ غامدی صاحب کے استاذ امام امین احسن اصلاحی صاحب کی قطعیت مشرق کو جاتی ہے تو غامدی صاحب کی قطعیت عین مغرب کی طرف رخ کیے کھڑی ہے۔۵ پھر یہ قطعیت صرف قرآن تک منحصر نہیں بلکہ ہر کلام اپنے مفہوم و معنی میں قطعی الدلالت ہوتا ہے۔ اس لیے ''اصول الشاشی'' سے لے کر ''توضیح و تلویح و مسلم الثبوت'' تک کے ابحاث لفظیہ کی بحث میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیسا ملتا چکتا نکتہ ہاتھ آ گیا۔!

اصول فقہ میں سے ابحاث لفظیہ یوں گئے۔ سنت کا معاملہ ویسے الگ ہو گیا۔ باقی رہا اجماع، تو وہ تو محض علمی افسانہ ہے۔۶ البتہ قیاس کو غامدی صاحب تسلیم کرتے ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں، لیکن قیاس ایسا کہ خود بے قیاس ہے، چنانچہ موزوں پر قیاس کرتے ہوئے نیل پالش پر بلا تکلف وضو کے جواز کا قول فرماتے ہیں۔ ۷

عقائد اور کلام:

اور عقائد کے باب میں کلامی توجیہات کی ضرورت ہی نہیں، بس قرآن کو سامنے رکھا جائے، اس کے علاوہ ہر چیز کو چھوڑ دیا جائے اور جو ظاہر نص ہے اسے مان لیا جائے، اگر محال لازم آتا ہے تو آیا کرے، تعارض ہے تو ہوا کرے۔ اور فراہی صاحب کے بقول امتِ مسلمہ میں جتنے بھی اختلافات ہوئے ہیں خصوصاً عقیدے کے اختلاف وہ قرآن کو اپنی غور و فکر کا محور نہ بنانے کی وجہ سے ہوئے ہیں۔ اگر قرآن (اور صرف قرآن) پر تدبر کیا جاتا تو کوئی اختلاف ہی نہ ہوتا۔ قرن اول کے بعد امت جس برے فتنے میں مبتلا ہوئی ہے وہ منقول (قرآن) کو چھوڑ کر معقول کے پیچھے پڑنا ہے۔۸

قصہ کوتاہ یہ کہ یہ مکتب فکر اصول تفسیر و حدیث سے لے کر فقہ و کلام تک امت کے علمی سرمائے کو ردی کی ٹوکری کا مال یا زیادہ سے زیادہ کباڑ (scrap) کا درجہ دیتا ہے، کہ جس سے اگرچہ کام کی چیزیں بھی ہاتھ آ جاتی ہیں تاہم اس کی مجموعی قدر و قیمت اس سے زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکتب فکر کی نمائندہ

آخری کتاب ''میزان'' کے فائنل ایڈیشن کے آخر میں غامدی صاحب نے صاف واضح لفظوں میں اپنی راہ امت کے علمی جادہ سے جدا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ (میزان کتاب) اس پورے دین کا بیان ہے جو خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے انسانیت کو دیا گیا۔ اسے فقہ وکلام اور فلسفہ وتصوف کی ہر آمیزش سے بالکل الگ کر کے بے کم وکاست اور خالص قرآن و (حدیث نہیں بلکہ۳۵) سنت کی بنیاد پر اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔''

ان تصریحات وتلمیحات کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ غامدی مکتب فکر کا رخ امت کی صحیح روایتی فکر سے ۱۸۰/درجے منحرف ہے۔ ان کی اصول نما بے اصولیوں کو امت کے چند چنیدہ اہل علم کے اکادکا تفردات کے پردوں میں چھپانے کی کوشش تو کی جاسکتی ہے۹، لیکن انہیں امت کے اجتماعی علمی تعامل اور مسلمات کے دھارے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ اور خود اسی مکتب فکر کے اسلوب میں کہا جائے تو یوں عبارت ہوگی:

''یہ بات بالکل قطعی ہے کہ غامدی صاحب دین کا مجمع مالہ وما علیہ ایسا فہم وتصور لائے ہیں جو امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ علمی روایت کی خرد ودانش کے تصور وفہم سے یکسر مختلف بلکہ معارض ومتصادم ہے۔''

اس کے بعد بھی کوئی شخص غامدی صاحب کے دیے ہوئے راستے پر چلنا چاہے تو جی جان سے، اور اگر بچنا چاہے تو بصیرت کے ساتھ۔

لیهلك من هلك عن بينة و يحيٰ من حي عن بينة.

حواشی:

۱: ادبی دہشت گردی اس مکتب فکر کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اسی لیے بعض مبصرین تو یہ فرماتے ہیں کہ غامدی فتنہ علمی سے زیادہ نفسیاتی فتنہ ہے۔ امین احسن اصلاحی صاحب کا رواجی ادباء کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مقولہ ان کے حلقہ اثر میں کافی مقبول ہے کہ ''ادب ایک تلوار ہے جس سے ہم گھاس کاٹنے کا کام لیتے ہیں'' ادب سے تو دل فتح ہو سکتے ہیں نظریات بنائے اور بگاڑے جاسکتے ہیں پھر کیوں نہ اپنے افکار کاسدہ کو پھیلانے کے لیے اس کو کام میں لایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس حلقے کے لوگ بشمول مودودی و پرویز دلیل کی کمزوری کو انشاء کے زور سے پورا کرنے کے ''کلامی'' اصول پر عمل پیرا ہیں۔ اپنے زور لفاظی سے مخاطب کو زیر کرنے اور عام پڑھے لکھے آدمی کو متاثر کرنے کو اپنی فتح سمجھتے ہیں۔ شبلی سے لے کر تفہیم القرآن وتدبر اور اس کے انڈوں بچوں تک کے تمام سلسلوں میں یہ اصول ارباب بصیرت کو نمایاں نظر آئے گا۔ لیکن دجل آخر دجل ہے وہ الفاظ کے پردوں میں کب تک چھپتا ہے۔ بقول محقق العصر ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب متجددین الفاظ کا چکر چلاتے ہیں، لیکن چکر کا اگر ایک سرا پکڑ کر ادھیڑیں تو ادھڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور بقول ایک ستم ظریف کے ''اگر اس مکتب فکر کی تحریروں سے لفاظی وزور انشاء کو خارج کر دیا جائے تو ان کے پلے معقولیت کی مقدار اتنی ہی رہ جائے گی جتنی آٹے میں نمک یا ٹی بی کے جاں بلب مریض میں خون کی۔

۲: 'میزان' میں ذکر کردہ احادیث سے دھوکہ نہ کھایا جائے، وہ اسی درجے میں قابل قبول ہیں۔ تسلی کے لیے میزان کے مبادی تدبر حدیث اور فائنل ایڈیشن کا حرف آخر دیکھ لیا جائے۔

۳: غامدی صاحب نے اپنی تحریروں میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحابہ دیانت وتقوے میں تو بعد کے لوگوں سے زیادہ ہو سکتے ہیں لیکن علم وفہم میں ان کا زیادہ ہونا کوئی ضروری نہیں۔ حالانکہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں: اولئک أصحاب محمد کانوا أبر هذه الأمة قلبًا، وأعمقها علمًا، وأقلها تكلفًا.

۴: دیکھیے میزان میں 'ربوالفضل' عول اور مرتد کی سزا کا مسئلہ۔

۵: دیکھیے 'تحفہ غامدی' ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب ص ۳۹۔ حضرت مفتی صاحب نے بڑے مدلل انداز میں ان کی قطعیت کی گت بنائی ہے۔ جس سے ان کی پڑھی لکھی بے وقوفیوں پر حیرت بھی ہوتی ہے اور گمراہی پر ترس بھی آتا ہے کہ جمہور امت سے ہٹ کر اور اسلاف کے دامن سے کٹ کر بیچارے کیسی استدراجی دلدلوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

۶: دیکھیے غامدی صاحب کے تلمیذ رشید جناب عمار خان صاحب کا کتابچہ 'حدود وتعزیرات۔ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب ن تنقیدات کا جائزہ' عمار صاحب لکھتے ہیں: ''یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ علمی وفقہی تعبیرات کے دائرے میں 'اجماع' کا تصور محض ایک ''علمی افسانہ'' ہے جس کا حقیقت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں۔''

۷: دیکھیے غامدی صاحب کی کتاب: مقامات ص ۱۵۱۔ حالانکہ یہ بات خود اس مکتب فکر کے اصولوں کے مطابق بھی غلط ہے، کیونکہ غامدی صاحب نے سورہ مائدہ آیت وضو کے حواشی میں صاف تصریح کی ہے کہ یہ آیت پاؤں دھونے میں ''قطعی'' ہے۔ اس قطعی میں تغیر موزوں پر مسح سے تو ہو سکتا ہے کیونکہ وہ امت کے تواتر اور تعامل سے ثابت ہے، نیل پالش جو امر مستحدث اور شعار فساق ہے، اسے کون سا تواتر وتعامل حاصل ہے کہ اس کی بنیاد پر غسل کے حکم میں تبدیلی کی جائے۔ لیکن غامدی صاحب کا فتویٰ ہے پھر کیا کسی سے گلہ کرے کوئی۔

متجددین اور اجتہاد کے بلند وبانگ دعوے کرنے والے ہمیشہ اصولی اور کلیاتی قسم کے امور میں تو جدل وسفسطہ کا مظاہرہ کرتے ہیں کیونکہ نظری ابحاث میں کافی توسع ہوتا ہے، لیکن جزئیات جو کہ فقہاء کی اعلیٰ بصیرت کا شاہکار ہیں اس کے میدان میں بہت کم نزول فرمائیں گے۔ کیونکہ ''اس میں لگتی ہے محنت زیادہ'' اور جب بھی بھولے سے یا مجبوری سے اس میدان میں آتے ہیں تو ان کا حال وہی ہوتا ہے جو امریکی فوج کا افغانستان کی سرزمین میں نزول کرنے کے بعد ہوا یا ہو رہا ہے۔ جزئیات میں علم وفضل کی قلعی فوراً کھل جاتی ہے اور اجتہاد کا بھانڈا جلد ہی پھوٹ جاتا ہے۔

۸: دیکھیے فراہی صاحب کی کتاب ''القائد الی عیون العقائد'' کا مقدمہ جس میں فراہی صاحب لکھتے ہیں:

ان علماء نا المتقدمين قد صنفوا في علم العقائد كتبا كثيرة ولاشك انهم قد افرغوا جهدهم في هذا المجال ولكن مما لاشك انهم لم ينجحوا في جهودهم وذلك لكثرة اشغالهم بالمعقول وقلة اهتمامهم بالمنقول وانها شر فتنة وقعت فيها الامة بعد القرن الاول حينما اشاعت الفلسفة بينهم وذهبت حكمة القرآن عنهم..... والشاهد على ماقلنا جميع المولفات الكلامية الموجودة في مكتباتنا ومدارسنا تدرس وتدارس فيها الى الآن وانهم وان لم يولفوها الا لاثبات الحق وابطال الباطل ورفع الاختلاف في مابيننا ولكن لم ينجحوا في تحقيق آمالهم لانهم تركوا القرآن الحكيم الذى كان منار العلم واليقين ومالوا الى العقليات الفاسدة التي ليس في حجيتها الا الشك والتخمين.

.... وهكذا وقع الاختلاف في اعمال العبد هل هي مخلوقة لله تعالى ام لا؟ واستدلوا بآية والله خلقكم وماتعملون....... وانما نشا الاختلاف بينهم لانهم لم يتفكروا في معنى الآية ولو تدبروا فيها بسياقها وما اقتضاه نظامها لم يستدلوا بها على خلق الاعمال لله تعالى ..

۹: اور یہی کام غامدی صاحب کے مولوی تلامذہ مثل عمار خان وفیصل خورشید جاپان والا وغیرہ کرتے بھی ہیں۔

☆......☆......☆.....☆

غامدی فتنہ میری نظر میں!

......مختلف اہل علم وقلم کے تبصرے......

چند مختصر تحریرات......اور......طوالت کی وجہ سے شائع نہ ہوسکنے والے بعض مضامین کے اقتباسات

مولانا حافظ زاہد حسین رشیدی [سنی اکیڈمی، جامعہ اہل سنت تعلیم النساء، چکوال]:

معروف اسکالر جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے دھیمے اور مدلل اندازِ تحریر وتقریر سے پڑھے لکھے طبقے کو متاثر کیا ہے۔لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ وہ جب ''تحقیق دین'' کرنے نکلے تو ان سے بہت سے مقامات پر سنگین کوتاہیاں ہوئیں، انھوں نے عقائد ونظریات کی دنیا میں اپنا جداگانہ تشخص اجاگر کیا اور ایسے ایسے نکتہ ہائے نظر تراشے جن سے امت مسلمہ کے اہل علم آشنا نہ تھے۔صدیوں کی علمی تحقیقات پائمال کیں اور امت کی نظریاتی وحدت کو شدید نقصان پہنچایا۔تعجب ہے کہ جو طبقہ نت نئے شگوفے ایجاد کر کے امت کو منتشر کرے وہ اتحاد امت کا علمبردار کہلاتا ہے اور جو امت کو اسلاف سے جوڑ کر وحدت کی طرف بلائے اسے فرقہ واریت کی سند دے دی جاتی ہے۔ ؎ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

غامدی صاحب کی یہ پھسلن محض اتفاقی نہیں بلکہ ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اور وہ یہ کہ انھوں نے باضابطہ علم دین کے لیے کسی مستند درسگاہ سے رجوع کیا اور نہ اہل علم کے حضور شاگرد کی حیثیت سے پیش ہو کر تحقیق کی تکنیک سے واقف ہوئے۔خداداد ذہانت کے بل بوتے پر رطب ویابس پڑھتے گئے اور اس انجام کو پہنچے جہاں ان جیسے دانش ور پہنچا کرتے ہیں۔مطلب امت میں صدیوں سے چلے آئے نظریات واعمال سے ہٹ کر اپنا الگ مکتب فکر متعارف کروادیا۔

میرے مدعٰی کی وضاحت کے لیے مجلہ صفدر کا ''غامدی نمبر'' شائع کیا جارہا ہے، جس کے تفصیلی اور منصفانہ مطالعہ سے آپ غامدی صاحب کی لغزشات کا ادراک کرتے ہوئے امت کو اس معاملہ کی ہولناکی سے آگاہ کر کے اپنا فریضہ پورا کریں گے۔ان شاء اللہ

اس موقع پر ایک گذارش اپنے علماء کرام کے حضور بھی پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خدارا! غامدی صاحب اور ان جیسے دوسرے حضرات کے اثر کو زائل کرنے کے لیے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کو بھی اپنی ''وراثت نبوت'' کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ورنہ خاکم بدہن بہت سے غامدی

صاحبان وقت پیدا کرے گا اور ہم چیں بجبیں ہوتے اور کڑھتے ہی رہیں گے

ع شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

خدا تعالیٰ ''مجلہ صفدر'' کی اس کاوش کو شرف قبولیت نصیب فرمائیں اور صفدر کی پوری ٹیم بالخصوص عزیزم حمزہ احسانی کے ذوق وجنوں کو سلامت رکھیں۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین۔

حافظ شمس الدین خان طلحہ صفدری [گوجرانوالہ]:

''انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ہر طرح سے آزاد رہنے کو پسند کرتا اور قید وبند کی زندگی کو اپنی خواہشات اور اہوا کے پورا کرنے میں مزاحم پاتا ہے۔ وہ ہر ایسی زندگی کی طرف لپک کر آگے بڑھتا ہے جو اس کو ہر قسم کی جسمانی وروحانی عقلی اور ذہنی آزادی کا پروانہ دیتی ہو اور ہر اس زندگی کے تسلیم کرنے میں تامل اور پس وپیش کرتا ہے، جو اس کو ایک خاص دائرہ عقائد واعمال، اخلاق اور معاملات میں مقید کردینا چاہتی ہو۔ اس عمومی فطرت کے ساتھ ان وساوس اور خطرات اور شکوک وشبہات کو بھی اگر ملا لیا جائے جو ہر وقت عدو مبین ابلیس لعین القاء کرتا ہے تو بدی کی گاڑی اور تیز ہو جاتی ہے اور اس نام نہاد دور تہذیب وتمدن میں عقائد واعمال، اخلاق ومعاملات سے جو کھلی چھٹی ملی ہے اس کی مثال قرون اولیٰ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ اس پرفتن دور میں عقلی اور ذہنی آزادی کا یہ عالم ہے کہ ہر وہ چیز جو از قسم معجزہ یا کرامت ہے یا جس میں خرق عادت کا کہیں ذکر آجاتا ہے یا جو قادر مطلق کی قدرت کا ایک خاص نمونہ ہوتی ہے اس کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ خلاف عقل ہے، سمجھ سے بالاتر ہے، نظام قدرت کے مخالف ہے، سائنس کے اصول سے ٹکراتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ کی انتہائی قدرت پر اور اس کے نظام پر پورا عبور حاصل ہے اور یہ اس کے ٹھیکہ دار اور اس پر حاوی ہیں (العیاذ باللہ) اور منکرین حدیث بھی اکثر حالات میں حدیث سے محض اس لیے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کے نفس کی آسودگی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں چھوڑتی یہ تو ان کے ضمیر، سیرت، کردار، اخلاق، نفس اور پوری زندگی کے لیے سخت آزمائش ہے یہ گویا اس کے لیے پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے اور یہاں ہی سے آپ کو حق وباطل کی کشمکش اور اسلام وجاہلیت کی مستقل آویزش وپیکار نظر آجائے گی اور اللہ والے صرف یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے خزاں رسیدہ چمن میں پھر سے بہار آجائے۔

عجب کیا ہے کہ بیڑہ غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

[صرف ایک اسلام:۲۱،۲۲]

''عوام الناس کو یہ بات پریشاں کیے ہوئے ہے کہ جو بھی اسلامی یا منسوب بہ اسلام فرقہ (غامدی ٹولہ بھی

ایک فرقہ کا روپ دھار چکا ہے [ناقل]) اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ قرآن وحدیث ہی کا نام لیتا ہے اور اپنے استدلال میں قرآن وحدیث ہی کو پیش کرتا ہے اب ہم کس کو صحیح اور کس کو غلط اور کس کو حق پر اور کس کو باطل پر سمجھیں؟؟ واقعی یہ شبہ اکثر لوگوں کے مغالطہ کے لیے کافی ہے لیکن اگر انصاف خدا خوفی اور دیانت کے ساتھ اس بات پر غور کر لیا جائے کہ آخر یہی قرآن وحدیث حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین عظام اور ائمہ دین و بزرگان صالحین کے سامنے بھی تھے ان کا جو مطلب و معنی اور جو تفسیر و مراد انہوں نے سمجھی وہی حق و صواب ہے باقی سب غلط ہے۔ پس عوام کا یہ کام ہے کہ ہر باطل پرست اور خواہش زدہ سے یہ سوال کریں کہ فلاں آیت اور فلاں حدیث کی جو مراد تم بیان کر رہے ہو آیا یہ سلف صالحین سے ثابت ہے؟؟ اگر ہے تو صحیح و صریح حوالہ بتاؤ چشم ما روشن دل ما شاد، ورنہ یہ مراد جو تم بیان کرتے ہو اس قابل ہے کہ اسے

ع اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں!

عوام اس قاعدہ اور ضابطہ کے بغیر اور کسی طرف نہ جائیں پھر دیکھیں کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اور قرآن وحدیث کی مراد کون سی صحیح ہے؟ اگر وہ ایسا نہ کریں گے اور اس میں کوتاہی کریں گے تو ضروریات دین میں غلطی کی وجہ سے بھی عنداللہ سرخرو نہیں ہو سکیں گے اور اپنی طاقت اور وسعت صرف نہ کرنے کی وجہ سے جو گناہ قرآن وحدیث کی تحریف کرنے والوں کو ملے گا اس میں ماننے والے بھی برابر کے شریک ہوں گے اس ضابطہ کے لیے چند حوالے ملاحظہ فرمائیں تاکہ پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

(۱) .....خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفی ۱۰۱ھ) کے سامنے منکرین تقدیر نے جب یہ دلیل پیش کی قرآن کریم کی بعض آیات سے تقدیر کی نفی ثابت ہوتی ہے، اس لیے تقدیر کا عقیدہ نہ ضروری ہے اور نہ ثابت بلکہ اس کا انکار ہی قرآن کریم کی بعض آیات کے موافق ہے، تو ان کے اس بے بنیاد شبہ کو دور کرنے کی غرض سے انہوں نے ارشاد فرمایا کہ

لقد قرءوا منه ما قرأتم و علموا من تأويله ما جهلتم وقالوا بعد ذلك كله بكتاب و قدر.

[أبو داؤد: ۲/۲۷۸]

یعنی حضرات صحابہ کرامؓ اور تابعین وغیرہم نے قرآن کریم کی یہ آیتیں بھی پڑھی ہیں جو تم نے پڑھی ہیں لیکن وہ ان کی مراد کو سمجھے ہیں اور تم نہیں سمجھے اور انہوں نے یہ سب آیات پڑھ کر تقدیر کا اقرار کیا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جن آیات سے تم نے تقدیر کے انکار کا مفہوم سمجھا ہے، یہی آیات حضرات صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے سامنے بھی تھیں پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان آیات کا وہ مطلب نہ سمجھ سکے جو تم نے سمجھ رکھا ہے، یہ کیونکر تسلیم کیا جائے کہ تم حق پر ہو اور وہ (معاذ اللہ) باطل پر تھے یعنی حق صرف انہی حضرات کے ساتھ ہے اور تم سراسر غلط کار ہو اور یہ فہم تمہارے لیے باعث وبال جان ہوگی۔

(۲) .....حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اے نیک بخت! جو چیز ہم پر اور تم پر لازم ہے وہ کتاب وسنت کے مطابق عقیدوں کو درست کرنا ہے اس طریقہ پر جس پر علماء اہل حق نے (اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو بارآور کرے) کتاب وسنت سے ان عقائد کو سمجھا ہے اور ان سے اخذ کیا ہے کیونکہ ہمارا اور تمہارا سمجھنا جب کہ ان کی سمجھ کے موافق نہ ہو درجہ اعتبار سے ساقط ہے کیونکہ ہر مبتدع اور گمراہ اپنے باطل احکام کو کتاب وسنت سے سمجھتا ہے اور انہی سے لیتا ہے حالانکہ اس کا سمجھنا حق کی کسی چیز سے کفایت نہیں کر سکتا۔ [مکتوبات، مکتوب ۱۵۷ وتنقید متین بر تفسیر نعیم الدین: ۱۸۰ تا ۱۸۲]

''محدثین کرام نے حدیث کی جتنی چھان بین کی اور اپنی تمام عمریں اس کی حفاظت میں صرف کر دیں اور جس طرح بے لاگ تنقید انہوں نے کی وہ کس سے مخفی ہے؟ مگر منکرین حدیث (غامدی صاحب وغیرہ ناقل) کا سب سے زیادہ ٹھیک نشانہ ہی ان اکابر کا وجود ہے وہ طرح طرح سے ان کو کوستے ہیں اور دینی ناواقف نوجوان طبقہ کی نگاہوں میں ان کو ذلیل اور حقیر کرنے کی محض اس لیے کوشش کرتے ہیں تا کہ ان کی محنت اور کوشش کو خاک میں ملا دیا جائے، آہ۔۔!!

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے فلک نے تھے جو خاک چھان کے

ان اکابر نے حدیث کے صحیح اور ضعیف ہونے کا جو معیار امت کے سامنے پیش کیا ہے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم اس کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتی ان اکابر نے ضعیف کمزور معلل منکر اور من گھڑت و جعلی حدیثوں کے لیے الگ کتابیں لکھ کر ان کو جمع کر دیا ہے تا کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو ایسی متروک حدیثوں سے شک اور شبہ پیدا نہ ہو۔ [صرف ایک اسلام: ۲۹، ۳۰]

یہ ساری بات اس لیے کرنی پڑیں کہ جناب غامدی صاحب کے افکار ونظریات ہیں کہ:

(۱) سنت قرآن سے مقدم ہے۔ [میزان: ۵۲، طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء]

(۲) سنت صرف ستائیس (۲۷) اعمال کا نام ہے۔ [میزان: ۱۰، ۶۵، طبع دوم اپریل ۲۰۰۲ء]

(۳) ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن میں کوئی فرق نہیں، ان دونوں کا ثبوت اجماع اور عملی تواتر سے ہوتا ہے۔ [میزان: ۱۰]

(۴) حدیث سے کوئی اسلامی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔ [میزان: ۶۴]

(۵) نبی ﷺ کی رحلت کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ [ماہنامہ اشراق، دسمبر ۲۰۰۰، ص: ۵۴، ۵۵] وغیرہم اس کی مکمل تفصیل ''غامدی نمبر'' میں قارئین ملاحظہ فرما چکے ہوں گے۔ آیا یہ افکار ونظریات وہی ہیں جو حضرات صحابہ کرامؓ، تابعین عظام، سلف صالحین نے اخذ کیے؟ یقیناً نہیں تو پھر ایسے نظریات کو اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں!

اس لیے ہمیں انہی نظریات پر کاربند رہنا چاہیے جو ہمیں حضرات صحابہ کرام، تابعین عظام اور سلف صالحین سے ملے، اسی میں ہماری کامیابی ہے۔ اللہ تعالی سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

مولانا محمد رضوان عزیز [دفتر ختم نبوت، چناب نگر]:

جاوید احمد غامدی صاحب ۱۸/اپریل 1951 کو پاکستان میں پیدا ہوئے اور پیدا ہونے سے تا حال ہر روز نئے زاوئے سے جنم لینے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ اور ان کے افکار معتقدات اور قدم قدم پر گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے نظریات روز اول ہی سے ہدف تنقید رہے ہیں، پھر بدقسمتی سے ان کو سرپرستی ایسے افراد کی مل گئی جو لباس خضر میں فرائض رہزنی سرانجام دے رہے تھے اور مغربی افکار ونظریات کی باسی سرانڈ کو مشرقی تہذیب میں گوندھ کر روشن خیالی کی تاریکی پھیلا رہے تھے۔

فتنہ انکار حدیث جو ہر دور میں مختلف روپ دھار کر اپنے گل کھلاتا رہا۔ اس کے وقوع کی خبر تو جناب سرکار دو عالم ﷺ نے زبان نبوت سے ارشاد فرمادی تھی، دین کے دشمنوں نے چونکہ لبادے بدل بدل کر دین اسلام پر حملے کیے، کبھی تو حبِ اہلِ بیت کے لبادے میں بغضِ صحابہ کو فروغ دیا، اور کبھی حامیان اہلِ بیت بن کر ہی اہلِ بیت کی ناموس پر حملہ آور ہوئے۔ اور بسا اوقات حبِ صحابہ کا مقدس عنوان اختیار کر کے اہلِ بیت کی عزت پر حملہ آور ہوئے اور کبھی اسی دفاعی حصار میں رہ کر حضرات صحابہ کی کردار کشی کی گئی۔ بعینہ یہی معاملہ قرآن وسنت اور فقہ کے ساتھ ہوا۔ بعض نے تو کھلم کھلا قرآن کا انکار کیا اور کہا کہ یہ موجودہ قرآن خدا کا نازل کردہ نہیں ہے۔ اور کبھی انکار کا حوصلہ نہ ہونے کی وجہ سے حب قرآن واہلِ قرآن ہونے کا لبادہ اوڑھا اور من مانی تفسیر کر کے اسی قرآن کا حلیہ بگاڑنا شروع کر دیا۔ یہی ظلم حدیث مبارکہ سے بھی ہوا کہ بعض نے اپنی کج فہمی کی بنا پر کھلم کھلا حدیث کو قرآن کا مخالف سمجھا اور اسے چھوڑ دیا اور بعض نے اپنی تحقیق کی خوش فہمی میں جب حدیث کے نام پر ذخیرۂ احادیث کو غیر معتبر کرنے کا منحوس کارنامہ سرانجام دیا۔ الحاد وبے دینی کے اس ماحول میں قرآن وحدیث، شریروں کے شر سے محفوظ نہ رہے تو فقہ کیسے ان کے دست برد سے بچ سکتی تھی؟ پس بعض فقہی مسائل کا بہانہ بنا کر کل ذخیرۂ احادیث کا انکار کیا اور بعض فقہ کے نادان دوستوں نے ایسی موشگافیاں کیں کہ فقہ کے نام پر اپنی بدعات کو تحفظ فراہم کرنا شروع کر دیا۔

جناب نبی کریم ﷺ نے ۱۴سو سال پہلے جس بات کی پیشین گوئی فرمائی تھی، جس کا مفہوم یہ ہے:
قیامت میں ایسے لوگ نمودار ہوں گے جن کے ہاں ذخیرۂ احادیث بے فائدہ ہوگا اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں آپ ﷺ کی احادیث کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہوں گے۔

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں یہ بتلایا گیا کہ منکرین حدیث زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے جو فکر

معاش سے آزاد اپنے تکیوں سے ٹیک لگا کر بے فکر زندگی گزار رہے ہوں گے اور اپنی بیکاری جنوں میں سر پیٹنے کا شغل اختیار کرنے کی بجائے احادیث کو رگیدنے کا شغل اختیار کیے ہوئے ہوں گے۔ موصوف جاوید احمد غامدی صاحب بھی عقل وخرد سے تو تہی دست تھے ہی مگر مستشرقین یورپ کی کرم فرمائیوں نے فکرِ معاش سے بھی آزاد کر رکھا ہے۔ لہٰذا اپنی کٹ حجتیوں سے ذخیرۂ احادیث کو مشکوک یا غیر معتبر بنانے کی مذموم حرکات کرنے میں مشغول ہیں اور بدقسمتی یا اس بدنصیب کی خوش نصیبی کہ اس بیہودہ عمارت کی تعمیر میں ایسے معمار مل گئے جنہوں نے اس کے آب ودانہ کی خاطر چمن کا بھرم اور گلوں کی آبرو خاک میں ملا دی۔

موصوف غامدی صاحب حدیث کے بارے میں اپنی ملمع سازی پر مبنی قلعی دار گفتگو یوں فرماتے ہیں:

> رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار احاد جنھیں بالعموم احادیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔

[میزان، ص:۱۵، طبع سوم ۲۰۰۸......اصول ومبادی، ص:۱۱، طبع دوم ۲۰۰۵]

مولانا مبشر بدر [مظفر گڑھ]:

کچھ عرصہ سے ایک مخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے اس مغربی فکر کو پروان چڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ”اسلام کے احکامات میں تبدیلی کرنی چاہیے، اسے جدید دور سے ہم آہنگ کیا جانا چاہیے“۔ جن میں سرِ فہرست اسلامی ریاست کا قیام، حدود وتعزیرات، تعددِ ازواج، طلاق، جہاد، اسلامی لباس وشباہت (ڈاڑھی اور پردہ) اور بیسیوں اسلامی احکامات میں تبدیلی اور ترمیم کرنا ہے۔ اِسی آڑ میں انہیں احکامات کو زیادہ نشانہ ملامت بنایا جا رہا ہے اور ان کی تبدیلی پر سارا زور صرف کیا جا رہا ہے۔ چونکہ علماء کرام اس مقصد میں کامیابی کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اس لیے وہ اکثر ان کے نشانہ پر رہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام کے قطعی اور اتفاقی مسائل میں تبدیلی کی گنجائش بالکل نہیں جو ہر دور کے لیے یکساں حیثیت رکھتے ہیں، جب کہ نئے پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی گنجائش ہے، جن کو ماہر علماء اجتہاد کر کے حل کرتے ہیں۔ اور ”متجددین“ ایسے لوگوں کو کہا جاتا ہے جو دین کی تشکیلِ نو اور تدوینِ نو کا ایجنڈا لے کر اٹھے ہیں۔ یہ درحقیقت مغربیت کے اس نظریئے سے متاثر ہیں کہ شریعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل نہیں کی گئی بلکہ یہ آقا علیہ السلام کے وضع کردہ قوانین ہیں، لہٰذا ان انسانی وضع کردہ قوانین میں زمانہ کی وجہ سے تبدیلی کرنی چاہیے۔ جس کے لیے سارا زور صرف کیا جا رہا ہے۔

اہل کلیسا کی طرف سے مسلمانوں کی وحدت میں چھرا گھونپنے کے لیے اسلامی صفوں سے کئی ایسے لوگ کھڑے کیے گئے ہیں جو اپنی چرب زبانی اور طلاقتِ لسانی سے یہ کام سرانجام دے رہے ہیں۔جن میں سے ایک جاوید احمد غامدی ہے۔جسے الیکٹرانک اور پریس میڈیا کے ذریعے مقبول کیا جارہا ہے تاکہ وہ اسلامی متفقہ مسائل میں رخنہ اندازی کرکے انہیں مشکوک بنائے۔اس طرح کفریہ طاقتوں کے لیے اسلامی سرحدات کی طرح اسلامی احکامات ونظریات پر شب خون مارنے کے لیے راستہ ہموار ہو جائے۔

ہمارے زمانے میں فتنۂ انکار حدیث کی آبیاری کرنے والوں میں ایک بڑا نام موصوف کا ہے جن کی تحقیقات کا میدان تحریفِ قرآن تک پھیلا ہوا ہے۔اس شخصیت کی تلاش میں کچھ زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔کوئی بھی ٹی وی چینل کھول لیں اس پر دینی اقدار کے خلاف اپنی سوچ کو بطور حجت پیش کرتے ہوئے جو شخص دکھائی دے وہی دورِ حاضر کا فیضی یعنی جاوید غامدی ہے۔جن کا سنت کی تعریف سے لے کر قرآن حکیم تک اُمت سے اختلاف ہے اور موصوف کا دعویٰ ہے کہ چودہ سو برس میں دین کو ان کے سوا کوئی سمجھ ہی نہیں سکا۔جاوید احمد غامدی صاحب دورِ حاضر کے فتنوں میں ایک عظیم فتنہ ہیں۔خصوصی طور پر ہمارا نوجوان، دنیاوی تعلیم یافتہ، اردو دان طبقہ کافی حد تک اس فتنہ کی لپیٹ میں آچکا ہے۔فی زمانہ غامدی فکر ایک مکمل مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

یہ دورِ حاضر کا ایک تجدد پسند گروہ **(Miderbusts)** ہے۔جس نے مغرب سے مرعوب و متاثر ہو کر دین اسلام کا جدید ایڈیشن تیار کرنے کے لیے قرآن وحدیث کے الفاظ کے معانی اور دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ بھیڑ کے روپ میں ایک بھیڑیا ہے۔

جو لوگ بے عملی کا شکار ہوتے ہیں وہ دین اور دینی احکام کا ذکر آنے پر کسی آسانی کی تلاش میں رہتے ہیں اور کسی ایسی پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں جو اس احساس سے ان کی جان چھڑا دے۔ایسے میں یہ نام نہاد سکالرز ان کے کام آتے ہیں اور ؎ خود بدلتے نہیں قرآن بدل دیتے ہیں

دین اور اہل دین سے دوری کا ایک نقصان یہ بھی ہے کہ نفس اور شیطان انسان پر حاوی ہو کر اسے خواہش پرست اور آزادی پسند بنا دیتے ہیں۔ایسا انسان جس چیز کو اپنی غرض، خواہش اور مشن کے لیے سدِ راہ اور رکاوٹ خیال کرتا ہے، غلط تاویلات اور فاسد خیالات کے ذریعہ اس کا انکار کر دیتا ہے۔جن لوگوں نے اپنے عزائم اور فاسد نظریات کی ترویج میں احادیث کو رکاوٹ گردانا، انہوں نے حجیت

حدیث کا انکار کیا۔قرآن پاک میں واضح ارشاد ہے کہ: وما اٰتکم الرسول فخذوہ ومانھٰکم عنہ فانتھوا۔ [الحشر:۵۹،ع۷] ترجمہ:رسول جو کچھ تمہیں دیں،اس کو لے لو،اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو۔

غامدی صاحب نہ صرف منکرِ حدیث ہیں بلکہ اسلام کے متوازی ایک الگ مذہب کے علمبردار ہیں۔یہ صاحب اپنی چرب زبانی کے ذریعے اس فتنے کو ہوا دے رہے ہیں۔ان کو الیکٹرانک میڈیا کی توجہ و سرپرستی حاصل ہے۔

غامدی صاحب کے منکرِ حدیث ہونے کے کئی وجوہات ہیں۔ وہ اپنے من گھڑت اصول حدیث رکھتے ہیں۔حدیث و سنت کی اصطلاحات کی معنوی تحریف کرتے ہیں اور ہزاروں اُحادیثِ صحیحہ کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ نسل اور عوام کی ایک بڑی تعداد پہلے ہاتھ ہی یہ کہہ دیتی ہے کہ احادیث میں تو تضاد ہے۔یہی وہ پہلا خفیہ پینترا ہے جس کے ذریعے پھر بڑی چابک دستی کے ساتھ انکارِ حدیث کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

ہم خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں تادم مرگ ایمان کامل کے ساتھ رکھے، ہدایت کو ہمارا مقدر بنائے، سرکشوں، بدمذہبوں کی صحبتوں اور ان کے وار، مکر و فریب سے ہمیشہ بچائے رکھے۔اگر ہدایت ان کا مقدر ہے تو جلد انہیں ہدایت یافتہ لوگوں میں شامل فرما دے ورنہ انہیں ان کے انجام بد تک پہنچائے۔آمین۔

مولانا عبید محمد [خیبر ایجنسی]:

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں جنم لینے والے بعض فتنوں مثلاً خوارج، معتزلہ، باطنیہ، قادیانیت اور منکرین حدیث کی طرح دورِ حاضر میں ایک بڑا فتنہ ''تجدد پسند الحاد فکری'' ہے، جس کا مقصد امت مسلمہ کو اس کے ماضی سے کاٹ دینا اور اسے دین اسلام کی چودہ سو سالہ متفقہ اور متوارث تعبیر سے محروم کر دینا ہے۔

مغرب سے مرعوبیت کے زیر اثر ہمارے ہاں تجدد پسندی اور انکار حدیث کا فتنہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے پھیلایا جا رہا ہے، اس کا آغاز تو سر سید احمد خان سے ہوا تھا، پھر چند اور حضرات اسے لے کر آگے بڑھے، پھر غلام احمد پرویز صاحب نے اسے خوب پروان چڑھایا اور اب جاوید احمد غامدی صاحب نے اسے ضلالت اور گمراہی کی آخری انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ جدیدیت کے نئے نام سے پھیلنے والا یہ فتنہ، فتنہ ہزار رنگ ہے، جو

قادیانیت، پرویزیت، مغربیت، تجدد' اعتدال پسند روشن خیالی' جیسے عناصر کا مرکب ہے۔ اس میں مسلمہ دینی امور کے بارے میں شکوک وشبہات اور غلط تاویلات ہیں۔ قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے۔ اس کی ایک سوا باقی تمام قراءتوں کا انکار ہے۔ احادیث وسنن کا استخفاف اور انکار ہے۔ دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنے کی سازش ہے۔ مسلمات دین اور اجماع امت کا انکار ہے۔ علمائے دین کی تحقیر ہے۔ مغربی تہذیب کو اسلام کے لبادے میں پیش کرنے کی ناپاک جسارت ہے۔ مسلمان عورتوں کے لیے پردے کے شرعی حکم کا اور شراب نوشی پر شرعی سزا کا انکار ہے۔ مجسمہ سازی، موسیقی اور گانے بجانے کا جواز ہے۔

ہم علمائے کرام سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ انھوں نے جس طرح ہر دور میں باطل فتنوں کی سرکوبی فرمائی ہے ایسے ہی اب غامدیت کے اس نوزائیدہ فتنے کا بھی تعاقب کر کے اس کا قلع قمع فرمائیں جو ہمارے ہاں ٹی وی اسکرین، چند سرمایہ داروں کی نظر کرم اور سرکاری دربار کی سرپرستی میں پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ فتنہ آستین کے سانپ کی طرح نہایت خطرناک ہے، کیونکہ دوسرے فتنے تو ایک سادہ لوح مسلمان بھی پہچان لیتا ہے (اور انھیں فتنہ سمجھ کر ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔) مگر اس فتنے کی پہچان ہر کس وناکس کا کام نہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اصطلاحات تو ہماری (اہل سنت کی) استعمال کرتے ہیں مگر مطلب اپنا (خود ساختہ) بیان کرتے ہیں جس کی وجہ سے عام مسلمان دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اس لیے علمائے کرام کو اس فتنے کے خلاف سنجیدگی سے کام کرنا چاہیے، تاکہ عام مسلمان دھوکہ کھانے سے بچ سکے۔

مولانا محمد ابوبکر [لیہ]:

امت مسلمہ کے چودہ سو سالہ متفقہ مسلمات سے انکار اور روشن خیالی وتجدد پسندی کے نام پر عوام، بالخصوص نوجوان نسل کو گمراہ کرنے کا نام "غامدیت" ہے۔ یہ خطرناک فتنہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو تمام فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آمین

مولانا مفتی نجیب اللہ [کراچی]:

اسلام کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جدوجہد اور عوام مسلمین کو بیکھز دے کر دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی سازش کا نام غامدیت ہے۔

مولانا محمد عمران مقبول [بہاول پور]:

غامدیت پورے دین اسلام کو بگاڑنے اور اس میں فساد برپا کرنے کا دوسرا نام ہے۔اور اسلام کے متوازی ایک نیا مذہب ہے۔

مولانا سید زین العابدین [کراچی]:

جناب! جاوید غامدی صاحب پر نقد تو اہل علم ہی کریں گے، ہماری رائے میں تو غامدی کے افکار ونظریات نے امت کے بعض ان صاحب نسبت اہل علم کو کھنچا (گمراہ کیا) اور امت کو ان کے فیض سے محروم کیا جن کی اس دور قحط الرجال میں امت کو سخت ضرورت ہے۔

مولانا محمد ہشام [گلبرگ، لاہور]:

عامۃ المسلمین کے متوارث مسلمات میں مختلف کتب کے ذریعے بغیر کسی اُصول وقواعد کے تشکیک پیدا کرنے کی ایک کوشش۔ تاکہ ذہنِ جدید کی رعایت ہو سکے اور اس کی ترجیحات کے موافق دین کی تعبیر جدید ہو سکے۔

مولانا مسعود خوشابی [منڈی بہاؤالدین]:

فکری ارتداد کا نام غامدیت ہے۔

محمد نعمان امین [کراچی]:

غامدی مذہب میری نظر میں نجاست کا ایسا ڈھیر ہے، جس پر چاندی کے ورق چڑھا کر میڈیا میں پیش کیا جاتا ہے۔

چوہدری محمد راشد فاروق [گجرات]:

غامدی مذہب سراسر گمراہی اور دین اسلام سے دوری ہے۔

مولانا شفیق احمد سلیم مدظلہ [استاذ الحدیث: جامعہ مفتاح العلوم، سرگودہا]:

غامدی تحریک خطرناک نظریاتی وفکری فتنہ ہے۔اور خوفناک صورتحال یہ ہے کہ اس کا شکار وہ طبقہ ہو رہا ہے جو ذہن وعقل کی دولت سے مالا مال ہے۔اور ان میں کسی ایک کی گمراہی دسیوں کی گمراہی کا پیش خیمہ ہے۔لہٰذا اس کی روک تھام اور سرکوبی کے لیے جتنا کچھ بن پڑے، دریغ نہ کیا جائے۔

☆......☆......☆......☆

......دارالامین [لاہور] کی مطبوعات......

......باب نمبر ۷......

فتاویٰ جات

قرآن وسنت کی روشنی میں غامدی کا شرعی حکم

مختلف مفتیان کرام کے فتاویٰ

فتنۂ غامدی نمبر کے اِس حصہ میں غامدی فتنے سے متعلق اہلِ علم کے فتاویٰ جات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ہر زمانے کے راسخ اہلِ علم نے میدانِ مناظرہ میں اُتر کر جہاں علمی دلائل کے ذریعے باطل کو لاجواب کیا، وہیں اُس باطل کے بارے میں واضح اور دوٹوک موقف کو فتوے کی صورت میں بیان کر کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت کا فریضہ بھی انجام دیا۔

دلائل کی اہمیت اپنی جگہ واضح ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عوام کی اکثریت، جو کہ علمی دنیا سے ناآشنا اور مناظرے کے فن سے ناواقف ہوتی ہے، اُس کے ایمان کا تحفظ دلائل کے ذریعے نہیں بلکہ مسلّم اہلِ علم اور اہلِ فتویٰ کے ''فتاویٰ'' سے ہوتا ہے۔ مرزا قادیانی کی کتابیں اور اُن کا رد شاید ایک فیصد عام مسلمانوں نے بھی نہ پڑھے ہوں، لیکن اکابر اہلِ علم کی پاکیزہ شخصیات اور اُن کے فتاویٰ پر اعتماد کی بدولت قادیانیوں کا کفر بچے بچے کے نزدیک قطعی اور کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔

منکرینِ زکوٰۃ کے شرعی حکم کے بارے میں امام الصحابہ حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا دوٹوک اور واضح 'فتویٰ' صحابہ کی پاکیزہ جماعت کے شرحِ صدر کا باعث بنا، اُس کے بعد سے اَب تک جب بھی کوئی فتنہ اُٹھا تو کسی بوحنیفہ وابن حنبل، کسی بخاری یا کسی مدنی وکشمیری کا ''فیصلہ وفتویٰ'' ہی لاکھوں اہلِ اسلام کے ایمان کی حفاظت کا سبب بنا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ اور دیگر اہلِ علم حضرات اگر صرف علمی دلائل تک بات کو محدود رکھتے اور اپنے زمانے کے اہلِ باطل کی شرعی حیثیت سے عوام الناس کو آگاہ وخبردار نہ کرتے تو لاکھوں، بلکہ شاید کروڑوں لوگ ان فتنوں کی ضلالت سے کماحقہٗ آگاہ نہ ہو پانے کی بناء پر گمراہی کے گڑھے میں جا گرتے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی بھی جگہ اہلِ علم کے ''فتویٰ'' کا ذکر سن کر دورِ حاضر کے فتنہ بازوں کے رنگ فق ہو جاتے ہیں اور سادہ لوح عوام کو بہلا پھسلا کر گمراہ کرنے اور علمائے کرام سے دُور رکھنے کی اُمیدوں کے دیئے ٹمٹمانے لگتے ہیں، اور وہ آخری بے جان حربہ کے طور پر ''فتویٰ نہیں مکالمہ......فتویٰ نہیں، مکالمہ'' کا غل مچانے، فتویٰ کی تحقیر وتذلیل کرنے، یا ماضی کے لاکھوں برووقت اور برمحل فتووں کو پس پشت ڈال کر اُن اِکا دُکا فتووں کو لے کر اُچھالنے لگتے ہیں جن میں کسی مفتی سے خطاء ہوگئی ہو۔ تاہم ان شاء اللہ عوام کا اہلِ علم سے اعتماد اُٹھانے کی اِن حضرات کی کاوششیں ناکام ہیں اور ناکام رہیں گی۔

اپنے اکابر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم غامدیت کا مدلل رد کرنے کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کے جید علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کو بھی پیش کر رہے ہیں تاکہ اہل السنۃ والجماعۃ اِن کی روشنی میں غامدیت کے حکم اور اُس کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ (مفصل فتاویٰ دوسری جلد میں شائع ہوں گے۔ ان شاء اللہ)

"لیھلک من ھلک عن بینۃ و یحییٰ من حی عن بینۃ، وان اللہ لسمیع بصیر"

باسمہ تعالیٰ

جاوید غامدی اور اس کے متعلقین کے بارے فتاویٰ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین: جاوید احمد غامدی کے بارے میں، جس کے مذکورہ ذیل عقائد وخیالات ہیں اور ان کی دعوت واشاعت میں ہمہ تن مصروف ہے، شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کی رُو سے اس کا کیا حکم ہے؟

۱......حیات ونزول عیسیٰ کا منکر ہے۔ کہتا ہے عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔

[اشراق مئی ۲۰۰۸ء، ص:۶۶]

۲......ظہور مہدی کا بھی منکر ہے، کہتا ہے کہ قیامت کے قریب کوئی مہدی نہیں آئے گا۔ (اگر کوئی مہدی تھا تو وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھے۔ جو گزر گئے۔) [میزان، علامات قیامت، ص:۱۷۷، طبع مئی ۲۰۱۴]

۳......(مرزا غلام احمد قادیانی) غلام احمد پرویز سمیت کسی کو بھی کافر تسلیم نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ کسی بھی امتی کو کسی کی تکفیر کا حق نہیں ہے۔ [اشراق، اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص:۶۷......جنوری ۲۰۱۰ء، ص:۶۳]

۴......حجیت حدیث کا منکر ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ حدیث سے دین میں کسی عمل یا عقیدے کا اضافہ بالکل نہیں ہوسکتا۔ حدیث شریف اور سنت رسول سے قرآن پاک کی تخصیص وتحدید کا بھی منکر ہے۔ کہتا ہے: حدیث مبارکہ میں جو چیز (اس کے) علم وعقل کے مسلمات کے خلاف ہو وہ نا قابل قبول ہے۔

[میزان، ص:۱۵۔۶۱، ۶۲، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

۵......سنت کے قبول کے لیے بھی قرآن پاک کی طرح تواتر کی شرط لگاتا ہے۔ اُس کے نزدیک سنتوں کی کل تعداد صرف ۲۷ ر ہے۔ باقی تمام سنتوں کا منکر ہے۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اعمال، نفلی عبادات، مرغوب طعام، لباس وغیرہ کی سنیت کا منکر ہے۔ [میزان، ص:۱۴۔۲۵۔۵۷۔۵۸۔۶۰]

۶......ڈاڑھی کو سنت اور دین کا حصہ نہیں مانتا۔ [مقامات، ص:۱۳۸، طبع نومبر ۲۰۰۸]

۷......اجماع کا منکر ہے اور اسے ''دین میں بدعت کے اضافے'' سے تعبیر کرتا ہے۔

[اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۲]

۸......مرتد کی شرعی سزا کا بھی منکر ہے۔ کہتا ہے: وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ساتھ خاص تھی۔ [اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۵۹]

۹......محصن زانی کے لیے رجم کو اور شراب نوشی کی شرعی سزا کو حد تسلیم نہیں کرتا۔

[برہان، ص:۳۵ تا ۱۴۶، طبع فروری ۲۰۰۹ء]

۱۰......کہتا ہے کہ اسلام میں ''فساد فی الارض'' اور ''قتل نفس'' کے علاوہ کسی بھی جرم کی سزا قتل نہیں ہو سکتی۔ [برہان، ص:۱۴۶، طبع فروری ۲۰۰۹ء]

۱۱......قرآن پاک کی صرف ایک قراءت مانتا ہے، باقی قراءتوں کو عجم کا فتنہ قرار دیتا ہے۔

[میزان، ص:۳۲، طبع اپریل ۲۰۰۲ء......بحوالہ تحفہ غامدی از مفتی عبدالواحد مدظلہ]

۱۲......تمام فقہاء کرام کی آراء کو اپنے علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا قائل ہے۔

[سوال و جواب، ہٹس ۷۷۲، ۱۹ جون ۲۰۰۹]

۱۳......ہر آدمی کو اجتہاد کا حق دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اجتہاد کی اہلیت کی کوئی شرائط متعین نہیں، جو سمجھے کہ اسے تفقہ فی الدین حاصل ہے وہ اجتہاد کر سکتا ہے۔

[سوال و جواب، ہٹس ۶۱۲، تاریخ اشاعت: ۱۰ مارچ ۲۰۰۹ء]

۱۴......غلبۂ دین کے لیے (اقدامی) جہاد کا منکر ہے۔ کہتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بعد غلبۂ دین کی خاطر جہاد ہمیشہ کے لیے ختم ہے۔ [اشراق، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۲]

۱۵......تصوف کو عالم گیر ضلالت قرار دیتا ہے۔ اور اسے اسلام سے متوازن ایک الگ دین کہتا ہے۔ [برہان، ص:۱۸۱ تا ۲۱۰، طبع ششم، فروری ۲۰۰۹ء]

۱۶......حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو باغی اور یزید کو بہت متحمل مزاج اور عادل بادشاہ کہتا ہے۔ نیز واقعۂ کربلا کو سو فیصد افسانہ قرار دیتا ہے۔ [بحوالہ غامدیت کیا ہے؟ از مولانا عبدالرحیم چاریاری، ص:۶۳]

۱۷......مسلم و غیر مسلم اور مرد و عورت کی گواہی میں فرق کا قائل نہیں ہے۔ سب کی گواہی کو یکساں کہتا ہے۔ [برہان، ص:۲۵ تا ۳۴، طبع ششم، فروری ۲۰۰۹ء]

۱۸......کہتا ہے کہ زکوٰۃ کے نصاب میں ریاست کو تبدیلی کا حق حاصل ہے۔

[اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۷۰]

۱۹......یہود و نصاریٰ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو ضروری قرار نہیں دیتا۔ کہ اس کے بغیر بھی اُن کی بخشش ہو جائے گی۔ [ایضًا]

۲۰......موسیقی کو فی نفسہ جائز کہتا ہے۔

[اشراق، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۶۹......جولائی، ۲۰۰۸ء، ص:۶۷......مارچ، ۲۰۰۹ء، ص:۶۹]

۲۱......بت پرستی کے لیے بنائی جانے والی تصویر یا مجسمے کے علاوہ ہر قسم کی تصویروں کو جائز کہتا ہے۔[اشراق، مارچ، ۲۰۰۹ء، ص:۶۹]

۲۲......بیمہ کو جائز قرار دیتا ہے۔[اشراق، جون ۲۰۱۰ء، ص:۲]

۲۳......یتیم پوتے کو دادے کی وراثت کا حقدار کہتا ہے۔ مرنے والی کی وصیت کو ایک ثلث تک محدود نہیں مانتا۔ نیز وارثوں کے حق میں بھی وصیت کو درست مانتا ہے۔

[اشراق، مارچ ۲۰۰۸ء، ص:۶۳......جون، ۲۰۱۱ء، ص:۲......مقامات، ص:۱۴۰، طبع نومبر ۲۰۰۸]

۲۴......سور کی نجاست کو صرف گوشت تک محدود کرتا ہے۔ اس کے بال، ہڈیوں، کھال وغیرہ سے دیگر فوائد اٹھانے کو جائز کہتا ہے۔ [اشراق، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص:۷۹......بحوالہ: غامدیت کیا ہے؟، ص:۹۰]

۲۵......غامدی کا یہ بھی نظریہ ہے کہ: سنت صرف دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی حیثیت سے جاری فرمایا۔ اور یہ قرآن سے مقدم ہے۔ (لہٰذا اگر کہیں قرآن کا ٹکراؤ دین ابراہیمی کی اس روایت سے ہو جائے تو قرآن کے بجائے اسی کو ترجیح ہوگی۔ اور دین ابراہیمی کی روایت سے غامدی کی مراد یہود و نصاریٰ کا متواتر فکر و عمل ہے۔[ناقل])[میزان، ص:۱۴۔۴۷، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

(۱)......جاوید غامدی کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ مسلمان ہے یا کافر......اگر مسلمان ہے تو اہل سنت میں سے ہے یا ضال و مضل؟

(۲)......اس کو مذہبی و دینی پیشوا بنانا اور اس سے شرعی احکام کے متعلق سوالات کرنا کیسا ہے؟

(۳)......اس کے نظریات و خیالات کی تائید یا ترویج و اشاعت کرنے والوں کا کیا حکم ہے؟

(۴)......اس کے گروہ میں شمولیت اور اس کے ادارے کی رکنیت حاصل کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۵)......عوام الناس کے لیے اُس کے بیانات سننا یا اُس کی اور اس کے تلامذہ و متبعین کی تحریریں پڑھنا کیسا ہے؟

المستفتی......حافظ محمد عدیل عمران، لاہور

مولانا مفتی حمید اللہ جان کا فتویٰ

الجواب باسم ملک الوهاب

بشرط صحت سوال یہ شخص زندیق ہے اور اس کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ناجائز ہے۔

"الثاني: أنه قد تواتر، وانعقد الإجماع على نزول عيسى بن مريم عليه السلام، فتأويل هذه وتحريفه كفر ايضًا. وقد قال في "روح المعاني" – وهو من محققي المتأخرين: إن من لم يقل بنزوله فقد أكفره العلماء، وهو على القاعدة في إنكار ما تواتر في الشرع."

[إكفار الملحدين في ضروريات الدين:۱۱]

قال: التفتازاني في "مقاصد الطالبين في أصول الدين": الكافر إن أظهر الإيمان خص باسم "المنافق"، وإن كفر بعد الإسلام "فبالمرتد"، وإن قال بتعدد الآلهة "فبالمشرك"، وإن تدين ببعض الأديان "فبالكتابي"، وإن أسند الحوادث إلى الزمان واعتقد قدمه" "فالبدهري"، وإن نفى الصانع فبالمعطل، وإن أبطن عقائدهي بالإنفاق "فبالزنديق".......وقال في شرحه: قد ظهر أن "الكافر" اسم لمن لا إيمان له، فإن أظهر الإيمان خص باسم المنافق، وإن طرأ كفره بعد الإسلام خص باسم المرتد، لرجوعه عن الإسلام، وإن قال بإلٰهين أو أكثر. خص باسم المشرك، لإثباته الشريك في الألوهية، وإن قان متدينًا ببعض الأديان والكتب المنسوخة، خص باسم الكتابي، كاليهودي والنصراني، وإن كان يقول بقدم الدهر وإسناد الحوادث إليه، خص باسم الدهري، وإن كان لا يثبت الباري تعالى خص باسم المعطل، وإن كان مع اعترافه بنبوة النبي – صلى الله عليه وسلم – وأظهار شعائر الإسلام يبطن عقائد هي كفر بالإتفاق، خص باسم الزنديق، وهو في الأصل منسوب إلى الزند، اسم كتاب أظهر مزدك في أيام قباد، وزعم أنه تأويل كتاب المجوس الذي جاء به زرادشت الذي يزعمون أنه نبيهم. قوله: "المعروف"اه.فإن الزنديق يموه كفره، ويروج عقيدته الفاسدة، ويخرجها في الصورة الصحيحة، وهذا معنى إبطان الكفر، فلا ينافي إظهاره الدعوى إلى الضلال، وكونه معروفًا بالإضلال.اه[إكفار الملحدين في ضروريات الدين:۱۳]

والله تعالىٰ أعلم بالصواب...... كتبه دين محمد عفي عنه

دارالإفتاء والإرشاد جامعة الحميد لاهور......۲۹/جمادى الأولىٰ ١٤٣٦ھ

الجواب صحیح......حمید اللہ جان عفی عنہ

☆......☆......☆......☆

دار الافتاء و التحقیق لاہور کا فتویٰ

بسم اللہ حامدا ومصلیا

جاوید غامدی اور اس کے پیروکار سب ہی سخت گمراہ لوگ ہیں۔ان کے خلاف تقریری یا تحریری طریقوں سے عوام کو آگاہ کرنا اور ان کے نظریات وافکار کا تقریری اور تحریری مقابلہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔فقط واللہ اعلم

عبدالواحد غفرلہ......رئیس دارالافتاء والتحقیق، متصل جامع مسجد الہلال، چوبرجی پارک، لاہور

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۶ھ......فتویٰ نمبر: ۱۹۳/۷

☆......☆......☆......☆

دار الافتاء و التحقیق لاہور کا دوسرا فتویٰ

(کراچی کے سید عطاء نامی صاحب کے ایک استفتاء کا جواب)

بسم اللہ حامداومصلیاً

۱/۲: جاوید احمد غامدی گمراہ ہے اور اس کے افکار گمراہی کا پلندہ ہیں۔آپ نے اس کے گمراہ اُفکار کا بڑا ذخیرہ کرلیا ہے۔کچھ باتیں تو کفر کے قریب تک پہنچ گئی ہیں مثلاً شق نمبر ۱۶ اگر واقعی غامدی کی اپنی تحریر ہے تو یہ قرآن کی صریح مخالف ہے۔اسی طرح شق نمبر ۱۷ میں سنت متواترہ کا انکار ہے۔اگر غامدی نے سنت کا اپنا مطلب نہ بنایا ہوتا تو سنت متواترہ کا انکار کفر ہوتا۔

۳/۴: جاوید احمد غامدی اور اس کے پیروکاروں سے تعلقات قائم کرنا، ان سے نکاح کرنا، ان کے خوشی غمی میں شریک ہونا یہ سب باتیں ناجائز ہیں۔

۵/۶: جاوید غامدی اور اس کے پیروکاروں کو نماز میں امام بنانا اور ان کا لٹریچر شائع کرنا اور ان کو بیان کے لیے بلانا یا ان کے پاس جانا یہ سب باتیں بھی ناجائز ہیں۔

۷: عوام کے لیے ان لوگوں کے تقریر سننا اور تحریر پڑھنا جائز نہیں ہے۔

۸: جہاں کہیں غامدیت کے بیج پڑ گئے ہوں وہاں کے اہل حق علماء کے ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو غامدیت کی گمراہیوں سے باخبر کریں۔اس کے لیے آپ کی مرتب کردہ فہرست ہی لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور اس کی کاپیاں لوگوں میں تقسیم کریں تو ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

جن اہل حق علماء نے جاوید غامدی کے افکار پر کتابیں لکھی ہیں وہ بھی لوگوں کو پڑھنے کو بتائیں۔

جاوید غامدی کی کچھ باتیں ہماری کتاب ''تحفۂ غامدی'' میں ہیں۔مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بیٹے اور جاوید غامدی کے شاگرد رشید مولوی عمار خان ناصر نے جاوید غامدی کی افکار کی تبلیغ کے لیے جو کتابیں لکھی ان پر رد کے لیے ہماری یہ کتاب بھی ہے ''عمار خان کا نیا اسلام اور اس کی سرکوبی''۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

دارالافتاء والتحقیق، مسجد الہلال چوبرجی پارک لاہور

☆......☆......☆......☆

دارالعلوم مدنیہ بہاول پور کا فتویٰ

الجواب باسم ملہم الصواب

صورتِ مسئولہ میں جاوید احمد غامدی کے عقائد و نظریات جو کہ استفتاء کے ساتھ لف ہیں۔ اُن کا بغور مطالعہ کیا اور بعض حوالہ جات کا اُس کی اصل کتابوں سے موازنہ بھی کیا۔اُس کے اِن عقائد و نظریات مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی

(۱)اس کے بعض نظریات کفریہ ہیں۔مثلاً قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا انکار، بعض سنتوں کے سنیت کا انکار، احادیث کا انکار۔

(۲) بعض نظریات الحادی ہیں۔

(۳)اس کے نظریات میں جابجا قرآنی تصریحات کا انکار، احادیثِ متواترہ اور مسائلِ اجماعیہ کا انکار واضح ہوتا ہے۔

لہٰذا اِن عقائد کا حامل شخص دائرہ اسلام سے خارج، ضال اور مضل اور کفریہ عقائد کا مالک ہے۔ ایسے شخص کی پیروی کرنا اور اس کو مقتداء اور پیشوا ماننا اور داعی اسلام سمجھنا اپنے آپ کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا ہے۔اِس سے خود بھی بچنا اور دوسروں کو بچانا فرض ہے۔

ھذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب

حررہ: محمد یوسف......دارالافتاء دارالعلوم مدنیہ بہاولپور......۳۶/۳/۸ھ

الجواب صحیح......احمد سفیان......دارالعلوم مدنیہ بہاول پور......۱۴۳۶/۰۳/۹ھ

الجواب صحیح......عطاء الرحمٰن......(رئیس دارالافتاء ومدیر وشیخ الحدیث:) دارالعلوم مدنیہ بہاول پور......۳۶/۳/۸

☆......☆......☆......☆

جامعہ خیر العلوم خیر پور ٹامیوالی کا فتویٰ

الجواب وھو العلیم

جاوید احمد غامدی یا اس کے تلامذہ کی کتابوں کے جو اقتباسات آپ نے نقل کیے ہیں، اگر سیاق وسباق سے ان کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو جاتا اور مصنف کی مراد بھی وہی ہے جو الفاظ سے ظاہر ہے تو یہ نہایت گمراہ کن عبارات ہیں، جو اسلام کے مسلمہ و متفقہ اصولوں کے خلاف ہیں، ان کا پڑھنا نہایت خطرناک ہے۔ اِن میں سے بعض نظریات تو خالصتاً کفر ہیں، مثلاً: نزولِ عیسیٰ علیہ السلام تواتر سے ثابت ہے، چنانچہ علامہ ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس کی صراحت کی ہے:

"وانه ینزل یوم القیامة کمادلت علیه الأحادیث المتواترة الخ"

[تفسیر ابن کثیر: ۱۴/۲ بحوالہ فتاویٰ محمودیہ: ۲۵۰/۳]

حافظ ابن حجرؒ نے ابو الحسن آبریؒ سے تواتر کا قول نقل کیا ہے۔ علامہ شوکانیؒ کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے: "التوضیح فی تواتر ماجاء فی المنتظر والدجال والمسیح"۔ علامہ ابن حزمؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الفصل فی الملل والنحل" میں صاف لکھ دیا ہے کہ عقیدۂ نزول تواتر سے ثابت ہے۔

[بحوالہ قادیانیت مطالعہ و جائزہ: ۵۸ مصنفہ ابو الحسن علی ندویؒ]

عقیدہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا ضروری ہے، اس کا انکار کفر ہے اور اِس کی تاویل کرنا زیغ وضلال اور کفر والحاد ہے: "فالإیمان بها واجب، والإنکار عنها کفر، والتاویل فیها زیغ وضلال والحاد" [مقدمہ عقیدۃ الاسلام: ۳۳ بحوالہ فتاویٰ محمودیہ: ۲۵۰/۳]

لہٰذا نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا منکر اجماعی عقیدہ کا منکر ہے اور احادیث متواترہ کا منکر ہے، تاویلات کے ذریعے بھی دفاع ممکن نہیں۔

باقی تمام نظریات بھی جمہور امت کے نظریات کے خلاف ہیں، موصوف قرآنی آیات اور احادیث میں من گھڑت تاویلات کا قائل ہے، اِس وجہ سے مذکورہ شخص ضال و مضل، ملحد و بے دین ہے۔ اس کو مذہبی پیشوا سمجھنا، اس سے شرعی احکامات کے متعلق سوال کرنا، اس کے نظریات وخیالات کی ترویج واشاعت کرنا، عوام الناس کے لیے اس کی یا اس کے تلامذہ کی کتابیں اور تحریریں پڑھنا یا بیانات سننا ناجائز اور حرام ہے اور عقائد ونظریاتِ اسلامی کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

ھذاماعندی واللہ أعلم بالصواب۔ کتبہ: محمد معین الدین غفرلہ

الجواب حق صحیح والحق احق أن یتبع

ابو اکرام محمد ارشاد الحق غفرلہ......رئیس دارالافتاء وشیخ الحدیث: بجامعۃ خیر العلوم خیر پور ٹامیوالی

☆......☆......☆......☆

جامعہ اشرفیہ لاہور کا فتویٰ

الجواب حامدا ومصلیا

سوال میں شخص مذکور کے جن عقائد کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے بعض عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کے اتفاقی عقائد کے خلاف ہیں، اور بعض عقائد نہایت گمراہ کن ہیں۔ نیز اسی طرح اُس کے ذکر کردہ مسائل میں سے بہت سے مسائل امت کے اجماعی مسائل کے خلاف ہیں۔ لہٰذا ان عقائد ومسائل کی روشنی میں شخصِ مذکور کا شرعی حکم اور آپ کے سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱)......شخصِ مذکور اپنے مذکورہ عقائد کی وجہ سے ایک گمراہ شخص ہے۔ یہ اہل سنت میں داخل نہیں کیونکہ اہلِ السنّت والجماعت قرآن وسنت سے اخذ شدہ مخصوص عقائد کے حاملین کا لقب ہے۔ اور جو شخص ان کے مخالف نظریات کا حامل ہو وہ ان میں شامل نہیں۔

(۲)......اس کو مذہبی پیشوا بنانا اور اس سے شرعی مسائل کے بارے میں سوال کرنا ہرگز جائز نہیں۔

(۳)......اس شخص کے مذکورہ نظریات اور خیالات کی ترویج اور اشاعت سے اجتناب لازم ہے۔

(۴)......شخصِ مذکور کے گروہ میں شامل ہونا جائز نہیں۔

(۵)......عوام الناس کو چاہیے کہ صحیح العقیدہ، نیک، صالح، متبعِ سنت علماء اور بزرگانِ دین کے بیانات اور تحریرات سے استفادہ کریں۔ ان کے لیے ایسے گمراہ شخص کے بیانات سننے، اس کی اور اسکے متبعین کی تحریریں پڑھنے سے اجتناب لازم ہے۔ البتہ محقق علماء اس شخص کی تردید کے لیے ان تحریرات کا مطالعہ کریں تو ایسا کرنا جائز ہے۔

نوٹ: اگر کوئی شخص نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا بلا تاویل انکار کرے تو وہ کفر میں بھی داخل ہوسکتا ہے۔

فقط واللہ أعلم بالصواب

کتبہ: محمد اویس مسعود غفرلہ...... متخصص جامعہ اشرفیہ، لاہور

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۹ فروری ۲۰۱۵ء

الجواب صحیح: محمد زکریا، ۱۹/۰۴/۱۴۳۶ھ......الجواب صحیح: شاہد عبید

☆......☆......☆......☆

جامعہ خلفائے راشدین احمد پور کا فتویٰ

الجواب

شخص مذکور اپنے عقائد ونظریات کی روشنی میں ملحد اور بے دین ہے، کما فی الشامیة:
والملحد من مال عن الشرع القويم إلى جهة من جهات الكفر "[شامية، ٣/٢٤٣م: رشيديه ١٤١٢ه]۔ اسے مذہبی راہنما ماننا یا اس کی تائید کرنا سب بے دینی وگمراہی ہے۔ عوام الناس کو ایسے فتنہ پرداز شخص کی تحریر وتقریر سے بچنا بچانا چاہیے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ: حسین اسماعیل......دارالافتاء:......۱۴۳۶/۰۳/۱۲ھ

بندہ محمد اجمل عفی عنہ......مفتی: مدرسہ عربیہ خلفائے راشدین، ریلوے روڈ، احمد پور شرقیہ

بندہ محمد اقبال عفی اللہ عنہ......مفتی: مدرسہ عربیہ خلفائے راشدین، ریلوے روڈ، احمد پور شرقیہ

☆......☆......☆......☆

جاوید غامدی کے چند ملحدانہ نظریات

عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں۔ [اشراق مئی ۲۰۰۸ء، ص:۲۶]

قیامت کے قریب کوئی مہدی نہیں آئے گا۔ [میزان، علامات قیامت، ص:۱۷۷، طبع مئی ۲۰۱۴]

حدیث سے دین میں کسی عمل یا عقیدے کا اضافہ بالکل نہیں ہوسکتا۔ [میزان:۱۵، طبع مئی ۲۰۱۴ء]

مرزا غلام احمد قادیانی بنیادی طور پر صوفی تھا، اس نے دعوئ نبوت نہیں کیا۔ [اختلافات احمدیہ:۸۴]

نبی ﷺ کے مختلف اعمال، نفلی عبادات، مرغوب طعام، لباس وغیرہ سنت نہیں۔ [میزان:۵۷]

ڈاڑھی سنت اور دین کا حصہ نہیں۔ [مقامات، ص:۱۳۸، طبع نومبر ۲۰۰۸]

دین کے ماخذ میں اجماع کا اضافہ یقیناً بدعت ہے۔ [اشراق، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص:۲]

مرتد کی شرعی سزا نبی کریم ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھی۔ [اشراق، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶۴]

قرآن کی ایک ہی قراءت ہے، اس کے علاوہ سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں۔ [میزان:۳۲، طبع ۲۰۰۲ء]

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے بعد اقدامی جہاد ہمیشہ کے لیے ختم ہے۔ [اشراق، اپریل ۲۰۱۱ء، ص:۲]

ہر آدمی کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ [سوال وجواب، ہٹس ۶۱۲، تاریخ اشاعت: ۱۰ مارچ ۲۰۰۹ء]

تصوف عالم گیر ضلالت ہے۔ [برہان:۱۹۳، طبع ششم، فروری ۲۰۰۹ء]

ریاست کو زکوٰۃ کے نصاب میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔ [اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۷۰]

یہود و نصاریٰ کے لیے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ [اشراق، جون ۲۰۰۸ء، ص:۷۰]

موسیقی فی نفسہ جائز ہے۔ [اشراق، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۶۹]

موصوف کی ہر کتاب بلکہ ہر صفحہ وسطر سے ذہنی آوارگی، کج فہمی، فکری کج روی، آزاد فکری، خود پسندی، تکبر اور ضلالت وگمراہی ٹپکتی ہے۔
(شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان)
غامدی صاحب لوگوں کو صراط مستقیم سے ہٹا رہے ہیں۔
(شیخ الحدیث مولانا محمد صدیق)
بدقسمتی سے ہمارے بھولے بھالے عوام غامدی صاحب کی زبانی بولیوں سے متاثر ہو کر جمہور امت سے الگ راہ پر جا رہے ہیں۔
(شیخ الحدیث مولانا عبدالرزاق اسکندر)
غامدی کی تحریرات میں ایسا خطرناک مواد ہے جس سے جدید نسل کے الحاد اور گمراہی بلکہ کفر تک میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔
(شیخ التفسیر والحدیث مولانا منظور احمد نعمانی)
اس دور کا سب سے بڑا فتنہ اکابرین سے اعتماد اٹھا کر دین کی نئی تشریح کرنے کا ہے۔ دور حاضر میں باقی فتنوں کی طرح ایک جاوید غامدی کا فتنہ ہے۔
(مناظر اسلام مولانا مفتی محمد انور اوکاڑوی)
عمار خان صاحب ناصر، جاوید غامدی پرویزی کی تقلید میں جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کی راہ سے ہٹ کر گمراہی کی دلدل میں پھنس چکے ہیں۔
(ترجمان دیوبند مولانا نور محمد تونسوی)
''غامدیت'' اس وقت کے بڑے فتنوں میں سے ہے۔
(شیخ الحدیث مولانا مفتی جمیل الرحمن)
بعض امور کفر کی سرحد کو چھو رہے ہیں۔
(مولانا قاضی نثار احمد)
یہ شخص زندیق ہے۔
مولانا مفتی حمید اللہ جان کا فتویٰ
بعض نظریات قرآن کے صریح خلاف ہیں۔
دارالافتاء والتحقیق لاہور کا فتویٰ
دائرہ اسلام سے خارج اور ضال ومضل ہے۔
دارالعلوم مدنیہ بہاولپور کا فتویٰ
بعض نظریات خالصتاً کفر ہیں۔
جامعہ خیر العلوم خیرپور کا فتویٰ
گمراہ اور اہل سنت سے خارج ہے۔
جامعہ اشرفیہ لاہور کا فتویٰ
ملحد اور بے دین ہے۔
جامعہ خلفائے راشدین احمدپور کا فتویٰ

جب ایک مرتبہ کوئی صاحبِ فکر جمہور اُمت کے مسلمات سے آزاد ہو کر اپنی راہ الگ اختیار کر لیتا ہے اور یہ تصور کر لیتا ہے کہ وہ ان مسلمات کے بارے میں پہلی بار اصابتِ فکر کے ساتھ غور کر رہا ہے، اور چودہ صدیوں میں علماءِ امت اس اندازِ فکر سے محروم رہے ہیں، تو اُس کے اوپر کوئی روک باقی نہیں رہتی۔ ماضی میں یہی طرزِ فکر نہ جانے کتنی گمراہیاں پیدا کر چکا ہے۔ طٰہٰ حسین سے لے کر سر سید تک اور وحید الدین خان صاحب سے لے کر جاوید غامدی صاحب تک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اپنے اپنے وقت میں اس قسم کے طرزِ فکر نے دلائل کا زور بھی باندھا، لیکن امت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر رفتہ رفتہ اُسے رد کر کے اس طرح آگے بڑھ گیا کہ اُس کا ذکر صرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔ بالخصوص آج کے دور میں جس طرح کے افکار دین میں تحریف کے درپے ہیں، اس کے سوا سلامتی کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ انسان علماءِ امت کے سوادِ اعظم سے اور جمہور امت کے مسلمات سے وابستہ رہے۔ بے شک انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہ ہونا چاہیے کہ انسان جمہور علماء امت کے مقابلے میں خود کو معصوم سمجھنے لگے اور یہ سمجھے کہ اُن سب سے بیک وقت غلطی ہوئی ہے، مجھ سے نہیں۔

(حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کے عمار خان کے نام مکتوب سے ایک اقتباس)